زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

شگوفہ

ایڈیٹر

سیّد مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت

حمایت اللہ ؛ محمد منظور احمد ؛ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

راجندر سنگھ بیدی ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور
بھارت چند کھنّہ نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مینیجر

سمیع جلیل

فون

57716

جلد (۱۷) ★ جنوری ۱۹۸۴ء ★ شمارہ (۱)

زرِ سالانہ : (۳۰) روپے

بیرونِ ہند سے (۹۰) روپے

فی شمارہ

۳ روپے

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳/۱۳ ۔ بیچلرز کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

ٹائیٹل

سعادت علیخان

کتابت : محمد عبدالرؤف ★ مسعود انور

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲



کشمیری قوام

تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

پھر ملیں گے اگر ...... خدا لایا

ادارۂ شگوفہ اپنے قارئین کی خدمت میں نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہے ــــ

شگوفہ کا "ہندوستانی مزاح نمبر" کتابت کے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے۔ اس خصوصی شمارہ کی مکمل صورت گری کیلئے کچھ اور وقت درکار ہے۔ اس لئے مناسب یہ سمجھا گیا کہ شگوفہ کی عام اشاعتوں کو متاثر نہ کیا جائے۔ چنانچہ خصوصی نمبر کی بجائے جنوری کا عام شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی طرح آئندہ شمارہ حسب معمول فروری کے دوسرے ہفتے میں شائع ہوگا ــــ مارچ کا شمارہ ہندوستانی مزاح نمبر، اور اپریل کا شمارہ سووینیر ہوگا۔

"مدیر"

شگوفہ

ہندوستانی مزاح نمبر

۱۹۸۴ء

مہمان مدیر: ——— یوسف ناظم

اردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی ۔ تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی ۔ اڑیا ۔ ملیالم ۔ سندھی ۔ کنڑی ۔ میتھلی اور راجستھانی زبانوں کے **مزاحیہ نثری ادب** کا جائزہ اور **منتخب مضامین کے تراجم** اردو کے دس مصنفین کے خودنوشت **خاکے** اور مضامین ۔ ملک کے **تنقید نگاروں کی آرا** اور **انٹرویو**، اردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل **ببلوگرافی** اور مقالہ نگاروں کی تصاویر کے ساتھ

یکم مارچ ۱۹۸۴ء
کو شائع ہوگا

شرکاء :

پروفیسر کلیم الدین احمد۔ ملک راج آنند۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر وحید اختر
ظ۔ انصاری۔ باقر مہدی۔ ڈاکٹر اپنا پانیکر۔ نثار احمد فاروقی۔ رشید حسن خاں۔ پروفیسر رام پنجوانی
شمیم حنفی۔ عبدالستار دلوی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ کرامت علی کرامت۔ عمیق حنفی۔ مظفر حنفی
ابنِ فرید۔ حامد حسن۔ سکسینا چودھری۔ پروفیسر سنتوک راز۔ پروفیسر شیام سندر مشرا۔
محمد زماں آزردہ۔ رتی لال شاہین۔ پروفیسر عبدالمغنی۔ حمید الماس۔ عزیز تمنائی۔ اسمٰعیل آذر
سلیمان اطہر جاوید۔ بھارت چند کھنہ۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور۔ نریندر لوتھر۔ مناظر عاشق ہرگانوی
فکر تونسوی۔ مجتبیٰ حسین۔ احمد جمال پاشاہ۔ شفیقہ فرحت۔ رشید قریشی۔ وجاہت علی سندیلوی
مسیح انجم۔ پروفیسر راما راؤ۔ اعجاز علی ارشد۔ پرویز یداللہ مہدی

ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات	قیمت : ۲۰ روپے مجلد ۲۵ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرمائیے

سالانہ خریداروں کے لئے دس روپے۔ پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں

یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائیگا۔

رضا نقوی واہی

اردو کی نسبندی

فیملی منصوبہ بندی کا کرشمہ دیکھ کر — بڑھتی آبادی گھٹانے کا یہ نسخہ دیکھ کر
قوم کو اردو کی نسبندی کا بھی آیا خیال — تاکہ رخصت ہو دلوں سے جلد یہ کافر جمال
مختلف ناموں سے نسبندی بھون کھولے گئے — کچھ تو پہلے ہی سے تھے کچھ دفعتاً کھولے گئے
سربراہوں میں کچھ اپنے بھی تھے کچھ اغیار بھی — مصلحت پیشہ بھی کچھ تھے ان میں کچھ خونخوار بھی
بکر رنگ، آلود سے نشتر زنی ہونے لگی — زخم اپنا، اپنے ہی خوں سے زباں دھونے لگی
بعد آزادی تو یوں بھی تھی لبوں پر اسکے جاں — اک "محقق" نے کہا اردو ہے ترکوں کی زباں
یہ تو گھس بیٹھی ہے بھارت درش میں کیا اس کا کام — جلد دستورِ اساسی سے ہٹاؤ اس کا نام
غیر تو ہیں غیر اپنوں کا بھی سنئے ماجرا — جن کے پنجوں میں بچاری کا دبا ہے نرخرا
جو غزل کو نیم وحشی صنف کا دیکر لقب — ہو گئے مشہور اپنی جملہ بازی کے سبب
آئے نسبندی بھون کی سربراہی کے لئے — کھل گیا اک اور رستہ تانا شاہی کے لیئے
جب سے اپنے شہر میں قائم ہوا یہ ورک شاپ — پیرِ تسمہ پا کی صورت ہیں مسلط اس پہ آپ
کیمپ میں رکھی گئی کچھ ایسے نسبندوں کی ٹیم — چند تھے جن میں عطائی چند تھے جعلی حکیم
یوں غلط بخشی و حق تلفی کا گھن چکر چلا — سب کو یاد آیا پرانا قصہ بندر بانٹ کا
مستند فنکار ہوں یا نونہالانِ ادب — ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جا رہے ہیں آج سب
جی حضوری اور خوشامد کی تو سودا پٹ گیا — ورنہ نسبندی بھون سے رشتہ ناتا کٹ گیا
جیسے نادر شاہ نے لوٹی تھی دِلّی کی بہار — فن ہو، یا فنکار، ناقدری کے ہیں یونہی شکار
گر کسی نے کردیا کچھ ان کی مرضی کے خلاف — غیر ممکن ہے، کبھی کردیں بڑے صاحب معاف
جو بجٹ رکھا گیا تھا خوں چڑھانے کے لئے — یعنی اردو کو بچانے اور جلانے کے لیئے
بینک بیلنس اس رقم سے دن بدن بڑھتا گیا — شیر نے کھا کر جو چھوڑا گیدڑوں میں بٹ گیا
گڑ کھلانے سے اگر بیمار کا قصہ ہو پاک — اس کو ناحق زہر دیکر کیوں کیا جائے ہلاک
سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی دو ٹکڑے نہ ہو — اس کو کہتے ہیں تدبر، اے ادیبو، شاعرو!

اِس طرح زبردستی کی نسبندی سے واہی عن قریب
جاں بحق تسلیم ہونے ہی کو ہے اردو غریب

انیس ! مدخاں
(نئی دہلی)

ایک شام مُنّا اُداس کے نام

انھیں بچپن سے ہی یہ شک ہوگیا تھا کہ ان کا گلا بہت اچھا ہے اور گانا بہت اچھا گا سکتے ہیں ان کے اس شک نے انھیں گھر سے بے گھر کیا در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر بھی مجبور کیا لیکن وہ دُھن کے اتنے پکّے تھے کہ کبھی بھی انھوں نے اپنے اس شک کو دور نہیں کیا۔

ان کا گلا سرگموں سے ہر طرح سے آزاد تھا ان کے سُر ہارمونیم میں تو کیا نقارے میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے تھے وہ اپنے گلے سے بیک وقت پندرہ پندرہ بیس بیس آوازیں نکال سکتے تھے اور اپنی آواز کو پنچم سے بھی کہیں اوپر لاؤڈسپیکر تک کھینچ سکتے تھے۔

ان کے اسی فن نے بچپن میں انھیں کئی بار بے عزت کیا ایک بار جب وہ مترنم اسکول کی پوئم پڑھ رہے تھے کہ پڑوسن نے ان کی ممّی کو ڈانٹتے ہوئے کہا "اری سنتو تو کیسی ظالم ماں ہے مُنّا اتنی زور سے روئے چلا جا رہا ہے تو چپ کیوں نہیں کراتی اُسے"۔

یہ بات ان کے دل میں تیر کی طرح چُبھ گئی اور وہ اداس رہنے لگے (حالانکہ ان کی اسی ادا نے انھیں آگے چل کر مُنّا اداس کے نام سے مشہور کیا) اسی اداسی کے عالم میں انھوں نے یہ عہد کیا کہ جب تک وہ پڑوسن آنٹی پر یہ ثابت نہ کر دیں گے کہ جسے وہ رونا سمجھ رہی تھی اصل میں وہ گانا تھا تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے اور انھوں نے یہ کر دکھایا لیکن پڑوسن آنٹی کی بے وفائی دیکھئے وہ اس سے پہلے ہی ملک عدم سدھار کر چین سے بیٹھ گئی۔

پڑوسیوں نے تو کبھی ان کے فن کی قدر نہیں کی یہی وجہ تھی کہ ریاض کرتے وقت بھی یہ اپنے گائے ہوئے گانے کے بول تک نہیں سُن پاتے تھے کیونکہ پڑوسی ان کا دروازہ ہی اتنی زور زور سے پیٹتے تھے۔

اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ان کی قدر کسی نے نہیں کی ہو ان دنوں جب وہ اپنے گانے کے شوق کی وجہ سے گھر سے نکالے جا چکے تھے تو انھوں نے شہر چھوڑ جنگل کی راہ اپنائی جنگل میں انھوں نے اپنے ریاض کا جھنڈا کھینچا

شروع کردیا دوران چلّہ وہاں سے ایک زمیندار کا گزر ہوا وہ ان کی بھاری بھرکم اور گرجدار آواز سے اتنا متاثر ہوا اتنا متاثر ہوا کہ اس نے انھیں اپنی بھینسوں کے ریوڑ ہانکنے پر معمور کرلیا۔

یہیں پر انہوں نے فن موسیقی میں بھنبیا اور شیر دہاڑ جیسے راگوں کا اضافہ کیا۔

پھر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہزاروں سال نرگس اپنی بے لوزی پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں سُنیل دت پیدا۔

حالانکہ سنیل دت والی نرگس کو نہ تو کبھی اپنی بے لوزی پہ رونا پڑا نہ دیدہ وروں کے لئے ترسنا پڑا لیکن جس نرگس یعنی آنکھ "بات یہاں چل رہی ہے جو کہ آگے چل کر "منّا اداس" کہلائے واقعی میں اپنے آپ کو منوانے کے لئے ہزاروں تو نہیں پانچ چھ سال بھینسوں کا ریوڑ ہانکنا پڑا اور چھپ چھپ کر جنگلوں میں گانے کے بہانے رونا پڑا۔

ایک دن منّا اداس کسی دیدہ ور کی تلاش میں پھاڑ سا منہ کھولے آنکھیں بند کئے اور ہاتھ پھٹکار پھٹکار کر کسی لوک گیت پر ریاض فرما رہے تھے تبھی زمیندار کی نیم ضبطی دُختر نیک اختر ان پر فریفتہ ہوگئیں اور اعلان کردیا کہ وہ شادی کریں گی تو مُنّے سے ورنہ حسبِ معمول کنواری رہیں گی۔ زمیندار نے بھی سوچا کہ جب اللہ ملائی جوڑی تو ہم بیچ میں کیوں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بیٹی کو مُنّے کی بیوی بنا دیا۔

شادی ہوتے ہی مُنّے کی لگی لگائی نوکری بھی چھوٹ گئی اور وہ پھر ایک بار بیروزگار ہوکر مع اپنی بیوی کے دردر کی ٹھوکریں کھانے میں مصروف ہوگئے لیکن انہوں نے گانا پھر بھی نہیں چھوڑا۔

ایک بار وہ گھر پر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ایک شام اپنے نام منوا رہے تھے تو دوستوں کے بے حد اصرار پر جب انہوں نے آآ : آ کرکے جو الاپ کھینچا تو اندر سے بیوی دہاڑی سی آتی ہوں ذرا مُنّے کو دودھ تو پلا دوں۔

اپنے فن کی اس قدر ناقدری دیکھ ان کا غصّہ ساتویں آسمان کی طرف پرواز چل پڑا لیکن جیسے تیسے فن کی خاطر انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنے غصّے کو دبا کر جوں ہی دوبارہ الاپ کھینچا کہ پڑوسی کے کتّے نے کورس میں بھونکنا شروع کردیا۔

بیوی کا غصّہ کتّوں پر انہوں نے آؤ دیکھا نا تاؤ ڈنڈا اٹھایا اور پڑوسی کے گھر میں گھس گئے اور بولے "پڑوسی! کہاں ہے تیرا کتّا میں اُسے پیٹوں گا"۔

پڑوسی نے حیرت سے پوچھا "اے مُنّا اداس آخر کیوں"؟ مُنّا اداس نے کہا "اس لئے کہ وہ حرا مخور میرا بھونکنا شروع کر دیتے ہیں"۔ "چل تو آپ ہی کرتے ہیں مُنّا اداس"۔

منّا اداس دنیا کے طعنے تشنیعے سُنتے رہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اپنا یہ شوق اور بھی پکّا کرتے گئے سنگیت سے ان کا اس قدر لگاؤ دیکھ ایک دن ان کے سسر بھی دنیا چھوڑ گئے لیکن جاتے جاتے اپنی ساری جائیداد اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کے نام کرتے گئے جس کا پہلا فائدہ مُنّا اداس کے دوستوں نے اٹھایا اور گھیرے اڑانے لگے بات یہیں تک رہ جاتی تب بھی ٹھیک تھا چند چمچوں نے سوچا کہ ہر بھری ہانڈی کو خالی کرنے کے لئے اس کے آس پاس آ جٹتے ہیں منّا اداس کو یہ صلاح دی کہ اگر وہ موسیقی کی دنیا میں کوئی ہنگامہ جیسی چیز کرنا چاہتے ہیں تو اپنے سسر کی بچی کچی جائیداد بیچئے

سے پہلے اپنے فن کا عام مظاہرہ کر ڈالیں کوشش کر کے اس جلسے میں کسی فلمی موسیقار کو چیف گیسٹ بنا دیا جائے گا اگر کہیں اس آنکھ کے اندھے اور کان کے بہرے موسیقار کی نظر ان پر پڑ گئی اور ان کی آواز اس کے من کو بھا گئی تو مُنّا اُداس راتوں رات سات تالے توڑ سات دیواریں پھاند، سات سمندر پھلانگ، سات سات اونٹ گھوڑوں پر سوار ہو کر ترقی کے ساتویں آسمان کی طرف روانہ ہو جائیں گے پھر گلی کوچوں سے دھتکارہ جانے والا مُنّا اداس گلی کوچوں میں گنگنایا جانے لگے گا۔

بات منّا اداس کے دل و دماغ میں پتھر کی لکیر کی طرح جم گئی اُنہوں نے فوراً باقی بچی سسرالی جائیداد بھی بیچ دی اور "ایک شام مُنّا اداس کے نام" کا اعلان کر دیا۔

تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں دور دور تک لاؤڈ اسپیکروں، پوسٹروں، اور ہینڈ بلوں کے ذریعہ یہ خبر پھیلا دی گئی کہ فلاں دن، فلانے وقت، فلانی جگہ موسیقی کی دنیا میں ایک ستارہ جگمگانے والا ہے آپ لوگ بھی یہ ماجرا دیکھنے ضرور تشریف لائیں جلسے کی صدارت مشہور موسیقار فلاں فلاں کریں گے۔

جس شام منّا اداس کو سرِ عام ہزاروں لوگوں کے سامنے گانا تھا اس شام شہر کے سنٹرل پارک میں ایک بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا جس کو چاروں طرف سے بجلی کے رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا پورا پارک ہزاروں آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا جو کہ مشہور موسیقار کے دیدار کو آئے تھے۔ اتنے آدمی ایک ساتھ دیکھ کر مُنّا اداس کی سٹی اور پٹی دونوں ہی گم ہو گئی تھیں ان کا گلا بار بار سوکھ رہا تھا اور زبان تالو سے چپکی جا رہی تھی وہ بار بار اپنے چمچوں سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ گانا نہیں گا سکتے لیکن ان کے چمچے تھے کہ ان کی ہمت بڑھاتے نہیں تھک رہے تھے ایک کہہ رہا تھا اُداس جی ہمت سے کام لیجئے نروس مت ہوئیے گا آج اپنی آواز کے بل پر ہزاروں کی جنتا کو لوٹ پوٹ کر دیجئے گا" دوسرا کہہ رہا تھا "منّا جی بس ایک بار صرف ایک بار اسٹیج پر آ کر جلوہ افروز ہو جائیے ہم نے میوزک ڈائرکٹر صاحب کو ٹھیک مائک کی سیدھ میں بٹھایا ہوا ہے ان کی نظر آپ پر پڑے بنا رہ ہی نہیں سکتی ہے۔ بس ایک بار آپ اسٹیج پر پہنچ تو جائیے پھر دیکھئے، صبح ہونے تک آپ کیسے مشہور ہوتے ہیں" تیسرا کہہ رہا تھا "مُنّا اداس جی ہم نے اخبار والوں کو کھلا پلا کر بالکل ٹُن کر دیا ہے کچھ نے تو آج کے جلسے کی کامیابی کی رپورٹ بھی اخباروں میں بھیج دی ہے اپنی خاطر نہیں تو ان کی روزی روٹی کی خاطر آپ کو اسٹیج پر آنا ہی ہو گا۔

آخر کار جنتا اور چمچوں کے بے حد اصرار پر وہ آئے وہ جیسے ہی اسٹیج پر آئے پبلک نے روایت کے مطابق زور دار شور شرابے کے بیچ تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا اپنا اس قدر والہانہ استقبال ہوتا دیکھ ان کی باقی بچی گھگھی بھی بند گئی اور اب حالت یہ تھی کہ جنتا ان سے گانے پر اصرار کر رہی تھی اور ان کے منہ سے آواز تھی کہ چھوٹ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

ایکا یک جانے کیا ہوا کہ وہ بڑے زور آ آ آ کر کے چیخنے اور اسٹیج پر اچھل کود مچانے لگے۔ (قارئین کو یہاں ایک بات بتاتے چلیں کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب ملک میں میوزک کی جگہ ڈسکو نیا نیا آ ہی رہا تھا اب حالت یہ تھی کہ پبلک خوشی میں چیخ چیخ کر ڈسکو مور مُنّا اداس کے نعرے لگا رہی تھی اور مُنّا اداس گلے سے قسم قسم کی آوازیں نکال نکال کر

اسٹیج پر دھماچوکڑی مچا رہے تھے یہ پروگرام کوئی پندرہ ایک منٹ تک چلا اس کے بعد مُنّا اداس اسٹیج سے کود کر نیچے آرہے لیکن تالیاں کوئی آدھا گھنٹے تک بجتیں مبارک باد دینے والوں کا تانتا سا بندھ گیا ہر کوئی آکر کہہ رہا تھا "منّا اداس آپ نے تو واقعی کمال کر دیا اتنا اچھا ڈسکو گانا اور ڈسکو ڈانس آخر آپ نے سیکھا کہاں سے اور منّا اداس آگ بگولہ ہوکر پوچھ رہے تھے "ارے خاک ڈالو اس موٹے ڈسکو پھسکو پر پہلے یہ بتلاؤ میری پینٹ میں چوہا کس نے گھسیڑا تھا:"

لیکن اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا تھا مشہور فلمی موسیقار منّا اداس سے ایک سال تک صرف اپنی فلموں میں ہی گانے کا کانٹریکٹ کر گئے تھے اخبار والوں نے انھیں اس صدی کا عظیم الشان ڈسکو سنگر کم ڈانسر کی پدوی سے نواز دیا تھا جنتا نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھلا لیا تھا۔

آج منّا اداس دیش کے مشہور ڈسکو سنگر ہیں ان کے کیسٹ ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں ان کے گانوں میں موجودہ دور کی ہر چیز ہوتی ہے جیسے شور شرابہ دھاڑ اگر نہیں ہوتی ہے تو شاعری اور موسیقی جیسی دقیانوسی چیزیں ان کے گائے ہوئے گانوں کے بول خود ان کو ہی معلوم نہیں ہوتے کیوں کہ آج بھی جب وہ گانے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی پینٹ میں ایک چوہا چھوڑ دیا جاتا ہے! ■■

پچھلے سال کی سرگزشت

رشید عبدالسمیع جلیل

مارتے تھے شمار کرتے تھے
خوب کھٹمل شکار کرتے تھے

جمع کرتے تھے سب کو ڈھکن میں
اور کھڑکی سے پار کرتے تھے

چھپکلی، چھپکلی سے ڈرتی تھی
دونوں مچھر پہ وار کرتے تھے

باہر اکثر دُھلائی ہوجاتی
گھر میں چیخ و پکار کرتے تھے

رات آتی تھی رت جگوں کے لئے
رت جگے بے قرار کرتے تھے

شب کی دہلیز پر اُجالے کا
صبح تک انتظار کرتے تھے

کوفت کھاتے تھے غصہ پیتے تھے
ہاضمہ خوشگوار کرتے تھے

بھوکے پیاسے نڈھال تھے پھر بھی
ایک دوجے سے پیار کرتے تھے

ہم تھے اُپل میں وہ بُلارم میں
روز آپس میں تار کرتے تھے

مل بھی جاتے اگر سرِ راہے
صرف آنکھیں ہی چار کرتے تھے

مختصر یہ کہ ہم الگ رہ کر
نوجوانی نثار کرتے تھے

ایک شیشہ تھا دل جسے کہئے
اُس کے ٹکڑے ہزار کرتے تھے

سرپھری سے تھا سابقہ پیہم
سرجری بار بار کرتے تھے

دستیاں جب کوئی چرا لیتا
آستیں داغدار کرتے تھے

بدکلامی اگر کوئی کرتا
ہم سکوت اختیار کرتے تھے

اب وہ صورت نہیں رہی باقی
جس پہ کچھ انحصار کرتے تھے

آج لائق نہیں بھروسے کے
جس پہ کل اعتبار کرتے تھے

ہر مہینے کا آخری ہفتہ
نذرِ پروردگار کرتے تھے

قرض جب ہم سے مانگتا کوئی
گفتگو شاندار کرتے تھے

مفلسی نے کیا تھا بے قابو
شاعری بے مہار کرتے تھے

مفت پڑھتے مشاعرے اکثر
پان بیڑی اُدھار کرتے تھے

نظم کہتے تھے پھسپھسی لیکن
سامعیں شاہکار کرتے تھے

پھر نیا سال آگیا ہے جلیل
جس کا ہم انتظار کرتے تھے

عطاء الرحمن طارق
(بمبئی)

غزل

گھر کے لوگوں کو سمجھانا ناممکن
اپنا آنگن چھوڑ کے جانا ناممکن

اندر بچے جیسے تیسے سوئے ہیں
باہر اپنی کھاٹ بچھانا، ناممکن

تم کہتی ہو کیسے اتنی دیر ہوئی؟
شام کو لوکل ٹرین سے آنا ناممکن

آٹا چاول دال بجا ہے فرمائش
چاند ستارے توڑ کے لانا، ناممکن

دنیا بدلی، تم بھی تو بدلو صاحب
نخرے سہنا، ناز اُٹھانا ناممکن

گاؤں سے آیا خط ماں کی بیماری کا
شہر سے کھولی بیچ کے جانا ناممکن

منڈی میں لاکھوں کی ہیرا پھیری ہے
پیار بھرے دو بول کمانا ناممکن

کاغذ کی دھرتی میں بو کر اسکیمیں
خوشحالی کی فصل اُگانا ناممکن

لکھ لو، پڑھ لو، اور سُنا کر خوش ہولو
طارق جی، دیوان چھپانا - ناممکن

یوسف یکتا

خوش آمدید ـــــ ۱۹۸۴ء

ہم تو قائل ہیں میاں جام سفال اچھا ہے
اور وہ کہتے ہیں کہ اسٹیل کا مال اچھا ہے

قحط آئینگے نہ طوفان، نہ آئینگے وبال
"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

بات ملنے کی جو پوچھا تو کہا روز جزا
نہ جواب اچھا ہے یارو نہ سوال اچھا ہے

سامنے ساس سُسر بیچ پچھے ہیں سالی سالے
یہ بچھا رکھا ہے جو آپ نے جال اچھا ہے

سب سے اچھا ہے تو بس اچھا ہے یوسف یکتا
نہ کمال اچھا ہے یارو نہ جمال اچھا ہے

قطعات

خوشامد میں مری کچھ تو اثر دے
دلِ وزرائے اعلیٰ نرم کر دے
الٰہی آرزو میری یہی ہے
کوئی کرسی وزارت کی ادھر دے

عزیز الرحمن
بھاگلپور

تیری تنخواہ سے ہے گھر کا جو چولھا روشن
ان پہ پل کر یہ تجھے دل سے دعا دیتے ہیں
اور کھا کر تیری محنت کی کمائی یہ سب
کیسے ناداں ہیں کہ تجھ کو ہی بھلا دیتے ہیں

محمد برہان حسین
(حیدرآباد)

فن تنقید نگاری میں نئے تجربے

سٹر فومیاں کو لاکھ منع کیا گیا کہ وہ اپنی کتاب کی رسم اجراء پر بے لاگ اور کڑی تنقید کرنے والے نقادوں کو نہ بلائیں چونکہ اس قسم کی تقریب میں تو چن چن کر ایسے لوگوں کو بلایا جاتا ہے جو اگر اپنی تحریروں کے مدّاح نہ ہوں تب بھی کم از کم اپنے کرایہ دار یا قرض دار رہ چکے ہیں۔ ویسے اس قسم کی تقریب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ چونکہ رسم اجراء کیجئے یا مینا بازار لگایئے لوگ اُردو کی کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے۔

ایک اردو کتب فروش نے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے بطور تجربہ دوکان پر ایک خوب صورت سیلز گرل کو ملازم رکھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ دوکان پر ہجوم رہنے لگا گو کتابیں کم بکیں لیکن لڑکی کی شادی ہوگئی۔

سٹر فومیاں ضدی انسان ٹھیرے حالانکہ کالج میں ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب ایک تقریری مقابلہ میں انھوں نے دھواں دھار تقریر کی تھی۔ لیکن پہلا انعام ایک نرم و نازک لڑکی کو ملا تھا جس نے UNO کے موضوع پر کچھ اس قسم کی تقریر کی تھی۔

" جناب صدر . . . . (شرماکر) اب میں کیا کہوں سر! ۔ سوری سر، اور معزز حاضرین۔ عنوان کافی بکٹ بلکہ چکٹ ہے۔ ایک عام ہندوستانی عورت UNO کے بارے میں کم ہی جانتی ہے۔ عورتیں ویسے بھی ہمیشہ چیز کا استعمال جانتی ہیں۔ کبھی اس کے بنانے والے کے نام پر توجہ کم ہی کرتی ہیں۔ پھر اس کمپنی کے ٹیپ ریکارڈر ابھی پاپلر نہیں ہوئے جاپانی کمپنیوں "سانیو" ، "پیاناسونک" ، "شارپ" وغیرہ کے الکٹرانک آلات عام ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر "UNO" جو شاید انگلش کمپنی ہے کے آلات اچھے ہوں گے تو ضرور پاپلر ہوں گے۔ اور لوگ عرب ملکوں سے ضرور ہندوستان لائیں گے۔

اب سٹر فومیاں کی باری آئی تو UNO کی پیدائش سے لے کر ساری عمر کی کہانی سنا چکے اور پیش گوئی بھی کر دی کہ بہت جلد UNO کی موت امریکہ کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ جوش میں اور بہت کچھ کہنے والے تھے کہ سامنے میز پر

رکھی ٹرو فی پر ان کی نظر پڑی تو اس پر اس لڑکی کا نام پہلے ہی سے کندہ کیا ہوا تھا۔

اس حادثہ کے بعد پورے بیس سال تک شرفو میاں مغموم رہے۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے چونکہ ایک بار وہ بجلی کے تاروں سے لپٹے تو بجلی فیل تھی۔ ٹرین کے نیچے گرے تو ٹرین ایک گھنٹہ پہلے ہی پٹریوں سے اتر گئی تھی۔ لاری کے نیچے گرے تو، لاری کا دوسری طرف کا پہیہ ایک گڑھے میں اتر گیا اور اس طرف کا پہیہ صاف ہوا میں معلق ہو گیا جس کے نیچے شرفو میاں آرام سے لیٹے رہے۔

"رسم اجراء ــــ آجکل تماشہ سے کم نہیں رہی۔ ایک و حب نے اپنی کتاب کی رسم اجراء کا اشتہار یوں دیا تھا"مشہور جادوگر اے کے بیٹولا کے جادو کے کرشمے مفت دیکھیے، قمر بانو بمقابلہ جینو قوال اور ساتھ میں مشہور و معروف مزاح نگار . . . . . . کی کتاب کی رسم اجراء بھی ہوگی۔ اشتہار دیکھ کر ایک منچلے نے کہا تھا" واہ روٹی کے ساتھ دال فری ہے یار"۔ اور محفل میں لوگ جادوگر اور قوالوں سے ملنے ایسے ٹوٹ پڑے کہ مصنف کو اپنی "... ں کے ڈھیر پر اوندھا گر کر کتابوں کو ایسے بچانا پڑا جیسے بارش سے بچانے کیلئے فٹ پاتھ کے بیوپاری اپنے مال پر اوندھے لیٹ جاتے ہیں۔

ایک خاتون مصنفہ کی کتاب کی رسم اجراء میں ایک دل جلے صاحب تقریر کر رہے تھے "حضرات! تسنیم بانو کو جو آج کی کتاب کی مصنفہ ہیں، میں نے پہلی بار دیکھا تو یوں لگا جیسے ہائے دل پہلو سے نکلا جائے۔ آنکھیں جیسے اوٹی کی نیلی جھیل، بال لمبے جیسے کیوڑا بن، ناک جیسے ادھورا ئیل، قد و قامت ایسی جیسے آ بیل مجھے مار، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہیں تو میں نے کہا تو کیا شادی کو گھر پر رکھ کر باہر نکلتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد شوہر سے ملاقات ہوئی تو کہنا پڑا۔ بندہ پرور اگر آپ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ سر کے بال گویا سر سے کہہ رہے ہیں" بندہ پرور اب اجازت دیجئے۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا" ویسے بھی مجھے شوہر لوگ اچھے نہیں لگتے۔

ایک دن وہ کالج کی راہداری میں چند کتابیں سنبھالے جا رہی تھیں، میں نے پوچھا، تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے، ان سے سب سے اوپر کی کتاب جو، کوک شاستر تھی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کون سی کتاب ہے، تو وہ ہڑبڑا گئیں جیسے زبان حال سے کہہ رہی ہوں،

کوئی پوچھے جو یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس گڑبڑ میں کوک شاستر زمین پر گر گئی۔ میں نے (جو مبہوت ہو چکا تھا) پوچھا " ارے یہ کیسے گر گئی؟ "
تو شاعرہ نے ناز سے گویا شہزادہ سلیم یا مہر النساء کا واقعہ دہراتے ہوئے۔ ایک اور کتاب گرا کر کہا" یوں ہی اسی طرح"

شرفو میاں نے کہا" نہیں صاحب ہمیں اپنی کتاب کی بے جا تعریفیں کرنے والوں کی محفل نہیں سجانی ہے۔ ہم تو بے لاگ نقادوں کو بلائیں گے ... کتاب کی رسم اجراء اپنے اسکول کے زمانے کے استاد سے کروائیں گے۔

جو مجھے نالائق سمجھتے تھے میں انہیں بتادوں گا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

ان نقادوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے برسوں سے نہ تو کسی سے بات کی تھی اور نہ کوئی کتاب پڑھی تھی صرف اس خیال سے کہ کہیں زبان خراب نہ ہو جائے چنانچہ ان کی زبانیں اس قدر سخت ہو گئی تھیں کہ بات کرنے سے پہلے ایک گھنٹہ پانی میں بھگو لیتے تھے۔

شرفو میاں اپنے مضامین اخباروں اور رسائل کو بھیجتے تھے اور وہ گنبد کی آواز کی طرح پلٹ کر ان تک فوراً آجاتے تھے۔ اس طرح ایسے کئی مضامین کا ذخیرہ ان کے پاس ہو گیا تھا جو اس قدر طبع زاد تھے کہ ایڈیٹروں نے انہیں لفافے سے نکالے بغیر لوٹا دیا تھا۔ ان ناگفتہ مضامین کو شرفو میاں نے ایک کتاب میں جمع کر کے چھاپ دیا تھا۔ کتابیں چھپ کر آگئیں تو انہوں نے کھانے کی میز پر اس طرح جا دیا گویا شام تک ساری بک کر رات کے کھانے تک میز خالی ہو جائے گی۔ دوستوں نے رائے بھی دی کہ پہلے ایک لوہے کی مضبوط الماری خرید لو، اس پر ان الماری تا قیامت پائیدار لکھائیے۔ ایک دوست نے تو ایسی کیڑے مار دوائیں بھجوائیں جو میموں کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

یہاں تک تو معاملہ اپنے ہاتھ میں تھا کہ آپ کو اگر کتاب چھپوانے کا شوق ہے تو صاحب! ضرور چھپوائیے دل چاہے تو سیکل لے کر کتابوں کے ساتھ گلی کوچوں میں نکل جائیے اور گھروں کی کھڑکیوں، دروازوں کی درازوں میں سے کتابیں پھینکیے اور اس سے پہلے کہ اہل خانہ یہ دیکھنے کے لیے دوڑیں کہ خود مصنف کتاب پھینک کر فرار ہو رہا ہے بازو کی گلی میں مڑ جائیے۔

شرفو میاں نے رسم اجرا بھی ضروری سمجھی اور اس میں ایسے بے لاگ اور خطرناک قسم کے نقادوں کو مدعو کیا کہ تقریب رسم اجراء، جلسۂ تہنیت کی بجائے کردار کشی فورم بن گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ شرفو میاں جیسا بدصورت انسان اور کوئی نہیں لیکن صورت کا بدل خوب سیرت میں موجود ہے

دوسرے نے کہا شرفو میاں کی عادت ہے کہ ہر شخص کی اس کے پیچھے برائی کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ شرفو میاں کبھی پیسے لے کر واپس نہیں کرتے۔ کسی نے کہا وہ بوالہوس ہیں۔ جب ان کا کردار اچھی طرح بلکہ بری طرح نشانہ بن چکا تب کہیں سب کا دل ٹھنڈا ہوا جب شرفو میاں نے ٹھنڈے مشروب سے تواضع کی۔

ایک تنقید نگار نے یوں کہا " اس کتاب میں مصنف کے خاندانی مفلسی کے قصے، جوانی کی بے راہ روی، اور پختہ عمر میں طبیبوں سے علاج معالجے کے حالات درج ہوں گے۔ میں نے نہ مصنف کو دیکھا ہے اور

ہی کتاب کو جو بے لاگ تنقید کا حرفِ اول ہے۔ خدا بخشے دادا مرحوم کو صبح اٹھتے ہی کچھ یوں گویا ہوتے، لاحول ولاقوۃ وہ بھی کوئی انسان ہے داماد کا مال چراتا ہے۔ بیٹی کو نصیحت کرتا ہے کہ شوہر کی جیب سے پیسے اڑا کر میرے پاس بھجوا دو۔ لڑکی کے زیور میں سے سونا اور پتھر نکال لیتا ہے۔

سننے والا سوال کرتا "آپ یہ کس کے بارے میں فرما رہے ہیں؟"

وہ کہتے: "وہی نابکار جو مجھے ابھی تک ملا نہیں۔"

وہ تنقید کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ کسی شخص کی کتاب پر تنقید کرنا ہوتا اور اگر اس شخص کے دادا نے پہلی جماعت میں وہی کتاب پڑھی تھی جو ان کے دادا نے بھی پڑھی تھی تو وہ تنقید سے یہ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیتے کہ مبادا مروت آڑے نہ آجائے۔

یہ تو دادا مرحوم کا حال تھا۔ خود حقیر فقیر کو بھی قدرت نے عنفوانِ شباب ہی کے زمانے میں نہایت تلخ تجربہ سے دو چار بلکہ کئی درجن کر کے ایک شدید، بے لاگ، خونخوار تنقید نگار بنا دیا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک کتاب بذریعہ ڈاک ، برائے تنقید وصول ہوئی۔ لیکن اس کتاب کی مصنفہ نے اپنی ایک خوب صورت تصویر معہ نام نویسی اس میں رکھ دی۔ بس اسی مصنفہ سے میری شادی ہوئی۔ پھر اس مصنفہ نے میری زندگی میں اس قدر تلخی گھولی کہ میں تلخ ترین تنقید نگار بن گیا۔"

شرفو میاں کی کتاب کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس کے سرورق سے، مضامین سے زیادہ مصنف کا کردار جھلکتا ہے۔ دھندلا دھندلا بے معنی جیسے سورج کبھی نہ طلوع ہونے کے لیے غروب ہو گیا ہو جیسے مصنف کو افلاس نے نگل لیا ہو یا سانپ کے ڈسنے سے رنگ نیلا ہو گیا ہے۔ اگر اس کتاب میں مضامین ہیں تو میری خواہش ہوتی کہ اس میں افسانے ہوتے اور اگر افسانے ہیں تو کاش اس میں ناول ہوتی۔ اور اگر ناول ہی ہے تو مجھے مصنف سے ہمدردی ہے۔ اس لیے کہ ناول لکھنے والوں کو شہرت مرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ ویسے یہ یقینی بات بھی نہیں ہے پھر بھی مر کر دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے نقاد نے جو اس ساری تقریر کے دوران مونچھوں کو اس طرح نوک دار بنا بنا کر شرفو میاں کو دیکھ رہا تھا جیسے بھوکا بھیڑیا بکری کو دیکھتا ہے۔ کہنا شروع کیا۔

حضرات! میں ایک "ٹو۔ اِن۔ وَن" ہوں، میں ایک نقادِ ادب ہوں اور ایک سزا یافتہ معاف کیجیے، تربیت یافتہ قیافہ شناس۔ دراصل یہ دونوں فن صرف مجھ میں یکجا ہوئے ہیں۔ میں شرفو میاں کے بارے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک بڑے مصنف بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ کسی ادبی جرم کے سلسلے میں پہلے شہرت پالیں۔

"شرفو میاں مصنف کا نام عجیب کم اور غریب زیادہ ہے۔"
سامعین میں سے کسی نے پوچھا "اس کے کیا معنی ہوئے۔"
تو نقاد نے حقارت سے جواب دیا "ہم یہاں تنقید کرنے آئے ہیں اُردو پڑھانے نہیں۔"
تو میں کہہ رہا تھا کہ شرفو میاں کا نام شاید اشرف میاں یا شرافت میاں کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ویسے انسان کی بگڑی ہوئی شکل اُردو کا شاعر ہے ہی لیکن ایسے نام رکھنا بڑی لاپرواہی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ چونکہ ضروری نہیں کہ بچہ بڑا ہو کر شریف الشکل اور شریف النفس نکلے اور مجھے خوف ہے یہاں یہی ہوا ہے۔ اے جی گارڈنر نے لکھا ہے کہ بعض لوگ بچہ کا نام "ہورشیو" رکھ دیتے ہیں جو کہ یونان کا زبردست پہلوان و جوانمرد تھا۔ اب اگر وہ بچہ لنگڑا، لولا نکل جائے تو یہ نام اس پر ایک مضحکہ بن جاتا ہے۔
کتاب کے بارے میں صرف یہی کہوں گا کہ اس کی جلد بندی سستی لیکن اچھی ہے۔ رہی اندر کی بات..... اگر اس میں جدید شاعری ہے تو اب یہ قدیم ہو چکی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے لڑکے کو پکارا "جونیئر بیٹے" تو ایک ساڑھے چھ فٹ کا تنگڑا جوان آ کھڑا ہوا" میرا مطلب ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ وقت گزرتے نام بھی بدلنا چاہیے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری کو جدید کی بجائے ناپسندیدہ شاعری، کہہ سکتے ہیں۔ میں مصنف کو صرف اس لیے پسند کرنے لگا ہوں کہ ان کا ظاہر یعنی کتاب اور خود ان کا چہرہ سیاہ ہے اور ان کا باطن بھی سیاہ ہے۔ کبیر داس کہہ گئے ہیں:۔

کاگا ہی بھلا کہ اوپر بھی کالا اور بھیتر بھی کالا

اس کے بعد بزرگ استاد نے رسم اجرا کی انجام دہی کی خاطر کتابیں اٹھائیں اور ایک کتاب لرزتے ہاتھوں سے فرش پر گرا دی۔ یہ دیکھ کر شرفو میاں کے اوسان خطا ہو گئے۔ چونکہ ایک نجومی دوست نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر رسم اجرا کے دوران کتاب گر پڑی تو...... "میں کہنا نہیں چاہتا کہ آپ پر کیا کیا مصیبتیں پڑیں گی۔"
یہ حالات دیکھ کر استاد نے باقی کتابیں ہاتھوں میں تھام کر پوچھا "کیا ہوا؟" تو شرفو میاں نے فوراً کتاب ہاتھ سے لے لی۔ شرفو میاں گھبرا گئے تھے کہ کہیں استاد اس قسم کا نقشہ نہ کھینچ دیں۔

میں نے جو پوچھا استاد یہ کیسا ہوا
ظالم نے ایک کتاب اور گرا کر کہا کہ یوں

استاد نے تقریر یوں فرمائی: "بچو، بچیو! میری ساری ملازمت کا عرصہ امتحانی پرچے آؤٹ کرنے، بچوں کو نقلیں کروانے میں گذرا۔ بچے بغیر محنت کے پاس ہو جائیں۔ یہ میرا زندگی بھر کا مقصد رہا۔ شرفو میاں نے مجھ سے کہا کہ ان کی اسی کتاب میں بھی اسی کی ترکیبیں درج ہیں تو میں اس کی رسم اجرا، انجام دینے پر تنہا بہ تقدیر راضی ہوا۔"

استاد کا یہ کہنا تھا کہ سی۔آئی۔ڈی کے چار افسر اور جوان ڈائس پر جھپٹے اور کتابیں ضبط کرلیں۔ شرفومیاں کو حوالات میں بند کردیا۔ بدنامی ہوگئی کہ وہ بیچے آرٹ کرتے کے جرم میں پکڑے گئے۔ دو دن بعد گھر آئے تو جوش میں بیوی کو "اماں" کہہ کر لپٹ گئے۔ دن چین سے گذرا، رات میں دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ دروازہ کھولا تو دو بڑے بڑے کتے ان سے لپٹ گئے۔ ساتھ پولیس کے جوان تھے معلوم ہوا کہ کتوں کو شرفومیاں میں کسی قتل کے مجرم کی بو آگئی تھی۔۔۔۔

غرض شرفومیاں نہ کتاب لکھتے، نہ رسم اجراء ہوتی یا کم ازکم وہ بے لاگ نقادوں کو بلانے کا شوق نہ کرتے یا پھر استاد سے انہیں اتنی عقیدت نہ ہوتی لیکن شرفومیاں ہی کیا جو کوئی بات مان لیں۔ ▲▲

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	-/۱۵ روپے
فقط	یوسف ناظم	مضامین	-/۸ ″
البتہ	″ ″	″	-/۱۰ ″
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	″	-/۸ ″
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	-/۸ ″
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	-/۵ ″
بالآخر	″ ″	مضامین	-/۱۴ ″
بہرحال	″ ″	″	-/۷ ″
سنی سنائی	لئیق صلاح	″	-/۱۵ ″
خواہ مخواہ	رشید الدین	″	-/۱۰ ″
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	″	-/۱۰ ″
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیار	″	-/۱۲ ″
ضیار حاضر	رؤف خوشتر	″	-/۱۲ ″
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	″	-/۱۵ ″
چنانچہ	مسیح انجم	″	-/۱۲ ″
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	″	-/۱۰ ″
پتے کی بات	″ ″	″	-/۶ ″
گڑبڑ گھٹالہ	پاگل عادل آبادی	مجموعۂ کلام	-/۱۵ ″
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	″	-/۱۲ ″

پاگل عادل آبادی

ڈسکو غزل

گھر سے تھانے دار جی کو رِنگ کرانا یاد ہے
دے کے پولس میں میری آئیلنگ کرانا یاد ہے

محفلِ شعر و سخن میں وہ میری پہلی غزل
اپنے چمچوں سے میری ہوٹنگ کرانا یاد ہے

چند دنوں ہی میں نکل جانا وہ دیوالہ مرا
کر کے شادی رات دن شوٹنگ کرانا یاد ہے

اپنی ہر اک فائل کو ارجنٹ کر دینا پٹ اَپ
میرے ہر اک کام کو پینڈنگ کرانا یاد ہے

عاشقی کی فاسٹ پچ پر کیوں نہ وکٹیں صاف ہوں
جیت کر بھی ٹاس خود، بیاٹنگ کرانا یاد ہے

پیار میں پہلے پہل تالو وہ سہلانا تیرا
تھوبڑی کی بعد میں ویلڈنگ کرانا یاد ہے

دوستوں کے سامنے کرکر کے تعریفیں میری
جانی واکر کی طرح ایکٹنگ کرانا یاد ہے

اُس کے گھر پہلی نظر کا کیا کہوں میں تجربہ
بوریا بستر میرا پیاکنگ کرانا یاد ہے

دلبری کے نام پر بھی عاشقوں کو بن ٹکٹ
وہ تیرا برسوں انھیں شنٹنگ کرانا یاد ہے

میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھ کو ہولا جان کر
نام پر اپنے میری بلڈنگ کرانا یاد ہے

یاد ہے پہلے پہل باڑوں میں وہ لانا تیرا
پھر رقیبوں سے میری فائٹنگ کرانا یاد ہے

ڈسکو کی دُھن پر ترا گانا وہ پاگل کی غزل
ناچنے کے نام پر جمپنگ کرانا یاد ہے

غزل

سراج نرملی

وہ بھی کوشش میں ہے لیڈری کے لئے
جو کہ فیمس تھا داداگری کے لئے

رشوتوں کی تو اب یار بھرمار ہے
ہم نے بیچا ہے گھر نوکری کے لئے

نام لکھ دے تو میرا ہی میرے خدا
لاکھ روپئے کی اس لاٹری کے لئے

کون پوچھے گا علم و ہنر کو بھلا
چاہیئے زر یہاں برتری کے لئے

بن پیئے بیئر کی ایک بوتل سراج
موڈ آتا نہیں شاعری کے لئے

. . . . . .

غزلیں

اسمٰعیل ظریف

میرے بھی کاروبار تھے تاجر رہا ہوں میں
اب کاروبار چھوڑ کے شاعر بنا ہوں میں

دادِ سخن کی برف سے اس کو بجھائیے
حرفِ سخن کی آگ میں جلنے لگا ہوں میں

کچھ قافیوں کی مصرعوں کی گردن مروڑ کر
اغیار کا کلام بھی اپنا چکا ہوں میں

اب کیا چھپاؤں آپ سے ماضی میں دوستو
کچھ کارِ جیب کام بھی اکثر کیا ہوں میں

تعلیم میری پوچھ کے کیا لینا ہے تجھے
اکثر نقل ہی مار کے پرچے دیا ہوں میں

منہ چل رہا ہے دانت نہ ہونے سے دوستو
محفل سمجھ رہی ہے کہ کچھ کھا رہا ہوں میں

آرام گھر کا چھوڑ کے ایک واہ کے لئے
پیدل ہی ٹاپتے ہوئے گھر سے چلا ہوں میں

بے کار بڑبڑانے کی عادت نہیں مجھے
جو کچھ بھی عرض کرنا تھا فرما دیا ہوں میں

یہ مسکرا کے داد جو دی آپ نے حضور
ایسی گلابی داد بہت پا چکا ہوں میں

پیشِ نظر سفیدی کو رکھتے ہوئے ظریفؔ
مت پوچھیے شباب میں کیا کیا کیا ہوں میں

بیلنؔ نظام آبادی

دنیا جسے کہتے ہیں مٹی ہے نہ سونا ہے
نقدی ہے تو ہنسنا ہے کڑکی ہے تو رونا ہے

اس شوخ کی مرضی بھی چاٹے کا بگونا ہے
مانگو تو ڈکاشن ہے، مل جائے تو پونا ہے

چمچے تو چرائے ہیں ہوٹل سے کہ کام آئیں
صابن بھی تڑی دے دے، پتلون بھی دھونا ہے

بیگم ہے کہ بے غم ہے، دن رات وہی چرخہ
کھانا ہے پکانا ہے، سینا ہے پرونا ہے

لا جنگ بھی نہیں کوئی، فٹ پاتھ پہ سوئیں گے
کچھ موڈ میں تو بھی ہے، موسم بھی سلونا ہے

بیلنؔ ترے ہاتھوں میں رہتا ہے تو رہنے دے
اب میں نے بھی ٹھانی ہے، ہو جائے جو ہونا ہے

تمنا مظفر پوری

خدا کا شکر ہے

ھمارا ملک ایک غریب ملک ہے اور یہاں بھیک منگوں کی کمی نہیں ورنہ سب سے بڑی دقت خیرات دینے ہوتی کہ زکوٰۃ ، نطرہ اور خیرات کس کو دی جائے یہ بات مجھے شب برات میں اس وقت ذہن میں آئی جب خیرات کی رو اور حلوہ بانٹنے کی نوبت پیش آئی اور مجھے فقیروں اور غریبوں کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ دور گاؤں میں لوگ ہیں اور بڑی مشکل سے انتظام کر کے اُن کے ہاں حصہ بھیجنا پڑا ۔ اتنا ہی نہیں جب مجھے اپنی دینی حیثیت اور آخرت کی بات یا آئی تو فاتحہ پڑھنے اور آخری آرام گاہ دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کے لئے کوئی قبرستان دور پاس میں نہ ملا. قبرستان تک جا سکنے کی حسرت دل میں رہ گئی میں نے سوچا مبارک ہیں وہ لوگ جو قبرستان کے قریب رہتے ہیں بلکہ وہ جو قبرستان میں ہیں. اسی لئے حضرت شادؔ عظیم آبادی مرحوم نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بناء پر کہا تھا ؎

خوشا وہ جو کہ معدوم ہے

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ قبرستان قبرستان کی کیا رٹ لگائے ہوئے ہے۔ تو محترم عرض ہے کہ یہ بہت اہم موت سے کسی آدمی کو کب چھٹکارا ہے. موت تو برحق ہے. پس وہ جگہ یا مقام جہاں قبرستان ہے مبارک ہے بلکہ آبا سے زیادہ بڑا رقبہ اگر قبرستان کا ہے تو اور بھی اچھا ہے. موت کا بالکل خوف نہیں رہتا کیوں کہ مرنے کے بعد دفن کیلئے آسانی سے جگہ میسّر ہوجاتی ہے (اور کاندھا دینے والوں کو بھی سہولت ہوتی ہے) ورنہ بہادر شاہ ظفر کی طرح کوئے یار میں دو گز زمین کی حسرت رہ جائے. اس لئے بہت سے دور اندیش بادشاہ اپنی زندگی میں ہی قبر بنوالیتے تھے کہ مرنے کے بعد دفن کے لئے پریشانی نہ ہو اور مرنے کے بعد محل میں رہنے کا لطف باقی رہے.

ہندوستان میں صنعتی ترقی نے زور پکڑا تو بڑی بڑی فیکٹریاں بنیں. اس کے ساتھ اسٹاف کے لئے رہائشی کا دو دو میل لمبی بنائی گئی اور کہیں کہیں فیکٹری کا کے ساتھ ملحقہ کالونی آٹھ دس میل تک پھیلی ہوتی ہے لہٰذا یہ کالونی قبرستانی آ سے کوسوں دور ہوا کرتی ہے. کالونی میں رہنے والے فیکٹری سے منسلک ہوتے ہیں یعنی سبھی نوکری پیشہ ہونے کی وج

سے باحیثیت اور عزت دار ہوتے۔ اور ایسی ہی کالونی میں مجھے اپنی ملازمت کے سلسلے میں رہنا پڑا جہاں یہ میری پہلی شب برات تھی۔ خیرات دینے اور قبرستان میں چراغاں کرنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اپنے بزرگوں کی قبر پہ جاکر فاتحہ پڑھنا تو دور کی بات تھی۔

شب برات گزر چکی تھی رمضان کا مبارک مہینہ آگیا تھا اور ایک دن میں باتھ روم میں غسل فرما رہا تھا اور میرا چھوٹا بچہ باہر بیٹھا کچھ پڑھ اور کچھ کھیل رہا تھا کہ "اللہ کا فضل ہے"، کی آواز آئی۔ میں چونکا کہ یاالٰہی یہ شاہ صاحب کہاں سے پہنچ گئے اور انہیں میرا کواٹر کیسے معلوم ہوا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے بچے نے پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

"جی! میں شاہ صاحب ہوں"

"کون شاہ، نادر شاہ؟" بچے جسے گاؤں کے رسم ورواج اور لوگوں کے متعلق کوئی علم نہ تھا بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

"نہیں حضور! اکبر شاہ"

"اوہ یعنی مغل اعظم" بچے نے مارے خوشی کے اچھلتے ہوئے کہا ادھر غسل خانے میں میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں اچک کر غسل خانے کے نچلے روشن دان سے باہر کی طرف دیکھنا چاہا کہ آخر یہ کیسے شاہ صاحب ہیں۔ دیکھا تو صاف ستھرے استری کئے ہوئے کرتے اور پائجامے میں ملبوس۔ سر پہ دوپلی ٹوپی اور ہاتھ میں اونٹ کی کل کی طرح ٹیڑھی میڑھی خاندانی چھڑی لئے کھڑے منے کو جواب دے رہے ہیں۔

نہیں بابو! میں شاہ صاحب ہوں، یہ علاقہ میرا ہے"۔

"اچھا!" منے نے کہا۔ "یہ علاقہ آپ کا ہے؟ کیا آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ملک آزاد ہوگیا ہے؟ کسی بادشاہ کا علاقہ نہیں رہا۔"

نہیں بابو! آپ بچے ہیں۔ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ میں فقیر ہوں فقیر، خیرات لینے آیا ہوں"

شاہ صاحب نے بچے کو سمجھایا۔ "آپ کے والد صاحب نے میرے گاؤں کے ایک شخص سے فقیروں اور غریبوں کا ذکر کیا تھا اس نے مجھے بھیجا ہے"۔

غسل خانے سے نکل کر میں نے بیگم کو آواز دی کہ باہر دیکھو ایک شاہ صاحب آئے ہیں اور منے سے مکالمہ چل رہا ہے۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ" اب منا کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ فقیر تو گدڑی پہنے ہوتے ہیں ہاتھ میں بھیک مانگنے کا برتن ہوتا ہے نہ کہ اس طرح آئرن کئے ہوئے کپڑے پہن کر بھیک مانگتے ہیں"۔

"بوا! میں خاندانی شاہ صاحب ہوں"

ادھر بیگم شاہ صاحب کا نام سن کر فوراً باہر نکلیں اور منے کو اس طرح سوال وجواب کرتے دیکھ کر ڈانٹنے لگیں۔

"دیکھو مُنّے سائل سے بحث نہیں کرتے۔ انہیں خیرات لاکر دے دو۔"

مُنّے کو ڈانٹ کر وہ اندر آئیں اور بولیں "خدا کا شکر ہے کہ خیرات لینے والے آگئے اکثر میں سوچا کرتی کہ کسی غریب کو کچھ دوں تو کوئی نہیں ملتا۔" انہوں نے ناشتہ نکالا اور مُنّے کی معرفت بھیج کر خود نقد خیرات لے کر باہر پہنچی۔ اس بار مُنّے تھے مکالمہ چلا تھا اس بار بیگم سے مکالمہ شروع ہوا۔

"شاہ صاحب آپ کہاں رہتے ہیں؟" بیگم نے پوچھا

"بی بی! یہاں سے آٹھ میل دور ایک گاؤں نقیر لویہ ہے۔"

"آپ برابر آئیں گے نا!" بیگم کو ان کے دور کے گاؤں سے اندیشہ ہوا۔

"آنا تو برابر مگر بس کا کرایہ بہت لگتا ہے، شاہ صاحب نے بتایا۔ اگر اس کالونی میں کچھ اور مسلمان ہوں تو آنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"

اسی بلاک میں تو نہیں مگر اس سیکٹر کے دو ایک بلاک میں کچھ لوگ ہیں۔ بیگم نے بتایا۔

"ہاں آپ برابر آئیے کم از کم ہر جمعہ کو ضرور آئیے۔"

"نہیں نیک بی بی، جمعہ کو نہیں جمعرات کو آسکتا ہوں اور وہ بھی ایک جمعرات بیچ کر کے۔"

پھر شاہ صاحب نے کہا۔ "اگر آپ بس کا کرایہ بھی الگ سے دیں گی تو ہر جمعرات کو آنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" بیگم نے کہا۔ "ابھی رمضان کا مہینہ ہے آپ رمضان بھر ہر جمعرات کو آجائیں میں کرایہ بھی دیدوں گی۔"

شاہ صاحب کے جانے کے بعد بیگم خوش خوش آئیں اور کہنے لگیں۔ "شاہ صاحب کے آنے سے خیرات نکالنے میں آسانی ہو ورنہ اکثر میں خواب دیکھ کر خیرات کرنا چاہتی تو مجبور ہو جاتی تھی۔ مُنّے کے دادا مرحوم کی برسی پر کھانا نہیں دے پائی تھی۔ عید آرہی ہے فطرہ، زکوٰۃ وغیرہ نکالنا ہے کتنی دقت ہوتی۔

میں نے کہا۔ "دقت کیا ہوتی، کسی مدرسے یا یتیم خانے کو بذریعہ منی آرڈر بھیج دینا؟"

"وہ تو اور بات ہوتی۔" بیگم نے کہا۔ "اب میں شاہ صاحب کو کہہ دوں گی کہ کچھ غریبوں کو ساتھ لیتے آئیں گے انھیں فطرۂ زکوٰۃ کے پیسے اور کپڑے دیدوں گی۔"

میری بیگم بہت نرم دل اور غریب پرور لہٰذا شاہ صاحب کے آنے سے انہیں واقعی خوشی ہوئی۔ اور حقیقت بھی یہ کہ مذہب اور دین کا ایسے عقائد نہ ہو تو ہم مردوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ یہ کون سا مہینہ ہے اور اس ماہ میں کس کا فاتحہ ہوگا یاد رکھوں۔

بہرحال شاہ صاحب کے آجانے سے مجھے بھی آسانی ہوئی کہ شب برات میں حلوہ روٹی بٹوانے میں جو پریشانی اُٹھانی پڑتی تھی وہ دور ہوگئی۔ شاہ صاحب نے اپنے گاؤں سے غریب لاکر فطرہ اور زکوٰۃ کے تقسیم کا مسئلہ حل کر دیا۔ سبھوں کو بیگم نے گیہوں نقد اور نئے و پرانے کپڑے دے کر چلائے جس کی نظامت شاہ صاحب کر رہے تھے۔

صنعتی ترقی سے جہاں روزگار کا مسئلہ حل ہوا ہے وہاں ایک مسئلہ یہ بھی آگیا ہے کہ لوگوں کو ملازمت کے سلسلے
ھر اور آبائی وطن سے دور جا کر رہنا پڑتا ہے۔ دقت ضرورت رشتے ناطے کا کوئی نہیں ملتا۔ پاس پڑوس کے لوگ خود
مصروف رہتے ہیں برابر کسی کی کیسے مدد کر سکتے ہیں۔ سبھی تو پردیس میں اکیلے ہوتے ہیں اور بیوی بچے ساتھ رکھنے والوں
ے دن ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہی ہوا۔ بیگم امید سے تھیں ان سے گھر کا کام نہیں ہو رہا تھا گھر سے آدمی بلوانا مشکل
آخر بیگم کے بار بار کہنے اور ان کی حالت دیکھ کر ایک دن میں نے اپنے اہی کرم فرما کو جنھوں نے شاہ صاحب کو بھیجا تھا مدعا
کہا کہ کوئی غریب لڑکا یا لڑکی یا کوئی غریب عورت کا انتظام کر دیں جو گھریلو کام سنبھال سکے ولادت کے بعد اگر وہ جانا چاہے
ہے گی ورنہ چلی جائے گی۔ بار بار میری یاددہانی کے اِن کرم فرما نے ایک دن فرمایا "گاؤں کے لوگ کالونی میں آکر کام کرنا
عزتی سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگ اتنا گر گئے ہیں کہ برتن دھوئیں گے اور دوسروں کے گھر میں جھاڑو لگائیں گے۔
میں نے کہا۔ "بھائی میرے اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے یہ تو محنت مزدوری ہے وہ کام کریں گی اور اُجرت
گی" انھوں نے جواب دیا نہیں بھائی میں نے کتنا کہا مگر کوئی تیار نہیں ہوا بلکہ گاؤں والے خود مجھ سے ناراض ہو گئے۔
نے کہا۔ "کیسے لوگ ہیں کم از کم مدد کے خیال سے آجاتے میں ان کی عزت بھی کرتا اور احسان مند بھی رہتا۔"
میرے کرم فرما کی بات کسی نے نہ مانی البتہ وہ خود اپنی اہلیہ کو ایک ماہ کے لئے لاکر رکھ گئے اور میں نے انہیں بھی اپنے ساتھ
لیا کہ ان کی اہلیہ کو اپنا پن محسوس ہو اور غیر جگہ سمجھ کر کام کرنے میں جھجھک محسوس نہ کریں۔ پھر میں نے چھٹی لے کر بیگم کو اپنے
وطن پہنچا آیا۔

رمضان المبارک کا مہینہ قریب تھا روزہ رکھنے میں پریشانی ہوتی کیوں کہ فیکٹری میں ڈیوٹی کا وقت (شفٹ) ہر ہفتہ
رہتا ہے لہذا مکان جا کر بیگم اور بچوں کو لے آیا۔ اس بار بیگم اپنے میکے سے ایک چھوٹی لڑکی بھی ساتھ لیتے آئی تھیں کہ
بچے کی دیکھ بھال اور کام دھام میں آسانی ہوگی۔ بیگم کے آنے کی خبر شاہ صاحب کو ہوگئی اور وہ "اللہ کا فضل" کا نعرہ
تے ہوئے نازل ہو گئے۔ بیگم کے غائبانے میں چونکہ میں فیکٹری چلا جاتا تھا اور شاہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوتی تھی
اُنہوں نے آنا بند کر دیا تھا۔ لیکن بیگم کے آنے کی خبر وہ لیتے رہے کیونکہ اُن کو ایک معقول آمدنی ہر جمعرات کو مل جایا کرتی تھی
اتھ ہی اس بہانے شہر کی تفریح بھی کر لیتے تھے۔

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو چکا تھا شاہ صاحب ہر جمعرات کو انطار، کھانا، سحری اور نقد لے جاتے
ے۔ پھر عید کے موقع پہ فطرہ اور زکوٰۃ دینے کا مسئلہ بھی تھا لہذا شاہ صاحب کو کہہ دیا گیا کہ کچھ غریب کو ساتھ لائیں گے لیکن اس بار
ہ بڑا سنگین نکلا۔ پچھلی بار عید میں کل بیس پچیس فقرا آئے تھے ان لوگوں کو بیگم نے کافی سامان دیا تھا لہذا اسکی شہرت سے اس بار آخر
ان ہوتے ہی ہر روز بیس پچیس عورتیں اور بچے غریب نادار بن کر آنے لگے۔ بیگم اس طرح لوگوں کو آتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔
" آپ نے کہا تھا کہ اس گاؤں میں غریب نہیں ہیں اسلئے دوسروں کے یہاں کام کرنا بے عزتی سمجھتے ہیں لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ میں نے
زکوٰۃ اور فطرہ نکالا ہے وہ ختم ہو چلا لیکن غریبوں اور بھیک منگوں کی کمی نہیں ہو رہی ہے۔" میں بیگم کو اس بات کا کیا جواب دیتا صرف اتنا کہا۔
"خدا کا شکر ہے"۔

رؤف خوشتر
(بیدر)

بیت الضعفاء

وحشت، عدم تحفظ، اضطراب، تشویش اور شکست و ریخت (شکست و ریخت کی اصطلاح صرف جدیدیت میں رائج ہے) کے ملے جلے جذبات و احساسات سے ان دنوں ہم گزر رہے ہیں۔ جی نہیں اس سے آپ یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ ہم جدید ادب کا شدت سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہماری خوش دامن صاحبہ کے خیریت نامہ سے ہماری خیریت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اب کے ان کا مستقل طور پر رہنے کا ارادہ ہے۔ بیگم خوش ہو کر "یہ زندگی کتنی حسین ہے" کا نغمہ گنگنا رہی ہیں اور ادھر ہم اس آمد کو ٹالنے کی تدبیریں سوچتے ہوئے گنگنا رہے ہیں کہ

عمر جلوؤں میں بسر ہو یہ ضروری تو نہیں

آخر کوئی آتش فشاں پہاڑ کے سامنے کیسے رہ سکتا ہے۔ ہمیں جاپانیوں کی جرأت مندی اور قوت برداشت پر رشک آیا لیکن اُن آتش فشاں پہاڑوں کی شعلہ روانی کا قبل از وقت علم ہو جاتا ہے اور بچنے کی مہلت ملتی ہے۔ لیکن ہمارے کوہ آتش فشاں کی شعلہ بیانی اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ بچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ پھر صاحب اگر ہم بھی اتنے ہی جرأت مند واقع ہوں تو ہم میں اور جاپانیوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ بہرکیف ہم خوش دامن کی اس پُر خطر آمد کو ٹالنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ پھر ایسے میں اپنے دائمی کرم فرما لوم الدولہ کی یاد کیسے نہ آتی؟ دائمی کرم فرما اس لئے کہ ہم ازدواجی بندھن میں جکڑنے کا پورا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔ ان کے حضور میں پیش ہوئے۔ تفصیل سُن کر کہنے لگے۔

" اماں یار، یہ کون سا مشکل کام ہے۔ تم نے شاید سُنا نہیں؟ اور سنتے بھی کیسے۔ شادی سے پہلے سمیع عالم تھے اور شادی کے بعد سمیع خانم ہو گئے ہو۔ تمہاری سماعت پر بیوی اور بصیرت پر ٹی وی کا مکمل قبضہ ہو گیا ہے۔

ہم نے کہا "بیوی کی باتیں اور ٹی۔ وی کی ساعتیں اصل میں دونوں ایک ہیں اور موت سے پہلے آدمی ان سے بچا جائے کیوں"؟

شاعری چھوڑو اور سنو کچھ مہربان نے نوجوانوں پر ترس کھا کر بیت الضعفاء کھول رکھا ہے جہاں معقول،

پر اب ہم اپنے بوڑھے بوڑھیوں کو رکھ کر مکانوں میں وقتاً فوقتاً وقوع پذیر ہونے والے زلزلوں سے نجات پاسکتے ہیں۔ چلو تمہیں وہاں لئے چلتے ہیں"۔

داماد کو اور کیا چاہیئے۔ لہذا ہم لوم الدولہ کے ہمراہ بیت الضعفاء پہنچے۔ معتمد نے محاذ سے لوٹے ہوئے گھائل سپاہی کی طرح ہمیں گلے لگا کر دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا" برخوردار، تمہارا غم اب ہمارا غم ہوگیا۔ تمہاری آنے والی بلا کو ہم ٹال اور پال سکتے ہیں۔ بیت الضعفاء اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ اپنے ان رشتہ داروں کو جن سے آپ کی بنتی نہیں ہے، ہفتوں یا مہینوں ہمارے یہاں رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے اُن کے قیام و طعام کا ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ آپ سے کنارہ کشی اور آپ خوشیوں سے ہم کنار ہوں گے۔ ہم نے اس اقامت گاہ کو زنانہ و مردانہ حصّہ میں بانٹ دیا ہے۔ مردانہ حصہ میں بوڑھے سیاستدانوں کے لئے حاضرین، پُرانے اداکاروں کے لئے ناقدین اور ضعیف شعراء کے لئے سامعین کا خاص انتظام ہے۔ ایک بڑے ہال میں ڈھیر سارے اخبارات رکھے گئے ہیں۔ جہاں ضعیف حضرات اُن پر ٹوٹ کر حرف حرف چاٹ جائیں گے اس طرح نوجوانوں کے دماغ محفوظ رہیں گے۔

چغلی یہاں کی خاص ڈش ہوگی۔ غیبت، الزام تراشی، دروغ گوئی، لن ترانی نوجوانوں کو کوسنے اور گالیاں دینے جیسے اِنڈور گیمس بلاناغہ منعقد ہوں گے۔ وہ اپنے دلوں کا غبار ہمارے یہاں بے موقع و محل نکال سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کے مکانات اُن کی بوجھل نصیحتوں کے غبار سے پاک ہوں گے۔

خواتین کے حلقہ میں ایک سسکتا ہوا ہال ہوگا جہاں بوڑھیوں کے ہاتھوں میں ایک ایک گھڑا دیا جائے گا تاکہ وہ دنیا بھر کا رونا روتے ہوئے گھڑا بھریں۔ بہاری گونگی اور بہری خواتین کا اسٹاف اُن کی بہو کا رول ادا کرے گا جن کو وہ کوس کوس کر خوش ہو جائیں گی ہمارے پاس ہمہ وقتی نگہداشت کا شعبہ بھی ہوگا جس میں چالاک اور جھگڑالو خوش دامنوں کو رکھا جا سکتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اس فلاحی ادارے سے کتنے ہی خاندان اُجڑنے سے بچ جائیں گے۔ گھریلو جھگڑے، رنجش مقدمہ بازی اور طلاق جیسی وارداتیں اب نہیں ہوں گی۔ ازدواجی زندگی خوش و خرم بسر ہوگی۔

بوڑھے سیاستدانوں کی ہمارے یہاں شرکت سے ملک کی کایا پلٹ ہوگی۔ ہمارے بوڑھے سماج کو نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ بوڑھوں کو یک گونہ بے خودی دن رات چاہیئے۔ اور یہ بے خودی انہیں یقیناً ہمارے ادارے میں میسر ہوگی"

معتمد بیت الضعفاء کے بوڑھوں کے متعلق اِن جواں خیالات سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ایک دوسری دائمی تشویش دور کرنے کے لئے پوچھا۔

"آپ مظلوم و مجبور شوہروں کے لئے بھی کچھ کیجئے"۔ معتمد نے دلاسہ دلاتے ہوئے کہا۔

"اُن کے لئے بہت جلد بیت الاماں کھول رہا ہوں"۔۔۔۔ اُن کے اس جواب سے خود کو محفوظ محسوس کر کے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ اُمید ہے آپ بھی اِن کے اِرادوں سے ہماری طرح خوش ہوں گے۔ ■■

سرپٹ حیدرآبادی

ٹکس !

لیتا ہے حسن، اہلِ وفا سے وفا کا ٹکس عشاق پر ہے یہ ستم ناروا کا ٹکس
ہے ٹکس بزمِ اہلِ سخن، صدرِ بزم پر اور شاعروں پہ لاگو ہے ان کی صدا کا ٹکس
کھل بل مچی ہوئی ہے حسینوں کی بزم میں عائد ہوا ہے حسن پہ ناز و ادا کا ٹکس
وہ ہوں گے ملتفت جو کبھی میرے حال پر مجھ پر لگایا جائے گا آہِ رسا کا ٹکس
بھٹکا کے رہرؤں کو شب و روز راہ سے گم کردہ راہ دیتے ہیں، ہر نقشِ پا کا ٹکس
چھاتی ہے جب وبا کوئی روئے زمین پر مخلوق ساری دیتی ہے، قہرِ خدا کا ٹکس
ان کے غلط علاج نے لی، سینکڑوں کی جان دیں گے طبیب حشر میں اپنی دوا کا ٹکس
ساقی نے میکدے میں یہ اعلان کر دیا ہر بادہ کش ادا کرے کالی گھٹا کا ٹکس
مقصد برآری کے لئے وہ جان سے گیا یعنی کہ مدّعی نے دیا مدّعا کا ٹکس
ہو ختم بندگی، کسی عنواں بپا ہو حشر کب تک ادا کرے گی خدائی خدا کا ٹکس

جس اصطبل کا جو ہے، وہ ہے اس کا ذمہ دار
سرپٹ کے ذمّے ریس کی آب و ہوا کا ٹکس

شہزاد معصومی

ایک لندن رٹرن لکچرر

لندن سے لیکے آئے سند ایک لکچرر کیا کیا نہ تھا جناب کا اندازِ کرّ و فر
ہر دم دماغ رہتا تھا چھینکے پہ عرش کے بھولے سے بھی نہ پاؤں وہ رکھتے زمین پر
اک شانِ بے نیازی سے آتے کلاس میں لڑکوں پہ صرف ڈالتے ترچھی سی اک نظر
لڑکوں نے دیکھا آپ کو جب یوں لئے دیئے گھسنے لگے وہ جوتوں کو اپنے زمین پر
آنکھیں نکال کر انھیں دیکھا جناب نے لیکن ہوا کلاس پہ اس کا نہ کچھ اثر
بولے ڈِزَرْو[1] تم نہیں کرتے مرا کلاس تڑ سے ملا جواب، پڑھاتے ہیں اپنا سر
یوں مِنمنا کے آپ پڑھاتے ہیں کورس تک جیسے زکام کا ہو اثر حلق و ناک پر
انگریز جب پڑھائے تو ہر لفظ صاف ہو لیکن تلفّظ آپ کا گنجلک ہے سر بہ سر
انگلش پڑھانا آپ کو آتا نہیں ہے خود اور الٹا ہم پہ رنگ جماتے ہیں اس قدر
یہ کہہ کے لڑکے سب نکل آئے کلاس سے الّو کی طرح رہ گیا تنہا وہ لکچرر

---

1 Deserve

شکیل رضا بنگلوری

بکرے کی تلاش میں۔۔۔!

دفتر کے بعد اب تو بس ہمیں ایک ہی کام رہ گیا ہے، جسے ہم باقاعدہ سرانجام دیتے ہے ہیں۔ وہ ہے بکرے کو صحیح معنوں میں بکرا بنانا، اس شوق میں ہم کبھی کبھی اپنے سینئر رول کو بکرا بنا کر دفتر سے گول ہوجاتے ہیں۔ مگر کبھی اپنے بکرے کو گول ہونے نہیں یتے، کیونکہ بکرا تو آخر بکرا ہی ہوتا ہے جسے اگر وقت پر چارہ نہ ڈالا جائے تو بے چارہ صرف خود ہی گول ہوگا بلکہ اپنے مالک کو بھی گول کر جائے گا۔ لہذا ہم حسب معمول دفتر ، دو گھنٹے قبل نکلے اور قریبی میدان میں کھڑے سرکاری پیڑ سے نیم کی شاخیں توڑ کر مخملی گھاس تھیلے میں بھر کر گھر کی جانب چل پڑے تھے!

گائے جب گھاس کھاتی ہے تو اس سے ہمیں دودھ حاصل ہوتا ہے، جس کی قیمت ھتے بڑھتے آج فی لیٹر چار روپے تک پہنچ کر مزید آگے بڑھنے کے لیے پر تول رہی ہے، ے اگر گھاس کی بجائے سونے کے دانے کھاتی تو پتہ نہیں آج دودھ کی قیمت کیا ہوتی! سکتا تھا گائے کے دودھ کی قیمت "ماں کے دودھ" سے بھی دُگنی ہوجاتی!! اسی لئے ہم نے بکرے کی قیمت بڑھانے کے خیال سے کبن پارک اور لال باغ کا گھاس کھلاتے تھے اور بلائیات سے محفوظ رکھنے کے لیے نیم کی شاخیں بھی کھلا دیا کرتے تھے۔ کیونکہ نیم کے پیڑ پر روحوں کا سایہ نہیں ہوتا۔

اور جب ہم گھر پر قدم رنجہ ہوئے تو بیگم صاحبہ کو اپنا منتظر پایا اور انہیں زار و قطار و بہاتے دیکھ کر ہمارا کلیجہ موہنہ کو آنے لگا، ہمارا کلیجہ موہنہ کو اس لئے آنے لگا تھا کہ صاحبہ نہ صرف ہمارے درجن بھر بچوں کی ماں تھیں، بلکہ وہ ہمارے بُرے دنوں کی ساتھی

اور سرد تنہائیوں کی رفیق گرم بھی تھیں جو ہمیں اپنی رگ جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ کلیجہ جب کچھ زیادہ ہی مونہہ کو آگیا تو ہم نے اس کی لگام کھینچی اور بیگم صاحبہ کو کلیجے سے لگاتے ہوئے، آنسو بہانے کا بہانہ دریافت کیا تو کہنے لگیں۔ "جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے! اِدھر ہمارا دل غم نمبر بارہ سے پھٹا جا رہا ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے"!

ہم نے پوچھا۔ "یہ آنسو کیوں بہائے جا رہے ہیں۔ تمہارے آنسوؤں کی دھار سے ہمارا دل اور جگر کٹا جا رہا ہے! نصیب دشمنان ہمارے بکرے صاحب تو خیریت سے ہیں نا.... !!"

دیکھو جی.... ! آج ہم کہے دیتے ہیں، اس موے بکرے کا نام ہمارے سامنے مت لیو۔ آپ کا بکرا جائے بھاڑ میں، پہلے آپ جاکر تو اپنے مُنّے میاں کو ڈھونڈو! شام ہونے کو آئی ابھی تک گھر نہیں لوٹے!

اور ہمارا بکرا ــــ ؟

وہ بھی صبح سے غائب ہے!

ہم اپنا سر تھام کر رہ گئے۔ ورنہ چکرا کر گر پڑتے! ارے.... ارے بیگم، کیوں آپ ہمارے بکرے کی دشمن ہوئی جا رہی ہیں۔ آپ دیکھتی نہیں۔ چند دنوں میں بکرا ہم سے کس قدر گھل مل گیا ہے! آپ کے مُنّے میاں اگر گھر نہیں لوٹے ہیں تو آپ بخدا پریشان نہ ہوں! وہ ضرور آجائیں گے۔ یہیں کہیں اپنے یار دوستوں کے ہمراہ کھیلتے ہوں گے اور اگر وہ نہیں لوٹ سکے تو آپ قطعی فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس مُنّوں کی کیا کمی ہے، ایک چھوڑ گیارہ پڑے ہیں!! مگر ہم اپنے بکرے کا کیا کریں۔ وہ ایک ہی تو تھا ہمارا بکرا! پتہ نہیں کہاں کس حال میں ہوگا۔ ہائے اب ہم اسے کہاں ڈھونڈیں!!

خدا غارت کرے آپ کے بکرے کو! آپ ایک بکرے کے لئے اپنے خون کو قربان کئے جا رہے ہیں۔ آپ کا خون اتنا سفید کیوں ہوتا جا رہا ہے! ارے خدا کے لئے جائیے اور اپنے مُنّے میاں کو ڈھونڈ لائیے۔

بیگم.... بیگم آپ سمجھتی کیوں نہیں، بکرا بھی تو آخر قربان ہی کرنا ہے نا....!

مگر آپ موے بکرے پر اپنے مُنّے میاں کو کیوں قربان کر رہے ہیں!! ــ بیگم کی باتوں سے گھبرا کر ہم اپنے بکرے اور بیگم کے مُنّے کو ڈھونڈنے گھر سے باہر نکلے ہی تھے کہ مُنّے میاں خود ہی گھر میں داخل ہوئے، جنھیں دیکھ کر ہم سے پہلے بیگم کی جان میں جان آئی! اور ہم نے مُنّے سے پوچھا۔

مُنّے بیٹے آپ کہاں تھے ؟

ابّا حضور .... ہم میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے ! اور ابا حضور، آپ کو معلوم ہے، ہم نے وہ چھکّا مارا کہ بولر کے چھکّے چھوٹ گئے۔

اور بیٹے اگر ہمارا بکرا نہ ملا تو ہمارے چھکّے ہی نہیں، گھر بار سب کچھ چھوٹ جائے گا

ابّا حضور ! آپ کا بکرا تو ہوٹل کے پاس جگالی کرتے ہوئے دو پہاڑوں کے درمیان کھیلے جانے والے ٹسٹ میچ کی کامنٹری سن رہا ہے ! مگر ہم منے کی کامنٹری پر مسکرائے بغیر بکرے کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے تھے، کیونکہ بقرعید کو صرف دو دن رہ گئے تھے اور بکرا تھا کہ ہمیں خود بکرا بنا کر نہ جانے کہاں رفوچکر ہوگیا تھا۔

چلتے چلتے جب ہم چاندنی چوک پر پہنچے تو چوک کے عین وسط میں ایک جم غفیر کو دیکھ کر ہمارے قدم رک گئے اور ہم کھڑے تماشہ دیکھنے لگے، کوئی صاحب جو دیکھنے میں ہو بہو امیتابھ بچن نظر آرہے تھے، چوک کے احاطے پر کھڑے ہوکر دلیپ کمار کے اسٹائل میں کامنٹری فرمارہے تھے ـــــ آئیے صاحبان، بکروں کے قدر دان ! دیکھئے اب آپ کے سامنے شیخ صاحب کے کالے بکرے اور خان صاحب کے سفید بکرے کے درمیان کرکٹ میچ شروع ہوگا۔ یعنی بکروں کا مقابلہ ہوگا ! بازی گروں کے لئے پھر کبھی ایسا موقعہ نہیں ملے گا !! لگائیے صاحبان، دل کھول کر ان بکروں پر بازی لگائیے !! شیخ، خان نے ان بکروں پر بڑی محنت کی اور روپیہ لگایا ہے، تاکہ وہ ان بکروں کو لڑا کر سود سمیت اصل وصول کرسکیں اور صاحبان آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ بڑے جاسوس بکرے ہیں جو ابن صفی کی ناولیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اسی لئے حمید اپنے بقرا خان کا مقابلہ ان بکروں سے کرانا چاہتا ہے۔

وہ دیکھئے صاحبان، کالا بکرا پیچھے ہٹ رہا ہے اور سفید بکرا آگے بڑھ رہا ہے !! کیوں کہ صاحبان ! شاید آپ بھی جانتے ہیں کہ جب ایک بکرا پیچھے ہٹتا ہے تو ظاہر ہے دوسرے بکرے کو آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ آپ اُسے بکرا ہی سمجھیں گے !!

ان بکروں کی لڑائی دیکھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے فلم "انسانیت" کا وہ منظر گھومنے لگا جس میں دلیپ کمار اور دیو آنند کے بکرے لڑائے جاتے ہیں !

شیخ خان کے بکرے لڑتے لڑتے جب بُری طرح تھک گئے تو ایک دوسرے کی بغلوں میں اپنے اپنے سینگ چھپائے کھڑے ہوگئے، جیسے آپس میں سمجھوتہ کر لئے ہوں اور پھر کامنیٹر صاحب کی آواز گونجنے لگی !

ہمیں افسوس ہے صاحبان کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہار جیت کے بغیر ان بکروں کی میچ ڈرا کر دی گئی۔!!

مگر ہم ڈرا ہونا نہیں چاہتے تھے! اس لئے ہم نے "تلاش گم شدہ" کے لئے ایک ترکیب نکالی اور اُردو روز نامہ کے دفتر کی طرف چل پڑے اور تھوڑی دیر کے بعد مدیر صاحب کے حضور پیش ہوئے ہماری روداد سن کر مدیر صاحب نے کہا کہ دیکھئے رضا صاحب! اس کے لئے آپ کو باقاعدہ "تلاش گم شدہ" کا اشتہار دینا پڑے گا، جس پر آپ کے کوئی پچاس روپے خرچ ہوں گے۔

پچاس روپے کی بات پر ہمیں بڑا رنج ہوا، مگر چونکہ معاملہ قربانی کے بکرے کا تھا۔ اس لئے اپنی جیب سے پچاس روپے نکال کر پیش کر دیئے اور دل ہی دل میں نیم کے پتے اور مخملی گھاس کا حساب کرنے لگے! ابھی حساب بے باق نہ ہو سکا تھا کہ مدیر صاحب کے سوال پر ہم اُچھل پڑے!

کیا آپ کے پاس اپنے بکرے کی کوئی تصویر موجود ہے؟

جی نہیں، کوئی تصویر اس وقت موجود نہیں ہے! ہاں اگر بکرا مل جائے تو تصویر ضرور پیش کروں گا۔

تب تو آپ کا بکرا ملنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔ کیونکہ "تلاش گم شدہ" کے لئے قاعدہ ہے کہ گم شدہ کی کوئی گم شدہ تصویر ضرور دی جاتی ہے، چاہے وہ آپ کا بکرا ہی کیوں نہ ہو! بہرحال کل کے شمارے میں ہم اشتہار تو ضرور شائع کر دیں گے۔ اس پر آپ کی تقدیر اور مرضئ مولا..!!

دوسرے دن کے اخبار میں ہمارا دیا ہوا اشتہار دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی، جس میں لکھا تھا۔ "قربانی کا ایک بکرا، جو کل صبح ٹسٹ میچ کی کامنٹری سماعت کرنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہے! کسی صاحب کو تو ضرور ملے گا وہ ازراہ بکرا پروری درج ذیل پتے پر پہنچا دیں تو انہیں انعام میں قربانی کے گوشت کا ایک حصہ ضرور دیا جائے گا۔

اشتہار کی کامیابی کے لئے ہم نے ظہر کی نماز ادا کی اور خدا سے دعا کرنے لگے، ابھی ہماری دعا پوری نہ ہو سکی تھی کہ مائک پر موذن صاحب کی آواز اُبھرنے لگی۔ کل شب کے تین بجے ایک بکرا ملا ہے! جسے قریبی انجمن کے دفتر میں رکھا گیا ہے، یہ بکرا جن صاحب کا ہو وہ نشانی بتا کر حاصل کریں!!

ہم نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور بھاگے بھاگے انجمن کے دفتر پر پہنچے تو چار بکرے کے ساتھ بکرے کے اصل مالک کو دیکھ کر، جو اپنا اور اپنے بکرے کا تعارف پیش فرما رہے تھے! ہمارے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے ہم اپنے بکرے پر حسرت بھری ایک نظر ڈالتے ہوئے پلٹ پڑے جو خود بھی جگالی کرتے ہوئے، ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا ——!!

——

ڈاکٹر حبیب ضیاء

حیدرآباد کی سڑکیں

کبھی کسی نووارد کو آپ نے یہ پوچھتے سنا ہوگا "یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" حیدرآباد کی ہر سڑک کے بارے میں اس سوال کا ایک ہی جواب ہے۔ "دواخانے جاتی ہے"۔ گذشتہ چند برسوں میں ماہرین تعمیرات اور متعلقہ ذمہ دار افراد کی مہربانی سے حیدرآباد کی سڑکیں خستہ تر ہوگئی ہیں۔ سڑکوں کی تباہ حالی کی وجہ سے ٹائرٹیوب والوں، ہڈیوں کے ڈاکٹروں اور جراحوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ ہم جسے سڑک کہتے ہیں وہ کیچڑ، کیچڑ، کھڈے کھلے میں ہول اور چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر کا نام ہے۔ اکثر سڑکوں پر جگہ جگہ سے بڑے بڑے گڈھے پڑ گئے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے آنے جانے والی گاڑیاں بے وقت، بے موقع گلے ملتی ہیں جس کے نتیجے میں ہر روز ہر سڑک پر کافی دیر تک راستے بند ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو ناف برابر کروانے کی لت ہے وہ ان سڑکوں سے بہت خوش ہیں۔ جراح اور لیڈی ڈاکٹر دست بہ دعا ہیں کہ یہ سڑکیں یوں ہی خستہ رہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خدمت کا موقع دے سکیں۔ اکثر خواتین نو مہینے کی بجائے سات مہینے میں بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ میڈیکل ہال والے پریشان ہیں کہ درد زہ بڑھانے والی دوا بالکل فروخت نہیں ہو رہی ہے۔ حالانکہ حسب معمول آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے زچگی خانہ آنے والی ایک خاتون سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے جواب دیا۔

"میں نے کوئی دوا استعمال نہیں کی، صرف آٹو میں بیٹھ کر گھر سے یہاں آئی ہوں۔"

بڑھتی ہوئی آبادی پر ترس کھا کر سڑکوں کی کشادگی کا کام تیزی سے شروع کیا گیا۔ کسی کا صحن کم ہوا کسی کا دالان آدھا ہوگیا تو کسی کا گھر، گھروا بن گیا۔ آناً فاناً تنگ سڑکیں کشادہ بن گئیں۔ لیکن ناجائز بچوں کی طرح ان سڑکوں کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ اکثر سڑکیں ضرورت سے زیادہ چوڑی ہوگئی ہیں۔ اس کے باوجود ہر کوئی ان سے اپنی گاڑی بچا کر پرانی سڑک پر چلنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

ہمارے شہر میں سڑک سے لگے ہوئے کچھ راستے ہیں۔ اردو زبان پر جان چھڑکنے والے ان راستوں کے لیے انگریزی لفظ "فٹ پاتھ" استعمال کرتے ہیں۔ ان پر سے پیدل راہروؤں کے چلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اتفاقاً

کہیں فٹ پاتھ اچھی حالت میں ہیں تو وہاں ایسے بیوپاری مستقل رہتے ہیں جنہیں اور کہیں جگہ نہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے، روزگار کا مسئلہ ہے۔ اکثر جگہوں پر فٹ پاتھ خالی دیکھ کر لوگ چلنا چاہتے ہیں تو آگے ایک مٹی کا بڑا ڈھیر، لائٹ کا کھمبا یا پتھر پڑے ہوں گے۔ یہ نہیں تو ایک عدد گڑھا ضرور ہوگا۔

دکان دار روز اپنی دکان کے سامنے جھاڑو دیتے ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی ہے کہ نہ صرف دکان بلکہ فٹ پاتھ پر بھی جھاڑو ہوتی ہے۔ لیکن جھاڑو کو سڑک پر پھرتے دیکھ کر خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ دکان دار کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ وہ کچرے کو اپنے جائز مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔

سڑک کے کنارے کچرے کی کنڈی نام کی چیزیں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ہمیشہ غلاظت سے بھری رہتی ہیں۔ اکثر کنڈیاں خوش قسمت ہیں اس لیے کہ بعض لوگ کچرا کنڈی میں ڈالنے کی بجائے باز دو ڈالتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں میں جب سے لاتعداد گڑھے پڑ گئے ہیں کچرے کو کنڈی تک لے جانے کی بجائے ان گڑھوں ہی میں انڈیل دیا جا رہا ہے۔

یہ سڑکیں انتہائی بے مروت ہیں۔ ان پر آئے دن لوٹ مار، قتل و غارت گری ہوتی ہے۔ دن دھاڑے منگل سوتر اڑالے جاتے ہیں، راہ چلتی عورتوں اور لڑکیوں پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں کہتیں، کچھ نہیں کرتیں۔ کریں گی بھی کیا؟ یہ خود قابل رحم ہیں، مصیبت زدہ ہیں، انتہا یہ کہ بے بسی میں یہ سڑکیں مہینوں ڈرینج کے آنسو روتی ہیں۔ ان کے یہ آنسو بہتے بہتے ناسور بن گئے ہیں۔ کوئی ان کا غمگسار نہیں کوئی چارہ ساز نہیں۔

اب بیل بھی انسان جیسے ہو گئے ہیں۔ انسانوں کی طرح بیچ سڑک پر کھڑے آنے جانیوالوں کیلئے رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بیل بھٹے یا موز کے چھلکے کھانے میں مصروف ہوتے ہیں تو انسان کی کنگال نگاہیں عریاں پوسٹرس پر ہوتی ہیں جن کی کشش اسے سنیما ہال کے اندر لے جاتی ہے۔ بے وقوف نہیں جانتا کہ وہ سین فلم میں نہیں ہوتا۔ پوسٹر دیکھ کر سنیما ہال کا رخ کرنے والوں پر بیل طنزیہ مسکراتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں "یہ سین پکچر میں ہوتا تو ہم بیل بنے یہاں کیوں کھڑے ہوتے۔"

وہ سڑک انتہائی خوش نصیب ہے جس پر سے کسی مہاراجہ یا مہارانی کی موٹر پلک جھپکتے میں گذر جاتی ہے۔ ایک لمحہ سہی لیکن اس سڑک کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ راتوں رات کھڈوں میں مٹی، پتھر بھر کر سڑک کو شاندار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ شاندار سڑک جاندار نہیں ہوتی پھر بھی سڑک ہوتی ہے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پہلی مرتبہ حیدرآباد کے لوگوں کا شعور بیدار ہوا ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کے لیے بھوک ہڑتال کر رہے ہیں، محضر بھیجے جا رہے ہیں۔ کچرے کے خوبصورت پارسل بنا کر متعلقہ افراد کے پاس بھیجنے کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ سڑک ضرور بنے گی لیکن راہ گذروں کی تسلی کے لیے بنے گی۔ اوپر سے تھوپی گئی مٹی اور فالتو ڈانبر اپنی اصلیت بہت جلد ظاہر کر دیں گے۔ ڈانبر کی ہلکی پرت تلے دبے ہوئے پتھر لپکا راٹھیں گے "ہمیں ان لاریوں سے بچاؤ۔" آج کل لاریاں انسانی جسموں کو وحشیانہ طریقے سے گھسیٹتی لیکر چلی جا رہی ہیں۔ پتھر تو پتھر ہیں۔ سڑک پر خاموشی سے پڑے رہنے ہی میں ان کی بھلائی ہے۔ ۵۵

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

بارات

انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی بارات نکالنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نوزائیدہ بچے کے بجائے جھولے کی بارات نکالی جاتی ہے۔ بچپن میں عقیقہ، بسم اللہ اور دیگر تقاریب میں بچوں کو دلہا دلہن بنا کر بارات نکالتے ہیں بعض طبقات میں جوان ہونے کی خوشی میں بھی بارات نکالی جاتی ہے پھر شادی کی بارات نکلتی ہے زندگی سے برات پر بھی جلوس کی شکل میں آخری مراسم ادا کئے جاتے ہیں۔ مختلف باراتوں میں شادی کی بارات اہمیت کی حامل ہوتی ہے آج کی مہنگائی کا اس بارات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہر کسی کو زندگی میں اپنی یا اوروں کی خوشی کے لئے کم سے کم ایک مرتبہ شادی کرنی پڑتی ہے۔ شادی چوری چھپے نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کی جاتی ہے اور بارات کے ذریعہ ڈنکے کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے۔

شادی کے دن دولھے کی بارات لے کر دولھن کے گھر جاتے ہیں۔ بارات کا سارا انتظام دولھن والوں کو کرنا پڑتا ہے۔ دولھن والے، دلھا کے کپڑے، جوتے، ٹوپی، پھولوں کے ہار اور سہرا، کار یا گھوڑا، کار کے پھول یا گھوڑے کا سہرا، بینڈ باجہ اور روشنی مہیا کرتے ہیں یا پھر اکثر صورتوں میں بارات کے انتظام کے لئے گھوڑے جوڑے کی رقم ادا کر دیتے ہیں آج کل گھوڑے جوڑے کی رقم میں بارات کے خرچہ کے علاوہ نوشہ کی قیمت بھی شامل ہوتی ہے۔ ہنگ لگے نہ پھٹکری دولھا والے شان سے بارات نکال کر رنگ جماتے ہیں۔ دولھن والے ہر جبر و خرچہ برداشت کرتے ہوئے بارات کا استقبال کرتے ہیں بارات کی نظر اُتارتے ہیں۔ باراتیوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ شادی کے بعد دولھا والے خوب کھا پی کر، دولھن اور جہیز لے کر، نئے جوش اور ولولہ کے ساتھ بارات واپس لے جاتے ہیں۔ دولھن والے ایک بوجھ سے برات حاصل کر کے رو دھو کر بارات کو وداع کرتے ہیں۔

بارات میں صرف نوشہ ذاتی ہوتا ہے بقیہ اجزائے ترتیب کرائے کی یا پھر مانگے تانگے کی ہوتی ہیں۔ کرایہ کی کار میں کرائے کی شیروانی اور کرائے کا تاج پہنے دولھا بیٹھا ہوتا ہے کرائے کا باجہ بجتا ہے۔ کرائے کی روشنی ہوتی ہے۔ بعض اوقات

کرائے کے براتی بھی شامل رہتے ہیں۔ بارات شادی خانہ جاتی ہے واپسی میں بارات کے ساتھ مانگی ہوئی دولھن اور مانگے ہوئے جہیز کا اضافہ ہوتا ہے۔ جہیز میں مانگی ہوئی کچھ چیز نہ ملیں تو بارات روٹھ جاتی بلکہ "اَڑ" جاتی ہے۔ کرائے کی اور مانگی ہوئی بارات شہر کی شاہراہوں سے گزرتی ہوئی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ ٹریفک میں خلل پڑتا ہے۔ ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ ایک بار کافی وقت کے لئے ٹریفک رکی رہنے پر ایک باریش بزرگ نے تنگ کر کہا تھا "ہم نے ایک نہیں تین چار شادیاں کیں ہر بار ہماری بارات نکالی گئی لیکن ہماری شادیاں کبھی بھی دوسروں کو تکلیف کا باعث نہ بنیں"۔ ہمارے شہر میں بارات کی واپسی عموماً رات دیر گئے ہوتی ہے جبکہ شادی کا دن ختم ہو کر دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔ جدھر سے بارات گزرتی ہے لوگ نیند سے بیدار ہو کر اونگھتے ہوئے جہیز کا نظارہ اور تعریف کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا مکان ایک شادی خانہ کے قریب واقع ہے ہم رات کو جاگتے اور دن کے وقت دفتر میں خراٹے لگاتے ہیں ویسے آج کل دفاتر میں حاصل ہونے والے آرام و آسائش کا گھر کے ماحول سے کیا مقابلہ!

ماضی میں دولھا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا لیکن آج کل دولھے کو کار میں بٹھا کر بارات نکالتے ہیں آج بھی کبھی کبھار رومی ٹوپی کی طرح دولھا، گھوڑے پر سوار نظر آتا ہے۔ ہمارے شہر میں چند مشہور امپورٹیڈ کاریں صرف اور صرف بارات نکالنے کے لئے کرائے پر ملتی ہیں لانبی چوڑی خوش بلکہ سُرخ رنگ اور اوپن ٹاپ کار کو پھولوں سے سجایا جاتا ہے پہلے خالی کار کی تصویر لی جاتی ہے پھر اس میں دولھے کو بٹھا کر اطراف سے باراتی کھڑے ہو کر تین چار زاویوں سے تصویر کشی ہوتی ہے۔ بارات دیکھ کر ہر کوئی کار کے بزنس پر رائے زنی کرنے لگتا ہے۔ شادیوں کے موسم میں ایک ہی کار تین چار باراتوں کے لئے گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک شادی میں کار اپنے مقررہ وقت پر بغیر دولھا دولھن کی بارات نکالے دوسرے پروگرام پر چلی گئی اور بیچارہ دولھا اپنی دولھن کو آٹو رکشا میں گھر لے آیا۔ ایسے ہی حالات میں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دولھا، دولھن کی بارات نہیں نکالتے، بلکہ کار کی بارات نکالتے ہیں۔

بارات بے وقوفیوں کا مجموعہ ہوتی ہے مَرد کو صنفِ نازک کی طرح میک آپ کرکے دولھا بنایا جاتا ہے۔ چہرے پر غازہ اور پوڈر ملا جاتا ہے گال اور ہونٹوں پر لالی لگائی جاتی ہے آنکھوں میں کاجل ڈالا جاتا ہے آنکھوں کے نیچے غراش لگایا جاتا ہے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی جاتی ہے۔ دلہا گورا ہو تو مصنوعی تل بھی لگائی جاتی ہے بعض کالے دلہوں کی مائیں نظر نہ لگنے کے خیال سے سیاہ رنگ لگاتی ہیں۔ تاشقند کی چمکتی ہوئی شیروانی پہنائی جاتی ہے۔ (شادی میں استعمال ہونے کی وجہ سے ہی شیروانی کو قومی لباس تسلیم کیا گیا ہے) کئی گز لانبے کپڑے کا شملہ باندھا جاتا ہے دولھا کو سینٹ اور عطر سے معطر کیا جاتا ہے۔ پھول کے ہاروں سے لادا جاتا ہے۔ سہرے سے چہرہ چھپایا جاتا ہے کمر سے نقلی تلوار لٹکائی جاتی ہے۔ چلتے پھرتے دولھے کو ایک طرح سے معذور کرکے دولھا کے دولھا بھائی ایک جگہ سے دوسری جگہ گود میں اٹھا کر منتقل کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ ماضی میں دولھا گھوڑے پر بیٹھا ہر کس و ناکس کو سلام کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ خیر سے یہ حال دولھے کا ہوتا ہے۔ باراتی اپنے گلوں میں پھولوں کے ہار پہنتے ہیں۔ بعض باراتی سر پر عجیب و غریب ٹوپیاں پہنتے ہیں۔

تو چند ایک باراتی لحیم شحیم دو منزلہ یا سہ منزلہ شملہ باندھتے ہیں۔ بارات میں اکثر اوقات فینسی ڈریس کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے کوئی باراتی سوٹ پہنے ٹائی لٹکائے شملہ باندھے ہے تو کوئی چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی کے ساتھ ہیٹ لگائے موجود رہتا ہے۔

بارات کے سامنے مختلف قسم کے کھیل تماشے ہوتے ہیں جس سے راہ گیر بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ آتش بازی کی جاتی ہے۔ جلتے ہوئے گولوں سے بیانڈ بجایا جاتا ہے۔ منہ سے آگ کے گولے درآمد کئے جاتے ہیں مختلف طرح کی روشنی بارات کے آگے اور پیچھے ہوتی ہے ایک بار ہم نے دولھے کے سہرے میں بھی برقی قمقمے لگے ہوئے دیکھے۔ دولھا کی کار کے سامنے دائرہ بنا کر بیانڈ باجہ کی دھن پر باراتی اچھلتے کودتے ہیں جسے ڈانس کہا جاتا ہے۔ تلوار اور لٹھ بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ساتھ میں مختلف کرتب بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ ہم نے ایک پہلوان کی بارات کے سامنے دولھا کے استاد کو فری اسٹائل کشتیوں کا مقابلہ کرواتے دیکھا ہے تو ایک اور بارات کے آگے مرغ اور بٹیر لڑائے جا رہے تھے۔

بیانڈ باجے کے بغیر بارات نہیں نکالی جاتی۔ لوگ حسبِ استطاعت ایک یا ایک سے زائد قسم کے بیانڈ بارات میں رکھتے ہیں۔ ہمارے شہر میں سکھ باجہ، خاں باجہ اور پولیس بیانڈ دھوم مچا رکھی ہے۔ ایک وقت ہم نے سڑک پر کچھ کم دس بیانڈ پارٹیوں کا جلوس دیکھا۔ ہم نے سوچا کہ حکومت اور عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بیانڈ باجہ والوں نے جلوس نکالا ہے ہم کو ان کے مطالبات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ جب بیانڈ پارٹیاں ہمارے سامنے سے گزر گئیں تو ہمیں چند باراتی نظر آئے جن کے پیچھے کرائے کی کار میں موسیقی کا رسیا دولھا بیٹھا باجہ کی دھن پر جھوم رہا تھا بارات میں بجانے کے لئے موقع و محل کے لحاظ سے کوئی فلمی گانے موجود ہیں۔ ایک وقت بیانڈ پارٹی والے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں سامعہ نواز تھے

کہتا ہے جو کر سارا زمانہ ؛؛ آدھی حقیقت آدھا فسانہ

پچھلے دو تین سال سے ہمارے شہر میں شادی کی بارات نکالنا خطرناک بنتا جا رہا ہے۔ راستے میں کہیں بھی بحث و تکرار ہو تو جھگڑے فساد کی تک نوبت آجاتی ہے۔ بارات کے باجہ سے امن پسند شہریوں کو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ پولیس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو چھپا لیتی ہیں۔ بیویاں اپنے سہاگ کے لئے دعائیں کرنے لگتی ہیں ان ہی خطرناک حالات کے پیش نظر حکومت کی جانب سے بارات نکالنے کے لئے پولیس کی اجازت کا لزوم عائد کیا گیا ہے۔ غور و فکر کے بعد پولیس اپنی نگرانی میں بارات نکالنے کی اجازت دیتی ہے۔ پولیس کا دستہ بھی بارات کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ لوگ پھر بھی شادی کی بارات نکالنے پر مصر رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے پس پردہ جذبۂ خوشی ہے یا پھر کوئی اور جنون کار فرما ہے؟

بھارت چند کھنہ

کرکٹ!

آج اِس دیش کا اے دوست عجب عالم ہے
کوئی بچہ ہو، جواں ہو کہ وہ بوڑھا پنڈت
کوئی دُلہن ہو کہ بیوہ ہو کہ لیڈر کوئی
یا بھکاری ہو، شکاری ہو، لُٹیرا کوئی
یا کہ سانپوں کا ہو سرمست سپیرا کوئی

...

جس کو دیکھو وہ ہوا جاتا ہے اس کھیل پہ مست
اور کرکٹ اے مرے دوست ہے اک ایسا کھیل
جس کو کھیلا تھا نہ راون نے نہ غالب نے کبھی
جسکے میدان کو پاٹا نہ تھا تیمور نے بھی
جسکی فنکاری سے واقف نہ ہوا تھا چنگیز
جسکے بمبر کی خبر تھی نہ قلوپطرہ کو
جسکے اعزاز سے محروم تھے کورو پانڈو
"اِس کی تفصیل سے ماضی کے ورق خالی ہیں"

...

اِس کے غمزوں سے بہت دور جناب فرہاد
اسکے عشووں کا پتہ تک بھی نہ تھا مجنوں کو
ہے یہ وہ کھیل کہ جو عشق میں داخل نہ ہوا
وہ ستمگر کبھی بیٹنگ پہ بھی راضی نہ ہوا

...

نئے انداز سے پھر وقت نے لی انگڑائی
شوق کرکٹ کا بڑھا
اور حیوں تک پہنچا
کھیل ہونے لگا گلیوں میں گذر گاہوں میں
بحث اس کھیل پہ ہونے لگی مئے خانوں میں
اور صدا آنے لگی کھیل کی بازاروں میں
اور پھر یہ بھی ہوا۔
جوش آنے لگا نیتاؤں، فلمساروں کو
رکشا والوں کو بھی اے دوست، ہوابازوں کو
وہ لگے کھیلنے اس کھیل کو میدانوں میں
دھوتی لنگی کو اُتارا، یہنی پوشاک نئی
وہ نظر آنے لگے کوٹوں میں و پتلونوں میں
گیند اور بلا گھمانے پہ ہوئے وہ تیار

...

ہو بھلا ملک میں پھیلی ہوئی لاسلکی کا
آنکھوں دیکھی ہوئی اِن کھیلوں کی ساری تفصیل
نشر ہونے لگی ڈائرکٹ ہی میدانوں سے
چائے خانوں میں کہ بیٹھے ہوئے گھر میں اپنے
چاہتے لوگ ہیں کانوں میں صدا آئے یہی
کس نے جیتی ہے وہاں ٹاس ہے کس کی باری
کھیل کا رنگ ہے کیا، ٹیم ہے کس کی بھاری

...

الغرض کھیل اگر ہوتا ہے ایک ہی دن کا
بحث اس کھیل پہ ہوتی ہے مہینوں سالوں
تبصرے ہیں کسی کپتان کی کپتانی پر
رگڑا جاتا ہے اُسے کی ہوئی من مانی پر
اور پھر ایسے بھی نقاد ہیں اس دنیا میں
پیٹ بھرنے کے لئے رکھتے ہیں جو تیز قلم
اور لکھتے ہیں اگر ایسا کیا جاتا تو
پھر یقیناً وہ نہ ہوتا جو ہوا ایک صبح
بات یہ ہے کہ ہے یہ کھیل اچھوتا اور عجیب
اس کا دلچسپ، دل آویز، درخشاں ماحول
جس پہ رکھ سکتا نہیں کوئی بھی تھوڑا سا یقین
اسکی ہر بات، ہر اک راہ ہے مانند سراب
جیسے معشوق کے وعدے ہوں کہ نیتا کا بچن
فہم طلبا کی ہو، جیسے کہ ہو ریلوں کا چلن
جیسے بارش پہ بھروسہ، ہو کہ میک اپ کا بھین

...

الغرض کھیل ہے کرکٹ کا بڑا البیلا
بھاری پلہ کو پلٹتے نہیں لگتی کچھ دیر
جو نظر آتے ہیں اک وقت کہ جیتیں گے ضرور
آن کی آن میں ہو جاتے ہیں بے بس، مجبور
جو تھے دلدل میں دھنسے کرتے ہیں پرواز یہاں
اور پھر چیختے ہیں مائیک پہ کامن ٹیٹر
میں نہ کہتا تھا ہوئے جاتے ہیں کیوں یہ مسرور
لو ہوئی جاتی ہے اس ٹیم کی نیا غرقاب!

--

مختار یونس (ایم اے)
(مالیگاؤں)

قصائی کی ڈائری

یکم ذی الحجہ۔ شب ایک بجے

کل بقرعید کا چاند دیکھا۔ چاند کی چھری جیسا۔ اس کے اطراف کم سن بھینسوں کے ریوڑ کالے بادلوں میں منڈلا رہے تھے۔ جنھیں دیکھ کر آسمان کی رال ٹپکنے لگی نیلی چھتری کے نیچے کالی چھتریاں کھل گئیں۔ جب مویشی مارکیٹ پہنچا تو بہت سے چھتریٔ جانوروں کے "شرعی عیب" ڈھونڈ رہے تھے۔ میرا سارا دن جانوروں کی دلالی میں گزرا۔ جانوروں کی شان میں فی البدیہہ نثری قصیدے پڑھ پڑھ کر کتنے سُونے آنگنوں میں جانور آباد کر دیئے۔

۲ ذی الحجہ۔ رات کے ۹ بجے

ہلالی چھری رامپوری چاقو بن چکی ہے امید ہے تین چار روز میں آسمان پر "چھرا" لہرانے لگے گا چونکہ جانوروں کی سیوا کرتے کرتے تھک چکا ہوں اس لئے قلم بند کر رہا ہوں۔

۳ ذی الحجہ تا ۹ ذی الحجہ

ایک ہفتہ تک حسبِ ذیل کارنامے انجام دیئے۔

۱۔ لوہار کو نئے اسلحہ جات کا آرڈر دیا۔

۲۔ پرانے ہتھیاروں کو چمکاتا رہا۔

۳۔ قحط زدہ جانوروں کا غول خرید کر پریشان حال کسانوں پر احسانِ عظیم کیا۔

۴۔ جانور رکھشا سمیتی کے ورکروں نے میرے جانوروں کو گرفتار کر لیا۔ جنھیں میں ضمانت پر بھی رہا نہ کرا سکا۔

۵۔ جانوروں کی گرفتاری کے غم میں آنسو بہاتا رہا میرے بال بچوں نے اس کام میں بھرپور تعاون دیا۔ بیوی نے دشمنوں کے حق میں نئی نئی بددعائیں ریلیز کیں۔

۶۔ "قصاب ایسوسی ایشن" کی میٹنگ میں خاکسار نے عید الضحیٰ کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز پیش کی جسے اکثریتی رائے سے "ویٹو" کر دیا گیا اور میں منہ لٹکا کر اپنے کھونٹے پر لوٹ آیا۔

۷۔ بقرعید کی چاندرات کو اپنے نقصان کی بھرپائی کے لئے میں نے کئی امیروں سے "معاہدۂ قربانی" کیا۔

۱۰ ذی الحجہ ۔ شب ۹ بجے

بقرعید کی صبح جب مؤذن نے لاؤڈ اسپیکر پر نمازیوں کو پکارا تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اپنے بھائیوں اور فرزندوں کے آگے "درس قطع و بُرید" کا اعادہ کیا اور نہانے کے بعد خاص طور پر "پُرانا چیتھڑا" کپڑا پہنا کیوں کہ نئے کپڑوں پر خون کی ہولی کھیلنا مجھے پسند نہیں۔ محلے کی مسجد میں امام صاحب کو "چھوٹی رکوع پڑھنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ لیا نماز میں نہ صرف قیام بلکہ رکوع و سجود میں بھی اختصار سے کام لیا۔ میں نے مسجد میں محسوس کیا کہ میں اہم شخصیت بن چکا ہوں۔ مصلیان، متولیان اور مالکانِ جانوران سب ہی مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہیں میں صف سے صاف ہو نہ جاؤں۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے وہ نمازی تھے جن سے میں نے "وعدۂ ذبیحہ" کیا تھا۔ میری ناکہ بندی کی جا چکی تھی۔ نماز ختم ہوتے ہی جونہی مسجد سے باہر نکلا تو گیٹ پر بھی وارنٹ گرفتاری لئے کچھ اہلِ ایمان موجود تھے وہ میرے ہاتھوں اپنے جانوروں کو بوٹیاں بنتے دیکھنا چاہتے تھے میں نے لیڈر قوم کی طرح انھیں تسلی دی اور یقین دہانی کی۔

میں نے اپنی خاندانی فوج کے جانباز بھائیوں اور بیٹوں کو مختلف محاذِ قربانی پر بھیج دیا۔ اس کے بعد میں بذات خود اسلحہ سے لیس ہو کر نکلا میرا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ تھا جیسے بھارت کے نقشے میں لنکا۔ رئیس اعظم کے آٹو رکشا میں ہم "جائے واردات" پر پہنچے راستے میں پولیس کی گاڑیاں گشت کرتی نظر آئیں۔ جن میں کانسٹبلوں کے ساتھ سب انسپکٹر بھی تھے۔ میں نے سیلوٹ نما سلام کیا۔ جب ہم قربان گاہ پر پہنچے تو جانور ہمیں دیکھ کر بھڑک اُٹھے۔ میں نے ایک چوپایہ کو تنہائی میں ملنے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں نے "اہنسا" کی پالیسی ترک کر دی اور تشدد پر اتر آیا اس کی نیک ٹائی (NECK TIE) پکڑ کر لے چلا لیکن وہ کم بخت بھی احتجاج کرنے لگا آج کل سیاست حیوانوں میں بھی سما چکی ہے میرے بیٹے نے اس کی بیک ٹائی Back [illegible] یعنی دُم کو مروڑ دیا اور جانور راہ راست پر آ گیا۔ گوشۂ تنہائی ملتے ہی میں نے جانور کو لیٹنے کے لئے کہا مگر اس کی سینگ میں کیا سمائی کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں بھی اپنی کھال سے باہر ہو گیا اور پھر — قریشی اور مویشی میں جنگ چھڑ گئی میرے بیٹے نے عین وقت پر روس و امریکہ کی طرح میری مدد کی اور جانور نے گھٹنے ٹیک دیئے اور میرے بیٹے نے اس کے چاروں پیر ایک رسی میں باندھ دیئے۔ رئیس اعظم امام مسجد کے ساتھ وہاں حاضر و ناظر تھے۔ امام صاحب نے جانور کی گردن کی ربن کاٹ کر افتتاح کیا۔ خون کے فوارے ابل پڑے۔ فرش لہولہان ہو گیا واٹرٹینکر نے ان کی دھلائی کر دی اب میں نے مرحوم کو کھال سے محروم کیا اور بیٹے کو "بوٹی سازی" کام کے لئے نامزد کیا۔

وہاں سے نکلا تو دروازے پر میرے طلب گاروں کا مجمع تھا میں قریب کے اُمیدوار کے ساتھ ہولیا۔ وہاں گیا۔ غیر قانونی جانور دیکھ کر میں بھڑک گیا۔ مالکِ جانور نے اصرار کیا میں نے انکار کیا اس نے "طعن بزدلی" دیا میری مردانگی کو للکارا مگر میری چھڑی بھی بھینس کی طرح موٹی ہو چکی ہے میں نے بھی انکار کیا اب انہوں نے "اثر و رسوخ" کی دھمکی دی میں سہم گیا۔ مجھے نرم ہوتے دیکھ کر اُنہوں نے میری ہتھیلی پر نوٹوں کا وزن رکھ دیا۔

"قانون" کا ذبیحہ ویسے بھی ہمارے ہاں عام ہوگیا ہے ہر شخص اپنے اپنے میدان عمل میں "دنبۂ قانون" کی شہ رگ کاٹنے میں مصروف ہے کوئی کھلے عام کوئی چوری چھپے۔ تاجر و صنعت کار عوام کی معاشی رگ پر منافع کا خنجر رکھے ہوئے ہیں۔ قانون کے باڈی گارڈ بھی دفعات کا سہارا لے کر قلم سے چھری کا کام لے رہے ہیں جمہوریت میں نیتاؤں کا ذبیحہ سب سے انوکھا ہے الیکشن کا چارہ پہلے ڈالتے ہیں معاش کی لچھے دار رسی میں پبلک کو جکڑتے ہیں اور پھر ملک کے سلاٹر ہاؤز میں قوم کی قربانی دھوم سے کرتے ہیں۔ عوام مسائل کے کھونٹے سے باندھ دیئے جاتے ہیں اور یہ دنیا میں آوارہ جانور کی طرح اِدھر اُدھر پھرا کرتے ہیں۔

جب ایسوں کا یہ حال ہے تو پھر میں کیوں پیچھے رہوں اسی لئے میں نے بہت سے جانور ملک عدم روانہ کردئے ہیں اگر ایسا نہ کرتا تو جانوروں کے پالک اور مالک اِس قومی دولت کو پرائے ملک میں بغیر پاسپورٹ کے ہانک دیتے اور دشمن کو مفت غذا سپلائی کردیتے اور تب ہمارے بازار کے جوتے چپل یہاں نہیں وہاں تیار ہوتے۔ میں دیش سیوا



حاشیائی رقم کے لئے فراہم کئے گئے

غریبوں کیلئے مکانات: جھونپڑیاں فراہم کرنے کے پروگرام کو برخواست کر کے پختہ مکانات مہیا کرنے کا پروگرام شروع کیا گیا۔ مختلف اسکیمات کے تحت ۵۲۰۰۰ ہزار سے زیادہ پختہ مکانات کی تعمیر مکمل کرلی گئی ــ غریب خاندانوں میں ایک لاکھ مکانات کی تعمیر کے لئے آراضیات تقسیم کئے گئے۔

خواتین کی بہبودی: ـ ترپتی میں عورتوں کی علحدہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔

ـ عورتوں کو جائیداد میں مساوی حقوق دینے کیلئے قانون تیار کیا گیا۔

تعلیم: ـ پیشہ ورانہ کالجوں میں عطیات کی وصولی پر پابندی لگادی گئی ہے۔

ـ دوپہر کے کھانے کی اسکیم سے ۴۵ر۳۷ لاکھ غریب طالب علموں کو فائدہ پہونچ رہا ہے۔

ــ ۴۶ نئے سرکاری کالج قائم کئے گئے ہیں (۱۸ ڈگری کالج اور ۲۸ جونیر کالج)

توانائی: بجلی کی پیداوار کے اعتبار سے ریاست خود مکتفی ہو چکی ہے۔ بجلی کی تنصیبی صلاحت کو ۲۹۰۱ میگا واٹ تک بڑھا دیا گیا ہے۔

آبپاشی: ۶۳۷ کروڑ لاگت کا تلگو گنگا پراجیکٹ تامل ناڈو اور تلگو عوام کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کی ایک علامت ہے ــ ۱۴۳ کروڑ روپیے کی لاگت سے بائیں بازو کی سری سیلم کنال تعمیر کی جارہی ہے جس سے ضلع نلگنڈہ کی ۲ر۱ لاکھ ایکر زمین سیراب ہوگی ــ ۲۰۳ کروڑ روپیے کی لاگت سے سری رام ساگر کے دوسرے مرحلہ کی تعمیر کی جارہی ہے جس سے تلنگانہ علاقوں میں ۵ر۹ لاکھ ایکر زمین سیراب ہوگی

صنعتوں کا پھیلاؤ گرامودیا (مرکزی اسکیم) دیہی علاقوں میں تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی خود روزگار یونٹیں قائم کرنے میں ۲۵ ہزار روپیے فی یونٹ کے حساب سے قرض کے طور پر مدد کی جارہی ہے۔

ـ "دیپا" اسکیم امیدواروں کی ٹریننگ اور رہنمائی کی اسکیم ہے جس کے ذریعہ انہیں اپنے پیر پر کھڑے ہونے میں مدد ملتی ہے ــ "یوا شکتی اسکیم" اس اسکیم کے ذریعہ نوجوانوں کی قوت کو قومی تعمیر کے کام میں جوڑا جاتا ہے۔

سرکاری زبان: تمام سطحوں پر تلگو کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کی رفتار کو تیز تر کیا جارہا ہے۔

پاک و صاف نظم و نسق بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کے انسداد کے لئے لوک آیوکت کا قیام

سکریٹریٹ اور ضلع کی سطح پر شعبۂ شکایات کا قیام

ــ یہ ایک ایسی حکومت کے کارنامے ہیں جو عوام سے قریبی ربط رکھے ہوئے ہے۔

جاری کردہ: ــ محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR R.O. No. 30740/Advt/C4/83.0/29.12.83

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

جین کالج، آرہ

'طنز و مزاح اور واہی'

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بتخانہ خوشتر است
ہر جا کہ ہست جلوۂ جانانہ خوشتر است

زندہ دلی و شگفتہ مزاجی ظرافت کے جوہر سے کبھی خالی نہیں، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی معصوم طبیعتوں میں بھی اس کی رمق موجود رہی ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ سے فرمایا کہ بوڑھے لوگ جنت میں نہیں جائیں گے۔ حضرت صفیہؓ چونکہ بہت ضعیف ہو چکی تھیں حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سن کر گھبرا گئیں۔ ختمی مرتبتؐ نے تبسم فرمایا اور کہا پھوپی جان بوڑھے لوگ جنت میں جوان ہو کر جائیں گے۔

رونا اور ہنسنا انسانی زندگی کی دو اہم حقیقتیں ہیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً یعنی ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ حیوان مطلق اور حیوان ناطق میں بولنے کے علاوہ ہنسنا بھی ایک وجہ امتیاز ہے۔ نفسیاتی طور پر ہنسنا اور رونا جسمانی اور ذہنی صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ انفرادی طور پر ہی نہیں اجتماعی طور پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ شخص اور سماج لازم و ملزوم ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور [illegible] دریا کچھ نہیں

سوال صرف جسمانی اور ذہنی صحت کا نہیں بلکہ فکری، شعوری، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی حسن اعتدال کا بھی ہے۔ باشعور اور احساس انسان عام مشاہدہ کے پیش نظر اپنے ذاتی بہجت و انبساط کا برملا اظہار نہیں کرتا۔ انسان کی ابتدائی غیر مہذب زندگی میں بھی اس کے عریاں جذبات کا بے ہنگم و غیر شائستہ ظہور ہوتا رہا ہے۔ جیسے جیسے ہم ارتقائے تمدن کی راہ پر گامزن ہوئے اس کے نئے نئے طریق و اسلوب ایجاد ہوئے۔ زبان و ادب کا دور جب آیا تو اس کے طرز و انداز بھی نفاست بداماں ہوتے گئے۔ جب سادہ کر بھی ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ آگیا اور [illegible]

بھی رونے رُلانے کے انداز آگئے۔ اپنی تکلیف و رنج پر بھی روئے اور دوسروں کے دُکھ درد پر بھی اشک فشانی کی۔ رونے سے دل کی بھڑاس نکلتی ہے اور جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ یہاں تک تو اصلاح نفس و ذات کی بات تھی مگر اس کا رشتہ شخص سے سماج تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہنسنے سے زیادہ رو کر ہی دوسروں کو متاثر کیا جا سکتا ہے یہ فطری بات ہے۔ اثر اندازی و اثر پذیری کی اسی حقیقت کے پیش نظر کہا گیا ہے ؎

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ہنسی اور خوشی کے بطن سے مزاح و ظرافت نے جنم لیا اور درد و بکا کے شکم سے طنز پیدا ہوا۔ غرض یہ کہ مزاح زندہ دلی و شگفتہ مزاجی و خوش طبعی کا مظہر ہے اور طنز رنج و افسردگی کا پیرایۂ اظہار۔

حالیؔ نے غالبؔ کو حیوان ظریف لکھا ہے۔ غالبؔ جیسا سنجیدہ فکر اور فلسفی مزاج شاعر بھی اپنے ماحول کی ابتری اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت پر روتا ہے اور اس کے رونے نے اکثر طنز کی ایسی صورت اختیار کی جس میں مزاح کی آمیزش اُس تلوار کی پرش بن گئی ہے گویا ع سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اردو شاعری میں مزاح و ظرافت، طنز و تمسخر اور ہجو و استہزا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو سوداؔ، میر ضاحک جعفر زٹلی سے لے کر انشاؔ و مصحفیؔ تک کہ یہ بڑے ثقہ حضرات تھے، ذم و ابتذال کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر تہذیب و شرافت اپنی آنکھیں بند کر لے۔

یہ طے ہے کہ طنز و مزاح دو مختلف چیزیں ہیں مگر ان دونوں کے معتدل اور متوازن امتزاج سے جو شئے سامنے آتی ہے وہی دراصل روح ظرافت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم اردو شاعری میں اکبرؔ الہ آبادی کا مقام محفوظ پاتے ہیں۔ اصلاح معاشرت کا جذبہ اکبرؔ کے یہاں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ حقائق کی ایسی ترجمانی اور ماحول کی ایسی تصویر کشی جو تیر نیم کش بن کر دل میں ترازو ہو جائے اور آر پار نہ ہو، بڑی لذت آگیں ہوتی ہے، یہ گویا شہد میں لپیٹ کر نیم کا ست دینا ہے جو لذت کام و دہن بھی فراہم کرے اور صحت اندام و بدن بھی۔

ازل سے سود و زیاں کا شکار انسان ذاتی منفعت کے آگے ہر دور میں دوسروں کے نقصان کا سبب ہوا ہے، الا ماشاء اللہ۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور شاہانہ ادوار کی تاریخ جبر و قہر فراعنۂ مصر سے لے کر شہنشاہان عصر حاضر تک ایک رہی ہے۔ ایک کا سود لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات بنا ہے۔

شاعر ہمدرد خلائق ہوتا ہے اور اپنے معاشرے کی آنکھ۔ اس کی ذکی الحسی سماج کے ہر شعبہ کی بے اعتدالیوں پر اسے تڑپاتی ہے اور وہ اپنے ڈھب سے معروف بکا ہوتا ہے۔ یعنی ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

ہر ادب میں شعراء اس حقیقت کی نشاندہی کرتے رہے ہیں، انگریزی کے پوپ اور ڈرائیڈن ہوں یا فارسی کے عبید زاکانی و فردوسی طوسی۔ اردو چونکہ فارسی ادب سے براہ راست متاثر ہوئی ہے لہذا اس نے بھی طنز و تشنیع اور ہجو و استہزاء کے پیرایے وراثت میں پائے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی عمر نسبتاً مختصر ہے، بادشاہوں کی سرپرستی اور ان کا زمانہ اردو شعراء نے بہت کم دیکھا۔ بساط سیاست اُلٹنے ہی کو تھی، اخلاقی زبوں حالی نے ملک و ملت کا شیرازہ بکھرنے کے قریب کر دیا تھا۔ ایسے میں جن لوگوں نے بھی طنز و مزاح کے شعری نمونے پیش کئے ان میں پوری فنکاری کے باوجود کلیتہً ثقہی معیار کا فقدان ہے سودا و میر ضاحک جیسے بزرگوں کے اشعار اکثر ہم محفلوں میں پڑھ نہیں سکتے، کتابوں میں بلفظہٖ نقل نہیں کر سکتے۔

اس پس منظر میں عصر جدید کی مزاحیہ اردو شاعری بسا غنیمت ہے کہ ہم ان میں عروض و بلاغت کی وہ دقیق نکتہ سامانیاں تو نہیں پاتے مگر عصری آگہی اور احساس کی شدت سے بھرپور اصلاحی توانائی ضرور دیکھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری پر بہت کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کسی نے اسے وقتی و عارضی کہا اور کسی نے ثبات حسن بداماں۔ اکبر کا یہ قطعہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ؛ اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ؛ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اپنی کاٹ میں آج بھی اسی شدت کا حامل ہے اور کل بھی رہے گا۔

طنز و ظرافت اور مزاح ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک ایسی قدر مشترک رکھتے ہیں جس سے انکار ممکن نہیں، ظرافت، طبعی اور فطری ہوتی ہے۔ اس میں مزاح کی بشاشت اور بذلہ سنجی کو دخل ہے۔ مزاح ناموافق حالات و واقعات کے عدم تناسب سے پیدا کیا جاتا ہے۔ سنجیدہ طبیعتیں کسی بات کی بے محلی سے بھی مزاح پیدا کر لیتی ہیں مگر طنز کا مقصد ہی اصلاح ہے، طنز ایک ظریف بھی کر سکتا ہے اور ایک متین بھی۔ ہر حال میں اس کے پیچھے شکست قدر کی چیخ اور دکھے دل کی کسک موجود ہوگی۔ پروفیسر احتشام حسین کے لفظوں میں "طنز مزاح کے سوا کچھ اور بھی ہے، اور "یہی" "کچھ اور" گرفت میں نہیں آتا۔" ع۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔

یہ طنز سودا و مصحفی کے یہاں بھی ہے اور فردوسی و قاآنی کے یہاں بھی مگر ایسے ہجویہ اور استہزائیہ انداز میں کہ قاری بھی کڑی کمان سے نکلے اُن تیروں کی سنسناہٹ محسوس کر لیتا ہے۔ ان کے برعکس عبید زاکانی کا قصہ موش و گربہ یا اکبر الہ آبادی کے قطعات مثلاً وہ قطعہ جس کا پہلا شعر ہے ؎

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے ان کی ترقی سے ہے اب یاس

تیر نیم کش کی لذت آفرینیوں سے معمور ہیں۔ ان کے یہاں طنز میں مزاح کی لطیف آمیزش نے معاشرے کی اصلاح کا بہتر ذریعہ فراہم کیا ہے۔

ہجو، فحاشی، عریانی، ہزل، پھبتی، پھکڑ، ریختی اور ضلع جگت میں بازاریت، بھانڈپن اور سستی لطیفہ گوئی کا مبتذل اور سوقیانہ مذاق کام کرتا ہے۔ اس کا پست اور گھٹیا معیار اظہر من الشمس ہے۔ طنز و مزاح، شوخ ظریف، شگفتہ متین اور سنجیدہ طبائع کا خاصہ ہے۔ شاعری چونکہ فن شریف ہے لہٰذا طنزیہ اشعار میں بھی شرافت و لطافت فن کی برق جہندہ چکا چوندھ پیدا کرتی ہے ہر زبان میں طنز و مزاح کا حصہ عام سنجیدہ ادب سے کم رہا ہے، اردو میں اور بھی کم ہے تاہم اس سلسلۃ الذہب کا دائرہ عصری ادب تک وسیع ہے۔ اکبر کے بعد اردو شاعری میں متعدد کامیاب طنز نگار پیدا ہوئے مگر ان میں جو نام اپنے لب و لہجہ کی انفرادیت اور مخصوص رنگ و آہنگ کے اعتبار سے سب میں نمایاں اور سر فہرست ہے وہ جناب رضا نقوی واہی کا نام ہے۔

شاعری ایک وہبی چیز ہے اور قدرت کا بڑا نیک عطیہ۔ اچھی شاعری وہی کر سکتا ہے جو اچھا انسان بھی ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا انسان قدرت کے اس عطیہ کے ساتھ اپنے سلوک میں خاطر خواہ کامیاب ہو۔ شاعری اظہار و بیان کی جس لطافت و شائستگی کا تقاضہ کرتی ہے اس کے لئے دل و دماغ کے بڑے پاکیزہ عمل کی ضرورت ہے۔ تجربات و مشاہدات احساس کو برانگیختہ کرتے ہیں، جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور متخیلہ حرکت میں آتا ہے۔ لازمی طور پر اس کے بعد جو ردّ عمل قول و فعل کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر وہ مہذب، متمدن، خوبصورت اور لطیف نہ ہوا تو اس کی عمومیت ہرگز لائق اعتنا نہ ہوگی۔

شاعر کا یہ ردّ عمل اشعار کی صورت اختیار کرتا ہے اور شاعر کے فکر و خیال کا یہ معنوی اور پیچیدہ عمل اس کی شخصیت سے متعلق ہے۔ شاعر کی شخصیت جس ماحول، تہذیب، ثقافت اور علوم کی پروردہ ہوگی ویسے ہی سانچے پیش ہوں گے حسن و نفاست، پاکیزگی و لطافت، دلکشی و اثر آفرینی از خود ان سانچوں میں ڈھل کر سامنے آئیگی ایسی شاعری خواہ سنجیدہ ہو خواہ مزاحیہ شاعر کے ذوق جمال اور تاب جلال کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ شعر گوئی کا یہ سارا فن سرخی و گرمی خون جگر سے عبارت ہے۔ شعر گوئی فن ہے اور فن کا اعجاز بڑے ریاض کا طالب ہے بالخصوص طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں یہ ریاض دوہری مشقت کا نام ہے، ایک ربط فن کی دوسرے ضبط نفس کی۔ شعریت و شخصیت کی تحلیل سے ہی طنز و مزاح کی پھلجھڑی تخلیق ہوتی ہے اور زبان و بیان کی قدرت تازہ تشبیہوں اور نادر استعاروں سے ایسے تیز و تیکھے نشتر ڈھالتی ہے جو منہ بند زخموں کی گہرائیاں ناپ لے۔

واہی کے طنزیہ اشعار ان کی طبیعت کی نفاست اور شخصیت کی تہذیب و تربیت کے عکاس ہیں۔ واہی کے جادو نگار قلم نے انھیں اقلیم طنز و ظرافت کی پوری عملداری بخش دی ہے۔ جس طرح اکبر اپنے سنجیدہ کلام کے باوجود مزاحیہ اشعار سے ہی زیادہ مشہور ہیں اسی طرح واہی کی سنجیدہ شاعری ان کے بے پناہ طنز و مزاح سے دب سی گئی ہے، انہوں نے

طنزیہ شاعری کو اُردو میں جس بام عروج تک پہنچایا ہے وہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔ واھیات، طنز و تبسم، کلام نرم و نازک، نشتر و مرہم ان کی منزل شہرت کے ارتقائی زینے ہیں۔

داہی کی متاع طنز و مزاح کا ایک سرسری جائزہ لیجئے تو ان کے فکر و فن کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ وحدت زمان و مکاں کی ہفت رنگی کے دلچسپ مناظر سامنے آئیں گے۔ سیاست و صحافت کی کساد بازاری ہو کہ معیار علم و فن کی رسوائیاں، بے سوا فیشن کی جادوگری ہو کہ شعر و ادب میں جدیدیوں کی بوالعجبیاں۔ داہی کی دور رس نگاہیں پورے معاشرتی ڈھانچے کا جائزہ لیتی ہیں۔ ان کا کلام مدقوق سماج کی ایکسرے رپورٹ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طنزیہ انداز قاری کے اعصاب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شدت احساس اور انتہائے کرب کی منزلوں سے گزر کر ایسے انمول جواہر پارے عطا کرنا عرفانِ ذات و حیات کی دلیل ہے۔ زہر پی کر امرت دینا بڑے ظرف کی بات ہے۔ داہی کے اشعار میں جھلاہٹ، کڑواہٹ اور غیظ و غضب کا اثر بالکل نہیں۔ وہ فرد و معاشرہ کی کمزوریوں، غلط کاریوں اور بے ڈھنگے پن پر ایسی چوٹ کرتے ہیں کہ اس کی ملی جُلی ترشی و شیرینی شعر و مزاح کا لطف دوبالا کرتی ہے۔ اِن کے طنز میں رکاکت و سفاہت کو دخل نہیں۔

داہی نے اپنی نظموں میں سامنے کے سیدھے سادے الفاظ کو اپنے شعور ذات و ادراک حقایق سے گنجینۂ معنی کا طلسم بنا کر پیش کیا ہے۔ لفظوں کے تانے بانے سے جس داخلی دھوپ چھاؤں کی عکاسی کی ہے وہ ان کی مہارت فن پر دال ہے۔ اِن کی نظموں میں ارتقائی ساخت ایک نمایاں وصف ہے جو قاری کو ڈرامائی لطف و تحیر سے دوچار کرتا ہے۔ یہ داہی کا خاص فن ہے جس میں ان کا مقابل کوئی نہیں۔ نورِ چشم، قبلہ آپ، مقلد، ڈکٹیٹر کا سر، معرکۂ جہیز، دین مہر جیسی نظمیں میرے اس دعوے کی دلیل ہیں۔ اِن نظموں میں داہی کا اخلاقی و اصلاحی نقطۂ نظر کارفرما ہے جس کے بغیر طنز موثر ہو ہی نہیں سکتا۔

داہی انسانی نفسیات کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا طنزیہ انداز تلخ و مضحک حقائق پر ایک دلکش باریک حریری پردہ بن جاتا ہے۔ چند نظمیں مثلاً لے دہی، انٹلکچول، وفاقی، لیلائے کرپشن، گویا شاعر، مشاعرے سے پہلے اور بعد، حضرت ساتب، مُلّا، فلسفی، اللہ رے بادہ، مکھن، ٹیڈی کفن، اشٹ گرہ اور پیروڈی پڑھئے صاف معلوم ہوگا کہ ان کا مصنّف نفسیات انسانی کی بھول بھلیوں کا ماہر آشنا ہے۔ شخصیتیں احساساتِ کمتری و برتری کے درمیان کیسے پستی رہتی ہیں، نارسائیوں کا غم اور حصول کی خوشی کس کس رنگ میں ظہور پذیر ہوتی ہے، خواہشات کی گرہیں کس طرح کستی ہیں، عقدہ ہائے آرزو کی کشود کیونکر ممکن ہے اور عقل کا مارا انسان جبلتوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی کیا کیا تماشے دکھاتا ہے؟ داہی اپنی ذکاوتِ حس اور بصارت دروں سے ان سب کا مشاہدہ اور احاطہ کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان تاریک نہاخانوں کا پتہ چلے گا جہاں داہی کے ذہن رسا نے روشن دریچے کھول دیئے ہیں۔ ~

نے دم صوفی صفا بخشد نہ راز خلوتی
روشنی دل ز فیض چشم بیدار الست و بس

نظیری

ایک نظم "میں اسٹوڈنٹ ہوں" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

میں اسٹوڈنٹ ہوں اے ہمنشیں اس دور حاضر کا
تمدن کے گھڑے میں ہوں نئی تہذیب کا سیر کا
مسلط ہوں میں سر پر قوم کے وہ مسئلہ بن کر
کہ جس نے ہوش غائب کر دیا ہے ہر مدبر کا
طبیعت میری ہر قید تعلق سے ہے بیگانہ
نہ گھر کا ہوں نہ کالج کا نہ مسجد کا نہ مندر کا

دراصل حقیقت کی سچی ترجمانی ہی طنز کا وہ حربہ ہے جس کی ہر ضرب کاری ہوتی ہے۔ اکثر یہ لفظی تصویر فنکار کی قدرت و ندرت قلمکاری سے ایسے کارٹون کی صورت اختیار کرتی ہے جس کی ہر ٹیڑھی میڑھی لکیر سے عریاں صداقت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ واہی کا قلم اس آرٹ میں بے نظیر ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے بھی اپنے گرد و پیش سے ہی موضوعات تلاش کئے تھے۔ کالج، فیشن سوراج پارٹی، قومی ایجیٹیشن کونسل، سرکاری پارٹی اور تعلیم نسواں پر اس انداز سے اظہار خیال کیا کہ اس عہد کے مختلف سیاسی اور سماجی رجحانات متشکل ہو کر سامنے آگئے۔

رضا نقوی واہی کے موضوعات فن کی دنیا کہیں زیادہ متنوع اور وسیع ہے۔ ان کی نظمیں تمثیلی اور محاکاتی حسن سے مملو ہیں۔ روایتی موضوع سخن بھی ان کی فنکارانہ ندرت سے نئی دلکشی پاتا ہے۔ لکھتے ہیں :

دادا سے باپ، باپ سے بیٹے نے پالیا ؛ یہ لیڈری کا پیشہ بھی جدّی ہے آج کل
اللہ! تین آنے کی ٹوپی کے سامنے ؛ زریں بھی ہو کلاہ تو بھدّی ہے آج کل

گرومورفوڈ (GROW MORE FOOD) سرکار کی ایک پرانی اسکیم تھی، واہی کی طباعی نے اسے سیاست کے مطبخ کا پکوان اور خیالی پلاؤ کی دوکان سے تعبیر کیا، لکھتے ہیں :

معاشی تخیل کی پرواز دیکھو "گرو مورفوڈ" کا یہ اعجاز دیکھو
کہ افسر اگاتی ہے صوبے کی دھرتی دفاتر میں ہوتی ہے بھرتی پہ بھرتی
نہ کھیتوں میں گیہوں نہ چاول نہ بھٹا جو اُپجا مگر کچھ تو ٹی۔ اے۔ ہی اُپجا

"وفاتی" کے عنوان سے ایک تاریخ گو شاعر کا دلچسپ کردار پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو :

کون کب مرتا ہے رہتے ہیں اسی کی تاک میں چھائی رہتی ہے سدا کا فور کی بو ناک میں
کوئی دلّی میں مرے یا فوت ہو بنگال میں چند قطعے آپ لکھیں گے مگر ہر حال میں
گر کبھی بہر عیادت آپ جاتے ہیں کہیں دیکھ کر زخم تو تڑپے بیمار کا حال حزیں
[illegible]

ایک اقتباساتی ادیب کو حضرت واہی کا مفید مشورہ ملاحظہ فرمائیے کیسی کاری ضرب ہے:

قبل ہر پیرا کے لکھیئے ہے فلاں کا یہ خیال
اپنی جانب سے نہ ہرگز کیجیئے کچھ قیل و قال
ورنہ کھل جائے گی قلعی اور چھلک جائے گا ظرف
ربط مضمون کے لئے کافی ہیں بس دو ایک حرف
اس طرح روزانہ اک مضمون لکھتے جایئے
اور نوزائیدہ پرچوں میں انھیں چھپوا ایئے
چھ مہینے سال بھر میں یوں چمک جائے گا نام
آپ کو حسرت سے دیکھیں گے سرور واحتشام

جناب واہی منظوم مکتوب نگاری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کا منفرد طنزیہ ومزاحیہ انداز بے تکلف منظوم خطوں میں ان کی زبردست انشائی صلاحیتوں کا غماز ہے۔ سردار ستوکھ سنگھ معصوم کے نام ایک خط سے چند اشعار نمونتاً پیش ہیں:-

چوروں سے معرکے کا پڑھا خط میں حال جی
واللہ آپ نے تو دکھایا کمال جی
کچھ مل سکا نہ ہوگا بجز نظم اور غزل
ہوگا اسی لئے انھیں بے حد ملال جی
رحمت گرو کی ڈھال بنی آپ کے لئے
اس واسطے نہ گل سکی چوروں کی دال جی
کیسی ہے اور کہاں یہ لڑاسی ہے آپ کی
ہے نانیہال میں کہ گئی دادیہال جی
بچوں کو پیار کیجیئے میری دعا کے ساتھ
سردارنی سے کہیئے سری ست اکال جی

الغرض واہی اس وقت کشور طنز و مزاح کے تنہا تاجدار ہیں، کوئی حسد کرے تو کیا کرے کہ یہ قبول خاطر و لطف سخن خداداد ہے۔

شہرت پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عشقت گر می کنید کارے



"لو آج ہم بھی"

مزاحیہ مضامین از شفیقہ فرحت

(تبصرہ)

از ڈاکٹر

سیّد حامد حسین

"لو آج ہم بھی" نہ تو کسی بیاضِ شعر کا نام ہے کہ رودادِ اسیرانِ قفس بیان کرتا ہو اور نہ ہمیں سوتری پروگرام کا کوئی اشتہاری عنوان کہ کمزور طبقے کا ہاتھ خیالی مونچھ پر جا پہنچنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہو۔ یہ دراصل ان شفیقہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو مال کے اصلی ہونے کی سند کے طور پر اپنے نام کے ساتھ فرحت کا اضافہ بھی ضروری سمجھتی ہیں۔

سولہ دھان پان مضامین کا یہ خاکسارانہ مجموعہ موصوفہ کا پہلا کتابی کارنامہ ہے جو انہوں نے اپنی تحریری عمر کے پچیس سال پورا ہونے پر شائع کیا ہے۔ دوسرے لوگ تو ایسے موقعوں پر سپاس نامے قبول کرتے ہیں۔ جشن دل اور نقاروں کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ طالب علم پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بٹورتے ہیں۔ خاص نمبر نکالنے والے دھن اور مضمون لگا

اُن کی جوتیوں کے طفیل، ماہر جوتیات اور دوسرے مناسب حال خطابات۔ آج جب کہ طفلانِ ادب، املا لکھنے سے قبل، صاحبِ کتاب ہو جانے کی سعادت قدرے بزورِ تمنا اور قدرے بزورِ تدبیر حاصل کرنے میں کامیاب ہیں، شفیقہ صاحبہ کا یہ رویّہ بعدِ درویشی کی سی بات لگتا ہے اور بے اختیار یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ محترمہ آخر آپ ابھی تک ہمارے درمیان کیا کر رہی ہیں کوئی خانقاہ، کوئی سجادہ، کوئی آستانہ سنبھالئے کہ جیسے بہتوں کے دن پھر رہے ہیں، آپ کے بھی پھریں۔

معذرت نما انتساب سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ معاملہ کچھ ڈکار کا اور کچھ غیرت کی للکار ہے۔ برسوں تصانیفِ غیرؔ نذر میں وصول کرتے کرتے، بالآخر یاد آیا کہ کچھ تلافی کی بھی سبیل کی جائے۔ چنانچہ یہ حقیر، کمترین قسم کا مجموعہ وجود میں آیا۔ ان حالات میں ہمارا خیال ہے کہ کتاب پر قیمت کا اندراج محض تکلفاً ہے۔ بہتر تھا کہ جلی حروف میں یہ تحریر کر دیا جاتا کہ کتاب صرف تبادلے میں حاصل کی جا سکتی ہے، پرانے اور نئے حقدار فلاں فلاں فارم میں درخواست پیش کریں۔ فارم کی فیس نقط بارہ روپیہ۔

مجموعے میں دو قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں کچھ جو انشائیہ ہیں اور کچھ جو انشائیہ نہیں۔ جو انشائیہ نہیں اُن میں سے کچھ نکاہیہ ہیں اور کچھ نکاہیہ نہیں اور جو نکاہیہ نہیں ...... خیر چھوڑیئے اس سلسلے کو۔ کسی غریب کو اس پر پی ایچ ڈی ہی مل جائے گی۔ فی الحال یہ دیکھئے کہ ہاں یا نہیں کی اِس آفاقی کیفیت کو ایک جدید شاعر نے کس چابکدستی سے پیش کیا ہے ؎

بات یہ ہے کہ آدمی شاعر
یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

یہ شعر اصلی اور اوریجنل ہے اور اسے شفیقہ فرحت نے اپنے کسی مضمون میں استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ احتیاط یوں لازم ہے کہ شفیقہ صاحبہ کو شعر کا کارٹون بنانے میں خاصی دلچسپی ہے اور اس مقصد کے لئے دیوانِ غالبؔ کی جانب اُن کی خصوصی توجہ ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا غالبؔ کے ساتھ اُن کا برتاؤ چچا کا نہیں بلکہ سسرال آئے نئے دولہا کی طرح ہے۔ حالانکہ آپ تکلفاً فرماتی ہیں: "شامتِ اعمالِ ما صورتِ غالبؔ گرفت"۔ لیکن اصل معاملہ بالکل برعکس ہے۔ فہرست مضامین دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ شاید دیوانِ غالبؔ کی ہی کوئی کاونی ہے لیکن مضامین پر جب نظر پڑتی ہے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اشعارِ غالبؔ سے فینسی ڈریس شو کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

مزاح کئی قسم کا ہوتا ہے۔ کچھ سلاد کی طرح کام آتا ہے کہ لقمے کو سہارا دیتا ہے۔ کچھ بگھار کی طرح کہ یہاں وہاں تیرتا دکھائی دے اور کچھ سردیوں کی طرح ٹھونکتے رہیئے اور گودا باہر نہ آئے۔ شفیقہ فرحت کا مزاح مضمون کے رگ و ریشے میں پیوست ہو کر بڑھتا ہے اور شاخ در شاخ پھیلتا ہے۔ وہ اُس گنڈیری کی طرح ہے، جو آخری ریشے تک مزا دیتی ہے۔ شفیقہ کا مزاح منہ میں رکھتے ہی گھل جانے والا اور اشتہاری مائکرو فائیڈ ایسپرو کی طرح منٹوں میں آرام دینے والا ہے۔ اس میں نہ فلسفے کی چربی ہوتی کہ عقل کی گرمی سے پگھلائے اور نہ

ادبی شعبہ گری کہ نقشہ سامنے رکھو تو گھماؤ سمجھ میں آئے۔

یہ ڈر لگتا ہے کہ کسی وقت شفیقہ کو جدیدیت والے ہائی جیک کرکے نہ لے جائیں، اس لئے ان کے کئی مضامین ذات کے کرب سے شروع ہوتے ہیں اور وہ بھی کوئی ایسا ویسا کرب نہیں بلکہ بڑا بنیادی کرب۔ کیا کیا روپ ہیں اُس کے۔ ایسی روم میٹ کہ اُٹھتے بیٹھتے، رات کو سوتے سے اُٹھاکر۔ دن میں بھیڑ لگاکر، ہر وقت اور ہر مقام پر افسانہ سنانے کے درپے ہو یا کرکٹ کا کھیل اور کرکٹ کی کمنٹری کہ نشانِ تہذیب اور بلائے جاں بن کر طوقِ گردن ہو، لمبے لمبے خطوط ہوں یا اہلِ ادب کی بے اعتنائیاں یا پھر بے ضابطہ زندگی کو ٹائم ٹیبل کے خانوں میں بٹھانے کی سعئ لاحاصل الغرض ایک چوٹ کھائے ہوئے پوز سے قطرہ قطرہ مزاح نچوڑنے کا گُر پتہ نہیں اُنھوں نے کہاں سے سیکھا ہے۔

"لو آج ہم بھی" رنگ برنگے، قسم قسم کے ذائقے اور ڈزائنوں والے بسکٹوں کا پیک ہے جس میں "عہد نامۂ جدید" جیسا کھولتا، ابلتا ہوا طنز بھی ہے اور "کرسی" جیسے انشائیہ کے کاندھے پر سوار ہو کر لگائے جانے والے چرکے بھی "حضرتِ آلو" جیسا معصوم، بے ضرر انشائیہ نما فکاہیہ بھی اور "ڈرامہ قوم سے نکلے" جیسا غالب صدی تقریبات کے بارے میں ہنستا کھیلتا طنزیہ بھی۔ پھر "اندیشہ ہائے دور دراز" کی شکل میں انٹلکچوئل بغلولیت کے کرشمے ہیں تو "دعا دیتے ہیں راہزن کو" میں مزاح کے تخم سے پھوٹنے والا سماجی طنز اور "مقدمہ" میں مقدمہ نگاری اور "اور لکھنا ناول کا" میں ناول نگاری کو مزاح کے شیشے میں اُتارا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجموعہ مجموعہ نہیں، انتخاب ہے، پوری عمارت کا صرف ماڈل۔ شفیقہ فرحت نے اور کیا کیا اور کتنا لکھا ہے۔ اُس کے لئے ایسے محققین کی ایک ٹیم کی ضرورت ہوگی جو مزاجاً محکمۂ آثارِ قدیم سے مناسبت رکھتے ہوں اور عملاً اُن میں نجومیوں کی صلاحیت ہو۔ تب تک اس تھوڑے کو ہی بہت جانئے۔

آخر میں ایک بات اور۔ شفیقہ صاحبہ کو شاید یہ پسند نہیں کہ کوئی اصول بند ناقد کبھی اُن پر یہ تہمت لگانے کی ہمت کرے کہ اُنھوں نے ساری عمر صرف الفاظ سے سروکار رکھا۔ اسی لئے اُن کے مضامین میں الفاظ کے علاوہ بھی اور بہت سا فرنیچر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً بریکٹ، پھر چھوٹا ڈیش، بڑا ڈیش، بڑے سے بڑا ڈیش۔ نشانِ استفہام اور نشانِ استعجاب اور موقعے ملے تو شاید نشانِ استقبال اور نشانِ استغفار بھی ایجاد ہو جائیں پھر ایک نشان سے کیا ہوتا ہے وہ دو، دو بھی ملیں گے اور تین چار کے لئے آپ کو تیار رہنا چاہئیے۔ بریکٹ بہرحال اُن کا مرغوب ترین نشان ہے جو اُن کے مضامین میں اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ قورمہ کے لئے گوشت اور حلیم کے لئے خود حلیم۔ بعض مقامات پر تو یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ بریکٹ کے باہر مضمون زیادہ ہے یا بریکٹ کے اندر۔ بریکٹوں کی اس ریل پیل میں ایسا بھی ہوا ہے کہ کاتب جملے کے اختتام پر غیر ارادی طور پر بریکٹ بند کر گیا ہے اور قاری پچھلے صفحات کا دوبارہ سفر اس غرض سے شروع کرتا ہے کہ اس مقام کا سراغ لگا سکے جہاں سے بریکٹ کا آغاز ہوا تھا۔

"لو آج ہم بھی" شفیقہ فرحت کا یہ اعلان ہے کہ وہ بھی صاحبِ کتاب ہو گئیں لیکن اُس کی حدود اور خود اُن کا

لمبا ادبی سفر دیکھتے ہوئے اُسے کتاب کی بجائے اُن کا شناختی کارڈ کہنا درست ہوگا۔ رہا اُن کے مزاح کا اسلوب، بات میں سے بات پیدا کرنے کا انداز، اچانک غیر متوقع تفصیلات کا استعمال، پھر موم کے بنے الفاظ اور مصرے کہ جس سانچے میں چاہیں فٹ ہو جائیں، جو روپ چاہیں بھرلیں، تمہید کسی نقطے سے شروع کرنا اور ٹہلتے ہوئے چپکے سے اصل مضمون کی طرف نکل جانا، کسی ایک اسلوب کو قالبِ کلام اور لحافِ اظہار نہ بننے دینا۔ اِن سب کا صرف "لو آج ہم بھی" کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ □□

خرافات

— (مراسلے) —

کمال صاحب، سلام مسنون!

ماہ نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ قصہ چہار بیویاں مجسمہ دیکھتا رہا، ہمارے ہیڈ، اور جانوروں کی کانفرنس ایک سے اعلیٰ ایک انشائیے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ "شگوفہ" دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے۔ چونکہ یہ برصغیر کا واحد رسالہ ہے، اس لئے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔ چشم بد دور۔

سفر میں یہ ایک بہترین ساتھی ہوا کرتا ہے۔ اور منزل پر پہنچنے کے بعد اس کی تلاش ضروری ہوجاتی ہے۔ جتنی مسافت ہم طئے کرتے ہیں تقریباً وہ بھی اس اثنا میں اتنی ہی گردش کرلیتا ہے۔ بہرحال! آپ کی سلامتی اور شگوفے کی نکاسی کے لئے دست بہ دعا ہیں ؎

ہر لمحہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طئے

ایک قاری

...

— مکرمی ایڈیٹر صاحب!

بہت انتظار کے بعد نومبر کا شمارہ نظر سے گذرا۔ مال مفت میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا "آتی ہے اردو زبان"، صغیر احمد سندیلوی کا "قصہ چہار بیویاں" اور ساتھ ساتھ جہانگیر انس کی ہنسی۔ مزے لے کر ہضم کرگیا۔ بے دھڑک مراسی اور کرکٹ بیتا دی کا چورن چٹ پٹا تھا۔ عابد معز کا طربیہ "جانوروں کی کانفرنس" سماج کے لئے ایک زبردست طمانچہ ہے امید کہ ہندوستانی مزاح نمبر میں ایک سے بڑھ کر ایک ادیب اور شاعر کی تخلیقات ہوں گی۔

انیس احمد۔ دوحہ (قطر)

...

— محترمی، تسلیمات!

اکتوبر کا شگوفہ نظر سے گذرا۔ مجموعی طور پر کامیاب ہے اندرونی صفحات ادبی خزانوں سے بھرپور ہیں۔ خاص کر بیلن نظام آبادی کی غزل معیاری اور قابل ستائش ہے۔

جان نثار رحمٰن۔ کاماریڈی

...

— دسمبر کے شمارے میں اعجاز وارثی صاحب کی نظم عقد ثانی بڑی خوبصورت ہے۔ دیگر مضامین بھی خوب ہیں۔

نور پرکاش۔ بمبئی

...

— سید صاحب،

آداب!

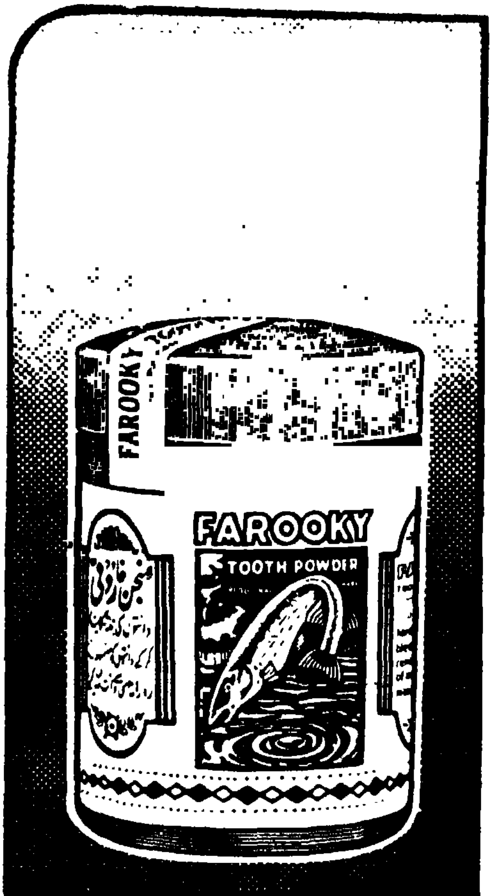
"چنگاری" کے توسط سے "شگوفہ" دستیاب ہوا اور پسند آیا۔ اس کی مزید کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔

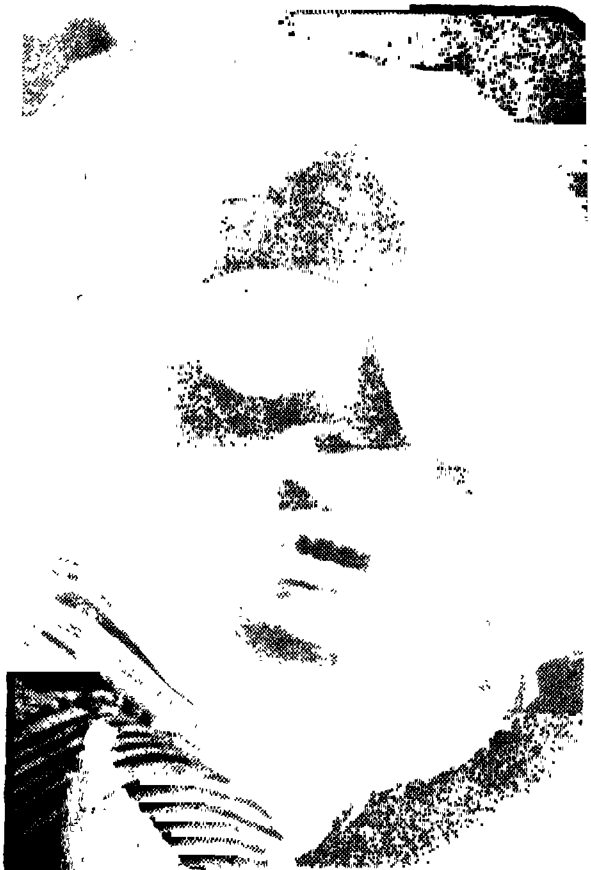
انیس احمد خاں۔ نئی دہلی

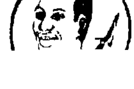
بیس نکات کا
پیغام یہ ہے
کہ مُلک صحت مند
اور تعلیم یافتہ ہو۔

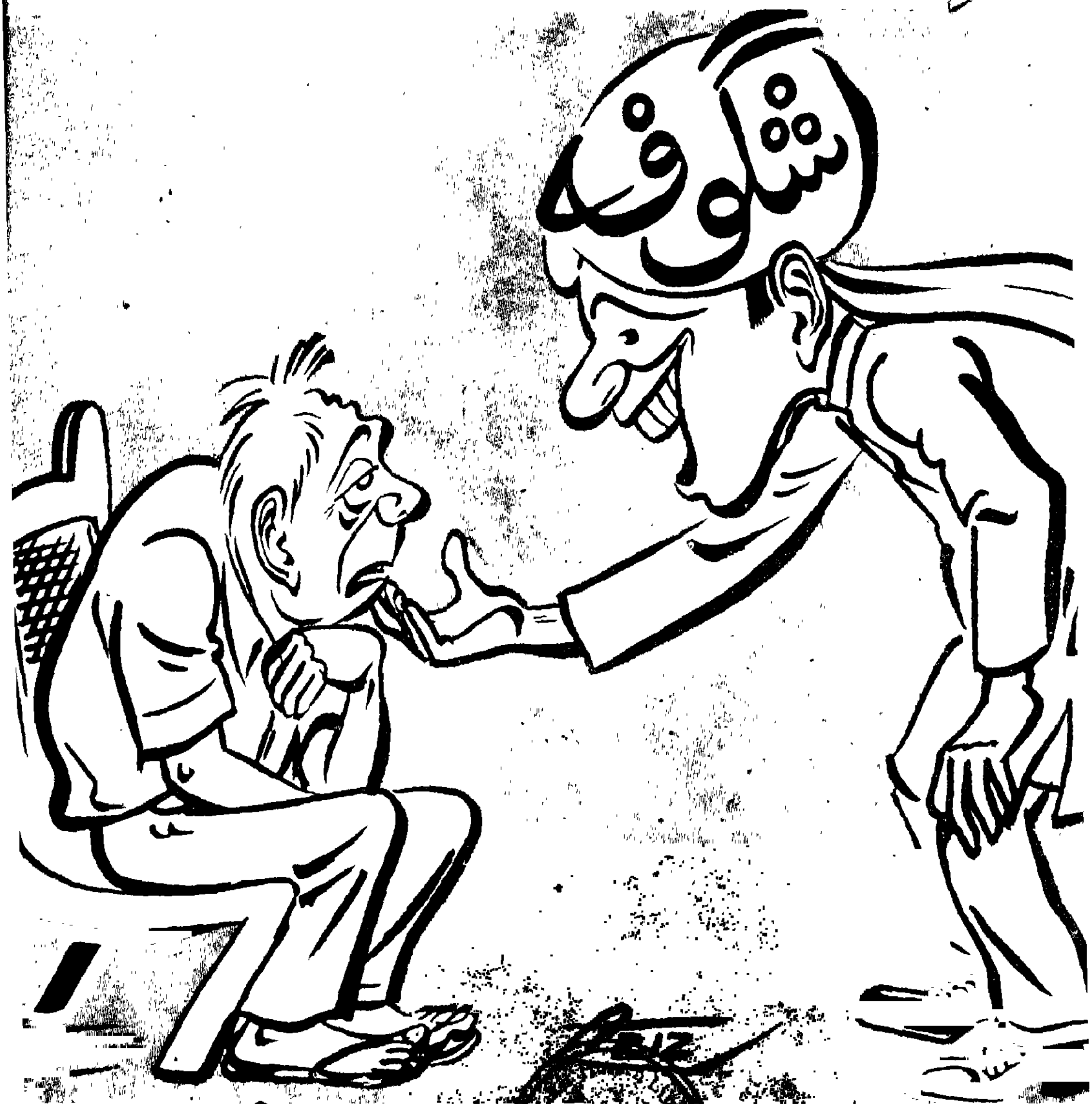


Vol. 17 Copy 1 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H/H
January 1984 Phone : 57









FEBRUARY 1984 **Rs. 3-(**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ — حیدرآباد

جلد ۱۷ ——— فروری ۱۹۸۴ء ——— شمارہ ۲

ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال

قیمت فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

کتابت : محمد عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ ، بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 57716

شگوفہ

کا

ہندوستانی مزاح نمبر

۱۹۸۴ء

بہت جلد شائع ہوگا

مہمان مدیر ——— یوسف ناظم

اردو - انگریزی - ہندی - بنگالی - تمل - تلگو - پنجابی - کشمیری - مراٹھی - اڑیا - ملیالم - سندھی - کنڑی - میتھلی - اور راجستھانی کے مزاحیہ نثری ادب کا جائزہ - منتخب مضامین کے تراجم - اردو کے دس مصنفین کے خود نوشت خاکے اور مضامین - ملک کے مشہور تنقید نگاروں کی آرا اور انٹرویو - اردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل ببلوگرافی اور مقالہ نگاروں کی تصاویر۔

ضخامت: تقریباً ۲۵۰ صفحات — قیمت: ۲۰ روپے، مجلد ۲۵ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرما لیجئے

سالانہ خریداروں سے دس روپے، پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مشتاق احمد یوسفی

مشاعرہ کی صدارت

"حیدرآباد دکن اسوسی ایشن، لندن کے زیرِ اہتمام حال ہی میں منعقدہ ایک مشاعرہ کی صدارت برِصغیر کے نامور طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے فرمائی۔ جناب حمایت اللہ نے موصوف کی صدارتی تقریر کا ٹیپ ہمیں فراہم کیا ہے۔ شگوفہ کے قارئین کی دلچسپی کے لئے مذکورہ تقریر من و عن شریکِ اشاعت ہے۔" (مدیر)

خواتین و حضرات! مجھے شکریہ کا فرض بھی ادا کرنا ہے۔ اور معذرت کا فرض بھی۔ شکریہ اس عزت افزائی کا جو آپ نے بخشی اور معذرت اُس تقریر کی جس کا عذاب اب آپ کو جھیلنا پڑے گا۔ ہوا یوں کہ جناب افتخار عارف، جناب رحمت اللہ ذرا اس وقت غائب ہیں، جناب عزیز احمد اور جناب مصطفیٰ علی خاں جو سب پیشے کے اعتبار سے بینکرس ہیں، یہ چاروں حضرات نہ جانے کب سے پانچویں سود خور کی تلاش میں تھے، ہم پانچوں میں سود کے علاوہ بھی ایک قدرِ مشترک نکلی۔ اور وہ ہے شعر و ادب سے دلچسپی۔ گمان غالب ہے کہ ان چاروں حضرات کی نگاہ افتخار اس گنہگار پر اس لئے پڑی کہ میں نسبتاً زیادہ طویل عرصہ سے ان دونوں مدعتوں میں مبتلا ہوں۔ ذاتی تجربہ کی بناء پر عرض کرتا ہوں کہ آدمی کو سود کھانے کا چسکہ پڑ جائے تو شعر و شاعری کی لذت بھی بڑھ جاتی ہے۔ پہلی شرط یہ کہ عاقبت خراب ہوتی ہے اور دوسری سے دنیا ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ جناب مصطفیٰ علی خاں صاحب نے چند روز پہلے مجھ سے فون پر پوچھا کہ آپ بیٹھتے کہاں ہیں؟ عرض کیا کہ فی الحال کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ آئندہ کا حال خدا جانے۔ بولے "میرا مطلب ہے دفتر کہاں ہے"؟ انھیں دفتر کا پتہ بتایا جو اُن کی سمجھ میں بہت مشکل سے آیا۔ اس لئے کہ ہماری بلڈنگ اس سے دوسری یا تیسری بلڈنگ ہی تھی۔ جسے بینک، بینک آف انگلینڈ کے اِرد گرد ہیں۔ جسے دنیا بھر کے بینکرس پیار میں the old lady of thread needle street کہتے ہیں حالانکہ کبھی نہیں کہتا کوئی بینکر اسے thread making needle street کے لغوی معنی کچھ بھی young ہوں لیکن وہ حقیقت میں کوچہ سود خواراں جس میں خوار ہونا اور عزت سادات گنوانا ہمارا مقدر ہو چکا ہے۔ ؎

پیر تو [illegible] سود خوار کوئی پوچھتا نہیں

ں نے عرض کیا کہ صدارت کی بات تو بعد کی بات ہے میں تو ادبی محفلوں میں شرکت بھی نہیں کرتا کہ طبعاً و اصولاً گوشہ نشین ہ پردہ نشین آدمی ہوں۔ لیکن انہوں نے نہ مانی پھر حضرت ساقی فاروقی اور جناب افتخار عارف نے نہ صرف مجھے پردہ توڑنے پر اکسایا، نہ صرف اپنے ہاتھ سے گھونگھٹ اُٹھایا بلکہ اسی عالم میں مع گھونگھٹ یہاں مجھے اُٹھا لائے۔

ع　　　لایا ہے تیرا شوق مجھے پردے سے باہر

گلے وقتوں میں جو مقطع شخص پہلے مبتدی شاعر سے آخری استاد تک ہر غزل کو مطلع تا مقطع ایسے مبہم سکوت سے سنتا کہ ھاگ سے گھاگ آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ اس سکوتِ مسلسل کا باعث سخن شناسی ہے یا نیند کا غلبہ۔ اس شخص کو اس مانے میں میر مشاعرہ کہتے تھے۔ وہ بیچارہ منہ تک آئے ہوئے فقروں کو دبائے غسل خانے جانے کے بڑھتے ہوئے فطری قاضوں کو اور اپنی غزل کو ضبط کئے سات آٹھ گھنٹے تک شبِ مہتاب میں بیٹھا رہتا تھا۔ شب مہتاب اس لئے کہ اس مانے میں (پرانے زمانے کی بات ہے) اندھیر گھپ راتوں میں مرد ایک دوسرے کو ایسے شعر سنانا خلاف تہذیب سمجھتے تھے۔ س صبر و تحمل کے ساتھ ساری رات (کہ مشاعرے رات بھر ہوتے رہتے تھے) سو سنار کی سہتا رہتا تھا۔ فقط اس امید میں کہ خر میں ایک لوہار کی یعنی جب اس کی باری آئے گی تو سب کسر نکال لے گا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے میر مشاعرہ ہمیشہ شاعر ہوا کرتا تھا۔ خراب شعر کہنا بھی اصولاً اس کے فرائض استحقاق صدارت میں داخل تھا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ سودا، میر اور غالب کبھی میر مشاعرہ بنے ہوں۔ ہاں مفتی صدر الدین آزردہ، جو غالب کو جیل بھیجنے کے علاوہ خراب شعر کہنے کے بھی مرتکب تھے، بارہا ان ہی کی زندگی میں میر مشاعرہ بنائے گئے۔ اس زمانے میں نثر کا استعمال صرف داد دینے ور ایک دوسرے کے کلام میں زبان کی غلطیاں نکالنے کے لئے رائج تھا۔ اور یہ بڑی سمجھ داری کی بات تھی۔ اس لئے کہ جو بات شعر میں بے جھجک اور بے جھجک کہی جا سکتی ہے وہ اگر میں سلیس نثر میں کہہ دوں تو لوگ وہیں بلکہ یہیں میرا سر پھاڑ دیں۔ مطلب آپ سن چکے ہیں۔ تشریح عرض کر دیتا ہوں کہ نثر کو جذبات کی نکاسی کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ غزل کی طرح نثر میں یہ بھی لازمی نہیں کہ ہر لائن میں ایک نکتہ ضرور ہو۔ بعض بعض غزل تو ہر شعر میں نکتوں کی بھرمار کی وجہ نکتہ دانی معلوم ہوتی ہے۔ تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ میر مشاعرہ کب رخصت ہوا۔ اور اس کی جگہ صدر نے کب لی۔ اور اب تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ صدارت کے لئے مجھ جیسے حضرات کو ترجیح دی جاتی ہے جن کے متعلق ہر طرح ٹھوک بجا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ انھوں نے عمر بھر کوئی شعر نہیں کہا۔ اور آئندہ بھی کہنے کا کوئی احتمال نہیں۔ بلکہ یہ تک جانچ پڑتال کر لیتے ہیں کہ اس کے سمجھنے کا بھی اندیشہ نہیں۔ یہ عاجز جو آپ کے سامنے کھڑا ہے ان تینوں معیار کی شرائط پر پورا اُترتا ہے۔ میں س مرحلۂ عمر میں اگر مشتعل ہو کر ایک شعر بھی کہہ دوں تو اگر اچھا ہوا تو لوگ اسے افتخار عارف سے منسوب کر دیں گے۔ ور اگر بُرا نکلا تو میرے پیچھے ساقی فاروقی کے ہاتھوں ایسے اُڑیں گے کہ شعر و شاعر دونوں مر جائیں گے، ساقی فاروقی کا خطرہ باقی رہ جائے گا۔ ویسے بھی ہر کام کا ایک وقت اور ایک عمر ہوا کرتی ہے۔ مجھے تو تین بالکل واضح مدارج نظر آتے ہیں۔ ادھیڑ عمر میں نصیحت، جوانی میں فضیحت، اور بڑھاپے میں وصیت۔ ان مرحلوں کے درمیان کسی وقت میں

اللہ کے بندے پر وہ مقام آسکتا ہے جس کی طرف حضرت جگر مرادآبادی نے اشارہ کیا ہے ۔ ؎

ہجر سے شاد وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

ہم بھی اس شعر پر ایک مُدت سے اُس وقت تک سر دھنتے رہے جب تک کہ ہمارے یار طرحدار مرزا عبدالودود بیگ نے یہ نکتہ دریافت نہ کیا کہ یہ صورتحال یعنی ہجر سے شاد اور وصل سے ناشاد اس صورتحال کا محل صدارت طبیعت کو نہیں صحت کو دیا جانا چاہیئے۔ غیر شاعر کو صدارت سونپنے کا یہ ضمنی فائدہ ضرور ہے کہ اس کا کلام سُننا نہیں پڑتا لیکن معلوم نہیں مشاعرے کے بعد تقریر کی بدعت کس نے شروع کر کے سارے فائدے کو خاک میں ملا دیا۔ اللہ اس کا گناہ معاف کرے وہ بخشنے والا ہے۔ میں سنجیدگی سے اس رسم کے خلاف ہوں۔ اس لئے کہ نثر سے ہی سامعین کی آزمائش کرنا کسی طرح ثواب میں داخل نہیں۔ نجی اور مختصر محفلوں کی اور بات ہے۔ بڑے مشاعروں سے بہت گھبراتا ہوں یاد ش بخیر، ۱۹۶۵ء میں سکھر کی ایک محفل مشاعرہ کے خطبہ افتتاحیہ میں میرے منہ سے نکل گیا کہ زندگی میں مجھے پہلی مرتبہ مشاعرے کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ معلوم نہیں مجھے دوسری مرتبہ موقع دیا جائے یا نہیں لہذا میں اس عقیدے کا اسی وقت اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ جو شعر بیک وقت پانچ، دس ہزار آدمیوں کی سمجھ میں فوراً آجائے وہ شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کچھ اور شئے ہے اس پر شعرائے کرام بُرا مان گئے۔ حالانکہ مشاعرے میں سو (۱۰۰) سامعین سے زیادہ نہیں تھے۔ میں نے اسی وقت معافی مانگی۔ اپنے الفاظ واپس لئے۔ اور سب کے سامنے یہ اقرار کیا کہ جو شعر بیک وقت پانچ، دس ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آجائے وہ بے شک شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ کہنے والے اور سُننے والے آدمی دونوں انسان ہوں۔ ؏

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

اردو مشاعروں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شعرائے عظام اور سامعین کرام نے دونوں بیک آواز ہو کر صاحب صدر کو "ہوٹ" کیا آج سولہ برس بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ مشاعرے کی صدارت سے نوازا گیا ہوں۔ جس کے لئے حیدرآباد دکن اسوسی ایشن کے معزز اراکین و عہدے داران کا سرتاپا سپاس گزار ہوں ہاں، ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر اتنا اور بتاتا چلوں کہ مجھے لندن میں ڈھائی سال گزرے اس عرصے میں صرف ایک بار اپنے ادبی اعتکاف کے حجرے سے باہر نکلا ہوں۔ ایک محفل میں شرکت کی دعوت ملی۔ میں نے مدعو کرنے والی خاتون سے اپنا پٹا پٹایا پیٹنٹ فقرہ دہرایا کہ بی بی گوشہ نشین، بلکہ پردہ نشین آدمی ہوں، بولیں "اسی لئے تو آپ کو بلا رہے ہیں۔ خواتین کی محفل ہے اگر آپ کو پردہ پر اتنا ہی اصرار ہے تو عینک اتار کر بیٹھ جایئے۔" خاتون محترم کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ عینک اتارنے کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جب اس کے شیشے میری طرح آدھے آدھے انچ موٹے ہوں۔ اللہ بخشے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو کہ سارے جہاں کے استاد تھے۔ جب اسّی (۸۰) سال کے پیٹے میں ہوئے تو ان کی محفل میں روز حاضری دینے والا ایک منہ چڑھا شاگرد ایک دن شام کو پہلی مرتبہ نئی نئی عینک لگا کر آیا۔ صوفی صاحب قبلہ دیکھتے ہی بولے "برخوردار عینک لگا کر تو تم بالکل اُلّو نظر آتے ہو"۔ شاگرد ہاتھ جوڑ کر بولا "کہ عینک نہ لگاؤں تو

اب اُتو نظر آئیں گے۔" خیر! میں نے اس محفل میں عینک لگائے ہوئے ہی حاضری دی۔ اور بصد التزام آخری صف میں بیٹھا۔ آخری صف میں بیٹھنے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی پیچھے سے میرے سر کے ناقابلِ دید جغرافیہ کا مطالعہ نہ کرے۔ اس وقت یہ اندازہ ہوا کہ صدارت کرنے میں یہ بھی فائدہ ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ میں سب کو دیکھ سکتا ہوں کہ کون کدھر دیکھ رہا ہے۔ اور مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے مجھے اس ضمن میں کبھی کوئی مغالطہ نہیں رہا۔ اللہ کا کرم بڑا کرم ہے کہ میری شکل وصورت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ کسی کا ایمان متزلزل ہو جائے۔ میں نے دیکھا کہ اس ستھری محفل میں (اسی محفل کا ذکر کہ جہاں میں گیا تھا) بے لوث اور نرا مَرد صرف میں تھا۔ نرے مَرد سے میری مُراد یہ ہے کہ بقیہ مرد حضرات کے vested interest تھے مطلب یہ کہ یہ بقیہ مَرد حضرات ان محترم خواتین کے شوہر تھے جو اس نشست میں اپنا کلام پڑھ رہی تھیں یا افسانے سنا رہی تھیں۔ میں واحد مَرد تھا جو بغیر ازدواجی دباؤ کے وہاں بیٹھا رہا۔ اور ہاں ابھی جو لفظ "مَرد حضرات" اضطراراً میرے منہ سے نکل گیا، تو مجھے اس اصطلاح یعنی "مرد حضرات" پر سخت اعتراض ہے۔ اردو اخباروں نے اس بھونڈی اصطلاح کو رائج کرنے میں بڑا حصّہ لیا۔ اگر مَرد حضرات سے یہ مُراد ہے کہ بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو صرف حضرات ہی ہوں۔ تو میں کیا عرض کرسکتا ہوں! اخبار والے زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور اگر حضرات سے پہلے "مرد" کی نخ محض اس لئے لگائی ضروری ہے کہ بعض خواتین بھی "حضرت" ہوتی ہیں۔ تو میں اس ضمن میں اس وقت کچھ عرض نہیں کرسکتا کہ میری بیگم اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ کچھ دن ہوئے کہ ایک صاحب نے جو لندن میں پندرہ یا بیس سال سے سکونت پذیر ہیں اپنا ایک افسانہ سنایا۔ جو کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"چھما چھم مینہ برس رہا تھا۔ ہری ہری ڈالیوں میں زرد زرد آم لٹک رہے تھے جنھیں سبز رنگ کے طوطے سُرخ چونچ سے کتر رہے تھے۔ سرسوں کے سرد کھیت میں شہتوتی رنگ کے لہنگے اور جامنی چولی پر فالسی اوڑھنی غضب ڈھا رہی تھی۔ رخساروں کے سیب دمک رہے تھے۔ ہمیں مذکورہ بالا اشیائے دہنی وخوردنی میں سے کوئی چیز بھی ناپسند نہیں تھی۔ بلکہ فالسے اور جامن پر تو اب بھی جان دیتے ہیں لیکن رنڈ سوتھ کی نیچر سے ہمیں بیر نہیں۔ اول تو اس لئے کہ وہ خوبصورت ہوتی ہے۔ دوم تو اس ظالم سے مفر نہیں جہاں دیکھو جہاں جاؤ موجود۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ محبوب کے سراپا کو ہم محکمۂ جنگلات کے تحویل میں دے دیں۔ یا یقیناً زندگی طوطا مینا سے دل لگانے میں نذر دیں۔ مولانا وحید الدین سلیم کہ اپنے وقت کے جیّد عالم اور وضع اصطلاحات کے موسس وبانی تھے ایسے ہی عالم کیف میں فرما گئے ہیں۔

> پیپل کے ہر درخت پہ طوطوں کے ہیں پرے ÷ چونچیں ہیں لال لال بدن ہیں ہرے ہرے
> چھوٹے پھلوں کو پھینکتے ہیں وہ کتر کتر ÷ نیساں برس رہا ہے زمیں پر پٹر پٹر

ان اشعار میں ہمیں تو طوطے ہی طوطے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ لگتا ہے کہ شاعر کے ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ کر پیپل تک پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں طوطوں کی پرواز پر کوئی اعتراض نہیں۔ ملال اس کا ہے کہ ان کے ساتھ روح شاعری بھی پرواز کر گئی۔ تفنن برطرف! میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ایسی بچپن کی یادوں کو فراغت میں لئے لئے پھرنے کا لُطف مجھے بھی آتا ہے۔ لیکن انگلستان میں رہنے والے اردو شاعروں اور ادیبوں کے لئے جن میں سر دست میں اپنا شمار بھی کر لیتا ہوں، اپنے گرد وپیش کے مسائل، نئی زندگی کے تجربات، تحریکیں وتقاضے فکر وفن

کے نئے مزاد نیے شاعر اور ادیب جس تکنیک کو سمجھنے اور سمجھانے کے جو وسائل اور مواقع بآسانی حاصل ہیں وہ اردو ادب میں ایک نئی توانائی اور تازگی کا ذریعہ اور ضمانت ہو سکتے ہیں۔ دراصل یہ نئی پود کا کام ہے۔ یہ اس نسل کے بس کا روگ نہیں جس کے فکر کے سوتے اور تخلیق رطوبتیں اور غدود خشک ہو چلے ہیں۔ مجھے سخن فہمی کا دعویٰ نہیں نہ کسی نسل کی طرف داری منظور ہے۔ صرف اس صورتحال کی طرف اشارہ مقصود ہے جہاں کسی کو مورد الزام نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

بوڑھوں سے نوجوان، کہاں تک وفا کریں ÷ بوڑھوں کو بھی جو موت نہ آئے تو کیا کریں

کم لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے بعد انگلستان اردو زبان کا تیسرا بڑا مرکز ہے۔ یہ بڑا چونکا دینے والا خیال ہے کہ انگلستان میں ہمارے اردو اخباروں کا جتنا سرکولیشن ہے اتنا کسی بھی غیر انگریزی زبان کے اخبار کا نہیں۔

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاتی ہیں!

کبوتر کے کابن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵	روپے
نقطہ	یوسف ناظم	مضامین	۸	"
البتہ	" "	"	۱۰	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹	"
یاد آخر	"	مضامین	۱۴	"
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵	"
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵	"
خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰	"
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰	"
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲	"
غبار خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵	"
چینا بچہ	مسیح انجم	"	۱۲	"
بہرحال	مجتبیٰ حسین	"	۷	"

"حقدار"

جوہر سیوانی

ایک صاحب تھے بہت ہی خوش مزاج و باوقار
شہر کے سُلجھے ہوئے لوگوں میں تھا اُن کا شمار

صاحبِ ادراک تھے وہ صاحبِ کردار تھے
اپنی بیوی کی اداؤں سے مگر بے زار تھے

اُن کی اَپ ٹو ڈیٹ بیوی تھی بہت فیشن پرست
وہ جوانی کے نشے میں رہتی تھی ہر لمحہ مست

اپنے شوہر سے کسی حالت میں بھی ڈرتی نہ تھی
قدر کُنبے کے کسی بھی فرد کی کرتی نہ تھی

ایک دن بیوی نے شوہر سے بہت جھگڑا کیا
اور جھگڑے میں اُنہیں ہر بات کا طعنہ دیا

شوہرِ خود دار کو طعنے بہت گزرے جو شاق
تنگ آ کر کیس اُس نے کر دیا بہرِ طلاق

جج نے شوہر ہی کے حق میں فیصلہ صادر کیا
یوں ٹلی شوہر کے سر سے زندگی بھر کی بلا

فیصلہ دے کر کہا جج نے کہ ہے اک مسئلہ
کون ذمہ دار ہوگا دونوں میں فرزند کا

جھٹ سے شوہر نے کہا بیٹے کو میں لے جاؤنگا
اِس کو میں انسانیت کی راہ پر لے آؤں گا

غیظ میں بولی وہ عورت میں اِسے لے جاؤنگی
اور میں تعلیم اِس کی اپنے گھر دلواؤنگی

یہ مرا بیٹا ہے اِس ناکارے کا بیٹا نہیں
پہلے پردہ تھا مگر اب کوئی بھی پردا نہیں

اس پہ رہ جاتی تو پیدا کچھ نہ ہوتا اے جناب
اور ممتا کے گلستاں میں نہ کھِلتا یہ گلاب

رنڈوا کہ بیوہ

جوہر سیوانی

ایک صاحب اپنی بیگم سے جو عاجز ہوگئے
رات کو آپس میں لڑتے لڑتے آخر سو گئے

صبح دَم جب آنکھ بیگم کی کھُلی تھا یہ سماں
آبدیدہ اور آزردہ نظر آئے میاں

بھول کر بیگم نے پچھلی رات کا غیظ و غضب
پیار سے شوہر سے پوچھا کرب و رنجش کا سبب

بولا شوہر، رات اک وحشت بھرا دیکھا ہے خواب
بڑھ رہا ہے جس سے میرے دل کا وہم و اضطراب

خواب یہ دیکھا کہ میں بھی ہائے رنڈوا ہو گیا
تم جہاں سے چل بسیں میرا مقدر سو گیا

بولی بیگم، یہ شرارت ہے دلِ بے تاب کی
سُن لو، تعبیریں ہوا کرتی ہیں اُلٹی خواب کی

لو جی، تم رنڈوا بنو، کیونکر گوارا ہو مجھے
میں ہی بیوہ کیوں نہ ہو جاؤں خدا ایسا کرے

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

تباہ حال شہرِ اُردو: حیدرآباد

آج سے پینتیس سال قبل حیدرآباد فرخندہ بُنیاد اُردو کا شہر تھا۔ چہار طرف اُردو کا سکہ چلتا تھا۔ سرکاری نیم سرکاری اور خانگی کاروبار اردو زبان ہی میں انجام دیئے جاتے تھے۔ حکومتِ وقت اُردو میں گزٹ اور محکمہ جاتی رپورٹیں شائع کرتی تھی۔ غور و فکر بھی اردو میں ہوتا تھا اور فیصلوں پر عمل درآمد بھی اردو میں ہوتا تھا۔ لیکن آج اُسی شہر اُردو سے اُردو شہر بدر ہوچکی ہے۔ دفاتر سے اردو غائب ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور بسوں پر اردو لکھی نہیں جاتی۔ بارہا توجہ دلانے اور اخبارات کے کئی کالم سیاہ کرنے کے بعد بادلِ ناخواستہ کبھی کبھار "اُردو نما" کسی زبان میں نام کی تختی ٹکائی جاتی ہے جسے ہم اُردو زبان تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے شہر کے دفاتر میں اردو درخواستوں کو شرف قبولیت تو بخشی جاتی ہے لیکن کوئی کاروائی نہیں کیجاتی۔ ایک مرتبہ ہم نے راشن کارڈ کے لئے اردو میں درخواست دی جو قبول تو کرلی گئی لیکن چند مہینے بعد اس درخواست کا حشر دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ افسر مجاز نے اردو میں لکھی گئی اس درخواست کو الٹا کر (پلٹا کر نہیں!) سیدھے جانب حاشئے پر بائیں جانب سے انگریزی میں اندراج کیا کہ اس درخواست کو سیٹ آرکیوز (STATE ARCHIVES) بھیجا جائے تاکہ متن کا ترجمہ حاصل ہوسکے!

شہر حیدرآباد کو کسی ہندوستانی زبان میں پہلی جامعہ قائم کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ پادشاہ وقت نے جامعہ عثمانیہ قائم کی جس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ لیکن آج یہی اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم معدوم ہوتی جارہی ہے۔ وقت کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے اُردو ایسے غائب کردی گئی کہ اب صرف اس کے ایمبلم (EMBLEM) میں "ع" ہی باقی رہا جبکہ آج کی نسل اس "ع" کو کوئی تجریدی نشان سمجھتی ہے۔ اردو کے شہر میں کل تک جو زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج تھی اس نے پہلے زبان اول کا درجہ حاصل کیا۔ پھر زبان دوم بنی اور آج کل "زبان بے زبان" بنی ہوئی ہے کہیں اردو پڑھنے والے طالب علم موجود ہیں تو پڑھانے والے نہیں ملتے اور جہاں اردو اساتذہ اور طالب علم یکجا ہوتے ہیں تو اسکول کی عمارت کا تخلیہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ایک دوست اُردو تحریک سے وابستہ ہیں۔ اُنہوں نے چند ایسے اردو مدارس کی نشاندھی کی جن کی عمارتیں بوسیدہ ہوچکی تھیں اور بچوں کی

زندگیوں کو خطرہ لاحق تھا. متعلقہ عہدہ داروں نے خبردار کیا کہ بوسیدہ عمارت میں تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ خطرہ تو اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں ہے !

زبان تہذیب ومعاشرت اور احساسات وجذبات کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ اردو تہذیب میں صنفِ نازک کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ صنفِ لطیف اور صنفِ کثیف کی گفتگو کے انداز مختلف ہیں یہی اردو کی انفرادیت ہے لیکن مرد وعورت کے مساوی حقوق کے نعروں نے اردو زبان کو اپنی اس خوبی سے محروم کردیا ہے۔ آج ہمارے شہر میں لڑکیاں صیغۂ تانیث کی بجائے صیغۂ تذکیر میں گفتگو کرنے لگی ہیں۔ ایک دن ہم تھکے تھکائے گھر پہنچے تو میز کی دراز میں خوشبو میں بسی ہوئی یہ چٹھی ملی :

"ڈیر۔ تمہارے شوہر کے آفس جانے کے بعد میں گھر آیا تھا تاکہ کچھ دیر مل بیٹھیں لیکن تمہارے ملازم نے بتایا کہ تم شاپنگ کرنے گئی ہو۔ خیر! کل اسی وقت میں پھر آؤں گا۔ . . . تمہارا اپنا" چٹھی پڑھ کر خون کھولنے لگا۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی اگلا قدم اٹھاتے بیوی نے ٹوکا "سونچ کیا رہے ہو۔ منہ ہاتھ دھوکر کھانا کھالو۔ اور ہاں شاکرہ کل ملنے آئے گی۔ میں اس کے ساتھ بازار سے تمہارے لئے سوٹ کا کپڑا لے آؤں گی۔ جس طرح وہ مردانہ باتیں کرتی ہے، مردانہ کپڑوں کا سلکشن بھی خوب کرتی ہے"!

حیدرآباد میں آج کل لوگ خالص اردو زبان میں بات چیت کو کسر شان اور ایک طرح کا عیب سمجھنے لگے ہیں۔ اکثر دو تین زبانوں کو ملاکر "کاک ٹیل زبان" میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارا دیس بھانت بھانت کی بولیوں کا دیس ہے اسی لئے کاک ٹیل زبان میں اظہارِ خیال کرنا ہمارے یہاں عیب نہیں ایک لیٹسٹ فیشن ہے اکثر ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن سے ہم اردو میں بات کرتے ہیں تو وہ انگریزی میں گویا ہوتے ہیں یا پھر اردو کہتے کہتے انگریزی ہانکنے لگتے ہیں۔ ایک صاحب نے جو خود کو اردو کا عاشق گردانتے ہیں، ہم سے کہا "اردو شاعری میں علامہ اقبال is JUST THE GREAT. اردو شاعری کی معراج بھی یہی ہے کہ لوگ اس کا اعتراف انگریزی میں کریں! آج نوجوان اردو کتابیں برسرعام پڑھنا قدامت پسندی سمجھتے ہیں۔ اردو کتاب کو انگریزی یا دوسری زبان کے اخبار کا لبادہ اوڑھ کر "کاسمو پولیٹن" جیسے لٹریچر کی طرح پڑھا جاتا ہے اردو اخبار پڑھنا تو کجا پیکنگ کے لئے بھی استعمال کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہمارے لڑکے نے اردو اخبار میں ٹفن "پیک" کرنے جانے سے انکار کردیا کیونکہ اس کے ساتھی اخبار دیکھ کر اس کی ہنسی اڑاتے ہیں کہ اس کے گھر میں اردو اخبار آتا ہے الغرض وہ تہذیب ہی نہ رہی جس کی شاخ پر اردو زبان نے آشیانہ بنایا تھا۔

ہمارے شہر میں اردو زبان سے دلچسپی اب صرف دو طبقوں میں باقی رہ گئی ہے۔ پہلا طبقہ شاعروں، ادیبوں اور نقادوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے طبقے میں سیاستداں ہیں۔ پہلے طبقہ کی اردو سے وابستگی ہمہ وقتی ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ موقتی طور پر اردو سے مہر و محبت کا اظہار کرتا ہے۔

ہمارے ایک انگریز زدہ دوست گھریلو کام کاج کے لئے استعمال کی جانے والی زبان کو مادری زبان قرار دیتے ہیں۔ آج اردو کا یقیناً یہی موقف ہے۔ بعض لوگوں کو فلمی مکالمے اور گانے بے حد پسند آتے ہیں جو اردو میں لکھے گئے ہوں لیکن یہ

لوگ اپنی پسند پر ہندی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ بعض لوگ اردو سے وابستگی کے اظہار کے لئے فلمی رسالوں اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آج ہمارے شہر میں کئی افراد کی اُردو دانی فلمی رسالوں اور جاسوسی ناولوں کی مرہون منت ہے۔ اس سے کچھ بات آگے بڑھے تو قوالیوں اور قوالی نما مشاعروں پر سر دھنتے ہیں۔ جیسے ہی قافیہ اور ردیف کی تعریف معلوم ہو جائے جناب شاعری کرنے لگتے ہیں۔ فلمی دھنوں میں مصرعے فٹ کرکے مشاعرے پڑھنے لگتے ہیں۔ پابند شاعری راس نہ آئے تو آزاد مشاعر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جو حضرات شعری ذوق نہیں رکھتے وہ افسانہ نگار یا ناول نگار ضرور بن جاتے ہیں۔ آج کل نثر نگاری میں صفحے کالے کرنا بھی نہیں پڑتا۔ صرف چند الفاظ پر مشتمل منی کہانیاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ اور جو حضرات فکشن میں بھی ناکام رہتے ہیں وہ تنقید نگار بن جاتے ہیں۔ ادبیات میں سب سے آسان صنف تنقید نگاری ہے۔ بس یہیں پر اردو کا ارتقائی عمل ختم ہوتا ہے۔

ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ اردو زبان سے سیاستدانوں کو بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ انتخابات کے موسم میں اردو، حکمراں اور اپوزیشن جماعتوں کی زبان بن جاتی ہے۔ ہر قائد اردو کا حامی، ہمدرد، رسیا اور شیدائی بن جاتا ہے۔ بار بار یقین دہانی کی جاتی ہے کہ اردو بلا لحاظ مذہب و ملت ہندوستان کی زبان ہے۔ سرزمین ہند پر پیدا ہوئی۔ یہیں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ہمیں نے اسے سنوارا، سجایا (اور پھر برباد کیا!) آج کا معشوق وعدے وفا کرنے لگا ہے لیکن سیاستداں ماضی کے معشوق سے بھی آگے نکل گئے ہیں! انتخابات کے قریب اخبار میں خبریں چھپتی ہیں، منسٹر صاحب اُردو سیکھ رہے ہیں، وزیر اعلیٰ نے اُردو وفد سے بل کر تلگو میں کہا کہ انھیں اردو پسند ہے، فلاں قائد نے اردو کے بارے میں طویل ترین تقریر کی۔ آخر میں موصوف نے صرف ایک جملہ اردو میں کہا "ہمرے اُوپر ووٹ ڈالو" ایسی تمام خبریں اردو زبان کے لئے اعزاز ہوتی ہیں۔ جلی حرفوں میں ان کی اشاعت عمل میں آتی ہے کبھی کبھار سیاستدان ایک آدھ غلط شعر پڑھ لیں تو صاحب اُردو کے چاہنے والوں کی عید ہوگئی سیاسی قائدین اردو کے تعلق سے دلچسپ بیانات بھی جاری کرتے ہیں۔ ایک قائد نے کہا "اردو شیروانی کی طرح ہے۔ شیروانی اور اردو کو آجکل مخصوص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے قائد نے کہا "اردو کا بچپن یتیمی میں گزرا، جوانی بیوگی میں بیت گئی اور اس کا بڑھاپا بے سہارا ہے اُردو کو زبردستی اور پیٹرو ڈالر کے عوض مشرف بہ اسلام نہ کیا جائے اسے سیکولر رہنے دیا جائے"۔

حیدرآباد میں ادبی محفلیں، مشاعرے اور زندہ دلان حیدرآباد کی تقریبات پابندی سے منعقد ہوتی ہیں۔ اندرون و بیرون ملک سے ادیب و شاعران تقریبات میں حصہ لیتے اور داد پاتے ہیں یہی حیدرآباد کی اردو تہذیب کی باقیات ہیں!

ویسے ہمارے شہر میں اردو کو زندہ رکھنے کے لئے کئی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں اُردو کی انجمنیں، اکاڈمیاں، بورڈ، اور مختلف اسوسی ایشن ہیں۔ کوئی محبِ اردو ہے تو کوئی نگہبانِ اُردو اُردو کے لئے ان اداروں کا وجود اسی طرح ہے جیسا کہ سکندر اعظم نے مرتے وقت کہا تھا

"میں کئی اطبّا کی موجودگی میں دم توڑ رہا ہوں"۔

OO

اسمٰعیل آذر

سیاسی جلسے میں مشاعرے کا انعقاد

اک ادارہ، مالی حالت جس کی تھی ناگفتنی
اس کی صحت کے لئے ترکیب کچھ سوچی گئی
تاکہ ہر ممبر کو حصے میں ملیں کچھ آم بھی
اور اس کے ساتھ پائیں گٹھلیوں کے دام بھی
کس مپرسی میں کہاں تک تیرتی کاغذ کی ناؤ
ایک دن سکریٹری کو آیا اس پہ خوب تاؤ
ٹھان لی دل میں کہ اب ہرگز نہ کچھ مانیں گے ہم
اس زبوں حالی کا بھرتہ ہی بنا ڈالیں گے ہم
الغرض جلسہ بلانا طے ہوا ایک شاندار
تاکہ نخلستان نکلے اندرونِ ریگ زار
اصل مقصد تھا حکومت سے رقم کچھ اینٹھ لیں
عام لوگوں کی توجہ کا بھی کچھ ساماں کریں
پھر تو پورے جتن سے اردو کا گن گایا گیا
بعد ازاں انگلش میں دعوت نامہ چھپوایا گیا
کارڈ میں لکھا منسٹر اور لیڈر آئیں گے
اپنے بھاشن سے ادارے میں لہو دوڑائیں گے
سرد پڑ جائیں گے تقریروں کے جب سارے دیئے
لائیں گے تشریف شاعر شمع فکر و فن لئے
الغرض لیڈر بھی اور شاعر بھی بلوائے گئے
کچھ گویئے اور مراثی بھی وہاں لائے گئے
شاعروں نے وقت سے پہلے ہی کیں تیاریاں
راہ بھر تکنے لگے لیتے ہوئے انگڑائیاں
آخرش وہ وقت دکھلا ہی دیا اللہ نے
شاعر دنیا کو جب یکجا کیا اللہ نے
ایک آئے وعدۂ دام و درم لب پر لئے
دوسرے خالی شکم، اشعار کے دفتر لئے
چل پڑا پھر لیڈروں کے بھاشنوں کا سلسلہ
بند کر کے رکھ دیا مجمع کا جس نے ناطقہ
ایک جب جاتا تو اٹھ کر دوسرا آتا رہا
روغنی تقریر سے امداد فرماتا رہا
ایک بھاشن کی طوالت پون گھنٹہ کم سے کم
اور شاعر تھے کہ بولائے ہوئے بیٹھے تھے دَم
جھانکتے پیہم وہ آدھی کھول کر اپنی بیاض
اور چپکے چپکے پھر کرتے ترنم کا ریاض
یک بہ یک مائک سے اک آواز گونجی صاحبان!
آج کا جلسہ رہا ہے کامیاب و کامراں
آج کا دن کم نہیں ہے صاحبو کچھ عید سے
لیڈروں کے صدقے گھر لوٹیں گے ہم اُمید سے
شاعروں کو اب کوئی زحمت نہ دیں شاید عوام
اس لئے جلسے کا کرتے ہیں یہیں ہم اختتام"
سن کے یہ اعلان کھسکے سارے محمود و ایاز
انگلی کانوں میں پھنسائے رہ گئے اُردو نواز
آج کل بلوائی جاتی ہے سیاسی ٹیم جب
اکسٹرا کی لسٹ میں ہوتے ہیں شاعر سب کے سب

سید سوتی سرن کیف
(چنڈی گڑھ)

شرکت حضرت ادیبؔ کی ایک اُردو کانفرنس کے

اگر آدمی کے پاس فرصت اور پیسہ دونوں ہوں تو اسے کچھ نہ کچھ خرافات سوجھے گی، ہی. ہمارے بزرگوار
، ناتھ نظر کو بھی ایک زبردست خرافات سوجھی. خود یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدے سے رٹائر ہوئے ہیں، بیوی
، نہیں، اکلوتا بیٹا ایک چھوٹی فیکٹری کا مالک ہے. چنانچہ ان کی شاندار کوٹھی میں صرف تین افراد خانوادہ رہتے
، وہ خود اور ان کا بیٹا اور بہو. پوتا پوتی کوئی نہیں ہے. کتب بینی کا بہت شوق ہے لیکن آدمی ہمیشہ کتب خانے
تو بیٹھا نہیں رہ سکتا، کچھ سماجی زندگی بھی چاہیئے. رٹائرمنٹ کے بعد سماجی زندگی جیسی جنس کمیاب ہو جاتی
، اور اِدھر اُدھر سے دستیاب کرنی پڑتی ہے. یہی مسئلہ قبلہ نظر صاحب کو درپیش ہے.

ایک روز میرے دفتر آ گئے اور کہنے لگے "نظامی صاحب، کیا خیال ہے آپ کا؟ اُردو دُنیا میں بہت تعطل دکھائی
، دے رہا ہے. کچھ ہنگامہ نہ کر ڈالا جائے؟"

میں نے ہنس کر کہا "کیا کرنا چاہتے ہیں؟ نوحۂ غم یا نغمۂ شادی؟"

کہنے لگے "کچھ ایسا ارادہ ہے کہ نوحۂ غم اور نغمۂ شادی دونوں ساتھ ساتھ ہوں".

"کس طرح؟"

"ایک عدد صوبائی اُردو کانفرنس کر کے. دونوں باتیں ہو جائیں گی. شادی جیسی چہل پہل بھی رہے گی اور اُردو کی
حالی پر سینہ کوبی بھی ہو گی".

بہت دیر تک ہم لوگ ہنستے رہے. مجھے اس تجویز میں کوئی اعتراض کی بات نہیں دکھائی دی. اچھا ہی ہے. مجھے بھی
عوام کے سامنے اپنی ادبی حیثیت ثابت کرنے کا موقع ملے گا اور نظر صاحب کو پبلک لائف میں آنے کا بجا طور پر موقع
ملے گا. دس بیس ہزار روپیوں کا انتظام نظر صاحب کے صاحبزادے کے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہے، کچھ خود لگا دیں گے

کچھ اپنے ساتھی مالکان کارخانہ جات سے دلوائیں گے۔ تنظیم کے کام میں نظر صاحب خود کسی سے کم نہیں ہیں۔ جان پہچان بھی اچھی خاصی ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ اگلے اتوار کو ایک مخصوص میٹنگ کی جائے جس میں کانفرنس کی مفصل اسکیم بنائی جائے۔

اگلے اتوار کو نظر صاحب کی کوٹھی میں میٹنگ ہوئی۔ اس میں میرے علاوہ ریٹائرڈ پروفیسر مُنیر انصاری، پروفیسر فکر، شیر پنجاب رستوران کے مالک سردار شیر سنگھ، جلال ادب کے سکریٹری وکیل حشمت اللہ اور قتالِ ادب کے صدر جناب ضغیم صدیقی بھی شامل تھے۔

میں نے میٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ضغیم صاحب اور حشمت صاحب سے کہا "مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ اس کانفرنس میں پیالے طشتریوں کا لین دین نہ ہونے دیں گے"۔

فکر صاحب کے علاوہ کسی کو ادیب جھانسوی کے گھر کی شعری نشست کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ دونوں مخاطبین کچھ شرما گئے۔ اپنی صفائی میں اُنہوں نے جو کچھ کہا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ان کی انجمنیں ادبی انجمنیں ہیں پاگل کتوں کے جھنڈ نہیں اور روز کا تماشہ ادیب کی حماقت کی وجہ سے ہوا تھا کیوں کہ اس نالائق نے اپنی چالاکی میں دونوں انجمنوں کے نوجوان لڑاکین ہی کو گھسیٹا تھا، عہدے داروں نے نہ نشست میں دلچسپی دکھائی تھی نہ اس میں شامل ہوئے تھے۔ یہ غلطی ضرور ہوئی کہ نوجوانوں کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا۔ جہاں تک صوبائی کانفرنس کا تعلق ہے اس میں کسی گڑبڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ سبھی لوگ نظر صاحب کا بھی احترام کرتے ہیں اور میرا (نظامی کا) بھی۔

ادیب کا ذکر شروع ہونے پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ میٹنگ میں ان کے ذکر خیر کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا خوش قسمتی سے مُنیر انصاری نے مناسب تنبیہہ کر دی۔ چنانچہ ادیب صاحب کے متعلق صرف پندرہ بیس منٹ تک باتیں ہوئیں۔

طے ہوا کہ دو روزہ کانفرنس ہو پہلے روز دن میں افتتاحی اجلاس ہو جس میں گورنر، چیف منسٹر اور وزیر تعلیم کی شمولیت کا یقین دلایا گیا۔ اسی شام کو ایک مشاعرے کا پروگرام رکھا گیا جس میں پانچ مقامی اور پندرہ بیس بیرونی شعرا کی شمولیت ہوتی تھی۔ دوسرے روز اردو ادب کے مسائل پر ایک سمینار منعقد کرنے کی تجویز کی گئی جس میں مقامی لوگوں میں مُنیر انصاری کو اور بیرونی مندوبین میں چار اصحاب کو مختلف موضوعات پر مقالے پڑھنے کی دعوت دینا طے کیا گیا۔ ایک تجویز اتفاق رائے سے اور بغیر بحث و مباحثے کے ایک منٹ کے اندر ہی منظور کر لی گئی کہ اس بات کی پوری احتیاط رکھی جائے کہ حضرت ادیب جھانسوی کا دخل کسی اجلاس میں نہ ہو سکے۔

دو مہینے بعد کانفرنس منعقد ہوئی۔ نظر صاحب کی تنظیمی لیاقت، سردار شیر سنگھ کی مشقت اور مُنیر صاحب اور فکر صاحب کے سنجیدہ تعاون سے کانفرنس ہوئی اور خوب ہوئی۔ مقامی پریس ہی نے نہیں مشہور اخبارات نے بھی کانفرنس کے پہلے اور بعد میں کانفرنس سے متعلق بہت حوصلہ افزا رپورٹیں چھاپیں۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا اور اس میں مخالف انجمنوں نے نہایت خوش خلقی کا ثبوت دیا۔ سمینار اور زیادہ کامیاب رہا اور سارے مقالات اور ان سے متعلق سوال و جواب بعد میں کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔

اتنی کامیابی کے باوجود منتظمین ایک معاملے میں بالکل ناکام رہے۔ طے ہوا تھا کہ ادیب جالنوی کو کسی اجلاس
ں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔ ہوا یہ کہ وہ شروع سے آخر تک ہر اجلاس میں جلوہ نما رہے۔

چونکہ کانفرنس کی شروع ہی سے تشہیر کی گئی تھی لہٰذا یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ ادیب صاحب کو اس کی خبر نہ لگتی۔
دں نے ایک مہینے تک مجلس استقبالیہ کے ہر ممبر کے پاؤں پکڑے کہ انھیں دعوت نامہ ضرور ملے۔ خوشامد سے کام نہ
ا تو جھگڑا کیا۔ جھگڑے سے کام نہ چلا تو پھر خوشامد کی۔ لیکن ہر حربہ بے کار ثابت ہوا۔ ہر ممبر نے معذوری ظاہر کی اور یہ
ر پیچھا چھڑایا کہ ذاتی طور پر تو میں ضرور تمہیں بلانا چاہتا ہوں لیکن دوسرے سبھی لوگ اس بات کے خلاف ہیں۔

ادیب صاحب ہار ماننے والے ہوتے تو ادیب صاحب ہی کیوں ہوتے؟ روبرو نبرد آزمائی میں کامیاب نہ ہوئے
شبخون مارا۔ کانفرنس کے انتظام کے لئے متعین پچیس تیس نوجوان کارکنوں میں سے ہر ایک سے ملے لیکن کامیاب نہ
ئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے وجود کے خطرے سے ہر کارکن کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک کارکن نظر صاحب سے سخت ناراض
کیوں کہ اُنہوں نے اس نوجوان کی سرزنش ایک لڑکی کو چھیڑنے پر سرِ عام کر دی تھی۔ چنانچہ ادیب نے اس سے معاملہ
ا۔ اس کے سامنے نظر کو بیس پچیس گالیاں دینے کے بعد اسے لالچ بھی دیا کہ ڈائرکٹر سے تمہاری ملاقات کرواکر تمہیں اسپورٹس
رٹمنٹ میں کوئی ملازمت دلوا دوں گا۔ چنانچہ جس وقت دوسرے منتظمین گورنر کے انتظار میں سراسیمہ تھے (کیونکہ انہیں
یں آدھ گھنٹے کی دیر ہو گئی تھی) اس نوجوان نے ادیب صاحب کو افتتاحی اجلاس کے اندر اسمگل کر دیا۔ ہال میں آتے
بعد ادیب صاحب کو روکنا کس کے بس کی بات تھی؟ وہ نہ صرف بیٹھے بلکہ اگلی قطار میں بیٹھے کیوں کہ کانفرنس کی ٹیلی ویژن
ہی بننے والی تھی اور ایسے مواقع پر ادیب صاحب اپنے چہرۂ مبارک کو حتی الامکان کیمرے کے نزدیک رکھا کرتے تھے۔

رات کے مشاعرے کا انتظام فکر صاحب کے ذمہ تھا۔ افتتاحی اجلاس ہی میں ادیب نے فکر کو گھیرا۔ اُس وقت اُنہوں
بالکل ظاہر نہ کیا کہ فکر نے ان کی شان میں جو ہجویہ نظم کہی تھی اس کا انہوں نے بُرا مانا ہے یا اس سلسلے میں ہر ادب نواز
سامنے چار چار پانچ پانچ بار فکر پر تبرا پڑھا ہے۔ فکر صاحب دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے میں اتنے اُلجھے تھے کہ انہیں
ہ کر ٹال دیا کہ تمہیں مشاعرے میں شرکت کا موقع دیا جائے گا۔ قسمت سے دو چار کارکن اس بات کے گواہ بھی تھے چنانچہ
کی مدد سے جناب کو مشاعرے میں بھی داخلہ مل گیا۔ علی گڑھ کے نجمی صاحب کو میر مشاعرہ بنایا گیا تھا۔ موقع نکال کر ادیب
ب نے ان کی گردن پکڑی اور انہیں یقین دلایا کہ شعراء کی فہرست میں اگر ان کا نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو محض
ہوا کیونکہ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ ان سے بڑا مزاحیہ شاعر ہندوستان میں کوئی نہیں ہے۔ نجمی صاحب کو مزاحیہ ادب میں
ی نہ تھی اور نہ اس ادب کی واقفیت ہی۔ چنانچہ اُنہوں نے ان کی بات کا یقین کر لیا اور شعراء کی فہرست میں ان کا نام
آگیا۔ ادیب صاحب خوش خوش بیرونی شعراء سے متعارف ہوئے اسی عرصے میں سردار صاحب نے معاملے کو
لیا تھا۔ اُنہوں نے نذیر انصاری کو بیچ میں ڈال کر نجمی صاحب کو اصل معاملے سے واقف کر دیا اور ادیب صاحب کا نامِ نامی
خاموشی سے فہرست میں داخل ہو گیا تھا اسی طرح خارج بھی ہو گیا۔

...جب صرف چار پانچ شعراء پڑھنے کو رہ گئے تو ادیب کا ماتھا ٹھنکا لیکن اب کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اور فکر صاحب نے مل کر پکا انتظام کر لیا تھا۔ میر مشاعرہ کے چاروں طرف اتنا سخت دفاعی گھیرا ڈال دیا گیا تھا کہ ہزار کشمکش کے باوجود مشاعرے کے دوران ادیب صاحب ان کے پاس نہ پہنچ سکے۔ مشاعرے کے بعد نجمی صاحب کو ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ان کی موجودگی کا ادیب صاحب کو گمان تک نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر ادھر ادھر بوکھلائے پھرتے اور مشاورت کر کے فکر صاحب کی اور میری شان میں گالیوں کے قصیدے پڑھنے کے بعد ادیب صاحب تشریف لے گئے۔ اس بوکھلاہٹ میں ان کا ایک نقصان ہو گیا۔ اگر بوکھلائے نہ ہوتے تو شعراء صاحبان کو دیئے گئے ڈنر میں داعی خود کی حیثیت سے شامل ہوتے لیکن انہیں جب تک اس بات کا ہوش آیا تب تک سرکاری بس شعراء صاحبان کو لے کر چار میل دور ڈنر کے لئے معینہ ہوٹل کی طرف روانہ ہو چکی تھی اور یہ بات ادیب تک کی سمجھ میں آنے والی تھی کہ اگر وہ ڈنر میں شامل ہونے کے لئے پیدل اتنی دور کا سفر کرتے تو بھی ان کے پہنچنے تک ڈنر ختم ہو جاتا تھا۔

دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد ہم منتظمین نے بھی ہار مان لی تھی اور سمینار میں ادیب جہانسوی کے داخلے کے امتناع کے معاملے میں کوئی سختی نہیں کی گئی۔ منیر انصاری کا خیال تھا کہ سمینار کی خشک بحث میں ادیب صاحب نہ آئیں گے کیونکہ ان کی سمجھ میں آنے والی کوئی بات وہاں نہ ہوگی۔ میری رائے اس کے خلاف تھی کیوں کہ میرا تجربہ تھا کہ خدا کے فضل سے ہر ادبی سرگرمی میں ادیب صاحب گھس جاتے تھے حالانکہ ان کی سمجھ میں سادہ سے سادہ شعر بھی مشکل سے آتا تھا۔ صرف ادیب ہونے کا خبط ہی انہیں ادیب بنائے ہوئے تھا کیوں کہ ادیب ہونے کے لئے کسی امتحان سے گزرنا نہیں پڑتا۔

مجھے جو خدشہ تھا وہی صحیح ثابت ہوا۔ ادیب صاحب سمینار میں شروع سے آخر تک رہے۔ ہوا صرف یہ کہ انہوں نے ہم منتظمین کو پریشان نہیں کیا۔ وجہ ظاہر تھی۔ ہم لوگوں کا دماغ چاٹنے کا موقع تو انہیں ہمیشہ ملتا تھا، بیرونی مندوبین سے اسی مختصر عرصے میں انہیں جان پہچان بڑھانی تھی اور اُن کے دل میں یہ بات مضبوطی سے ڈالنی تھی کہ اس شہر میں ان سے زیادہ قابل شخص اور کوئی نہیں ہے اور اس کانفرنس کا انتظام انہوں نے دوسروں کو صرف ان کی حوصلہ افزائی کے لئے دیا ہے ورنہ ان میں اس سے دس گنا بڑی کانفرنس تن تنہا کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو مناسب موقعے پر ظہور میں بھی ضرور آئے گی۔ کچھ مندوبین نے اس بات کی شکایت بھی کی کہ ادیب صاحب نے جو چرخہ چلایا تو وہ فلاں یا فلاں مقالہ ٹھیک طرح نہ سن سکے اور نہ بحث میں حصہ لے سکے۔ ان مندوبین کے لئے اظہارِ ہمدردی کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

دوپہر کو مندوبین اور منتظمین کے لئے ظہرانے کا انتظام اسی کالج کے لان ہی میں کیا گیا تھا جس کے ہال میں سمینار ہو رہا تھا۔ ادیب صاحب کو گزشتہ شب کے ڈنر کی کسر بھی پوری کرنی تھی لہٰذا انہوں نے پوریوں اور مٹر پلاؤ کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اِدھر اُدھر گھوم کر مندوبین کی جان بھی کھاتے رہے اور اتنی یکسوئی سے کھاتے رہے کہ بیا اِدھر اُدھر دیکھنے کی تکلیف بھی نہیں کی۔ چنانچہ تین چار منٹ تک میں نے خود اپنے بارے میں ایک بیرونی مندوب کے ساتھ ادیب صاحب کے ذریعہ دیا ہوا تعارف سنا کہ میں اردو سے بالکل واقف نہیں ہوں اور صرف خوشامد کے بل پر ایڈیٹر بنا ہوا ہوں

میں چار پانچ روز کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ کھانا جلدی ختم کر کے ہال میں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا تاکہ آدھ گھنٹے تک لوگوں کی نظروں سے بچ کر آرام کروں۔ سمینار کا دوسرا سشن آدھ گھنٹے بعد ہونے والا تھا۔ میرا یہ خیال غلط نکلا کہ میں ہال میں روپوش رہ سکتا ہوں۔ ادیب جھالنوی کی عقابی نظریں میری جائے پناہ پر پڑ گئیں اور وہ عقابی شان سے جھپٹ کر میرے سر پر آگئے۔

میں تھکن کی وجہ سے خاموش رہا۔ ادیب صاحب یہ سمجھے کہ میں کم از کم اس وقت ان سے ناخوش نہیں ہوں اور ساتھ ہی یہ کہ اپنی بات مجھ سے کہنے کے لئے انہیں اس سے اچھا موقع نہیں ملیگا۔ بغیر تمہید کے شروع ہوگئے "نظامی صاحب میری سمجھ نہیں آتا کہ آپ اِس سردار کے بچے کو کیوں اتنا سر چڑھائے ہیں؟ اِس سے کہئے کہ تم اپنی پنجابی میں لکھو پڑھو تمہیں اُردو سے کیا لینا دینا۔ خواہ مخواہ ہر موقع پر گھس آتا ہے۔ جیب اس کی بھرتی ہے بدنامی آپ لوگوں کی ہوتی ہے"۔

ادیب کی ریل گاڑی چلنی شروع ہوئی تو کسی اسٹیشن پر نہ رُکی۔ میں نے اپنی آنکھیں بھی بند کریں اور فہم و ادراک کے دروازے بھی۔ مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ٹین کی چھت پر موسلا دھار بارش کی آواز آرہی ہے۔ اچانک بارش کے دوران زور سے بجلی کڑکی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ سردار صاحب مع اپنے پہلوان نما گماشتے کے ادیب صاحب کے سر پر سوار ہیں۔

سردار صاحب کہہ رہے تھے "دیکھ ادیب کے بچے، آخری بار تجھے موقع دیتا ہوں۔ اگر تو نے اپنی بکواس بند نہ کی تو تیری لاش کوتوالی کے چوراہے پر کسی درخت سے لٹکی ہوگی۔ جب دیکھو میری بُرائی اِدھر اُدھر کرتا پھرتا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی"۔

ادیب صاحب گھبرا کر بولے "نہیں سردار صاحب، آپ کو میرے کسی دشمن نے بہکا دیا ہے۔ میں تو آپکا بڑا مداح ہوں! ابھی نظامی صاحب سے کہہ رہا تھا کہ سردار صاحب کے حُسنِ انتظام ہی نے کانفرنس کو کامیاب بنایا ہے"۔

سردار صاحب بہت غصے میں آئے تھے لیکن اب چکرا گئے۔ اُنہوں نے تین چار منٹ تک خود اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ ادیب صاحب ان کے بارے میں مجھ سے کیا کہہ رہے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ سوچتے تھے کہ ادیب صاحب کچھ لیپا پوتی کریں گے۔ اس سفید جھوٹ کے لئے وہ بھی تیار نہ تھے۔ ان کے لہجے کی سختی کافی کم ہوگئی۔ کہنے لگے "تو جھوٹ بولنے میں ماہر ہے ...." ادیب صاحب نے معرکہ سر کرلیا تھا۔ سر جھکا کر بولے "بھائی تمہیں یقین نہیں ہے تو میرے دس جوتے مار لو۔ اور کیا کہوں؟" کفنش ٹہنی کے موضوع پر بحث نہ ہوسکی کیوں کہ سردار صاحب نے کچھ مندوبین کو ہال کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ سیمنار کا دوسرا اجلاس کچھ دیر بعد شروع ہوگیا۔ ادیب صاحب میرے پاس بیٹھے رہے کافی دیر بعد بولے "اس شیر سنگھ کے جنگلی پن نے سارا معاملہ خراب کردیا۔ میں اس مقالے پر کچھ سوال کرنا چاہتا تھا لیکن ..." میں نے آگے کی بات اَن سُنی کردی۔ ـــــ!

لیکن ایک ہفتے کے بعد ادیب صاحب میرے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور سینہ ٹھوک کر کہہ رہے تھے "نظامی صاحب! اس شہر میں بس صرف آپکی عزت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں مجھے کسی بات کا ڈر تو ہے نہیں۔ اُس روز آپ نے خود دیکھا تھا کہ میں نے شیر سنگھ کو کیسا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ بولتی بند ہوگئی تھی بچو کی"۔ ایسے دعوے کی تردید کے لئے خاموشی سے بڑھکر اور کونسی دلیل ہوسکتی ہے؟

غزلیں

سرپٹ حیدرآبادی

پُر نور دن ہے یا ہے میرے یار کا مزاج
میرا مزاج ہے کہ شبِ تار کا مزاج

اقرار کا مزاج بنی، زیرِ لب ہنسی
ابرو کی ہر شکن بنی، انکار کا مزاج

ساموں میں فصلِ گُل کے ہے پھولوں کا رنگ روپ
فصلِ خزاں کے پھولوں میں ہے خار کا مزاج

باطل پرست ہیں بہت، حق آشنا ہیں کم
لاکھوں پہ بھاری ہوتا ہے، دو چار کا مزاج

سب کی جدا پسند ہے سب کے الگ ہیں دن
ہم کو مگر پسند ہے، اتوار کا مزاج

دل جس پہ آئے آپ کا، اپنائیے اُسے
نفرت کا اک مزاج ہے اک پیار کا مزاج

اُلٹا اثر ہوا ہے، عیادت کا آپ کی
بے انتہا خراب ہے بیمار کا مزاج

الفاظ لکھ کے، بے تکے، بے ڈھنگے، واہیات
شاعر بگاڑ دیتے ہیں اشعار کا مزاج

چلنے لگا ہوں جب سے میں سرپٹ ادھمڑی چال
برہم ہے مجھ سے خود، میری رفتار کا مزاج

عبدالحفیظ لقب عمران (امراؤتی)

گھر میں نہ بھر اناج غزل کہہ رہا ہوں میں
اے دشمنِ سماج غزل کہہ رہا ہوں میں

دنیا بنی ہوئی ہے جہنم سی آج کل
اچھا نہیں مزاج غزل کہہ رہا ہوں میں

کل رات میں نے خواب میں دیکھا عجب سماں
سر پر ہے میرے تاج غزل کہہ رہا ہوں میں

چلتا ہے مرا سکہ جہانِ ہنر میں اب
ہر سو ہے میرا راج غزل کہہ رہا ہوں میں

شہرِ سخن کے مانے ہوئے باکمال لوگ
دیتے ہیں مجھ کو باج غزل کہہ رہا ہوں میں

راہِ وفا پہ چلنے کی دعوت نہ دو مجھے
تھک سا گیا ہوں آج غزل کہہ رہا ہوں میں

اک مالدار لڑکی سے رشتہ ہوا ہے طے
نظروں میں ہے بجاج غزل کہہ رہا ہوں میں

فکرِ معاش کی جگہ فکرِ سخن ہے اب
چھوڑا ہے کام کاج غزل کہہ رہا ہوں میں

بیگم خدا کے واسطے چپ رہنا سیکھئے
کب تک یہ احتجاج غزل کہہ رہا ہوں میں

مشقِ سخن کو راز میں رکھا نہیں لقب
ڈنکے کی چوٹ آج غزل کہہ رہا ہوں میں

محمد خورشید نادر
(کامٹی)

مجتہد

ہمارا حلقۂ احباب بفضلہ کافی وسیع ہے۔ اس غولِ بیابانی میں یوں تو ہر قماش کے افراد اور ہر فن کے مولا شامل ہیں تاہم اکثریت ایسے ستم ایجاد دوستوں کی ہے، جن کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے کہ ان کی دوستی و قربت کے باعث آسماں اپنی روائتی دشمنی سے دست کش ہوجاتا ہے، کیونکہ صدہا سال کی مشقِ ستم کے باوجود ستمگاری اور دل آزاری کے معاملہ میں اسے وہ سلیقہ اور مہارت حاصل نہیں، جو اس قبیل کے افراد کو فطرتاً ودیعت ہوا کرتی ہے۔

خاص الخاص دوستوں کے اس طبقہ میں جو رگِ جاں سے قریب تر بھی ہے اور نشتر بدست بھی، بعض تیز دست تو چشم بد دور، ایسے سبک دست واقع ہوئے ہیں کہ چشم زدن میں دل کے سو ٹکڑے کردیں مگر تن کو خبر تک نہیں ہوتی، آنکھ کا سُرمہ پار کردیں مگر کیا مجال جو شیشۂ کو آہٹ بھی مل سکے۔ بعض کی شیریں بیانی میٹھی چھُری ثابت ہوئی اور ایسے تلخ تجربات ہوئے کہ ان کی تلخی روح میں سرایت کرگئی۔ بعض ایسے سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ امداد فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ میں تمیز نہیں کرسکتے۔ چنانچہ قرضِ حسنہ کے طور پہ لی ہوئی رقمیں شیرِ مادر کی طرح ہضم کر گئے اور پھر ایسے روپوش ہوئے کہ اب ان کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمارے کیریئر کی مٹی پلید کرنے اور شخصیت کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے میں جو عوامل و عناصر کار فرما رہے ہیں، ان میں سب سے موثر اور فعال عنصر انہیں احباب کی کرم فرمائی ہے۔ ہاں! اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی ہے۔

من جملہ احبابِ باصفا ایک اسپیشل کرم فرما کا وجودِ مسعود ان دنوں ہمارے لئے وحشت و اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے۔ گلدستۂ احباب میں ان کی حیثیت گلِ سرسبد کی ہے۔ آں جناب کو کرکٹ اور تجریدی آرٹ سے والہانہ عشق ہے۔ اور ان کا یہ عشق بالآخر اب جنون کی حد میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ حضرت یوں تو بالطبع مرنجاں مرنج واقع ہوئے ہیں لیکن فدوی کے حق میں ان کا مربیانہ و مشفقانہ طرزِ عمل بعض دفعہ بڑی طرح کھل جاتا ہے۔ خدا جانے اس روشن ضمیر کو یہ الہام کیونکر ہوا کہ ہمیں بعض خاص معاملات میں ایک اتالیق اور اعزازی مشیر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ خدائی فوجدار ہمارے

وجود پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہوکر گلے کا ہار ہوگئے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ مجھے جن چیزوں سے قلبی تنفر اور للّٰہی بُغض ہے، یہ ان پر سو جان سے فدا ہیں۔ میں کرکٹ کی رو دادِ رواں (کمنٹری) اور تجریدی آرٹ دونوں سے حد درجہ الرجک ہوں۔ نہ جانے میری کھال کے عناصرِ ترکیبی میں کیا خلل واقع ہوا ہے کہ کمنٹری کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میرے بدن کے تمام رونگٹے ہڑ بڑا کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر موٹے آتش دیدہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور تا دیر اس حالت میں رہنے کے بعد بمشکل تمام سابقہ حالت بحال ہوتی ہے۔ اور اگر تجریدی آرٹ کے شہ پاروں کو بنظرِ غائر دیکھ لوں تو، دونوں کنپٹیوں کی رگیں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے مچلنے لگتی ہیں، آنکھوں کے آگے تاریکی چھا جاتی ہے، اور اس تاریکی میں کچھ ذرّے، کچھ تارے اس طرح ضو فشانی کرتے ہیں جیسے ظلمتِ نیم شب میں جگنوؤں کی ضیاء پاشی۔ لیکن ہمارے ان کرم فرما کو ان دونوں لغویات سے قلبی وابستگی ہے۔ وہ اول الذکر کو فردوسِ گوش اور ثانی الذکر کو جنتِ نگاہ قرار دیتے ہیں اور ان دونوں خرافات سے میرے اظہارِ بیزاری کو صراطِ مستقیم سے برگشتگی قرار دیکر مجھے راہِ راست پر لانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے رہتے ہیں۔

گو میرے اور ان کے ادبی نظریات اور فنی اعتقادات میں بُعد المشرقین اور تفاوتِ قطبین واقع ہے، مگر ان گہرے اختلافات کے باوجود دوستانہ مراسم برقرار ہیں۔ کیوں کہ آدمی فی الواقع بے حد شریف، خیر اندیش اور بہی خواہ واقع ہوئے ہیں۔ مزید برآں خود ہمارے مشرب و مسلک میں آزردگیٔ دلِ دوستاں کا ارتکاب گناہِ کبیرہ سے کم نہیں، اِس لئے اس خیال سے کہ مبادا ان کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگ جائے، ان کی ہر تجویز پر خواہی نخواہی صاد کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اس نیاز مندی اور ایثار کے نتیجہ میں اِس بندۂ عاجز پر جو گزرتی ہے، وہ بندہ نواز اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ان کا یہی طرزِ عمل ہمارے لئے کبیدہ خاطری کا باعث ہے۔

اُدھر چند دنوں سے ان پر ایک خاص نشہ چھایا ہوا ہے۔ فرطِ مسرت سے کِھلے جارہے ہیں، مگر میرا خون مسلسل خشک ہورہا ہے۔ کیونکہ شہر میں ملک کے سربرآوردہ مصوروں کے تجریدی آرٹ کے شاہکاروں کی خصوصی نمائش کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ آخر وہ قیامت کی گھڑی آن پہنچی۔ اور وہ دُمدار ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔ جونہی اُنہوں نے اپنی دانست میں مجھے یہ مژدۂ جانفزا سُنایا، میں نے قطعی لاشعوری طور پر قدم بقدم پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ مگر اُنہوں نے ایک لمحہ بھی توقف کئے بغیر جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے نمائش گاہ کی طرف لے چلے۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی غیر مؤثر مزاحمت ترک کردینے ہی میں عافیت دیکھی اور مُردہ بدستِ زندہ کی عملی تفسیر بنا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔

اس نمائش کو اُنہوں نے مانی و بہزاد کا مشترکہ نگار خانہ قرار دیا تھا۔ مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے میں کشتِ زعفران کی سیر میں مشغول ہوں۔ پہلی ہی تصویر دیکھ کر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس تصویر میں ہڈیوں کا ایک مسلّم ڈھانچہ سرو قد ایستادہ تھا اور اس کے قدموں کے قریب ایک پا بہ گِل بگلا ایک پاؤں پر محجوب و شرمسار کھڑا تھا اور اس کے دوسرے پاؤں کے پنجہ میں ایک سبز ٹہنی تھی۔ تصویر کے نیچے ایک مصرع بھی لکھا ہوا تھا۔ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوا گویا بگلا ڈھانچہ کی آرتی اُتار رہا ہے۔ مگر یہ خیال لغو و مہمل معلوم ہوا۔ پھر بغور دیکھنے پر کچھ ایسا گمان ہوا جیسے کوئی سیاسی رہنما کسی عوامی نمائندہ کو سبز انقلاب کی بشارت دے رہا ہے، مگر غیر معمولی تاخیر پر نادم و پشیمان ہے۔ مگر یہ تعبیر بھی کچھ تسلی بخش نہ معلوم ہوئی۔ میں مزید غور و فکر کرنا ہی چاہتا تھا کہ دونوں کنپٹیوں کی رگوں میں خفیف سی لرزش کا احساس ہوا۔ یہ ارتعاشی کیفیت خطرہ کی گھنٹی تھی، اس لئے میں بدحواس ہو کر اس دروازہ کی طرف لپکا جو نکاسی کے لئے مخصوص تھا مگر بدبختوں نے اسے مقفل کر رکھا تھا۔ غالباً منتظمین میں کوئی ماہرِ نفسیات بھی موجود تھا، ورنہ اس پیش بندی کے کیا معنیٰ؟

راہِ فرار مسدود دیکھ کر اگرچہ مجھ پر اختلاجی و خفقانی کیفیت طاری ہو چکی تھی مگر کمرہ کے وسط میں صُمٌّ بُکمٌ کھڑے رہنا بھی دانشمندی کے خلاف تھا اس لئے چار و ناچار دوسرے کمرے کا رُخ کیا مگر وہاں ہمارے دیرینہ شفیق مکرم بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اُنہوں نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کسی قدر کرخت لہجہ میں کہا۔

" یہ تم تصاویر دیکھ رہے ہو یا کمروں کے طول و عرض کی پیمائش کر رہے ہو؟ بندۂ خُدا ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!"

پھر وہ کچھ دیر تک بڑی پُرسوز لے میں تجریدی آرٹ کی کساد بازاری، دانشوروں کی بے اعتنائی اور ہماری نالائقی اور کور ذوقی کا ماتم کرتے رہے۔ پھر ہماری استعداد، لیاقت اور معصومیت کو دیکھتے ہوئے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" اس کمرے میں امتیازی نوعیت کی خصوصیات کی حامل چند تصاویر ہیں۔ انہیں دیکھ لو! اگر خُدا نے توفیق دی تو انشاء اللہ روح روشن اور دل بیدار ہو جائے گا"

ان کی دل گرفتگی اور اخلاص سے متاثر ہو کر میں نے بصمیمِ قلب عہد کیا کہ انجام خواہ کچھ ہو، مگر میں اب اس فن کی گہرائیوں میں پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ اُترنے کی کوشش کروں گا۔ پھر ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ "ہرچہ بادا باد، ما کشتی در دریا انداختیم" کہتے ہوئے مجوزہ کمرہ میں باوقار انداز سے داخل ہو گیا۔ لیکن دِقت یہ تھی کہ تجریدی آرٹ کی نمائش میں جانے کی سعادت زندگی میں پہلی بار حاصل ہوئی تھی اور چونکہ میں تو گرفتاروں میں تھا اس لئے مجھے اس امر کا د توف و شعور ہی نہیں تھا کہ ان تصاویر کو کس طرح دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے سوائے تقلیدِ کورانہ کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا چنانچہ حاضرین کی تقلید میں میں نے بھی اونٹ کی طرح گردن اٹھائی، تصویر فہمی کی نیت کرتے ہوئے دونوں ہاتھ پُشت پر باندھ لئے اور ایک تصویر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

خُدا جانے یہ میرے ضعفِ بصارت کی کرشمہ سازی تھی یا تجریدی آرٹ سے میری ازلی بیزاری کا نفسیاتی اثر کہ پہلے تو میری چندھیائی ہوئی آنکھوں کو فریم کے درمیان کچھ دکھائی ہی نہیں دیا مگر جب ذرا دہشت اور وحشت کم ہوئی تو تبدیلی کچھ ایسا نظر آیا جیسے کینوس پر نہایت باریک خطوط مثل تارہائے عنکبوت کھینچے ہوں۔ کچھ خطوط بھٹے تھے کچھ سیدھے

کہیں دائرے، نیم دائرے، قوسین اور اقلیدسی زاویئے دکھائی دیئے جو ایک دوسرے میں پیوست اور باہم دست و گریباں نظر آتے تھے۔ میں عرض البلد اور طول البلد سے تو کسی قدر واقف تھا مگر ان پراسرار خطوط سے قطعی نابلد۔ جا بجا مختلف سائز کے داغ دھبے اس طرح جلوہ گر تھے، جیسے زندگی کی چادر میں درد و غم کے پیوند۔ یا کسی زاہد پارسا کے خرقۂ سالوس پر مے ناب کے دھبے۔ میں اس نقشِ چلیپا کا صحیح حل تلاش کرنے کے لئے کبھی دائیں سے بائیں دیکھتا کبھی اوپر سے نیچے۔ میرے اس ذوق و انہماک کو دیکھ کر میرے قریب کھڑے ہوئے ایک صاحب نے پہلے مجھے نیچے سے اوپر دیکھا پھر اوپر سے نیچے۔ غالباً سوچ رہے ہوں گے کہ فن کے حقیقی قدردان ابھی زندہ ہیں۔

اب جو میں نے اس تصویر کو سمجھنے کی ذرا سنجیدہ کوشش کی تو کنپٹیوں کی رگوں نے بطورِ احتجاج تڑپنا شروع کر دیا۔ کانوں میں تیز سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس اذیت سے بچنے کے لئے میں نے اپنی انگلیاں دونوں کانوں میں ٹھونس لیں۔ اس وقت میں کچھ ایسی پوزیشن میں تھا کہ اگر مجھے کوئی عقب سے دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا گویا میں اس بتکدۂ آذر میں اذان دے رہا ہوں۔ یکبارگی جی میں آئی کہ بیہوشی کا عذر کر کے لمبی تان لوں اس طرح ان ہوش ربا اور صبر آزما تصاویر کی دید و بازدید کی اذیت سے بچ جاؤں گا اور بعد میں ان پر رائے زنی کی صعوبت سے بھی نجات مل جائے گی۔ غالب نے بھی تو ایسی سچویشن سے گلو خلاصی کے لئے خود فراموشی کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ ؎

ہاں اہلِ طلب! کون سنے طعنۂ نایافت؟

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے۔

مگر اسی دوران پاس ہی چند خواتین کو نہ صرف تصویریں دیکھتے بلکہ ان پر سنجیدگی سے تنقید کرتے ہوئے بھی سنا۔ ایک محترمہ ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"یہ دیکھو! یہاں CLERICAL MISTAKE ہے اور یہاں کتابت کی غلطی ہے۔"

اس اچھوتے تنقیدی ریمارک نے رگوں میں خون کی گردش کو تیز تر کر دیا۔ نتیجتاً غیرتِ مردانہ عود کر آئی اور میں پھر تازہ دم ہو کر تصویر کی طرف متوجہ ہو کر ازسرِ نو غور کرنا شروع کر دیا۔

معاً خیال آیا کہ شاید اس جگہ کی دیوار شق ہو گئی ہے، اس لئے ممکن ہے محض ستر پوشی کے خیال سے اس فالتو تصویر کو یہاں آویزاں کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ باوجود فکر و تامل کے مصور کا ما فی الضمیر اور پیش منظر کا ماحول و ما علیہ اب تک سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ چنانچہ اپنے اس شبہ کی تصدیق کے لئے میں آگے بڑھ کر تصویر کے پیچھے کی دیوار کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ میں نے خود کو اپنی ایڑیوں پر حتی الوسع اونچا اٹھا رکھا تھا۔ میری اس اضطراری حرکت کو دیکھ کر پاس کھڑے چند حضرات چونک پڑے، اور پھر میں نے ان کی آنکھوں کو حیرت سے پھیلتے ہوئے دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا گویا نادانستگی میں مجھ سے کوئی مضحکہ خیز حرکت سرزد ہو گئی ہے۔ میری بوکھلاہٹ میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہو گیا جب میں نے اپنے دوست کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ان کا چہرہ فرطِ غیظ سے سرخ ہو رہا تھا، ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور وہ میری طرف

اس عزم و ارادہ سے بڑھ رہے تھے گویا مجھے کچا چبا ڈالیں گے، مگر شاید قدرت کو میری معصومیت پر ترس آگیا۔ قبل ا
کے کہ وہ مجھ بے زبان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرتے کسی نے عقب سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی طر
متوجہ کرلیا۔ سچ ہے، جا کھو را کھے سائیاں مار سکے نہ کوئے۔

جو صاحب اس وقت میرے حق میں فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہوئے تھے، میں اُن سے کسی حد تک واقف تھا۔
عجیب الخلقت فنکار ایک منفرد مصوّر کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے بارے میں مُقتیانِ فن کا مُ
فتویٰ ہے کہ وہ رائج الوقت تجریدی آرٹ کے امام ہیں۔ اس اعزاز کا سبب سوادِ اعظم سے ان کا شعوری انحراف اور ن
جہتوں کی دیوانہ وار تلاش ہے۔ اس فاضلِ اجل نے اپنی خداداد اجتہادی بصیرت اور عبقری ذہانت کو بروئے کار ا
فنِ مصوّری میں جو بعض انقلابی اضافے کئے ہیں، ان کی بنا پر انہیں مجتہدینِ فن کی مجلسِ شوریٰ کا تاحیات صدر منتخب کیا

ہمارے دوست ان کے مدّاحین کے زمرہ میں آتے ہیں اور وہ غالباً انہیں اپنے ساتھ اپنے شاہکاروں کی زیا
کروانے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ میں بھی سحر زدہ معمول کی طرح ان کے پیچھے ہولیا۔ اُن صاحب نے اپنے شاہکا
کی رُونمائی سے قبل بطور تمہید کے کہا کہ وہ آجکل دُنیائے ادب کے آفتاب و ماہتاب یعنی غالب و اقبال کے دواوین کا ایک
خاص زاویۂ نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کے بعض الہامی اشعار کے معنیٰ و مفاہیم کی تجسیم کاری اور تشکیلِ شعری میں
ہمہ تن مصروف ہیں۔ پھر نہ جانے اِن کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے اس خاکسار کو خصوصیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ اسے میری خود ستائی پر محمول نہ فرمائیں تو دست بستہ عرض ہے کہ ان تصاویر کے مشاہدہ کے دوران
اس امر کو ملحوظِ خاطر رکھیں کہ یہ تجریدی آرٹ کے جدید ترین نمونے ہیں۔ اور انہیں تیار کرتے وقت قصداً و عمداً اور دید
دانستہ روایت سے بغاوت کی گئی ہے اور اشاریت و رمزیت کو کوٹ کوٹ کر بھر اگیا ہے۔"

اس خصوصی تخاطب پر ہمارے پیارے دوست نے پہلے میری طرف اور پھر مصوّر کی طرف دیکھا اور اس طر
ایک ٹھنڈی سانس لی گویا مصوّر سے کہہ رہے ہوں۔

"اماں! تم بھی کس بھینسے کے آگے بین بجا رہے ہو۔ یہ کم بخت تو ٹھیک سے جگالی کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا"

ان دونوں کے تمسخر آمیز بلکہ اشتعال انگیز طرزِ عمل سے ہمارے بحرِ انا میں مدوجزر کی سی کیفیت پیدا ہوئی مگر قہرِ د
برجانِ درویش، سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکے کہ بطورِ احتجاج ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور تصاویر کی طرف متوجہ
ہوگئے۔ ہمارے دوست اِن معاملات میں زود فہم واقع ہوئے ہیں، ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ اسی وادی پُرخار کی
سیّاحی میں گزرا ہے۔ چشم زدن میں فن و فنکار کی گہرائی و گیرائی کو ناپ لیا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ تو تصاویر پر محض طائرانہ
نظر ڈالتے اور تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور میں مثلِ طفلِ ابجد خواں پہلی تصویر کے ہجّے میں مصروف ہوگیا

پیشِ نظر تصویر غیر متوقع طور پر صاف اور حیرت انگیز حد تک قریب الفہم تھی۔ تصویر کے وسط میں ایک مہیب اور
قوی الجثہ عقاب بہ اندازِ خسروانہ براجمان تھا۔ بُشرہ سے رعونت، تمکنت اور قلندرانہ بے نیازی ہویدا تھی۔ اگرچہ بیشتر

انواع و اقسام کے پرندے نظر آرہے تھے۔ پرندوں کی اکثریت شاداں و فرحاں نظر آتی تھی، مگر قلیل تعداد ایسے پرندوں کی بھی تھی جو بے حد مشتعل تھے اور جارحانہ اقدامات کے لئے پر تولتے نظر آرہے تھے۔

تصویر کچھ تو صاف تھی اور کچھ میں نے بھی اپنی فہم و فراست کی ایک خاص مقدار سے سمجھنے میں صرف کر دی تھی۔ اس لئے جلد ہی معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا۔ یعنی یہ کہ عقاب طائرانِ صحرا کے درمیان منعقد ہونے والے انتخاب میں صدر کے عہدہ کے لئے منتخب ہو گیا ہے۔ اکثریت اس انتخاب سے مسرور و مطمئن ہے، مگر حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے شکست خوردہ پرندے اس نتیجہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ انتخاب میں عقاب پر سینہ زوری اور اپنے رعب و جلال کے ناجائز استعمال کے الزامات عائد کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ اور از سرِ نو منصفانہ انتخاب کے مطالبہ کو منوانے کے لئے انہوں نے صدر منتخب کو محصور کر رکھا ہے۔

تصویر فہمی سے ایک گونہ مسرت ہوئی اور حصول مسرت سے بصیرت میں بھی قدرے اضافہ محسوس ہوا اور میں نے مصور کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ مگر معلوم ہوا وہ خود میری طرف مسلسل دیکھ رہے تھے۔ مجھے متوجہ پا کر دو قدم اور آگے بڑھ آئے اور ترس کھانے کے انداز میں کہا

"معاف کیجئے! میں خود تشریح کئے دیتا ہوں تاکہ آپ کا ذہنی خلجان اور اعصابی ہیجان رفع ہو جائے۔"

میں دل ہی دل میں ہنسا کہ بھلا یہ بھی کوئی تشریح طلب چیز ہے۔ مگر پھر ان کی دل شکنی کے خیال سے خاموش ہی رہا۔ انہوں نے فرمایا۔

"آپ نے مجددِ عصر علامہ اقبالؒ کا وہ معرکۃ الآراء شعر سنا ہوگا، جسے سن کر زنگ خوردہ ضمیر میں چرچراہٹ ہونے لگتی ہے۔ میرا مطلب اس شعر سے ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہی شعر اس تصویر کا محرک ہے۔ میں نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عقاب نے اولاً مرغانِ چمن کو سخت کوشی، جہد دستی اور صبر و قناعت کی تلقین کی۔ بعدہٗ اختلافِ رنگ و صوت کے باوجود اپنے انفرادی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے ہم آہنگی اور یک جہتی کے جذبہ کو فروغ دینے کی اپیل کی۔ اس نے خوش نوایانِ چمن کو بطورِ خاص متنبّہ کیا کہ وہ دانہ کے ساتھ دام پر بھی نظر رکھیں، علی الخصوص اُس دام پر جو ہم رنگِ زمین ہو۔ عقاب نے ان کو فہمائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ دسم گل کی دلفریبیوں اور رعنائیوں سے مست و بے خود ہو کر محض خوش فعلیوں میں مستغرق نہ رہیں۔۔۔۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں زمین کی ثقل سے آزاد ہو کر خلاء میں معلق ہو گیا ہوں۔ مصور صاحب کی تقریر جاری تھی وہ فرمائے جا رہے تھے۔

"۔۔۔ انہیں چاہیئے کہ زمینِ چمن جو نئے نئے گُل کِھلا رہی ہے، ان پر گہری نظر رکھیں کیونکہ شاخِ گُل بُو صحنِ چمن کو دیکھ کر

مختلف سمتوں سے قطار در قطار آئے ہوئے عجیب الوضع اجنبی پرندے چمن کے دور افتادہ گوشوں میں آشیاں سازی میں مصروف ہیں اور چند خاص نوع کے مقامی پرندوں سے گاہ زیرِ سایۂ سرو و صنوبر اور گاہ لبِ جوئبار غلط میں مصروف ہیں۔ بعض دیسی پرندوں کا اُن ناجنسوں سے روز افزوں اختلاط و ارتباط، معنی خیز سرگوشیاں اور پُراسرار مشترکہ پروازیں محبانِ چمن کے لئے باعثِ تشویش ہیں ....؟

میں نے اپنی سراسیمگی اور انتشارِ ذہنی کے باوجود محسوس کیا کہ فاضل مصور صاحب جو کچھ فرما رہے تھے، اس کا اظہار کسی مووی کیمرہ کی مدد سے لی ہوئی متحرک تصویر میں تو ممکن ہے مگر ایک مجرّد اور ساکت تصویر میں کسی طرح ممکن نہیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ تجریدی آرٹ ساگر کو گاگر میں مُہر بند کرنے کا فن ہے۔ اسے خلاصۃ الافکار کہیئے یا فکر و تخیل کی مائکروگرافی۔ کیونکہ اس میں صراحت نہیں ہوتی۔ وہ محض رموز و علائم کا ملغوبہ ہوتا ہے مصور کا دماغ گوناگوں اور متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے، جدید افکار کی یورش، سابقہ روایات کا احترام، بیرونی نظریات، دیسی ماحول، وقت کی قلت، کنبوس کی تنگ دامانی، عصری تقاضے، خارجی دباؤ، اندرونی شکست و ریخت، اور ان سب پر مستزاد اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کا خبط و جنون۔ نتیجتاً ایک اعصاب شکن چیستان وجود میں آتا ہے جسے مصور ثائقین کے روبرو پیش کر کے کُلیتاً بَری الذمہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر دلدادگانِ فن اور پیشہ ور ناقدین کی بن آتی ہے۔ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کے مصداق وہ اپنے اپنے طور پر اس کی تشریح و توضیح ضروری سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ان منتشر ریزہ ریزہ اکائیوں میں ربطِ باہمی تلاش کر کے خالی جگہ پُر کرنا اور معنی و مفہوم بر آمد کرنا ان کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مصور ان توضیحات کا نہ پابند ہوتا ہے اور نہ جوابدہ۔ بعض پُرجوش شارحین تو ایسی لطیف و بلیغ تشریح فرماتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد خود اِن کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور وہ خود اسے دوبارہ بیان نہیں کر سکتے۔

میرا ذہن انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا۔ مگر مصور صاحب میرے جذبات و احساسات بلکہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دُھن میں کہے جا رہے تھے....

..... صالح الفکر اور اعتدال پسند پرندوں کی اکثریت نے عقاب کے مجوزہ لائحہ عمل اور ضابطۂ حیات کو پسند کیا اور عقاب کی بلند نظری اور دور بینی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تشویش و اضطراب کو حق بجانب قرار دیا اور رفع شر کے لئے اپنی حمایت و تعاون کا یقین دلایا۔ مگر بعض بدنہاد اور شر پسند پرندے اس تجویز کو سُن کر چراغ پا ہو گئے ہیں اور وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں ہر طرح کی آزادی، تن آسانی اور آسائش درکار ہے۔ بغیر کسی ضابطۂ اخلاق کے اور بنا کسی اصول و قدغن کے۔ ان کا اصرار ہے کہ لقمۂ تر کے لئے ناجنسوں سے اختلاط، ان کی ثنا خوانی بلکہ ان کا دست نگر ہونا بھی بُرا نہیں۔ ہاں! اک ضمیر کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں....."

میں نے ذرا پونی دیوار کا سہارا لے لیا۔ انہوں نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ مبہم اشارے دیکھئے اور پھر عقاب کے تیور دیکھئے جیسے کہہ رہا ہو کہ خود فروشی کے اس رُجحان سے حرکت و عمل میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے"

ضمیر پر پھپھوندی لگ جاتی ہے اور قلب پر مُہر۔ طائرِ خوش الحان محض شکم پُری اور نغمہ سنجی کو مقصدِ حیات سمجھ لیتا اور دوسرے اعلیٰ صحرائی اقدار ۔ ۔ ۔ ۔"

مصور صاحب قبلہ عالمِ جذب و کیف میں تقریر فرما رہے تھے اور میں عالمِ بے خودی میں سر دُھن رہا تھا۔ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ جمالِ ہم نشین در من اثر کرد کے اصول کے تحت ان کی حرارتِ ایمانی مجھ کو رگ رگ و پے پے میں منتقل ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، تا آنکہ میرا نحیف و نزار بدن جوش و جذبہ کی شدت سے بید کی طرح لرزنے لگا۔ اور میں وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کرنے ہی والا تھا کہ دفعتاً انہوں نے اپنا استخوانی پنجہ میری لمبی، خشک گردن پر اس طرح مارا جیسے عقاب ممولہ کو دبوچ لیتا ہے، اور پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک دوسرے شاہکار کے نیچے لا کر کھڑا کر دیا اور کہا

"اور اب معجزۂ فن کی اس نمود کو ملاحظہ فرمائیں۔ تجریدی آرٹ کی شاخِ جدید — "ڈسکو آرٹ" کا نمونہ ایک اجتہادی کاوش، جو اس باب میں خشتِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔"

اور پھر وہ مجھے گہرے پانی میں دھکیل کر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کنجشک بازدیدہ کی طرح اوپر کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ تا دیر مجھ پر سکتہ کا عالم طاری رہا۔ جب قدرے افاقہ ہوا تو چشمہ اتار اسے رومال سے صاف کیا اور پھر بغور دیکھا۔ تجسیمِ تخیّل کی ایسی نادر مثال از آدم تا ایں دم نہ کسی نے دیکھی نہ سنی ہوگی۔ ؎

عقل بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

دیوار میں لگے ایک ہینگر میں ایک دائرہ نما شئے جھول رہی تھی۔ درمیانی حصّہ بالکل خالی تھا۔ بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ فاضل مصوّر نے کینوس ہی کو رول کر کے اسے ایک دائرہ کی شکل دیدی ہے۔ اس دائرہ کے زیریں حصّہ سے ایک مستطیل کاغذ منسلک تھا جس پر غالب کا یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

میں فرطِ استعجاب سے منہ کھولے، سانس روکے اس بدعتِ حسنہ کو دیکھ رہا تھا اسی اثناء میں دو صاحب تشریف لے آئے۔ ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا

"یہ دیکھئے، یہی ہے وہ رسوائے زمانہ ڈسکو آرٹ۔ تجریدی آرٹ کی انتہائی ترقی یافتہ شکل، ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ یہ اساتذہ کے برگزیدہ اشعار کی معنویت کو اُجاگر کرنے کا کم خرچ بالانشین اسٹائل وجود میں آیا ہے، جسے دیکھ کر روح پر وجد طاری ہو یا نہ ہو مگر وجدان پر سکتہ ضرور طاری ہو جاتا ہے۔ بخدا مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ ڈسکو آرٹ قُربِ قیامت کی آخری اور حتمی نشانی ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر میں ڈسکو آرٹ کے کسی نمونہ کے قریب اس کے خالق کو دیکھ لوں تو مجھے اپنے ہاتھ، پاؤں پر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔"

دوسرے صاحب نے تجریدی آرٹ کی نئی شاخ پر کھلے اس غنچۂ لوزس کو دیکھا تو فرمایا
"اگر یہ فنکار اسی طرح مشقِ ناز فرماتے رہے تو خونِ دو عالم کس کی گردن پر ہوگا؟"
پھر اُنہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا
" ڈسکو آرٹ کے اس موجد کو تو قریب کے ہینگر پر ہی لٹکا دینا چاہیئے تاکہ خالق و مخلوق کو یکمشت دیکھا جا سکے۔
مگر ۔ اس شاہکار کا خالق ہے کہاں؟"

پھر ان دونوں نے میری طرف رُخ کیا اور مجھے مصوّر کا پبلسٹی ایجنٹ سمجھ کر ان کا حُلیہ اور موجودہ محل وقوع دریافت کرنے لگے۔ میں نے بدقّتِ تمام انہیں یقین دلایا کہ میں تو صرف ایک طفیلی ہوں اور یہاں میری حیثیت سبزۂ بیگانہ سے زیادہ نہیں نیز یہ کہ میں از خود نہیں آیا بلکہ ہانکا کرکے لایا گیا ہوں۔

اسی اثناء میں چند افراد قریب سے گزرے۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ بھی مصوّر کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں تیزی سے نکاسی کے دروازے کی طرف لپکا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب وہاں ہنگامۂ دار و گیر برپا ہوگا اور ممکن ہے مجھے بھی ناکردہ گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔

تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ کسی نے کسی سے کہا "نکاسی کا دروازہ کھل گیا"
میری نظریں بے اختیار دروازہ کی طرف اٹھیں۔ جو صاحب سب سے پہلے نہایت تیزی سے باہر نکلے وہ ڈسکو آرٹ کے موجد تھے اور اُن کے پیچھے ہمارے دیرینہ کرم فرما! ■■

ظفر کمالی (پٹنہ)

(۱)

دین وایمان مگر اپنا بچائے رکھیئے :۔

کھو لیئے آپ ہراک شخص کا کچا چھٹا
اصلیت اپنی بہرطور چھپائے رکھیئے
امتحاں آپ کو دینا ہے تو دکھلا کے چھرا
اپنے استاد کو ہر وقت ڈرائے رکھیئے
دیجئے اوروں کو اخلاق و محبت کا سبق
اپنے سینے میں کدورت کو چھپائے رکھیئے
آپ دیں ساتھ زمانے کا نہیں مجھ کو گلہ
دین وایمان کو مگر اپنا بچائے رکھیئے
کیوں نہ پھر آپ کا، صرف آپ کا طوطی بولے
ہر محلے میں اگر رنگ جمائے رکھیئے
لُٹ بھی جائے اگر ایمان کی دولت کیا غم
بینک بیلنس مگر اپنا بڑھائے رکھیئے
لوٹیئے مال غریبوں کا ظفر ہو کے نڈر
ساتھ پولس کو فقط اپنے ملائے رکھیئے

(۲)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر احتیاط سے :۔

تم شادیاں رچاؤ مگر احتیاط سے
بارِ گراں اُٹھاؤ مگر احتیاط سے
ایسا نہ ہو کہ جیل کی کھچڑی تمہیں ملے
چوری کا مال کھاؤ مگر احتیاط سے
لائے ہو ساتھ اپنے جو مانگے کی یہ غزل
محفل میں تم سناؤ مگر احتیاط سے
قلیہ، پلاؤ، زردہ، ڈبل روٹی، قورمہ
کھاتے ہو تم تو کھاؤ مگر احتیاط سے
رکھنا پڑے گا اپنے بجٹ کا تمہیں دھیان
دوجوں پہ سنگ اٹھاؤ مگر احتیاط سے
مذہب نہ جائے ہاتھ سے تہذیب نو کی سمت
اپنا قدم بڑھاؤ مگر احتیاط سے
دشمن جو دوستی کی کرے پیشکش، ہے خوب
اس کو گلے لگاؤ مگر احتیاط سے
بچوں کا کھیل طنز وظرافت نہیں ظفر
تم بھی قلم اٹھاؤ مگر احتیاط سے

مقیت اعظمی (دھولیہ)

اک طرف حُسن کا ہے جال چلو لوٹ چلیں
دوسرے شہر میں ہڑتال چلو لوٹ چلیں
خواہش لطف وکرم ہوگی نہ پوری اپنی
شہر کے لوگ ہیں کنگال چلو لوٹ چلیں
لے کے آئے ہیں مجھے حُسن کے بازار میں آپ
گل سکے گی نہ یہاں دال چلو لوٹ چلیں
یہ نہ بن جائیں کہیں پاؤں کی بیڑی یارو
حُسن ہے کھولے ہوئے بال چلو لوٹ چلیں
جوتیاں آج وہ اپنی ہی بنانے کیلئے
مجھ سے مانگے ہے مری کھال چلو لوٹ چلیں
حُسن سے آنکھ ملانا نہیں آساں یارو
سر کے اُڑ جاتے ہیں سب بال چلو لوٹ چلیں
شعر گوئی میں نہیں ثانی مقیت اپنا کوئی
اہلِ فن بن گئے جنڈال چلو لوٹ چلیں

غزل

ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن
(بھاگل پور)

(انشائیہ)

اکزامنر کے نام

امتحان ہال ۔ ۲۳ جولائی ۸۳ء

مائی باپ!

سلام، پرنام، نمستے، گڈ مارننگ، واہ گرو (ان میں سے جو آپ کو سوٹ کرے) سر! عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے، چاہے ڈبوائیں چاہے اُگائیں! ناک کٹ جائے گی اگر اس بار بھی فیل ہوئے۔" ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں"

"مائی" ۔ اس لئے کہ میرے کرم فرما "عورت ہیں یا مرد؟ معلوم نہیں! ۔ کیا پتہ! عورت کب مرد بن جائے اور مرد عورت۔ آج کل افسر لوگ بھی تو لڑکپن کی چال چل رہے ہیں" لڑکا لڑکی اور لڑکی لڑکا لگے ہے مجھے" جن کے ہاتھوں میں میری یہ کاپی ہو اپنا جنس خود متعین کرلیں۔ اور خود فیصلہ کریں کہ آپ کس جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ "صحبتِ ناجنس" کے سبب اپنے ہم صحبت کی ہمرکابی اور ہمشکلی پر مائل ہیں۔ اگر آپ "جنس گراں مایہ" میں سے ہیں تو بے مہار یا مہار یا لگام یا بے لگام! ہندی معاشرے میں تو علامتِ عنان صنفِ لطیف کے سروں کے درمیان اور صنفِ کثیف کے دوش پر ہوتی ہے جس سے یہ تادمِ آخر سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ جب تک یہ علامتِ کارآمد سروں پر منقش و مُزین نہیں ہولیتی "نہ رات رینائی نہ دن چینا" ماں باپ دن رات ایک کر کے آسمان کے تارے توڑ لاتے اور جہیز کے گھوڑوں کی طرح لاکھوں میں بھی ایک سواری اپنی لاڈلی کو خرید دیتے۔ ؎

انگلینڈ کے رئیس و مدبر یہ کرو فر
دیتے ہیں اپنی میم کو موٹر خرید کر
ہندوستاں کی شانِ امارت تو دیکھئے
بیٹی کو باپ دیتے ہیں شوہر خرید کر

اگلے وقتوں میں مانگوں کے بیچ کے یہ سُرخ نشان نیک شگون سمجھے جاتے تھے جو عالمِ شباب میں سُرخ سیپوں کی طرح سروں کے بیچوں بیچ خطِ جدی کی مانند مانگ کو چیرتی ہوئی گزر جاتی اور اب تو یہ حال ہے کہ مانگیں تو اُجڑ رہی ہیں لیکن ان کو منوانے کے لئے ہڑتال، اسٹرائک، گھیراؤ، دھرنا اور پکڑنا شروع ہوگیا۔ "ہماری مانگیں پوری ہونا چاہیے جو مجبوری ہو"۔ چند دریدہ ذہن نافہموں کو یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ "مانگیں ہماری پوری ہوں، جو ان ہو یا بوڑھی ہوں"؟ عالمِ جوانی کی مانگیں بھی انواع واقسام کی ہوتی ہیں۔ اس فہرست میں 'بی بی' سے لیکر 'ٹی وی' تک شامل ہوتے ہیں اور بیچارے والدین "مانگ بھرنے" کی آرزوئیں لئے اپنی قبروں کے گڑھے بھر والیتے ہیں۔

آج کی یرقان زدہ سوسائٹی میں مانگوں کے یہ نشانات ہندوستانی عوام کی طرح زرد اور پوپلے ہوگئے ہیں جن کی دریافت جدید شیشوں کی مدد سے بھی مشکل ہے۔ مانگوں کی یہ نشانیاں اب ٹوڈیٹ گھرانوں میں قدامت پرستی کی علامت سمجھی جاتی ہیں اسی لئے ان کا استعمال بائی فوکل لینس کی طرح وقت پر ہی کیا جاتا ہے "رِند کے رِند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی"۔ اب بازار اور کلب میں مس اور مسز میں امتیاز کرنا مشکل ہے جیسے ذکور و اناث میں۔

رہی بات جناب کو اس رقعہ میں باپ لکھنے کی تو اصل یہ ہے کہ باپ کہہ کے اڈریس کرنا ہمارا "جنم سدھ اھیکا" ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ابّا حضور (جو خیر سے اب پاپا اور امی جان پاپی کہلاتی ہیں) فرمایا کرتے کہ باپ تین ہوتے ہیں ـــ اصلی نقلی اور دخلی۔ اصلی باپ تو وہ ہے جو جنم دیتا ہے دخلی باپ وہ ہے جو دخل در معقولات کے تحت اپنی دختر نیک اختر نکاح میں مرحمت کرتا ہے اور نقلی باپ وہ ہے جو پڑھاتا لکھاتا اور سکھاتا ہے۔ ویسے ہر پڑھانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے کو میں باپ تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے کہ مجھے اُس کا نا ماسٹر کی دست درازی یاد ہے جنھیں پڑھانے سے زیادہ میرے کان کھینچنے میں لطف آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا نالج تو صفر کا صفر ہی رہا البتہ میرا کان گدھے کی طرح لمبا ہوگیا جس کی وجہ سے آج بھی احباب میں "خرگوش" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہوں۔ کنمٹی کے اس عملِ جراحی سے میری آہوں نے وہ صورت اختیار کی کہ "میں رات کو اُٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے"۔

جناب کو باپ کہنے کی جرأت اس لئے بھی ہوئی کہ خدانخواستہ آپ بھی ہمارے کالج کے پروفیسر کی طرح کہیں لوکر تو نہیں ؟ خیر معاملہ جو بھی ہو وہ آپ جانیں مجھے دوسروں کے گریبان میں جھانکنے کی کیا پڑی ہے۔ اگر ناخواندہ اہلِ رسا اور صاحب مکھن ہوں تو اکزامنر ہونا ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہمارے پروفیسر صاحب بھی اپنی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں اور سالوں بھر "بہار بنگال" کئے رہتے ہیں۔ پُرانہ مانیں روئے سخن آپ کی طرف نہیں" گر ہو تو روسیاہ"۔ عرض کرنا دراصل اپنے ان پروفیسروں کے بارے میں ہے جو ہمیں درس دیا کرتے ان میں لیاقتِ تدریس سے زیادہ شوقِ قیادت ہے، کلاسوں میں تو اُونگھتے اور پرنسپل کی مکھن بازی میں چاق و چوبند رہتے۔ ان کی علمی صلاحیت صفر اور حکمتِ عملی بائی ہے ۔

ہ

یوں کہنے کو ان کی کئی ڈگریاں ہیں
مگر ان کی نالج صفر ہی صفر ہیں

ایک پروفیسر ہی ہماری کم مائگی کے ذمہ دار نہیں "جہلا کے سایوں میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں"۔ اپنا جو احوال ہے وہ ہماری تحریر سے اظہر من الشمس ہے "من آنم کہ من دانم" امتحان میں جن ممکن سوالات کی تیاریاں کی گئی تھیں وہ تو آئے نہیں اور لڑ گئے پرنسپل اور اِن وج لیٹر۔

تین سال تک میٹرک میں ریسرچ کرنے کے بعد پاپا کے گھوس گھاس اور بھیا کے اپروچ سے "مع ٹرک" پاس کیا۔ کالج میں داخلے کے لالے پڑے سے چسکو چچا نے حل کیا چچا اور پرنسپل سے بڑھی گاڑھی چھنتی ہے۔ سنا ہے کئی معاملوں میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ کالج میں کیا کبھی مرن دن تی اور کبھی جنم دن کی چھٹی غرض کہ سالوں بھرّرات کو روز روشن کیا اور دن کو جوں توں شام کیا۔

قبلہ وکعبہ! بی اے کے بعد ہمارے ہر دن عید اور ہر شب دیوالی ہونے والی ہے۔ ممی کا ارادہ ہے کہ امتحان کے نتیجہ کے برآمد ہوتے ہی گھر میں گھی کے چراغ جلائے جائیں محلے کی مسجد کے "مولی" صاحب کی دعوت کی جائے اور مراد پیر کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی جائے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ کی نظر کرم ہو جائے ورنہ خوابوں کے محل چکنا چور ہو جائیں گے۔ ایک بات جو مجھے لکھتے ہوئے سنکوچ ہو رہا ہے وہ یہ کہ اسی امتحان کے نتیجے پر ہماری سگائی کا انحصار ہے لڑکی والوں نے علاوہ نان نفقہ اسکوٹر اور ٹی وی کے نقد پچاس ہزار دینے کی پیشکش کی ہے ؂

ساتھ بیگم کے ملا کرتے ہیں دس بیس ہزار
مُفت کے مالوں میں سُسرال کا مال اچھا ہے

پچاس ہزار پر آپ متحیر اور چیں بہ جبیں نہ ہوں "رسم دنیا ہے یہی اور یہی باتیں ہیں"

دطیرہ ہے یہی دُنیا کا اس سے منہ نہ موڑ اے دل
سگائی آگے پیچھے روبرو "نقدین" ہوتی ہے

خلاصۂ کلام یہ کہ ایک مخلص اور ہمدرد انسان سمجھ کے ہم نے جناب کے حضور میں لب کشائی کی جرأت کی ہے اُمید کہ کرم فرمائی کی زحمت گوارا فرما کر ہائی نمبر مرحمت کریں گے۔ کاپی کے بیچ میں پچاس روپے کا ایک نوٹ ہے جس کے ملنے کی رسید کی ضرورت نہیں۔ یہ نوٹ رونمائی اور سلامی کے ان نوٹوں میں سے ہے جو لڑکی والوں کی طرف سے مجھے نذر کیا گیا تھا جسے خدمتِ اقدس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ آپ کا ایک سعادت مند شاگرد۔

غزلیں

رؤف رحیم (حیدرآباد)

گیسو بدوش آئے تھے جب سے وہ خواب میں
اُس روز سے ہوں آج تلک پیچ و تاب میں

جانے کیا لکھا تھا اُنھیں اضطراب میں
قاضی کے ساتھ آ گئے خط کے جواب میں

لغزش سی ہو گئی تھی مرے انتخاب میں
میں کر سکا نہ فرق جو گوبھی گلاب میں

کٹتی ہے زندگی مری اس رعب و داب میں
بیروزگار رہوں میں جو بیگم ہے حساب میں

دیکھا کر مجھ کو سیٹ منسٹر کی ہل گئی
چھچھڑے دکھائی دیتے ہیں بلّی کو خواب میں

رہتے الگ تو عیش بھی کرتے الگ الگ
ما ں باپ، بھائی بہن ہیں ہڈی کباب میں

شاید اسی لئے وہ تھا غرقِ مطالعہ
تصویر پدمنی کی تھی چسپاں کتاب میں

آگے پریکٹیکل کا بھی ہو جائے انتظام
اب تو ہے جنسیات کی تھیوری نصاب میں

ہیں اس لئے عروج پہ میخانے آج کل
مغرب سے پیچھے کیوں رہیں ہم بھی شراب میں

اتنے سے کام کے لئے کیوا) دور جایئے
بکتی یہاں کے تیر پئے چشم تر آب میں

شادی کا دن تو مجھ پہ قیامت ہی بن گیا
جب سے ہوں آج تک بھی مسلسل عذاب میں

دل میں ہزار گالیاں دیتا ہوں میں اُنھیں
اُٹھتی نہیں زبان جو اُن کی جناب میں

اُن کی نظر میں کیسے جچے گا کوئی حسین
سو عیب جو نکالتے ہیں ماہتاب میں

میرا مکان بھی تو تمہارا مکان ہے
کب تک رہو گے اس دل خانہ خراب میں

شاید کوئی حسین ہے محفل میں اے رحیم
ہل چل مچی ہوئی ہے جو ہر شیخ و شاب میں

محبوب مانجھومی (بلاسپور)

○

حالت بلا سے غیر ہو اب میزبان کی
خاطر میں کچھ کمی نہ رہے میہمان کی

جب تک ادا نہ اصل مع سُود ہو جناب
کیوں کر لگے نہ ڈر مجھے صورت سے خان کی

"اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی"
لو ناک کٹ گئی نا بھرے خاندان کی

اُدھم مچایا پی کے وہ یاروں نے رات بھر
بنیاد ہل گئی مرے پکّے مکان کی

غفلت کی گر یہی رہی حالت تو دیکھنا
میّت ہی یاں سے اُٹھے گی اُردو زبان کی

کیا سادہ لوح لوگ ہیں، ایٹم کے دور میں!
محبوب باتیں کرتے ہیں تیر و کمان کی!

ڈاکٹر سمیع بن سعد
لکچرر۔ ودربھ مہاودیالیہ
(امراوتی)

تین حرف

لکھنے والے پر بھی تین حرف اور پڑھنے والے پر بھی تین حرف۔ جب اس قسم کا جملہ ہم نے پہلی بار پڑھا۔ تو ہماری تین حرفی عقل بھی چکرا کر رہ گئی، ہم حیران تھے کہ یہ کیا بَلا ہے۔ حیرانی جملہ کے مضمون پر نہ تھی، تین حرف پر تھی۔ آخر یہ تین حرف کیا ہیں۔ مولانا دال چے میم بن کا تخلص خود تین حرفی ہے۔ سے دریافت کیا تو موصوف بہ لہجۂ حزیں و بہ تلفظ نون غنہ گویا ہوئے کہ "میاں ایں تین حرف انسرار ہیں۔ لفظوں کے بھید خداں ہی جانیں"۔ واقعی ان کی بات ہمارے لئے بھید ہی رہی۔ اب ہم نے اپنی پریشانیٔ خاطر کو تین حرفی لغت سے دور کرنا چاہا۔ جو لغات کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تین حرف لفظ لعنت کے ہیں جو کلمۂ نفرین ہے۔ اب ہم مزید حیران کہ لعنت میں تو چار حروف ہیں اور یہ تین حرفی لعنت کب سے بن گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی سیاسی لیڈروں کی طرح دَل بدلو ہے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور لعن ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی قابلِ نفرین ہی ہے۔

لیکن تین حرف کی یہ داستان یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جوں جوں ہم دریائے تفکر میں غوطہ زن ہوتے گئے گہرہائے آبدار اسرار ہمارے ہاتھ آتے گئے اور رازہائے سربستہ منکشف ہوتے گئے۔ کیونکہ لغت بھی تین حرفی ہے جو اپنے اندر تمام حروف و الفاظ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں ہمارے تین حرف کا مقصد اپنی زبان کے تمام تین حروف کا بیان مقصود نہیں۔ یہ گفتگو تو پھر لغت سہ حرفی ہو جائے گی اور پڑھنے والے بے اختیار تین حرف بھیجنے شروع کر دیں گے۔

بنظرِ غور دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ تین حرف ازل ہیں اور ابد ہیں کہ جن کے درمیان یہ کائنات پھیلی ہوئی ہے ؎

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

ہم نے سب سے زیادہ تین حرف بھیجتے ہوئے اور تین حرف کا شکار ہوتے ہوئے طالب علموں کو دیکھا ہے

جو اپنے کھیل کود اور جوانی کے دن مُرادوں کی راتوں کو برباد کرنے کے باوجود تین حرف پاس اور فیل کا شکار ہوتے ہیں اور امتحان اور ممتحین پر تین تین حرف بھیجتے رہتے ہیں۔

یہی تین حرف خزینۂ علم ہیں کہ انھیں تمام حرفِ تہجی کا قائم مقام سمجھ لیا گیا ہے۔ جیسے کہتے ہیں وہ تو اب ج سے بھی واقف نہیں یا وہ اے بی سی بھی نہیں جانتا۔ اب ج یہ سے یاد آیا کہ یہ تینوں علم الحساب کی دنیا میں سب سے زیادہ محنت سے کام کرنے والے ہیں۔ کسی بھی کام کے حساب کو دیکھ لیجئے۔ اب ج موجود ہیں۔ ان میں ج بڑا شریر ہے کبھی کام چھوڑکر چلا جاتا ہے کبھی واپس آجاتا ہے۔ کھانے کے جلسوں میں بھی اس کی یہی حرکات ہیں۔ یہ کسی محکمہ کا کلرک سا لگتا ہے کہ جس میں آفیسر اور چپراسی تو کام کرتے رہتے ہیں اور کلرک اکثر اوقات میز سے غائب رہتا ہے۔ پھر یہ تین حرف تکون کی شکل میں اُبھرتے ہیں۔ یہ کبھی فیملی پلاننگ کے تکون مَرد۔ عورت۔ بچہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی عاشق، معشوق رقیب کی شکل میں۔ کبھی حاکم محکوم نوکرشاہی کی شکل میں یہ تین ایسا لگتا ہے کُل عالم پر محیط ہیں۔

عربی میں تو تمام کام تین حرفی ہی ہیں۔ فعل اچھے ہوں یا بُرے۔ نچلے ہوں یا اونچے۔ سب تین حرفی تین حرف جتنے خراب ہیں اتنے مقدس بھی۔ تمام کائنات ان تین حروف (خدا) کے آگے سجدہ ریز ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ تین حرف اپنا بھید کسی پر نہیں کھولتے۔ دیکھئے نا! الم کا بھید کتنا گہرا ہے۔ جنھوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی انھیں تین حرف (موت) نے ہمیشہ کے لئے خاموش کرکے پھر سے نیا بھید پیدا کردیا۔

دُنیا کی ہر زبان میں حروف پُراسرار ہیں۔ لغات ان سے بھری پڑی ہیں۔ معنی دار بے معنی ہر قسم کے تین حرف مل جائیں گے۔ تین حرف شیریں ترین بھی ہوسکتے ہیں اور کڑوے بھی۔ شکر اور شہد سے میٹھا شاید کوئی نہیں ہوگا اور نیم سے بڑھ کر کڑوا کون؟

نہ جانے انسان کو ان تین حرف سے کیا بیر ہے۔ جس چیز کو انتہائی قابلِ نفرین سمجھتا ہے یا جس چیز کو مقدس خیال کرتا ہے تین حرف کے وجود میں سمو دیتا ہے۔ اُلّو کو ہی دیکھئے "اُلّو" بھی تین حرفی ہے اور چغد بھی لیکن اُلّو میں شدید زبردستی ہے۔ لکھنے میں تو یہ تین ہی حرف ہیں۔ البتہ گدھے کو فخر حاصل ہے کہ وہ چار حرفی ہے جیسے اس کے نام کے آگے ایک ڈگری زبردستی لگ گئی ہو۔

جب ڈگری کا ذکر آیا تو آپ بھی سُن لیجئے کہ یہاں بھی تین حرف کی بڑی قدر ہے بی اے۔ ایم اے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن بی ایس سی، ایم ایس سی، پی ایچ ڈی والوں کو دیکھئے کس طرح فرعونِ بے سامان نظر آتے ہیں اور بیچارہ بی اے، ایم اے وہ تو آرٹ کا شیدائی ہے ویسے بھی دنیا میں آرٹ کی اب کوئی قدر نہیں اس لئے دنیا میں اب کھویا کھویا سا رہتا ہے۔

تین حرف زندگی کے ہر گوشے میں دخیل نظر آتے ہیں ویسے وہ آسمان میں بھی کافی اہم نظر آتے ہیں۔ دنیا کی چہل پہل، یہ رنگینی، ختم ہوجائے اگر یہ تین حرف یعنی مہر و ماہ ختم ہوجائیں۔ دنیا کی سرسبزی و شادابی ختم ہوجائے

لوگ پیاسے مرجائیں اگر یہ تین حرف کبھی ابر نہ آئیں۔ دیکھئے کیسے بلند مرتبہ ہیں یہ تین حرف دنیا کو روشنی، خوشبو، تی دے رہے ہیں سیراب کر رہے ہیں۔

یہ تین حرف کبھی کبھی انسان پر آفت بن کر گرتے ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی برداشت کئے جاتا ہے جیسے قرض زرض۔ مرض۔ اور آخر میں یہی تین حرف موت بن کر ان تمام آفتوں سے نجات دلاتے ہیں۔

علم۔ قلم۔ قلم کی آجکل دھوم دھام ہے سرکار علم کے فروغ کی جتنی کوشش کر رہی ہیں اتنا ہی عمل سے گریز کیا جا رہا ہے اور جہل بڑھ رہا ہے۔ افسوس کہ مؤخر الذکر کا بھی استعمال سماج کی بہبودی کے لئے کم ہی ہو پا رہا ہے۔ ان کا استعمال ایسے انداز میں ہو رہا ہے کہ بے اختیار تین حرف بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔

بعض تین حرف تو اپنے اندر ایک جہانِ معانی آباد رکھتے ہیں۔ پطرس بخاری نے AIR کا لفظ ضرب کرکے بڑی ذہنی ہوشیاری کا ثبوت دیا اور PIA۔ TWA جیسی ہوائی کمپنیاں تو تین حرف کے سوا ہوا میں کچھ اڑانا ہی نہیں جانتیں۔

سماج نے بھی تین حرف کو کبھی درگزر نہیں کیا۔ سماج میں ان تین حرف کو قائم رکھنے کے لئے لوگ کیا کیا کچھ نہیں کرتے۔ لیکن یہ تین حرف ہیں کہ کبھی اونچے ہو جاتے اور کبھی کٹ بھی جاتے ہیں اس قسم کے حرف کی سب سے بڑی نمائندہ ناک ہے۔ لیکن کان بے چارے کبھی تو پکڑنے کے کام آتے ہیں کیونکہ اسکول میں ہمیں جو پکڑنے پڑتے تھے یا پھر استادوں کے اینٹھنے کے کام آتے ہیں۔ معاف کرنا قارئین مضمون لکھتے ہوئے آپ کی تین حرفی چشم کا خیال آگیا ہے اس لئے یہیں ختم کرتا ہوں ورنہ آپ بے اختیار تین حرف بھیجنے شروع کر دیں گے۔

غزل

قبل شادی زندگی کو زندگی کہہ لیجئے
بعد شادی جیل کی اک کوٹھڑی کہہ لیجئے

حسن کو اک پاٹھ شالا سے اگر تشبیہ دیں
عشق کو سبجکٹ اک کمپلسری کہہ لیجئے

کھا کے جھڑکی کچھ نہ بولا وہ بڑا ڈرپوک ہے
اب شرافت کو جہاں میں بزدلی کہہ لیجئے

اندرونی چال سے شیطان کا کیا ہے چچا
یوں، بظاہر آدمی کو آدمی کہہ لیجئے

جسکی داڑھی مفلسی میں بڑھ گئی ہے دوستو
بے جھجک اس شخص کو اب مولوی کہہ لیجئے

سر پہ بالوں کا بنا رکھا ہے کھوپا ناز سے
اس ادا کو سبزہ زارِ نلگری کہہ لیجئے

اس مشینی دور میں سہما ہوا ہے آدمی
زندگی کہیئے گا اسکو، موت ہی کہہ لیجئے

میرا منا بھی تو کرلیتا ہے نثری شاعری
"آپ کیوں خاموش ہیں کچھ آپ بھی کہہ لیجئے"

جسم کی عریانیاں تہذیب میں شامل ہوئیں
دوپہر کی روشنی کو تیرگی کہہ لیجئے!

زنگ لاتی ہے محبت جوتیاں کھانے کے بعد
اور کیا کہیئے گا اس کو بس یہی کہہ لیجئے

شیطنت حرص و ریا مکر و دغا بازی فریب
اس ادائے کج روی کو لیڈری کہہ لیجئے

زن مریدی نے مٹا ڈالا ہے عارض کا جمال
مرد کی اس بے بسی کو عاشقی کہہ لیجئے

یہ گرانی اور ہماری بے زبانی ہائے ہائے
کچھ نہیں کہیئے تو اسکو بے حسی کہہ لیجئے

ہیں کہاں صابر بہاری اور کہاں طنز و مزاح
آپ انکی شاعری کو گدگدی کہہ لیجئے

مشترکہ غزل

صابر بہاری (رانچی)

باپ دادا کی کہانی اور ہے
"اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے"

سرخرو ہوں سینڈل کی مار سے
"سوز غمہائے نہانی اور ہے"

یوں تو کہنے کو گرانی کل بھی تھی
"لیکن اب کے "سر" گرانی اور ہے"

کہتے کہتے آپ نے چپ سادھ لی
"کچھ تو پیغام زبانی اور ہے"

یہ تو ہے انگور کی بیٹی میاں
"وہ بلائے آسمانی اور ہے"

یوں تو جیتے جی مرے صابر بہت
"ایک مرگِ ناگہانی اور ہے"

منظوم لطیفہ

صابر بہاری (رانچی)

لوگ کہتے ہیں، جواہر لال نہرو ایک سال — "انسپکشن" کی غرض سے پہنچے کانکے[1] ہسپتال
کوئی پاگل چپکے چپکے وارڈ سے ہو کر فرار — آکے اُن کے سامنے گویا ہوا یوں ایک بار
نام کیا ہے اور کیا ہے آپ کا حضرت مقام — مسکرا کر اُس سے نہرو جی ہوئے یوں ہمکلام
ہوں وزیرِ اعظم بھارت جواہر نام ہے — از ہمالہ تا کرالا میری شہرت عام ہے
پاگل اُنکی بات سنکر سامنے سے ہٹ گیا — زیرِ لب کچھ بُد بُدایا اور پھر اُسنے کہا
آپ اچھے جلد ہی ہو جایئے گا محترم — ہم بھی خود کو پہلے ہٹلر سے سمجھتے تھے نہ کم

---

[1] ایک مقام جہاں رانچی کا پاگل خانہ واقع ہے

رفیق شاکر (جونا ئیل کھام گاؤں)

فارغ البال

سند یافتہ حکیم اور ڈاکٹر جب ہمارے گنجے پن کا علاج نہ کر سکے تو ہم غیر سند یافتہ حکیموں اور عالموں یعنی اپنے دوستوں سے رُجوع ہوئے۔

مظہر بھائی نے کہا "مرزا صاحب آپ کے ناخن کسی جنگلی بلّے کی طرح نوکدار اور سخت ہیں۔ آپ تو گنجے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ گنجوں کو ناخن نہیں دیتا۔" تو مجید بھائی نے کہا "یار مرزا صاحب کے بال انگریزی طرز کے ہیں بھلا وہ اُردو کی اس کہاوت کو کیا خاطر میں لائیں گے؟ اور بھلے ہی مرزا صاحب اردو جانتے ہوں مگر اُن کے بال تو اُردو نہیں جانتے؟"

حمید بھائی نے کہا "مرزا بھائی آپ کو تو اپنے گنجے پن پر فخر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر مُفکر گنجے ہوتے ہیں؟" ہم اپنے مفکر ہونے کی خوشی منانے ہی والے تھے کہ ثاقی بھائی نے "اکثر مفکر گنجے ہوتے ہیں لیکن ہر گنجہ مفکر نہیں ہوتا" کہہ کر ہمیں مفکروں کی صف سے الگ کر دیا۔

سعید بھائی نے کہا "مرزا صاحب! چونکہ بال سنوارتے وقت آپ کے بال کثرت سے جھڑتے ہیں اس لئے آپ تیل اور کنگھی کو "شجرِ ممنوعہ" ہی سمجھیں۔ تو طاہر بھائی نے مضحکہ خیز انداز سے کہا "پھر تو مرزا بھائی تبت کا خَسرا بیل یا افریقہ کا حبشی معلوم ہوں گے"۔

ہم نے جھنجھلا کر کہا "یار آپ لوگ کوئی معقول تجویز بھی پیش کریں گے یا بس یونہی ایک دوسرے پر طنز کریں گے؟"

بالآخر متفقہ طور پر ایک دو سالہ منصوبہ طے ہوا جو کچھ اس طرح تھا۔

۱. صبح ناشتہ کے بعد "سیکاکائی" صابن سے سر کی دُھلائی اور پھر "پیور سلویکرن" (PURE SILVIKRIN) سے دس منٹ تک مالش۔

۲. دوپہر کھانا کھانے سے قبل "شکنتلا ہیر آئل" سے مالش اُس کے آدھے گھنٹے بعد "پیراشوٹ کوکونٹ آئل"

PARACHUTE COCONUT OIL میں "جھرن" JHARAN ملا کر دس منٹ تک مالش۔

۳۔ سہ پہر کی چائے کے ساتھ "بے نظیر ہیر آئل" کا استعمال۔

۴۔ رات کو سونے سے قبل "زلفی شیمپو" سے سر کی دُھلائی اور "زلفی ہیر ٹانک" کا استعمال۔

مسلسل دو سال کے اس ریاض سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارا گنجا پن پہلے کی بہ نسبت چار گنا زیادہ ہوگیا!

ایک روز رحیم خلیفہ نے ہمارا چہرہ بناتے وقت بڑے رازدارانہ انداز میں کہا: "مرزا صاحب! اگر آپ دو چار دفعہ اپنا سر منڈھوالیں تو نہ صرف گنجا پن دور ہوجائے گا بلکہ لمبے اور گھنے بال بھی اُگ آئیں گے" اور سند کے طور پر انہوں نے اپنے دو چار مریضوں کے نام گنواتے ہوئے بتایا کہ یہ جو اپنے سروں پر بالوں کا گھنا جنگل لئے پھرتے ہیں سب اسی مجرب اور آزمودہ نسخہ کا اثر ہے۔

کافی غور و خوض کے بعد ہم نے رحیم خلیفہ کے نسخہ کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ بنایا اور ایک دن اپنے فارغ البال ہونے کی غرض سے رحیم خلیفہ کی دکان پر پہنچے معلوم ہوا کہ صاحبِ موصوف ———— دو ماہ کے لئے "غیر شہر" کے دورے پر گئے ہوئے ہیں مجبوراً ہمیں نئے نائی سے رجوع ہونا پڑا۔

ہم نے کہا نائی بھائی ہمارا سر مونڈھ دو۔

جب نائی کو پوری طرح یقین ہوگیا کہ واقعی ہم بحالتِ ہوش و حواس اپنا سر مونڈھوانا چاہتے ہیں تو اس احمق نے انکار کرتے ہوئے کہا "پہلے اپنے گھر کی کسی بزرگ شخصیت کو اپنے ساتھ لائیں۔"

"گھر کی سب سے بزرگ شخصیت ہم ہی ہیں۔"

"پھر محلے کے کوئی ذمہ دار اور سمجھدار شخص کو ساتھ لائیے۔"

"پورے محلے میں ہم سے زیادہ ذمّہ دار اور سمجھدار کوئی ہے ہی نہیں۔" "پھر اپنے چند دوستوں کو ساتھ لائیں تاکہ سر مونڈھنے کے بعد آپ کسی قسم کا دنگا فساد نہ کرسکیں۔"

مجبوراً چند دوستوں کو ساتھ لئے ہم نائی کی دکان پہ پہنچے۔ اِدھر نائی نے اُسترا چلایا اُدھر ہمارے دوستوں نے تالیاں بجانا اور قہقہے لگانا شروع کیا بالآخر ہم ایک اچھے خاصے جلوس کی شکل میں گھر لوٹے ہمارے دوستوں نے بڑی مشکل سے ہماری شناخت ہماری بیگم اور بچوں سے کروائی اور کافی جدوجہد کے بعد ہمیں اپنے گھر میں داخلہ نصیب ہوا۔

خان صاحب نے ہمیں اس حالت میں دیکھا تو بڑے معنی خیز انداز سے مسکراتے ہوئے ہماری خیریت دریافت کی پھر تو ہماری خیریت دریافت کرنے والوں اور پرسہ دینے والوں کا تانتا سا بندھ گیا۔

ہم ہر کس و ناکس کی مسکراتی نظروں، طنزیہ فقروں اور بے تکے سوالات کا شکار ہوتے رہے اور یہی سوچکر سب کچھ برداشت کرتے رہے کہ ہفتہ پندرہ دن میں جب نئے بال اُگ آئیں گے تو لوگ اس حادثۂ ظریف کو بھول جائیں گے لیکن آج ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گذر جانے کے باوجود ہمارا سر بالکل ویسا ہی صاف ہے جیسا کہ نائی نے پہلے دن صاف کیا تھا اور ہم رحیم خلیفہ کا انتظار کررہے ہیں۔ اب خدا اُنہیں غارت کرے اس احمق کو!

سید حسن عباس (سیوان)

دیکھئے! آپ میں پوشیدہ ہیں جوہر کتنے

(اس خاکہ میں جو مصرعے کام میں لائے گئے ہیں ان کے خالق جوہر سیوانی ہیں ہاں! اکثر و بیشتر مصرعوں میں تحریف یا کسی کسی جگہ تخریب کا ذمہ دار میں خود ہوں اس کے لئے جوہر صاحب سے معذرت چاہوں گا اس اُمید پر کہ انھیں معاف کرنا آتا ہے۔ س۔ ح۔ عباس)

مجھے اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا اور اس اشتیاق نے ایک خوبصورت اتفاق پیدا کیا کہ میری اُن سے ملاقات ہوگئی۔ گرچہ اس خوبصورت اتفاق کی یاد اب ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ نہیں رہی مگر میں اُن کی "خوبصورت شخصیت" کا دل سے معترف اور کہیں کہیں معتقد بھی ہوں۔ ویسے ہماری ملاقات کسی شعری نشست میں ہوئی تھی۔ خیر! تو ہوا یہ کہ میری اُن سے ملاقات ہوگئی۔ کسی صاحب نے بڑھ کر تعارفی "تکلفات کے پردوں کو آہستہ آہستہ سرکایا۔ "یہ ہیں! ملک گیر شہرت کے حامل، طنز و مزاح کے بادشاہ! جناب جوہر سیوانی"۔ اور جوہر صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" بیک وقت ہم دونوں کے مُنہ سے نکلا۔

میں تو کب سے جوہر سیوانی کا نام سُنتا اور اکثر مشاعروں کی رپورٹوں میں پڑھتا آیا تھا۔ بس! افسوس تھا تو اس کا کہ انھیں مشاعروں میں پڑھتے دیکھا یا سُنا نہ تھا۔ سو قدرت نے وہ موقع بھی فراہم کرا دیا۔ جوہر سیوانی اور مشاعرہ — لازم و ملزوم ہیں۔ کچھ نشستوں میں تو ان کے کلام کو بڑے ذوق و شوق سے سُنا اور دل کھول کر داد بھی دی۔ مگر کیا پتہ تھا کہ یہ داد گری مجھ پر دادا گری کی طرح حاوی ہو جائے گی۔ کیوں کہ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک "سخن ناشناس" مفت ہاتھ آہی گیا ہے تو ہوشمنداں را موقع کا فیسٹ کے مصداق دادِ سخن وصول کرنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے اس لئے جب بھی ملے اور اکثر تو صرف اسی لئے ملے کہ کوئی نئی چیز سنیئے — مرتا کیا نہ کرتا!

اور صاحب! سچ تو یہ ہے کہ اب میں ان کے کلام کو کم اور ان کی شخصیت کو زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا اور میرا

ؔ جن لوگوں نے جوہر سیوانی کو دیکھا ہے وہ میری بات کی تصدیق مزید کریں گے۔ عباس

خیال ہے (جو صدفی صد درست ہوگا) کہ وہ بھی مجھ سے کم اور میری جا و بے جا داد دینے کی عادت سے زیادہ محظوظ ہوتے مثلاً ایک شعر۔ جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اسے غزل سے بلکہ مجموعۂ کلام ہی سے نکال کر "غیر متداول کلام" میں جگہ دی جائے تاکہ مرنے کے بعد مجھ جیسے سخن ناشناسوں کے ہاتھوں رسوائی کی حد تک شہرت کی معراج پائے۔ مگر میں اس شعر کی تعریف میں رطب اللسان بلکہ جنبان اللسان تھا کہ میرو غالب سے لے کر دورِ حاضر کے کسی اچھے یا بُرے شاعر نے اس خیال کو اس طرح نہ باندھا ہوگا جس طرح جوہر سیوانی نے ۔ شعر یہ تھا ؎

کرم اہل کرم کا جھانکتا ہے ۔ فقیر رہگزر کے پیرہن سے

اور جب میں نے کئی "حوالات"[1] کی نشاندہی کی تب وہ بے حد خوش ہوئے اور اس شعر کو اپنے "دیوان خانے" میں مناسب جگہ فٹ کرنے کی سوچنے لگے۔ پھر میری "علمیت" پر رشک بھی کرنے لگے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جوہر سیوانی کا اصل نام مظفر حسین ہے اصل نام کا استعمال بھی اب وہ نہیں کرتے، سوائے ایک جگہ کے، اور وہ جگہ ہے دفتر کا رجسٹر۔ جس پر مظفر حسین کی دستخط سے تنخواہ اڑا لیتے ہیں۔ یہ بات بھی شاید لوگ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے والد ماجد جناب یوسف سیوانی مرحوم طنز و مزاح کے بہت اچھے شاعر تھے۔ باپ کی سعادت مند اولاد ہونے کے سبب جوہر سیوانی نے بھی باپ ہی کے نقش قدم پر قدم جمانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ورنہ کیا جوہر کیا شاعری ۔ یہیں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست ÷ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

جوہر سیوانی ۔ پانچ ساڑھے پانچ فٹ کا قد، گول مٹول چہرہ، ستواں ناک، تانبے کی طرح تو نہیں مگر ہاں! چمکتی ہوئی پیشانی، جسے عورتیں اقبال مندی کی نشانی سمجھتی ہیں۔ سر، تربوز کی طرح ۔ لیکن تربوز سے کچھ چھوٹا اور بیل سے کچھ بڑا (بیل کو بیل نہ پڑھا جائے) آنکھیں چھوٹی مگر سیاہ اور چمکدار، ہونٹ پتلے، دانت چمکیلے اور زبان رسیلی ۔ جو پان کی کثرت سے کچھ زیادہ ہی "رنگین" ہوگئی ہے۔ بھاری بھرکم جسم ۔ نہ توانا اور نہ ہی کسرتی، بلکہ ریاستی۔ وہ خود کہتے ہیں، ؏ یہ جسم میرا کوئی بیل کی گاڑی تو نہیں ہے۔

رنگت ۔ بقول پیر دیزید اللہ مہدی۔ "ایسی کہ کسی حسینہ کے گال پر تل" کی شکل میں ہو تو خوبصورتی اور حسن میں چار چاند لگ جائیں" اور ہم کہہ سکیں کہ ؏

افق پر نیا چاند روشن ہوا ہے

جوہر صاحب اعلیٰ روایتی اقدار کے علمبردار ہیں مگر موجودہ دور میں نئی اور پرانی قدروں کی شکست و ریخت سے بیزاری اور نئی تہذیب و تمدن اور پرانے نظامِ حیات کی کشمکش سے کچھ رنجیدہ اور کبیدہ خاطر بھی۔ گویا ؏

نئی تہذیب میں رسمِ کہن کی آزمائش ہے

---

[1] صحیح حوالاجات ۔ عباس۔

مگر اُن دونوں متضاد رسموں کو وہ بڑی وضعداری اور خوبصورتی سے نبھاتے چلے آرہے ہیں اگر کوئی دوست بل جائے اور وہ بھی نئے دور کا تو اس سے اُسی طرح پیش آتے ہیں جیسا اس دور کا تقاضا ہے اور اگر کوئی رسم کہن کا نمونہ آدھمکا تو اس سے بھی وہ بڑی وضعداری سے پیش آتے ہیں اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صرف "وضعداری" ہی کی بنا پر اپنی ساکھ بنائے ہوئے ہیں ورنہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ع

پاس جوہر کے اب رہا کیا ہے ؟

لیکن حقیقتاً ایسی بات نہیں ۔ جوہر صاحب کے پاس اب بھی بہت کچھ ہے، کوربینا کہا جائے کہ ان کے پاس کیا ہے ؟ ان کے پاس سب سے بڑی دولت ان کا فن ہے جس کے نہ گم ہونے کا خطرہ ہے اور نہ چوری جانے کا ۔ مگر زنگ لگنے کا ضرور خطرہ ہے اس خطرے کا احساس انہیں بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے "بزم انور" کی ماہانہ نشست قائم کی ۔ جس میں نومولود بھی آتے ہیں اور نو وار دان بساط سخن میں غزل خواں کر کے مجمع اکٹھا کر لیتے ہیں اس کے بعد اہل فن کی باری آتی ہے اور جب جوہر صاحب کی باری آتی ہے تو ع لہلہاتی ہوئی رنگین غزل کہتے ہیں ۔

اور اپنی اس، لہلہاتی رنگین غزل سے ع "ہر ایک روتے ہوئے انسان کو جوہر ہنسا دے ہے"۔ سُنتے ہیں کہ اکبر کے دربار میں نورتن تھے مگر یہاں تو جوہر صاحب اپنے آپ میں نورتن ہیں ۔ یہ نورتن (جوہر سیوانی ، قمر سیوانی ، کوثر سیوانی، بیکس سیوانی، سہیل پیغمبر پوری، ننگ عنایت پوری ، عارف سیوانی ، احمق سیوانی ، امتیاز رام پوری) اتفاق سے سب شاعر اور وہ بھی "کام چور" شاعر ۔

جوہر صاحب کا تعارف تو چل ہی رہا ہے جوہر صاحب کی شخصیت کو "چومکھی" بنانے والوں کا تعارف یہ ہے ۔

قمر سیوانی :۔ اسکول میں ٹیچر ہیں مگر کسی بھی طرف سے ٹیچر نہیں شاعر ہی دکھائی دیتے ہیں ۔ ویسے کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں ۔ پڑھنے کے انداز پہ تو محفل جھوم جاتی ہے اگر ہم یا آپ جھوم جائیں تو کوئی بات نہیں ۔ ویسے آپ انہیں ہر فن مولا کہہ لیں تو زیادہ مناسب ہوگا ۔

کوثر سیوانی :۔ سب سے بڑے شاعر ۔ بلکہ کتنوں کو شاعر بنانے والے ۔ شاعر گر ۔ باوقار شخصیت اور پروقار انداز بیاں بھی ۔ اب ایسا سمجھیں کہ تمام شاعر انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ چونکہ میں شاعر نہیں اس لئے کچھ گنجائش نکالی جاسکتی ہے مگر میں ان کی عزت کرتا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ وہ بڑے شاعر ہیں بلکہ بڑے انسان بھی ہیں ۔ ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے ۔

بیکس سیوانی :۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے ۔ ان کی تعریف جوہر صاحب کی زبانی سنیئے :

شاعری کی مشین ہیں بیکس پھر بھی کوڑی کے تین ہیں بیکس
ڈاکٹر بھی ہیں اور شاعر بھی کیا بلا کے ذہین ہیں بیکس
ہے بچھے ڈھول سی صدا ان کی شر ہے اُدھیا ئین ہیں بیکس

محفل وَعظ ہو کہ قوالی آپ ہی سامعین ہیں بیکس
ان کی تعریف کیا کروں جوہر
ایک ہو کر بھی تین ہیں بیکس

سہیل پیغمبر پوری :۔ لمبا قد، لمبی داڑھی' لمبا کرتا اور لمبی بنڈی اور اُوپر سے لمبی شیروانی پھر سر پر کسی قدر لمبی ٹوپی۔ قرأت سے کلام کرتے ہیں اور کسی قدر پڑھتے بھی ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ہیں جناب مولانا سہیل پیغمبر پوری بہترین نعت گو اس سے کہیں بہترین نعت پڑھنے والے۔ غزل بھی خوب کہتے ہیں واعظ و محتسب کے ساتھ کبھی کبھی ناقدوں کے بھی جان کے لالے پڑجاتے ہیں اس لئے کہ ہر وقت لاحول ولاقوت اِلّا باللہ کا وِرد جاری رہتا ہے۔ ویسے نہایت شریف اور پُر مذاق آدمی ہیں۔ انھیں چھوڑیئے!

تنگ عنایت پوری :۔ تخلص خوب ہے یہ لڑکا بھی خوب ہے' خوب ان معنوں میں کہ اس کے ذوق شاعری کو پروان چڑھانے والے بھی خوب ہیں۔ غیر مسلم ہے غالبًا اس کے دادا شام عنایت پوری مرحوم اردو فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے افسوس کہ ان کا کلام منظر عام پر نہ آسکا۔ ہاں! تو تنگ کا قصہ یہ ہے کہ اسے شاعری اور وہ بھی مزاحیہ شاعری سے تعلق ہے وہ جوہر صاحب کی پناہ میں جہاں تہاں مشاعرے بھی پڑھ چکا ہے۔ چھریرا بدن، ہنستا چہرہ لئے ہر جگہ آدھمکتا ہے اور جب آتا ہے تو طوفان جگاتا ہے جاتا ہے تو طوفان کی طرح —!

عارف سیوانی :۔ سنجی شکل وصورت والے نوجوان ادیب و شاعر ہیں صحافی بھی ہیں اخبار و رسائل سے وابستہ بھی ہیں ان کے بارے میں جان لیجئے کہ کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے ورنہ کیا پتہ کب ہماری شامت آجائے۔

احمق سیوانی :۔ نام ہی کی طرح بالکل واضح اور کھلم کھلا" احمق" ہیں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ مزاحیہ شاعری ان پر لادی گئی ہے اور یہ بڑے مزے سے ڈھو رہے ہیں!

امتیاز رام پوری :۔ ہیں تو نستعلیق، مگر آواز مہین ہے سُر بھی دُبلا پتلا ہے کہتے اچھا ہیں پڑھتے اچھا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر مشاعروں میں ہوٹ ہو جاتے ہیں۔ بقول جوہر۔

گھس کے کانوں میں موذن کے صدا دیتے ہیں
ناک پر بیٹھ کے خواب ان کا اُڑا دیتے ہیں

جوہر صاحب مجسم خلوص ہیں۔ ویسے کچھ لوگ" خلوص مجسم" سے بھی کام چلا لیتے ہیں۔ ان کے پاس واقعی اگر کچھ ہے تو وہ ہے" خلوص بیکراں" یا" بے کنار"۔ جس سے وہ ہم کو، آپ کو، بلکہ سب کو ہمکنار، کر لیتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ بساط سخن سے زیادہ کام لیتے ہیں اور اس بساط سخن کا نام" بزم الاذ" ہے جس کی سرپرستی وہی کرتے ہیں۔ یہ بزم اچھی خاصی شاعروں کی ایک ٹیم ہے تعارف کچھ کا اُوپر ہو چکا ہے اس میں ہر طرح کے کھلاڑی موجود ہیں اکثر ماٹھے تانگے یا سرقہ و توارد کی بالنگ۔ بھی خوب ہوتی ہے اور کبھی کبھی کوئی باؤلنسر گھائل بھی کر دیتا ہے۔

خیال سے خیال ٹکرا جائے تو کوئی بات نہیں، کلام سے کلام ٹکرا جاتا ہے اور کبھی کبھی ہوائی جہاز سے بیل گاڑی مگر صاحب! اس نشست کی تنظیم و ترتیب ہیں۔ جوہر صاحب کی امپائرنگ ایسی ہوتی ہے کہ جانے مانے امپائر گھٹنے ٹیک دیں۔ کیا مجال کہ یہ شخص ایک سکنڈ کو بھی بیٹھ جائے۔ امپائر تو دونوں ٹانگوں سے کھڑا رہتا ہے مگر یہ صرف ایک ہی ٹانگ پر ـــ گویا اب بانگ دینا شروع کردیں گے!

مگر اللہ بچائے نکتہ چینوں سے ـــ جوہر صاحب بھی ان کے تیر و نشتر سے اکثر پریشان رہا کرتے ہیں۔ ایک گھریلو نشست میں انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ کسی مشاعرہ میں جب اناؤنسر نے ان کی باری آنے پر نہایت موٹے تازے الفاظ سے ان کا خیر مقدم کیا تو کچھ استاد قسم کے شاعروں نے بغلیں جھانکنی شروع کردیں۔ اور جب میں نے مقطع کا یہ مصرعہ پڑھا ؎

زندہ اکبر کی جگہ جوہر سیواں ہے ابھی

تو وہ پسینے میں ڈوب گئے۔ اس میں شک نہیں کہ جوہر صاحب نے اپنی مزاحیہ شاعری سے نہ جانے کتنے بجھے دلوں میں خوشیوں کے چراغ جلائے ہیں مگر میں کہہ نہیں سکتا کہ ان چراغوں نے کتنوں کے دل جلائے ہیں۔ ہاں! تو بات تھی نکتہ چینوں کی ـــ جن سے حضرت شاد (عظیم آبادی) کو بھی برابر سابقہ پڑتا رہتا تھا اور کچھ آگے بڑھیئے تو چچا غالب کو بھی یہ نکتہ چیں "یہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہتے نہیں چوکے تو بھلا جوہر سیوانی کیسے بچتے ـــ ان کے بارے میں اکثر نکتہ چینوں کا خیال ہے کہ

وہ اونچے درجے کا اک مسخرہ لگتے ہے ہمیں

لیکن یہ "اونچے درجے کا مسخرہ" کم و بیش ہر چھوٹے، بڑے، کل ہند، صوبائی، شہری، مضافاتی یا میاں بھاتی کی نشستوں اور مشاعروں میں پابندی سے "پوچھا" جاتا ہے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ ایک نرالی آن بان اور دیکھنے والی شان سے بیٹھا منہ میں پان کی گلوریاں دبائے ہر ایک سے بڑی خوش دلی سے محو گفتگو ہے۔ اور جب کلام سنانے کھڑا ہوتا ہے تو محفل اسٹیج پر آتے ہی زعفران زار بن جاتی ہے۔

؎ جرأت کہاں کسی میں بھلا گفتگو کرے

اور دوسرے شعراء حسرت شادکامی یا کامیابی کا داغ اٹھائے، منہ لٹکائے، گردنیں جھکائے مری ہوئی آواز میں یہ کہتے ہوئے راستہ لیتے ہیں کہ

شریک بزم تو جوہر ہے کیا کیا جائے
ایک گوشے سے کسی نے آواز کسا۔

؎ کوئی سُر ہے نہ تال ہے پیارے

مگر یہ شاعر بھلا کب ماننے والے ہوتے ہیں فوراً شعر کو مکمل کردیا ـــ

ع اب تو جینا محال ہے پیارے

اور ادھر جوہر سیوانی بڑی پاٹ دار آواز میں یہ مصرعہ دہرا رہے ہیں۔

ع یہ اپنا اپنا مقدر ہے کیا کیا جائے

آپ بڑی خوبیوں کے حامل ہیں۔ چھوٹے بڑے سب سے بے حد پیار اور محبت سے ملتے ہیں ساتھ ہی خاص کر نکتہ چینیوں کا کچھ زیادہ ہی خیال کر جاتے ہیں بقول خود۔

ع ہم نے سیکھا نہیں شرمندۂ احساں ہونا

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ جوہر صاحب چور کی طرح مشہور ہیں یہ خیالات انہی لوگوں کے ہیں جن کو

ع شہرت بھی اُن کو چبھنے لگی خار کی طرح

درحقیقت یہ نکتہ چیں یا چیں بر جبیں والے حضرات رشک کرتے ہیں رشک بھی کچھ ایسا جو حسد کے گھوڑے کو مہمیز کرنے لگے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جب مشاعرہ میں جوہر صاحب پہنچ جاتے ہیں محفل انہی کے ہاتھ رہتی ہے اور کہنے والے کہتے ہیں

ع ہاں! مگر ثابت قدم جوہر ہی محفل میں رہے

جوہر صاحب دوست بنانے کے سبھی گُر سے واقف ہیں ماشاءاللہ یادداشت بھی خوب ہے ایک بار جس کا چہرہ دیکھ لیتے ہیں زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں وہ چہرہ جب کبھی، کہیں سامنے آجائے فوراً پہچان لیں گے۔ یادداشت کی ایک سامنے کی مثال یہ ہے کہ انھیں ان کا سب نہیں، تو تقریباً آدھے سے زیادہ کلام زبانی یاد ہے۔ وہ یہ بھی بتادیں گے کہ یہ غزل یا نظم کس موقع سے کب کہی تھی۔ احباب پروری اور احباب نوازی میں بھی وہ پیش پیش رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان سے ملنے والے نہ جانے کہاں کہاں سے آتے رہتے ہیں شاعر دوست کی بات تو الگ رہی غیر شاعر دوستوں میں بھی وہ اسی طرح مقبول ہیں۔ اگر آپ سیوان آنا چاہیں تو سیدھے جوہر سیوانی کے یہاں چلے آویں۔ کیونکہ شہر میں وہ ہر دل عزیز ہیں رکشے والوں سے پوچھ لیں یا تانگے والوں سے۔ سب ان کے گھر کا پتہ جانتے ہیں۔

جوہر صاحب جتنا باہر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ گھر کے اندر۔ کیوں کہ وہ وفا شعار شوہر بھی ہیں اور ذمہ دار باپ بھی۔ اور پڑوسیوں کی نظر میں "پہنچے ہوئے لوگوں" میں سمجھے جاتے ہیں۔ سیوان کا ہر بچہ ان کے نام سے واقف ہے ان کے کام سے واقف ہے۔ بچوں سے بالکل اسی طرح ملتے ہیں جس طرح دو بچے آپس میں ملتے ہیں۔ شاعروں کے درمیان شاعر اور وہ بھی شاعر آخرالزماں ــ شاید یہ مبالغہ ہوگیا۔ ویسے آپ چاہیں تو

ع جوہر خوش ذوق کو اک جوہری کہہ لیجئے

غزلیں

اب کے دو بئی سے ہے سالا، مرا آنے والا
ٹیپ ٹی وی ہے مرے واسطے لانے والا

بہترین جاب ملا اُس کو پہنچتے ہی وہاں
ہوٹلوں میں ہے وہ کفگیر چلانے والا

بیویاں بیٹے بہو بیٹیاں اور گھر داماد
کھانے والے ہیں کئی ایک کمانے والا

دیکھ کر تیری خوراک اور ترا یہ جُثّہ
کون ہوگا تجھے دعوت میں بلانے والا

ہاتھ دینے کے لئے بھی تو ملاتے ہیں لوگ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

وائف سے بور ہوا میں تو بہت اب اس کو
نیند کی گولیاں دے کر ہوں سلانے والا

ہوں بھلکڑ میں بڑا، کاش کوئی ایسا ملے
قرض دیکر بھی نہ ہو یاد دلانے والا

ہر کوئی ہم کو پلاتا ہے فقط چائے سراج
کاش مل جائے کوئی بیر پلانے والا

ہر برس گھر سے یوں ایک جاتی رہے
بن کے دولہن نئی، ایک آتی رہے

کیک بسکٹ رہیں اور چپاتی رہے
ناشتے میں مرے ناشپاتی رہے

اپنے میکے کو اکثر تُو جاتی رہے
یوں ہی سامان بھر بھر کے لاتی رہے

(JOB) جاب کر کے کما کر تو لاتی رہے
میں کماتا رہوں اور تو کھاتی رہے

روز رشوت ملے لائف میری یوں ہی (LIFE)
چاندنی کی طرح جگمگاتی رہے

ہے یہ کوشش کہ اگلے الکشن تلک (ELECTION)
کوٹھیاں چار ہوں، کار ذاتی رہے

مُرغ بریانی زردہ پلاؤ رہے
پی کے فل بیر، ہر براتی رہے (BEER)

ینگ لیڈر کی پلسٹی کے لئے
پروگرام ایک پندرہ نکاتی رہے

خواہ مخواہ وائف سے ڈر رہا ہے سراج
یوں نہ اس پر اثر نفسیاتی رہے

○

پڑے جو وقت لفنگے بھی کام آئیں گے
یہ پالیٹکس ہے غنڈے بھی کام آئیں گے

خریدنے کے لئے ایک ادن سیکل اب
ہماری بزم کے چندے بھی کام آئیں گے

دمیزبان ہے مرضی تری کھلا کچھ بھی
نہ ہو جو مرغ تو انڈے بھی کام آئیں گے

گداکو جان کے حاضر گواہی دینے کو
عدالتوں میں یہ جھوٹے بھی کام آئیں گے

ہے کھیتی ہی نے گا تو کل کروڑ پتی
یہ تیرے بلیک کے دھندے بھی کام آئیں گے

سراج دیئے اٹھا لو تو لائٹ آف ہوئی
کسے خبر تھی اندھیرے بھی کام آئیں گے

سراج نرملی

★

نظم ونسق کی اصلاح ـ بھلائی کے مزید اقدامات

" سری این. ٹی. راما راؤ چیف منسٹر آندھرا پردیش کی قیادت میں ریاستی حکومت نے کامیاب ایک سال مکمل کرلیا ہے اور ریاستی حکومت نے عام لوگوں کی بھلائی کے لئے مختلف فلاحی اقدامات کا اعلان کیا ہے۔"

ظم ونسق کی اصلاح

○ لوگوں کی چوکھٹ تک نظم ونسق مہیا کرنے کے لئے ۱۲ منڈلس کا قیام عمل میں آرہا ہے کئی دیہات کے ایک گروپ کے لئے جن کی آبادی ۳۵ ہزار تا ۵۵ ہزار ہے ایک منڈل قائم کیا جائیگا۔ نو ترقی کے مرکز کے طور پر خدمت کرے گا

○ ویلیج آفیسروں کے تمام عہدے ختم کردیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ ویلیج اسسٹنٹ کا تقرر کیا جائے گا۔

لمزوروں کی امداد

○ بیواؤں کو جن کی سالانہ آمدنی اٹھارہ سو ۱۸۰۰ روپے سے کم ہے ۵۰ روپے ماہانہ کے حساب سے وظیفہ دیا جائے گا۔ پچھڑے ہوئے طبقات کے یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے لئے یتیم خانے ائم کئے جائیں گے اور منڈل کمیشن کی تمام سفارشات پر عمل آوری ہوگی۔

قلیتوں کی فلاح

○ اقلیتوں کی فلاح کے لئے اقلیتی مالیاتی کارپوریشن قائم کی جائے گی۔

○ لسانی اقلیتوں کی مادری زبان میں تعلیم کے لئے جہاں بھی ضرورت ہو اُن مقامات پر اُن کو تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

دیگر فلاحی کام:- ۱۲ سال کی عمر تک کے طالب علموں کے لئے بسس میں مفت سفر کی سہولت ہوگی اسکول کو آمد ورفت کے لئے۔" ○ زرعی محاصل کی برخواستگی۔

○ بڑی صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو امکنہ کی فراہمی ان کے مینجمنٹ کی مدد کے ساتھ اور دوسری صورتوں میں حکومت کی مدد سے۔ ○ مرکزی حکومت کی خاندانی منصوبہ بندی ترغیبی انعامات ریاستی حکومت کے ملازمین کے لئے بھی جاری کئے جائیں گے۔

فلم اور ثقافت

○ نوجوانوں کی تہذیبی مصروفیات، ثقافت اور کھیلوں کی ترقی کے لئے ہر ضلع میں ایک ثقافتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

○ آندھرا پردیش کی فلمی صنعت کی ترقی کے لئے ترغیبی انعامات کا اعلان۔

محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ

DIPR LR NO: 2/PIL/ADVT/C4/84 DATE. 19-1-1984

میمونہ وحید
(ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ)

طنز و مزاح کی تعریف

اُردو ادب میں طنز و مزاح کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ ادب میں دوسری اصناف کی۔ طنز و مزاح انسانی جذبات کے دو اہم اجزاء ہیں۔ یہ نفرت اور مسرت انسانی زندگی کے دو اہم اور بُنیادی جذبے ہیں۔ طنز و مزاح انہی دو جذبوں کی ایک طرح سے نمائندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ طنز نفرت کے جذبے سے پیدا ہوتا ہے اور مزاح جذبۂ مسرت کی پیداوار ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ طنز و مزاح اپنی افادیت اور مقصدیت کے اعتبار سے تنقید کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ طنز و مزاح اچھائی اور بُرائی کو سامنے رکھ کر ہر اُس چیز کا جو اپنی اصلی حالت یا اپنے معیار سے گری ہوئی ہو مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ اور اس طرح ناہمواری کا نہ صرف احساس دلاتے ہیں بلکہ تبدیلی اور تغیر کے بھی خواہاں رہتے ہیں۔ دراصل طنز و مزاح کا محرک اصلاح ہوتا ہے۔ طنز و مزاح حیاتِ انسانی کی سب سے اہم خدمت انجام دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے تنقید کے تعلق سے کہا تھا کہ

"تنقید انسان کے لئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ سانس"

طنز و مزاح کے تعلق سے یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ انسانی زندگی میں طنز و مزاح کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی سانس کی چنانچہ کنھیا لال کپور طنز و مزاح کو شگفتہ تنقید قرار دیتے ہیں اور طنز نگار کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھی طنز لکھنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اچھا ہاضمہ، تیز طبیعت دماغی توازن اگر ان چیزوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے تو طنز نہیں رہتی"[1]

---

[1] بال و پر از کنھیا لال کپور ص ۱۰

ہر صنف ادب کی طرح طنز و مزاح کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہے۔ اس لئے اس کی جامع و مانع تعریف کرنا دشوار کن امر ہے۔ گویا سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

اردو ادب کی نشو و نما میں فارسی اور انگریزی ادبیات نے نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ چنانچہ اُردو ادب کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ اور طنز و مزاح کی تعریف کے سلسلے میں زیادہ تر مغربی طنز و مزاح کے معیار کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔ گو بیسویں صدی عیسوی میں اردو ادب کے میدان میں طنز و مزاح پر خاصی توجہ دی گئی اور اس کی تعریف اور اس کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔

بیسویں صدی عیسوی طنز و مزاح کے فروغ کے لئے سازگار ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ ایک تو اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر اس پر خاصی توجہ دی گئی۔ دوسرے اس دَور میں مغربی طنز و مزاح کے حربوں کو اُردو طنز و مزاح میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح سے اردو طنز و مزاح کا دامن مختلف لعل و گہر سے مالامال ہوگیا۔ اور یوں طنز و مزاح کو فروغ نصیب ہوا۔ اور اس نے اب ایک اہم اور مستقل صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر لی۔

طنز انگریزی لفظ "سٹائر" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خود انگریزی لفظ Satire لاطینی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اردو میں لفظ سٹائر کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لفظ "طنز" سے کام لیا جاتا ہے۔ گو سٹائر کے لفظ میں جو معنویت اور وسعت پوشیدہ ہے وہ لفظ طنز سے پوری طرح ادا نہیں ہوسکتی۔ شاید اسی لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ :۔

> سٹائر Satire کا جو مفہوم انگریزی میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی (ہمارے یہاں کے کسی ایک لفظ میں) تقریباً ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہجو و ہجا، ہجو ملیح، تعریض، تنقیص، لعن و طعن و طنز استہزا، مذمت مضحکات، شطحیات، ہجو و ہزل وغیرہ۔" [1]

گو سٹائر اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے بے حد وسیع ہے۔ لیکن اردو میں لفظ طنز سٹائر کے معنی و مفہوم کو بڑی حد تک ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے اس میں بھی وہی معنویت اور وسعت پوشیدہ ہے۔ جو انگریزی لفظ سٹائر میں موجود ہے۔

ڈاکٹر جانسن کے خیال میں طنز کسی حماقت یا برائی کو ختم کرنے یا رد کرنے کا نام ہے۔

بولٹ نے طنز کی تعریف کچھ اس انداز میں کی ہے :

"خواہ وہ خوب ہو کہ خراب، عمومی ہو کہ خصوصی، سچ ہو کہ جھوٹ، وحشتناک ہو کہ

---

[1] "طنزیات و مضحکات" از رشید احمد صدیقی، ص ۲۳

مزاحیہ، نثری ہو کہ منظوم' انسان اور اس کے کردار کے معیوب اور احمقانہ
پہلو پر کی جانے والی ادبی تنقید کو طنز کہا جاتا ہے"۔ [1]

مندرجہ بالا تعریف سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز دراصل تنقید کا دوسرا نام ہے۔ طنز میں ادبیت بھی ہونی چاہیئے۔ اور ادبیت اس وقت ممکن ہے۔ جبکہ طنز نگار کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو۔ بغیر ادبی رنگ و آہنگ کے طنز، طنز نہیں رہتا بلکہ گالی گلوچ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انگریزی ادباء و فضلاء کی ایک حد تک متفقہ رائے یہی ہے۔ اس لئے انسائیکلوپیڈیا میں طنز کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"ہجو و ھجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ
یا حالت پر ہمارے جذبہ تفریح یا تفریحات کو تحریک ہو۔ بشرطیکہ اس ہجو و طنز میں ظرافت
یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو۔ اور ایسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو۔ اگر ان حیثیتوں کا
فقدان ہوا تو پھر یہ گالی گلوچ یا دہقانیوں کی طرح منہ چڑھاتا ہوگا"۔ [2]

مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز بغیر ظرافت کی آمیزش اور ادبی حسن کے اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حسن دونوں ضروری ہیں۔ خالص ظرافت نشیب و فراز کا
احساس دلا کر ایک مسرت یا انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی
ہے۔ اسلوب کی طرح طنز و ظرافت کا حسن بھی یہی ہے کہ اس کے غازہ و رنگ پر نظر نہ پڑے۔
یعنی تلوار کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے"۔ [3]

دراصل طنز زندگی اور ماحول کی برہمی کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ طنز نگار جس کو اپنا نشانہ تمسخر بناتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے اور اس ماحول کو بھی ناپسند کرتا ہے جس نے ناہمواری کو جنم دیا۔ گویا طنز میں نشتریت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ بہرکیف طنز نگار مضحکہ خیز شئے یا واقعہ یا حالت کو نہ صرف ہدف طنز بناتا ہے۔ بلکہ تبدیلی اور تغیر کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ طنز، تخریب، نشتریت اور نفرت کی آمیزش کا نام ہے۔ اصل میں اس کا جذبۂ محرک اصلاحی ہوتا ہے گو طنز نگار تخریب، پستی، نشتریت اور نفرت جیسے عناصر کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا کر ناہمواری کا احساس دلاتے ہوئے تغیر کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس طرح طنز ایک تعمیری کارنامہ انجام دیتا ہے۔ لیکن اس کی اس اہم خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ طنز اپنی بقاء اور اثر پذیری کے لئے چند عناصر کی آمیزش ایسی کرے کہ وہ ناگوار محسوس نہ ہو بلکہ خوشگوار بن جائے۔ اس طرح طنز میں ادبی حسن اور ظرافت کی آمیزش ضروری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سلسلے میں لکھا ہے:۔

---

[1] JONATHAN SWIFT AND THE ANOTOMY OF SATIRE BY BULLIT P39

[2] "طنزیات و مضحکات" از رشید احمد صدیقی ص۳۶۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) [3] "تنقید کیا ہے" از آل احمد سرور ص۵۳

طنز کے لئے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو۔ بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔ دوسرے پردہ دری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف و نازک پیرایۂ اظہار اختیار کرے۔ تیسرے کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا سلسلہ بنائے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز، طنز نہیں رہتی۔ محض، پھبتی، استہزا، ہجو کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔" [1]

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز بہت نازک طبع کا حامل ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش اس کی افادیت اور مقصدیت کو ختم کر دیتی ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجے کا طنز تہذیب، شائستگی اور ادب کا پیکر ہوتا ہے۔ چنانچہ طنز نگار کو ان عناصر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے طنز نگار کیلئے اپنے حصول مقصد کے تحت ادب، اخلاق تہذیب اور شائستگی اور مزاح جیسے عناصر کا دامن تھامے رہنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرقت کاکوروی بھی اسی بات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"Satire کی اصلی جولان گاہ سماج یا سوسائٹی کی برائیوں، کمزوریوں اور حماقتوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرنا ہے مگر اس میں تہذیب اور ادبیت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ طنز نگار پھکڑ پنے اور بھونڈے پن کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔ صحیح طنز وہ ہے جس میں تمسخر زیادہ ہو زہرناکی کم اور کم سے کم احساس برتری۔" [2]

فرقت نہ صرف طنز کے لئے تہذیب اور ادبیت کے قائل ہیں بلکہ صحیح طنز کے لئے مزاح کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

طنز میں جو تعمیری صلاحیت ہوتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوئفٹ نے لکھا ہے کہ طنز ایک ایسی اخلاقی پولیس ہے، جو برائی کے سامنے بے بس ہے۔ لیکن اچھائی کی مددگار ہے۔

ھنتی... نے بھی طنز کی جو تعریف کی ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ طنز کا بنیادی کام تعمیری ہوتا ہے طنز میں زندگی کو بہتر اور برتر بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔

مسٹر اسٹیفن لیکاک نے بھی طنز کی جو چار خصوصیات گنائی ہیں۔ اُن سے بھی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز زندگی میں پیدا ہونے والی خرابیوں اور حماقتوں کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مزاح اور ادبی حسن کے ذریعے ایک خوشگوار انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

لیکاک نے طنز کی جن الفاظ میں تعریف کی ہے اس کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز زندگی کی ناہمواریوں کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔[3] طنز میں مزاح اور تنقید کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ طنز با

---

[1] "اردو ادب میں طنز و مزاح" ادارہ فروغ اردو ... تا ۵۴ لے "اردو ادب میں طنز و مزاح" از فرقت کاکوروی ص ۱۸

[2] "ENGLISH SATIRE" BY I.L. SMEALL PAGE 12

خوشگوار صنفِ ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔

گویا اچھے طنز کے لئے مزاح تنقید اور ادبیت کی چاشنی ضروری ہے۔ بغیر ان عناصر کی آمیزش کے طنز، طنز نہیں رہتا بلکہ گالی گلوچ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ برخلاف اس کے مزاح بغیر ان چیزوں کی آمیزش کے اپنی بقاء کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن ایسا مزاح صرف تفریح، مسرت و انبساط کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ایسا خالص مزاح جذبہ اصلاح سے خالی ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے خالص مزاح طنز بغیر آمیزش کے اپنے بطن میں جذبہ اصلاح سے سرشار ہوتا ہے۔ شاید طنز کی ایسی خوبی کو سامنے رکھتے ہوئے سید احتشام حسینؒ طنز کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:۔

"جو چیز طنز کے سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب ہے، وہ طنز اور حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت کا ادراک کئے بغیر طنز پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اگر کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصوّر نہیں ہے تو وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو کر ہی نہیں سکتا"۔ [۱]

حقیقت کا ادراک پھر اس حقیقت کو بدلنے کی خواہش طنز کی سب سے بڑی محرک ہوتی ہے۔ طنز کی بنیاد ارکن حقیقتوں کو بدلنے کے لئے جس طرح اور جس انداز میں کام کرتا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ارتھر کوسلر نے لکھا ہے۔

" ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناموزوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انھیں مبالغہ آمیز انداز سے پیش نہ کرے ہماری نگاہیں ان پر جمنے ہی نہیں پاتیں۔ پس طنز نگار کی جیت اسی میں ہے کہ وہ زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو لیوں چڑھا کر اور ایسے مزاحیہ انداز میں پیش کرے کہ ہم ان ناہمواریوں کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور ہاں، طنز نگار کی یہ بات بُری بھی نہ لگے"۔ [۲]

مندرجہ بالا کوسلر کی تعریف سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ طنز کی بقاء کے لئے مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ انسان زندگی کی ناہمواری اور سکوت سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف زندگی کی ناہمواریوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ تو پھر ظاہر ہے کہ ایسے میں طنز نگار کو مبالغہ سے کام لینا از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ انسان کو اپنی پستی اور ناہموار زندگی کا احساس ہو جائے اور بلندی کی طرف اپنا رُخ پھیر لے۔ گویا طنز نگار انسان یا فرد، سماج، زندگی اور ماحول کو جو اپنی معیار سے گری ہوئی ہوتی ہیں۔ اپنی اصلی حالت اور حقیقی معیار و مقام تک پہنچانے کے لئے مبالغہ آرائی کو اپنے حصولِ مقصد کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ اس لئے طنز مخصوص ماحول و فضاء کا تابع ہوتا ہے۔ طنز ناسازگار فضاء میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی طنز کو اس وقت فروغ نصیب ہوتا ہے جبکہ ملک یا قوم سیاسی، سماجی، معاشی اور ذہنی کشمکش میں مُبتلا

---

[۱] "نیرنگ نظر" مرتبہ ابن فرید صفحہ ۲۳۵

[۲] INSIGHT AND OUT LOOK, BY ARTHUR KOESTLER, PAG 95

ہوتے ہیں۔ شاید اس لئے اردو نثر کے فروغ کے وقت طنز کو بھی فروغ نصیب ہوا۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ :-

"اردو نثر کے فروغ کا دور ایک طویل سیاسی، مجلسی، ذہنی کشمکش اور تصادم کا دور ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور نے طنز کی نمو کے لئے تو ایک سازگار فضاء قائم کر دی، لیکن خالص مزاح کے فروغ کو اس سے صدمہ پہنچا ہے"؛ [۱]

[۱] "تنقید احتساب" از ڈاکٹر وزیر آغا صـ ۱۹۲۔

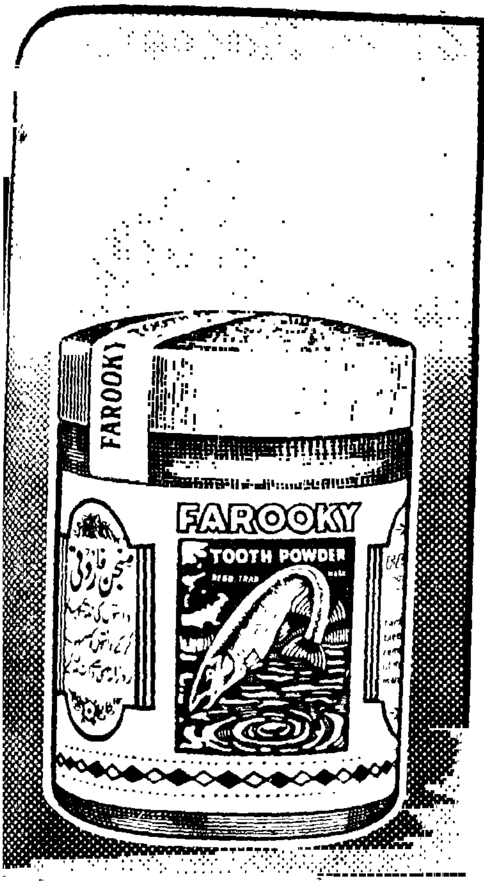
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

روزنامہ رہنمائے دکن کے مینیجنگ ڈائرکٹر، جواں سال بے باک اور نڈر صحافی جناب سید لطیف الدین قادری کا دہلی میں اچانک انتقال ہوگیا۔ جب میں نے یہ روح فرسا خبر سنی تو پہلے یقین ہی نہ آیا۔ موصوف وزیراعظم اندرا گاندھی کی دعوت پر اردو اخباروں کے ایڈیٹروں کے ساتھ ملاقات کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ تین دن تک مصروف رہنے کے بعد وہ حیدرآباد لوٹنے والے تھے کہ سینے میں درد ہوا اور آناً فاناً روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ موت تو برحق ہے۔ لیکن ایسی جوان موت کا جتنا غم کریں کم ہے۔ لطیف پاشا نے رہنمائے دکن کے ذریعہ ہندوستان میں اردو صحافت کو بے باکی بخشی۔ اقلیتوں میں اعتماد پیدا کیا۔ جبر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اتحاد بین المسلمین کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی شرافت، انسانیت، دوستی اور مرنجان مرنج طبیعت کا ہر کوئی قائل تھا۔ ان کے انتقال سے اردو صحافت کا ناقابلِ تلافی نقصان تو ہوا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے ایک عزیز دوست اور بھائی کو کھو دیا۔ تمنا ہے کہ لطیف پاشا نے رہنمائے دکن کو جس نہج پر ترقی دی تھی، اور جو مقام اس اخبار نے حاصل کیا تھا ہے اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔ ع خدا تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

● اسی مہینے حیدرآباد کے ایک سینئر صحافی جناب احسن علی مرزا بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ موصوف روزنامہ "سیاست" کے سب ایڈیٹر تھے۔ مرزا بھائی ایک خاص طرز کے صحافی تھے۔ اُنہوں نے صحافت کو تخلیقی رنگ عطا کیا تھا۔ وہ ایک اچھے طنز نگار بھی تھے۔ شگوفہ کی پہلی مجلس ادارت کے رکن بھی تھے۔ مرزا بھائی نے بے شمار مضامین لکھے۔ ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ "زہرخند" کے نام سے آٹھ دس سال پہلے چھپ چکا تھا۔

خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے! آمین





دن بھر کی خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے

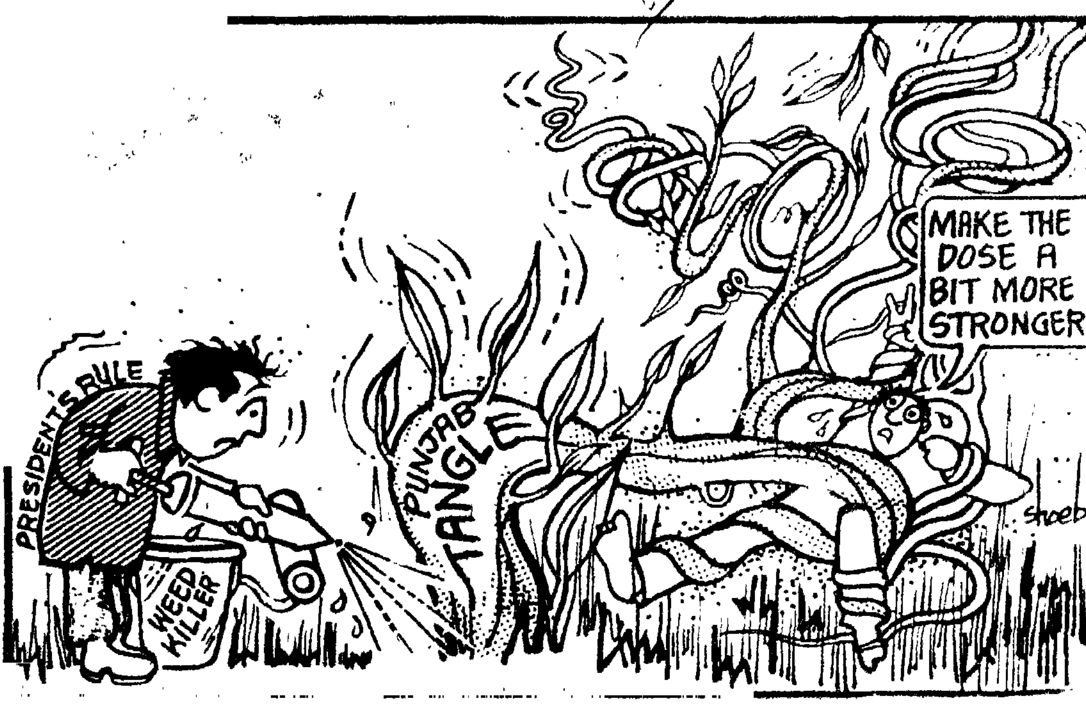
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دہن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات ۔ حیدرآباد ۔ ۱۳۰۰۰





MARCH 1984 **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۷ ـــــــ مارچ ۱۹۸۴ء ـــــــ شمارہ ۳

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: عبد الرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

شگوفہ

کا

ہندوستانی مزاح نمبر

جون ۱۹۸۴ء کے آخری ہفتہ میں شائع ہوگا

مہمان مُدیر ——— یوسف ناظم

- اُردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی ۔ تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی ۔ اڑیا ۔ ملیالم ۔ سندھی کنڑی ۔ میتھلی ۔ اور راجستھانی کے مزاحیہ نثری ادب کا جائزہ
- منتخب مضامین کے تراجم
- اُردو کے دس مصنفین کے خود نوشت خاکے اور مضامین ۔ ملک کے مشہور تنقید نگاروں کی آرا اور انٹرویو
- اُردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل ببلوگرافی اور
- مقالہ نگاروں کی تصاویر۔

ضخامت، تقریباً ۲۵۰ صفات، قیمت، ۲۰ روپے، مجلد ۲۵ روپے

سالانہ خریداروں سے دس ۱۰ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرمالیجیے

پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائیگا۔

کرنل محمد خان

شرابی کبابی

یہ قصہ ہے اُن دنوں کا جب آتش جوان تھا اور ہم کپتان تھے اور ایک مشہور چھاؤنی کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہ
تھے۔ ایک شام باہر سے لوٹے تو نوکر نے بتایا کہ ڈرائینگ روم میں دو خواتین انتظار کر رہی ہیں ـــــ ہمارے گھر میں خواتین !
دی کنگر دیا لگڑ بگڑ آ نکلتا تو ماننے کی بات بھی تھی۔ خواتین کا اس خالص مردانہ گھر میں کیا کام ؟ بہرحال کمرے میں داخل ہوئے
مہانوں پر نگاہ پڑی ـــــ سچ مچ خواتین تھیں !

خواتین کو خوش آمدید کہنے کی ایسی مشق تو نہ تھی لیکن ہمیں اتنی عقل ضرور تھی کہ پہلی ملاقات پر ہی وہ شعر پڑھنا قبل از وقت
ہوگا کہ "وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"۔ اگرچہ بے شک یہ بھی خدا کی قدرت ہی۔ چنانچہ ہم نے اپنا فرض نثر ہی م
ادا کیا اور صالح مسلمانوں کی طرح صرف السلام علیکم کہا۔ جواب میں چھوٹی خاتون ـــــ عمر بیس اکیس سال ـــــ متانت ا
شگفتگی سے بولیں :

"میں مسز "خ" ہوں۔ میرے میاں ایک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ مجھے پنشن کے لئے کسی کمشنڈ افسر سے کاغذات تص
کرانے ہیں۔ آپ کو زحمت دینے آئی ہوں ـــــ اور ہاں یہ میری والدہ ہیں۔"

میں نے والدہ صاحبہ کی طرف سر خم کیا اور پنشن کے کاغذات پر بلا تامل دستخط کر دیئے۔ اس پر چھوٹی محترمہ نے
پہلا شکریہ ادا کیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا :

"اگر ایک زحمت اور بھی گوارا فرماسکیں۔ مجھے ڈاک خانے سے روپے نکلواتے وقت بڑی کوفت ہوتی ہے خصوصا
بلیے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والوں سے۔ اگر آپ اپنے کسی سپاہی یا چپراسی کو بھیج کر روپے نکلوالیا کریں تو میں خود آکر آپ سے
لے جایا کروں گی۔ آپ کو تکلیف نہ دیتی، مگر ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں۔"

پھر پرس کھولا اور فرمایا :
"یہ ہے میری پاس بک۔"

لیکن پرس کیا کھلا گویا طبلۂ عنبر کھلا۔ پاس بک کا نکلنا تھا کہ سارا کمرہ خوشبو سے معطر ہو گیا۔ محترمہ کے ہاتھ سے رنگ و بُو میں لپٹی ہوئی کتاب لی تو ہم نے کتاب سے فارسی میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا:

"اے کتاب مشکی یا عبیری؟"

کتاب نے محترمہ سے آنکھ بچا کر ہمارے کان میں کہا:

"حضور میں تو ناچیز سی کتابچی ہوں۔ مجھ میں مشک یا عبیر کہاں؟ یہ تو سب جمالِ ہم نشیں کا اثر ہے"۔

میں پاس بک سے ہمکلام تھا کہ محترمہ درمیان میں بول پڑیں:

"یوں تو آپ کو تکلیف نہ دیتی، لیکن چونکہ آپ یونٹ کے اکاؤنٹس افسر بھی ہیں لہذا آپ کے لئے بنکوں اور ڈاک خانوں سے کاروبار آسان ہے"۔

گویا تشریف آوری سے پہلے خاکسار کے پیشے اور ساکھ کے متعلق بھی تحقیق کی جا چکی تھی اور ہمیں اس امتحان میں پاس سمجھا گیا تھا۔ اسی لئے تو پہلی ملاقات پر ہی "سپردم بتو مایۂ خویش را" کی نوبت آ گئی تھی۔ عرض کیا:

"یہ خدمت بھی بجا لاؤں گا"۔

دوسرے دن دفتر گیا۔ نائیک صوبہ خان ڈاک خانے کو جانے لگا تو اُسے مسز "خ" کے روپے نکلوانے کے لئے پاس بک دی۔ صوبہ خان واپس آیا تو اس نے پاس بک کو اس زور سے سونگھا کہ نصف عطر کشید کر لیا۔ پھر ہم پر ایک نہایت شُبہ آلود نگاہ ڈالی۔ پاس بک اور نقدی میز پر رکھ کر اباؤٹ ٹرن کیا اور چل دیا ـــــــ صوبہ خان کو اپنی بدتمیزی پر اختیار نہ تھا۔ ہمیں معاف کرنے پر اختیار تھا، چنانچہ معاف کر دیا۔

بعد کی داستان ذرا دراز ہے۔ مختصر یہ کہ اس ملاقات کے بعد محترمہ وقتاً فوقتاً تشریف لانے لگیں۔ شروع شروع میں والدہ کے ساتھ لیکن جب ہماری برخورداری کا یقین ہو گیا تو اکیلی بھی آ جاتیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارا اندازہ مسز "خ" کے متعلق کچھ اور ہی تھا، لیکن ان سے ذرا تفصیلی تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ شاید ہم اتنے برخوردار نہیں جتنی مسز "خ" باکردار ہیں۔ چنانچہ اس انکشاف کے بعد ہمارا دل اس خاتون کے لئے سراپا احترام و تحسین تھا۔

مسز "خ" اچھی تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور خوش رُو بھی۔ اگرچہ ان کا اصلی حسن ان کے شگفتہ مزاج، شائستہ عادات اور شیریں گفتار میں تھا۔ لیکن اس شگفتگی، شائستگی اور شیرینی سے بھی واضح تر حقیقت ان کا شباب تھا جو ان کی بے وقت بیوگی کی وجہ سے سوگوار سا تھا اور انہیں بجا طور پر شریکِ زندگی کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے ہم خود تو چند خانگی مجبوریوں کی وجہ سے اس شرکت سے معذور تھے لیکن مسز "خ" کے حالات کے مدنظر ان سے ہمدردی بے حد تھی۔ چنانچہ دل ہی دل میں اپنے حلقۂ احباب کو اس غرض سے پرکھنے لگے کہ شاید ان میں سے کوئی مسز "خ" کی رفاقت کے قابل ہو۔ ہم پوری نیک نیتی سے اس کارِ خیر میں مصروف تھے لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ مسز "خ" بھی ـــــــ جنھیں ہماری مجبوریوں کا علم نہ تھا ـــــــ اتنی ہی نیک نیتی سے یہ اعزاز خود ہمیں بخشنا چاہتی تھیں اور اس ذرّہ نوازی کا جاندار شُبہ اس وقت ہوا جب ایک دوپہر کو دفتر سے واپس

حسبِ معمول ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولا لیکن اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اپنے ڈرائینگ روم کی بجائے بہزاد کے اسٹوڈیو میں آنکلا ہوں۔ یہ ہمارا ہی گھر تھا اور ہمارا ہی سامان لیکن اس کی ترتیب و تزئین میں انقلاب تھا۔ کمرے کی تصاویر میں ایک نئی کشش تھی، پردوں میں نیا فسوں تھا۔ اور گلدستوں میں نئی تازگی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے ڈرائینگ روم میں کہکشاں اُتر آئی ہے اور یہ کہ نہیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیئے۔

بیرا محمد دین نمودار ہوا اور بولے بغیر ہی سمجھ گیا کہ کس سوال کا جواب دینا ہے، بولا:

"جناب یہ سب کچھ بیگم صاحب نے کیا ہے"

"کس کی بیگم صاحب؟"

محمد دین تجربہ کار، صاحب دیدہ اور میم آزمودہ بیرا تھا۔ سوال کا جواب ٹال گیا اور بولا:

"بیگم صاحبہ باورچی خانے میں کھانا تیار کرا رہی ہیں"

کچن میں جھانکا تو مسز "خ" ابھی ابھی کھانا پکوانے سے فارغ ہو چکی تھیں اور باورچی کو آخری ہدایات دے رہی تھیں۔ ہماری آنکھیں مسز "خ" کی ممنونیت میں تر ہو گئیں، دفتر کی کوفت کے بعد ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے کمرے میں آئے تو مسز "خ" بھی کچن کی کوفت دھو کر گلِ تر کی صورت تشریف لے آئیں۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس قدر مفصل زحمت اُٹھانے کی وجہ پوچھی تو بولیں:

"اس گھر کے ماحول سے ایک کرخت مردانہ پن ٹپکتا تھا، سوچا آپ کے نوکروں کا ہاتھ بٹا دوں"

یہ خاکساری بھی تھی اور دلربائی بھی۔ کھانا کھا چکیں تو ہم سے وعدہ لیا کہ کل چائے پر آنا ہوگا۔ اتنے میں نائیک صوبیدار بھی ڈاک خانے سے روپے نکلوا لایا۔ تھوڑی دیر بعد مسز "خ" رخصت ہونے لگیں تو ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نغہ پاس بک کے ساتھ دل بھی چھوڑے جا رہی ہیں۔ اِدھر ہر چند کہ ہم تابعدار تھے۔ امیدوار نہ تھے۔ ہزار چاہا کہ سواری روک کر کہہ دیں کہ "یہ ہے آپ کا دل، لیتے جائیے" لیکن ایسی بے باک زبان کہاں سے لاتے؟

اب اس خطا کا احساس ستانے لگا کہ خاتون کو ایک غلط توقع کے ساتھ رخصت کر دیا ہے۔ اگر اس غلطی کی فوری اصلاح نہ کی گئی اور کل چائے پر بھی جا نکلے تو نتائج شادی اور قطع تعلق کے درمیان کوئی شکل اختیار کر سکتے ہیں اور ان حادثات سے ہم ہر صورت بچنا چاہتے تھے۔ بے بسی میں اور کچھ بن نہ پڑا تو اپنے ہمسائے آنریری کیپٹن ش سے رجوع کیا جو تجربۂ زن کے بین الاقوامی غواص تھے۔ آپ نے پہلی شادی پہلی جنگِ عظیم کے دنوں میں فرانس میں کی تھی۔ آپ کی موجودہ شادی ایک اعتبار سے ساتویں اور دوسرے حساب سے ایک سو ساتویں تھی۔ سرکار نے آپ کو پنشن سے بلا کر ریکروٹنگ کا کام دے رکھا تھا جسے آپ خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ یعنی ہر عصری بیوی کے بعد ایک ریکروٹ بھرتی کر کے فوج کے حوالے کر دیتے۔

کیپٹن ش نے ہماری بپتا سُنی تو بحرِ فکر میں ڈوب گئے لیکن آنکھ کھلی تو معلوم ہوا پہلے غوطے میں ہی گوہر لے لائے ہیں

فرمانے لگے:

" جاؤ تمہاری مشکل آسان ہوگئی ہے۔ خاتون تمہاری محبت سے شفا پائے گی۔ بے کھٹکے جاکر چائے پیو۔ فقیر نے سب کچھ سوچ لیا ہے"

دل میں شکوک تو بہت پیدا ہوئے لیکن اس پوشیدہ مگر مہربان ولی پر جرح کرنا گستاخی تھی۔ لہذا چُپ رہا۔ دوسرے دن محترمہ کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو چائے کا انتظام تو تھا لیکن چاہت کا بندوبست نہ تھا اور جذبۂ شوق کی متوقع گرمیوں کی بجائے اچھی خاصی سردیاں بپا تھیں۔ والدہ محترمہ کا سانس سینے کے بجائے فرجیڈیئر سے نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ مسز رخ کی گفتگو بھی خاصی ایئرکنڈیشنڈ تھی اور سارے گھر کا ماحول یخ بستہ نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے قطب شمالی میں آنکلا ہوں بلکہ آہستہ آہستہ مادرِ مہربان اپنی گہری بغل میں اسکیمو نظر آنے لگیں۔ گھر کی بلّی مسلسل چھینکوں سے نمونیہ زدہ معلوم ہونے لگی۔ چائے کا گھونٹ پیا تو منہ ہی میں جم گیا۔ رخصت کی اجازت مانگی تو جیسے بن مانگے ہی مل گئی۔ دروازے سے باہر نکلا تو مادرِ مہربان کنڈی لگانے سے پہلے بولیں:

" ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ جواری، شرابی اور کبابی ہیں" ـــــ اور دروازہ ٹھک سے بند ہوگیا!

تو یہ تھی اس پوشیدہ ولی کی کارستانی! کم بخت نے ہماری شادی تو ٹال دی لیکن ہمیں بدنام کر کے محترمہ کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ بلکہ مستقل طور پر شادی کے نااہل کر دیا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ہم اپنی ہی زبان سے معذوری کا اظہار کر دیتے یا شادی ہی کر لیتے خواہ بعد میں برادری سے خارج کر دیئے جاتے۔ چنانچہ آگ بگولا ہوکر ہم اس آخری کتاب کے پاس گئے اور کڑک کر کہا:

" او' پرانے زمانے کے متروک سے کپتان، محترمہ سے شادی کر کے ہم حقّہ پانی بند کرا لیتے یا پھولتے پھلتے، تم نے ہمارے خلاف یہ سہ نکاتی جھوٹ کیوں بولا؟ تم سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ ہم جواری، شرابی اور کبابی ہیں؟ ایک شریف زادے پر یہ تہمت؟"

کیپٹن ش مسکرائے اور تواضع سے کرسی پیش کی مگر ہم کھڑے رہے اور بگڑتے رہے آخر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے

" دیکھو صاحبزادے۔ اول تو ان تین لفظوں میں کوئی تہمت کی بات نہیں۔ افسر لوگ ہر شب کلب میں برج کھیلتے ہیں جو بڑا جائز سا جوا ہے۔ کبھی کبھی بیئر کا گھونٹ بھی پی لیتے ہیں جو ایسی حرام شئے نہیں اور کباب تو اسلام میں ہیں ہی حلال۔ یہ جو کچھ [illegible] نے کہا ہے وہ اتنا جھوٹ بھی نہیں اور اتنا سنگین بھی نہیں۔ میں نے تو محض سنگین لفظوں کا فائدہ اٹھایا ہے اور تمہارا [illegible] کارنامہ انجام دیا ہے یعنی عارضی طور پر مسز "رخ" کی محبت کا رُخ کسی دوسرے شخص کی طرف موڑ دیا ہے۔ اب جب چاہو انہیں صحیح بات بتا کر غلط فہمی دور کی جا سکتی ہے۔

کیپٹن ش کی بات ہمیں ذرا معقول یا کم نامعقول نظر آئی، خصوصاً اس لیے کہ اس نے محترمہ کی محبت کا رُخ کسی دوسرے شخص کی طرف موڑ دیا تھا۔ گویا اب مسز رخ کی شادی کا امکان تھا جو ہماری اپنی اسکیم کے عین مطابق تھا؛ چنانچہ

ہم نے اپنے غصّے کی لے کو ذرا مدھم کرتے ہوئے کہا:

" اچھا، یہ تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور ہاں، وہ محبت کا رُخ کس طرف موڑا ہے؟"

کیپٹن ش کے ہونٹوں پہ ایک ادبا شانہ تبسم نمودار ہوا اور بولا:

" دُولہا تمہارے سامنے کھڑا ہے!"

ہم ایک لمحے کے لئے لڑکھڑا گئے اور آج تک پچھتا رہے ہیں کہ اس راسپوتین کی طرف کیوں رجوع کیا۔

آپ پوچھیں گے اس شادی کا انجام کیا ہوا ـــ وہی جو ایک سو آٹھویں شادی کا ہونا تھا! □□

ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن (بھاگلپور)

غزل

چپکے چپکے رات دن وہ گھوس کھانا یاد ہے
ہم کو اب تک افسری کا وہ زمانہ یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں مکھن لگانے کے لئے
وہ میرا کوٹھی پہ ننگے پاؤں جانا یاد ہے
اور دلالوں سے کرنا سودا بازی اس طرح
ففٹی ففٹی مل کے کھانا اور کھلانا یاد ہے
اور میرا ماتحت پہ وہ جمانا دھونس کا
جی حضوری میم صاحب کی بجانا یاد ہے
بینک بیلنس اپنی بیگم کا بڑھانے کے لئے
دوسروں کا بینک بیلنس لوٹ لانا یاد ہے
بھولی بھالی نیک جنتا کو لبھانے کے لئے
چھوٹے بچے سبز باغوں کا دکھانا یاد ہے
منتری کے پوسٹ پر خود کو بٹھانے کے لئے
رات دن لیڈر کے در پہ سر جھکانا یاد ہے
پانی پانی ہونا میرا پڑھ کے اشعار عزیز
اور ان اشعار کا نشتر لگانا یاد ہے

اسمٰعیل ظریف

"نظم"

"شادی"

گدھے کا ایک جوڑا زو میں اک بچے نے جب دیکھا
تو پوچھا باپ سے بابا وہ پنجرے میں گدھے کیوں ہیں
نہیں ہے وہ یہاں کا وہ گدھا باہر کا ہے بیٹے
گدھا کالا ہے بھورے رنگ والی اسکی بیوی ہے
کہا بچے نے بابا کیا گدھے بھی شادی کرتے ہیں
کہا بابا نے ہاں بیٹے گدھے ہی شادی کرتے ہیں

"مشورہ"

کہا عاشق نے اپنی منچلی محبوب سے اِکدن
میں کرنا چاہتا ہوں مشورہ شادی کے بارے میں
شریک زندگی میں ایسی لڑکی کو بناؤں گا
سلیقہ سے جو کرسکتی ہو گھر کے کام ہاتھوں سے
کہا لڑکی نے یہ سُن کر. بہت اچھا ارادہ ہے
خیالات اور یہ جذبات بے شک ہیں بہت اونچے
ملا دونگی تمہیں کل ہی میں اپنی نوکرانی سے

عابد معز

★

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

چوریوں اور ڈکیتیوں کا شہر حیدرآباد

ہم نے تاریخ کے مضمون میں پڑھا تھا کہ پچھلے زمانے میں سفر پُرخطر ہوتا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ ڈاکوؤں سے تھا۔ استے میں حملہ کرکے ڈاکو، مال و اسباب لوٹ لیتے تھے۔ اسی لئے لوگ قافلہ اور کاروان بناکر سفر کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ سفر آسان اور محفوظ ہوتا گیا۔ ڈاکوؤں نے بھی اپنا نشانہ بدلا اور چھوٹے قصبہ اور مواضعات میں سرگرم عمل ہوگئے۔ شہری آبادی ڈکیتیوں سے ہمیشہ محفوظ رہی لیکن صاحب! شہرِ حیدرآباد کی خوبی اور ڈاکوؤں کی دیدہ دلیری دیکھئے۔ آج کے دَور میں جبکہ قانون کے ہاتھ لمبے ہوچکے ہیں ہمارے شہر میں ڈاکے پڑتے ہیں اور جہاں ڈکیتیاں ہوتی ہیں وہاں چوری، راہزنی اور دھوکہ دہی معمولی کی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔

پچھلے چند سال سے ہمارے شہر میں ڈاکہ زنی کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ شہر کے ہر حصہ اور محلّہ میں ڈاکوؤں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہر ڈکیتی کے بعد وہی کہانی دہرائی جاتی ہے ڈاکو آدھی رات گزرنے کے بعد سَبلوں سے دروازہ توڑ کر حملہ آور ہوئے آس پاس کے مکانات کو باہر سے بند کردیا تھا۔ ڈاکو تلگو اور ہندی زبان میں بات چیت کر رہے تھے۔ خاکی نیکر اور سفید بنین پہنے ہوئے ڈاکوؤں کی عمر بیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ ڈاکو پتھروں اور لاٹھیوں سے لیس تھے۔ ایک ڈاکو کے پاس تمنچہ بھی تھا۔ مدافعت کرنے والے مکینوں کو زخمی کردیا گیا۔ زیور مالیتی کئی ہزار روپے اور چند ہزار روپے نقد اور دوسری قیمتی اشیاء لے کر ڈاکو فرار ہوئے۔ پولیس نے کیس درج رجسٹر کرلیا ہے۔ ہر ڈکیتی کے بعد ہمیں ڈاکوؤں کے بارے میں اس کہانی سے زائد کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ پولیس بھی کوئی دور یا قریب کی کوڑی نہ لاسکی۔ پولیس اتنی ڈکیتیوں کے بعد بھی یہ اطلاع تک نہ دے سکی کہ ڈاکو گبر سنگھ ہے یا مان سنگھ یا پھر ڈاکو سنگرام یا پھولن دیوی کے آدمی ہیں یا بلیک کوبرا، بلو کیٹ جیسے گروہ ہمارے شہر میں سرگرم عمل ہیں۔ ہمیں پولیس سے اُمید نہیں ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا اتہ پتہ چلائے گی اسی لئے ہم ڈاکوؤں سے ہی گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنا یا گروہ کا نام بتلاکر ڈاکہ ڈالیں تاکہ رات میں جب بچے روئیں تو حیدرآباد کی شہری اطمینان سے ڈراسکیں "سوجا بیٹا! ورنہ گبر سنگھ آجائے گا ـــــ اور پولیس والے کچھ نہ کرسکیں گے!"

ڈکیتی کے بعد ڈاکو فرار ہو جاتے ہیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہوتی ہے۔ مکین رو دھو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ لوگ مکینوں کو پُرسہ بھی دے جاتے ہیں۔ تب کہیں ہمارے شہر کی پولیس مقام واردات پر وارد ہوتی ہے جیسا کہ اکثر ہندوستانی فلموں میں بتلایا جاتا ہے۔ سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے مصداق پولیس کی تفتیش شروع ہوتی ہے۔ مختلف سوالات کئے جاتے ہیں۔ ڈاکوؤں کی آمد کے وقت آپ کیوں سو رہے تھے؟ ڈاکوؤں کا حلیہ بتلائیے؟ ڈاکوؤں کی تعداد اور جنس لکھائیے؟ ڈاکوؤں کی چال کیسی تھی؟ ان کے شناختی نشان تبلائیے؟ اپنے کسی رشتہ دار پر ڈاکوؤں کا شبہ تو نہیں ہے؟ اس ڈاکہ میں آپ کو کسی بیرونی ہاتھ کا شبہ تو نہیں؟ چوری گیا ہوا سامان آپ نے کیسے اکٹھا کیا تھا؟ سامان کی رسیدیں دکھلائیے اتنی نقد رقم آپ نے گھر پر کیوں رکھی؟ اس رقم کا انکم ٹیکس آپ ادا کر چکے؟ اسی طرح کئی سوالات کئے جاتے ہیں۔ سوالات کے جوابات قلم بند کرنے کے بعد پولیس لٹے ہوئے گھر اور زخمی مکینوں کی تصاویر لیتی ہے جو دوسرے دن اخباروں میں چھپتی ہیں۔ پولیس اپنے کتوں کو ڈاکوؤں کی خوشبو سے آشنا کرتی ہے۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ پیروں کے نشان لئے جاتے ہیں۔ تشخیص مکمل ہونے کے بعد پولیس ڈاکوؤں کی تلاش شروع کرتی ہے۔ کتوں کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکو INTIMATE سینٹ استعمال کرتے ہیں۔ دوران تلاش پولیس کو اہم سراغ ہاتھ لگتے ہیں جن سے ملزمین کی گرفتاری یقینی ٹھہرائی جاتی ہے لیکن صاحب حقیقتاً یہ سراغ وہ "سوراخ" ہوتے ہیں جس سے ڈاکو ہاتھ سے نکلتے جاتے ہیں۔

ڈاکوؤں سے مدافعت خطرناک ہوتی ہے۔ شروع شروع میں ہمارے شہر میں ان سے مقابلہ کیا گیا۔ مالی نقصان کے علاوہ کسی کا سر پھوٹ گیا تو کسی کی ہڈی پسلی گولا ہوئی۔ چند شہریوں کی جان بھی گئی۔ انھیں حالات کے پیش نظر آج کل لوگ ڈاکوؤں سے مفاہمت پر آمادہ ہیں۔ ایک شہری نے اپنے گھر ڈاکہ زنی کی تفصیل سُنائی "ڈاکو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم نیند سے بیدار ہوئے۔ ہم نے دروازہ نہ توڑنے کی التجا کی اور کہا بھائی صاحب جب ڈاکے کی نیت سے آئے ہی ہیں تو ہم دروازہ کھول دیتے ہیں۔ ہم نے دروازہ کھول دیا۔ گھر کی کنجیاں ڈاکوؤں کے حوالے کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا میں فلاں ابن فلاں ایک بینک میں کلرک اور کثیر العیال ہوں۔ آپ تمام سے مل کر خوشی ہوئی۔ یہ گھر کی کنجیاں ہیں۔ گھر کا اثاثہ ہم سبھی کا ہے۔ جو بھی چیزیں آپ کو درکار ہوں بصد شوق لیجائیے لیکن اہنسا کے ساتھ! ہمارا دیس اہنسا کا دیس ہے ڈاکوؤں نے مکان کی تلاشی لی منتخب اشیاء کو تھیلے میں بھرا۔ تھیلہ بند کیا اور ہم سے کہا گھڑی میں وقت دیکھ لیجئے اور گھڑی ہمیں دے دیجئے گا۔ ہم نے وقت دیکھا اور پچیس سالہ وفادار گھڑی کو بھی ان کے حوالے کر دیا۔ ہم چائے پلانا چاہتے تھے لیکن ڈاکوؤں نے پینا نہ چاہا۔ ڈاکوؤں نے ہم تمام کو ایک کمرے میں بند کیا اور دوسرے گھر ڈاکہ ڈالنے چلے گئے۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد ہم نے سکون کا سانس لیا اور سوچا سر سلامت تو پگڑی ہزار ۔

مثل مشہور ہے چور کا بھائی گرہ کٹ! ڈاکہ ڈالنا بڑے بھائیوں کا کام ہے۔ ہمارے شہر میں چھوٹے بھائیوں نے بھی دھوم مچا رکھی ہے۔ راہ چلتی خواتین کے گلے سے منگل سوتر اُچک لینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ جیب کاٹنا اور منی پرس اڑا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ شہر میں ان سے ہوشیار رہنے کے لئے جگہ جگہ انتباہ دیا جاتا ہے "جیب کا شانہ

ریلوے اسٹیشن، سینما ہال وغیرہ میں زور شور سے انھیں کا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے حیدرآباد کے شہری اپنے آپ کو ان سے بچانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اکثر اشخاص دکھاوے کے لئے منی پرس ساتھ رکھتے ہیں تاکہ گرہ کٹ دھوکہ کھا جائے ور پیسے چھپانے کے لئے نیفہ، آستین، بلوز، پنیچواں اور دوسرے مقامات پر "چور جیب" بنوا رکھے ہیں۔ اس احتیاط کے باوجود بھی جیب، کٹ ہی جاتی ہے۔ جیب کتروں، اچکوں اور اٹھائی گیروں کی تصاویر پولس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ جن کو مخصوص طریقہ سے چسپاں کر کے تشہیر کی جاتی ہے۔ بعض وقت اس سے چور اچکوں ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔ ایک بار دوران سفر ایک صورت آشنا ہم سے مل بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ہم سوچتے رہے کہ انھیں کہاں دیکھا تھا۔ سفر ختم ہونے پر منی پرس گنوا کر ہمیں یاد آیا کہ ان مہربان کو ہم نے پولیس کے البم میں دیکھا تھا۔

حیدرآبادی شہریوں کے دلوں پر ڈاکوؤں اور راہزنوں کی "دھاک" (دہشت) بیٹھی ہوئی ہے۔ شفق کی لالی کے ساتھ ہر کوئی اپنے اپنے گھر واپس ہو جانا چاہتا ہے۔ شہر میں اندھیرا ہوتے ہی خوف و ہراس چھا جاتا ہے۔ خوف و ہراس سے اُترے چہرے تیز قدم بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ کون جانے کس گلی سے کوئی شخص نمودار ہو کر نام پوچھے اور زندگی کے دیپ بجھا دے یا پھر خنجر یا چاقو رکھ کر گھڑی، انگوٹھی اور پیسے لے کر چلتا بنے۔ حیدرآبادی گھر پہنچ کر اپنی خیریت کا حال سُنا کر دوسروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ تمام بچے صحیح و سالم گھر پہنچ چکے ہیں؟ آج کوئی کرنٹ کا بل دینے اور نل کا میٹر دیکھنے کے بہانے کچھ اٹھا تو نہیں لے گیا؟ کسی ہاتھ دیکھنے والے نجومی یا فال کھولنے والے نے بچہ وقوت تو نہیں بنایا؟ ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ دن تو خیر سے گزر گیا! میرے مولا! اب رات میں بھی تو ہمارا نگہبان رہنا۔ دروازے کھڑکیاں بند کر کے علیگڑھ کے تالے لگا دیتے ہیں۔ خود ساختہ بلیک آوٹ لا دیتے ہیں۔ لاٹھیاں، مرچی کا پوڈر ٹارچ لائٹ سرہانے رکھ لیتے ہیں۔ صدرِ خاندان کے علاوہ کسی اور کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں رہتی۔ ذرا سی آواز پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہمارے شہر میں گھوڑے بیچ کر سونے کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ جس نے بھی رات میں کھٹکھٹانے پر دروازہ کھولا وہ رستمِ حیدرآباد ہے اور صاحب! ایسی بہادری ہر کسی کے نصیب میں نہیں آتی۔ چند دن پہلے رات میں کوئی دو بجے ہمارے گھر دستک ہوئی۔ ہم ہر دستک پر پہلو بدل کر انجان ہوتے گئے۔ بڑی دیر تک دستک کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ تو ہم نے لنگوٹ کس کر لاٹھی اور مرچی کا پوڈر لئے کپکپاتی آواز میں پوچھا "کون"؟ جواب دیا گیا "میں ہوں"۔ ہم نے سوال دہرایا پھر وہی جواب۔ ہم نے سوچا ڈاکو "میں ہوں" ہی کہے گا وہ اپنا نام بتلانے سے رہا۔ ہم نے ہمت کر کے "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" وظیفہ پڑھتے ہوئے کہا "دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے ڈاکو بھائی کوئی اور گھر ڈھونڈ لیجئے۔" اتنا کہہ کر ہم نے دباؤ سے آزاد ہونے کے لئے بیت الخلاء کا رُخ کیا۔ ایک دو مرتبہ پھر دستک ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ صبح پتہ چلا کہ دستک دینے والے ہمارے برادرِ نسبتی تھے جنھوں نے بقیہ رات دروازے کے سامنے اونگھتے کاٹی تھی۔ الغرض ہم حیدرآبادیوں کو دن میں چین ہے نہ رات میں قرار!!

ناظم انصاری

عزت مآب

نزع کا وقت ہے کرم کر دو
سورہ یٰسین پڑھکے دم کر دو
بارگاہِ خدا میں مولانا
میرے بارے میں کچھ رقم کر دو

تم تو عزت مآب ہو قبلہ
تم جسے چاہو محترم کر دو
ہاتھ میں تم اُٹھا لو جو پتھر
دیکھتے دیکھتے صنم کر دو

اختیارات ہیں تمہیں حاصل
صبحِ خنداں کو شامِ غم کر دو
میں اہوں مجرم تو رحم کیا معنے
سوچتے کیا ہو سر قلم کر دو

گفتگو میری سُن کے وہ بولے
دیکھو ناظم بہکنا کم کر دو

حیدر بیابانی

دُلہن کی ترکیب

باپ سے

"بیٹی کی شادی باپ کی قاتل ہے آج کل
دلہا خریدنا بڑی مشکل ہے آج کل
بیٹی! مجھے جہیز کی لعنت کا خوف ہے
یعنی کہ اک پہاڑ مقابل ہے آج کل

بیٹی سے

"ابو نہ اس جہیز کے دینے کا غم کرو
ہر ایک مانگ پہ سرِ تسلیم خم کرو
ہر چیز دو جہیز میں ہر بات مان لو
انکے مطالبات کو اک حکم جان لو

کل دیکھ لینا آپ وہ چکر چلاؤں گی
میں اُس کماؤ پوت کو یاں لا بساؤں گی
اور ساتھ میرے آئیگا سارا جہیز بھی
پھر اپنے اُس جہیز سے یہ گھر سجاؤں گی

○

سرسوتی سرن کیف (چنڈی گڑھ)

تنقیدِ غزل کی
ادیب کی زبانِ مبارک سے

بچپن ہی میں بزرگوں نے دل پر نقش کردیا تھا کہ راج ہٹ، بال ہٹ اور تریا ہٹ، ان تینوں کا مد مقابل ہونا بالکل بے کار بات ہے کیونکہ کوئی آدمی آج تک ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہے۔ چنانچہ گھر پر تو میں فرمانبردار شوہر اور گاودی باپ کا رول ادا کرتا ہی ہوں، دفتری زندگی میں بھی کسی افسر کی کسی بات کی مخالفت کرنے میں کوئی تک نہیں دیکھتا افسروں کی اطاعت گزاری کرنی ہی چاہیئے۔

لیکن ہر بات کی طرح اطاعت گزاری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب دن بھر کے سخت کام سے سر میں درد ہو رہا ہو، موسم کا حبس علاحدہ پریشان کر رہا ہو اور بازار میں کچھ خریداری بھی ضروری ہو اس وقت پانچ بجے ڈائرکٹر صاحب کا ٹیلیفون آئے کہ ابھی ان کے بنگلے پر پہنچنا ہے تو کس ماتحت کو غصہ نہ آئے گا۔ میں نے تعجب اور ناراضی کے لہجے میں کہا۔ "اسی وقت جناب!" تو حضرت بولے "ہاں بھائی' بہت ضروری کام ہے۔ گھر کی فکر نہ کرو۔ تمھارے گھر آدمی کے ذریعہ خبر بھجوادی ہے کہ دیر سے آئیں گے اب بحث نہ کرو، فوراً آجاؤ۔"

ڈائرکٹر صاحب کا لہجہ اس قدر غیر افسرانہ اور دوستانہ تھا کہ جھنجھلاہٹ تو دور ہو گئی لیکن تعجب بڑھ گیا کہ ایسا کیا کام ہو سکتا ہے کہ میرے گھر بھی خبر بھجوادی۔ کسی ڈائرکٹر کے گھر جانے کا یہ ساری ملازمت میں تیسرا یا چوتھا موقع تھا۔ پرانے ڈائرکٹر صاحب نے تو کبھی گھر پر بلایا ہی نہیں۔ یہ متق صاحب ابھی ڈیڑھ مہینے پہلے آئے ہیں اور دوسری بار بلا بھیجا ہے پہلی بار تو خیر اپنے بیٹے کے جنم دن پر بلایا تھا لیکن آج کس خوشی میں بلا بیٹھے؟ خیر، زیادہ کوفت

اس لئے نہیں ہوئی کہ ہمارے ڈائرکٹر مسٹر مصرا کی طرح یہ صرف سرکاری کام سے کام نہیں رکھتے بلکہ خوش خلق بھی ہیں اور ادبی مذاق بھی اچھا رکھتے ہیں۔

بنگلے کے پھاٹک ہی پر چپراسی کھڑا ملا۔ میرے رکشے سے اُترتے ہی سلام کر کے بولا "حضور صاحب نے کہا ہے کہ آپ سیدھے ڈرائنگ روم میں تشریف نہ لے جائیں بلکہ بغلی دروازے سے داخل ہوں اور ٹائپسٹ کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ وہیں صاحب آپ سے ملیں گے۔"

یہ اور عجیب بات تھی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو چپراسی مسکرا کر بولا۔ "میں کیا جانوں حضور .... آپ تشریف تو لے جائیں، وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔"

ٹائپسٹ کے کمرے میں پہنچا تو موڈ پھر خراب ہو چکا تھا۔ پانچ منٹ میں متل صاحب تشریف لائے تو میں نے کچھ اونچی آواز میں کہا۔ "جناب، میری کچھ سمجھ ......"

ڈائرکٹر صاحب ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر بولے "آہستہ .... آہستہ .... ڈرائنگ روم میں ادیب جھانسوی بیٹھے ہیں۔"

میں اور بوکھلا گیا۔ ادیب جھانسوی ہی تو بیٹھے ہیں، کوئی ملک الموت تو نہیں بیٹھے۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ منہ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولے "گھبرائیے نہیں، گوپی ناتھ نظر صاحب کو بھی بلایا ہے، وہ بھی آپ کے ساتھ اسی کمرے میں بیٹھیں گے۔ آپ لوگ آپس میں بات بھی نہ کریں۔ جب کتاب میز پر پٹکوں اُس وقت آپ لوگ اطمینان سے ڈرائنگ روم میں آجائیں۔"

"لیکن بات کیا ....." میرا سوال ادھورا چھوڑ کر متل صاحب مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ میں اور کرتا بھی کیا۔ ڈرائنگ روم سے صاف آنے والی آوازیں سننے لگا۔ ادیب کہہ رہے تھے "حضور، اب رسالے کی خوش قسمتی ہے آپ جیسا صاحبِ ذوق ڈائرکٹر آگیا ہے۔ مصرا صاحب تو اُردو جانتے ہی نہ تھے، رسالے کو کیا دیکھتے۔ اسی لئے نظامی صاحب نے اسے گھر کی کھیتی سمجھ لیا ہے۔ قاعدے کی تصنیفات پڑی رہتی ہیں اور اپنے گُٹ کے لوگوں کی غلط سلط خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔

اتنے میں نظر بھی آگئے۔ ان کو چپراسی بھیج کر ان کے گھر سے بلایا گیا تھا۔ چپراسی نے راستے ہی میں ضروری ہدایتیں دے دی تھیں۔ سمجھ میں ان کی بھی کچھ نہ آرہا تھا۔ خاموشی سے میرے پاس بیٹھ گئے۔

ڈائرکٹر صاحب کی آواز آئی "آپ کوئی واضح مثال دیں تو غور کروں۔ ایسی گول مول باتوں سے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟

ادیب نے کہا: "اب اسی تازہ شمارے کو دیکھئے۔ اس میں نظر کی جو غزل چھپی ہے وہ کتنی واہیات ہے۔ نظر کو آتا ہی کیا ہے؟ صرف نظامی صاحب کے دوست ہیں اور نظامی صاحب تو خود ہی کہہ چکے ہیں کہ انھیں شاعری کا کوئی علم نہیں۔"

نظر نے اور میں نے مسکراتے ہوئے نگاہوں کا مبادلہ کیا۔ دونوں کی حیرانی دور ہوگئی تھی۔ کسی کو اُمید نہیں تھی کہ کوئی ڈائرکٹر اتنا خوش طبع ہوسکتا ہے کہ ادیبؔ جھانسوی کو گھیرنے کے لئے ایسا جال بچھائے۔ اب ظاہر تھا کہ شام ہنسی خوشی سے گزرے گی۔

متلؔ صاحب کی آواز آئی "اس غزل میں آپ کو کیا خرابی نظر آتی ہے؟"

"ایک دو خرابیاں ہوں تو بتاؤں۔ نہ وزن درست ہے نہ قافیے۔ کئی خرابیاں زبان کی بھی ہیں۔ محاورے ہیں تو غلط . . . . ."

"آپ اِن اعتراضات کو نظامی صاحب کے سامنے یوں نہیں پیش کرتے مفصل طور پر"؟

"وہ سنیں گے کہاں حضور؟ اور معاف فرمایئے سنیں گے بھی تو سمجھیں گے کیا؟"

متلؔ صاحب نے ہاتھ کی کتاب میز پر پٹک دی۔ ہم لوگ اندرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ادیبؔ جھانسوی ایش——— ——— صوفے پر دو فیٹ اُچھلے اور پھر کھڑے ہوگئے۔

"بیٹھیے، بیٹھیے" ڈائرکٹر صاحب ان سے بولے پھر ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے "ادیب صاحب کو آپ لوگوں سے کچھ شکایت ہے۔ دو تین بار مجھ سے میرے دفتر میں مل چکے ہیں۔ میں نے سوچا سب لوگوں کے سامنے مفصل بات ہو جائے۔ اسی لئے آپ کو تکلیف دی۔"

"حضور، میں نے شکایت تو کچھ نہیں کہا تھا . . . ."

نظرؔ صاحب نے صوفے پر پھیلتے ہوئے ادیب کی بات کاٹی "نہیں بندہ پرور، ابھی آپ جو کچھ فرما رہے تھے تعریفاً ہی فرما رہے تھے۔ اب مہربانی سے مفصل تنقید شروع کر دیجیے۔ مجھے بھی تو اپنی غلطیاں معلوم ہوں۔ کیوں نظامی صاحب؟"

میں اپنے افسر کے گھر پر تھا، نظرؔ صاحب کی طرح صوفے پر پھیل کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن ہنس کر بولا "مجھے بھی ایڈیٹنگ آجائے گی۔"

ادیب صاحب بولے "نہیں صاحب، میں آپ لوگوں کو کیا سکھاؤں گا۔ میں تو . . . . ."

"میں تو میں تو کیا؟" متلؔ صاحب کا لہجہ اب مکمل طور پر افسرانہ ہوگیا تھا۔ "ابھی تو آپ نظرؔ صاحب کی غزل میں ہر قسم کی غلطیاں بتا رہے تھے۔ اب وہ خود پوچھ رہے ہیں تو کیوں نہیں بتاتے؟"

ادیب صاحب کیا بتاتے۔ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ نظرؔ نے کہا۔ "میں غزل کا ایک ایک شعر پڑھ دیتا ہوں، ادیب صاحب رائے دیتے جائیں۔"

"بالکل صحیح ہے" متلؔ صاحب بولے "لیکن پہلے چائے پی لی جائے۔"

ادیب صاحب بولے "حضور مجھے اجازت دیں تو عنایت ہو۔ ایک بہت ضروری کام . . . ."

"آپ کو کام وام کچھ نہیں ہے،" متلؔ صاحب آنکھیں نکال کر بولے "آپ نے کہا تھا اپنی بات کا پورا ثبوت دیں گے۔ تین روز سے میرے پیچھے

پڑے ہیں اسی لئے میں نے ان لوگوں کو تکلیف دی ہے۔ اب آپ ان کی نظر میں مجھے بے وقوف ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

ادیب صاحب دل ہی دل میں خواجہ خضر کی پناہ مانگنے لگے۔ چائے نوشی پر گزارے ہوئے پندرہ بیس منٹ ادیب صاحب کو چھوڑ کر اور سب کے لئے بڑی ہنسی خوشی کے ثابت ہوئے۔ ادیب صاحب رس گلّوں اور سموسوں کا ذائقہ بھی اچھی طرح نہ لے سکے۔ چائے کو جوشاندے کی طرح پیتے رہے۔ دل ہی دل میں دعا کرتے رہے کہ مبتّل صاحب مفصل تنقید کی بات بھول جائیں۔

لیکن مبتّل صاحب کی یادداشت کمزور نہیں ہے۔ ملازم نے برتن ہٹائے تو مبتّل صاحب بولے "ہاں، تو نظر صاحب پھر ......"

نظر صاحب نے قریب پڑا ہوا رسالے کا تازہ شمارہ کھولا اور مطلع عرض کیا ؎

اگر تیری نگاہِ لطف اے درد آفریں ہوگی
فضائے ہستیٔ دل رشکِ فردوس بریں ہوگی

مبتّل صاحب نے کو نچا تو ادیب بولے "اس میں پہلے مصرعے کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں طوالتِ زیر ہے۔ پہلا مصرعہ وزن سے بھی گرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

"طوالتِ زیر کیا ہوتی ہے؟" مبتّل صاحب حیرانی سے بولے۔

میں نے کہا "غالباً ادیب صاحب کا مطلب توالیٔ اضافت سے ہے۔ لیکن ان کا خیال غلط ہے۔ توالیٔ اضافت اس میں ہے نہیں۔"

"کیوں؟" ادیب صاحب کے لہجے میں کچھ گرمی آئی "اس میں چار اضافتیں نہیں ہیں؟"

مبتّل صاحب نے کہا "آپ کو پڑھنا نہیں آتا۔ چار اضافتیں عیب تب ہوتی ہیں جب لگاتار آئیں۔ دل پر اضافت کہاں ہے؟"

"پہلے مصرعے میں مطلب بھی خبط ہے" ادیب نے کہا "نگاہِ لطف اگر درد آفریں ہے تو اس کے بعد 'اے' لانے سے بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔"

"یہ آپ کی سمجھ کا پھیر ہے" نظر صاحب بولے "درد آفریں نگاہِ لطف کے لئے نہیں آیا ہے محبوب کے لئے آیا ہے اور اسی مناسبت سے حرفِ ندا آیا ہے۔ خیر، اب دوسرا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

نہ تھا معلوم یہ اعجازِ چشمِ حسن پرور کا
کہ جس شے پر پڑے گی تیری تصویرِ حسیں ہوگی

ادیب صاحب بولے "یہ بھی بے معنی ہے۔ محبوب کی آنکھ خوبصورت ہوتی ہے یا حسن پرور پھر وہ جس پر پڑے گی وہ حسین تصویر کیسے ہو جائے گی؟ اور تیری کا کیا مطلب ہے؟ کس کی حسین تصویر؟"

اب کی مبتّل صاحب بولے "یہ آپ کی سمجھ کا نہیں نظر کا پھیر ہے۔ میاں، چشمِ حسن پرور معشوق کی نہیں، عاشق کی ہے اور تصویر بنے گی معشوق کی۔ آیا کچھ سمجھ میں آپ کی؟"

ادیب صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو

ان کا نہیں خاک بدہنم خدا کا قصور ہے جس نے انہیں ایک خاص قسم کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ خیر، نظر صاحب نے اگلا شعر پڑھا ؎

گراں ہے قالبِ خاکی کو دو دن روح کا رہنا
مکاں وہ اور ہی ہونگے جنھیں قدر مکیں ہوگی

ادیب صاحب نے کہا۔ "روح کا کہاں رہنا گراں ہے؟"

نظر نے کہا "بھئی قالبِ خاکی تو کہا ہے۔ روح تو جسم میں رہتی ہے۔ آپ کی روح کہاں رہتی ہے؟"

"ان کی روح ممکن ہے جوتوں میں رہتی ہو۔" میں نے سہولت سے کہا۔ متل صاحب ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔

نظر صاحب نے اگلا شعر پڑھا ؎

نظر نا آشنائے کیف ابھی سجدے سے کیا حاصل
عبث خاکِ درِ معبد سے آلودہ جبیں ہوگی

ادیب صاحب میں اب مایوسی سے پیدا ہونے والی جرأت آگئی تھی۔ بولے "آپ لوگ چاہے جو کچھ کہیں لیکن اس میں اسلام کی توہین ہے۔ خاکِ سجدہ سے جبیں آلودہ ہونا، سبحان اللہ۔ پھر پہلے مصرعے کا کیا مطلب ہے؟ سر نا آشنا اَے کیف، کوئی بات ہوئی؟"

متل صاحب سنجیدہ ہو گئے "اگر اسلام کی توہین ہے تو واقعی قابلِ اعتراض بات ہے۔ نظر صاحب، آپ کو اور مجھ کو خاموش رہنا چاہیے۔ نظامی صاحب، آپ فرمائیے کچھ۔"

میں نے کہا: یہ شعر مخاصمانہ انداز میں وہی کچھ کہتا ہے جو کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کئی جگہ آیا ہے کہ اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ بغیر اس کی محبت کے کیف میں ڈوبے ہوئے سجدہ کرنا محض ظاہر داری ہے۔ ہزاروں اردو اشعار میں یہ مضمون باندھا گیا ہے۔

متل صاحب بولے "پہلے مصرعے کا مطلب ادیب صاحب اس لئے نہیں سمجھے کہ ان میں ذوق شعری کم ہے اور انہوں نے مصرعے کو صحیح طریقے سے سنا نہیں۔ سرِ نا آشنا اَے کیف نہیں ہے بلکہ سرِ نا آشنائے کیف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے کیف سے نا آشنا سر، ابھی یعنی جب تک کہ تجھ میں عشقِ الٰہی کا کیف پیدا نہیں ہوتا سجدہ کرنا بیکار ہے، صرف پیشانی پر مٹی لگانا ہے۔ سمجھے ادیب صاحب؟"

نظر صاحب پھر گویا ہوئے ؎

نہ پوچھ اے باغباں کس نے لگا دی آگ گلشن میں
کسی مرغِ دلِ آزردہ کی آہِ آتشیں ہوگی

ادیب صاحب کا اعتراض تھا "گھسا پٹا مضمون ہے۔ آج کے حالات میں یہ مرغ اور آہ آتشیں کی بے کار باتیں ہیں۔ پھر اسی میں براتِ حلال کا عیب بھی ہے۔ آگ کا پتہ پہلے مصرعے ہی میں چل جاتا ہے۔"

اب ہم تینوں اپنے اپنے صوفوں پر اچھل پڑے۔ براتِ حلال کا عیب کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ آخر کار میں نے پوچھا "یہ براتِ حلال آپ نے کہاں پڑھا؟"

ادیب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے "بڑے بڑے قابل آدمی

بیٹھے ہیں، میں کیا بتاؤں؟ آپ نے نجمی غبی کی نہر البلاغت تو دیکھی ہی ہو گی؟"

ہم لوگ اور پریشان ہوئے۔ نہ نجمی غبی کا نام سنا تھا نہ نہر البلاغت جیسی کسی کتاب کے بارے میں جانتے تھے لیکن مبتل صاحب کی سمجھ میں کچھ آیا۔ بولے "آپ بحر الفصاحت کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"ہاں صاحب، وہی ہے۔ معاف کیجیے گا۔ میں نام ذرا کچھ بھول کر گیا . . . . . ."

مبتل صاحب کے طریقے پر میں نے بھی ذہنی تفتیش کی اور کہا "آپ نے مولانا نجم الغنی نجمی کو غبی خوب بتایا اور ہاں آپکا برأت حلال سے مطلب براعت استہلال سے تو نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں، وہی تو میں نے کہا تھا" ادیب صاحب بولے مبتل صاحب اور نظر صاحب دونوں کے منہ سے نکلا "یا الٰہی!"

میں نے کہا "سنیے۔ براعت استہلال عیب نہیں ہوتا یہ صنعت ہے جس میں کتاب کے شروع میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن سے اسکے نام کا اندازہ ہو سکے۔ نظر صاحب کے شعر میں یہ صنعت بھی نہیں ہے بلکہ صنعت ارصاد ہے جس میں پہلے مصرعے کے الفاظ سے مصرع ثانی کے قافیے کا اندازہ ہو جاتا ہے رہا آپ کا مضمون کی قدامت کا اعتراض، تو میں عرض کرونگا کہ یہ حالات حاضرہ سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔ عوام کی مفلسی سے قوم کیلئے مصائب پیدا ہوتے ہیں۔ یہی تو کہا گیا ہے اس شعر میں۔"

نظر صاحب نے کہا "اس شعر کے متعلق کچھ فرمائیں ؎

جو اے کلک سخنور تیری حق گوئی سلامت ہے
تو دنیا سے تمدن تیرے ہی زیر نگیں ہو گی

ادیب صاحب کے منہ کھولنے سے پہلے ہی مبتل صاحب بول اٹھے "اس پر آپ کچھ نہ کہیں۔ آپ کو نہ تمدن سے علاقہ ہے نہ حق گوئی سے۔"

نظر صاحب نے کہا "غزل سنتی ہے تو مقطع بھی سن لیجیے ؎

نظر انساں وہی ہے جو شریک درد انساں ہو
جو بس مٹی کی مورت ہے وہ کیوں کر دلنشیں ہو گی

[یہ غزل بزرگوار شریف فرخ آبادی مرحوم کی ہے۔ اس میں، میں نے جو تصرفات کئے ہیں ان کے لئے مرحوم کی روح سے معافی کا خواستگار ہوں۔ کیف]

مبتل صاحب بولے "ادیب صاحب، آپکو تو اس غزل میں وزن کی نئے خامیاں بھی نظر آئی تھیں اس بارے میں کچھ کہیئے۔"

ادیب صاحب نے وزن کے نام پر من، سیر، چھٹانک ہی پڑھا تھا۔ ہاں ایک آدھ بحر کا نام ضرور سن لیا تھا۔ قاعدے کی بات تھی کہ خاموش رہتے لیکن خاموش تبھی رہتے جب قاعدے کے آدمی ہوتے۔ کہنے لگے "نہیں، میں غلط سمجھا۔ بحر کامل میں بالکل صحیح اتر رہی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں پھٹ سا پڑا "کچھ آتا نہیں تو بولتے کیوں ہیں آپ؟ یہ بحر ہزج میں ہے یا بحر کامل میں؟"

ادیب صاحب اٹھ بیٹھے۔ مبتل صاحب نے کہا۔ "ارے جا کہاں رہے ہیں! آپ لوگوں کو کھانا بھی غریب خانے پر ہی کھانا ہے۔ ابھی تو محفل شروع ہوئی ہے۔"

ادیب صاحب کا پیٹ بھر چکا تھا۔ بغیر سلام کئے چلے گئے اور ہم غریبوں کو ہنستا چھوڑ گئے۔ — —

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

ڈاڑھ کا درد

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کر وبیاں

یہ شعر ہم نے اس وقت سنا تھا جب ہم نہ تو درد دل سے واقف تھے نہ کر وبیاں کو ہی پہچانتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ذرا سی بات کو سمجھنے میں زمانہ گزر جاتا ہے چنانچہ ہماری نا سمجھی ایک اور شعر سے جا ٹکرائی وہ شعر تھا۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہاں ایک بات صاف ہوگئی وہ یہ کہ زندگی میں غم سے نجات پانا ناممکن ہے۔ گویا سر ہوگا تو درد سر بھی ہوگا۔ لہذا ہم کمر کس کے شکستیں کھانے اور مقابل ہونے کے لئے تیار ہوگئے اور ہوا بھی وہی۔ ہم تھے اور ستم گر آسماں تھا۔

بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے ۔ کیوں روتا؟ — ہم سوچتے ہیں ضرور اس کو کوئی جسمانی تکلیف ہوتی ہوگی تب ہی تو وہ روتا ہے اس کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے سنگ و خشت تو ہوتی نہیں یقیناً درد سے بھر آتا ہوگا۔ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ بچہ فلاسفر ہوتا ہے پیدا ہوتے ہی بھانپ لیتا ہے کہ دنیا میں وہ غلط آگیا چونکہ یہ دنیا تو اک عالم ہے آہ و فغاں کا — اور وہ یہ سوچ کر رونے لگتا ہے۔ مگر کوئی بات بے سبب نہیں ہوتی۔ اگر بچہ فلاسفر نہیں ہوتا تو احمق اور دیوانہ بھی نہیں ہوتا۔ بلا وجہ رونا دلیل ہے بے وقوف ہونے کی یا پاگل ہونے کی۔ اگر صرف ہندوستان میں بچہ پیدا ہوتے ہی روتا تو ہمارے ملک کے غریب نواز لیڈر اس غریب پر یہ الزام بآسانی لگا دیتے کہ بچہ کو ملک کی غریبی اور مہنگائی کا احساس شکم مادر میں ہی ہو جاتا ہے اور وہ دنیا میں آتے ہی غریبی کا رونا رونے لگتا ہے۔ ہم نے کبھی دیکھا نہیں ۔ سنا نہیں کہ کوئی بچہ پیدا ہوتے ہی ہنسا ہو — اتنا ضرور ہوتا ہے کہ بعض بچے غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوتے ہیں وہ روایت پسند بچوں کی طرح روتے نہیں بلکہ خاموش رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے بچے کو مار مار کر رونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ بچہ کسی جسمانی

اذیت کے نتیجہ میں رہتا ہے۔ ممکن ہے پیدائش کے فوراً بعد اس کے جسم ناتواں پر دنیا کی باہری ہوا کا دباؤ اتنا شدید پڑتا ہو کہ اُس کی ہڈیاں سی ٹوٹنے لگتی ہوں۔ جو کچھ بھی ہو درد کا رشتہ آدمی کے ساتھ پیدائش سے ہی جڑ جاتا ہے۔ اس بحث میں ہم کیوں پڑیں یہ خالص نفسیاتی مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہاں چند نامور دردوں کا ذکر کرتے ہیں۔ دردِ دل۔ دردِ جگر یہ دونوں تو ادبی درد ہیں ولی دکنی سے لے کر مقامی چھوٹے چھوٹے شاعر کے اشعار میں ملتے ہیں۔ غیر شاعرانہ درد ہیں دردِ شکم، دردِ کمر، دردِ سر، دردِ گردہ، دردِ قولنج، دردِ گھٹیا، دردِ عرق النسا یہ مردوں کو بھی ہوتا ہے۔ آنکھ کا درد، کان کا درد ناک ایک وہ درد جس سے قدرت نے صرف مردوں کو بچا رکھا ہے اگر وہ بھی ان دردوں میں شامل ہو جاتا تو سوچیئے مَردوں کا کتنا درد انجام ہوتا۔ ہم نے اتنے درد بتا دیئے لیکن اپنے ڈاڑھ کے درد کو بھول گئے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اوروں کے گریبان سی ڈالے ــــ اپنا ہی گریباں بھول گئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم کو جب بھی درد کا خیال آتا ہے ڈاڑھ میں چمک چلنے لگی ہے۔ کیا موتی سے جڑے تھے ہمارے ہونٹوں کے درمیان۔ سڑک پر منجن بیچنے والوں نے ہمارے دانتوں کا فوٹو دکھا کر اپنا منجن بیچا کرتے تھے۔ ہم ان دانتوں سے لوہے کے چنے چبایا کرتے تھے وہ بھی اکثر کہا کرتی تھیں میں آپ پر نہیں آپ کے دانتوں پر عاشق ہوئی تھی۔ شاید نظر لگ گئی ایک رات ہم آخری شو میں سینما دیکھنے چلے گئے انٹرول میں بھوک سی لگی۔ سینما گھر سے باہر گئے۔ شاہی اناج پر نظر پڑی وہ اناج جس کو مغل بادشاہ شاہجہاں نے پسند کیا تھا۔ گرم گرم چنے لیئے اور ہاؤس کے اندر۔ فلم شروع ہو چکی تھی مگر آج کل کی فلموں میں یہ خوبی ہے جہاں سے دیکھو وہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ دلہن نے ایک مکا ہیرو کے چہرے پر مارا۔ ہم نے زور سے اپنی ڈاڑھ تلے دبے چنے پر اپنا جبڑا مارا۔ دماغ میں انار سا چھوٹا۔ ڈاڑھ میں تیر سا لگا۔ ہم سوچنے لگے کہ دلہن کا گھونسا ہمارے جبڑے پر کیسے آلگا۔ ورنہ اس درد کی وجہ کیا ہے۔ ذرا دیر میں پردے پر منظر بدل گیا۔ وہ ماہ جبیں جن کے درمیان جگؔر مرحوم کی زندگی گزری تھی ایک سوئمنگ پول میں نہا رہی تھیں ہماری نظر اور ذہن دونوں وہاں جم کر رہ گئے۔ اور احساسِ درد باقی نہ رہا۔ زلیخا کی رقیبوں نے بھی تو اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں ہم اگر جو محوِ جلوہ ہو گئے تو کیا ہوا۔ ہم منظر میں گم تھے مگر ہمارے دانت مل کر اُس چنے کو دبانے میں لگے ہوئے تھے مگر وہ چنا تھا جذبہ تو تھا نہیں کہ دب جاتا۔ پھر ہمارے سامنے پردے پر گھوڑے کے پیچھے گھوڑے دوڑنے لگے تب ہمارا خیال اُس چنے کی طرف لوٹ آیا جس نے ہمارے منہ میں درد کی ایک نئی دنیا بسا کر رکھ دی تھی۔ جب اُس چنے کو زبان کی نوک سے ہونٹوں کے باہر لا کر دیکھا تو وہ واقعی لوہے کا چنا نکلا۔ وہ سائیکل کے ہب میں استعمال ہونے والا چھرہ تھا۔ جس نے تھوڑی دیر میں ہماری ڈاڑھ کے پرزے اُڑا دیئے تھے اور ہم اس نئے درد سے دوچار ہو چکے تھے اب نہ وہ بنات النعش سوئمنگ پول تھیں نہ وہ ہیرو نہ دلہن۔ سینما ہال میں ہم تھے ہماری ڈاڑھ تھی اور ڈاڑھ میں درد تھا۔ پکچر ختم ہوئے پر اُس چنے فروش کی تلاش میں نکلے جس نے نہ جانے کس جنم کی دشمنی ہم سے نکالی تھی۔ ہم دکان پر پہنچے جہاں سے چنے خریدے تھے اس دکان پہ بورڈ لگا تھا۔ جنتا سائیکل سروس۔ دکان بند ہو چکی تھی معلوم ہوا کہ دن میں سائیکل درست ہوتی ہے رات کو چنے فروخت ہوتے ہیں۔ غلطی ہے

ہرہ چنوں میں مل گیا۔ ہمارے لئے یہ تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو ملاوٹ کی چیزیں کھانے کے عادی ہیں اگر بغیر چبائے چنے نگل جاتے ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ کیوں چنے چبائے ہم تو ہم الزام اُس کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

سینما گھر سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور ڈاڑھ کا درد ہندوستان کی آبادی کی طرح تیزی سے بڑھتا رہا۔ ہر قدم پہ یں لگتا تھا جیسے کوئی کیل ہماری سر میں ٹھونکی جا رہی ہو۔ اپنے درد کو منہ میں چھپائے گھر پہنچے جہاں کوئی ہمارے انتظار میں دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ وہ ہماری صورتِ حال دیکھ کر رو پڑیں ہم کو خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ اِس دورِ بے وفائی میں ہم ب محبت کرنے والی بیوی کے خوش قسمت شوہر ہیں۔ مگر جلد ہی ہماری غلط فہمی دور ہو گئی جب ان کے پیار نے غصہ کی شکل ختیار کر لی ـــ جب اُنہوں نے پورے یقین سے فرمایا پکچر ہاؤس میں کسی کو دیکھ کر شعر پڑھ دیا ہوگا جب ہی تو چہرہ اتنا سوجھ رہا ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ایا حضور ٹھیک ہی کہتے تھے شاعر بڑھاپے میں زیادہ جوان ہو جاتا ہے۔ ہرے کے ورم نے ہم کو غنچہ دہن بنا دیا تھا لب کُشا نہ ہو سکے ویسے بھی بہت کم لوگ بیوی کی بات کا جواب دے سکتے ہیں ی کہ غالب بھی کہہ گئے ہیں، گالیوں کا اُن کی کیا جواب۔

ہم درد سے کراہتے رہے وہ ترس کھا کر ہلدی چونے کا لیپ لگاتی رہیں کبھی بڑے ہمدردانہ لہجہ میں دریافت کرتیں یچ بتا نا کیا کسی محمد علی کلے جیسے مکّے باز سے ہو گئی تھی جو ایک ہی ہاتھ میں چہرہ فٹ بال بن گیا اردو کے شاعروں میں ایک جگر مرحوم ہی تھے جن کو شبِ فراق میں نیند آئی جاتی تھی مگر ہماری رات ہجر کی ہزار راتوں سے بڑی لگ رہی تھی خدا خدا کر کے سویرا ہوا۔ آئینہ جو دیکھا تو لگا چو این لائی کے روبرو کھڑے ہیں۔ اسپتال گئے تو منہ پر رومال ڈال کر پریشانِ حال کے ڈر سے س کس کو بتاتے زبوں حالی کا سبب ہم ـ ایکس رے کا فوٹو لیا گیا فریکچر نکلا۔ دوائیں انجکشن پر جو خرچہ آیا وہ اُس کی رقم قریباً پچاس روپے اُس رقم سے زیادہ تھی جو ہم نے اپنی شادی کی دعوت ولیمہ پر خرچ کی تھی۔ ایک ماہ تک ہم کسی کو منہ دکھانے ے لائق نہیں رہے آخر جب ڈاڑھ نکل گئی تب کہیں جا کر ہمیں آرام آیا۔ مگر ان کو یقین آج تک نہیں آیا کہ فریکچر چنے چبانے سے یا تھا۔ اب ہم کو دانت والوں سے ایک ہی بات کہنا ہے وہ یہ کہ دانت ہوگا تو دانت کا درد بھی ہوگا ـــ لہٰذا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ درد سے پہلے دانت یا ڈاڑھ کو نکلوا دیا جائے مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائیں گے۔

عالمؔ تاجپوری

ہمارا شاعرِ اعظم اگر میخوار ہو جائے

حجامت عاشقوں کی پھر سرِ بازار ہو جائے
کوئی چنچل حسینہ جب بھی پاکٹ مار ہو جائے

کبھی نوبت نہ آئے بینک میں گڑبڑ گھٹالے کی
جو مینجر کا سالا اس میں چوکیدار ہو جائے

وزارت کی جہاں کُرسی پہ بیٹھے ہوں کروڑی مل
تعجب کیا جو دو کوڑی کی وہ سرکار ہو جائے

اُڑائیں کیوں نہ ہم بھی گوشت مچھلی اور مَلپوُ ئے
جو بیٹا چار سو بیسی کا ٹھیکیدار ہو جائے

مرا اسٹارٹ کل سے اینول اکزامنیشن ہے
مَسالا نقل بازی کا کوئی تیار ہو جائے

محافظ ہے خُدا شعر و ادب کا دورِ حاضر میں
کوئی بھی خوش گلو شاعر اگر فنکار ہو جائے

بنایا دھرم شالا گھر کو ہم نے اس لئے ڈیڈی
کہ اُس میں منتقل ہر ایک رشتہ دار ہو جائے

یقیناً پھاند ہی جائے گا وہ دیوارِ جنّت کو
ہمارا شاعرِ اعظم اگر میخوار ہو جائے

اِدھر بیگم کی دُر دُر اور اُدھر احباب کی بھن بھن
خدائی قہر ہے جب آدمی بیکار ہو جائے

ترقی کی بلندی پر وہی تو گامزن ہوگا
کہ جس کے ذہن و دل کی اہلیہ مختار ہو جائے

مرے ہوش و خرد کا گر یہی عالم رہا کچھ دن
تعجب کیا انھیں میں جو تیمو بیمار ہو جائے

مختار یوسفی

"یاد ہے"

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
چھوڑ کر بچّوں کو تیرا بھاگ جانا یاد ہے

کانپ جاتا ہوں میں اکثر یاد کرکے وہ گھڑی
چمٹے، بیلن سے مری دُرگت بنانا یاد ہے

جب کبھی میں نے بلایا گھر پہ تیری ساس کو
وہ تیرا غصّے میں آکر منہ پھُلانا یاد ہے

فوجداری کرنے آئے تھے تیرے بھائی بہن
ہٹ ہٹا کر مجھ سے اُن کا بڑبڑانا یاد ہے

اتفاقاً ہی گیا تھا بھول سے ہوٹل میں کل
دیکھ کر مجھ کو ترا سنگل بجانا یاد ہے

دیکھنے کو فلم شعلے اور جو رو کا غلام
جیب سے میری ترا بٹوا اُڑانا یاد ہے

تیرے پھوہڑ پن سے جب ہوتا تھا میرا موڈ آف
بن سنور کر پھر ترا سکہ لگانا یاد ہے

کر سکا جب تیری فرمائش نہ پوری یوسفی
روٹھ کر اُس دم ترا میکے کو جانا یاد ہے

نور پرکاش (بمبئی)

کُتّے!

دُنیا کے ہر مُلک، ملک کے ہر صوبے، صوبے کے ہر شہر، شہر کے ہر گلی کوچہ میں کُتّے مارے مارے پھرتے دیکھے جا سکتے ہیں ـــــ لیکن کتّوں کی یہ دُردَشا اور ناقدری ایشیائی ممالک بالخصوص ہندو پاکستان میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں ان کو بعض حالات میں انسان سے زیادہ اُونچا مقام دیا جاتا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں کتّوں کے باقاعدہ کلب ہوتے ہیں۔ کتّے اپنے مالکوں کے ہمراہ ان جگہوں کی تمام تقریبات و تفریحات میں برابر حصّہ لیتے ہیں۔ یہاں اُن کی (کتّوں کی) دلجوئی، اور تفریح کا تمام سامان ہوتا ہے۔ کتّے ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کتّوں کے مالک ان کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے رہتے ہیں۔

ہندو پاک میں کُتّے "پالتو" کم اور "فالتو" زیادہ ہوتے ہیں۔ فالتو کتّوں کو قابو میں رکھنے کے لئے میونسپل کارپوریشن کا ایک پورا عملہ دن رات سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

بعض مغرب زدہ ہندوستانی جنہوں نے یورپ اور امریکہ صرف کتابوں میں پڑھا، اور فلموں میں دیکھا ہے' اپنے کتّوں کو اپنی سگی اولاد سے زیادہ چاؤ اور چونچلے سے پالتے، بلکہ پوستے ہیں!

شام کے وقت چوپاٹی کے ساحل پر ان گنہگار آنکھوں نے یہ منظر بارہا دیکھا ہے کہ میاں بیوی ساتھ ساتھ چہل قدمی کر رہے ہیں، یعنی ٹہل رہے ہیں۔ اور وہ بھی، اس طرح کہ میاں نے دونوں بچّوں کے ہاتھ تھام رکھے ہیں' اور بیگم صاحبہ ایک جھبرے سے کتّے کے پلّے کو گود میں لیئے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ کتّے کے بچے کو "پلّا" کیوں کہتے ہیں؟ جبکہ دیگر تمام جانوروں کے بچوں کو اُنھیں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' جیسے بلی کا بچّہ، بکری کا بچّہ، گھوڑے کا بچّہ، گدھے کا بچّہ... سور کا...!

کتّے ہر رنگ کے ہوتے ہیں۔ کالے، سفید، بھورے، پیلے، کتھئی... بالکل کالے، بالکل سفید، بالکل بھورے، بالکل پیلے بالکل کتھئی اور اکثر کتّے ان سب رنگوں کا مجموعہ!

کتے باقاعدہ لمبی زبان رکھنے کے بعد بھی بے زبان ہوتے ہیں۔ بولنے کے نام پر صرف بھونکتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جو بھونکتے ہیں، وہ کاٹا نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں جس نابکار کتے نے کاٹا تھا، بخدا ہمیں اچھی طرح یاد ہے، کہ کاٹنے سے پہلے زور زور سے بھونکا بھی تھا! تبھی تو ہم نے اِس نامعقول مقولہ پر یقین کرتے ہوئے سوچا، کہ یہ کیا کاٹے گا.... یہ تو بھونک رہا ہے!

لیکن ابھی ہم نے اطمینان کا طویل سانس لیا ہی تھا کہ اُس نامعقول کتے نے بھونکتے بھونکتے اچانک بھونکنا بند کرکے پہلے تو ہمارے گرد دو چار چکر کاٹے۔ ہم چلتے چلتے ایک بجلی کے کھمبے کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔

انسان کی دریافت شدہ سائنسی ایجادات میں کتوں کو بجلی سے زیادہ بجلی کے کھمبوں سے جنون کی حد تک لگاؤ ہوتا ہے۔ اگر آزاد اور خود مختار ہے تو کیا کہنا، اور اگر زنجیر کا ایک سرا گردن کے گرد اور دوسرا کسی حسین نازک کلائی کے گرد لپٹا ہوا ہے، تب بھی، بجلی کے کھمبے پر نظر پڑتے ہی زنجیر یا پٹہ تڑا نہ سہی چھڑا کر سہی، یہ کھمبے کو سونگھ کر اُس کا طواف کرتا ہے، اور پھر اُسے تر کرتا ہوا کسی دوسرے خشک کھمبے کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔

ہاں، تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہم چلتے چلتے ایک بجلی کے کھمبے کے قریب ہی رُک گئے۔ شام کا وقت تھا۔ کتے نے حسبِ عادت پہلے تو ہماری ٹانگوں کو سونگھا، ہم سمجھے اظہارِ عقیدت کے طور پر ایسا کر رہا ہے۔ مگر صاحب!

"اُس نے اپنے دل میں ٹھانی اور ہی"

بس ہمارا طواف کرتے کرتے اچانک رُکا، اور ہماری نئی JEANS تر کر دی۔ ہم نے تاؤ میں آکر اُسے دھتکارا جس پر کم بخت بھونکنے لگا، اور بھونکتے بھونکتے اپنے چار نوکیلے دانت ہماری پنڈلی میں اُتار دیئے! وہ تو ہماری JEANS آڑے آئی، یعنی اُس کے دانت ہمارے گوشت میں بہت زیادہ اندر، یعنی ہڈی تک نہ پہنچ سکے۔ اور بچائے لاکھوں روپیہ جیبوں میں بھرے گھر واپس آگئے۔ ہو سکتا ہے، اُس نے ہمیں بھی بجلی کا کوئی کھمبا سمجھ لیا ہو۔ ہم ہیں بھی بہت "پستہ قد" اور موٹے تازے ـــ!

ہمارے ناقص خیال میں خشکی پر چلنے والے تمام چوپایوں میں کتا وہ واحد جانور ہے، جس کی زبان سب سے زیادہ لمبی ہوتی ہے، اور جس کا تین چوتھائی حصّہ ہمہ وقت اس کے منہ سے باہر لٹکتا رہتا ہے۔ لیکن اتنی لمبی نمایاں زبان رکھنے کے باوجود ان میں آپس میں کبھی زبان کے مسئلہ پر فسادات نہیں ہوتے۔ یہ صفت صرف حیوانِ ناطق، یعنی ہم انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ہاں، ہر کتے کی دُم اقوامِ متحدہ کو درپیش اکثر و بیشتر مسائل کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے۔

یوں تو کتوں کی وفاداری کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں، لیکن عالمگیر شہرت کا مالک ہے، سگِ لیلیٰ۔ کہ قیس اس کتے کو دیکھتے ہی اُسے گلے لگا لیتا تھا، یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض کتوں کے کاٹنے سے آدمی مجنون ہو جاتا ہے، کہیں لیلیٰ کے کتے نے بھی تو قیس کو......!

سگِ لیلیٰ کے بعد دوسرا مثالی کتا وہ ہے، جو دھوبی کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی بچارا نہ گھر کا ہوتا ہے، نہ گھاٹ کا! کتوں کی یہ قسم صرف ہندو پاک میں پائی جاتی ہے، کیوں کہ مغربی ممالک میں نہ دھوبی ہوتے ہیں نہ گھاٹ۔
مغرب کے ہر فیشن کی طرح کتا پالنے کا فیشن اپنے ملک میں بھی عام ہوتا کیا جارہا ہے، ہوگیا ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا، کہ اب ہر ترقی یافتہ گھر میں کتا بھی خاندان کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہاتھی کے دانتوں کی طرح کتے کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور نہیں ہوتے، کھانے اور دکھانے کے علاوہ کاٹنے کے بھی ہوتے ہیں۔

ہم اپنے ایک دوست کے ہمراہ اُن کے ایک دوست کے گھر گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی جو کچھ ہم نے دیکھا آپ بھی ملاحظہ فرمایئے!

ڈرائینگ روم میں کپڑے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہیں۔ تین بچے اور ایک کتا، آپس میں گڈمڈ قیمتی قالین پر کشتی لڑ رہے ہیں۔ بیوی قریب ہی صوفہ پر نیم دراز MEMOIRS OF A YELLOW DOG پڑھ رہی ہیں۔ میاں منے کو بوتل سے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر کیشور کمار کا کوئی گیت بج رہا ہے، اور ایک دوسرا کتا ٹیپ ریکارڈر کے سامنے H.M.V. کے کتے کے پوز میں بیٹھا مزے سے گانا سُن رہا ہے۔

ہمارے ایک اور کرم فرما ہیں، جو امیر ہونے کے ساتھ ہی کبیر بھی ہیں۔ اور کتوں کے رسیا بھی! ایک دن ہم کسی کام سے اُن کے پاس گئے۔ زبردستی دوپہر کے کھانے کے لئے روک لیا۔ ہم شریفوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر کھانے کے عادی ہیں۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم کھانے کو نہیں بلکہ کھانا ہمیں کھا رہا ہے۔ بہرحال ہم بھی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

ہمارے میزبان کا پیارا کتا، جسے وہ سب پیار سے "بی۔ ڈبلیو" کہتے تھے، اپنے مالک کے دس سالہ بچے کی گود میں بیٹھا تھا۔ سبھی لوگوں کی گود میں NAPKINS رکھے ہوئے تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ ہر لقمے کے بعد میاں "بی ڈبلیو" بچے کا ہاتھ اور منہ چاٹتے جاتے تھے۔ گویا اُن کی زبان NAPKIN کا کام دے رہی تھی۔ ہم نے اپنے دوست کا ل رکھنے کے لئے ان کے بچے سے زیادہ اُس کتے کی تعریف کردی۔ جس پر بے حد خوش ہوکر بولے اجی صاحب، بس ھ نہ پوچھیئے۔ تبھی تو میں نے اس کو گھر کے کل سیاہ وسفید کا گویا کہ مالک بنا رکھا ہے۔ جبھی تو ہم سب اِسے پیار سے ا ڈبلیو" کہتے ہیں۔ "بی ڈبلیو" یعنی بلیک اینڈ وہائٹ! اور تب ہم نے جو غور سے اُسے دیکھا، تو پتہ چلا کہ اس کا دھا جسم بالکل سیاہ ہے، اور آدھا بالکل سفید!

ایک اور صاحب کو کتوں سے اِس حد تک عشق ہے کہ اپنی کتیا کا نوزائیدہ پلا کوٹ کی جیب میں لئے پھرتے ہیں۔
ب بار ہمارے گھر آئے۔ سخت زکام میں مبتلا تھے۔ کوٹ کی ایک جیب میں رومال، اور دوسری جیب میں کتے کا پلا ——!
وران گفتگو جو چھینکیں آنا شروع ہوئی ہیں، تو داہنی جیب سے رومال کے بجائے بائیں جیب سے کتے کے

پلّے کی پُونچھ پکڑ کر اپنی بہتی ہوئی ناک سے رگڑ ڈالی! پلّا بڑی زور سے چلّایا ...! جناب نے لاحول ولا کہکر اُسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پلّا سامنے رکھے ہوئے ٹی سیٹ پر گرا، اور گرما گرم چائے سے نہاتا ہوا چائے کے برتنوں سمیت فرش پہ آرہا۔

آپ حضرات نے غالب کا وہ مشہور شعر ضرور سُنا ہوگا کہ

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں!

ہم جب بھی وہ نیلی JEANS پہن کر کسی نیم تاریک گلی سے گزرتے ہیں تو کتّے کے خوف سے ڈرتے، اور مرزا کا یہ شعر انتہائی ترمیم کے ساتھ کچھ اس طرح پڑھتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کہ

دنیائے رنگ و بو میں میاں آدمی کے بعد
کتّوں سے ڈر لگے ہے، کہ "ممّی" گزیدہ ہوں

بالو نسرتاج چندر پور (مہاراشٹرا)

میڈم میری

مقام۔ گرلس ہوسٹل۔

کردار۔ آشا، میناکشی، شردھا، یاسمین، کُسم، پُشپا دیدی۔ اور میڈم میری۔

(یاسمین کا کمرہ، کمرے میں ایک پلنگ، دو ٹیبل اور دو کرسیاں ہیں۔ یاسمین آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی ہے۔ آشا اور شردھا بھاگتی ہوئی آتی ہیں)

آشا:۔ گئی... گئی... گئی..... ی ی ی۔

یاسمین:۔ (چونک کر) کون گئی؟

آشا، شردھا:۔ (ایک ساتھ) مہاکالی، چنڈی، درگا، میڈم میری تشریف لے گئی۔

یاسمین:۔ سچ! مجھے یقین نہیں آرہا۔

آشا:۔ رکشہ گیٹ سے باہر گئے پورے چالیس منٹ ہو چکے ہیں۔ اب تک وہ اسٹیشن پر پہنچ چکی ہوگی بلکہ ٹرین میں لد چکی ہوگی (ٹیبل پر سے کتابیں ہٹا کر بیٹھ جاتی ہے)

یاسمین:۔ تھینک گاڈ۔ میڈم گئی تو کسی طرح ہمیں چھوڑ کر خزانے کے سانپ کی طرح ہم پر پہرہ دیتی ہے۔

شردھا:۔ (منہ بسور کر) مگر صرف آٹھ روز کے لئے گئی ہے۔

آشا:۔ آٹھ روز بہت ہوتے ہیں۔ یہ آٹھ روز ہم آزادی سے ہنس کھیل کر گزاریں گے۔ کوئی ہمارے ہنسنے، چہکنے چلنے، بولنے پر ٹوکنے والا نہ ہوگا۔

یاسمین:۔ بڑھیا سمجھتی ہے کہ اس کے دن گئے تو سب کے پر کاٹ لے گی۔

آشا:۔ میناکشی اور کُسم کو بھی بلا لو۔ ہم سب مل کر میڈم کی ABSENCE CELEBRATE کرینگے

(جگہ پر بیٹھے بیٹھے چلاتی ہے... میناکشی .... کُسم ....)

شردھا:۔ (اٹھ کر دروازے تک جا کر میناکشی اور کُسم کو آواز دیتی ہے پھر لوٹ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

کُسم:۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) تم لوگوں کے خوشی سے کھلے ہوئے چہرے دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہیں بھی میڈم کے جانے کی خبر مل گئی۔

آشا:۔ آنے کورس اور یہ جاسوسی کے دھندے ہم نے میڈم ہی سے سیکھے ہیں۔

سمین : ۔ جاسوسی پر سے یاد آیا۔ اُس روزی کا کچھ علاج
دو، وہ ہماری باتیں سن کر میڈم سے ایک کی چار بناکر بتائیگی۔
میناکشی : ۔ (کمرے میں داخل ہوکر) فکر نہ کرو۔ میں باہر
س کا کمرہ لاک کرآئی ہوں۔
شا : ۔ شنکر دادا یا منگلا تائی کو پکار کر کمرہ کھلوالے گی
پر ہمیں کچا کھا جائے گی وہ۔
میناکشی : ۔ (اکڑکر) مابدولت نے ان دونوں کو شام
تک چھٹی دے دی ہے۔
شا : ۔ (خوشی سے چیخ کر) اوسویٹ میناکشی۔ یہ کام کیا
ہے تم نے (دونوں ہاتھوں سے ٹیبل پیٹتی ہے۔ سب ہنستی
ہیں میناکشی شردھا کے پاس بیٹھ جاتی ہے)
یاسمین : ۔ میں پہلے بھی ہوسٹل میں رہ چکی ہوں مگر میں
نے ایسی ڈینجرس عورت نہیں دیکھی۔
میناکشی : ۔ اُسے عورت کہہ کر عورت ذات کو بدنام
نہ کرو۔ اُس میں کوئی نسوانی خصوصیت نہیں ہے۔ نہ
ممتا نہ پیار ... نہ میٹھی زبان نہ نرم مزاج ... ہر دم
کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔
شردھا : ۔ بائی دَ وے یاسمین، تم جس ہوسٹل میں رہتی
تھیں وہاں کی وارڈن شادی شدہ تھی یا کنواری؟
یاسمین : ۔ شادی شدہ تھی. شوہر تھا ... بچے تھے ...
میناکشی : ۔ تو ہوگئی بات کلیئر ... میرے خیال میں تو
بوڑھی کنواریوں سے خرانٹ ذات اور کوئی نہیں۔
آشا : ۔ اپنے کالج کی انگریزی کی لیکچرر مس پردھان
کی مثال لے لو۔ چالیس برس کی ہو جانے پر بھی نوعمر
دوشیزہ کی طرح سجتی سنورتی ہے۔ کم سے کم آدھا درجن
تو بھائی بنا رکھے ہیں شہر میں۔

شردھا : ۔ I AGREE WITH YOU مگر
نہ جانے تمام گرلس ہوسٹلوں میں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑھیا
کنواریاں کیوں وارڈن بنائی جاتی ہیں؟
کسم : ۔ مس پردھان کا نام لسٹ میں ضرور ہوگا۔ ریٹائر
ہوتے ہی وارڈن شپ تیار ملے گی۔
میناکشی : ۔ شوہر نہیں ہوتا حکم چلانے کے لئے بچے نہیں
ہوتے ڈانٹ بتانے کے لئے ... بس لڑکیوں پر رعب
جھاڑتی ہیں۔
کسم : ۔ میری ممی نے کبھی مجھ پر اتنی روک ٹوک نہیں
کی جتنی یہ کھوسٹ بڑھیا مجھے ٹوکتی ہے۔ کاجل کیوں لگایا؟
زلفیں کیوں نکالیں؟ مٹک مٹک کر کیوں چلتی ہو ...
ایسا نہ کرو ... ویسا نہ کرو۔
(پس منظر میں کسی کے پکارنے کی آواز ... میناکشی،
کسم ... کہاں ہو تم لوگ؟)
شردھا : ۔ (میناکشی کو دروازے کی طرف ڈھکیلتی ہوئی)
پشپا دیدی آگئیں۔ جا بھاگ جلدی۔ کہیں اُس جاسوس
روزی کو آزاد نہ کر دیں وہ۔ (کسم پہلے دوڑ جاتی ہے
اور پشپا دیدی کو ساتھ لے کر لوٹتی ہے)
پشپا دیدی : ۔ لڑکیو! کسم نے مجھے بتایا کہ تم لوگ میڈم
کے جانے کی ....
کسم : ۔ (بات کاٹ کر) جانے کی نہیں دفع ہونے کی
پشپا دیدی : ۔ ... دفع ہونے کی خوشیاں منا رہی
ہو۔ مگر خالی خولی خوشی؟ منہ میٹھا نہیں کراؤ گی؟
یاسمین : ۔ ہائے آج تو میرے پاس شکر بھی نہیں۔
دیدی۔ کوئی بات نہیں۔ لو۔ مٹھائی میں لے آئی ہوں۔
(بیگ سے ایک لفافہ نکال کر کسم کو دیتی ہیں۔ لفافے میں

سے مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا لے کر سب لفافہ آگے بڑھاتی جاتی ہیں)

یاسمین :۔ (مٹھائی کھاتے ہوئے) اچھا دیدی، میں بتاؤں؟ آپ ریسرچ کیوں کر رہی ہیں؟

دیدی :۔ (حیرت سے) میں ریسرچ کیوں کر رہی ہوں یہ تم بتاؤ گی؟

یاسمین :۔ (اطمینان سے) ہاں. اصل وجہ تو آپ کو بھی پتہ نہ ہوگی. جب میں بتاؤں گی تب معلوم ہوگا.

دیدی :۔ بتاؤ... بتاؤ. (کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتی ہیں)

یاسمین :۔ اس لئے کہ آپ کی اپنے شوہر سے پٹتی نہیں ہے.

دیدی :۔ ایں!

کسم :۔ شوہر سے جھگڑ کر آپ ہوسٹل میں رہنے آئی ہیں.

دیدی :۔ کیا کہہ رہی ہیں تم لوگ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے.

یاسمین :۔ شادی شدہ جتنی بھی لڑکیاں ریسرچ کرتی ہیں... ہوسٹل میں آکر رہتی ہیں ان کے بارے میں میڈم یہی بتاتی ہیں... یعنی کہ شوہر سے کھٹ پٹ ہے.

(دیدی جھینپی ہنسی ہنستی ہیں)

میناکشی :۔ دیدی. اب پوچھو کہ ہم لوگ کیوں ریسرچ کر رہی ہیں. پوچھو... پوچھو.

دیدی :۔ کیوں ریسرچ کر رہی ہو تم لوگ؟

آشا :۔ اس لئے کہ ہماری شادی نہیں ہوتی.

شردھا :۔ لڑکوں نے ہمیں پسند نہیں کیا. ہمیں پسند نہیں کرتے ہیں

میناکشی :۔ لوگوں کے سوال و جواب سے بچنے کے لئے ماں باپ ہمیں ہوسٹل میں بھیج دیتے ہیں.

یاسمین :۔ میں نے تو ایک بار چڑ کر کہہ دیا تھا میڈم مجھے بازار میں کھڑا کر کے دیکھو کتنے لڑکے مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں.

کسم :۔ میڈم کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا ہوگا یہ سن کر.... بے چاری کے نصیب میں تو ایک بھی نہیں تھا.

آشا :۔ مجھ سے ایک بار یہی بات کہی میڈم نے تو میں نے کہا ابھی تو صرف ایم فل کر رہی ہوں. اب پی. ایچ. ڈی اور ڈی. ایس. سی بھی اسی ہوسٹل میں رہ کر کروں گی.

کسم. میناکشی :۔ (ایک ساتھ) تھری چیئرس فار یاسمین اینڈ آشا.. میڈم کو ترکی بہ ترکی جواب دینے والا ملے تب ہی تو منہ بند ہوتا ہے اس کا.

دیدی :۔ مگر میڈم کا کیا بگڑتا ہے. اسے تو اپنی ڈیوٹی بہرحال کرنی ہے.

کسم :۔ سال بھر تو کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں ہی ہیں دماغ کھانے کو... چھٹیوں میں ہم ریسرچ اسکالر آجاتی ہیں. بس جل بھن جاتی ہے وہ.

دیدی :۔ بڑبڑ کرنے کی عادت ہے میڈم کی یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کرو.

یاسمین :۔ بڑبڑ کرنا اور بات ہے بکواس کرنا اور بات. کبھی کبھی تو بالکل ہی بے لگام ہو جاتی ہے۔ اب اس دن آشا سے پوچھ رہی تھی... بتا نہ آشا کیا پوچھ رہی تھی؟

آشا :۔ کسم میڈم کی اچھی نقل اتارتی ہے. وہ بھی تو تھی میرے ساتھ.... کسم پوچھ اسی طرح، جس طرح

میڈم پوچھ رہی تھی۔

(کسم اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک نربہ خاتون کی طرح چلنے کا ناٹک کرتی ہوئی اسٹیج کے درمیان آکر کھڑی ہو جاتی ہے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیتی ہے)

کسم :۔ (عجیبی نظروں سے آشا کو نیچے سے اُوپر تک دیکھ کر باریک آواز میں)

آشا.... اِدھر آؤ۔

آشا :۔ (نزدیک آکر) جی میڈم۔

کسم :۔ (کڑک کر) تمہارا وزن کتنا ہے؟

آشا :۔ ... جی... جی... وزن... جی ۴۵ کے جی۔

کسم :۔ کب کرایا تھا؟

آشا :۔ آٹھ روز پہلے۔

کسم :۔ کہاں کرایا تھا؟

آشا :۔ اسٹیشن پر۔

کسم :۔ اسٹیشن کیوں گئی تھیں؟

آشا :۔ یاسمین کو چھوڑنے گئی تھی۔

کسم :۔ یاسمین کہاں گئی تھی؟

آشا :۔ وہ اپنے گھر گئی تھی۔

کسم :۔ کس کے ساتھ گئی تھی؟

آشا :۔ اکیلی گئی تھی۔

کسم :۔ کیوں گئی تھی؟

آشا :۔ اُس کی طبیعت خراب تھی۔ آپ ہی نے اُس سے کہا تھا کہ اپنے گھر جاکر مرو۔ یہاں آگا پیچھا کون دیکھتے بیٹھے گا؟

کسم :۔ ... اچھا چپ رہو... میں پوچھ رہی ہوں جب ہوسٹل میں آئی تھیں تم تب کتنا وزن تھا؟

آشا :۔ شاید... چالیس کے جی۔

کسم :۔ تین مہینوں میں ۵ کلو وزن بڑھ گیا (گھ آشا کو چاروں طرف سے دیکھتی ہوئی) کوئی گڑبڑ ہے آشا۔ دیکھ مجھ سے نہ چھپانا۔

میناکشی :۔ (اچھل کر) ہائیں! کب کی بات ہے یہ! اُس دن مجھ سے بھی پوچھ رہی تھی۔

کسم آشا :۔ (ناٹک بھول کر) کیا پوچھ رہی تھی۔

میناکشی :۔ (میڈم کی طرح باریک آواز بناکر) میناکشی ادھر کچھ دنوں سے دبلی نظر آرہی ہو۔ کوئی گڑبڑ تو نہ

(سب کی سب کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں)

آشا :۔ تم نے کہہ دینا تھا کہ آپ کی نظر لگ گئی ہوگی

یاسمین :۔ اور آشا تم نے کہنا تھا کہ روز آلو کی بھا کھا کر مٹا رہی ہوں۔

کسم :۔ یا یہ کہنا تھا کہ آپ کے چشمے کا نمبر بدلوانا کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے آپ کو۔

دیدی :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوسٹل میں رہ کر موٹے ہو سکتے ہیں نہ دُبلے۔

یاسمین :۔ ہاں۔ جتنا وزن لے کر آئے ہیں اتنا ہی جانا ہوگا۔

کسم :۔ جیسے میڈم کے وزن میں سے لے جا رہے

دیدی :۔ مگر تم اس طرح کے سلوک پر احتجاج کیوں کرتیں؟ آخر تم لوگ بچّی تو ہو نہیں۔

شردھا :۔ بے حد چالاک ہے وہ۔ اُس سے کہتے کہ ایسا کیوں کہا تو فوراً اپنی بات سے پلٹ جاتی کہتی ہے میں نے تمہیں تھوڑی کہا میں تو ایک جنرل با رہی تھی۔

(دیدی قہقہہ لگاتی ہیں۔ سب اُن کا ساتھ دیتی ہیں)

شردھا :۔ یہی تو خوبی ہے میڈم میں۔ پھر آپ کے سامنے تو ایسے پوز کرے گی جیسے آپ اُس کی فیورٹ FAVOURITE ہوں۔ آپ کے پیٹھ پھیرتے ہی کہے گی۔ پرکٹی ہے۔ بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومنے آئی ہے ریسرچ کا تو بہانہ ہے۔

دیدی :۔ سچ کہتی ہو شردھا! واقعی ایسا کہتی ہے میڈم۔

شردھا :۔ سینٹ پرسینٹ سچ۔ ہم میں سے ہر ایک کو تجربہ ہو چکا ہے۔

دیدی :۔ تو پھر مجھے بھی کہتی ہوگی۔

میناکشی :۔ (بے ساختہ) کہتی ہی ہے۔

دیدی :۔ (تجسّس سے) کیا کہتی ہے۔

میناکشی :۔ (گھبراکر) نہیں نہیں۔ آپ کو کیوں کہنے لگی۔ میں تو یوں ہی کہہ گئی تھی۔

دیدی :۔ نہیں ضرور بتاؤ۔ ویسے بھی روک ٹوک تم لڑکیوں پر ہو تو مناسب بھی ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ مجھے کون اڑا کر لے جائے گا!

یاسمین :۔ (شوخی سے) اب ایسا بھی نہ کہئے دیدی۔ کتنی خوبصورت ہیں آپ! ابھی یہاں کوئی روپ کا چور گھس آئے تو ہم لڑکیوں کو چھوڑ، آپ کو ہی اُٹھا لے جائے گا۔

دیدی :۔ (شرماکر) دھت!! (پھر مسکراکر) میرے پتی دیو کہتے ہیں جو تمہیں اُڑا کر لے جائے گا وہ پچھتائے گا۔

آشا :۔ جلے دل کے پھپولے پھوڑتے ہوں گے جیجا جی۔

(سب ہنستی ہیں)

دیدی :۔ اچھا.... بتاؤ میناکشی۔ کیا کہتی ہیں میڈم میرے بارے میں۔

میناکشی :۔ (ہار مان کر) اُس دن آپ سے ملنے کوئی آیا تھا نا؟

دیدی :۔ (یاد کرتے ہوئے) پچھلے اتوار.... تیاگی صاحب آئے تھے۔

میناکشی :۔ (جھجکتے ہوئے) آپ میڈم کو بتانے آئی تھیں کہ آپ رات دیر سے لوٹیں گی تو میڈم نے آپ سے کہا کہ آپ کبھی بھی آسکتی ہیں۔ آپ کے لئے کوئی بندھن نہیں۔ آپ خود سمجھدار ہیں وغیرہ وغیرہ ... ایسا ہی کہا تھا نا؟

دیدی :۔ ہاں۔

میناکشی :۔ آپ کے جاتے ہی بولی (کھُڑک کر) بولی .. دیکھا اس عمر میں بھی بوائے فرینڈ رکھتی ہیں عورتیں۔

دیدی :۔ (جھینپ کر) وہ میرے کولیگ رہ چکے ہیں۔ یونیورسٹی سے انہیں میرے بارے میں معلوم ہوا تو مجھ سے ملنے آئے تھے۔

آشا :۔ آپ سے صفائی کون مانگ رہا ہے دیدی۔ یہ تو کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا میڈم کی ضد پر میں نے بوائے فرینڈ بنایا۔

کسُم :۔ کسی کا بوائے فرینڈ ہے تو کیوں ہے؟ نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے... دونوں طرف سے چال کھیلتی ہے میڈم۔

شردھا :۔ اُس کے ڈر سے ہوسٹل میں لوٹ کر آنے کو جی نہیں چاہتا۔ سارا دن لائبریری میں گزارنے کے بعد شام کو اُس کی صورت دیکھتے ہی جی کیسا کیسا ہونے لگتا ہے۔

آشا :۔ اسی لئے تو جب میڈم جارہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر ایک فلمی گیت گاؤں....

یاسمین:۔ کون سائیت ؟

آشا:۔ (دسٹر نکال کر) ادھا جانے والے، ہوسکے تو لوٹ کر نہ آنا...

کسم:۔ (دسٹر ملا کر) لوٹ نہ آنا۔

(سب ہنستی ہیں)

یاسمین:۔ میڈم چلی ضرور گئی ہے مگر اس کا سارا دھیان ہوسٹل کی طرف ہوگا۔

کسم:۔ سوچتی ہوگی کون فرسٹ شو دیکھنے گئی... کون بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومنے گئی.. کس کا ٹرنک کال آیا....

آشا:۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے میڈم کو سبق پڑھایا جائے۔

کسم:۔ یعنی کوئی کراری چوٹ دی جائے۔

میناکشی } کیا سبق ؟
یاسمین } کیسی چوٹ ؟

آشا:۔ جس کے بعد وہ ہم لڑکیوں کے پیچھے چیخ چیخ کرنا چھوڑ دے۔

دیدی:۔ (مسکرا کر) میڈم کی شادی کرا دو۔

کسم:۔ (ناامیدی سے) اس فوم کے گدّے سے کون شادی کرے گا۔

میناکشی:۔ فوم۔ ارے ڈبل فوم کہو۔

یاسمین:۔ عمر بھی تو ۵۵ کو پہنچ رہی ہے۔

شردھا:۔ ناک نقشہ بھی بالکل ردّی ہے۔

کسم:۔ بالکل سڑے ہوئے سیتاپھل جیسی لگتی ہے

دیدی:۔ چپ! حد سے باہر نہ جاؤ۔

آشا:۔ (اچانک ٹیبل سے نیچے کود کر) آئیڈیا!

سب (ایک ساتھ) کیا؟

آشا:۔ میڈم کو لوریا (LOVERIA) کا ڈوز دیا جائے۔

میناکشی:۔ کیا مطلب؟

آشا:۔ مطلب یہ کہ میڈم کو لو لیٹر لکھے جائیں۔

یاسمین:۔ لو لیٹر! کس کی طرف سے؟

آشا:۔ میڈم کے فرضی عاشق کی طرف سے۔

کسم، میناکشی:۔ گڈ.... میڈم کو لوریا ہوگا اور وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے گی۔

دیدی:۔ بڑی شیطان ہو تم لوگ۔ مگر افسوس کہ اس کھیل سے میں لطف اندوز نہ ہو سکوں گی۔

شردھا:۔ کب جا رہی ہیں آپ؟

دیدی:۔ پرسوں صبح۔

کسم:۔ کوئی بات نہیں۔ میں میڈم کے آتے ہی خوش خبری دے دوں گی کہ پشپا دیدی کی ہم نے ان کے شوہر سے صلح صفائی کرا دی اور سمجھا بجھا کر گھر واپس بھیج دیا۔

دیدی۔ خوش ہو جائے گی کہ ایک بلا تو ٹلی۔

کسم... چلو بھئی پہلے لو لیٹر لکھیں۔ مجھے صبر نہیں آرہا ہے۔

آشا:۔ لکھے گا کون؟ میڈم لکھاوٹ نہ پہچان لے گی۔ ہمارے خطوط سنسر جو کرتی ہے۔

شردھا:۔ یاسمین کو الٹے ہاتھ سے بھی لکھنا آتا ہے۔ تم لکھو یاسمین۔

یاسمین:۔ (خوف زدہ ہو کر) نہیں.. میں نہیں۔

شردھا:۔ تم لکھو تو سہی۔ بعد میں ٹائپ کرالیں گے۔

(یاسمین ٹیبل کے نزدیک کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتی ہے۔ کسم اس کے نزدیک پلنگ پر بیٹھتی ہے)

سمین (کاغذ قلم سنبھال کر) بولو۔

ردھا۔ لکھو.... میری ڈارلنگ !

م :۔ نہیں۔ مائی ڈیر میری۔ ٹھیک رہے گا۔

شا:۔ پران پیاری میری...

مین :۔ (میناکشی کی طرف دیکھ کر) تم بھی بول دو۔

اکشی :۔ میرے خیال سے شروعات ذرا رومانٹک
نی چاہیئے، میرے سپنوں کی رانی... مناسب رہیگا۔

مین :۔ دیدی آپ بتایئے کیا لکھوں؟

ردھا :۔ مجھے اس معاملے میں نہ گھسیٹو۔

شا :۔ (شوخی سے) جیجاجی آپ کو خط میں کیا لکھتے
؟

ردھا :۔(مصنوعی خفگی سے) مجھ سے شرارت نہیں ہاں۔
(بیگ سے آدھا بنا سوئیٹر نکال کر بُننے لگتی ہیں)

مین :۔ (لکھتے ہوئے) میرے سپنوں کی رانی.. بھا
چلو آگے..

شا :۔ اُس دن تمہیں سینما ہال میں دیکھا۔

کشی :۔ کٹ! سینما دیکھنے تو میڈم یوں ہی اُٹھارہ مرتبہ
جاتی ہے۔ کسی تقریب کا ذکر کرو۔

م :۔ اُس دن رجسٹرار صاحب کی لڑکی کی شادی میں
شریک ہوئی تھی میڈم۔

شا :۔ (ٹہلتے ہوئے سنجیدہ صورت بنا کر) لکھو یاسمین۔
گذشتہ جمعہ کو رجسٹرار کے یہاں شادی میں تمہیں دیکھا۔

ردھا :۔ اور دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔ (یاسمین کی کرسی
پیچھے کھڑی ہو کر خط میں جھانکنے لگتی ہے)

سمین :۔ (سر اٹھا کر) خوف سے ہوش بیٹھا... ایسا
کیوں کیا؟

آشا :۔ یار کیا غضب کر رہی ہے۔ لو لیٹر لکھ رہی ہے
اس کا تو خیال کر۔

کسُم :۔ رومانٹک لینگویج میں لکھو (کاسر) ایک بجلی
گری اور میں جل گیا۔

آشا :۔ سائیلنس... آگے لکھو یاسمین۔ نیلے رنگ کی
ساڑی میں تمہارا دمکتا چہرہ نیلے آکاش میں چمکتے چاند
کی یاد دلا رہا تھا۔

کسُم :۔ مگر میڈم نے اُس روز نیلے رنگ کی ساڑی نہیں
پہنی تھی۔

آشا :۔ پھر کون سے رنگ کی پہنی تھی؟

کسُم :۔ لال رنگ کی بلڈ ریڈ (BLOOD-RED)
رنگ کی۔

آشا :۔ نہیں نیلے رنگ کی تھی۔

کسُم :۔ میناکشی۔ شردھا.. تم بتاؤ کون سے رنگ کی
ساڑی تھی؟

میناکشی، شردھا :۔ لال رنگ کی تھی بھئی۔

آشا :۔ ٹھیک ہے لکھو... لال رنگ کی ساڑی میں تمہارا
اُجلا روپ نئی دلہن کو شرمندہ کر رہا تھا۔

یاسمین :۔ چلو بغیر شادی کے دلہن بننا تو نصیب ہوا بیچاری
کو۔

کسُم :۔ اُس طرح لکھو یاسمین... چتا پر پتی کے ساتھ ستی
ہونے کے لئے تیار، دلہن کی طرح سجی دھجی، تم قتل کو بھاری
تھیں۔

میناکشی :۔ کسم کی بچی کیوں موڈ خراب کرنے پر تُلی ہے؟

یاسمین :۔ آگے بولو بھئی۔

آشا :۔ (ٹہلتے ہوئے) تمہارے بھونرے جیسے کالے

بالوں میں کنول کا وہ سفید پھول۔
کُسُم :۔ (کھلکھلا کر) کویا سمین تشبیہ اُلٹی ہوگئی۔۔
لکھو کہ تمہارے کنول جیسے سفید بالوں میں وہ کالے بھونرے
جیسے کلپ۔۔۔ (سب ہنستی ہیں)
پشپا دیدی :۔ (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) خوب سوجھتی
ہے اس کُسُم کو۔
آشا :۔ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ جس سے
محبت ہو جائے اُس کی خامی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔
یاسمین :۔ بولو بابا آگے۔۔۔ کیا رک رک کر بولتی ہو۔
آشا :۔ تمہاری وہ مدبھری چنچل آنکھیں۔۔۔
کُسُم :۔ بھینس جیسی۔
آشا :۔ خوبصورت ناک۔۔۔۔
کُسُم :۔ پکوڑی جیسی۔۔۔۔
آشا :۔ رسیلے ہونٹ۔
کسم :۔ بھنڈی جیسے۔۔۔
آشا :۔ (کسم کو گھور کر دیکھتے ہوئے) وہ مورتی جیسا
بدن۔۔۔
کسم :۔ اچنتا پہاڑ جیسا۔
(میناکشی، یاسمین، شردھا اور دیدی کی ہنسی)
آشا :۔ (ڈانٹ کر) کُسُم، ٹھیک سے بیٹھ یا باہر چلی جا۔
(کسم ڈرامائی انداز میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آنکھیں بند
کرلیتی ہے)
آشا :۔ آگے لکھو۔۔۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے۔
کسم :۔ آنکھوں میں تم ہی تم ہو۔
آشا :۔ پھر بولیں تم؟۔۔۔ یاسمین لکھو۔ میں تمہارے
بنا نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہیں میری چاہت منظور ہے تو

بدھ کی شام گلابی ساڑی پہن کر امبا جھری گارڈن
میں آجانا۔
شردھا :۔ یہ بھی لکھو کہ پیدل چل کر آنا۔ میں راستے
میں کہیں پلکیں بچھائے کھڑا ملوں گا۔
میناکشی :۔ دو کلو میٹر پیدل چل سکے گی وہ؟
شردھا :۔ چلنا ہی پڑے گا پیدل، ایک عاشق
ملے گا۔ کیا اتنی آسانی سے چھوڑ دے گی۔
کُسُم :۔ (آنکھیں بند کئے کئے) کچھ چربی بھی تو کم ہونی
چاہیئے۔
یاسمین :۔ امبا جھری گارڈن کیا۔۔۔ آرڈیننس فیکٹری
بھی بلائے گا تو میڈم دوڑی چلی جائے گی۔
آشا :۔ اچھا۔۔۔ یاسمین۔۔۔ پیار لکھ کر ختم کردو مضمون
۔۔۔۔۔
یاسمین :۔ نام کیا لکھوں؟
میناکشی :۔ ۔۔۔ تمہارا امیتابھ لکھ دو۔
شردھا :۔ ایسا غضب نہ کرنا۔ وہ تاڑ کا پیڑ میڈم کو بالکل
پسند نہیں۔
آشا :۔ راجیش لکھ دو۔
یاسمین :۔ راجیش کا۔ مارکٹ ڈاؤن چل رہا ہے۔
کُسُم :۔ جیتندر پر مرتی ہے میڈم۔ (پھر ہونٹوں پر
انگلی رکھ لیتی ہے)
آشا :۔ تمہارا جیتندر، لکھ کر ختم کرو بس۔۔۔ بس۔۔ بس
(آشا کا منہ دروازے کی طرف ہے۔ آخری لفظ اُس
کے منہ سے برابر نہیں ادا ہوتے۔۔۔ بس۔۔۔ بس۔۔ کہتی
کھڑی رہ جاتی ہے)
(شردھا میناکشی دوڑ کر اُس کے پاس پہنچتی ہیں) کیا ہوا؟

آشا:۔ م .... ما .... ما .... م ....

میناکشی :۔ (اُسے جھنجوڑ کر) کیا .. ما .... ما کی سرگم الاپ رہی ہے۔

آشا:۔ (دروازے کی طرف اشارہ کرتی ہے)

شردھا، میناکشی :۔ (دروازے کی طرف دیکھتی ہیں اور چیخ پڑتی ہیں) میڈم! (دروازے میں میڈم میری کھڑی ہیں)

یاسمین :۔ میڈم کا نام سُن کر جھٹکے سے یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آنکھ بند کر کے بیٹھی ہوئی کُرسی فرش پر لڑھک جاتی ہے مگر آنکھیں نہیں کھولتی)

میڈم :۔ (ایک ایک کو گھورتی ہوئی) میں بہت دیر سے دروازے کے باہر کھڑی تم لوگوں کی باتیں سُن رہی تھی... ایک ایک کی خبر لوں گی ٹھہر تو جاؤ یہ نہ سمجھنا کہ چھوڑ دوں گی

آشا:۔ (ہکلا کر) میڈم ... ہم تو ... ہم تو ....

میڈم :۔ (ڈپٹ کر) خاموش! یاسمین کا غذ ادھر لاؤ۔ یاسمین کی طرف ایک قدم بڑھاتی ہے کہ یاسمین گڑبڑا کر کاغذ کی گولی بنا کر منہ میں رکھ لیتی ہے اور نگل جاتی ہے)

میڈم :۔ (ہکا بکّا ہو کر) ایں!! کاغذ کھالیا ...!!

دیدی :۔ (بڑی مسکین آواز بنا کر) مگر میڈم آپ تو دہلی جا رہی تھیں۔

میڈم :۔ ہاں جارہی تھی۔ اسٹیشن پہنچی تو معلوم ہوا ٹرین دو گھنٹے لیٹ ہے۔ میں نے سوچا تب تک ہوسٹل کا ایک چکر لگا آؤں۔

دیدی :۔ (اٹک اٹک کر) اب ٹرین آنے ہی والی ہو گی۔

میڈم :۔ اب میں دہلی نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم سب کی خبر لوں گی ... (لڑکیاں ایک ایک کر کے لہرا کر فرش پر گرنے لگتی ہیں ...) پردہ گرتا ہے) ■■

غزل

بلین نظام آبادی

اُدھار دیتے ہوئے لوگ ڈرنے لگتے ہیں
گڑھے ہیں جتنے بھی، پہلی پہ بھرنے لگتے ہیں

دباؤ خون کا کچھ روز بڑھنے لگتا ہے
ہمارے گھر میں جو مہماں اُترنے لگتے ہیں

پکارتی ہے ہمیں میکدے سے ہر بوتل
قریب آ کے بھی جب ہم گزرنے لگتے ہیں

قریب ہی سے ہمیں دیتا ہے کوئی دھکّہ
گڑھے میں بھولے سے جب ہم اُترنے لگتے ہیں

یہ شرم ہے کہ حیا ہے حجاب ہے کہ ادا
زباں سے کچھ نہیں کہتے سنورنے لگتے ہیں

ہرا ہرا سا جہاں بھی دکھائی دیتا ہے
ہمارے دوست وہیں جا کے چرنے لگتے ہیں

ہمارے پاشومیاں موت سے نہیں ڈرتے
حسیں کوئی بھی نظر آئے، مرنے لگتے ہیں

عجیب بات ہے، تلوار سے نہیں ڈرتے
عجیب لوگ ہیں بلیں سے ڈرنے لگتے ہیں

نتیجہ

ندامت کے مرقد پہ سب رو رہے ہیں
تونگر، بھکاری
نئی نسل فیشن نئے لا رہی ہے
سماج اپنی حالت پہ آنسو بہائے
ہے تہذیب کندھے پہ لاشہ اٹھائے
عقیدت کی گنگا میں پانی نہیں ہے
محبت کی جمنا تکے پیاسی پیاسی
ادب کے گلابوں میں خوشبو نہیں ہے
ہمالہ عزائم کا ہے ریزہ ریزہ
ہر اک ذہن پر پستیوں کا ہے ڈیرہ
مروّت کہیں نام کو بھی نہیں ہے
ہوا خواب مل بیٹھنا دو گھڑی کا
مساوات اب قتل کر دی گئی ہے
حقائق کو کاذب چُرا لے گئے ہیں
اندھیرے اُجالوں پہ اب چھا گئے ہیں
ندامت کے مرقد پہ سب رو رہے ہیں
مگر آج آنسو بہانا غلط ہے
یہ سب کچھ وہ ہے جو کبھی ہم نے کیا ہے
ہمارے کئے کا بدل مل گیا ہے

مصطفےٰ جمیل

★

غزل

اقبال شانہ

اُن کے ابّا جان مجھ پر اسقدر برہم ہوئے
ابتداء اُردو سے کی پھر فارسی میں آ گئے

نقل کرنا، منہ چڑانا، سر کھجانا، کودنا
بندروں کے سب طریقے آدمی میں آ گئے

شہر میں ہوں گے نہ جانے کتنے ایسے ڈاکٹر
جرمنی سے جو پلٹ کر ریچھنی میں آ گئے

تالیوں کے زور سے دشمن کو پیچھے کر دیا
جب کبھی دو چار چھکّے ملٹری میں آ گئے

جب سے شادی ہو گئی قیدی بنا ہوں دوستو
میرے دونوں ہاتھ گویا ہتھکڑی میں آ گئے

ہر طرف سے ایکدم جوتوں کی بارش ہو گئی
ہم یقیناً دوستو اُن کی گلی میں آ گئے

میں نے جب سنجیدگی سے پڑھ لیا اخبار کو
ساری دُنیا کے مسائل کھوپڑی میں آ گئے

صرف باتوں ہی سے اکثر مسئلے حل ہو گئے
مرحلے ایسے بھی شانہ عاشقی میں آ گئے

حلیمہ فردوس (بنگلور)

امتحان ہال میں تین گھنٹے

کسی بھی ہال میں وقت کا گزرنا بڑا مشکل ہوتا ہے. خواہ وہ لکچر ہال ہو کہ کانفرنس ہال ہو یا امتحان ہال. البتہ ایک ہال ایسا ہوتا ہے جہاں نوجوان اور بوڑھے تین گھنٹے گزارنے کے باوجود، ہشاش بشاش نظر آتے ہیں اور وہ ہے سینما ہال. سب سے زیادہ نحوست تو کانفرنس ہال سے آئے ہوئے صاحبان کے چہروں پر ہوتی ہے. ہر یونیورسٹی کے احاطہ میں بڑے بڑے کانفرنس ہال ہوتے ہیں جو ہمیشہ غیر آباد اور شاذ و نادر ہی آباد رہتے ہیں. "سینیٹ ہال" "کرافورڈ ہال" "غالب ہال" وغیرہ کے بارے میں آپ بھی جانتے ہیں. ایسے ہال میں جانے کا اتفاق ہمیں ہمیشہ ہوا کرتا ہے. دعوت نامہ کا احترام ہماری فطرت ہے. اس لئے ہم جس جلسے میں بھی مدعو ہوتے ہیں چاہے وہ کسی ہال میں کیوں نہ ہو وقت سے پہلے پہنچ جاتے ہیں. جہاں ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا. اس لئے ہم پریشان حال ضرور ہو جاتے ہیں. وقت کے پابند ہونے کے ناطے ہمیشہ ہمارا استقبال ہال کے در و دیوار اور بے جان کرسیاں کرتی ہیں. جس طرح خالی کرسیوں پر ہم سرکنے لگتے ہیں اسی طرح گھڑی کی سوئیاں ہمارے مقابلے میں سرکنے کی کوشش کرتی ہیں. اور اسی شغل میں ہمیں تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوتا. لوگ آتے گئے کارواں بنتا گیا کے مصداق ہال جب بھرنے لگتا ہے تو یہ گمان حقیقت میں بدل جاتا ہے کہ ہم صحیح مقام پر پہنچ گئے ہیں. اب لیجئے صاحب دو تین گھنٹوں کی تاخیر سے ہی سہی کانفرنس ہال بھرنے لگتا ہے اور اسٹیج پر غیر موزوں صاحب موزوں مقام پر بٹھا دیئے جاتے ہیں. یہ ستم ظریفی ہم چپ چاپ برداشت کر لیتے ہیں کیوں کہ آج کے دور میں ہر بڑی کرسی پر غیر موزوں شخص ہی براجمان ہے. ہماری قوت برداشت کا دامن اس وقت مسکنے لگتا ہے جبکہ سامعین مہمانِ خصوصی پر نت نئے فقرے کسنے لگتے ہیں اور اس پر ہر طرف سے گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹروں کی بوچھار ہونے لگتی ہے پھر بھی معزز مہمان تقریر کرنے سے گریز نہیں کرتا. کیوں کہ اس کا تقریری مواد بھی غیر ہضم شدہ غذا ہوتی ہے.... دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے. لیکن ایسے

مہمانِ خصوصی کئی بار ان مرحلوں سے گزر کر بھی چھانپڑ ہونک کر پینا نہیں جانتے۔

کانفرنس ہال کا منظر تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب امتحان ہال کا نظارہ کیجئے۔ امتحان ہال کا ذکر آتے ہی ہمارا حال بُرا ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ یہ گھڑیاں عالم نزع سے بھی کٹھن ہوتی ہیں۔ نگران کار اور طالب علم دونوں کے لئے فرحت اللہ بیگ نے طالب علم کی روداد سنائی تھی مگر ہم نگران کار کی حیثیت سے ان تین گھنٹوں میں ہونے والے تجربات سے آپ سب کو آگاہ کئے دیتے ہیں تاکہ صبر یعقوب کے بعد صبر نگران کار کا اندازہ ہوجائے۔

امتحان ہال کے منظر کو دیکھنے کے بعد دُنیا کے سارے نظارے پھیکے نظر آتے ہیں۔ ایک بند کمرے میں اس کی خود اپنی دنیا ہوتی ہے۔ دنیا زمانیہا سے بے خبری کا عالم اگر دیکھنا ہو تو آپ امتحان ہال پہنچ جائیے۔ کسی چہرے پر تقدس کی ضیا پھوٹ رہی ہے تو کوئی چہرہ خوف و دہشت سے پیلا پڑ گیا ہے۔ جیسے ہی پہلا گھنٹہ بجا اور آپ جوابی کا پیاں سنبھالے امتحان ہال میں قدم رکھیں تو ہر طرف سناٹا چھایا نظر آئے گا۔ سارے طالب علم دروازے پر کھڑے آخری بار یہ کلمہ دہراتے رہیں گے "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو"۔ وقت کی اہمیت کا اندازہ تو آپ صرف طالب علم سے ہی لگا سکتے ہیں کیونکہ جوابی پرچے بانٹ دینے اور آخری گھنٹہ بجنے کے بعد آپ کو یہ عاجزانہ درخواست کرنی پڑے گی کہ او بچو ترس کھاؤ ان جوابی کاپیوں پر تمہارے بغیر یہ کنواری رہ جائیں گی۔ ان کی مانگوں میں سیندور بھرنا صرف تمہارا کام ہے۔ تب آہستہ آہستہ طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوں گے۔ جیسے انہیں امتحان سے غرض نہیں بلکہ وہ آپ پر احسان کرنے چلے آئے ہیں۔ اُنہوں نے سال بھر کیا پڑھا اس کا اندازہ تو آپ نہیں لگا سکتے البتہ پندرہ منٹ پہلے اُنہوں نے جو مطالعہ کیا اس کی شہادت ان کی ہتھیلیاں اور امتحان ہال کے میز ضرور دیتے ہیں۔ ان کے ڈھول دھپے سے بچنے کے لئے آپ حقیقت کو جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی خوف کی بدولت آج ہر عہدے دار شتر مرغ کی طرح شکاریوں سے بچنے کے لئے ریت میں منہ چھپائے بیٹھا ہے اس لئے آج طالب علم پڑھائی کو چیونگم کی طرح بے مزہ سمجھ کر چبا رہا ہے جب کہ قدیم زمانے میں پڑھائی لوہے کے چنے چبانے کے برابر تھی جس سے دل گردہ رکھنے والا طالب علم ہی عہدہ برا ہو سکتا ہے۔

ادھر پرچے بٹے اور ادھر آپ کی بیکاری شروع ہوئی۔ اسے ختم کرنے کے لئے یہ نگران کار INVIGILATOR DAIRY لئے ہال کا چکر لگانے نکل پڑتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہال ٹکٹ کا دیدار بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ٹکٹ بھی کم بخت ایسی چیز ہے جس کے بغیر داخلہ منع ہے۔ بس میں ٹکٹ کے بغیر سفر نہیں کیا جا سکتا۔ امتحان ہال میں ٹکٹ بغیر امتحان دیا نہیں جا سکتا۔ کیا آدم کو بھی دُنیا میں آنے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑا ہوگا۔ ہال ٹکٹ کا بھی عجیب تماشہ ہے کوئی اسے مذہبی روپ دیتا ہے، کوئی نفاست بخشتا ہے اور کوئی بداحتیاطی سے اسے رکھتا ہے۔ ———

——— نفاست پسند اسے پلاسٹک کور میں محفوظ رکھتے ہیں تاکہ تاقیامت یہ محفوظ رہے حالانکہ اس کی ضرورت آٹھ یا دس دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایسے بھی طالب علم ہیں جنھیں ڈاک ٹکٹ کے بجائے ہال ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ کبھی ہم نے اپنے دوست کو جمع شدہ ڈاک ٹکٹ کا البم بتایا تو اُنہوں نے یہ کہکر

ہمارے مشغلے کی دھجیاں اڑائیں کہ یہ بہت پرانا شغل ہے ہم نے تو الیسی ٹکٹوں کا ایک نیا البم بنایا ہے جسے آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ واقعی اُسے دیکھنے کے بعد ہم حیران رہ گئے۔ کیوں کہ اس میں مختلف رنگوں کے کاغذات پر مختلف سنِ اشاعت کے ساتھ ایک ہی نام درج تھا۔ ہم نے کہا یہ کیا عجیب حماقت ہے۔ تو جواب ملا عجیب بھی ہے اور عظیم بھی۔ دراصل یہ ہمارے ہال ٹکٹوں کا البم ہے۔ کیوں کہ ہماری تعلیم بڑے پختہ طریقے سے ہوئی ہے۔ ایک امتحان کامیاب کرنے کے لئے ہمیں بسا اوقات دو یا چار بار بھی سعی کرنی پڑی ہے اور ایسا بھی ہوا کہ نوکری حاصل کرنے تک جب بھی مارکس کارڈ کھو گئے تو ہم نے ان ہال ٹکٹوں کی مدد سے اپنے مارکس کارڈ منگوائے ہیں۔ بھائی صاحب یہ یادِ ماضی کا ریکارڈ ہی نہیں اس کا نام تو ہم نے "سعیِ پیہم" رکھا ہے۔ اب بتائیے کس البم کا پایہ بلند ہے۔ ہم پایہ ڈھونڈتے رہے اس کا پایہ تو نہیں ملا البتہ ہمارے سر میں یہ بات آگئی کہ واقعی یہ البم کام کی چیز ہے۔

ذکر ہو رہا تھا ہال ٹکٹ کی نفاست و حفاظت کا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی بنفسہ ہال ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ ہم نے گندے ہال ٹکٹوں پر بھی دستخط کی ہے۔ یک نہ شُد دو شُد کی طرح بنا پوچھے ہی صاحب ٹکٹ اس کی آلودگی پر لکچر دینے لگے کہ جناب یہ میرا ہال ٹکٹ ہے اس قدر تعجب سے آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اِسے منّو نے پھاڑا تھا اور امّی نے بڑے سلیقے سے ابّا کے سگریٹ کی پرنی لے کر جوڑا ہی تھا کہ ببّو نے اس پر سیاہی انڈیل دی۔ غنیمت ہے کہ میرے رول نمبر پر دھبّہ نہیں آیا۔ ہم صفائی پسند اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگے کہ کہیں یہ بھی آلودہ نہ ہوگئی ہوں ہماری نظریں جب ہال ٹکٹ سے ہٹ کر صاحب ٹکٹ کے چہرے پر پہنچی تو وہ بھی داغدار تھا۔ ہمیں بڑا دُکھ ہوا۔ لیکن اُس طالب علم نے کہا کہ گزشتہ ہفتہ ہم چکن پاکس میں مُبتلا تھے تو آج ہمارا ہال ٹکٹ اس کا شکار ہوگیا ہے۔ مزید اُس نے یہ بھی کہا کہ اِس سے میرے نتیجہ پر کچھ اثر پڑنے والا نہیں ہے اگر آپ چاہیں تو میرا رول نمبر اپنے ساتھ رکھیں میرا نمبر صرف درجہ اول میں ہوگا۔ ہم حیران اس خود اعتمادی کے مجسمے کو دیکھتے رہ گئے۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ واقعی وہ درجہ اول سے کامیاب ہوا ہے۔ ہمارے ذہن کو اس وقت دھکا لگا جب کہ وہ طالب علم درجہ اول کی ڈگری رکھتے ہوئے دردر کی خاک چھانتا رہا ہے۔ آج نوکری کے لئے درجہ اول کی کامیابی ضروری نہیں بلکہ نقلی مسکراہٹ اور چہرے کا نکھار ضروری شرط ہے۔

یہ ٹکٹ کے دیدار کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے کہ کوئی طالب علم پون گھنٹے بعد ہی سے ایڈیشنل شیٹ کا تقاضہ کرتا ہے اور نگران کار کی دوڑ دھوپ یہاں سے شروع ہوجاتی ہے۔ "ایڈیشنل" بھی کیا لفظ ہے۔ اس کے اضافہ سے "دُم کے ساتھ دُم چھلّا" والا محاورہ یاد آتا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ جو طالب علم ایڈیشنل شیٹ منسلک کرتے ہیں اچھے بھلے نمبرات سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ممتحن جھلا اُٹھتا ہے اور اس جھلاہٹ میں پینتالیس نشانات لگانے کے بجائے پینتیس دے دیتا ہے۔ ایڈیشنل شیٹ کی بیماری متعدی مرض سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کسی طالب علم نے اس کا تقاضہ کیا کہ اس سے سبقت لیجانے کے لئے دوسرا آواز

دیتا ہے۔ جیسے جیسے یہ آوازیں بڑھنے لگتی ہیں ہمارا پارہ چڑھنے لگتا ہے۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق دوڑ وڑ کر ہم اُن کی مانگ پوری کرتے ہیں ہم ہمیشہ سے ایک پنت دو کاج کے قائل رہے ہیں امتحان ہال میں چکر گاتے وقت طالب علم کے پرچوں پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ وہ بہک گئے ہیں تو انھیں سنبھال لیں۔ ایک پرچے پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ بڑی صفائی سے صرف صفحے کے درمیان جواب لکھا جا رہا ہے۔ ہم نے طالب علم سے سوال یا کیا آپ شاعر ہیں، تو جواب ملا یہ تو میں نے اپنے پرچے میں نہیں لکھا پھر آپ کو اس بات کا اندازہ کیسے ہوا۔ ہم نے فرمایا آپ جواب جو نثری نظموں کی شکل میں لکھ رہے ہیں اُس سے ہم پہچان گئے۔ انہوں نے ہماری غلط فہمی س طرح دور کی کہ میرے والد محترم کوئی رشوت خور نہیں ہیں۔ میری امتحانی فیس ابا کی گاڑھی کمائی ہے۔ اس لئے یں حکومت سے اپنا حق وصول کر رہا ہوں۔ یہ بات ہمیں اچھی لگی چنانچہ ہال میں اعلان کر دیا۔

ایڈیشنل شیٹ کی کمی نہیں بچو

ایک مانگو ہزار ملتے ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ شعبۂ پولیس میں بیکاری حد سے بڑھ گئی ہے۔ امتحان ہال کی خاموشی اور مصروفیت دیکھنے کے بعد کسی امتحان گاہ پر پولیس کی موجودگی کم از کم ہمیں تو غیر ضروری لگتی ہے جہاں تک تحریری امتحان کا تعلق ہے ہر طالب علم اَلم غلم ہی سہی بڑی سنجیدگی سے تین گھنٹے لکھتا رہتا ہے اگر ان کا زبانی امتحان لیا جائے تو بیچارے اپنی آنکھ تو کیا زبان بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ نہ کردار کے غازی ہیں نہ گفتار کے البتہ آپ انہیں تحریر کے غازی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اپنی سیاہی کی قیمت وصول کر لیتے ہیں کیوں کہ پڑھیں کہ نہ پڑھیں، وہ کامیاب ضرور ہو جاتے ہیں۔

امتحان ہال میں چکر لگاتے لگاتے ہماری طبیعت تھک گئی تو سوچا کسی طالب علم سے اٹھکھیلیاں کر لیں شاید کچھ وقت گزر جائے۔ ایک طالب علم ہر پانچ منٹ بعد ایڈیشنل شیٹ مانگ رہا تھا اور ہم اس کی تیز رفتاری پر حیران تھے۔ ہمارے ساتھ امتحان ہال کے سارے طالب علم اس معمّہ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہم سے رہا نہ گیا۔ [illegible] براہِ راست پوچھ لیا کہ بابا آخر اس قدر کیا لکھ رہے ہو۔ گزشتہ تم نے کس قدر نشانات حاصل کئے تھے۔ انہوں نے بڑی معصومیت سے ہمیں مطمئن کیا کہ جناب اگر حافظہ اس قدر قوی ہوتا تو ایڈیشنل شیٹ کی ضرورت کیوں پڑتی۔ [illegible] سلسلہ وار جواب نہیں لکھتے جو بات جہاں یاد آئی "صفحہ اُلٹیے" کے ساتھ مواد لکھا اور چلتے بنے۔ ہمارا پرچہ تو بس وہی جانچ سکتے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی بھول بھلیاں دیکھی ہیں۔ ایک اور طالب علم کے جوابی پرچے پر نظر پڑی تو ہم انگشت بدنداں رہ گئے وہ صاحب جس رسم الخط میں لکھ رہے تھے ہمارے لئے کچھ اجنبی سا تھا۔ حکومت کی مہربانی اور سہ لسانی فارمولہ کے نفاذ سے ہم دو چار زبانوں کے رسم الخط سے واقف ہی تھے۔ بڑے غور سے ہم نے ان کی تحریر دیکھی تب یہ عقدہ کھلا کہ یہ تو ہندوستانی دستور سے کی منظورہ چودہ زبانوں کے

رسم الخط کا بہترین امتزاج ہے۔ ہم نے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور آگے نکل گئے۔ آپ کو پتہ نہیں اس چار دیواری میں بعض صاحبین شرٹ کے بٹن کھُلے رکھے۔ سینہ تانے، سر سے کفن کھولے ہوئے مگر ہاتھ میں ایک عدد چاقو لئے بھی داخل ہوتے ہیں۔ پرچے پر قلم سرکتا نہیں البتہ ٹیبل پر چاقو ضرور تھرکتا رہتا ہے۔ ایسے منظر کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہونے کے بجائے سو جاتے ہیں۔

اس ہال میں کیا طالب علم کیا طالبات سب کا حال دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ جس ہال میں طالبات ہوں وہاں کی نگرانی گویا آنکھوں کی عیادت ہوتی ہے۔ کوئی صاحبہ سمٹ سمٹ کر نئی نویلی دُلہن کی طرح الفاظ ناپ تول کر گن گن کر لکھتی جاتی ہیں تو کوئی معتبر و شائستہ بنی سنجیدگی سے لکھے جاتی ہیں تو کوئی کچھ بھی نہ لکھنے کی بدولت آنکھیں نکالے بے معنی انداز میں ہم پر نظریں جمائے بیٹھی ہیں جس سے ہم خود سہم جاتے ہیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے یہ ماجرا اس وقت دلچسپ موڑ اختیار کرلیتا ہے جب کوئی طالبہ نے جوابات لکھتے لکھتے بڑے اطمینان سے اپنا پرس کھول کر منہ میں "کیڈبریز" چاکلیٹ ڈال لیتی ہے اس کے بعد ان کا منہ تو بند ہوگیا لیکن ہمارا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اس واقعہ کو ہم بھُلا نہ پائے تھے کہ دوسری میز پر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحبہ سامنے پرچہ رکھے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہیں ہم نے خیال کیا کہ آنکھیں موند کچھ سوچ کر لکھ رہی ہوں گی۔ پانچ دس منٹ ہوگئے وہ اسی حال میں بیٹھی رہیں تب ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں ہارٹ اٹیک تو نہیں ہوگیا۔ ہم نے انہیں جھنجھوڑا تو وہ فوراً آنکھیں مل کر ہمیں دیکھنے لگیں اور ہم وہیں دم سادھے کھڑے سوچتے رہے کہ شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں سولی پر بھی نیند آجاتی ہے۔

جماہیاں لینے کا کام ہم زندگی کے دوسرے موقعوں کی بہ نسبت امتحان ہال میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ بحر ہال میں ہم لکھنے میں مصروف رہتے ہیں تو طالب علم جماہیاں لینے میں منہمک اور امتحان ہال میں ہم جماہیاں لیتے ہیں تو طالب علم بڑے چاق و چوبند ہو کر لکھتے رہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود غرض دنیا میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ کیا بتائیں۔ جماہیاں لیتے لیتے ہمارا منہ اس قدر کھُلنے لگتا ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر وہیل مچھلی کا گمان ہوتا ہے ایسے میں سوچتے ہیں کہ کاش ہمارے منہ کے اندر سارا امتحان ہال غڑاپ سے ڈوب جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری اور ہم مفت میں مشہور ہوجائیں سارے اخبارات میں یہ سُرخی پہلے صفحے پر شائع ہوجائے کہ وہیل نما نگران کار نے آج فلاں نمبر کے امتحان ہال کے سارے طالب علم کو نگل لیا!

جوابی کاپیاں سمیٹنے سے پہلے ہم اپنے نامۂ اعمال یعنی INVIGILATORS DIARY کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں تاکہ کوئی بھول چوک نہ ہونے پائے۔ ڈائری کے سارے خانے تو ہم بڑے سلیقے سے پُر کرتے ہیں جہاں تک طالب علم کے رول نمبر، نام اور دستخط کا معاملہ ہوتا ہے اس خانے میں ہمارا سلیقہ کام نہیں کرتا۔ طالب علم اس میں مروتی سے اس میں نمبر درج کرتے ہیں کہ اس پر بلبلی کی چوپائی کا دھوکہ ہوتا ہے۔

ادھر آخری گھنٹہ بجا ادھر ہم نے پرچوں کو سمیٹنا شروع کیا۔ بعض طالب علم بڑی عاجزانہ درخواست کرتے ہوئے ایک سکنڈ میں بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ساری عمر عشق بتاں میں کاٹ کر کوئی آخری وقت مسلمان نہیں بن سکتا۔ سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ قیامت خیز گھڑیاں کیسے گزر گئیں۔ شاید اس مصرعہ کے ورد کی کرامت ہو جیسے ہم نے تین گھنٹوں میں ایک سو اسی بار دُہرایا تھا۔

"گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے"

□□

ڈی فارم ——— ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد

۱. مقام اشاعت : ۳۱، مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ـ ۱ ۲. وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳. پرنٹر و پبلشر کا نام : سید مصطفیٰ کمال ۴. شہریت : ہندوستانی، پتہ : ۶۸ ـ ۶ ـ ۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

۵. ایڈیٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال ؛ شہریت : ہندوستانی، پتہ : ۶۸ ـ ۶ ـ ۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳۔

۶. ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصہ دار ہیں : سید مصطفیٰ کمال ۶۸ ـ ۶ ـ ۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ـ ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی معلومات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔ یکم مارچ ۱۹۸۴ء سید مصطفیٰ کمال

علیم جہانگیر (اورنگ آباد)

کھیلوں کی باتیں

دنیا کی سب سے اچھی بازی گاہ ہندوستان ہے۔ جہاں ہر طرز کے کھیل بلا جھجک، بے خوف و خطر کھیلنے کی عام اجازت ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی معتدل آب و ہوا، اور زرخیز زمین ہر موسم و رواج، طور طریق، کھیل کود اور ناچ گانوں کو پھولنے پھیلنے میں بڑی ہی معتدل واقع ہوئی ہے۔ یہاں کے عوام پہلے ہی سے آندولن، بند، مورچے، مظاہرے، ہڑتالیں، توڑ پھوڑ، گھیراؤ، جلسے جلوس اور پتھراؤ جیسے کھیلوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اب تو غیر ملکی کھیلوں کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے، کامنٹری بڑی توجہ اور انہماک سے سننے کے بھی عادی ہو چکے ہیں۔

غیر ملکی کھیلوں کی بات ہی نرالی ہے۔ یہ دور کرکٹ کا چل رہا ہے۔ کرکٹ بڑے زور و شور سے کھیلی، قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی اور پسند بھی کی جا رہی ہے۔ خاص طور پر سالانہ جشن بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ اب دن تو دن رات میں بھی سورج جیسی تیز لائٹ کی روشنی میں کھیلوں کے مقابلے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ رات غیر مہذب لوگوں کے آرام اور مہذب حضرات کے مخصوص کھیلوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

کھیل کود صحت اور تندرستی کے لئے نہ صرف ٹانک ہے بلکہ دوستی کی آڑ میں دشمنی نکالنے کا آسان اور مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ کھیل میں کھلاڑی کی بنیادی اہمیت جوش اور جذبے کی ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عوام کا طریق کار اس سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔

کھیل کے میدان سے میلوں دور ہندوستانی عوام گھروں میں ریڈیو، ٹرانسسٹر اور ٹی وی پر آنکھوں دیکھا حال سُن کر تو خود بے حال ہو جاتے ہیں۔ لیکن راہ چلنے والا بھی اسکور جاننے کے خبط میں ایسے حضرات سے اسکور پوچھ بیٹھتا ہے جنہیں اسکور کی دُم بھی معلوم نہ ہو۔ ہم نے ایسے ایسے لوگوں کو اسکور سُنتے دیکھا ہے جنہوں نے زندگی میں کبھی گلی ڈنڈا بھی کھیلا نہ ہو۔ البتہ خانگی زندگی یعنی پرائیوٹ لائف کی خانہ جنگی میں مزید گولہ باری، لاٹھی چارج اور بمباری کی ہوگی۔

ہندوستانی عوام کی کھیلوں سے دلچسپی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب کوئی کھیل ہندوستانی اور پاکستانی ٹیم کے درمیان کھیلا جا رہا ہو۔

ہندوستانی کھیل کم خرچ میں ٹیڑھے آنگن میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ اسی لئے کوئی دوسرا ملک نہیں کھیلتا ہے ہندوستانی کھیلوں کی قسموں میں چار قسمیں بہت مشہور ہیں۔ گلی ڈنڈا، چوسر، شطرنج اور آنکھ مچولی۔ لیکن ان کھیلوں کو صرف وہی لوگ کھیل اور دیکھ سکتے ہیں۔ جن کا شمار "آثار قدیمہ" میں ہوتا ہے۔ اب جو کھیل بے حد مقبول ہیں۔ وہ ہیں کبڈی، کھوکھو، کشتیاں، بل کھم اور خونی کھیل۔ جن کے ملک بھر میں وقفے وقفے سے ٹورنامنٹ بھی ہوتے ہیں اور جشن بھی منائے جاتے ہیں۔

کبڈی:۔ ہندوستان کا ایک قدیم کھیل ہے۔ اس کھیل کی عمر صرف چالیس منٹ ہوتی ہے۔ بیس منٹ پر وقفہ برائے آرام ہوتا ہے۔ دوران کھیل ہر کھلاڑی کی بولی "کبڈی، کبڈی، کبڈی" یا "ہو تو تو تو" ہوتی ہے جو عام بول چال سے بالکل الگ تھلگ ہوتی ہے۔ ناقابل فہم بھی۔

کھیل کے میدان میں جب کوئی کھلاڑی شمالاً جنوباً، تو کبھی مشرقاً، مغرباً اچھل کود کے ساتھ باہیں پھیلائیں، ہاتھ نچائے، ٹانگیں اچھالے مسلسل کھیل کی یہ بولی کہتا ہے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی اناڑی شاعر کی چھوٹی بحر کی غزل کے بے مصرعہ پر ڈسکو ڈانس کی ابتدائی مشق کر رہا ہو۔

ساڑھے بارہ میٹر لمبے اور دس میٹر چوڑے میدان میں سنٹر لائن سے ڈھائی میٹر کے فاصلے پر ایک چھونے والا ریکھا ہوتی ہے۔ جسے کبھی کبھار چھونے یا نہ چھونے پر کھلاڑیوں یا ناظرین کی ہٹ دھرمی کے باعث "ہو تو تو تو" "یں تو یں یں" بھی ہو جاتی ہے۔

کھوکھو:۔ ہندوستان کا دوسرا قدیم کھیل ہے۔ ایک ٹکڑی ایک سو دس فٹ لمبے اور چونتالیس فٹ چوڑے میدان میں زندگی اور موت کا درمیانی کھیل کھیلتی ہے۔ دوسری ٹکڑی دو پول کے درمیان بھارتیہ بیٹھک کے اصول پر چاق و چوبند زمین نشین ہوتی ہے۔ اس ٹکڑی کے کسی کھلاڑی کو راج والے کھلاڑی کا بے سرا "کھو" کا اشارہ ملتے ہی وہ یمدوت کی طرح بچاؤ والی ٹکڑی کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

کشتیاں:۔ ہندوستان کا تیسرا بڑا کھیل ہے۔ کشتیوں کی دو بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ ہندوستانی اسٹائیل ۲۔ فری اسٹائیل

۱۔ ہندوستانی اسٹائیل:۔ ہندوستانی داؤ پیچ پر مبنی کشتیوں کو ہندوستانی اسٹائیل کہتے ہیں۔ جو انسانی داؤ پیچ کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے۔ اس کھیل میں پہلوانوں کے پٹھے، ہاتھ پاؤں مضبوط ہونا چاہئیں۔ سینہ شیر کی طرح اور کمر ہرن کی طرح ہونا ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سیر کو سوا سیر پہلوان نہ صرف پچھاڑ دیتا ہے بلکہ کچا چبا ڈالتا ہے۔

پہلوانوں میں ایک خاص خوبی ہوتی ہے۔ وہ اکھاڑے میں اترنے پر اور الٹا سیدھا داؤ مارنے کے بعد اپنے

ڈنڈ اور رانیں مزدور ٹھو نکتے ہیں۔ جن کی آواز کسی ٹائر کے برسٹ ہونے والی آواز سے مشابہت رکھتی ہے۔

آج کل پہلوانوں کا دھندہ مندہ پڑ گیا ہے۔ کچھ پہلوانوں نے فلم اسٹوڈیو کو اکھاڑہ بنا دیا ہے تو چند نے دودھ میں پانی ملانے کا کھوٹا دھندہ اختیار کر لیا ہے۔ اب پہلوانوں کی جگہ دادا نظر آتے ہیں۔ بعض تو دادا کے بھی دادا واقع ہوئے ہیں۔

۲۔ فری اسٹائیل :- فارن پالیسی کے تحت لڑانے، ہاتھ مارنے، پاؤں چلانے، ڈراپ کیک لگانے، گھونسے جڑنے، ٹکریں دینے اور بے ہنگم اچھل کود کو فری اسٹائیل کشتیاں کہتے ہیں۔ جو ہندوستانی اسٹائیل کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ فری اسٹائیل کشتیاں عموماً زمین سے چند فٹ اوپر ایک اسٹیج پر کھیلی جاتی ہیں۔ تاکہ ناظرین اچھی طرح محظوظ ہوسکیں۔ ورنہ دوسری شکل میں وہ بھی فری اسٹائیل شروع کر دیتے ہیں۔ فری اسٹائیل کشتیوں کو بغور دیکھنے پر ہندوستانی مار دھاڑ فلموں کا گمان گزرتا ہے۔

بل کھم :- یہ ہندوستان کا شاہی کھیل ہے۔ اس کھیل میں قطب مینار جیسی اونچی پوری، موٹی تازی، چکنی چوپڑی اور خوب صورت بلّی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جس پر الٹ پلٹ، لوٹ پوٹ، آڑھے ٹیڑھے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ اس کھیل میں کرتب باز کو چالاک اور چُست رہنا پڑتا ہے ورنہ معمولی سستی اور غفلت کرتب بازی کا سارا کھیل بگاڑ دیتی ہے۔

خونیں کھیل :- یہ ہندوستان کا بے حد اہم اور بین الاقوامی شہرت یافتہ کھیل ہے۔ اہم اس طرح کہ ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کے خلاف بھارت چھوڑ و تحریک پر کھیلا گیا تھا۔ وہ کچا پکا کھیل تھا۔

۱۹۴۲ء میں سرفروشوں نے اس تاریخی کھیل میں بلا معاوضہ کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ۱۹۴۷ء میں سامراجیوں نے مبارکبادی کے طور پر ہندوستان کے ساتھ ہمیں یہ لعنت بھی سونپ کر راہ فرار اختیار کی۔ تب سے اب تک اس کھیل کا تمت بالخیر نہ ہو سکا اور آج ہم آپس میں کھیلتے ہیں۔ جس پر فرقہ واریت کی چھاپ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی طبقے کے افراد بھی آپس میں مقابلے منعقد کرتے ہیں۔

ملک کے طول و عرض خونیں کھیل کے ہاؤس فل کامیاب ہفتے منائے جا چکے ہیں۔ عوام کے بے حد اصرار اور فرمائش پر مکرر سکرر اس لئے کھیلے جاتے ہیں کہ شر پسند کھلاڑی گیس تیل، پٹرول بم پھینکنے اور رام بان چلانے کی مشق کہیں بھول نہ جائیں۔ ممنوعہ ہتھیاروں پہ زنگ نہ آجائے۔

خونیں کھیل ہر طرح سے فائدہ مند، پسندیدہ اور آزمودہ کھیل ہے۔ فائدہ مندیوں کہ اس کھیل کے ختم ہونے تک شرح آبادی میں قابل قدر اور قابل تعریف کمی واقع ہو جاتی ہے تفریحی عناصر کی کمی نہیں۔ متبادل چاہیں جتنا لطف اٹھائیں کوئی روکنے یا منع کرنے والا نہیں۔ پسندیدہ اتنا کہ ہر فرد بڑھ چڑھ کر کھیل دکھانے کا خواہاں ہوتا ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کھیل کو نہ صرف ہر طبقے کی مکمل حمایت اور تائید حاصل ہے بلکہ اس کھیل کی ابتداء ہوتے ہی سارے اخبارات اور ریڈیو سے کمنٹری نشر ہو جاتی ہے آزمودہ اتنے کہ برسوں سے آزمائے جا رہے ہیں، نشانہ چوکتا نہیں۔ ■


بیس نکات کی
یہ کہانی
گاؤں گاؤں
میں بجلی پانی
davp 83/498

سید رحیم الدین توفیق (حیدرآباد)

سونے کا نوالہ شیر کی نظر

بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر۔ اس پر شفیق الرحمٰن نے گرہ لگائی "تا کہ کھایا پیا پانی ہو جائے" ہمیں تو یہ کہاوت سے زیادہ مشورہ معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس نا معقول کے ذہن کی پیداوار ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ مقولہ محکمہ جنگلات کے کسی آفیسر یا سرکس کے رنگ ماسٹر کا ہے۔ اس مشورہ کے ساتھ کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے۔ حالانکہ اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے آنکھیں بھی شیر کی چاہئیں ایسے لوگ اس مقولہ پر ضرور عمل کر سکتے ہیں جن کی آنکھیں کرنجی یعنی بلی جیسی ہوں۔ ہم اکثر لوگوں سے سنتے ہیں کہ وہ بلی کی آنکھوں والا۔ اچھا اچھا وہ بلی کی آنکھوں والا یار ارے وہی جس کی بلی جیسی آنکھیں ہیں۔

جب ہم چھوٹے تھے تو اپنی اماں جان سے یہ کہاوت اکثر و بیشتر سنتے تھے۔ وہ دوسروں کو بھی شیر کی نظروں سے دیکھنے کا مشورہ دیتیں اور مثالاً ہمیں پیش کر دیتیں کہ دیکھو ہم نے اپنے بچوں کو کس طرح رکھا ہے۔ ہم اس معصوم جھوٹ پر ہنستے۔ ہمیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ ہمارے والدین ہمیں شیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ہم نے باغ عام میں کئی بار شیر سے نظریں لڑائی تھیں پاں پنجہ نہیں لڑایا۔ لیکن انھیں یہ دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ ہم شیر کی نظروں سے بدظن نہ ہو جائیں اور بغاوت کر بیٹھیں۔ اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً یہ وضاحت کرتے کہ شیر کی نظر سے ہماری ہی بھلائی اور ہاضمہ کے لئے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ سونے کا نوالہ بہت ثقیل ہوتا ہے اس طرح وہ ہمیں اپنے اعتماد میں لے کر اس سلسلے میں ہمارے تعاون کے طلبگار تھے جس طرح قومی مسائل کے حل کے لئے حکمران پارٹی اپوزیشن کو اپنے اعتماد میں لے کر ان کے تعاون کی خواستگار ہوتی ہے۔

غریب اور متوسط طبقے کے لوگ سونے کا نوالہ تو نہیں کھلا سکتے لیکن حسب استطاعت چاندی۔ تانبہ اور

پیتل کا نوالہ سونے کا ملمع چڑھا کر کھلاتے ہیں۔ لیکن وہ شبیر کی نگاہ کہاں سے لائیں کہ یہ موروثی عطیہ ہے۔ اس لئے وہ بلّی کی نظر پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ یہ بھی شیر کی خالا ہے اور اس سے ملتی جلتی ہے۔

ہمارے بچپن میں تربیت کا معیار دوسرا تھا۔ وہ شاہی دور تھا اس لئے ہر گھر پر شاہی کی گہری چھاپ تھی مشہور ہے جیسا راجہ ویسی پرجا۔ ہر گھر ایک محل اور ہر دیوان خانہ ایک دربار تھا۔ اور گھر کا مالک خود کو بادشاہ نہیں تو وزیر ضرور سمجھتا اس حساب سے اس کی بیوی ملکہ اور بچے شہزادے اور شہزادیاں۔ اسی لئے تربیت بھی اسی انداز سے کی جاتی۔ آج تو ماں باپ ایک طرف اور بچے کسی طرف ہیں کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے پوچھو تو جواب ملتا ہے، GENERATION GAP ہے۔ حیدرآباد کی بریانی اور شیروانی مشہور ہے مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک اور چیز بھی مشہور ہے واللہ اعلم۔ ہم ایک شادی میں شریک ہوئے تو دیکھا دلہن کی والدہ مہمانوں کے سامنے نہیں آر ہیں۔ دلہا والے باربار پوچھ رہے تھے کہ دلہن کی والدہ کہاں ہیں۔ ایک گھر کی بھیدی جو ہمارے قریب بیٹھی تھی بھوا میں گرہ ڈال کر بولی امی ان کی پیشانی پر تو گوندہ ہے گوندہ ایک کالا نشان ہوتا ہے جو یہ قدیم قوم اپنی پیشانی پر گدھوایا کرتی تھی لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ یہ قوم کافی دور اندیش ہو گئی ہے اس لئے اس کا رواج اب تقریباً ترک ہو گیا ہے۔ لیکن آج کل لوگ جعلی صداقتنامہ نکال کر اس قدیم قوم سے اپنا نسلی رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ اور سلسلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے گورنمنٹ نے سخت سزائیں تجویز کی ہیں انقلاب ہیں زمانے کے پتھر تیر رہے ہیں۔!

آج سے چالیس سال پہلے جنسیات ایک راز کی چیز تھی لیکن آج یہ ایک کھلی کتاب ہے۔ بچے کی شرافت اور سعادت مندی کا یہ معیار تھا کہ بچہ ہمیشہ پڑھائی لکھائی میں مصروف رہے۔ کوئی کھیل نہ کھیلے کھیل کے نام پر زیادہ سے زیادہ دور کھڑے ہو کر دوسرے بچوں کو کھیلتا دیکھ لے فلمی گانے بالکل نہ سنے کہ اس میں ساجن بالم سجنا بلما۔ پیار۔ محبت اور عشق جیسے گندے الفاظ ہوتے ہیں۔ فلمیں کبھی نہ دیکھے ہاں اگر تاریخی فلم ہے تو کوئی بات نہیں لیکن وہ بھی ہمارے ساتھ دیکھیں۔ ضروری نہیں کہ تاریخی واقعات بالکل صحیح ہوں شرط یہ ہے کہ کوئی ننگا سین نہ ہو۔ (ننگا یہاں مادر زاد کے معنوں میں نہیں ہے)

نوجوانوں کی شرافت کا سب سے بڑا معیار یہ تھا کہ شادی کے دن تک بھی اس کو میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو یہی اس کی شرافت اور معصومیت کی پہچان تھی۔ شادی کے روز اس کے بہت ہی شریف اور شادی شدہ دوست کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا کہ میاں بسم اللہ اب تم اس بچے کو زندگی کے راز سمجھاؤ۔ یا یہ ذمہ داری کوئی نانی یا دادی قسم کی بڑھیا اپنے ذمہ لیتی۔ کہ اس عمر میں تذکیر و تانیث کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بتاتی تھی۔ نوجوان بھی کافی ستم ظریف ہوتے سب کچھ جانتے ہوئے بھی یوں بھولے بن جاتے جیسے کچھ نہیں جانتے اور اس بڑھیا کے غیاب میں اس کی ناقص اور ادھوری معلومات پر قہقہے لگاتے۔

مگر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ۔ جو علم سینہ بہ سینہ چلتا ہے وہ ایسا ہی ناقص ہوتا ہے ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم نے مرغی کو جھانپ میں بند کیا ۔ ہم بار بار جھانک کر دیکھتے کہ مرغی نے انڈا دیا ہے یا نہیں اس تانک جھانک میں ایک بار ستارے مل گئے اور ہم نے وہ عمل دیکھ لیا جس کے دیکھنے پر اللہ میاں بغیر بیان صفائی لئے آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن انڈے کی خوشی میں اسے بھول کر ہم نے فوراً جھانپ پلٹ دیا ۔ مرغی کروی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی ۔ ایک سیکنڈ میں یہ دوسرا حادثہ اس پر گزرا تھا ۔ پلک جھپکتے میں وہ چیخ کر اُدھر بھاگی اور ہم انڈا لے کر ادھر ۔ ابھی انڈے کی گرمی پوری طرح کم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہیبت شروع ہوگئی ۔ اب کیا ہوگا ۔ اللہ میاں ہماری آنکھیں پھوڑ دیں گے ۔ اس پریشانی کے موقع پر ہم کسی کو اپنا مونس و غمخوار بھی نہیں بنا سکتے تھے معاملہ کافی شرمناک تھا ۔ سوچا چل کر اماں کے سامنے اعتراف گناہ کرلیں شائد وہی کچھ تدبیر کریں اور ہماری آنکھیں پھوٹنے سے بچالیں ۔ لیکن ہم سوچتے ہی رہ گئے ۔ ایک طرف اماں جان دوسری طرف اللہ میاں یا اللہ ہم کدھر جائیں ۔ اسی کشمکش میں شام ہوگئی ہماری آنکھیں پھوٹنا تو کجا بقول سرمہ فروش جالا پھولا بھی نہیں آیا دوسرے دن ہم اس بات کو بھول گئے ۔ لیکن برسوں بعد نمائش میں کھلونے کی دکان پر جب ہم نے پلاسٹک کی ایک ایسی مرغی دیکھی جو دبانے پر ایک کے بعد ایک چھ سات انڈے خارج کرتی ہے تو ہمیں وہ واقعہ یاد آگیا ۔ بڑی ہنسی آئی ۔ ہم نے سوچا زمانہ ترقی کرگیا ہے اور اب بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دی جاتی ہے یہ کھلونا بچوں کے اس سوال کا سیدھا اور آسان جواب ہے کہ انڈا کہاں سے آیا ۔

ایک اور بات سے بھی ہمیں ڈرایا جاتا کہ مینڈک مارنے سے بچے گونگے پیدا ہوتے ہیں ۔ گاؤں میں ہمارے گھر کے قریب ایک کنٹہ تھا اس میں بے حساب مینڈک تھے ایک دن ہم اس کنٹہ میں کنکر اور پتھر بازی کر رہے تھے کہ ایک بڑا کنکر ایک چھوٹے سے مینڈک کو لگ گیا ۔ مینڈک چت ہوگیا ہم نے سوچا شائد مذاق کر رہا ہے مگر اس کا وقت تو آچکا تھا کم بخت سچ مچ مرگیا اور ہم کو پریشانی میں مبتلا کرگیا ۔ ہم نے سوچا کہ یہ بہت آگے کی بات ہے جب ہوگا تب دیکھا جائے گا مگر خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ہمارے بچے ایک سال کے مکمل ہوتے سے پہلے ہی بولنے لگے ۔ دوسرا بچہ تو کافی باتونی بھی نکلا ۔ ابھی کچھ دن پہلے یہی واقعہ ہم اپنے بچوں کو سنا رہے تھے کہ کس طرح ہم نے مینڈک مارا اور وہ گونگے ہونے سے بچ گئے تو ہماری والدہ کی ممتا بھڑکی اور انھوں نے دوسرے کمرے سے پکار کر کہا "ہوتو تم جان بوجھ کر تھوڑا ہی مارے تھے" لیجئے جناب اُنہوں نے ہمیں پھر شش و پنج میں مبتلا کردیا اتنی معمولی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی ۔ واقعی اگر ہم جان بوجھ کر مینڈک کو مارتے تو نہ جانے کیا ہوجاتا ۔ اور ہم شائد اندھے ہونے سے بھی اسی لئے بچ گئے کہ مرغی کو انڈا دیتے ہوئے دیکھنے میں ہمارے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا ۔

فریاد

ڈاکٹر مجید آذر

وہ ٹیچر بن کے کچھ ایسے کھڑی ہے کہ جیسے میم کوئی لکچرر ھی ہے
لئے ہاتھوں میں وہ اپنے چھڑی ہے بس اب گردن سنئے پر اڑی ہے
مری آنکھوں میں اشکوں کی جھڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

سحر سے اٹھکے وہ مجھکو ستائے مجھے دے چائے خود انڈے اڑائے
کبھی بھیجہ کبھی مرغی پکائے ہمیشہ دال وہ مجھکو کھلائے
غضب ہے دال بھی کتنی سڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

نمک کھانے میں، میں نے کم جو پایا ذرا سا میں نے جو غصہ دکھایا
تو اس نے ہاتھ کچھ ایسا جمایا مرے گالوں کو انگارہ بنایا
بچا لو میرے سینے پر چڑھی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

گھر آکے جم گئے سسرال والے بڑی سالی مری اور سات سالے
گرے کھانے پہ جوں بنگال والے گرانی میں مجھے مولا بچالے
یہ لگتا ہے قیامت کی گھڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

چلو دیکھا ہی پڑوسن کا بتاؤ کہا سنگھار دان مجھکو بھی لاؤ
مجھے بھی تاج ہوٹل میں گھماؤ مجھے بھی ٹوسٹ اب تم ہی سکھاؤ
بلا کیسی یہ سر پہ آ پڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

یہاں رشک چمن، رشک قمر بھی ہزاروں لالہ رخ، شعلہ اثر بھی
سکون دل بھی، تسکین نظر بھی گلابی گال بھی پتلی کمر بھی
مگر حصہ مرا بابا سی کڑھی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

سبھی چڑیا گھروں کو چھان مارا عجائب گھر میں بھی وقفہ گذارا
نہ اسکا جوڑ ہے پروردگارا کہاں سے لاؤں میں نومن کا چارہ
کہ ہتھنی میرے گھر آکر پڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

بچالے مجھکو اے مولا بچالے مری بیوی کو اپنے گھر بلالے
نہ مرضی ہو اگر اے عرش والے مرے اللہ مجھکو ہی اٹھالے
کہ میری جان آفت میں پڑی ہے
میں چھوٹا ہوں مری بیوی بڑی ہے

○

ساغر شولاپوری

○

ڈیلی ملتیں مجے اب کیسے نرالے لوگاں
کبھی اُجلے کبھی گورے کبھی کالے لوگاں
سب بھانڈے میری سسرال میں جاکو چھوڑے
میرا کھاکو میرے پوچھ پڑے سالے لوگاں
ہر یتیم خانے کے ناماں پو اُٹھاکو چندے
پیٹ بھرنے کے لئے دھندے نکالے لوگاں
دھول لائف میں نہ بیٹھی تھی کبھی باڈی پہ
آخر موت مجے مٹی میں ڈالے لوگاں

○

غزلیں

نیّرہ حامد

میلا پڑا ہے سارا مکاں، بھاڑ میں جائے
جھاڑو رکھی ہے جانے کہاں، بھاڑ میں جائے

کب گیس آئے، کب ملے اسٹوو سے نجات
آنکھوں میں لگ رہا ہے دھنواں بھاڑ میں جائے

بونس ملے، تو ہار مجھے چاہیے نیا ۔ ۔ ۔؛
جی سنتے ہو؟ کہہ دیتی ہوں، ہاں، بھاڑ میں جائے

دو دن سے سارے گھر کا میں کرتی ہوں کام کاج
آئی نہیں ہے نور جہاں، بھاڑ میں جائے

سر میں ہے میرے درد کرو اس کا کچھ علاج
تم شاعروں کا "درد نہاں" بھاڑ میں جائے!

چولہا پڑا ہے ٹھنڈا، نہیں اس کا کچھ خیال
کیا کہتے ہیں وہ "برق تپاں" بھاڑ میں جائے

آٹا نہیں ہے، دال نہیں، تیل بھی نہیں!
کیا؟ بند ہے بنیئے کی دکان؟ بھاڑ میں جائے

چلّا رہی ہوں کب سے میں نیّر سنے گا کون؟
ان شاعروں کا زورِ بیاں "بھاڑ میں جائے"!

گھامڑ محبوب نگری

سچ ہے سانچ کو آنچ نہیں کچھ جھوٹ نہیں اک بال برابر
بھیا چینی ہو یا لڑکی گھر کی مرغی دال ـــــ برابر

لالم لال ہیں جو برسوں سے ہیں وہ لالم لال برابر
اور تھے جو کنگال ہمیشہ آج بھی ہیں کنگال برابر

بن موسم ہر سال برابر جائیں گے سسرال برابر
عید ہو نہ تہوار ہو کوئی اوڑھیں گے ہم شال برابر

منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنتیں اور نہ سر پر بال برابر
جسم فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ جن کے نہ تن پر کھال برابر

انجر پنجر ڈھیلے سارے دیکھتے ہیں جو دن میں تارے
اک بچے کے باپ بچارے ہوتے ہیں ہر سال برابر

اسّی سال کے بوڑھے ہوں یا بارہ سال کے بچے اب کے
دیکھ پرائے مال کو سب کے منہ سے ٹپکے رال برابر

لاکھ حکومت کے ہوں پہرے ملک سے باہر ملک کے اندر
ہوتا ہی رہتا ہے اکثر اسمگلنگ کا مال برابر

مجھ سے مت ٹکرانا پیارے دکھلا دوں گا دن میں تارے
دو گھونسے اک لات میں سارے کر دوں گا سُر تال برابر

متولی نہ مجاور قاضی کیا ہے ہمارا گھر نہ اراضی
ہم تو ہیں گھامڑ اپنا ماضی مستقبل اور حال برابر

کمزور طبقات کی بہبودی

وعدے جنھیں حقیقت کا جامہ پہنایا گیا

مسٹر این۔ ٹی۔ راما راؤ کی زیر قیادت ریاستی حکومت کمزور طبقات کو معاشی اور سماجی ترقی دینے کا عزم صمیم کئے ہوئے ہے۔

چاول ۲ روپیہ فی کلو:۔ ۸۰۔۱ لاکھ غریب خاندان فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس اسکیم پر ۸۰۔ اکروڑ روپے بطور امداد دیئے گئے۔

غریبوں کیلئے مکانات:۔ صرف پختہ مکانات فراہم کئے جائیں گے۔ جھونپڑیاں فراہم کرنے کے پروگرام کو ختم کر دیا گیا ہے۔ تقریباً ستر ہزار پختہ مکانات کی تعمیر مکمل کر لی گئی ہے۔ ۱۲ء۱ لاکھ مکانات مرحلہ وار تعمیر کئے جائیں گے جن پر ۸۸ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ جملہ ۴ء۲ لاکھ مکانات تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ ایک لاکھ مکانات کی تعمیر کے لئے غریبوں میں زمینات تقسیم کئے گئے۔

تعلیم | دوپہر کے کھانے کی فراہمی سے ۴۵ء۳۷ لاکھ غریب طلباء کو فائدہ پہنچتا ہے۔ درج فہرست اقوام، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے ماقبل میٹرک اور مابعد میٹرک ۵۲ء۱۳ لاکھ طلباء کو ۴۷ء۲۳ کروڑ روپے کے صرفہ سے تعلیمی وظائف دیئے جا رہے ہیں۔

معاشی امدادی پروگرام | درج فہرست اقوام و درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے ۳۰ء۱ لاکھ خاندانوں کو ۲۲۵ کروڑ روپے پر مشتمل معاشی امداد مہیا کی گئی۔ ۸۸ء۲ لاکھ پسماندہ طبقات کے خاندانوں کو ۸۱ء۱۴ کروڑ روپے بطور حاشیائی رقم امداد فراہم کی گئی۔ ۹۹ء۷ کروڑ روپے وظیفہ پیرانہ سالی کے لئے فراہم کئے گئے۔

بہبودی خواتین | آبائی جائیداد میں عورتوں کو مساوی حقوق دینے کے لئے قانون مدون کیا گیا۔ موازنے کی رقم کو دوگنا کر دیا گیا۔ سال ۸۳۔۱۹۸۲ء میں مختص کردہ ۱۱ء۷ کروڑ کی رقم کو ۸۴۔۱۹۸۳ء میں ۱۳ء۵۲ کروڑ روپے تک بڑھا دیا گیا۔ سالانہ ۱۸۰۰ سے کم آمدنی والی بیواؤں کو ماہانہ ۵۰ روپے وظیفہ منظور کیا گیا۔

جسمانی معذورین | علحدہ نظامت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ٹریننگ کم پروڈکشن مراکز، ترویجی اور وسٹا کھا ٹیم میں قائم کئے گئے۔

"ریاستی حکومت کمزور طبقات کی بہبودی کی پابند ہے"

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حیدرآباد

DIPR

"زندہ دلانِ بمبئی" (افتتاحی نشست)

"تحریک چلانا، انجمنیں بنانا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ خلوص، نیک نیتی اور صدقِ دل سے اس کی خدمت کی جانی چاہیئے"
(پرنسپل ڈاکٹر منشی صاحب)

ہمیں اپنی توجہ مزاحیہ ڈراموں کی طرف بھی کرنی چاہیئے۔ (انجم رومانی)

۲۲ر فروری بروز بدھ شام ۵ بجے مہاراشٹر کالج لائبریری ہال، ڈاکٹر عبدالقدوس منشی صاحب کی صدارت میں زندہ دلانِ بمبئی کی افتتاحی نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ رفیعہ شبنم عابدی (صدر زندہ دلانِ بمبئی) نے مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ نثر نگاروں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ شعر کہنا نثر کے مقابلے میں آسان ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مقصد اردو ادب کی خدمت اور نوجوانوں میں طنز و مزاح سے دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ مسز نورالعین علی صاحبہ نے افتتاح کی رسم انجام دیتے ہوئے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ بمبئی میں ایک عرصہ سے ایسی انجمن کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی جو یہاں کے مصروف لوگوں کو ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع فراہم کرسکے اور زندہ دلانِ بمبئی کا قیام اس بات کا مظہر ہے۔ جناب انجم رومانی صاحب (مدیر روزنامہ اردو ٹائمز) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ زندہ دلی تو انسانی فطرت میں شامل ہے اور آج کے دور میں زندہ رہنے کے لئے بھی زندہ دلی کے ساتھ بڑے سخت مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم بیرونی ماحول کا جائزہ لیں تو ہمیں طنز و مزاح کی کیفیت دکھائی دیگی۔ انجم صاحب نے یہ بھی کہا کہ طنزیہ شاعری اور مزاحیہ ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہمیں مزاحیہ ڈراموں کی طرف خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے جس کی آج ضرورت ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبدالقدوس منشی صاحب نے جامع اور پُراثر تقریر کی اور انجمن زندہ دلانِ بمبئی کے اراکین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس بحرانی دور میں کوئی ادارہ کوئی تحریک یا انجمن بنانا بہت بڑی بات ہے لیکن کامیابی اور صحیح خدمت اُسی وقت ہوسکتی ہے۔ جب خلوص، نیک نیتی و صدقِ دل سے کام کیا جائے ——— خان محمد اشتیاق (جوائنٹ سیکریٹری) نے اپنا مزاحیہ مضمون "اخباریہ" پڑھا پھر رفیعہ شبنم عابدی (صدر) یوسف ناظم، منیر علی، حامد اقبال، خان اخلاق، شاہد شیخ، ضمیر الحسن اور ریاض احمد خان نے بالترتیب طنزیہ و مزاحیہ مضامین پڑھے آخر میں جوائنٹ سیکریٹری خان محمد اشتیاق نے شکریئے کی رسم ادا کی اور نشست کے برخواست ہونے کا اعلان کیا۔

مجتبیٰ حسین کا دورۂ یوروپ و امریکہ

نئی دہلی ۲۷ر فروری ۸۴ء۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین اردو مجلس برطانیہ کی دعوت پر ۲۷ر فروری ۸۴ء کو لندن روانہ ہوگئے۔ جہاں وہ اردو مجلس کے زیراہتمام مخدوم محی الدین مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والی تقاریب کی صدارت کریں گے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی کئی ادبی انجمنوں کی جانب سے ان کے اعزاز میں استقبالیہ تقاریب بھی منعقد ہو رہی ہیں۔ مجتبیٰ حسین یوروپ کے کئی ممالک کا دورہ کرنے کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا بھی جائیں گے۔ وہ اپریل ۸۴ء کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان واپس ہوں گے۔

سلسلہ ص ۵۸ پر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

زندہ دلان حیدرآباد کے زیرِ اہتمام اس بار سالانہ تقاریب کی بجائے عالمی جشن مزاح منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ تقاریب حسبِ معمول اپریل میں منعقد ہوں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے بیرون ملک کے مزاح نگاروں کے پروگرام کو قطعیت دینے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اکثر حضرات نے رائے دی کہ یہ عالیشان عالمی جشن سرما کے موسم میں منعقد ہو تو دنیا کے مختلف ممالک سے وفود کی شرکت میں سہولت ہوگی۔ چنانچہ اب عالمی جشن مزاح ۱۶ تا ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء کو عظیم الشان پیمانہ پر منعقد ہوگا ـــــ اس ضمن میں قارئین شگوفہ سے التماس ہے کہ جشن کے انعقاد کے سلسلہ میں اپنی تجاویز ارسال فرمائیں۔ اور اسے کامیاب بنانے میں مدد کریں۔

○ شگوفہ کا "ہندوستانی مزاح نمبر" مختلف وجوہات کے باعث وقت پہ شائع نہ ہوسکا۔ اب قطعی طور پر یہ خصوصی نمبر جون کے آخری ہفتہ میں شائع ہوگا۔

دہلی اور پٹنہ میں جشن ظرافت

اردو اکیڈیمی دہلی کی جانب سے شاندار پیمانے پر ۲۰ مارچ کو "جشن مزاح" منعقد کیا جارہا ہے جس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند فرمائیں گے۔ اس جشن میں حیدرآباد کے ممتاز مزاح نگار جناب نریندر لوتھر، جناب طالب خوندمیری اور جناب مسیح انجم کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ جشن جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی کاوشوں کی وجہ سے منعقد ہورہا ہے

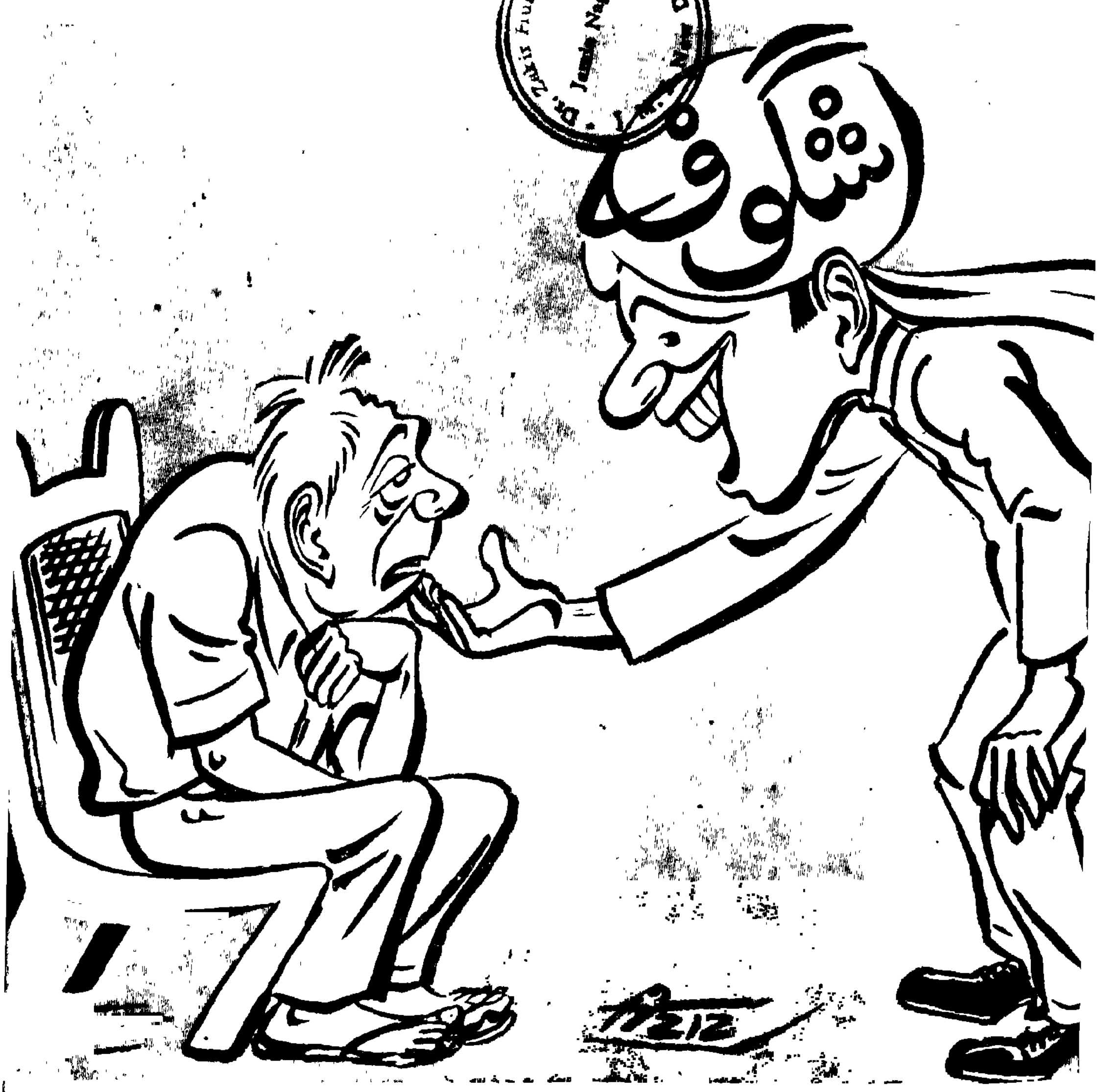
۷ اور ۸ اپریل کو پٹنہ میں عالیشان پیمانے پر کل ہند جشن ظرافت کا انعقاد عمل میں لایا جارہا ہے۔ اس جشن میں حیدرآباد سے ممتاز مزاح نگار شرکت کررہے ہیں۔ یہ جشن جناب رضا نقوی واہی کی خصوصی دلچسپی کے نتیجہ میں پچھلے چند سال سے پٹنہ میں منعقد ہورہا ہے۔

جناب یوسف ناظم کی صاحبزادی کی شادی

بمبئی ۷ ار فروری مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم کی صاحبزادی سیما کوثر کی شادی خانہ آبادی شیخ عبدالملک کے ساتھ باندرا کے سینٹ تھیریسا ہائی اسکول میں بحسن وخوبی انجام پائی۔ اس موقع پر مہمانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں قابلِ ذکر مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، احمد ذکریا، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، شیام کشن نگم، ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور، سلمیٰ صدیقی، نفیل جعفری، ڈاکٹر ممی رضا، استاد اللہ رکھا خاں، حسن کمال، عزیز قیسی، ریاض احمد خاں، "ظ" انصاری، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، فلم ساز یس یم ساگر، اور مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ حیدرآباد وغیرہ ہیں۔ اس موقع کے لئے ہندوستان کے ممتاز مزاح نگار شاعر رضا نقوی واہی نے ایک نظم بھی کہہ کر بھیجی۔ (روزنامہ انقلاب ۸ ار فروری ۱۹۸۴ء)

11 Copy 3 **SHUGOOFA Hyderabad-1** Postal Regd. No. H/HD 6
March 1984 Phone : 57716

شگوفہ



APRIL 1984

Rs

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۷
شمارہ ۴

اپریل ۱۹۸۴ء

ایڈیٹر : سیّد مصطفیٰ کمال

کتابت : محمد عبدالرؤف، مسعود انور
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان حیدرآباد

قیمت فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ :
شگوفہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز - معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 557716

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

مالِ مفت (انشائیے)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

قاضی جی دبلے (رپورٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوِرن ... (منظومات)

شگوفہ کا "ہندوستانی مزاح نمبر"

جون ۱۹۸۴ء کے آخری ہفتہ میں شائع ہوگا

مہمان مدیر :ـــــــــــ یوسف ناظم

● اُردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی ۔ تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی ۔ اڑیا ۔ ملیالم ۔ سندھی ۔ کنڑی ۔ میتھلی اور راجستھانی کے مزاحیہ نثری ادب کا جائزہ

● منتخب مضامین کے تراجم ● اردو کے دس مصنفین کے خود نوشت خاکے اور مضامین ۔

● ملک کے مشہور تنقید نگاروں کی آرار اور انٹرویو ● اردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل ببلوگرافی

اور ● مقالہ نگاروں کی تصاویر ۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات ● قیمت : ۲۰ روپے مجلد ۲۵ روپے

سالانہ خریداروں سے دس روپے **اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرمالیجیے ۔**

پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا

وجاہت علی سندیلوی

مرزا نخچیر

مرزا بڑی بدحواسی سے گھر میں گھسے تو کواڑوں کو اس زور و شور سے بند کیا کہ صرف ان کی چُولیں کیا مکان کی بُنیادیں بھی ہل گئیں۔ کُنڈی بند کر کے اندر پہونچے تو ترکاری کے جھولے کو تخت پر پٹکا اور شیروانی اتار نے سے زیادہ نوچ کر الگنی کی طرف ایسی تاک کر پھینکی کہ وہ الگنی کو پھاند کر کھڑونچی سے جا لپٹی۔ اس کے بعد اظہار وحشت کے لئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی ٹوپی اتار کر بیوی کے پاندان پر دے ماری اور اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے صحنچی میں ٹہلنے لگے۔

اس ساری کارروائی کا خاموش تماشائی صرف گھر کا کُتّا شیرا تھا جو پلنگ کے نیچے اطمینان سے لیٹا ہوا ایک آنکھ بند کئے ایک کھولے، مرزا کی حرکات بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مرزا کی نظریں اس پر پڑیں تو انھیں اس کے اس طرح دیکھنے میں ایک کھُلا ہوا انداز تمسخر نظر آیا۔ وہ چلبلا کر اس کی طرف بڑھے اور اس کے قریب پیر پٹخ کر چلّائے یہاں سے ناشدنی! کہا تو وہ بڑی شان استغنا سے مٹکتا، دُم ہلاتا، باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔ مرزا کو اس کی یہ ادا پھوٹی آنکھ نہ بھائی بلکہ اس خیال سے دل پر چوٹ سی لگی کہ دیکھو یہ ٹکے کا جانور بھی مجھے مسخرا سمجھ کر منہ چڑاتا ہے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شیرا دُم نہیں ہلا رہا ہے بلکہ دراصل اپنی دُم سے انھیں چونچ دکھلا رہا ہے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پیر کا جوتا اتار کر اس سے زیادہ اس کی دُم کو تاک کر مارا۔ جوتا کسی سو میل کی رفتار سے پرواز کرتا ہوا کتے کی دُم سے کئی گز فاصلے پر پانی سے بھرے ہوئے تسلے میں غڑاپ سے جا ڈوبا اور اس آواز سے اوپر چھتری پر بیٹھے ہوئے کبوتر پھر پھڑا کر اڑ پڑے۔

ایک جوتے کی مفارقت نے مرزا کو دوسرا جوتا بھی اتار کر پلنگ پر بیٹھ جانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اب اُنھوں نے ہانک لگائی۔ "ارے کہاں ہو چھمن کی ماں؟" جواب نہیں ملا تو پھر چیخے۔ "سانپ سونگھ گیا ہے سب کو اس گھر میں!" اور پھر مقابلتاً کچھ دھیمے لہجے میں بڑبڑائے "کیا سب اللہ کے پیارے ہو گئے اکٹھا قبرستان میں؟"

"کیوں کیا ہوا؟ آج ترکاری لینے گئے تو بس بازار ہی کے ہوگئے۔ لڑکے باسی دال کھا کر اسکول سدھارے ہیں۔ آپ کو کیا؟"

"لڑکے اسکول سدھارے ہیں اور میں جیل خانے سدھار رہا ہوں۔ اب تو بر آئی آپ کی منہ مانگی مراد؟"

کیا ہذیان بک رہے ہیں آپ؟ جیل جانے کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔"

آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر دل گردے کے زندہ ہیں اب تک! چہ خوش! اور ابھی جو تھانے کے سپاہی آئیں گے ہم کو پکڑنے تو بس آپ کی اس صفائی پر کہ ہمارے دل گردہ نہیں ہے' وہ ہمیں چھوڑ کر منہ پیٹتے واپس چلے جائیں گے۔"

"کیسا تھانہ اور کیسے سپاہی؟ کیا اس موئے بانگڑو داس کے یہاں شطرنج کھیلتے ہوئے دھر لئے گئے؟ یہی کہتی تھی . . ."

"بس بس خدا کے غضب سے ڈریئے۔ میرا ہر دوست آپ کو لُچّا اور شہدا ہی نظر آتا ہے۔ خبردار ہم نے کسی کی شان میں کوئی ناشائستہ الفاظ سُنے۔"

"خود ہی پولیس اور تھانے کا قصّہ لے بیٹھے ہیں آپ؟ پولیس لچّوں اور شہدوں کے پیچھے نہیں گھومتی ہے تو اور کس کے؟ —"

"اب یہاں آکر پوری بات سُنئے گا یا وہیں سے حلق میں لاؤڈ اسپیکر لگائے سارے محلّہ میں میری بداعمالیاں اور بدقماشیاں نشر کرتی رہیئے گا۔"

"اور ہانڈی کو چولھے پر جلنے کے لئے چھوڑ دوں؟"

چولھے میں گئی ہانڈی' ہمیں نہ ہوں گے تو ہانڈی کیا آپ کا سگا شیرا کھائے گا؟"

"اے لونج! شیرا میرا سگا کیوں ہونے لگا۔ سگا ہوگا تمہارا جو ایسے خبیث کتّے پر جان چھڑکتے ہو۔"

"ہم جان چھڑکتے ہیں شیرا پر؟ اجی حد کر دی جھوٹ کی تم نے بھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ کتنا مبارک دن ہوگا وہ' جب اس نجاست کے پوٹ سے ہمارا گھر پاک ہو جائے گا۔ ہم تو دُعا مانگتے ہیں کہ وہ کم بخت کل کو مرتا ہو تو آج ہی مَر جائے۔"

"کیوں کسی بے زبان کا صبر سمیٹتے ہیں آپ؟ —"

"اجی وہ بے زبان ہے اور ہم زبان دراز! ڈیڑھ ہاتھ کی تو دُم ہے اُس سالے کی۔"

"ہزار بار منع کر دیا کہ اس قسم کے واہی تباہی رشتے مت جوڑا کیجئے!"

"تو کٹوا کیوں نہیں دیتیں دُم اُس کی؟"

"اُس کی دُم آپ کو کیا کھلتی ہے ؟"

"یہ بھی ایک ہماری ہی گویا کہ ہمیں اُس کی دُم سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ ہم اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی بھٹیار خانے میں رہتے ہیں !"

"توبہ توبہ ! ناک میں دم کر دیتے ہیں آپ ! اپنی اوٹ پٹانگ بکواس سے !"

"سرکاری سپاہی ہمارا وارنٹ گرفتاری لئے محلے میں گھوم رہے ہیں۔ اور یہ عورت کتے کی دُم کا قصّہ لئے ہماری جان کو رو رہی ہے۔"

دُم کا قصّہ میں نے شروع کیا تھا ؟"

"اور کیا ہم نے جس کا ایک پیر حوالات کے اندر ہے ؟"

بیگم باورچی خانے سے باہر نکل آتی ہیں۔" دشمنوں کے کان بہرے یہ حوالات کون جارہا ہے اور کیوں ؟"

"دشمنوں کے کان بہرے بھی ہوں گے تو بھی آپ کی چیخ پکار سے سُن لیں گے کہ یہ ناچیز فدوی، حقیر، دلگیر، المتخلص بہ نخچیر جیل جارہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ؟ جیل میں بھی کوئی مشاعرہ ہورہا ہے۔"

"جیل میں مشاعرے کی بھی ایک ہی رہی۔ اجی بیگم صاحبہ جیل میں غزلیں نہیں پڑھی جاتیں بلکہ چکیاں پیسی جاتی ہیں۔ آپ نے مولانا حسرت موہانی کا وہ مشہور شعر نہیں سُنا ...... مشقِ سخن اور چکی کی مشقت والا "

بیگم مرزا کے پاس ہی پلنگ پر آکر بیٹھ جاتی ہیں اور پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں" اب خدا کے لئے بتا بھی چکئے کہ کیا بات ہے۔ جب بھی گھر میں قدم رکھتے ہیں آپ مجھے دہلانے کے لئے کوئی نیا شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"گویا کہ ہم اپنی خوشی سے تقریباً محض تبدیلِ آب و ہوا کے لئے جیل جارہے ہیں اور وہاں کسی مشاعرے میں غزل پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

للہ اب رحم کیجئے اور بتا بھی ڈالیئے کہ خدا نخواستہ جیل جانے کی کیا بات ہے۔"

"جان بوجھ کر انجان بنتی ہیں آپ ! اجی وہی افیم کا معاملہ پھر میرے کسی دشمن نے کھڑا کر دیا ہے !"

"بیس سال ہو چکے ہیں اس موئے معاملے کو اور ابھی تک وہ کسی بھوت کی طرح آپ کے سر پر سوار ہے۔"

"اجی میں نے بھی تو وہ تھپڑ دیا تھا اس افیمچی کے منہ پر کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا اس کے باپ کو۔"

"لیکن گھر آکر ہلدی اور چونا تو آپ ہی کے تھوپا گیا تھا۔"

"اجی وہ تو میں تھپڑ مارنے کی جھونک میں خود گر گیا تھا نالی میں۔"

"اچھا تو یوں ہی سہی کہ آپ نے کسی افیمچی کے تھپڑ مار دیا تھا تو اب بیس سال کے بعد وہ معاملہ پھر کیسے کھڑا ہو سکتا ہے ؟"

" تھپیڑ مارتے وقت میں نے اسے اپنا نام اور پتہ کب بتا دیا تھا۔ وہ کم بخت فہیمی اتنا زبردست تھپیڑ کھانے کے بعد نچلا کب بیٹھا ہوگا۔ میرا نام اور پتہ دریافت کرتا پھرا ہوگا۔ اور اب جب میرے کسی دشمن نے اسے بتا دیا ہوگا تو اس نے میرے نام کا وارنٹ کٹا دیا ہے ۔"

" لیکن یہ واقعہ تو مرادآباد کا تھا اور اب آپ بیس سال سے لکھنؤ میں ہیں اور آپ نے اپنا تخلص بھی دلگیر بدل کر نخچیر رکھ لیا ہے ۔"

" اجی ایک ہی مملکت کا معاملہ ہے اور پھر چار گھنٹوں میں مرادآباد سے لکھنؤ میل گاڑی آتی ہے ۔"

" ہر دوسرے تیسرے مہینے جب کسی کانسٹبل کو دیکھ لیتے ہیں آپ فوراً اس جھاڑو پھرے فہیمی کا قصّہ یاد کر کے ہولنے لگتے ہیں ۔"

" قسم ہے آپ کے سر کی ابھی جب میں بازار سے واپس آ رہا تھا تو بانگڑو داس کے چبوترے پر خفیہ پولیس کے کچھ لوگ میرا اور میرے والد بزرگوار مرحوم کا نام لے کر بلکہ ایک سرکاری کاغذ سے پڑھ پڑھ کر میرے گھر کا پتہ پوچھ رہے تھے ۔"

کوئی باہری دروازے کی کنڈی کھڑکھڑاتا ہے۔ بیگم دروازے کے پاس چلی جاتی ہیں اور مرزا ہڑبڑا کر پلنگ کے نیچے گھس جاتے ہیں۔

" کیا مرزا نخچیر ولد مرزا دلاور جنگ تشریف رکھتے ہیں؟"

بیگم " کون صاحب ہیں ؟"

" کیا مرزا صاحب باہر تشریف لا سکتے ہیں ؟"

" کیا کام ہے ؟"

بانگڑو داس " بھابی تسلیم ! میں ہوں بانگڑو داس ! میرے ساتھ بھکڑی مل ببن خاں اور کچھ لوگ گھاسٹر پرشاد کے لئے بھائی صاحب اور آپ کا ووٹ مانگنے آئے ہیں ۔" ـــــ " تو اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ جدھر آپ اُدھر ہم ۔" ـــــ کئی آوازیں " شکریہ ! بہت بہت شکریہ ! بھولیے گا نہیں گھاسٹر داس کا انتخابی نشان گدھا ہے ۔"

بیگم مسکراتی ہوئی صحنچی میں واپس چلی آتی ہیں۔ مرزا صاحب کپڑے جھاڑتے ہوئے پلنگ کے نیچے سے برآمد ہوتے ہیں ـــــ بیگم نے مسکرا کر پوچھا ـــــ " یہ کیا ؟ یا وحشت ! " ـــــ مرزا نے غصّے کا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

" اجی وہ شیرا کا بچہ میرا ایک جوتا کہیں اُٹھا لے گیا ہے اسی کو پلنگ کے نیچے ڈھونڈھ رہا تھا ۔"

ـــــ

عابد معز

بس ! بس !!!

(مرا شہر لوگاں سوں معمور کر)
شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

کوئی قوت برداشت کے مادہ کو بڑھانا چاہتا ہے تو اسے حیدرآباد کی بسوں میں سفر کرنا چاہیئے - یہ ہمارا صرف خیال ہی نہیں دعویٰ بھی ہے جس نے بھی حیدرآباد کی بسوں میں سفر کیا ہو اُسے جہنم کی تکالیف برداشت کرنے میں دشواری نہیں ہوگی. آیئے دیکھیں آپ ہمارے خیال سے متفق ہیں یا نہیں !

بس حاصل کرنے کے لئے بس اسٹانڈ آنا پڑتا ہے. بس اسٹانڈ کا محل وقوع گاہے ماہے تبدیل ہوتا رہتا ہے. کبھی اس پان کے ڈبے کے سامنے تو کبھی اُس ہوٹل کے پاس، بس اسٹانڈ بلا علم و اطلاع منتقل ہوجاتا ہے اسی لئے بس اسٹانڈ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے. ہمارے شہر میں حیران و پریشان لوگ اپنا اثاثہ اٹھائے بس اسٹانڈ کا پتہ پوچھتے نظر آتے ہیں. خدارا ! بس اسٹانڈ کبھی اس خیال سے نہ آئیں کہ بس وقت پر مل جائے گی، سفر وسیلہ ظفر اور آرام دہ ہوگا. بس اسٹانڈ کو ______ کمر باندھ کر مصمم ارادہ کے ساتھ آنا پڑتا ہے کہ جو بھی مشکلات درپیش ہوں گی ان کا مقابلہ جوانمردی سے کیا جائے گا. احتیاطی تدابیر اختیار کرنا فائدہ مند ہوتا ہے. سفر کے دوران مضبوط ڈرل کے کپڑے پائیدار ہوتے ہیں. "جینس" کپڑوں کی ایجاد شاید ہمارے شہر کی بسوں میں سفر کا نتیجہ ہے. بھول کر بھی پیروں میں چپل نہ پہنیں. چپل ٹوٹ جاتی یا کسی کے پاس رہ جاتی ہے. چپل پہننے سے پیر محفوظ بھی نہیں رہتے کچلے جانے کا اندیشہ رہتا ہے. اسی لئے مضبوط فوجی جوتے کارآمد ثابت ہوتے ہیں. پیسے اور کام کی چیزیں اوپری جیبوں سے نکال کر چور جیبوں میں چھپا لینا پڑتا ہے. ہاتھ کی گھڑی اور چشمہ اتار کر محفوظ کرلینا دانشمندانہ اقدام ہوتا ہے.

بس اسٹانڈ پر مسافر وقت معلوم کرکے نظام الاوقات دیکھتا ہے جو تضیع اوقات کا کام ہے. بسوں کا نظام الاوقات صرف دیکھنے کی چیز ہے. حقیقتاً بسیں اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں. جب چاہے، جیسے چاہے چلتی ہیں. جہاں چاہے رکتی ہیں. گھنٹوں کوئی بس نہیں آتی اور جب بسیں آتی ہیں تو ایک کے پیچھے ایک، تین چار بسیں قطار بنا کر آجاتی ہیں.

کبھی دن بھر میں ایک ہی بس چلتی ہے تو کبھی وہ ایک بس بھی نہیں چلتی۔ قصہ مختصر بس اسٹانڈ پہنچ کر انتظار کرنا پڑتا ہے انتظار کسی کا بھی ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بعض حضرات انتظار کی کوفت سے بچنے کے لئے اخبار بینی اور سیاست پہ بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ نوجوان محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔ محبت کی شادیوں میں بس اسٹانڈ پہ کی گئی محبت کا تناسب یقیناً زائد ہوگا! خیر صاحب، ہمارے شہر میں بس کا انتظار منٹوں سے گھنٹے، گھنٹوں سے دن اور دنوں سے ایک عمر کے لئے ہوتا ہے۔ بقول ایک حیدرآبادی شاعر ؎

شب کو بس اسٹانڈ پہ ایک نوجوان نے یہ کہا ٭ صبح دم آیا تھا میں شب کا اندھیرا ہوگیا
ایک مردِ پیر نے یہ سن کے فرمایا میاں ٭ میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہوگیا

بس اسٹانڈ پہ ہدایت لکھی رہتی ہے کہ بس کا انتظار قطار بنا کر کیجئے۔ کہتے ہیں "کیو" بنانے کا طریقہ نازیوں کی پیداوار ہے اسی لئے ہمارے جمہوری شہر میں "کیو" بنانے کا رواج ہی نہیں ہے۔ ہر مسافر اپنے آپ کو بس میں پہلے سوار ہونے کا حقدار سمجھتا ہے اور ہر مسافر کی اپنی ایک الگ کیو ہوتی ہے۔ چند مسافرین ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہوکر انتخابات سے پہلے حزب مخالف جماعتوں کی طرح ایک کیو بناتے ہیں جو اقتدار کی طرح بس آتے ہی بکھر جاتی ہے۔ جدھر سے بس آتی ہے تمام مسافرین کی نظریں اُدھر ہی اٹھی رہتی ہیں۔ دور سے بس دکھائی دینے والی شئے قریب آکر کبھی لاری تو کبھی آٹو رکشا بن جاتی ہے۔ ماضی میں بسوں کا مخصوص رنگ ہوا کرتا تھا جس سے شناخت آسان ہوتی تھی لیکن آج کل ہمارے شہر میں بسیں مختلف رنگوں سے مزین تجارتی اشیاء کا اشتہار بنی پھرتی ہیں۔ "اشتہاری بسوں" سے ایک طرح کی سہولت ہے ہمارا لڑکا "چاکلیٹ کی بس" میں اسکول جاتا ہے تو ہم دردِ سر کی دوا کے اشتہار والی بس میں دفتر جاتے ہیں۔

بس کی نشاندہی کے بعد دوسرا تکلیف دہ مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ مسافرین بس کا روٹ نمبر تلاش کرنے لگتے ہیں روٹ نمبر اور مقام کا نام، کلاسکی اور جدید آرٹ کے امتزاج اور ہمہ اقسام کے رنگوں سے اس طرح لکھا جاتا ہے کہ پڑھے لکھے اور قابل مسافر کو بھی اَن پڑھ حضرات کی طرح بس میں سوار لوگوں سے استفسار کرنا پڑتا ہے۔ "بس کہاں جائے گی" مختلف اشخاص مختلف جگہوں کا نام بتلاتے ہیں۔ اسی دوران بس نامعلوم مقام کے لیے روانہ ہوجاتی ہے بس) کی روانگی کے بعد "بس کے منتظرین میں رائے زنی ہونے لگتی ہے"۔ میرے خیال میں یہ نوتین کی "بس تھی"۔ بس پہ روٹ نمبر اور جگہ کا نام اچھی طرح لکھنا چاہیئے"۔ روٹ نمبر اور مقام کا نام اردو میں بھی لکھنا چاہیئے" لیکن ہمارے شہر کی بسوں اور اردو زبان میں ازلی دشمنی چلی آرہی ہے کسی بھی بس پر کہیں بھی اردو لکھی نہیں جاتی۔

ہمارے شہر میں بس اسٹیج پر نہیں ٹھہرتی۔ ہمیشہ ہی اسٹیج سے آگے یا پیچھے رُکتی ہے۔ مسافرین بس میں سوار ہونے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور جیسے ہی مسافرین بس کے نزدیک پہنچتے ہیں، بس اُن سے دور جانے کے لئے دوڑ پڑتی ہے۔ بعض وقت اسی بھاگ دوڑ میں مسافر کی منزل مقصود بھی آجاتی ہے۔ ایک حیدرآبادی مسافر نے بسوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے گھر پہنچ کر ہانپتے ہوئے بیوی سے کہا "ڈارلنگ! آج میں نے بسوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے پچاس

پیسے بچائے ہیں۔" یہ بات سن کر بیوی نے شوہر کو ڈانٹا؟ "اگر آپ آٹو رکشا کے پیچھے دوڑ لگاتے تو چار روپیہ بچا سکتے تھے!! خیر! کبھی کبھار کوئی ایک بس اسٹیج پر آ کر رکتی ہے تو تمام مسافرین بس کے دروازہ پر یلغار کر دیتے ہیں۔ عموماً بس کے دروازہ میں سے صرف ایک آدمی آیا جا سکتا ہے لیکن اس وقت نہ جانے کیسے وقتِ واحد میں کئی آدمی آتے اور جاتے ہیں۔ اکثر اوقات بس کے دروازہ کو چھونا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ بعض وقت دروازہ کے قریب پہنچتے ہیں کہ بس نکل پڑتی ہے۔ بس تو خیر سے چلی جاتی ہے لیکن دیگر مسافرین میں سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ گردن کو کسی کے بغل سے کھینچنا پڑتا ہے ایک ہاتھ کو چار لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانا پڑتا ہے دوسرا ہاتھ جو کسی کے بستہ میں الجھا رہتا ہے، صاحب بستہ کی گالیاں سنتے ہوئے بستہ میں سے ہاتھ نکالنا پڑتا ہے ٹانگوں کو چھڑانے اور ان پر کھڑے ہونے کی کوشش میں گرنا پڑتا ہے محنت کے بعد جب اپنے آپ کو اکٹھا کر لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ منی پرس غائب ہے۔ چشمہ ٹوٹ چکا ہے شرٹ پھٹ گیا ہے اور پتلون اتر چکا ہے اس صدمہ جانکاہ سے مالک حقیقی کی طرف لوٹنے کے بجائے بے عزتی کے ساتھ پھر سے اپنے ہوش و حواس یکجا کر کے دوسری بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے شہر کی بسوں کی خاصیت ہے کہ وہ مسافرین سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی شاذ و نادر ہی کوئی خالی بس صحرا میں نخلستان کی طرح نظر آتی ہے۔ شہر حیدرآباد کے مسافرین کی خوبی ہے کہ وہ دروازوں میں لٹک کر سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ بس خالی بھی رہے گی تو فٹ بورڈ پر کئی مسافرین لٹکتے نظر آتے ہیں دروازہ کے پاس لوگ ڈنڈوں کو پکڑے لٹکتے ہیں۔ چند لوگ انہیں پکڑ کر جھولتے رہتے ہیں تو ایک دو اشخاص لٹکنے والوں میں اٹکے ہوتے ہیں یا لٹکتے ہوئے مسافرین پر باقاعدہ سوار ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی مسافرین کو بس کی کھڑکیوں سے لٹکتے ہوئے تو بعض مسافرین کو بس کی چھت پر بیٹھے سفر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ دروازوں پر ہجوم کے باعث حیدرآبادی مسافر دروازہ کے علاوہ کھڑکیوں اور چھت کی راہ سے بھی بس میں وارد ہوتے ہیں۔ دروازہ سے بس میں داخل ہونے کے لئے کرتب بازی کرنی پڑتی ہے کسی کے بغل تو کسی کی ٹانگوں میں تڑپ کر نکلتے ہوئے کسی اور کے ہاتھوں سے پھسلنا پڑتا ہے۔ اس طرح کہنے کو ہم بس میں سوار ہو جاتے ہیں لیکن حقیقتاً ہم دروازہ کے قریب مسافرین میں اٹکے ہوتے ہیں۔ مشکل سے ایک پیر کو آگے بڑھا کر دوسروں کے پیر پر رکھتے ہیں۔ اچھل کر بس کے اندر لگے ڈنڈے کو پکڑتے ہیں۔ دوسرے پیر کو قریب کرنا چاہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس پیر کے ہمیں حقدار نہیں ہیں ہمارے علاوہ اور بھی مسافرین اس پیر کے وارث ہیں۔ اسی اثناء میں بس کو ایک زور دار جھٹکا لگتا ہے اور ہم خود بخود بس کے اندر پہنچ جاتے ہیں، اس جھٹکے کے طفیل چہرے پر ایک جلتے ہوئے سگریٹ کا نشان لگ چکا ہوتا ہے۔ نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ نظر آتا ہے لیکن ہاتھ کے مالک کا پتہ نہیں چلتا۔ آہستہ آہستہ ہمارا غصہ فرو ہونے لگتا ہے۔ پسینہ پونچھتے اور سانسیں درست کرنے کے درمیان [illegible]

جھک کر دیکھتے ہیں۔ ایک چھوٹا لڑکا، کاندھے پر کتابوں کا بوجھ لادے ہماری ٹانگوں کے درمیان سے طلوع ہو رہا ہے۔

بس میں سوار ہونے کے بعد ہماری تکالیف کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ تکالیف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ شہر حیدرآباد کی بسوں میں بیٹھنے کے لئے سیٹ نہیں ملتی۔ اس کا احساس انھیں بھی ہے جو بسیں چلاتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے شہر میں "اسٹانڈنگ بسیں" چلائی جاتی ہیں جس میں مسافرین بیٹھتے نہیں بلکہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے سفر کرتے ہیں۔ دوسری بسوں میں برائے نمونہ چند سیٹ موجود رہتی ہیں۔ سیٹ پر ایک پہلو بیٹھنا پڑتا ہے۔ سیٹ سے ٹیک لگائے ایک اور مسافر کھڑا ہوتا ہے۔ خاتون مسافر کی گود میں اٹھے بچے کے پیر کا انگوٹھا سیٹ پر بیٹھے مسافر کے چہرے کا طواف کرتا رہتا ہے۔ ہمارے شہر کی بسوں کی سیٹ پر زیادہ دیر بیٹھنے سے چند ایک بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ایک وقت ایسا ہی مرض لے کر ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "لوگوں کے ساتھ آپ کے غلط تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے کان پکڑ کر انھیں یقین دلایا کہ یہ مرض شہر کی بسوں میں سفر کرنے کا نتیجہ ہے ان تکالیف کے باوجود چند سیٹوں کے لئے بس میں مسافرین کے درمیان "میوزیکل چیر (MUSICAL CHAIR)" جیسا مقابلہ ہوتا ہے۔ بس میں لوگ اس مسافر کی تلاش میں رہتے ہیں جو بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے اور اُٹھنے کے لئے بے چین ہے۔ اِدھر اُدھر سے چار چھ مسافر سیٹ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ سیٹ پر بیٹھا مسافر اپنی منزل مقصود آتے ہی سیٹ سے اٹھ جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اُٹھتا ہے دور کھڑے مسافر اپنا بستہ یا اخبار سیٹ پر پھینک کر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب ہو نہیں پاتے۔ اطراف کے تین چار مسافر بیٹھنے کے لئے جھپٹ پڑتے ہیں لیکن خدائی فوجدار بن کر کوئی اور ہی مسافر کہیں سے سیٹ پر ٹپک پڑتا ہے۔ اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اکثر نوجوان اپنی سیٹ سے اُٹھتے ہیں۔ اِدھر اُدھر سے چند مسافرین جھپٹ پڑتے ہیں پھر وہی نوجوان "ابھی منزل دور ہے" کہہ کر سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔

ہمارے شہر کی اکثر بسیں بہت پرانی اور خستہ حال ہیں۔ کھڑکیوں میں آئینے اور نہ ہی پردے لگے ہوتے ہیں۔ کھڑکی سے بارش، دھوپ، دھول، سامان اور مسافروں کی سہولت بخش آمد و رفت رہتی ہے۔ سیٹ ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے۔ جس میں کھٹمل بسیرا کرتے ہیں۔ چھت میں کئی سوراخ ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ کیلے اور لوہے کے ٹین کے ٹکڑے مسافروں کو زخمی کرنے کیلئے لگے ہوتے ہیں۔ بس چلتی ہے تو ہر پرزہ لرزہ بہ اندام رہتا ہے۔ جس سے بس میں ایک مخصوص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس آواز میں بس کے انجن کی آواز معدوم ہو جاتی ہے مسافرین میں برقی رَو کی طرح بس کی آواز کی لہریں گزرنے لگتی ہیں۔ ہمارے شہر کی بسوں میں سفر کرنے سے جسم میں سفری اور تعاش پیدا ہوتا ہے۔ بس چلتی کم جھٹکے زیادہ لگاتی ہے۔ ریل گاڑی کے سفر میں بھی اتنے جھٹکے نہیں لگتے جتنے ہمارے شہر کی بسوں میں لگتے ہیں۔ مسافر کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ کبھی ادھر گر رہے ہیں تو کبھی اُدھر لڑھک رہے ہیں۔ کبھی سر تو

کبھی گھٹنے کو مار لگ رہا ہے۔ ایسے ہی روزمرّہ کے حادثات سے نمٹنے کے لئے بسوں میں فرسٹ ایڈ باکس رکھنے کا رواج ہے۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے لڑکے سے دریافت کیا فرسٹ ایڈ کسے کہتے ہیں؟ جواب ملا "شہر کی بسوں میں ڈرائیور کے پیچھے خالی چوکونی ڈبہ فرسٹ ایڈ باکس کہلاتا ہے"۔ خواتین کے تعلق سے ہر کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے شہر کی بسوں میں پچیس فیصد گوشہ مقرر تھا جسے بڑھا کر چالیس فیصد کر دیا گیا ہے۔ جب ہمدردی حد سے بڑھتی ہے تو بس "مخصوص برائے خواتین" بن جاتی ہے۔ یہ ہمارے شہر کی بسوں کی نسوانی خوبی ہے۔

بس دو اشخاص کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ ایک ڈرائیور جو بس چلاتا ہے اور دوسرا کنڈکٹر جو مسافروں کو چلاتا ہے۔ ڈرائیور ہمیشہ سگریٹ پیتا رہے گا۔ بس میں جلی حرفوں میں "تمباکو نوشی منع ہے" لکھا ہوتا ہے لیکن ہمارے شہر کی بسوں میں تمباکو نوشی ڈرائیور سے ہی شروع ہوتی ہے۔ کنڈکٹر پان کھاتا یا پھر چھالیہ، چیونگم سے شغل کرتا ہے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر دونوں مل کر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے چائے پیتے رہتے ہیں۔ مسافرین کو ڈرائیور سے زیادہ کنڈکٹر سے واسطہ رہتا ہے۔ کنڈکٹر ہمیں کم سے کم وقت میں ٹکٹ کے پیسے نکالنے کے لئے کہتا ہے۔ بس میں پیسے نکالنے کے لئے سرکس کرنی پڑتی ہے۔ اس پر گرتے، اس پر پڑتے کچھ ریزگاری نیچے گرا کر ٹکٹ کے لئے پیسے دیتے ہیں۔ کسی بھی کنڈکٹر کے پاس چلر نہیں رہتا۔ کنڈکٹر صاحب ٹکٹ کے پیچھے بقیہ رقم لکھ کر دستخط کر دیتے ہیں کہ بس سے اترتے وقت اپنے پیسے واپس لے لیں۔ لیکن صاحب بس سے اترتے وقت مسافرین اپنے آپ کو یکمشت اتار نہیں لیتے انھیں پیسے واپس لینے کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ ہمارے شہر میں ہر دوسرے اسٹیج سے پہلے مسافرین کو ٹکٹ دینے کا مرحلہ مکمل کر لینا پڑتا ہے۔ ڈرائیور کی کرتب بازی اور کنڈکٹر کی سستی وقت سے پہلے ٹکٹ دینے میں حائل رہتی ہے اسی لئے اکثر مقامات پر شہر کی بسیں مسافرین کو ٹکٹ دینے کے لئے رکی رہتی ہیں۔

ہمارے شہر میں بسوں میں سفر کرنا جرمانے کے ساتھ قید بامشقت سزا ہے۔ جرمانے سے ہماری مراد ٹکٹ خریدنے سے ہے بس میں آپ کو سیٹ ملے نہ ملے اور بھلے ہی آپ ایک ٹانگ پر کھڑے سفر کریں ٹکٹ بہرحال خریدنا پڑتا ہے۔ ویسے کبھی کبھار کچھ پیسے کنڈکٹر کے ہاتھ میں رکھ کر بغیر ٹکٹ سفر کر سکتے ہیں۔ ہمارے شہر میں کئی قسم کی بسیں چلتی ہیں۔ آرڈنری، پاسنجر، فاسٹ پاسنجر، اکسپرس سوپر اکسپرس، ڈیلکس، سوپر ڈیلکس، لکژری، سوپر لکژری، سیمی لکژری، ایشیاڈ، ایرکولڈ وغیرہ وغیرہ۔ مختلف بسوں کا کرایہ مختلف ہوتا ہے لیکن تمام بسوں میں مسافروں کو ایک جیسی طرح کی سہولت اور آرام حاصل ہے ہر قسم کی بس کی رفتار بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ بسیں بہت آہستہ چلتی ہیں۔ سامان سے لدی پھندی لاریاں بس کو پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہیں۔ بعض وقت سیکل سوار بھی ہاتھ ہلاتے آگے نکل جاتے ہیں۔ کہتے ہیں آئیل بچانے کے لئے بسوں کی رفتار کو متعقل کر دیا گیا ہے بعض وقت متعقل رفتار کی وجہ سے مضحکہ خیز صورت پیش آتی ہے چند بسیں مسافرین کو ساتھ لئے چڑھاؤ پر چل نہیں سکتیں۔ مسافرین چڑھاؤ پر بس دھکیلتے اور اتار پر بس میں سفر کرتے ہیں۔

جو مشکل بس میں سوار ہونے کے لئے ہوتی ہے اتنی ہی پریشانی بس سے اترنے کے لئے ہوتی ہے۔ منزل آنے سے پہلے اپنے آپ اور سامان کو دروازہ کے پاس پہنچانا ہوتا ہے۔ بعض وقت ہجوم کی وجہ سے دروازہ کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک بار دروازہ کی تلاش میں ہم، لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں سے ہوتے ہوئے ایک مسافر کی گود میں جا بیٹھے تھے۔ ہر اسٹیج پر بس روکنے اور نہ روکنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ مسافرین جنھیں اسٹیج پر اترنا نہیں ہوتا کہتے ہیں "پہلے ہی سے لوگ زائد ہیں یہاں بس نہ روکو" اور جنھیں اترنا ہوتا ہے بس ٹھہرانے کے لئے چیختے چلاتے، گھنٹی بجاتے اور چھت پیٹتے ہیں نتیجتاً بس کبھی بھی اسٹیج پر نہیں رکتی۔ ہمیشہ ایک نئی منزل کے پاس ٹھہرتی ہے۔ صحیح معنوں میں بس رکتی نہیں رینگتی رہتی ہے۔ جیسے ہی ہم اُترنے کے لئے دروازہ کے پاس پہونچتے ہیں دوسرے مسافر ہمیں اٹھا کر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ سڑک کی خاک چوم کر کبھی پاکٹ تو کبھی دوسرے اثاثہ سے محرومی کا احساس ہوتا۔ ہے۔ ٹکٹ کے پیچھے لکھے پیسے کنڈکٹر کے پاس ہی رہ جاتے ہیں جسم کے ہر حصہ میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ ہم جہنم سے بھاگ آئے ہیں!

OO

رؤف خوشتر (بیدر)

ماہی کی تباہی

برسہا برس سے نہ برس کر، اب کے سوکھوں پر ترس کر، ایسے برسا کہ گلیوں کے گڑھے تالاب کو شرما گئے۔ ان کو لبالب دیکھ کر دریا پانی پانی ہوگیا۔ اس سال بادلوں نے سورج کو یوں چھپا رکھا تھا جیسے ساہوکار اصلی بہی کھاتہ چھپاتا ہے۔

دریا کے چڑھتے ہی سارے ماہی گیر میدان میں اُتر گئے۔ ہمارے دوست جو نیم نقاد خطرۂ ادب ہیں، بضد تھے کہ اب کے مچھلیوں کا شکار کیا جائے۔ لفظ "اب کے" کو اتنا طول کھینچا۔ جیسے اب تک صرف شیر چیتے کا ہی شکار کیا جاتا رہا ہو۔

ہم نے ٹالنا چاہا کہ امن پسند شہری ہونے کے ناطے — ہم چھری کانٹا نہیں رکھتے۔
کہنے لگے اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے سنا ہے برساتی مینڈکوں کی طرح برساتی مچھلیاں آگئی ہیں اور لب ساحل تیرتی رہتی ہیں اور بھولے بھالے لوگوں کی طرح فوراً ہاتھ لگتی ہیں۔ لوگ ٹوکریاں لے جاتے ہیں اور بھر بھر کر لاتے ہیں۔
ہم نے اب تک جل بن مچھلی سُنا تھا اب جال بن مچھلی والی بات سامنے آرہی تھی۔ لیکن ہم تو ہر معاملہ میں کیل کانٹے سے لیس ہوکر نکلنے کے عادی رہے ہیں بھلا مچھلی پکڑنے جائیں اور چھڑی کانٹے نہ ہوں۔ فوراً اپنے شکاری دوست کے پاس پہنچے۔ وہ حسب سابق دوسرے شکار کی تاک میں تھے کہ ادھار کس سے لیں۔ اس ہفتہ کے قرعۂ فال یا ان کے جال میں ہم آگئے۔ ہم نے کچھ روپے دیئے اور ان کا پیچھا چھڑا کر چھڑی کانٹا لیا۔ دیتے ہوئے کہنے لگے۔
مچھلی لاؤ یا نہ لاؤ لیکن اس تاریخی ہتھیار کو صحیح سلامت لانا۔ مجھے اس سے ایک تجربہ کرنا ہے۔"
"کیسا تجربہ؟"
"اماں یار۔ اس چھڑی کانٹے کو میں نے ایک ایسے شکاری سے خریدا ہے۔ جن کا کہنا ہے کہ ان کا سالا اس کو لے کر مچھلی کے شکار کو گیا تھا۔ شکار کے دوران مچھلی نے کچھ ایسے جھٹکے دیئے کہ وہ چھڑی سمیت پانی میں گر گئے۔

جس دن سے اُنہوں نے ماہی گیری بلکہ بھنوئی گیری سے توبہ کر لی اور پھر کبھی بھنوئی کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔ تم تو جانتے ہو کہ تمہارے بھی ایک عدد سالے صاحب ہوا کرتے ہیں۔ میں نے زیادہ قیمت دے کر اس سالا شکن چھڑی کو خریدا ہے۔

الغرض جب ہم اُن سے رخصت ہو رہے تھے تو وہ چھڑی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے

ع چھڑی نہیں میرا دل ہے دیکھو دیکھو ٹوٹے نا

ہم مکان آکر مچھلیاں لانے کے لئے تھیلیاں جمع کرنے لگے۔ نصف بہتر اس وقت نصف بدتر ہو رہی تھیں۔

" شام صرف تھیلیاں ہی تھیلیاں آگئیں مچھلیاں نہیں۔ آخر آپ مارکٹ سے خرید کر کیوں نہیں لاتے۔ یہ سارے جھیل کے جھمیلے کیوں؟

" بیگم یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ آسانی سے دستیاب چیزوں سے گریز کرتا ہے۔ بچوں کو دیکھو دس پیسے میں پتنگ مل سکتی ہے لیکن وہ کٹی پتنگ کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے کسی اسکوٹر سے ٹکرائیں، چھت سے گریں۔ جو مزہ پتنگ کے لوٹنے میں ہے وہ خریدنے میں کہاں؟ بالکل اسی طرح جو مزہ مچھلی پکڑنے میں ہے وہ خریدنے میں کہاں؟

بیگم نے دوسرا جال بچھایا۔

کتنی تکلیف ہوتی ہے پکانے میں۔ یہ مچھلیاں آخر کس کام کی؟

" بیگم مچھلیاں تو مچھلیاں۔ اب لوگ گھٹلیاں نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ میں کل ہند مسابقتی امتحان دے رہا ہوں۔ دماغ کو طاقت کی ضرورت ہے مچھلیاں کھا کھا کر بنگالی اور کیرالا والے کامیاب ہوتے ہیں۔ اب کے ہم بازی لے جائیں گے۔

جب ہم اپنے ادیب نما دوست کے ہمراہ دریا پہنچے تو وہاں ماہی گیروں کا اتنا جم غفیر تھا اور اتنی چھڑیاں دریا میں ڈال دی گئیں تھیں کہ اوسطاً ہر ایک کے حصے میں ایک دو مچھلیاں ہی مل جاتیں۔ ایک صاحب مچھلیوں کو خطاب کرتے ہوئے محمد رفیع کی روح کو تکلیف پہنچا رہے تھے یعنی گا رہے تھے:

چلے آؤ جی، چلے آؤ جی، چلے آؤ موجوں کا لے کر سہارا
ہو رہے گا ملن، یہ ہمارا، تمہارا رہے گا ملن یہ ہمارا تمہارا

ابھی ہم چھڑی کا کانٹا دریا میں ڈال ہی رہے تھے کہ شور و غل مچ گیا۔ دیکھا کہ دو ماہی گیر بغل گیر ہو کر لڑ رہے ہیں کہ ساحل پر تڑپنے والی مچھلی اُن کے کانٹے کا شکار رہے۔ ہر دو اُس پر حق جتلا رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سارے ماہی گیر دو گروپ میں تقسیم ہو گئے۔ بعض غیر جانبدار حضرات ریفری کے فرائض انجام دینے لگے۔ اور یوں دریا کا ساحل ایک مچھلی کے لئے مچھلی بازار بن گیا۔ ہم نے سنا تھا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن یہاں تو ایک نیم جان مچھلی سارے معاشرے کو گندہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی آپسی رقابت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کُتا آگے بڑھ کر اُس تڑپتی مچھلی کو منہ میں دبائے فرار ہو گیا۔ یہ منظر ہم سے دیکھا نہ گیا

ئی بدستور جاری تھی۔ ہم نے بھی ماہی گیری سے توبہ کرلی۔ واپس شہر آکر اپنے دوست کو چھڑی کا تحفہ دیا۔ وہ
ں گلے لگاتے ہوئے چھڑی کو چومتے رہے۔

مارکٹ سے مچھلیاں خریدلیں اور اپنے دوست کے بھائی کے ہاتھوں گھر پہنچائی۔ رات گئے جب
پہنچے تو بیگم حسبِ سابق نصف بدتر بنی ہوئی تھیں۔

ہم نے کہا کہ بہت تھک گئے ہیں اس لئے منانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ جی ہاں اس لڑکے نے مجھے سب
نا دیا ہے کہ کتنے روپے میں آپ نے دوکان سے مچھلی خریدی ہے۔ چلئے مچھلی صاف کرکے کاٹیئے ورنہ میں
کے آگے رکھ دیتی ہوں۔

ہم بھیگی بلی سے بن کر ساری رات مچھلی کاٹنے صاف کرنے، دھونے اور پکانے میں صرف کردی اور
ں کی تباہی کے جھٹکوں سے آئندہ کے لئے ماہی گیری کا خیال بھی جرم قرار دے لیا۔ □ □

جوہر سیوانی

کچھ گھٹ گیا کچھ رہ گیا

سلسلہ برسات کا کچھ کٹ گیا کچھ رہ گیا
مینڈکوں کا شور وغل کچھ گھٹ گیا کچھ رہ گیا
شیخ جی سیلون میں جب بیٹھے تجلی کٹ گئی
ان کے سر کا بال تو کچھ کٹ گیا کچھ رہ گیا
ہے کرم اہلِ سیاست کا کہ ذات و نسل میں
دورِ نو کا آدمی کچھ بٹ گیا کچھ رہ گیا
دورِ نو کا گوند بھی دو نمبری ثابت ہوا
پوسٹر دیوار پر کچھ سٹ گیا کچھ رہ گیا
حسن کے مکتب کا عاشق بھی ادھورا ہے ابھی
بے حیائی کا سبق کچھ رٹ گیا کچھ رہ گیا
فوجِ صبر و ضبط جو ہمت سے تھی آراستہ
لشکرِ جور و ستم کچھ ڈٹ گیا کچھ رہ گیا
آپ نے بھیجا غریبوں کو جو دینے کے لئے
دینے والوں میں وہ زر کچھ بٹ گیا کچھ رہ گیا
جب سے نس بندی کی خاطر کچھ رقم ملنے لگی
بڑھتی آبادی کا دم کچھ گھٹ گیا کچھ رہ گیا
شاعری کی جھیل میں آبِ سخن تھوڑا ہی تھا
فکر و فن کا کھیت تو کچھ پٹ گیا کچھ رہ گیا
شاعرِ اعظم کی بیساکھی کسی نے توڑ دی
جوہر ان کا نازِ قد کچھ گھٹ گیا کچھ رہ گیا

طوقِ لعنت

کر رہے ہیں آپ بیٹی کو جو رخصت بن جہیز
اس لئے میں دے رہا ہوں مشورہ لے لیجئے
ہو گی جب سسرال میں سختی تو جلنے کے لئے
ماچس اور اک ٹن کراسن تیل بھی دے دیجئے

○

جوہر کا مشورہ ہے ہر اک والدین کو
بیٹی کا جب بیاہ کریں تو جہیز میں
سامان جتنا ہو سکے اتنا تو دیں مگر
بیٹی کی رخصتی میں گھر اپنا نہ بیچ دیں

جناب شیخ ہر شب جاتے ہیں مسجد سے میخانے
بنے ہیں جو مسلماں رندان کو راہ پر لانے
وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تسبیح آتے ہیں
اذاں جب صبح کی ہو جاتی ہے تو لوٹ جاتے ہیں
وہ رندوں کو قریبِ جام بھی آنے نہیں دیتے
شرابِ تلخ پی کر ان کو لہرانے نہیں دیتے
خدا کا نام لیتے ہیں وہ میخانے میں جا جا کر
چلے جاتے ہیں پیاسے رند تقریروں سے گھبرا کر
مسلمانوں کو لطف و عیش سے جینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے

عبدالرحمٰن مدبّر (بنگلوری)

مچھر

جی ہاں میں مچھر ہوں ارے میرا نام سُنتے ہی آپ نے یہ ناک کیوں چڑھالی اچھا میرے کہتے ہی پھر سیدھی کرلی۔ ارے بھائی میں آپ کا دشمن نہیں ہوں جیسے آپ گائے، بیل، بکری، مرغی اور مچھلی کے دشمن نہیں ہیں۔ آپ انھیں بڑے پیار سے پالتے ہیں اور اُن سے بہت محبت کرتے ہیں پھر بھی آپ انھیں ذبح کر دیتے ہیں کیوں؟ اپنے پیٹ کی خاطر۔ میں بھی آپ سے بے حد محبت کرتا ہوں میرا بھی تو پیٹ ہے میں بھی اپنے پیٹ کی خاطر ایک یا زیادہ سے زیادہ دو قطرے خون پی لیتا ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کتنا چھوٹا ہوں اندازہ لگائیے میرا پیٹ کتنا چھوٹا ہوگا اور بتائیے میں آپ کا زیادہ خون کیسے لے جا سکتا ہوں۔ (ویسے آپ کے پاس لیٹروں خون ہے) لیکن میں آپ کو ذبح تو نہیں کرتا جس طرح کہ آپ کرتے ہیں!! اور ویسے میری غذا ایک ہی تو غذا ہے آپ کسی کو ذبح کئے بغیر بھی اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ ہم خون تو نہیں پیتے غلط کہتے ہیں آپ، آپ بھی تو خون چوستے ہیں اور وہ بھی اپنوں کا (یقین مانئے ہم کبھی اپنوں کا خون نہیں پیتے) گھبرائیے نہیں میرا اشارہ صرف آپ کی طرف نہیں بلکہ مجموعی طور پر حضرت انسان کی طرف ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کیا میں نے غلط کہا ہے کیا ہر امیر غریب کا خون نہیں چوستا؟ خون صرف چوسا ہی نہیں بلکہ پیا بھی جاتا ہے کہیں بھائی بھائی کا خون پیا جاتا ہے تو کہیں بیٹا باپ کا گلا کاٹ رہا ہے۔ میں تو کسی کا خون نہیں بہاتا۔ میں صرف دو قطرے خون کے پی لیتا ہوں جس سے آپ کی صحت پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا میں بعض اوقات دارننگ بھی تو دے دیتا ہوں آپ کے کان کے قریب آکر اپنی میٹھی زبان میں کہہ تو دیتا ہوں آپ ہاتھ سے جو سمجھتے ہیں اپنا ہاتھ اُٹھا کر ہلا دیتے ہیں اس سے آپ کا کچھ کیا مطلب ہو میرے لئے تو آپ کی اجازت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے آپ کو چھیڑنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے ویسے کہ میں آپ کے جسم کے

کسی حصے پر بیٹھ جاتا ہوں تو آپ اپنا ہاتھ اُٹھا کر زور سے مارتے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ کا ہاتھ مجھ تک پہنچے میں وہاں سے فرار ہو چکا ہوتا ہوں آپ اپنے آپ کو پیٹ لیتے ہیں کبھی یہاں کبھی وہاں اور کبھی کبھی تو آپ خود کو تھپڑ بھی رسید کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی آپ کا نشانہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں مر جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ایک منٹ میں اپنے آنسو تو پونچھ لوں اچھا تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ میں مذاق کرتا ہوں لیکن سچ کہتا ہوں میں یہ مذاق صرف اپنے پیٹ بھرنے تک کرتا ہوں میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آپ سے بہت محبت کرتا ہوں کیا میں آپ کا بُرا چاہوں گا۔ "از اِٹ پاسبل"۔

دیکھئے میں یہ کام جان ہتھیلی پہ رکھ کر کرتا ہوں کتنا مشکل کام ہے یہ صرف ایک وقت پیٹ بھرنے کے لئے اپنی جان بھی گنوانی پڑتی ہے۔ ذرا سوچ کر بتائیے کیا آپ نے کبھی اتنی مشکل سے روٹی کمائی ہے اتنی مشقت اٹھائی ہے کبھی ؟ آپ کیا سوچیں گے آپ کو تو وقت کی توڑنے کی عادت ہے ۔

آپ میں ذات پات اُونچ نیچ بھی دیکھا جاتا ہے لیکن ہم میں نہ کوئی مذہب ہے اور نہ اُونچ نیچ ہم سب ایک ہیں ہمارے ہاں فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوتے ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں کبھی لڑتے جھگڑتے نہیں ۔ دیکھ انسان تو آپ ہیں لیکن "انسانیت" آپ میں نہیں بلکہ ہم میں ہے اشرف المخلوقات کا خطاب آپ کو بیکار دیا بلا اس خطاب کے اصل حقدار تو ہم ہیں۔ ذرا سوچئے میری اب تک کی کہی ہوئی باتوں میں کوئی بات غلط ہے۔ اگر سچ کہا جائے تو آپ کا سر شرم اور ندامت سے اتنا جھک جانا چاہیئے کہ پھر نہ اُٹھے لیکن آپ تو انسان ہیں او آپ میں اب شرم کا مادہ ذرا برابر بھی نہیں رہا ہو سکتا ہے تھوڑی بہت دکھاوے کی شرم ہو۔

میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جو بقول آپ کے آپ کے سوا کوئی نہیں جانتا کیا کہتے ہیں اُسے ۔ آں ہاں راز کی باتیں میں آپ کا راز بھی جانتا ہوں۔ جی ہاں آپ کا ڈر یئے مت بے عیب ہوتے ہوئے بھی سب کے سامنے آپ کا عیب نہیں نکالوں گا راز کو راز ہی رکھوں گا ۔ !

آپ ہی کی طرح ہم میں بھی فیملی پلاننگ کو ترجیح دی جاتی ہے ہم میں عورتیں فیملی پلاننگ کی زیادہ مشتاق ہوتی ہیں آپ جانتے ہیں ہم اوڈو ماکس (ODOMOCS) سے دور رہتے ہیں ہماری عورتیں اوڈوماکس لگا کر سو جاتی ہیں اور اس طرح ہمیں اُن کی قربت کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں رات کی سیا کا عاشق ہوں اور سینما گھروں میں رات ہی کی سی سیاہی ہوتی ہے اور میں وہاں بھی موجود ہوتا ہوں جس آپ کو بھی احساس ہوگا اور اس طرح مجھے فلمیں دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے لیکن میں آپ کی طرح وقت او پیسے برباد کر کے فلمیں نہیں دیکھتا۔ فلم دیکھنے کے ساتھ وہاں پیٹ کی آگ بجھانے کا بھی موقع فراہم ہوتا ہے جانتے ہو مجھے ستیہ جیت رائے کی فلمیں بہت پسند آتی ہیں کیوں کہ اُن کی فلموں میں فلم بین فلم دیکھنے زیادہ [illegible] اور میرا پیٹ سمجھ گئے نا۔

بہت دن ہوئے ستیہ جیت رائے کی فلمیں نہیں آئیں لیکن حال ہی میں کمال امروہی نے ستیہ جیت رائے کی کمی پوری کر دی۔ کمال امروہی کی تازہ ترین تخلیق "رضیہ سلطان" میں فلم بینوں کی زیادہ تعداد سوتے ہوئے ملتی ہے۔ یہی ہماری معراج ہے۔

آپ ہی کی طرح میں بھی دلیپ کمار کا مداح ہوں ایک بات ہے کہ میں دلیپ کمار کی فلموں میں کسی کا خون پی کر کسی کو قتل نہیں ڈالتا کیوں کہ میں خود بھی فلم دیکھنے میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ اپنے پیٹ کا خیال ہی نہیں ہوتا واقعی دلیپ کمار کی فلموں میں اور دلیپ کمار کی اداکاری میں حقیقت جھلکتی ہے۔ گلوکاروں میں میں کندن لعل سہگل کا دیوانہ وار عاشق ہوں اُن کے گائے ہوئے نغمے مجھے اپنی جان سے پیارے لگتے ہیں میری دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ میں اُن کے ساتھ انھیں کی طرح گنگنانے لگتا ہوں جیسے آپنے بھی سُنا ہوگا۔

ارے آپ نے گھڑی دیکھی باپ رے بہت وقت ہوگیا آپ سے گفتگو کے وقت اپنا پیٹ بھی آپ ہی سے بھر لیا مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو پتہ تک نہیں چلا۔ مجھے بہت سارے کام کرنے ہیں انشاء اللہ رات کو پھر ملاقات ہوگی مجھے بھولنا مت۔

○○

غزلیں

عادل آبادی

پیروی کا کمال ہے بھائی
برطرف بھی بحال ہے بھائی

میں نے کالے کو کہہ دیا کالا
وہ تو غصے سے لال ہے بھائی

خودکشی کو بھی آج دریا پر
کیو ہے لمبی کمال ہے بھائی

تیری کمر میں اسپرنگ تو نہیں
کیا تھرکتی سی چال ہے بھائی

کب ہٹے گی غریبی بھارت سے
بڑا ٹیڑھا سوال ہے بھائی

جس کو مرنا تھا کل، وہ آج مرا
ڈاکٹر کا کمال ہے بھائی

عاشقوں کو لڑانا آپس میں
سامراجی یہ چال ہے بھائی

پان بیڑی تلک بھی رشوت میں
لیڈروں کو حلال ہے بھائی

بن ٹکٹ قبر میں اتارے ہیں
یہ ٹرینوں کا حال ہے بھائی

بن چھری کے تو کاٹا ہے جسے
کیا وہ مرغا حلال ہے بھائی

میں تو کہتا ہوں ہے گدھا پاگل
آپ کا کیا خیال ہے بھائی

مجیب الرحمٰن بزمی

رخِ ماہ پر جو قدم پڑا تو دلوں سے خوفِ خدا گیا
مجھے راس آئی جو لیڈری تو خیالِ بیم و رجا گیا

کبھی دال روٹی کی فکر تھی ہوں وزیر اب میں خوراک کا
وہ نمازِ عصر و فجر گئی وہ خیالِ روزِ جزا گیا

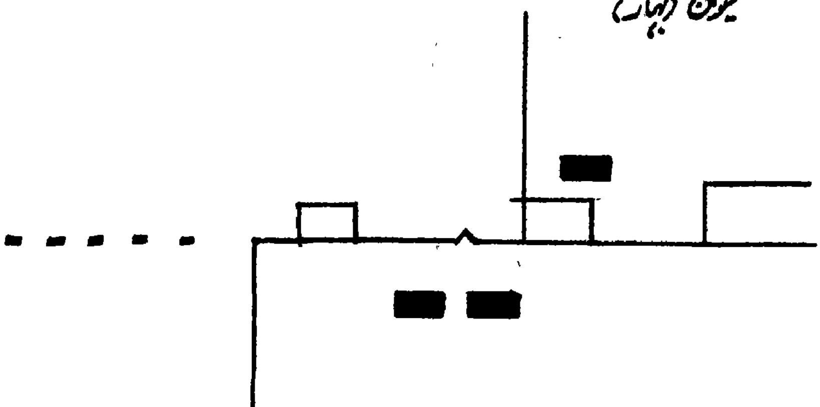
لگے کھانے مالِ یتیم بھی جو حرام تھا وہ حلال ہے
نہ خیالِ جبر و ستم رہا، وہ اصولِ قول و وفا گیا

شب و روز کا یہی حال ہے نہ تو گوشت ہے نہ تو دال ہے
یہ عجیب موسمِ خشک ہے مری زندگی کا مزا گیا

کچھ اور دیر ابھی سونے دے ابھی مت جگا مری بات سن
وہ لگے گی بزمی کو کوسنے "موا کچی نیند جگا گیا"

جہانگیر انس

سیوان (بہار)



کئی دنوں کے بعد علامہ گرگٹ سے ملاقات ہوئی تو ہم نے
ا "حضرت! آپ تو اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے رات کو بجلی
ئب ہو جاتی ہے۔"

علامہ گرگٹ نے پُرغرور لہجے میں کہا "ایک عظیم مشاعرہ سر کرنے چلا گیا تھا۔"

مشاعرہ سر کرنے کی اصطلاح سے محظوظ ہوتے ہوئے ہم نے پوچھا "کیا کُل ہند مشاعرہ تھا؟"

لامہ گرگٹ نے پہلے ہی کی طرح پُرغرور لہجے میں کہا "کُل ہند سے بھی بڑھ کر یعنی ایک عظیم مشاعرہ تھا۔" ہم نے
جب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "عالمی مشاعرہ آپ سر کر آئے اور ہمیں پہلے خبر بھی نہ کی!" علامہ گرگٹ نے
ر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا "عالمی مشاعرہ سے بھی عظیم مشاعرہ تھا۔"

علامہ گرگٹ کے عظیم مشاعرہ سے اب ہمیں بھی خواہ مخواہ کی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہم نے پُراشتیاق لہجہ میں
وال کیا "بڑے بڑے شعراء آئے ہوں گے اور سامعین کی تعداد بھی لاکھوں میں ہو گی؟"

علامہ گرگٹ ہماری کم فہمی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بولے "میاں! تم آج تک یہ بھی نہیں جانتے کہ
ظیم مشاعرہ کسے کہتے ہیں؟ ——— ارے بدھو، عظیم مشاعرہ وہ ہوتا ہے جس میں شعراء کی تعداد سامعین سے چوگنی
ہیں تو دوگنی ضرور ہو کیونکہ مشاعرہ شعراء سے ہوتا ہے نہ کہ سامعین سے۔ اگر لاکھوں سامعین ایک جگہ جمع ہو جائیں
ر وہ مشاعرہ نہیں کہلائے گا لیکن چند شعراء کسی ٹی پارٹی میں بھی یکجا ہو جاتے ہیں تو دوسرے دن کے اخبار
ں عظیم مشاعرہ کے عنوان سے اسکی روداد شائع ہوتی ہے ——— اور میں جو مشاعرہ سر کرنے گیا تھا اس میں
شعراء کی تعداد تین ہندسوں کے عروج پر تھی جب کہ سامعین کی تعداد دو ہندسوں کی نچلی سطح پر تھی۔ اسی سے

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنا عظیم مشاعرہ تھا۔"

علامہ کی زبان سے عظیم مشاعرہ کی یہ انوکھی تعریف سُن کر ہمیں اپنے آپ پر افسوس ہوا۔ خواہ مخواہ ہم نے اسکول اور کالج میں اپنی عمرِ عزیز کے اتنے قیمتی سال گنوا دیئے اور اب بھی کتب بینی میں کافی وقت ناحق ہی برباد ہو رہا ہے۔ علامہ کی طرح اگر کتب بینی کے بجائے جہاں بینی پر عمل کیا ہوتا تو آج یوں کفِ افسوس نہ ملنا پڑتا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ قرض دیئے ہوئے روپے کی طرح گزرا ہوا وقت بھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اس لئے ہم نے علامہ کے دستِ مبارک پر ہی بیعت حاصل کر کے اپنے محدود علم کو غرانٹ سود خور کے سود کی طرح بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

عظیم مشاعرہ کے لئے عظیم شعراء کا وجود ناگزیر ہے۔ عظیم مشاعرہ کی تعریف ہم علامہ کی زبانِ مبارک سے سُن چکے تھے لیکن سکّے کے دوسرے رُخ یعنی عظیم شاعر کی شناخت کا مسئلہ ہمارے لئے ابھی ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا۔ اس لیے ہم نے علامہ سے کہا "لگے ہاتھوں عظیم شاعر کی بھی تعریف بتا دیجئے؟"

علامہ نے گہری نظر سے ہمیں دیکھا کہ کہیں ہم انھیں بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ اپنے چہرے پر دنیا بھر کی مسکینیت طاری کرتے ہوئے ہم اللہ کی گائے بن گئے ہیں۔ ہمارا سپاٹ، جذبات سے عاری چہرہ دیکھ کر انھیں یقین ہو گیا کہ ہم انھیں بنانے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں تو وہ خود سے ہنستے ہوئے بولے۔

"عظیم شاعر وہ ہوتا ہے جسے زیادہ سے زیادہ مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے، جس کا کلام سن کر سامعین اتنے زور سے واہ واہ کرتے ہیں کہ مشاعرہ گاہ میں کلام کے بجائے واہ واہ کی صدا گونجنے لگتی ہے یہاں تک کہ مشاعرہ ختم ہو جاتا ہے لیکن واہ واہ کی صدا گونجتی رہتی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ تو سامعین کے عظیم شاعر کی تعریف ہوئی۔ قارئین کے عظیم شاعر کی تعریف کیا ہوگی۔؟ کیونکہ بقول شخصے "شاعری کی دو قسمیں ہیں، سامعین کی شاعری اور قارئین کی شاعری" لہٰذا شاعر بھی دو قسم کے ہوئے، سامعین کے شاعر اور قارئین کے شاعر۔"

علامہ نے سر کھجلاتے ہوئے کہا "قارئین کی شاعری کے لئے دوربین اور باریک بین نظر، تخیل کی تیزی، حسن و قبح کی پرکھ کی صلاحیت، خلوصِ فکر و احساس، محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی، واقعیت شعاری، مسائل کی شناخت اور آگہی اور تجربہ کی آنچ ضروری ہے۔ آج کے تیز رفتار "یورینائی عصر" کے دور میں کسی شاعر کے اندر یہ تمام اوصاف بیک وقت یکجا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور پھر قارئین کی شاعری کے لئے تو قارئین کی بھی ضرورت ہو گی لیکن آج کتنے لوگ اُردو پڑھتے ہیں اور جو اُردو پڑھتے ہیں ان میں کتنے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں؟؟ —— اس لئے اب شاعری صرف سامعین کے لئے ہی کی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اب شاعری کا تعلق صرف سامعین سے رہ گیا ہے لیکن آپ کی تعریف کے مطابق تو عظیم شاعروں کی ایک نہ ٹوٹنے والی لمبی قطار بن جائے گی جب کہ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ چیں بجبیں ہوتے ہوئے بولے "اقبال نے جب یہ شعر کہا تھا اس وقت کا زمانہ کچھ اور تھا اب دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ کیا اقبال کے دور میں بھی مرغا چوراہے میں سورج لئے کھڑا رہتا تھا؟ کیا اقبال کے دور میں بھی رہزنی رہنمائی میں شامل تھی؟؟"

ہم نے نہایت سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں ـــــ آج تو بقول شاعر ؎

دیکھ کر اس کو زمانہ دنگ ہے ایک بگلے کا گلابی رنگ ہے

اور یہی نہیں بلکہ ؎

احتراماً ان کو کہتے ہیں بزرگ جن کے اندر کائی باہر زنگ ہے

علامہ ہماری سعادت مندی پر خوش ہوتے ہوئے بولے "اگر آج اقبال زندہ ہوتا تو بگلے کا گلابی رنگ دیکھ کر اسے بھی اپنے نظریات بدلنے پڑتے ـــــ اب تو کوئی بات مشکل نہیں رہی۔ پہلے انسان کم پیدا ہوتے تھے اس لیے دیدہ ور یعنی عظیم بڑی مشکل سے پیدا ہوتے تھے۔ اب تو رشوت اور بیکاری کی طرح عظیم لوگوں کی پیدائش بھی دن دونی رات چوگنی ہونے لگی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب غیر عظیم شخصیتیں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں۔"

علامہ کے گراں مایہ فرمودات سے متاثر ہوتے ہوئے ہم نے کہا۔ "بجا فرمایا آپ نے واقعی اب وقت بدل چکا ہے۔"

علامہ ایک بار پھر ہماری کم فہمی کا شکوہ کرتے ہوئے بولے "میاں! اس غلط فہمی میں مت رہو کہ وقت بدلتا ہے۔ وقت کبھی نہیں بدلتا قدریں بدلتی رہتی ہیں۔"

علامہ کے ذہن سے اپنی کم فہمی کے اثرات کم کرنے کے لیے ہم نے کہا "لیکن بعض قدریں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی نہیں بدلتیں۔"

علامہ نے پُر تجسس لہجہ میں پوچھا "مثلاً"

ہم نے کہا "مثلاً سچائی، نیکی، حسن وغیرہ"

علامہ نے خانقاہی پیر کی طرح مصلحتاً ہنسی بہ چہرہ بسہ پیدا کرتے ہوئے کہا "اے کتابی کیڑے! کتابوں کی دنیا سے باہر آکر حقیقی دنیا بھی دیکھ تاکہ تجھے معلوم ہو سکے کہ تحریر اور عمل میں کتنا تضاد ہوتا ہے۔ آج سچائی

کا نام ہے بے وقوفی، نیکی کا مطلب ہے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا اور حسن سے یہ مراد ہے میک اپ۔ افلاطون نے کیا نظریہ پیش کیا ہے، ارسطو نے کیا لکھا ہے، سقراط کیا کہہ گیا ہے، عیسیٰ کا پیغام کیا تھا، گاندھی نے کیوں گولی کھائی؟ ــــ یہ تمام باتیں درسی کتابوں کے لیے ہیں نہ کہ کسی کی رہنمائی کے لیے۔ عملی زندگی میں انھیں برتنا زمانے کو اپنا دشمن بنانا ہے۔ آج کی دنیا میں جنھیں جینا ہے اور شان سے جینا ہے انھیں وقت کے تقاضے کو محسوس کرنا ہوگا، حاکم وقت کی جی حضوری کرنی ہوگی، برسر اقتدار کا کہا ماننا ہوگا، دل و دماغ سے دیکھنا اور آنکھ سے سوچنا ہوگا۔ بقول شاعر ؎

اُدھر ہی چلو جدھر کی ہوا ہو

کہ اس کا نام ڈپلومیسی ہے، یہی کامیابی و سرخروئی کی ضمانت اور آج کے دور کی سب سے بڑی سچائی ہے۔"

علامہ پر ایک "عظیم مشاعرہ" سر کرنے کا خمار طاری تھا اُن کے زرخیز دماغ میں دُور دور کی کوڑیاں جمع ہو گئی تھیں ایسے سنہری موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا بے وقوفی ہوتی۔ اور ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں کہ اس بیش قیمت موقع کو رائیگاں جانے دیتے۔ گفتگو کا موضوع "عظیم" تھا۔ علامہ فلسفہ کی وادیوں میں پہنچ گئے تھے ہم نے دوبارہ انھیں "عظیم" کی طرف گھسیٹا اور عظیم شاعر کے بعد عظیم نقاد کے متعلق جاننا چاہا کہ آج ادب سے زیادہ تنقید کا بازار گرم ہے اس لیے ہمارے جیسے کم فہم قاری کو عظیم تنقید سے مستفید ہونے کے لیے عظیم نقاد سے واقف ہونا ضروری ہے۔

علامہ نے کہا "عظیم نقاد وہ ہوتا ہے جس کی نظر ہمیشہ نقد پر رہتی ہے جو اُدھار کا قائل نہیں ہوتا ہے کہ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے یہ سودا دست بہ دستی ہے۔"

عظیم نقاد کی "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی یہ انوکھی تعریف سن کر ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے ــــ احتشام حسین ــــ اختر رائے پوری ــــ مجنوں گورکھپوری ــــ ممتاز حسین ــــ آل احمد سرور ــــ شمس الرحمٰن فاروقی ــــ خلیل الرحمٰن اعظمی ــــ عبادت بریلوی ــــ کلیم الدین احمد ــــ وزیر آغا ــــ ایک ایک نقاد کی تصویر ہمارے ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگی۔

علامہ نے ہمارے دلی جذبات کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "بجنوری ہوں یا نیاز، عبدالحق ہوں یا حالی، شبلی ہوں یا دورِ جدید کے نقاد، اس حمام میں سب ننگے نظر آئیں گے کہ کوئلے کی دلالی میں کم و بیش سب کا ہاتھ کالا ہوتا ہے۔"

علامہ کی تعریف صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ بحق قاری محفوظ رکھتے ہوئے ہم نے اُن سے عظیم ادیب کی تعریف بھی پوچھی۔ علامہ عظیم ادیب کی تعریف بتانے کے بجائے ہم سے پوچھ بیٹھے کہ "ادیب کس چڑیا کا نام ہے؟"

ہم نے حیرت سے علامہ کی طرف دیکھا۔ کہیں عظیم مشاعرہ سر کرنے کی خوشی میں ان کا دماغ یک لخت اُلٹ تو نہیں

گیا ہے کہ وہ ادیب کو چڑیا سمجھنے لگے، خدا خیر کرے "ایسی نادرالوجود ہستیاں قومی سرمایہ ہوتی ہیں جن کی حفاظت کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔ علامہ کو فوراً بریلی یا کانکے بھیجا جانا چاہیئے۔ پھر خیال آیا کہ اگر واقعی علامہ کا دماغ اُلٹ گیا ہے تو انھیں مبارکباد پیش کرنا چاہیئے کہ علامہ اب عقل و دانش کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں اب ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ "سند" ہوگا اور سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا کیونکہ آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

ہمیں خیالات کی وادی میں بھٹکتا دیکھ کر علامہ نے طنزاً کہا "سیکڑوں کتابیں پڑھنے کے بعد بھی ادیب کس چڑیا کا نام ہے نہیں جانتے؟"

علامہ کو مبارکباد پیش کرنے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہم نے شرم سے جھینپتے ہوئے کہا "ایسی بات نہیں، ہم کچھ سوچنے لگے تھے" پھر ہم نے کہا — "ہمارے ناقص خیال کے مطابق ادیب کسی چڑیا کا نام نہیں بلکہ ادب کے خالق کو ادیب کہتے ہیں۔"

علامہ نے پوچھا "اور ادب کسے کہتے ہیں؟"

ہم نے کہا "بقول احتشام حسین ادب زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ ہے، ممتاز حسین نے ادب کو زندگی کا آئینہ کہا ہے اور مشہور مغربی نقاد میتھو آرنلڈ کے نزدیک ادب تنقیدِ حیات ہے۔"

علامہ نے کہا "اگر ادب زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ ہے یا ادب زندگی کا آئینہ یا تنقیدِ حیات ہے تو پھر اسے جدید ادب، قدیم ادب، ترقی پسند ادب، غیر ترقی پسند ادب ..... کے خانوں میں کیوں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ہر دور کے اور ہر قسم کے ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ، زندگی کا آئینہ یا تنقیدِ حیات کیوں نہیں سمجھا جاتا ......"

گفتگو میں سنجیدگی کے ساتھ طوالت بھی آتی جارہی تھی اس لیے ہم نے ادب کی بحث سے دامن بچاتے ہوئے علامہ سے ایک دفعہ پھر عظیم ادیب کی تعریف پوچھی — ہمیں اُمید تھی کہ علامہ کہیں گے کہ عظیم ادیب وہ ہوتا ہے جس کے تخلیقی نمونوں میں زندگی کا گرم خون دوڑنے کے ساتھ روحِ عصر کی شعلہ سامانی بھی ہو۔ لیکن ہماری اُمید کے خلاف علامہ نے کہا "عظیم ادیب وہ ہوتے ہیں جن کی تصانیف اکادمیاں یا سرکار کا بھاشا وبھاگ اپنے خرچ سے شائع کرتا ہے یا ان پر انعام دیتا ہے۔"

عظیم ادیب کی یہ دلچسپ تعریف سُن کر ہمارے دل میں بہتیرے ایسے ادیبوں کے لیے عقیدت کا جذبہ پیدا ہوگیا جن کی تصانیف اکادمیوں یا سرکار کے بھاشا وبھاگ کے طفیل عالم وجود میں آئی ہیں، اور جنھیں پڑھنے کے بعد ہم ان مصنفین پر مسکرا کر رہ گئے تھے کہ اپنی مسکراہٹ پر ہی ہمارا اختیار ہے۔

عظیم ادیب کی تعریف بتانے کے بعد علامہ نے کہا "اس بک بک جھک جھک سے بہتر ہے کہ اپنی نوٹ بک مجھے

دے دو، میں انسانی زندگی سے متعلق تمام شعبوں اور علوم و فنون میں "عظیم" کی تعریف کیلیے درج کروں گا تاکہ سند رہے اور تمہارے اور تم جیسے کتابی کیڑوں کے وقت ضرورت کام آئے۔"

علامہ کے حکم کے مطابق ہم نے اپنی نوٹ بک ان کے حوالے کر دی — اب وہ نوٹ بک ہمارے پاس واپس آچکی ہے۔ چلتے چلاتے — چند اور تعریفیں گوش گزار کرتا چلوں تاکہ آپ بھی ان بیش بہا تعریفوں سے مستفید ہوسکیں اور علامہ گرگٹ کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھیں۔

عظیم مفکر — جو ہردم فکرمند رہے۔

عظیم لیڈر — جو جوتش ودیا میں ماہر ہو۔ عوام کو مستقبل میں رونما ہونے والے حادثات سے روشناس کراسکے اور پھر بعد میں یہ ثابت کرسکے کہ وہ حادثات کیوں رونما نہیں ہوئے۔ جو عمل سے زیادہ قول پر یقین رکھتا ہو

عظیم مقرر — جو سب سے آخر میں تقریر کرے جب کہ سامعین اپنے گھر جاچکے ہوں۔

عظیم اداکار۔ جو اسٹیج پر اداکاری کرنے کے بجائے اپنی عملی زندگی میں اداکاری کرے۔

عظیم آرٹسٹ۔ جس کی بنائی ہوئی تصویریں عام لوگوں کی سمجھ سے بالا ہوں۔

عظیم ڈاکٹر۔ جس کی فیس زیادہ ہو، جو فیس کے ساتھ خون، پیشاب، پاخانہ، اور تھوک ٹیسٹ کرنے کی فیس بھی وصول کرلے اور مریض کو جس کے در کی گھنٹوں بلکہ دنوں اور ہفتوں دربانی کرنا پڑے۔

عظیم عاشق۔ جو سرِ راہ معشوق کے ہاتھوں پٹنے پر بھی بدمزہ نہ ہو۔

عظیم تاجر۔ سال میں کم ازکم دو دفعہ جس کا دیوالیہ نکلے۔

عظیم سواری۔ جو اکثر ایکسیڈنٹ کرے۔

عظیم شہر۔ جہاں کی سڑکیں کوڑا کرکٹ سے بھری ہوں، جہاں مچھروں کی بھرمار ہو اور جہاں کے رہنے والے دعا سلام کے فن سے بھی ناواقف ہوں۔

عظیم یونیورسٹی۔ جہاں دنگا فساد عام ہو، جہاں کبھی اساتذہ ہڑتال پر ہوں تو کبھی طلباء اور کبھی غیر تدریسی عملہ۔

—— اور ہاں یہ بتانا تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ نوٹ بک کے پہلے صفحہ پر علامہ نے نہایت ہی جلی حروف میں لکھا ہے "از قلم عظیم دانشور علامہ گرگٹ، اور اس کے کچھ نیچے یہ بھی درج ہے "عظیم ادیب اللہ رکھا کے لیے" —— علامہ کے عظیم دانشور ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہم نے عظیم ادیب پر روشنائی پوت دی ہے کیونکہ ابھی تک ہماری کوئی تصنیف اکادمی یا بھاشا وبھاگ کے مالی تعاون سے شائع نہیں ہوئی ہے اور نہ ہماری کسی کتاب پر انعام ہی ملا ہے۔ ——

∴ ∴ ∴

مرزا کھونچ بیتیا

چندہ

چار حرفی لفظ 'چندہ' ایک ایسا کوزہ ہے جس کے اندر ایک دریا موجزن ہے۔ یہ ایک ایسا تھیلا ہے جس کے اندر پورا حلقۂ بازار سجایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا راگ ہے جسے الاپنے کے لئے جوان کیا بوڑھے بھی کوشاں رہتے ہیں۔

جس طرح چاند کی چاندنی اندھیری رات کو اُجالے میں بدل دیتی ہے، اُسی طرح چندہ کی دلفریب شعائیں جیب کے تاریک گوشوں کو منور کر دیتی ہیں۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند اور چندہ سے گہرا تعلق ہے۔ چاند بھی چار حرفی ہے اور چندہ بھی۔ دونوں کا کام تاریکی کو اُجالا بخشنا ہے۔ چاند عید کا پیغام لاتا ہے تو چندہ سوئیوں میں مٹھاس۔ چاند گوشت کھلاتا ہے تو چندہ بکرے کو گھاس۔

چندہ رہبر قوم کی گفتگو ہے، جناب شیخ کی آبرو ہے، اداروں کی آرزو ہے اور بیکاروں کی جستجو ہے جس طرح شمع کی روشنی پر پروانے نثار ہوتے ہیں اُسی طرح ایک رہبر قوم کی جان چندے پر قربان ہونے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ کل کا واقعہ ہے ایک رہبر قوم وعظ فرما رہے تھے کہ "ہم قوم کا غم کھاتے ہیں، قوم کے درد کو بوتلوں میں بند کر کے وقتاً فوقتاً پیتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے کھانے اور پینے سے ہم میں جذبۂ ایثار کھو جاتا ہے۔ قوم کا درد پینے اور غم کھانے سے ہمارے بدن میں ایک طرح کی کمزوری آجاتی ہے۔ اور اس کمزوری کا واحد علاج ہے۔ چندہ! اگر ہم اپنی کمزوری کا علاج نہ کرائیں تو ہمارے اندر درد اور غم کھانے پینے کا جذبہ کم ہو جائے گا۔ اس لئے ہم چندہ کا ٹانک پی کر کمزوری کا علاج کرتے ہیں۔ ورنہ ہم کب کے گر گئے ہوتے۔ اور جب ہم گر جاتے تو آپ کا گرنا لازمی تھا۔ اگر آپ گرنا نہیں چاہتے ہیں گرنے سے بچایئے اور دل کھول کر چندہ دیجئے۔"

چندہ کی بدولت ہی ہم شیخ جی سے جنت کا اڈیشنل پاسپورٹ حاصل کر کے جنت کے کسی برتھ کا ریزرویشن کرا لیتے ہیں۔ بھلا یہ لاشمر سے دینا نہیں ملے۔ جس محلے میں ایک بھی مُرغا نظر نہ آئے بس سمجھ لیجئے اُس محلے کے سارے

ن جنت نشین ہو گئے۔ کیوں کہ شیخ صاحب ایک ہفتہ یہاں ضرور قیام فرمائے ہوں گے اور سارے لوگوں کو جنت کا ٹکٹ دے گئے ہوں گے۔

اداروں کی کامیابی چندہ کی وصولیابی پر منحصر ہوتی ہے۔ ادبی ترقی ہو یا مذہبی سبھوں کا شجرہ چندہ تک یہی ہے۔ چندہ نہیں ہوگا تو شام غزل اور شب افسانہ کیوں کر منعقد ہوگی اور اگر یہ منعقد نہیں ہوئی تو آپ سمجھ لیں کہ اردو کا بیڑا غرق اگر چندہ نہیں ہوا تو بڑے مولانا کی تقریر کیسے ہوگی اور تقریر نہ ہوئی تو مذہب میں زنگ لگنا شروع ہو جائیگا۔ اور پھر اپنا خدا حافظ۔ ایک مذہبی ادارے نے جب دیکھا کہ ان کے رقیب ادارہ نے ایک شاندار جلسہ منعقد کیا، زور دار تقریر ہوئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ تب ادارہ کے کارکنوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ انہوں نے ایک پرانی فلم خریدی اُسے ایک پکچر ہال میں چیریٹی شو میں دکھائی۔ پھر پیسے کا انبار لگ گیا۔ اُس پیسہ سے ایک شاندار جلسہ کا دَور چلا۔ مقررین نے رات بھر تقریروں کی بوچھار کی مٹھائیوں کا دَور چلا۔ رقیبوں کا منہ کالا ہوا۔

بیکاری دُور کرنے کا واحد طریقہ ہے چندہ وصول کرنا۔ نوکری پیشہ شخص کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ دروازہ دروازہ گھوم گھوم کر چندہ مانگتا پھرے۔ یہ ایک ایسا دھندہ ہے جس میں نہ ہاتھ کالا نہ منہ۔ اگر منہ ہاتھ کالا بھی ہو جائے تو اللہ رکھے صابن بنانے والوں کو انھوں نے ایسی چیز بنا دی ہے جس سے کالے پن کے ساتھ ساتھ چندہ بھی صاف ہو جاتا ہے۔

چندہ ایک قسم کی تجارت ہے جو صرف نفع میں چلتی ہے۔ ایک دفعہ ایک ادارے کے وصول کنندہ نے ادارے کو کچھ اُس طرح حساب دکھایا۔ کُل چندہ وصول ۳۰۰ روپیہ ۵٪ کے حساب سے ۱۵ روپے کمیشن۔ گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے ہوٹل ہی میں دونوں وقت ناشتہ اور کھانا کھانا پڑا۔ پانچ دن کا بل ہوا ۵۲ روپے۔ رکشا بھاڑا ۱۰ روپیہ، بس بھاڑا ۱۳۱ روپیہ۔ میری غیر حاضری میں اہلیہ نے گھر چلانے اور بچوں کی فیس کے لئے پڑوسن سے قرض لیا ۷۵ روپے کُل خرچہ ۱۶۲ روپے تحویل میں ۱۳۸ روپے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو چندہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کا چاک گریباں سیتا ہوا نظر آئے گا۔ اگر نمبر کی کمی کی وجہ سے کالج میں نام لکھانا مشکل ہو تو فوراً بلڈنگ فنڈ میں چندہ دے ڈالئے آپ کا نام سرِ فہرست لکھا جائے گا۔ ایک جگہ معاملہ کچھ برعکس نظر آتا ہے۔ ایک مریض کی دوا کے لئے جہاں صرف ۱۰ روپیہ چندہ ملتا ہے وہاں اس کے مرنے کے بعد کفن کے لئے ۱۰۰ روپے۔ آخر کیوں؟ یہ عقدہ ناقابلِ حل ہے۔ اب چندہ کے سلسلے میں اس طرح کی تبدیلی کرنی ہوگی کہ "بھائی ایک ایسے مریض کے لئے چندہ دیجئے جو فوراً مرنے والا ہے"۔

دیکھا آپ نے اس چار حرفی لفظ کے کوزہ میں دریا کا منظر۔ اس اندھیری زندگی میں اگر چندہ کی روشنی ختم کر دی گئی تو سمجھ لیں سب ختم!

غزل

رؤف رحیم

چاہا تھا جس کو میں نے اداکار دیکھ کر
"مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر"

یوں دل ترس رہا ہے تری کار دیکھ کر
للچائے جیسے جام کو مئے خوار دیکھ کر

بالائے بام یا پسِ دیوار کون جائے
حسنِ بتاں سے رونقِ بازار دیکھ کر

کوئی فساد، چوری ڈکیتی نہ حادثہ
حیران ہوں میں آج کا اخبار دیکھ کر

دونوں کا لال خون بھی کیا ہوگیا سفید
لڑتے ہیں لوگ سُبحہ و زنار دیکھ کر

اب رکشا راں بھی گاتے ہیں مخدوم کی غزل
شاید اثر ہوا ہے یہ "بازار" دیکھ کر

جوڑے کا بھاؤ چاہیئے ڈگری کے وزن پر
قیمت بڑھا رہا ہوں خریدار دیکھ کر

کس سمت جا رہے ہیں بتاؤں میں شیخ جی!
اندازہ ہو چکا ہے یہ رفتار دیکھ کر

سنتے ہیں روز خون کا بازار گرم ہے
لیکن سکون ملتا ہے اخبار دیکھ کر

اس دور میں تو شانہ بہ شانہ ہیں مرد و زن
ہم ہوگئے ذلیل انھیں خوار دیکھ کر

ٹکڑے نہ کر دے ہند کے آپس کی سر پھٹول
اندازہ لگ رہا ہے یہ آثار دیکھ کر

لیکن وہ لطف غیر کے حصے میں آگیا
پیار ان کو ہوگیا تمہارا پیار دیکھ کر

اب اے رحیم آپ بھی سنیاس لیجئے
"رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر"

٭٭٭

چلے گئے

رشید عبدالسمیع جلیل

وہ جو کل تلک تھے سپارڈینٹ کہیں چیف بن کے چلے گئے
رہے ایروگنٹ جو فطرتاً وہ شریف بن کے چلے گئے

رہا بے زبان جو ماتحت اُسے چارہ کچھ بھی نہ مل سکا
کہ حرق تمام نکال کر وہ ترقیف بن کے چلے گئے

نہ چمن پسند رہے سدا نہ مشن پسند رہے سدا
جو غبن پسند رہے سدا وہی چیف بن کے چلے گئے

جو ڈپارٹمنٹ میں جواں ہوئے بڑی مشکلوں سے رواں ہوئے
کبھی تیر تھے جو کماں ہوئے تو ضعیف بن کے چلے گئے

وہ جو گرم رہتی تھی ہیٹری ہوئی جیسے برف کی تیکڑی
کہ ستی جلیل کی شاعری تو ظریف بن کے چلے گئے

ظفر کمالی

کوئی گیتا لئے پھرتا ہے تو قرآں کوئی

خواہ غلہ ہو کہ سبزی نہیں ارزاں کوئی
آج سے آئے نہ اب گھر مرے مہماں کوئی

بیچنے کے لئے پھرتا ہوں میں شہروں شہروں
چار آنے میں ہی لے لے مرا دیواں کوئی

ہو گی وہ اور ہی دنیا جہاں بستے ہوں گے
اس زمیں پر نہیں ملتا مجھے انساں کوئی

مسجدیں ہو گئیں سنسان تو اس کا کیا غم
سینما ہال تو رہتا نہیں ویراں کوئی

سامنا دین کے قزاقوں کا ہر گام پہ ہے
کیسے محفوظ رکھے دولت ایماں کوئی

اپنی تہذیب کو بھولوگے تو مٹ جاؤ گے
یہ مرض وہ ہے جس کا نہیں درماں کوئی

علم ہو خام مگر خود کو جو کامل سمجھے
اس سے بڑھ کر نہیں اس دنیا میں ناداں کوئی

جیسی عریانی ہے اب عام ڈگر پر یارو
ویسے خلوت میں بھی شاید نہ ہو عریاں کوئی

لوگ کرنے کو نصیحت تو چلے آتے ہیں
دیکھتا اپنا بھی اے کاش! گریباں کوئی

بینک بیلنس بڑھانے کے لئے آج یہاں
کوئی گیتا لئے پھرتا ہے تو قرآں کوئی

عین ممکن ہے کہ دل کو وہاں راحت مل جائے
چل کے آباد کریں شہر خموشاں کوئی

لکھیے تو کس کے لئے پڑھیے تو کس جا پڑھیے
اب تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا سخنداں کوئی

ایک بیگم سے تولد ہوئے بارہ لڑکے
گھر کو اب گھر نہ کہو وہ تو ہے زنداں کوئی

تڑکے ہی بولیں کہ لادو مجھے ڈسکو ساڑی
ورنہ پھر گھر میں اٹھا دوں گی طوفاں کوئی

تیغ کی دھار پہ چلنا ہے فن طنز و مزاح
اس کو سمجھے نہ کبھی بھول کے آساں کوئی

شاعری کرکے نہیں ملنے کی روٹی تم کو
شہر میں کھولو ظفر پان کی دوکاں کوئی

٭ ٭ ٭

برق آشیانوی

پوست واستخواں کا مجسمہ

وامق جونپوری

{یہ مضمون ہندی بھون جون پور میں وامق جونپوری کی پچہتر ویں سالگرہ کے جشن کے سلسلہ میں منعقدہ سمینار میں ۲۳ فروری ۸۴ء کو پڑھا گیا}

ڈاکیہ ٹیپرد ے گیا. کھولا تو حضرت سید نور محمد نور اکیلوی کا خط تھا. لکھا تھا کہ وہ دوبارہ جون پور جا رہے ہیں. فرطِ مسرت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے. اتنے میں بیوی آگئیں اور دیکھا کہ ہماری آنکھوں میں آنسو ہیں تو وہ بھی رونے لگیں. بچے آئے. دیکھا کہ ماں اور باپ دونوں رو رہے ہیں تو اُنہوں نے بھی رونا شروع کر دیا. پھر بچوں کے بچے جن کی تعداد خدا نظرِ نیک سے نہ بچائے تو عرض کروں کہ پچاس سے اوپر ہے. ہم لوگوں کو روتا دیکھ کر اُن سب نے بھی رونا شروع کر دیا. خادمہ آئی. دیکھا کہ گھر کے سب لوگ رو رہے ہیں تو اس نے بھی رونا شروع کر دیا. پڑوسی کو معلوم تھا ہم برسوں سے ایسے بیمار ہیں کہ بس دو چار دن کے مہمان ہیں چنانچہ ہر دو چار دن کے بعد وہ ہماری خیر و عافیت معلوم کر کے مایوس ہو جایا کرتے تھے. اس طرح برسوں گزرنے کے بعد جب ہمارے گھر سے رونے کی آواز بلند ہوئی تو پڑوسی نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ دو چار دن آج پورے ہو گئے ہیں جن کا برسوں سے انتظار تھا. اُن سے محلّے کے ایک شخص نے دریافت کیا کہ ـ یہ برق آشیانوی صاحب کے گھر سے رونے کی آواز کیسی آرہی ہے؟ تو انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ برق آشیانوی کا انتقال ہو گیا ہے. اب کیا تھا پورے محلّے میں ہمارے انتقال کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور بقول مجتبیٰ حسین فائر بریگیڈ کا عملہ منہ دیکھتا رہ گیا. ایک قریبی عزیز کو معلوم ہوا تو وہ ہمارے گھر آئے اور سیدھے ہمارے کمرے میں پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم ہمارے گھر میں ایک صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے. انہوں نے ایک چھ سالہ بچے کو قریب بلا کر پوچھا کہ ـ میاں تم کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا آپا رو رہی تھیں تو میں بھی رو رہا ہوں. انہوں نے اس آپا کو بلا کر دریافت کیا کہ کیوں رو رہی ہو تو اس نے کہا ابا رو رہے ہیں اس لئے

میں بھی رو رہی ہوں بھیا نامی بچے سے پوچھا گیا کہ تو اس نے کہا امی رو رہی ہیں اس لئے میں بھی رو رہا ہوں۔ اسی قسم کی مخلوق سے سوال کیا گیا تو انہوں نے آنسو صاف کرکے جواب دیا۔ لے لو مجھے کیا معلوم۔ وہ جو تمہارے سگے ہوتے ہیں نا وہ رو رہے تھے، تو میں نے رونا شروع کر دیا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ کیوں رو رہے تھے۔ البتہ اُن کے سامنے ایک خط تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ضرور اس میں کوئی الم ناک خبر ہوگی اس لئے میں نے بھی رونا شروع کر دیا؟" آخر میں وہ صاحب ہمارے پاس آئے اور شانہ ہلاکر ہمیں نیند سے نہیں بلکہ رونے سے بیدار کیا اور پوچھا کہ بھائی صاحب آپ کیوں رو رہے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ برادرم میں فرطِ مسرت سے رو رہا ہوں۔ بہر حال رونے کی محفل ایک ڈرامے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ جس کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ ہمارے رشتہ دار نے ہمارے آنسو صاف کئے اور صبر کی تلقین فرمائی۔ کہ میاں مشیتِ ایزدی میں کس کو چارہ ہے۔ زندگی میں ایسے خوشی کے واقعات آتے رہتے ہیں۔ اب تو صبر کرلو میں دُعا کرتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں خوشی کے ایسے ہزاروں واقعات آتے رہیں اور تم مسرت کے آنسو بہاتے رہو۔ اُن کے دلاسہ دینے پر ہم نے رونا بند کیا اور وہ چلے گئے۔

اس کے بعد دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا تو ہم نے دل کو سمجھایا کہ بھائی یہ تمہارے اچھل کود کی عمر نہیں ہے اس لئے ہماری جان خطرے میں رہتی ہے اس لئے ذرا سنبھل جاؤ۔ جب دل سنبھل گیا تو ہم نے بیوی کو بتایا کہ ہم نے جون پور جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی کیوں کہ جونپور سے ہمارا روحانی رشتہ ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، ہم نے اپنے ایک دوست سے ذکر کیا کہ ہم جونپور جارہے ہیں تو انہوں نے تاکید کی کہ وامق جون پوری سے ضرور ملنا۔ اب جس شخص سے ملاقات ہوتی وہ تاکیداً کہتا کہ جون پور جا رہے تو وامق جون پوری سے ضرور ملاقات کرنا۔ غرض جتنے شاعروں، ادیبوں، نقادوں، دانشوروں کو معلوم ہوا کہ ہم جون پور جارہے ہیں ہر ایک نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ وامق جون پوری سے ملے بغیر نہ آنا۔ اگر تم ملے بغیر واپس آئے تو ہم بہ واپسی ٹرین تم کو جون پور بھیج دیں گے تاکہ تم وامق جون پوری سے مل کر آؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وامق جون پوری کا نام سنتے سنتے وہ ہمارے کانوں سے دماغ میں ایسے بس گئے کہ کوئی ہم سے پوچھتا کہ آپ کا نام کیا ہے تو ہم کہتے وامق جون پوری۔ کہاں رہتے ہو۔ تو کہتے وامق جون پور؟ کیا کام کرتے ہو تو جواب دیتے وامق جون پوری مزاج کیسا ہے تو ہم کہتے کہ وامق جون پوری چاہ! ایک صاحب نے یہ سمجھ کر کہ وامق جون پوری کسی بیماری کا نام ہے کہنے لگے۔ ہاں یہ نہایت خطرناک بیماری ہے۔ شہر میں وبا کی طرح پھیل گئی ہے۔ خود ہمارے شہر میں چار پانچ آدمی اس بیماری سے انتقال کر گئے [illegible] ایک صاحب جنہوں نے دعوے سے صرف اتنا شنا

کہ ہم کسی بیماری میں مبتلا ہیں قریب آئے اور پوچھا کہ کس ڈاکٹر کا علاج کروا رہے ہو تو ہم نے جواب دیا وامق جون پوری۔ انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا۔ بس اُسی کا علاج کراؤ۔ شہر میں اس سے بہتر کوئی ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب ہم خود اپنے آپ کو وامق جون پوری سمجھنے لگے۔ اور کوئی ہم سے ہماری کوئی غزل سُنانے کی فرمائش کرے تو ہم وامق جون پوری کی غزل سُنا دیتے۔

جب یہ خبر ملا مجرالیہود کو پہنچی تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور ہمارے کمرے میں داخل ہوکر کہا اسلام علیکم تو ہم نے جواب دیا وامق جون پوری۔ وہ اچانک سنجیدہ ہوگئے ہمارے قریب آکر ہمیں غور سے دیکھا ہماری آنکھوں میں جھانکا۔ ہماری انگلیوں کے ناخن دیکھے۔ پھر ہمارے صاحبزادے کو لے کر باہر نکلے اور دروازے کے قریب کھڑے ہوکر گھبراہٹ کے عالم میں فرمایا۔ "میاں تمہارے والد صاحب کو وامق جون پوری کا سایہ ہوگیا ہے۔ اگر فوراً علاج نہ کیا گیا تو بڑے خطرناک نتائج نکلیں گے۔" صاحبزادے نے دریافت کیا کہ اس کے لئے کیا کرنا ہوگا تو انہوں نے کہا، میاں۔ برق آشیانوی میرا بچپن کا دوست ہے۔ اس سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں ہزاروں سے کم ہر کسی کا علاج نہیں کرتا۔ بس ایک کالا بکرا۔ سفید مرغ پانچ کیلو امرتسری چاول دو کیلو دال چار کیلو اصلی گھی ایک درجن انڈے دو لیمو اور تھوڑا سا کالا دھاگہ اور ہاں صرف دوسو روپے نقد میرے مکان پر شام تک بھجوا دو۔ انشاء اللہ وامق جون پوری کا سایہ میں اتار دوں گا۔" چنانچہ فوراً تمام اشیاء فراہم کرکے ملا صاحب کے گھر بھجوا دی گئیں۔

یہ سب اپنی جگہ ہو رہا تھا اور ہم ٹرین میں برتھ کا رزرویشن کروانے کے لئے اسٹیشن پہنچے کاؤنٹر پر پہنچے اور سو روپے کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ بکنگ کلرک نے دریافت کیا کہاں کا ٹکٹ چاہیئے تو ہم نے جواب دیا۔ "وامق جون پوری" وہ تھوڑی دیر تک ہمیں غور سے دیکھتا رہا۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک کتاب نکالی اور اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا صاحب وامق جون پوری کوئی اسٹیشن نہیں ہے۔ ٹھیک سے بتائیے کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔" ہم نے کہا "بس وامق جون پوری کا ٹکٹ دیجیئے"۔ اتنے میں پیچھے جو لوگ کیو میں کھڑے تھے انہوں نے ہمیں ہٹا دیا۔ ہم مایوس ہوکر گھر آئے۔ اور اپنے صاحبزادے سے واقعہ بیان کیا۔ تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں رزرویشن کروا دیتا ہوں وہ اسٹیشن گئے۔ ریزرویشن کرواکر جون پور کا ٹکٹ ہمارے ہاتھ تھما دیا۔ ہم نے پوچھا۔ وامق جونپوری کا ہی ٹکٹ لے آئے ہونا۔؟" تو انہوں نے کہا۔ "جی ہاں"

آخر میں ایک نہایت ہی ناگوار واقعہ پیش آیا۔ صبح میں نماز فجر کے بعد ہماری بیوی کی ایک سہیلی آئیں اور کچھ رازکی باتیں بتاکر چلی گئیں۔ بیوی ہمارے کمرے میں آئیں اور قریب بیٹھ گئیں۔ پھر دانت بھینچ کر رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا۔۔۔ "یہ وامق جونپوری کون ہے؟" ہم حقیقت کی تہہ کو پہنچ گئے اور نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "وامق جون پوری ملک کے ایک عظیم شاعر [illegible]

اب باتیں نہ بنائیے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے آپ سے ایسی توقع نہ تھی کہ مجھ سے چھپا کر یہ کام کریں گے اور برسوں تک مجھے پتہ نہ ہونے دیں گے۔" ہم نے لاکھ تردید کی لیکن انہیں اپنی سہیلی کے مقابلے میں ہماری بات کا یقین ہی نہ آیا۔ اور ہم کو خاموش ہونا پڑا۔ اُنہوں نے اپنی بہو سے اس بات کا تذکرہ کیا تو بہو نے بتایا کہ وامق جون پوری ملک کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ پھر دونوں ہمارے کمرے میں آپہنچیں۔ اور بیوی نے معذرت کے لہجہ میں کہا کہ مجھے "وامق جون پوری صاحب کے بارے میں جو کچھ کہا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"

آخر گھر سے روانہ ہونے کی گھڑی آپہنچی۔ گھر سے چلنے لگے تو بچوں نے دریافت کیا کہ جونپور میں سب سے اچھی چیز کیا ہے تو ہم نے کہا۔ وامق جون پوری تو ایک بچے نے کہا کہ میرے لئے دو وامق جونپوری لائیے کسی نے کہا میرے لئے چار وامق جون پوری لائیے کسی نے آٹھ وامق جونپوری کی فرمائش کر دی۔

یہاں تک تو میں صرف یہ بتلا دینا چاہا کہ وامق صاحب کی شخصیت کو حیدرآباد میں کتنے اونچے مقام پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ جب میں وامق صاحب کی لال کوٹھی پر پہنچا تو احساس ہوا کہ اس میں غالب ذوق، مومن وغیرہ کے دور کے کسی شاعر کو رہنا چاہیئے تھا لیکن اس کے برعکس ایک ایسے شاعر کی قیام ہے جو ترقی پسندی کا نقیب اور اس تحریک کی ایک ایسی یادگار ہے جو اب عنقا ہوتی جا رہی ہے۔

جہاں تک جسامت کا تعلق ہے مجھ سے زیادہ خستہ حالت ہے کیوں کہ وامق صاحب کو غور سے دیکھ تو بعد تلاشِ بسیار پوست و استخواں کے علاوہ دو چار سو گرام گوشت بھی پورے جسم میں موجود نہ آیا۔ باقی پوست و استخوان کے مجسّمے کا نام ہی وامق جون پوری ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن میں آگئی کہ پوست و استخواں کے مجسمے ہی قوموں اور ملکوں میں بڑے بڑے انقلاب لائے ہیں۔ اور ہندوستان کی جنگ آزادی کا سب سے بڑا سورما بھی پوست و استخواں کا ایک مجسمہ ہی تھا۔

وامق صاحب کی لال کوٹھی سادات مسونڈہ عرف کجگاؤں میں واقع ہے۔ اس زرخیز زمین اور یہاں کے خانوادۂ علم و ادب کے چشم و چراغ اور ترجمان حضرت وامق جون پور ہیں جن کی شعری اور علمی خدمات نے عظمتِ رفتہ کی یاد کو تازہ کرنے میں اپنا مقدس فرض ادا کر کے اس سرزمین کی آبرو رکھ لی ہے۔ آپ نے اپنے خصوصی اوصاف اور کمالِ فن کا ہند و پاک سے آگے بڑھ کر بیرونی ممالک سے لوہا منوا لیا ہے۔

وامق جون پوری صاحب کی شاعری اور کمالِ فن کا تفصیلی جائزہ لینے کی اس لئے ضرورت نہیں سمجھتا کہ مجھ سے پہلے کئی اصحاب نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا آپ شاعر کے دو مختلف ادوار کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ایک دور ترقی پسندی کی ابتداء کا اور دوسرا دور عہد حا

اور ہر دو ادوار میں وامق صاحب اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

چونکہ میں طنز و مزاح کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ملک میں جانا اور پہچانا جاتا ہوں اس لئے میں نے طنز و مزاح کے تعلق سے اُن کے خیالات معلوم کرنا چاہے تو اُنہوں نے کہا کہ طنز و مزاح سے اچھا جراح سماج اور سیاست کے دست و پائے شکستہ کو درست کرنے کے لئے اور کسی صنفِ ادب کو نہیں مانا جاسکتا۔ افراد کی غلطیوں پر طنز کرنا دعوتِ فکر دیتا ہے اور مزاح ذہن کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے بلکہ مزاح اور ہجو کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ کیوں کہ یہ اصناف ایک دوسرے سے بے حد مربوط ہیں۔

برسبیلِ تذکرہ آپ نے جوش ملیح آبادی کی ایک ہجویہ نظم اور جوش صاحب کو اپنا ہجویہ جواب سنا جوش ملیح آبادی نے شعرا کی ایک جماعت پر ہجو لکھی تھی جس کا جواب وامق صاحب نے ہجو میں دیا تھا جس کو سُن کر ہم لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ یہ نظم روز نامہ ملاپ میں شائع ہوئی تھی۔ جس کو پڑھ کر لوگوں نے آپ سے کہا تھا کہ کاش آپ ہجو نگار ہوتے تاکہ شاعری کی اس صنف میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔ ایسا نہ کرکے آپ نے نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ اس مخصوص شاعری پر بھی ظلم کیا ہے۔ ■■

تلگو تہذیب — ایک نشاۃ ثانیہ

شری این۔ ٹی۔ راماراؤ کی قیادت و نگرانی میں تلگو عوام کی قدیم روایات اور تہذیب کی عظمت کو پروان چڑھانے اور آبیاری کرنے و نیز ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کے لئے حکومت آندھرا پردیش نے اپنے آپ کو وقف کیا ہے اور کئی نئی اسکیموں کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

- تلگو یونیورسٹی کا قیام
- ہر ضلع میں تمام عصری ضروریات کے حامل ایک جدید آڈیٹوریم کم کلچرل سنٹر کا قیام۔
- رقص و موسیقی اور ڈراموں کے ہر ضلع میں مقابلے منعقد کئے جائیں گے۔
- مختلف ثقافتی شعبوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان فنکاروں کو مالی امداد کی فراہمی۔
- نوجوان فنکاروں کو ممتاز استادانِ فن کے ذریعہ ٹریننگ اور اسکالرشپ کی فراہمی۔
- ریاستی سطح پر موسیقی و ڈراموں کے یونٹ کا قیام

تھُت تمھاری کی

پچکر نظام آبادی

شاعر بن کو اکڑ دکھا رئیں ۔۔۔ اُستاداں سے غزلاں لکھا رئیں
ہک ہک کو سب کو سُنا رئیں ۔۔۔ سلاماں کرکو داداں پا رئیں
تھُت تمھاری کی

بن کو پھر رئیں رستمِ دوراں ۔۔۔ خود کو سمجھ رئیں طرّم خاں
تن کو دے رئیں موچھوں پہ تاواں ۔۔۔ بیوی کے تم پاواں دبا رئیں
تھُت تمھاری کی

تن ہے سوکھا پیٹ کنڈا لا ۔۔۔ گھر میں نیئں کھاتے کو نوالا
لڑنے کو نکلیں لے کو بھالا ۔۔۔ خالی پسلی جوتے کھا رئیں
تھُت تمھاری کی

پھسیاں پکڑتے گھر سے نکل کو ۔۔۔ کیچوے لگا رئیں اپنی گل کو
کھیکڑے بیٹھیں اُن کو نگل کو ۔۔۔ تیر نڑا اپنا تمھیں ہلا رئیں
تھُت تمھاری کی

رکھ کو تخلص اپنا پچکر ۔۔۔ ظاہر کر رئیں خود کو بیچلر
کاماں کر رئیں سارے چلتر ۔۔۔ باوا حضت کا نام ڈبا رئیں
تھُت تمھاری کی

غزل

یوسف جانی میدکی

کرے گی محبت، اثر دھیرے دھیرے ۔۔۔ جُھکے گی تمھاری کمر دھیرے دھیرے
جو ہر سال گل، یوں ہی کھلتے رئیں گے ۔۔۔ بچے گا تمھارا بھی گھر دھیرے دھیرے
اکڑ رئیں اکڑ لو، مٹک رئیں مٹک لو ۔۔۔ اُتر جائیں گا یہ کلر دھیرے دھیرے
بغل میں دبائے برانڈی کی بوتل ۔۔۔ میاں شیخ جا رئیں کدھر دھیرے دھیرے
قرض لینے جا رئیں اُتو جلدی جلدی ۔۔۔ ادا کرنے آ رئیں مگر دھیرے دھیرے
حسینوں کی آنکھوں کا تارا بنو گے ۔۔۔ نظر آؤ ٹیکنی کلر دھیرے دھیرے
بھلا ویں سے گھر جا کر صدقہ اُتارو ۔۔۔ کہیں لگ نہ جائے نظر دھیرے دھیرے

م۔ع۔ عشرت صدیقی (جونپور)

بخار

واہ کیا نام ہے۔ بخار۔ دیکھئے نا، بخار کا نام لیتے ہی بخار کا احساس ہونے لگتا ہے اور بخار چڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔

یوں تو بخار کئی قسم کا ہوتا ہے۔ خوشی کا بخار، رنج و غم کا بخار، غصہ کا بخار، بغض و نفرت کا بخار اور اب تو اقسام میں اضافہ ہوگیا ہے فلمی بخار اور ڈسکو بخار وغیرہ بھی تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ یہ بھی بخار بیماری والے بخار سے کہیں زیادہ خطرناک ہوا کرتے ہیں اور یہ جس کے سر پر چڑھتے ہیں اس کی عقل خبط ہوجاتی ہے اور پھر جب تک کسی دوسرے پر اس کا بخار اتر نہیں جاتا اس وقت تک اسے سکون نصیب نہیں ہوتا لیکن صاحب چھوڑیئے ان بخاروں کو، میں تو آپ سے سیدھے سادے بخار کی بات کر رہا ہوں۔

ادھر کافی دنوں سے میری ملاقات جناب "بخار" سے نہیں ہوسکی تھی جس کی وجہ سے طبیعت کچھ بےمزہ تھی۔ تبھی جو پچھلے دنوں صبح کو ڈیوٹی سے آتے ہی بغیر سردی کا خیال کئے نہالیا اور کھانا کھاکر اطمینان سے سویا اور شام تک سوتا رہا۔ کسی نے جگانے کی زحمت بھی نہ کی۔ کیونکہ رات کی ڈیوٹی کے بعد اکثر ہی دیر تک سوتا تھا۔ خیر صاحب شام کے وقت جب اٹھا تو کچھ عجیب ہی کیفیت تھی۔ سر بھاری آنکھوں میں جلن، ماتھا بھی گرم اور تبھی مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر بخار نے شرف ملاقات بخشا ہے۔ پھر کیا تھا میں نے اطمینان سے چادر اوڑھی اور چارپائی پہ دراز ہوگیا کیونکہ بخار صاحب کا ساتھ ہو اور آرام نہ لیا جائے۔ غیر ممکن۔

بیماری کی خبر پھیلتے ہی احباب عیادت کے لئے چلے آرہے ہیں۔ "ارے بھئی عشرت صاحب خیریت تو ہے، یہ بخار آپ نے کہاں سے لگا لیا۔"
"اجی عشرت میاں یہ تم نے کیا روگ پال لیا۔ جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ، پرسوں ایک نشست ہے اور اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔" "کہئے جناب عشرت صاحب آخر بخار نے پٹخنی لگادی نہ، بہت اینٹھے اینٹھے گھومتے تھے کہ بھئی مجھے تو کبھی بخار آتا ہی نہیں۔" غرض ایسے ایسے حسین فقرے اپنی

شان میں سننے کو ملے کہ بس لطف آگیا۔

دوسرے دن صبح سے کھٹی میٹھی کڑوی کسیلی دوائیں، لال پیلی کالی سفید ٹکیاں کھانے کو ملنے لگیں لیکن جناب یہ بخار ـــــ جو کافی عرصہ کے بعد آیا تھا لہٰذا اتنی آسانی سے ٹلنے کو تیار نہیں تھا اور میں اپنی خوش بختی پر خوش تھا کیونکہ اب بات ٹکیوں کے بجائے خوش رنگ کیپسولس تک جا پہنچی تھی۔

پہلے زمانہ میں حکیم لوگ بھوک ہڑتال کروایا کرتے تھے لیکن ڈاکٹروں نے یہ پابندی بھی اُٹھادی ہے۔ اس لئے تھوڑا بہت، کھانا پینا بھی چلتا رہا۔ لیکن بخار صاحب سے اپنی یہ توہین برداشت نہ ہوسکی اور انھوں نے منھ کا مزہ ایسا بگاڑ دیا کہ کچھ کھانا ممکن ہی نہ رہا۔

دوست احباب جو عیادت کو آتے اپنے ساتھ پھل "فروٹ" ضرور لے آتے۔ تو جناب بخار کے طفیل میں پھل وغیرہ کھانے کو ملے۔ ورنہ کون اس گرانی میں پھل کھاتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے حکم پر دودھ بھی پینا پڑا۔ ورنہ دودھ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ (سچ پوچھیے تو ملتا ہی نہ تھا) لیکن بخار صاحب کی خاطرداری تو کرنی ہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بخار کو بھگانے پر تلے ہوئے تھے اور بخار صاحب اتنی جلدی جانے کو تیار نہیں تھے۔ اس لئے کیپسولس کے بعد انجکشن کا نمبر بھی آگیا۔ اور سوئی کی چبھن کا مزہ بھی لینا پڑا۔ الغرض اس بخار کی مہربانی سے میں نے طرح طرح کے لطف اُٹھائے لیکن آٹھ دنوں کے بعد میں خود بھی اوب گیا اور اُن سے لڑنے کو تیار ہوگیا اور تب مجبوراً دس روز میرے سر پر سوار رہنے کے بعد جناب بخار صاحب تشریف لے گئے۔

بخار کے چلے جانے کے بعد جب اُٹھ کر چلا ہوں تو بس لطف آگیا۔ نقاہت کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ازسرِ نو چلنا سیکھ رہا ہوں۔ بدن میں سنسناہٹ، ہر قدم پر لڑکھڑاہٹ، بس کچھ عجیب کیفیت تھی۔

بخار کی مہربانی سے مسلسل پندرہ دن تک دفتر سے بھی فرصت مل گئی تھی اور بخار اُترنے کے بعد "وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے" والی کہاوت راس آئی۔ اور دفتر کی فکر لاحق ہوئی۔

اور اپنی زندگی کا چکر پھر معمول کے مطابق چلنے لگا۔ اس لئے اب پھر مجھے انتظار ہے کہ کب بخار صاحب تشریف لاتے ہیں اور غم دنیا سے کچھ دنوں کے لئے مجھے کب فرصت ملتی ہے۔

لیجئے صاحب میں نے اپنا بخار تو اُتار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ پڑھتے پڑھتے خود آپ لوگوں کو بخار چڑھ آیا ہو۔ اور آپ لوگ بخار میں لال پیلے ہو رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو علاج کا دعویٰ مدیر "شگوفہ" پر کیجیے۔ اگر فرصت ملی تو پھر ملاقات ہوگی۔ — —

شہزاد معصومی

اس کا رہے خیال ہنسی ہو نہ زہر خند

شائستگی سے دُور ظریفانہ شاعری یوں ہے کہ جیسے سر پہ غلاظت کی ٹوکری
ہو چٹ پٹی سی نظم جو طنز و مزاح کی پھر تو ملے زباں کو ظرافت کی چاشنی
جیلی، اچار، چٹنی، ہری مرچ کا مزا پڑھ کر نہ جب ملے تو بھلا کیا وہ شاعری
وہ نظم کامیاب نہیں پیشِ اہلِ ذوق نشتر زنی سے جس کی نہ پیدا ہو گدگدی
جس پر ہو چوٹ، چوٹ وہ کھاتے ہی ہنس پڑے جیسے کہ کی گئی ہو کوئی اُس سے دل لگی
چوری پہ نظم چور بھی پڑھ، سن کے داد دے تصویر اُس کے حُلیہ کی اُس میں ہو گو کھنچی
چوری کا مرغ کیسے کیا جاتا ہے حلال کرتا ہے کس طرح سے اُسے ہضم مولوی
یہ نظم سُن کے بگڑے نہ جب اُس کا ہاضمہ پی جائے سارا طنز ہلاہل ہنسی خوشی
تب جا کے نظم ہو گی مکمل مزاحیہ جب قہقہہ لگائے گی شکلِ محترمی
جھگڑا فساد کرنے پہ گر تُل گیا کوئی پھر تو رہے گی نظم میں اک آنچ کی کمی

اس کا رہے خیال ہنسی ہو نہ زہر خند
یعنی مزاح و طنز نہ بن جائے وعظ و پند

پیروڈی

روشن لال روشن
(وارانسی)

کانگریس میں اُمیدواری کی "کوئی اُمید بر نہیں آتی"
پہلے آتی تھی بات بات پہ شرم "اب کسی بات پر نہیں آتی"
ملک کے پرچہ و رسائل میں "کچھ ہماری خبر نہیں آتی"
میں نہ مقروض ہوں نہ شاعر ہوں "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"
شعر کہتے ہو اس زمانے میں "شرم تم کو مگر نہیں آتی"
لیڈروں سے نجات کی روشن "کوئی صورت نظر نہیں آتی"

٭ ٭ ٭

دو شعر

وہ تو نیتا ہوئے وزیر ہوئے اور ہم صرف راج گیر ہوئے
بال سونے کے، جسم چاندی کا اس طرح وہ بھی اک امیر ہوئے

صنعتی محاذ پر آندھرا پردیش کے بڑھتے قدم

جنوری ۸۳ء سے شری این۔ ٹی۔ راما راؤ چیف منسٹر کی زیر قیادت آندھرا پردیش نے صنعتی محاذ پر شاندار ترقی کی ہے۔

صنعتی ترقی:

- آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن نے جنوری ۸۳ء سے اب تک ۲۹۵۰ یونٹس کے قیام کے لئے ۶۸ کروڑ روپئے مہیا کئے ہیں
- آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے ۵۵ نئے پراجیکٹس کے لئے ۱۹۷ کروڑ روپے مہیا کی ہے۔
- بڑے پیمانے کی اور درمیانی درجے کی ۳۲ صنعتوں کے لئے ۵۹۱.۴۰ کروڑ روپئے فراہم کئے گئے اور ان سے ۶۲۴۸ افراد کو روزگار ملا ہے۔
- ۱۴۷۸ چھوٹی صنعتوں میں پیداوار شروع ہو گئی ہے۔
- کاکی ناڈا میں ناگر جونا فرٹیلائزرس، منگل گیری میں ٹائر فیکٹری اور آندھرا پردیش ہیوی انجینئرنگ مشنری لمیٹڈ جیسے یونٹوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔

کاریگروں کی امداد:

- ۱۰۴ نئے فنی کامپلکس قائم کئے گئے ہیں جس کے ذریعہ ۲۰۸۰ کاریگروں کو راست اور ۶۲۴۰ کاریگروں کو بالراست روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔
- ۴۴۸۶۰ کاریگروں کی مدد کی گئی اور ۸۰۸۱ کو تربیت دی گئی۔
- "گرامودیا" اسکیم کے تحت ۲۰۸۰۵ اُمیدواروں کو خود روزگار فراہمی کے لئے منتخب کیا گیا۔

—— (آندھرا پردیش نئے صنعتی دور میں داخل ہو رہا ہے) ——

"ڈی۔ آئی۔ پی۔ آر آندھرا پردیش" DIPR No. 4/PDL/Advt/C4/84. dt. 13-3-1984.

غزلیں

عزیز الرحمٰن (بھاگل پور)

آتی ہیں روز خبریں عالم کے ریڈیو سے
جلتا ہی جا رہا ہے یہ گلستاں ہمارا

رہزن بنا ہوا ہے ہر رہنما ہمارا
لٹتا ہے روز و شب میں ہر کارواں ہمارا

مچتی ہے کونسلوں میں دن رات خوب بھگدڑ
بوٹوں سے روندتا ہے جب حکمراں ہمارا

تلتی ہے چاندیوں میں علم و ہنر کی عفت
زنجیرِ دست و پا ہے ہر باغباں ہمارا

شانِ وطن کی خاطر ہم سر کٹا چکے ہیں
کیوں لے رہا ہے ظالم پھر امتحاں ہمارا

عبدالحمید کتنے قرباں ہو چکے ہیں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

★

یوسف یکتا

(حضرت فنا نظامی سے معذرت کے ساتھ)

"دو گھونٹ کا میں ساقی الزام نہیں لوں گا"
مٹکے کا میں عادی ہوں اک جام نہیں لوں گا

گھر جھاڑنے بولا تو جھاڑو ہی پھرا ڈالے
اب بارِ دگر اُن سے کچھ کام نہیں لوں گا

جی جان لڑا ڈالوں گلشن کو بنا ڈالوں
"حق میرا مجھے دے دو انعام نہیں لوں گا"

سرکار کا وعدہ ہے وہ دیں گے اضافے دو
میں تیسرے بچے کا اب نام نہیں لوں گا

چوتھی بھی ہوئی رخصت حد ہو گئی اب یکتاؔ
شادی کا مرے دم تک، مَیں نام نہیں لوں گا

★

اختر سعیدی (رانچی)

بڑھاپے میں طبیعت کی یہ جولانی نہ جائے گی
کہ دل کے آئینے سے شکلِ نورانی نہ جائے گی

سفیدی بال کی ہرگز نہ جائے گی خضابوں سے
تمہارے ساتھ پیچھے کو وہ دیوانی نہ جائے گی

میں بچوں کا محافظ ہوں، میں اب گھر کا نگہباں ہوں
مری قسمت میں لکھی ہے جو دربانی نہ جائے گی

نظر اُس کی چپل پر بہ وقتِ گفتگو نادان
بگڑ جائے گی صورت ایسی، پہچانی نہ جائے گی

کبھی جو گدگدایا ہنستے ہنستے اُن کو اے اخترؔ
کہا اس نے بڑھاپے میں بھی شیطانی نہ جائے گی

غزلیں

سراج نرملی

لم اتنا کیا نہیں جاتا
ہم سے بیگم! سہا نہیں جاتا

جی میں جو آئے بکتی رہتی ہو
ضبط ہم سے کیا نہیں جاتا

ب سے شادی ہوئی مری یارو
ھر سے باہر رہا نہیں جاتا

ہوگیا تھا شروع جو بَبلو سے
اب تلک سلسلہ نہیں جاتا

ریج ہوتا ہے میری محنت کا
کچھ ترے باپ کا نہیں جاتا

آپ سے چپ رہا نہیں جاتا
"اور ہم سے سُنا نہیں جاتا

سیاری ہوٹلوں میں جاتی ہے
ن کرپشن رہا نہیں جاتا

دور ہے یہ تو بے ایمانی کا
قرض لے کر دیا نہیں جاتا

ب بھی مہمان آئے کہتی ہو
ب تلک یہ ہُوا نہیں جاتا

کچھ نہ کچھ ہے غرض سراج ان میں
یونہی تحفہ دیا نہیں جاتا

○

وہ کرپشن کے جو منسٹر ہیں
میری بیگم اُنہیں کی دختر ہیں

وہ پہنتے ہیں ٹوپی اب کیونکہ
صرف گنتی کے بال سر پہ ہیں

ان کو پبلک سے واسطہ کیا ہے
خود غرض آج کل کے لیڈر ہیں

بول بھارت میں آج کتنوں کو
روٹی کپڑا مکان میسر ہیں

جس طرح دل بدلتی دیکھا ہے
آج یوں دل بدلتے لیڈر ہیں

ہے بھلا کون ان میں کم ظالم
بس اسی کشمکش میں ووٹر ہیں

رہبروں سے تو چور ڈاکو ہی
لاکھ درجے سراج بہتر ہیں

★

یوں تو کہنے کو COMPETITION ہے
رشتہ داروں کا بس SELECTION ہے

تحفتاً دے رہا ہوں میں تم کو!
کون کہتا ہے یہ CORROPTION ہے

اب تو آنے لگے ہیں سب لیڈر
آخری ویک میں ELECTION ہے

قائل یہ کچھ تو ویٹ رکھتا تھا
بس یہی ایک OBJECTION ہے

کیا ہے بتلا دے آخری خواہش
کل ترے دل کا آپریشن ہے

شاعری چھوڑ دے سراج اب تو
یہ مرا SINCERE SUGGESTION ہے

(رپورٹ)

جشنِ رسمِ رونمائی

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

مصنفہ :- ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

ایچ ای ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری حیدرآباد کے اسٹڈی سرکل "حلقۂ ارباب ذوق" کی جانب سے ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کی تصنیف "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کی اشاعت پر جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں "جشن رسم رونمائی" کا شاندار پیمانے پر اہتمام کیا گیا۔ جناب صادق علی سابق گورنر مہاراشٹرا و ٹامل ناڈو مہمانِ خصوصی تھے۔ ابتدا میں جناب محمد منظور احمد معتمد نے خیر مقدمی تقریر کی۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنی تقریر میں کہا کہ خواجہ صاحب نے طنز و مزاح کی مختلف ادبی و غیر ادبی اقسام کو اپنی تصنیف میں یکجا کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی، امریکی یوروپی ادبیات سے مثالیں بھی فراہم کی ہیں اور طنز و ظرافت کے مختلف اقسام کے نازک اور باریک فرق کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ مغنی صاحب نے کہا کہ ظرافت مستقل صنف ادب نہیں ہے وہ ایک اسلوب ہے اسی لئے تمام اصناف ادب میں ظرافت ملتی ہے۔ خواجہ صاحب کا یہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ تحقیق تنقید سے زیادہ خشک ہوتی ہے۔ لیکن خواجہ صاحب نے اپنے اسلوب کے ذریعے اس تحقیق کو بہت دلچسپ بنادیا ہے۔ مثالوں کی وجہ سے عام آدمی بھی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ طنز و مزاح کی اصطلاحوں کو سمجھنے میں عام قاری کو اس کتاب سے یقیناً مدد ملے گی۔

ممتاز مزاح نگار رشید قریشی نے اپنے مخصوص انداز میں خواجہ صاحب کے تنقیدی جائزہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب کے لئے کسی بھی بات کو سنجیدہ بنانا آسان ہے۔ کیونکہ خود ان کے قول کے مطابق ان کا مزاج بچپن سے ظریفانہ ہے۔ ان کے مزاح میں انگریزی مزاح کی چھاپ ہے جس کی نشو و نما جامعہ عثمانیہ کے ماحول میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ بادۂ علم کے جام بھی دیتی تھی اور ظرف کو سنوارنے کا انتظام بھی کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کی گل نگاری نے طنز و مزاح کی سنگلاخ زمین کو شادابیوں سے ڈھانک دیا ہے۔ ان کی یہ تصنیف جہاں طالب علموں کے لئے پڑھی جائے گی وہیں عوام کے لئے بھی پڑھی جائیگی۔

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے خواجہ صاحب کی

شخصیت اور فکر و فن کا مخصوص شگفتہ انداز میں تذکرہ کیا اور ان پر ایک مضمون سنایا۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ اُردو کے بہت کم محققین نے طنز و مزاح کی طرف توجہ کی ہے۔ ڈاکٹر غفور کی یہ کاوش اردو تحقیق میں سنگ راہ اور نشانِ منزل ہے۔ ان کی یہ تصنیف خیال انگیز اور خیال افروز ہے۔ واسوخت کو مزاح کی صنف میں شامل کرکے خواجہ صاحب نے جدت سے کام لیا ہے۔ یہہ ان کی اپنی اُپج ہے۔ ان کی فعّال اور ذہین شخصیت نے تحقیق کے میدان میں جوہر دکھائے ہیں۔ اسی علمی و ادبی کاوش کے ذریعہ خواجہ صاحب نے طنز و مزاح کے موضوع کا سیر حاصل اور بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اور جدید مغربی مصنفین اور ماہر نفسیات کی کتابوں سے قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ انھوں نے اُردو ماحول اور ہندوستانی ماحول سے مثالیں دی ہیں۔ طنز و مزاح کے میدان میں کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز اگر اس سے استفادہ کریں تو ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوگی۔ ان کی اس تصنیف سے صنفِ تحقیق میں ایک نئی راہ کھل گئی ہے۔ مزاح سے انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس کتاب میں مزاح کے زندگی، فرد اور سماج سے ربط و تعلق کو بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

مہمان خصوصی جناب صادق علی سابق گورنر مہاراشٹرا نے بمبئی کی تہذیبی زندگی میں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کے حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ بمبئی کا ہر شخص خواجہ صاحب کا نام محبت، عزت اور احترام سے لیتا ہے۔ مہاراشٹرا میں ان کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس تحقیقی مقالہ میں ان کی شخصیت ڈوبی ہوئی ہے۔ طنز و مزاح کے موضوع سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔ ہمیں دنیا کو ظریفانہ نگاہ سے دیکھنا چاہئیے۔ آج چھوٹے اور بڑے ہر آدمی کو مزاح کی ضرورت ہے۔ بعض کتابیں قاری کو سلادیتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی یہ تصنیف قاری کو جگائے گی۔ انھیں لکھنے کی دُھن اور شوق ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی کارناموں کے ذریعہ ملک و قوم اور اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔

جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ قدرت کا کچھ عجیب انتظام ہے کہ جن لوگوں کو حسن نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض کو سینس آف ہیومر ملتا ہے۔ تاکہ وہ حسن برت سکیں۔ بعض کو انتقاماً حسن پرست بنادیا جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو دوسری قسم کا آدمی سمجھتا ہوں۔ آج سے چھیالیس سال پہلے، جب میں جامعہ عثمانیہ کے ہوسٹل میں شریک ہوا تو مجھے خواجہ عبدالغفور صاحب کا 'دیدار' نصیب ہوا۔ کالج میں غفور صاحب مجھ سے دو سال سینئر تھے، حیدرآباد سول سروس میں چھ سال سینئر تھے، اور شائد مزاج کے معاملے میں مجھ سے سو سال سینئر ہیں۔ آپ شائد مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے دیدار کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے آدمی کو دیکھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے مجھے دیکھا لیکن اگر آپ بڑے ملیح اور خوبصورت آدمی کو دیکھیں تو کہنا چاہیئے کہ آپ کو اس کا دیدار نصیب ہوا۔ چنانچہ برسوں پہلے باوجود اس کے کہ جامعہ عثمانیہ میں سینئر کی بڑی اہمیت تھی، اور سینئرس کا خیال تھا کہ حسن پرست ہونا صرف انہی کا حق ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری

حسن پرستی کی شدت میری سنیریٹی سے زیادہ تھی۔

خواجہ عبدالغفور صاحب کو جو مجھ سے سینیر تھے، جس دن میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تو وہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا۔

زلفیں بھی نہ تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

میرا لڑکپن تھا اور ان کی جوانی، اس مصرعے کے بعد مجھے یہ توضیح کرنی پڑنے گی کہ زلفیں میری نہیں تھیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں عرض کروں کہ غفور صاحب سے میرا ربط بہت طویل رہا ہے۔ طالب علمی کے بعد جب میں ۱۹۴۶ء میں سول سروس میں آیا تو غفور صاحب سول سروس کے نگران کار تھے، پھر ان کے زیر نگرانی میری ٹریننگ ہوئی۔ ٹریننگ کے بعد جب سوشیل سروس کے محکمہ میں میرا تبادلہ ہوا تو غفور صاحب اس کے ناظم تھے یہاں بھی مجھے ان کی ماتحتی کا شرف حاصل ہوا۔

پھر اس کے بعد راستے بدل گئے۔ وہ مہاراشٹرا چلے گئے میں حیدرآباد میں رہ گیا۔

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

خواجہ عبدالغفور صاحب نے ایک غیر شہر اور غیر ریاست میں بڑا نام کمایا۔ میں چونکہ بالکل روایتی قسم کا سول سرونٹ تھا اس لیے گمنام ہی رہا۔

ایک عرصے کے بعد ان کی کتاب دیکھی تو ادبی چیزوں کے علاوہ ایک غلط فہمی جو مجھے ان کے بارے میں تھی کہ وہ زیادہ محنت نہیں کرتے، دور ہوگئی۔ اس کتاب کے لکھنے میں انھوں نے غیر معمولی محنت کی ہے، سلیقے اور تلاش سے چیزیں جمع کی ہیں۔ شاید میری محرومی تھی کہ میں یہ کمی تھی کہ ان کا یہ پہلو میں نہ دیکھ سکا۔

خواجہ عبدالغفور صاحب کی زندگی کے بہت سے پہلو مجھے پسند ہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر رشک آتا ہے۔ ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ ان میں اتنی ساری خوبیاں کہاں سے یکجا ہو گئی ہیں۔

انڈر گریجویٹ عبدالغفور صاحب اور پی۔ ایچ۔ ڈی غفور صاحب میں چھیالیس سال کا فصل ہے۔ حالانکہ اگر وہ باقاعدگی سے جبھی پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتے تو شاید چھ سال میں ان کی بات پوری ہو جاتی۔

اب ایک اور بات کہ وہ نہ صرف صاحب کتاب، مصنف ہیں اور انہوں نے مصنف اور مکمل چیزیں لکھی ہیں بلکہ تحقیق بھی کر لی ہے۔ وہ مستند طور پر اردو کے ماہر ہیں اگر جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر بننا چاہیں تو یقیناً بڑی خوشی سے انھیں . . . . . . !

آخر میں صاحب مصنف ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور نے ان کے اعزاز میں منعقدہ اس خوبصورت محفل کے لیے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ ـــــ!

بمبئی کے زمانے میں جب میں چیف آف پروٹوکول تھا اور محترم صادق علی صاحب وہاں گورنری کے عہدے پر فائز تھے، میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور آج جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا کہ میری کچھ باتیں انھیں بھی پسند تھیں، میں اپنے آپ کو اس کے لیے قابل فخر سمجھتا ہوں۔

جہاں ایک طرف مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں دوسری طرف اس جلسے کے صدر [illegible]

صاحب شریک ہیں۔ جن کی شخصیت سے آپ بدیر واقف ہوئے ہوں۔ مگر جیسا کہ انھوں نے خود کہا میں کئی برسوں سے ان سے واقف ہوں۔ کچھ خاندانی مراسم بھی رہے اور ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا وہ حسن پرستی سے بڑھ کر حسنِ ظن پر محمول ہوتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے جو باتیں کہیں انھیں میں بہ خوشی قبول کرتا ہوں کیوں کہ ایسا نہ کروں تو کفرانِ نعمت ہوگا ـــــ بہت زیادہ خاکساری کا بھی میں قائل نہیں ہوں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک نوجوان کو ایک لڑکی سے شادی کرنے کا خیال آیا، دل آگیا تھا، دوستوں سے مشورہ کیا، لوگوں نے کہا بھئی یہ خاکساری اور انکساری کا زمانہ ہے، لڑکی سے کہو تم بڑی خوب صورت، قابل، باصلاحیت ہو، بڑی دانشور ہو، تمہارا خاندان بہت اعلیٰ ہے۔ اور اپنے متعلق کہو کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میری محبت تمہاری طرف کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ اس پر عمل کر کے انھوں نے لڑکی کے سامنے بات چھیڑی، دو چار منٹ تو وہ سنتی رہی اور پھر بولی "تم تو بالکل فضول اور بے کار آدمی ہو، تم میں ایک بھی خوبی نہیں ہے کہ میں تم سے شادی کروں۔"

اس لیے بہت زیادہ خاکساری کبھی آدمی کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ حیدرآبادی اس معاملے میں بہت بدنام ہیں۔ دوسروں کی تعریف میں رطب اللسان اور خود کے معاملے میں خاکساری برتی جاتی ہے۔

یہ تو صرف ایک جملہ معترضہ تھا، ایک اور واقعہ مجھے یاد آیا کہ کسی انگریز کی موت کے بعد اس کے کفن دفن کا اہتمام ہو رہا تھا، پادری اس وقت مرنے والے کی تعریف کرتے ہیں کہ بہت اچھا انسان تھا، بہت اچھا باپ، بھائی، شوہر اور پڑوسی تھا۔ اس نے بہت سے اچھے کام کیے۔ بہت سی خوبیاں تھیں . . . .

پادری حسب عادت اپنی رو میں بول رہا تھا۔ اُدھر غم و اندوہ سے بوجھل مرنے والے کی بیوی اتنی تعریفیں سن کر حیرت زدہ تھی۔ بولی "آپ لوگ کسی غلط آدمی کو تو دفن کرنے نہیں آئے ہیں" ـــــ مجتبیٰ حسین کی باتوں پر مجھے خیال آیا کہ کہیں انھوں نے غلط کلکٹر کو تو نہیں دیکھا۔ ان کا بھی یہ حسنِ ظن برسوں سے میرے ساتھ رہا ہے۔ ان کے دلچسپ اندازِ بیان اور اسلوب کی وجہ سے ان کا مضمون پسند کیا جائے گا۔

مجتبیٰ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ناچیز کو چیز بنا دیتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ اپنی لطیف ہجو سے کام لے کر گستاخی تک کر بیٹھتے ہیں کہ صاحبِ نشانہ بُرا ماننے کے بجائے اپنی تعریف سمجھ بیٹھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کے مضمون میں اس قسم کی کوئی بات تھی، میں اُسے بہ خوشی قبول کرتا ہوں۔

اس کے بعد استادانِ جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب نے کتاب کے تعلق سے اس کے اسلوب اور تحقیقی عناصر پر جو کچھ کہا ہے۔ اس کے بہترین جج آپ خود ہیں۔ شخصیت کے بارے میں صحیح یا غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ حضرات علم و ادب کے ساتھ زیادتی کریں گے۔ ان کا اعلیٰ مقام اور درجہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ میری کمزوری یا کوتاہی کی نشاندہی سے گریز کریں گے البتہ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ جب کوئی پروفیسر بولنے پر آتا ہے تو سیدھے پچپن منٹ بولتا چلا جاتا ہے۔

کیوں کہ اس کا لیکچر ٹائم پچیس منٹ مقرر ہوتا ہے لیکن انھوں نے جتنی دیر میں، جو کچھ کہا وہ کسی طویل طویل داستان سے زیادہ تنقیدی اشارے ہیں۔ یہ سب میرے لیے ہمت افزائی اور حوصلے کا باعث ہیں۔ آئندہ میں کوئی تخلیق یا تصنیف پیش کروں گا تو ان باتوں کو ضرور میں اپنی نظر میں رکھوں گا۔

میرا خیال تھا کہ ہاشم علی اختر صاحب بھی اسی گروہ کے سربراہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی اسی انداز میں بولیں گے۔ ایسے موقعوں پر طویل طویل بات مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ چاہے وہ آپ کے اپنے بارے میں ہی کیوں نہ کی جا رہی ہو۔ بارہا اس قسم کے سوال کیے جاتے ہیں کہ آپ اپنی پسند کی دس کتابوں کے نام بتائیے، تو میں ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہوں کہ میں نے اب تک صرف چھ کتابیں لکھی ہیں، میں بھلا دس کتابوں کے نام کہاں سے بتا سکتا ہوں۔ یہ کوئی خودستائی یا خود بینی نہیں ہے بلکہ رو میں ایسا ہو جاتا ہے۔

البتہ "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کے لیے میں نے جس طرح محنت کی ہے۔ جیسی اصناف و اقسام کی درجہ بندی کی ہے۔ اس سے یہ ایک اچھی کاوش ہوگئی ہے اور ریسرچ اسکالروں کے علاوہ عام قاری کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔ اس کے لیے جن کا تعاون مجھے ملا ان کا ذکر ضروری نہیں لیکن جنھوں نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا اس میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ کا نام نامی خاص ہے۔ وہ سخت قسم کی ممتحن مشہور ہیں لیکن ازراہ کرم ان کے اعلیٰ ذوق اور بلند پروازی نے اسے پسند کیا۔ بہا الفاظ کے متبادل انگریزی اور ہندی مثالوں کے انتخاب میں کچھ فروگذاشت ہوئی ہو۔ یہ بنیادی اساسی کام ہے۔ اس پر دوسرے بہت سے لوگ کام کر سکتے ہیں، اور آگے بڑھا سکتے ہیں۔

میری کالج کے زمانے سے ہی رشید قریشی صاحب سے بڑی گہری دوستی رہی ہے۔ اس وقت ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ آئندہ کالج کی ڈگریوں کے علاوہ بھی لکھنے پڑھنے کے کام سے وابستہ رہیں گے۔ اس قسم کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں نہیں تھا، لیکن رشید قریشی کی ہونہاری اور ذہانت مسلمہ تھی لیکن ہمارے فطری رجحان نے یہاں تک پہنچایا۔ میں رشید قریشی کو اس منزل پر دیکھ کر بہت خوش ہوں، وہ آج طنز و مزاح کے وسیع میدان میں کامیابی سے گامزن ہیں۔

اسی طرح یہاں ایک اور شخصیت مصطفےٰ کمال کی ہے، وہ شگوفہ نکالتے ہیں، شگوفہ کھلاتے بھی ہیں۔ انھوں نے بہت سے نوآموز اور مبتدی لکھنے والوں کو راستہ دکھایا ہے۔ ان کی ہمت بڑھائی ہے خصوصاً دکنی مزاح کو نئی سمت دکھائی ہے جس میں تھوڑی بہت امداد و اعانت اور قلمی تعاون کا حصہ میرا بھی رہا ہے، میں نے بھی ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔

نریندر لوتھر کسی وجہ سے جلدی چلے گئے۔ کبھی کبھی لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ انڈین ایڈمنسٹریشن والے، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، میں یا پیر دکی میں روی ہوتے ہیں یا کچھ اور لوگ ہیں۔ اس قسم کی مذاق کے میدان میں کس طرح آئے۔ تو عرض کروں کہ

ہماری زندگی میں تنوع بہت ہوتا ہے۔ فکر اور شعبوں کی تبدیلیاں سے مگر اکثر شاید ہمارا پہلا عشق یعنی اپنی زبان کا عشق حاوی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بار ہم سول سروسیس کے افسروں نے طے کیا تھا کہ ہم اب سے ہم زلف کہلائیں گے، کیوں کہ ہم اُردو کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔

غزل

— گھامڑ محبوب نگری

کہی ہے نظم کو میں نے اُلٹ پلٹ کے غزل
لکھی ہے اپنی روش سے یہ میں نے ہٹ کے غزل

غزل اُسی کی ہے پڑھتے ہوئے جو اُٹھ کے غزل
ہر ایک مصرعے میں جھٹکوں پہ کھائے جھٹ کے غزل

یہ ادبی بھور بڑے سینہ زور ہوتے ہیں
مشاعروں میں سناتے ہیں کیسے ڈٹ کے غزل

غزل کسی سے بھی لکھوا کے پڑھ تو سکتے ہیں
نہیں مذاق سنانا کسی کی رٹ کے غزل

غزل تو کیا کبھی اک شعر بھی نہیں ہوتا
کبھی کبھار ہی ہوتی ہے بھولے بھٹکے غزل

غزل کسی کی ہی صاحبِ کلام ہے وہ
رہی ہو نام سے برسوں اگر چپٹ کے غزل

نہ بحر کوئی نہ ارکان قافیہ نہ ردیف
غریب رہ گئی لفظوں میں آج بٹ کے غزل

کہیں پہ نثر کا دھوکہ، کہیں پہ نظم لگے
گماں یہ ہوتا ہے شاید چھپی ہے کٹ کے غزل

جو داستاں سے کہانی بنی فسانہ ہوئی
بنی ہے صدیوں میں یوں گھٹتے گھٹتے گھٹ کے غزل

بھروسہ کچھ نہیں گھامڑ نہ جانے کب کس کو
بٹھا دے عرش پہ یا پھر زمیں پہ پٹ کے غزل

انیس احمد خاں (نئی دہلی)

بال کی کھال (تبصرہ)

"گھات میں بات"

مصنف فکر تونسوی

با ادب با ملاحظہ ہوشیار! ظلِ سبحانی جن کا چہرہ نورانی، قلم مانگتا ہے جن سے پانی اچھے اچھوں کی مرتی ہے جن کے سامنے نانی، جن کی عجب ہے کہانی، وہی طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ، چشم بردار، فی الحال چلنے پھرنے سے لاچار، پھر بھی عمر کی جن پر ابھی تک نہیں پڑی مار یعنی فکر تونسوی ان کی نئی کتاب "بات میں گھات" بازار میں آچکی ہے۔

"بات میں گھات" پورے دو سو سینتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں اڑتیس مضامین ہیں یہ کتاب ان چوروں کے نام معنون ہے جو انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی قیمت بیس روپے ہے یہ اور خطرت ہے کہ مجھے بزوری میں ملی اس کی وجہ یہ ہے کہ فکر صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اور میں اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا ہوں ویسے بھی میں ایک طالب علم ہوں جس کے لئے علم کی چوری جائز ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ یہ چوری آج کل فقط کتابوں تک ہی محدود ہوگئی ہے۔

چور اسے کہتے ہیں جو چوری کرتا ہے۔ اور چوری اس پروگرام کو کہتے ہیں جو چور کے ذریعہ انجام پاتا ہے فکر تونسوی کی یہ کتاب متعلق ہے کہ دنیا میں کتنی طرح کے چور ہوتے ہیں اور چوری کرنے کے کتنے طریقے ہیں۔ شاید یہی سوچ کر میں نے یہ کتاب وہاں سے چرائی تھی لیکن پڑھ کر مایوسی ہوئی مایوسی تو فی الحال ایک بہت بڑے نیتا کو بھی ہوئی تھی جب موصوف کی ایک تصنیف بعنوان "بدنام کتاب" تنہائی میں پڑھنے کے لئے اٹھا کر لے گئے تھے۔

فکر کیا لکھتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔ وہ طنز لکھتے ہیں یا مزاح مجھے یہ بھی نہیں معلوم مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ وہ آدمی کو ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی۔ جب آدمی ہنستا ہے تب اس کے من میں میل نہیں ہوتا۔ ہنسنے سے لمحہ بھر پہلے اس کے من میں میل ہو سکتا ہے اور ہنسنے کے پل بھر بعد بھی۔ پھر جس کا ہاضمہ اچھا ہو وہی ہنس سکتا ہے۔ قبض کا مریض مشکل سے ہنستا ہے۔ لہٰذا فکر کی باتیں قبض توڑ گولیاں ہوتی ہیں۔ اب وہ قبض چاہے پیٹ کا ہو یا دماغ کا۔

دماغ کا قبض توڑنے کے لئے طنز نگار طنز لکھتا ہے۔ جو کہ وہ ملک یا معاشرے کے حالات سے متاثر ہوکر

کسی مصلح کے درد سے بھی زیادہ درد سے بے چین ہوکر لکھتا ہے۔ "بات میں گھات" ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ہے
ویسے بھی طنز ہلکے پھلکے ماحول میں لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ جب تک مصنف استحصال، پاکھنڈ، سماجی برائیوں اور تعصب سے دماغی طور پر اندر ہی اندر اینٹھنے نہ لگے تب تک طنز کے لئے ضروری چیز یعنی غصّہ نہیں اُبھرتا۔ جب مصنف غصّے میں اپنے آپ کو پاگل نہیں ہونے دیتا (کیوں کہ پاگل ہونا آسان ہے اور پاگل نہ ہوتے دینا اتنا ہی مشکل) اور اسی "نہ ہونے دینے" کی دھار پر کھڑا ہوکر مصنف جب قلم اٹھاتا ہے تو وہ تمام غصّہ تپے ہوئے تانبے کی مانند ڈھل کر سماج کے بدنما بے غیرت چہرے کو بے نقاب کرنے کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے فکر تونسوی کی یہی فکر "یہ بچّہ کس کا ہے" میں ملتی ہے۔

میری ان تمام باتوں سے آپ کہیں یہ نہ سوچنے لگیں کہ فکر تونسوی نے یہ کتاب اصلاحِ معاشرے کے لئے لکھی ہے۔ وہ اصلاحِ معاشرہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ روشناس ہو جائیں اس سڑاند اس بدبو اس کوڑھ اور ان پوشیدہ امراض سے جو ہمارے چاروں طرف پنپ رہے ہیں جس سے ہم شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ جیسے کہ قبلہ "اوماں او بھارت ماں" میں فرماتے ہیں۔ . . اور پھر عورتوں کی ایک ذات بالا خانے پر بیٹھتی ہے۔ ان کی روح کو مسلسل دُرّے مار کر معطل کر دیا جاتا ہے۔ صرف جسم کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ ان کے جسم کی عمر زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال ہوتی ہے۔ چار پانچ سال میں جب ان کے جسم کو گرم گرم گوشت سمجھ کر کھا لیا جاتا ہے تو باقی سوکھی ہڈیاں رہ جاتی ہیں اور دلال ان سوکھی ہڈیوں کو میونسپلٹی کے کوڑے دان کی طرف اُچھال کر پھینک دیتے ہیں۔ . . ."

"بات میں گھات" میں کئی مضامین ہیں جن میں کئی باتیں ہیں۔ لیکن ایک مضمون ہے "عالم و فاضل" لوگ"۔ . . .
اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی بلا کر شتر عالم فاضل رہتے ہیں۔ میں فکر صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ اگر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپے تو اس میں براہ مہربانی وہ اسے اکھتر کردیں۔

فکر جانوروں کے نام لیٹر بھی لکھتے ہیں۔ بھینس کو محترم خاتون اور گدھے کو بچھڑے ہوئے بھائی جان لکھتے ہیں۔ حالانکہ تجھ عمر کے اس عروج پر ہیں کہ ان کے علاوہ کسی کو لکھ بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا چوروں کے نام دوسرا خط بھی لکھ ڈالتے ہیں جس میں ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ تو خوب چوری کر اور جیب کاٹ لیکن کبھی کسی شاعر کے اوپر ہاتھ مت ڈال۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چوری کے جرم میں تجھے شاعر کی بیاض سننے کی سزا دیدیں۔

اب تبصرہ ختم کرتے ہوئے میں چند باتیں کتاب کے سرورق کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔ چند باتیں نیتا بھی فرماتے ہیں جو ~~جھٹ پٹے~~ گھنٹے دو گھنٹے کی تقریر کی صورت میں پھیل جاتی ہیں۔ مگر آپ خوف نہ کھائیں مہربان، فکر تونسوی کے قدر دان آپ پر قربان مری جان۔ میں اپنی بات آپ کی جان بچانے کی خاطر واقعی دو میں

جملوں میں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کتاب کا سرورق کالے بھورے، ہرے اور نارنجی رنگ پر مشتمل ہے۔ ان ہی رنگوں کے درمیان ایک محترمہ اپنی تمام بلندیوں کے ساتھ جانے کیا کچھ چھلکائی ہوئی کھڑی ہیں اور ایک گنجے صاحب چو خانے کا تہمد باندھے ان کے پیروں کا بوسہ لینے میں مشغول ہیں!

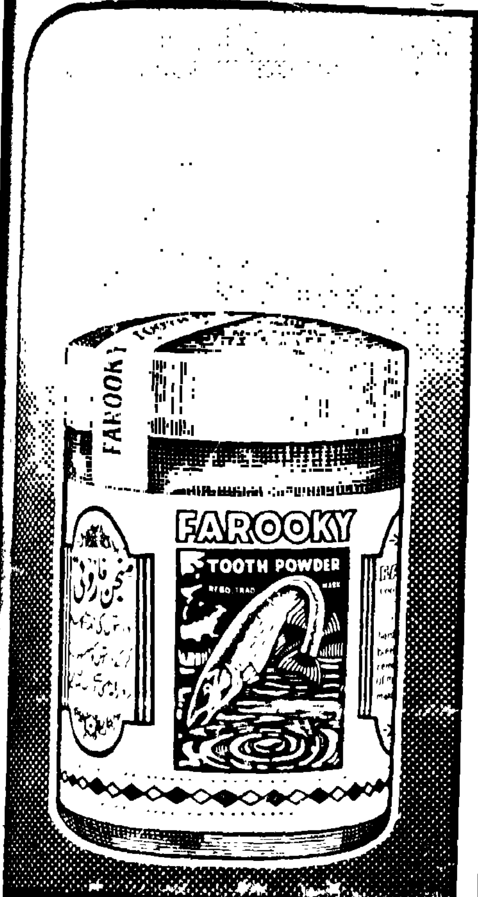
حالانکہ جی تو چاہتا ہے کہ بوسہ تو جناب فکر تونسوی کے ہاتھوں کا لیں جنھوں نے اپنی عمر کی اس بلندی سے طنز و مزاح کی ایک ایسی بوند چھلکائی ہے جس کے بارے میں بے دریغ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جو چکھے تو پچھتائے جو نہ چکھے تو پچھتائے"۔ ■■

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجا سکتی ہیں

○ کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵	روپے
○ دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸	"
○ آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹	"
○ نقطہ	یوسف ناظم	مضامین	۸	"
○ البتہ	"	"	۱۰	"
○ سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
○ بالآخر	مجتبیٰ حسین	"	۱۴	"
○ سُنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵	"
○ رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵	"
○ خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰	"
○ چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰	"
○ گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲	"
○ غیابِ حاضر	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
○ ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵	"
○ بہرحال	مجتبیٰ حسین	"	۷	"
○ چٹا پٹا	نسیم انجم	"	۱۴	"



Vol. 17 Copy 4 **SHUGOOFA Hyderabad-1** Postal Regd. No. H/HD
April 1984 Phone : 55771





دن بھر کی
خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:

شگوفہ

22/5/84

MAY 1984 **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

شگوفہ

جلد (۱۷) ★ شمارہ (۵)

مئی ★ ۱۹۸۴ء

کتابت: محمد عبدالرؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

چارکمان حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

فون: ۵۵۰۱۶

شگوفہ کی مجلس مشاورت کے رکن اور ممتاز مزاح نگار
ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کو بھرپور خراج عقیدت

ماہنامہ **شگوفہ** کا آئندہ شمارہ

خواجہ عبدالغفور نمبر

ہوگا

- خواجہ عبدالغفور کی مکمل سوانح حیات اور کارنامے
- خواجہ صاحب پر مختلف مشاہیر کے تاثراتی مضامین
- لالہ زار، گل و گلزار، سمن زار، قہقہہ زار اور شگوفہ زار کے علاوہ
- "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" سے انتخاب
- خواجہ صاحب کے لطائف و کارٹون
- خواجہ صاحب کے نام ممتاز شخصیتوں کے خطوط
- خواجہ صاحب کی سماجی تہذیبی اور اردو خدمات و دیگر موضوعات

صفحات : ۔۔۔۔۔ ۱۲۸
قیمت : ۔۔۔۔۔ صرف پانچ روپے

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

اداریہ

۲۶ر اپریل کو یہ روح فرسا خبر ملی کہ اردو زبان و ادب کے بے لوث خدمت گزار، سکریٹری مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی محترم خواجہ عبدالغفور کا حیدرآباد سے بمبئی سفر کے دوران لوناوالا کے قریب ٹرین میں انتقال ہوگیا۔ پچھلے چند مہینوں سے غفور صاحب کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے انھیں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ چند دن کے لئے وہ دواخانے میں شریک بھی رہے، لیکن دواخانہ سے نکلے تو غفور صاحب پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہوگئے مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے کاموں کے سلسلہ میں مسلسل اضلاع کے دورے کرتے رہے۔ جشن ظرافت میں شرکت کے لئے پٹنہ گئے۔ گزشتہ ایک مہینہ میں حیدرآباد دو بار آئے۔ اور دوسری بار بمبئی لوٹے تو ایسے کہ عالم سفر ہی میں زندگی کا سفر پورا ہوچکا تھا۔ ان کی زندگی کا یہ سفر خدمت، محبت، خلوص، لگن اور بے پناہ مصروفیتوں سے عبارت تھا۔

ایک ماہر اڈمنسٹریٹر کا اردو کی خدمت کے لئے وقف ہوجانا، ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صنف طنز و مزاح پر بھی غفور صاحب کے بڑے احسانات ہیں۔ بے شمار ادبی تہذیبی ادارے ان کے دم سے قائم تھے۔ لیکن ماہنامہ "شگوفہ" سے محترم خواجہ عبدالغفور کو خاص تعلق خاطر تھا۔ غفور صاحب میرے محسن و مربی تھے۔ انہوں نے اپنی محبت خلوص اور شفقت کے ذریعہ جو جگہ میرے دل میں بنائی تھی وہ کبھی پُر نہ ہوسکے گی۔ میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ حبیبہ بھابی، ان کے بچوں اور مرحوم کے ضعیف والدین کو پُرسہ دوں۔ خدا سے دعا ہے کہ ان سب کو صبر کی طاقت عطا فرمائے۔

○ مختلف تہذیبی اور ادبی اداروں کی جانب سے حیدرآباد میں منعقدہ ایک تعزیتی جلسہ میں میرے عزیز دوست محمود انصاری مدیر روزنامہ منصف نے شگوفہ کا خواجہ عبدالغفور نمبر شائع کرنے کی تجویز پیش کی چنانچہ ہندوستانی مزاح نمبر سے پہلے خواجہ عبدالغفور نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے توسط سے خواجہ صاحب کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا۔

خواجہ صاحب کے چاہنے والوں سے التماس ہے کہ اس ضمن میں تعاون فرمائیں۔ اور ماہ جون کے اختتام سے قبل اپنے تاثرات ارسال فرمادیں۔

بھارت چند کھنّہ

"مسکرانے کی وجہ"

مضمون کا عنوان یعنی موضوع نہایت معمولی اور سیدھا سادھا سا نظر آتا ہے مگر صرف اُس وقت تک جبکہ آپ خامہ بگوش بیٹھے رہیں، جیسے ہی لکھنے کے لئے قلم پکڑو تو موضوع کی مناسبت سے خیال اور الفاظ دونوں آنکھیں چرانے لگتے ہیں۔ کچھ یہی حالت مہنگائی نے میرے جیسے معمولی سے آدمی کی کر رکھی ہے، جو کسی چیز کو خریدنے سے پہلے جب اُس چیز کی قیمت سُنتا ہے تو سُن ہو کر رہ جاتا ہے، اور جیب ٹٹولنے کے بعد یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ چھوڑو اس چیز کو — پھر کبھی سہی۔ ان حالات میں "مسکرانے کی وجہ" دریافت کرنے والے صاحب سے نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ "قبلہ معاف فرمایئے گا" میں مسکرانے کی وجہ آپ کو بتلانا نہیں چاہتا، بلکہ اس راز کو اپنے سینہ میں، کسی حکیم صاحب کے نسخہ کی طرح، جو سینہ بہ سینہ سفر کر رہا ہو، مدفون رکھنا چاہتا ہوں!"

اب جو سفر کی بات نکل ہے تو دیگر اشیاء کی قیمتوں کی طرح، سواریوں کے کرائے ہر سال کی طرح اس سال بھی بڑھ کر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ سلسلہ لامتناہی قسم کا ہے۔ نرخوں کے بڑھنے کے اس سفر میں، ڈاک تار اور ٹیلیفون بھی کرایوں کے ہمسفر ہیں۔ اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ بڑھے ہوئے کرایوں کے پیش نظر، اور اُن مصیبتوں اور ذلتوں کا تصور کرتے ہوئے جو ریل میں جگہ محفوظ کرانے کے لئے ٹکٹ خریدتے وقت پیش آتی ہیں، میرے جیسے انسان کو اگر کسی جگہ جانا ہو تو وہ محض تصوّر کر لیا کرے گا کہ مقام متعلقہ تشریف لے گیا تھا، اور وہاں جو کچھ اس کو دیکھنا، سُننا یا کرنا تھا، وہ سب بخوبی انجام دیکر اپنے تھان پر واپس آگیا ہے — اور ایسا کرتے ہوئے وہ جیوٹ اگر مسکرانے لگے تو مسکرانے کی یہ ایک معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ ملحوظ رہے کہ ایسی مسکراہٹ کے حصول میں سفر کی تکلیفوں اور اخراجات سے نجات کی پوری پوری گارنٹی بھی موجود ہے۔

زمانہ قیمتوں کو اپنے کندھے پر اُٹھائے کچھ ایسی تیزی سے قیامت کی چال چل رہا ہے کہ لوگ یعنی ہم بیچارے حیرت کے اس انتظار میں ہے کہ کب زمانے کے پاؤں تھک جائیں اور کب گرانی کسی نقطہ پر پہنچ کر رُک جائے تاکہ انسان روح اور جسم میں تعلق قائم رکھنے کے لئے اپنا کوئی دیرپا معاہدہ تیار کر سکے!

اس ضمن میں ہمارے ایک کرم فرما کا قصہ سُنیے جن کو اپنی سیاہ و دراز زلفوں اور گھنی لمبوتری سیاہ ڈاڑھی سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک دن جب اُن کو ان بالوں میں چاندی کی ایک، دو لکیریں نظر آئیں تو اُنہوں نے فوراً خضاب سے ان کا سواگت کیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب اُن کی عمر ۲۷ سال اور خضاب کی شیشی کی قیمت اڑھائی روپے تھی۔ اس کے بعد ہوا یوں کہ سفید بالوں کے ظہور اور خضاب کی قیمت کے بڑھنے میں مقابلہ شروع ہوگیا۔ پہلے تو موصوف نے خضاب کی شیشی کی عمر دراز کرنے کے لئے اپنی ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو گھٹا دیا اور پھر جب اُنچالیس سال کی عمر میں خضاب کی قیمت ۲۲ روپے ساٹھ پیسے ہوگئی تو موصوف کا حُلیہ بدل گیا اور وہ اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک صبح اُٹھ کر موصوف "یہ دنیا دیوانی" کا نعرہ لگایا اور اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں پر اُسترا پھیر دیا کہ نہ رہے بالوں کا عذاب اور نہ رہے حاجتِ خضاب! اب وہ صحیح معنوں میں "کلین شیون" یعنی "صفاچٹ" کہلانے کے مستحق ہوگئے ہیں۔ ویسے انتہائی فیشن پرست لوگوں کا ایک مخصوص طبقہ (سنیاسیوں کے علاوہ) دنیا میں ایسا بھی ہے جو سر اور ڈاڑھی دونوں مونڈتے ہیں اور فی زمانہ ایسا کرنا اخراجات کم کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے!

جس واقعہ کی تفصیلات ابھی پیش کی گئی ہیں، اُن سے مسکرانے کی وجہ تو نہیں، بلکہ فی زمانہ عام انسان کی بے بسی اور بے کسی ظاہر ہوتی ہے لیکن مسکرانے کی سب سے آسان، موثر اور تیر بہدف ترکیب اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ انسان فرش پر بستر یا بستر کے بغیر ہی لیٹ جائے اور کسی کو اس بات پر راضی کر لے کہ وہ آپ کے پیروں کے تلوؤں کو گدگدی کرے، آپ جب تک چاہیں، آپ کے لئے مسکرانے یا ہنسنے کی وجہ پیدا کرتا رہے گا۔ مسکرانے کا یہ ایک مجرب نسخہ ہے!

ایک اور وجہ مسکرانے کی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان آج کل بازار سے سودا سلف لاتا ہے۔ وہ بھی کوئی زمانہ تھا جب انسان اگر بیس پچیس روپے کی اشیاء (یہاں سونے، چاندی یا ہیروں کا ذکر نہیں) خرید کر لاتا تھا تو اکثر و بیشتر اس کو سامان گھر پہنچانے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان دنوں اتنی رقم کا اگر آپ ریشم خریدیں تو اس کو بطور رومال کوٹ کی اوپر کی جیب میں (بشرطیکہ آپ کے پاس کوٹ ہو) رکھا جا سکتا ہے۔ کپڑا اگر ریشم نہ ہو تو پتلون کی ہپ پاکٹ میں آسانی سے سما جائے گا۔ مٹھائی وغیرہ ہو تو اس کا ایک آدھ پیکٹ ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے۔ بہرحال آج کل بازار سے کوئی سودا لاتے ہوئے بوجھ اُٹھانے کی زحمت ہرگز نہیں ہوتی اور انسان مُسکرانے لگتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے، کہ مجھے لال چیونٹیوں سے بچنے کے لئے گیمکسین پاؤڈر خریدنا تھا۔ اپنی ضروریات کے پیشِ نظر میں تین روپے کا جو گیمکسین خرید سکا وہ اچھے سائز کی نمکدانی میں سما سکتا تھا۔ اس پاؤڈر کے خریدنے سے خاکسار کے لئے مسکرانے کی وجہ پیدا نہیں ہوسکی، البتہ گھر کی چیونٹیاں مسلسل قہقہے لگا رہی ہیں

ہمارے ملک میں زندگی، آبادی کے اندھا دھند بڑھنے کی وجہ سے ایک ایسے موڑ پر آپہنچی ہے کہ اس میں مسکرانے کی وجوہ از خود بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ ویسے انسان اگر چاہے تو محض منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر آئینہ سامنے رکھ کر مسکرانے کی مشق کر سکتا ہے تاکہ کہیں مسکرانا ہی بھول نہ جائے۔ وہ اگر چاہے تو کوشش کر کے مسکراہٹوں میں کافی ویرائٹی بھی پیدا کر سکتا ہے، یعنی "دبی سی مسکراہٹ" سے مشق شروع کر کے "معمولی" "غیر معمولی" "اچھی" "اچھی خاصی"، "زوردار" اور پھر "وسیع و بسیط مسکراہٹ" کے زمروں میں ان کو تقسیم کر سکتا ہے۔ اور پھر خوش رہنے کے لئے حسبِ مرضی، موقع محل دیکھ کر ان کو نسوار، پان بیڑی سگریٹ یا چھٹے کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ آخری قسم کی مسکراہٹ میں ہونٹوں کے کنارے پھیل کر کانوں سے ٹکرانے چاہئیں۔

عام انسان کی بے چارگی اور لاچاری کے اظہار کے لئے ایک واقعہ جو میرے ساتھ ہوا آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش ہے۔ یہ چند ہی دنوں کی بات ہے کہ میں سڑک پر جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک ٹھیلہ والا مونگ پھلی بیچ رہا تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے مجھے گھر کی ریزگاری کے ڈبہ میں ایک پیسہ کا سکہ مل گیا تھا جس کو میں نے غیر ارادی طور پر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے وہ نیا پیسہ مونگ پھلی والے کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور اُس سے اس سکۂ رائج الوقت کی مونگ پھلی مانگی۔ وہ شخص کچھ دیر تک مجھ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا، غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ مجھ کو بھی مونگ پھلی کے دانہ کی طرح مونگ پھلی میں ملا کر فروخت کر دے۔ پھر اس کی مسکراہٹ قہقہوں میں بدل گئی اور اس نے میرے سکہ کو بڑے زور سے ہوا میں دور پھینک دیا۔ کہنے لگا "حضور والا ایک پیسہ کا کچھ نہیں ملتا۔ آپ شاید کسی اور دنیا سے پدھارے ہیں" میں نے کہا "کچھ نہیں ملتا تو نہ سہی، میرا پیسہ مجھے واپس دے دو" کہنے لگا "اس کا ملنا تو ناممکن ہے" میں نے کہا "اگر پیسہ نہیں دے سکتے تو مونگ پھلی دے دو"

کہنے لگا "جو حکم سرکار"۔ یہ کہہ کر اُس نے دو دانوں والی ایک مونگ پھلی اٹھائی۔ جیب میں سے ایک پرانا بلیڈ نکال کر اس کو بیچ میں سے کاٹ کر آدھا کیا۔ نصف حصہ میں سے مونگ پھلی کا ایک دانہ نکالا۔ بڑی احتیاط سے اس کے دو حصوں کو علحدہ کیا۔ پھر ایک حصہ اپنے منہ میں ڈال لیا اور باقی کا آدھا دانہ یہ کہتے ہوئے مجھے دیدیا کہ "سکہ رائج الوقت سے جو کچھ مل سکتا تھا آپ کو پہنچ گیا"

پیسہ کی قدر و قیمت کا کچھ حال آپ نے سُنا۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں اس نوبت پر پہنچ چکی ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مسکراہٹ کی بھی ہے اور میرے خیال میں اس کی قیمت دوسری تمام اشیاء سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ اور بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو یہ شے میسر آئی ہے۔

بطورِ حرفِ آخر یہ عرض کرتا چلوں کہ بڑے اطمینان سے انسان اس صورت میں بھی مسکرا سکتا ہے اگر اس کی پیٹھ میں ایسے مقام پر کھجلی ہو جہاں اس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہو۔

(آل انڈیا ریڈیو کے لئے لکھا گیا) ■■

محمد جمیل الرحمٰن جمیل (حاجی پور)

چنانچہ

لاولد ہیں وہ، جمع ہے دولت چنانچہ
تم کو بھی چچا کی چاہیئے چاہت چنانچہ

جب خود نہیں پڑھا تو پڑھائے بھی کیا جناب
اُستاد کی بنی ہے حجامت چنانچہ

موقع یہ دَل بدل کی سعادت نہ مل سکی
بدلی نہیں جناب کی قسمت چنانچہ

الفاظ اور معانی کے رشتے بکھر گئے
بالغ ہوا اب حُسنِ بلاغت چنانچہ

وہ اتنے زور وشور سے اچھلے کہ الاماں
بانہوں پہ اپنی ہے مجھے حیرت چنانچہ

دیکھا گیا نہ ہم سے ترے گھر پہ غیر کو
چپل چُرا کے ہوگئے رُخصت چنانچہ

جو گندی نالیاں تھیں وہی تبدیل ہوگئیں
گھر کی طرف مُڑی ہے غلاظت چنانچہ

اردو کی دوسری سے وہ آگے نہ پڑھ سکے
خط میں غلط سلط ہے عبارت چنانچہ

اربابِ اقتدار ہیں اُردو پہ مہرباں
اُٹھے گی اس کی دھوم سے میت چنانچہ

ردّی کی ٹوکری میں ہے مسکن جمیل کا
بے معنی کی مل گئی خلعت چنانچہ

محمد مصطفٰے جھنجھٹ (دہلی)

غزل

جو دل کی باتیں کہیں کسی نے تو منہ پہ وہ ایک لات دیں گے
خفا ہیں اہلِ وفا سے اتنے نہ بات لیں گے نہ بات دیں گے

کسے خبر تھی قریب آکر ڈھکیل دیں گے سڑک کے نیچے
یہ سوچ کر میں بہت ہی خوش تھا کہ اب وہ ہاتھوں میں ہات دیں گے

ہم اپنے مطلب کے لیڈروں کی کریں گے تعریف بن کے اندھے
پلاؤ قلیہ کہیں گے اسکو جو ہم کو وہ دال بھات دیں گے

بہت دنوں تک کئے ہیں فاقے اب ایسا دھندا کریں گے ہم بھی
نمونہ دکھلا کے صبح کو ہر ایک گاہک کو رات دیں گے

جو سب سے مہنگا ملے گا کپڑا اُسے خریدیں گے اپنی خاطر
جو سب سے سستا ملے گا کپڑا اُسے بنامِ زکات دیں گے

زمانہ ہے اشتراکیت کا حضور بارہ کا نصف چھ ہے
ہمیں بھی حق ہے برابری کا نہ پانچ لیں گے نہ سات دیں گے

ملاوٹوں کو نہ عیب کہیئے یہی ہمارا ہنر ہے جھنجھٹ
کمال یہ ہے وہ زہر ہوگا جو کہہ کے آبِ حیات دیں گے

هزل

دل سے تمام مال مسالا نکل گیا — ایسی ہزل کہی تو دیوالا نکل گیا
جس کے ذریعہ میں نے کیا نامۂ پیام — وہ بھی تمہارا چاہنے والا نکل گیا
نزلے کا ستیاناس ہو کھانے کی میز پہ — چھینک آگئی تو منہ سے نوالا نکل گیا

جھنجھٹ میاں یہاں کے تماشے تو دیکھ لو
کیا ہوگا آنکھ سے جو اُجالا نکل گیا

باقر نقوی (لندن)

سیٹ بیلٹ SEAT BELT

انگلستان میں حال ہی میں ایک قانون نافذ ہوا ہے جس کی رو سے مشینی گاڑیاں چلانے والوں او اگلی نشستوں پر بیٹھنے والوں پر سیٹ بیلٹ باندھنا لازمی ہوگیا ہے۔ سیٹ بیلٹ دو عدد پٹیاں نائیلون کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جو کاندھے اور شکم سے گزر کر مسافر کو نشست سے گرفتہ رکھتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سیٹ بیلٹ حادثہ کی صورت میں سواریوں کو کافی حد تک محفوظ رکھتی ہے۔

سیٹ بیلٹ جس نے ایجاد کی اُس غریب کو شاید یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ اس کی حادثات سے بچانے والی ایجاد لوگوں کے دوسرے کام بھی آسکتی ہے۔ ہم پاکستانی جدت طرازی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ کوئی بھی چیز لے لیجئے یہ قوم اُس کی ایسی ایسی خوبیاں دریافت کرلیتی ہے کہ خود ایجاد کرنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ پچھلے دنوں جب پاکستان گیا تھا ایک عزیز کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ موصوف پرانے رند تھے اور زاہدوں کی حکومت نے اُن کو زچ کر رکھا تھا۔ پاکستانی جدت طرازی کی جبلت نے کام کر دکھایا۔ اُن کے گھر میں مجھ کو B. G. PHOS دوا کی بیسیوں خالی بوتلیں نظر آئیں۔ اس دوا سے تپ دق کے مریض شفا یاب ہوتے ہیں۔ میں نے حیرت سے حال دریافت کیا۔ تو حضرت معنی خیز انداز میں مسکرائے اور کہنے لگے ویسے تو میں ٹھیک ٹھاک ہوں مگر اس دوا کی خوراک میں نے دو چمچے سے بڑھاکر دو بوتلیں روزآنہ کرلی ہے اور اسی سے گزارا ہوجاتا ہے۔ (اس دوا میں کافی مقدار میں الکحل ہوتی ہے) جس نے یہ دوا ایجاد کی تھی اس کو معلوم ہو تو وہ اُس شاعر کی طرح خوش ہوگا جس کے شعروں سے ایسے مطلب اخذ کرلئے گئے ہوں جن کا اس کو کبھی گمان بھی نہ ہوا ہو۔ ایسی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں مگر یہ ان کا محل نہیں۔

ذکر ہو رہا تھا سیٹ بیلٹ کا۔ سیٹ بیلٹ ایجاد ہوئے زمانے گزر گئے۔ موٹروں میں ان کا استعمال آج شروع ہوا ہے۔ پہلے یہ صرف ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتی تھی۔ ہماری لیبرچی تو یہ ہے کہ موجودہ

یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ سیٹ بیلٹ اُس نے ایجاد کی۔ سیٹ بیلٹ اس صورت میں اُس نے بنائی ضرور ہوگی مگر ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں اس کا خیال اور اس کا استعمال تو زمانۂ قدیم سے موجود ہے۔

پہلی مثال، انگلستان کی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کی ہے جس کو ہاؤس آف لارڈز کہتے ہیں جہاں یہ روزِ اول سے موجود ہے یا یوں سمجھیئے کہ اس ایوان کی ہر نشست سیٹ بیلٹ کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ان نشستوں پر لوگ نسل در نسل بندھے رہے ہیں۔ اب ان نشستوں پر لوگ زندگی بھر کے لئے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ہاؤس آف لارڈز بھی عجیب ادارہ ہے۔ ایک بار ہم پارلیمنٹ ہاؤس دیکھنے گئے دربان سے پوچھا کہ ہاؤس آف لارڈز کدھر ہے۔ اُس نے پہلے تو بہت حیرت سے ہماری طرف دیکھا پھر ایک سمت اشارہ کر دیا۔ ہم اُدھر کو چلے تو محافظ نے بڑھ کر روک دیا۔ ہم اپنی شخصی آزادی پر قدغن کو برداشت نہ کر سکے اور تنک کر پوچھا کہ تم نے ہمارا راستہ کیوں روکا؟ اس نے نہایت ادب سے خم ہو کر جواب دیا "جنابِ والا آپ کو اس ایوان میں جانے کے لئے پہلے لارڈ بننا پڑے گا" ہمیں بہت دنوں تک اس بات پر حیرت رہی مگر بعد کو اس پابندی کی اصل وجہ معلوم ہوئی۔ یہ ایوان پاکستان کے مشہور اکاؤنٹنس آفس A.G.P.R جیسا ہے۔ اثر و رسوخ میں بھی اور حاضری کے معاملے میں بھی۔ عموماً وہ بوڑھے ایوان میں پابندی سے آتے ہیں جن کی لیڈیاں مرچکی ہوتی ہیں یا وہ لارڈ جو نئے نئے اپنے عہدے پر فائز ہوئے ہوتے ہیں۔

دوسری مثال۔ شادی بیاہ۔ کیا یہ عمر بھر کے لئے میاں بیوی کے لئے سیٹ بیلٹ کا کام نہیں کرتی! مسلمانوں نے تو مردوں کے لئے آسانی پیدا کر لی مگر ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں تو یہ بندھن موت ہی کھولتی ہے۔ ویسے یہ سب باتیں زمانۂ قدیم کی ہوتی جا رہی ہیں۔ انسان چوں کہ کافی ترقی کر گیا ہے اس لئے ہر چھوٹی سے چھوٹی پابندی کو اپنی آزادی پر قدغن جانتا ہے۔ مغرب میں تو اب شادی وادی جیسی لغو رسومات ختم ہوتی جا رہی ہیں مغرب کے نئے مفکرین کا خیال ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور اُس کو کوئی پابندی قبول نہیں کرنی چاہیئے۔ یہی آزادی کا تصور انگلستان میں سیٹ بیلٹ کے نفاذ کے آڑے آیا۔ لوگوں نے مخالفت کی کہ ہم خود کو گرفتار محسوس نہیں کرنا چاہتے۔ سچ ہے کہ جان اُسکی اپنی ہے خود آزاد ہے تو اُس کو اس بات کی بھی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی جان گنوائے۔ انگلستان کے لوگوں کا مزاج ہی ایسا ہے۔

تیسری مثال۔ ہمارے ملک پاکستان کے ایک ہر دلعزیز صدر تھے فیلڈ مارشل ایوب خان، اُن کو زیڈ اے سلیری جیسے دانشور نما کالم نگاروں نے "فیلڈ مارشل صاحب" پکارنا شروع نہیں کیا تھا اس لئے لوگ ان کو پیار میں 'صدر ایوب' ہی کہتے تھے۔ موصوف اسم با مسمّٰی تھے۔ اتنے صابر تھے کہ ایک بار کرسی پر بیٹھے تو صبر و شکر سے بیٹھے ہی رہے۔ لوگوں نے ہنگامے کئے، غل غپاڑہ ہوا مگر اُنھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پاکستان کی کرسیٔ صدارت میں سیٹ بیلٹ کا اضافہ اُنھیں کا مرہونِ منت ہے۔ قصور ایوب صاحب کا نہیں جسم کی ساخت کا تھا جنھوں نے ان کو بے دخل کر دیا۔ سیٹ بیلٹ لگ چکی تھی اس لئے اُس کا استعمال ہر صدر کا سب سے

بڑا فرض منصبی ٹھہرا۔ بحمد اللہ آج تک کسی نے اس فرض سے کوتاہی نہیں کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے خطائیں ہوئیں مگر "سنتِ ایوبی" پر سب نے بڑے خضوع و خشوع سے عمل کیا۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ دیکھئے کتنے سامنے کی بات ہے ایوب اور یحییٰ دونوں خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کے نام ہیں۔ انصاف سے کہیئے کہ مملکتِ خداداد پر حکومت ان لوگوں کا حق تھا کہ نہیں؟ "امتیں" ان کی بھی ناز مان نکلیں، ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ یہ تو خیر پیغمبروں کے نام تھے۔ ان کے بعد جو آئے وہ "نور" علیٰ نور وہ تو ایک ہاتھ اور آگے نکلے، نام نامی میں بھی شامل تھا جو نصیریوں کے خدا کا بھی نام تھا سو اُن کے تیور بھی نرالے تھے۔ اُنھوں نے حق کا بول "بالا" کیا۔ یاد رہے کہ سیٹ بیلٹ پر اُن کا عقیدہ حضراتِ ماسبق سے زیادہ راسخ تھا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اُنھوں نے انا الحق کا نعرہ بھی لگا دیا تھا سو معتوب ہوئے اور منصورِ دوراں کے عہدۂ بلند پر فائز ہوئے۔ سیٹ بیلٹ بدستور ہے اور اب تو خیر سے حق بہ نفسِ نفیس جلوہ گر ہے۔ حق ظاہر ہے کہ ابدی ہے جس کو زوال نہیں لہٰذا راوی قیامت تک کے لئے چین ہی چین لکھتے ہیں۔

پاکستان کی حکومت کو چاہیئے کہ سیٹ بیلٹ جیسی کام کی چیز کا رواج عام کرے۔ مثلاً سرکاری دفاتر کی کرسیوں میں کہ ملازمین میں بیٹھنے کی عادت ہو۔ اسکولوں اور کالجوں میں کہ طلباء ہنگاموں کے لئے ہل نہ سکیں۔ سیاسی پارٹیوں کے دفاتر اور نشستوں میں کہ وہ حکومت کے خلاف نہ اُٹھ سکیں، کارخانوں میں کہ مزدور ہڑتال کرنے باہر نہ نکل سکیں، بلکہ پوری قوم کو سیٹ بیلٹ میں جکڑ دینا چاہیئے تاکہ کچھ دن ملک میں شانتی ہو اور معاشرے کو برائیوں سے پاک کیا جا سکے۔ یہ کام ہے ہی ایسا جس کو سکون کے ماحول میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ □□

چچا چکن ___ مظاخ بیدری

فطرت اُن کی بچی نہیں — مجھ سے ان کی بنی نہیں
دعوے میں کچھ کمی نہیں — ابھی جوانی ڈھلی نہیں
اندازہ ہے ستّر کا — عمر کسی سے چھپی نہیں
شہری کوئی نا پہچانے — ایسی کوئی گلی نہیں
کہہ دیں ساری ڈش کھا کر — بھوک ابھی تک کھلی نہیں
وہ جنگوں کے غازی ہیں — گرچہ کوئی لڑی نہیں
ہیروئینوں سے واقف ہیں — پکچر کوئی چھٹی نہیں
بال ابھی تک کالے ہیں — کمر ابھی تک جھکی نہیں
پڑھتے ہیں اخبار تمام — عینک بھی تو لگی نہیں
بچے اٹھارہ، بیگم تین — مسئلوں کی کمی نہیں
ایسے خواہش باقی ہے — جیسے شادی ہوئی نہیں

جنسی باتیں موضوع ہیں
عادت کوئی بھلی نہیں

○

ہپّی ___ محبوب مانجھومی (بلاسپور)

(دردِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کس درجہ ماڈرن ہے یہ خانداں ہمارا — ہپّی بنا ہوا ہے ہر نوجواں ہمارا
گانجہ چرس کا شیدا بچہ ہر ایک اپنا — افیون و بھنگ پینا شیوہ میاں ہمارا
عریانیت کو ہم تو اک آرٹ جانتے ہیں — اس ننگے پن میں کوئی ثانی کہاں ہمارا
کیوں ذمہ داریوں کو بڑھ کر گلے لگائیں — اس واسطے نہیں ہے کوئی مکاں ہمارا
کھاتے ہیں ہوٹلوں میں، سوتے ہیں ہم سڑک پر — ساری زمیں اپنی، ہے آسماں ہمارا

محبوب اپنا مسلک دنیا سے ہے نرالا
تیزی سے بڑھ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

حفیظ حارث (مہاراشٹرا)

ایک مشاعرے کا خطبۂ صدارت

شہر کی ایک بہت مشہور ادبی انجمن "بزم عاقلانِ ادب" نے شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا تھا۔

بزم عاقلانِ ادب ہر سال اپنے شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرتی تھی، جس میں ملک کے مختلف شہروں
، "مترنم شاعر" ہی بلائے جاتے تھے۔ شاعر کا معیاری ہونا کوئی ضروری نہیں ہوتا تھا لیکن مترنم ہونا بہت ضروری ہوتا
ا بلکہ اشد ضروری ۔! کیوں کہ آج کل فیشن ہی ترنم سے پڑھی جانے والی شاعری سننے کا ہے ۔! مشاعرہ جب سے
اس کی محفلوں سے نکل کر عوامی مجلسوں تک آ پہنچا ہے، ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو یہ حق حاصل ہوگیا ہے کہ وہ مشاعرہ
سنے جائے اور شاعروں کے کلام پر اپنی "گراں قدر" رائے کا برموقع اظہار بھی کرے ۔!

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ چونی چھاپ پبلک کس قسم کی شاعری کو پسند کرتی۔ اُن کے نزدیک تو جاندار شاعری وہ ہوتی ہے
عشق و محبت کے گھٹیا پن کے اردگرد تھرک رہی ہو۔ اور پھر اس قسم کی شاعری کو مزید جاندار بنانے کے لئے ترنم کا
ہارا لیا گیا ہو۔ اس لئے مترنم شاعری سننے کا ایک رواج سا چل پڑا ہے۔ اور وہ شاعر جن کی شاعری معنیٰ و مفہوم
ے مبرا ہوا کرتی تھی، ترنم کے رہینِ منت راتوں رات مشہور ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے صفِ اوّل کے
شاعر بن بیٹھے ۔!!

چنانچہ جب زمانہ ہی سطحی شاعری اور ترنم ریزی کا ہو تو پھر وہ لوگ احمق ہی قرار پائیں گے جو آل انڈیا مشاعرہ کرواکے
ے اور معیاری شعر کہنے والے شعرائے کرام کو اپنے یہاں مدعو کریں اور انھیں تحت اللفظ سے پڑھنے کی دعوت دے کر
نے مشاعرے کا دیوالہ نکلوائیں اور عوام کے ہاتھوں شامیانے اور فرنیچروں کی ایسی تیسی کروائیں ۔!

لیکن بزمِ عاقلانِ ادب کوئی احمقوں کی بزم تو تھی نہیں جو اس قسم کی فاش غلطی کرتی۔ یہ تو شہر کے بڑے بڑے
جروں، سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے لیڈروں اور ڈگری ہولڈر دانشوروں کی بزم تھی۔ اس لئے وقت کی رفتار
پہچانتی تھی اور عوام کی دُکھتی رگ پر صحیح ڈھنگ سے انگلی رکھتی تھی۔ اس لئے اس بزم کے اراکین نے زمانے کی موجودہ
وش کو دیکھتے ہوئے تحت اللفظ سے پڑھنے والے معیاری شاعروں کو اپنی یادداشت کے پردے سے حرفِ غلط کی طرح

مشاہدہ کیا تھا اور صرف انھیں شاعروں کو یاد رکھا تھا جن کا شمار "گویّوں" میں ہوتا ہے ۔!

چنانچہ اس دفعہ بھی اسی قسم کے شاعر مدعو کئے گئے تھے اور مشاعرے کی تیاری بڑے زور و شور سے جاری تھ
بزمِ عاقلانِ ادب کا یہ مشاعرہ مفت ہی پیش کیا جاتا تھا۔ کوئی ٹکٹ و کٹ نہیں رکھی جاتی تھی۔ مشاعرے کے اخراجا
چندے اور عطیئے سے پورے کئے جاتے تھے۔ پورے زور و شور سے شہر بھر میں چندہ کیا جاتا اور آناً فاناً ہزاروں رو
اکٹھا کرلئے جاتے ۔ عوام اس مشاعرے کے لئے بزمِ عاقلانِ ادب کو دل کھول کے اور جیب جھاڑ کے چندہ دیا کرتے۔ اس
طرح وہ اپنے تعلیمی و ثقافتی شعور سے مالا مال ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا کرتے۔

بزمِ عاقلانِ ادب کے آل انڈیا مشاعرے میں اکثر مسندِ صدارت پر کوئی "سیاسی سیٹھ" ہی جلوہ افروز ہوتا۔ ا
اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن صدر منتخب کرنے کے طریقۂ کار میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی گئی تھی۔ بزمِ عاقلانِ ادب
فیصلہ کیا تھا کہ مسندِ صدارت پر اس دفعہ وہ شخصیت رونق افروز ہوگی جو مشاعرے کے لئے سب سے زیادہ عطیہ دے
چنانچہ شہر کے کئی "سیاسی سیٹھوں" میں کرسئ صدارت حاصل کرنے کے لئے ایک دل چسپ مقابلہ شروع ہوگیا اور تق
سیٹھوں نے ہی کرسئ صدارت حاصل کرنے کے لالچ میں معمول سے کچھ زیادہ ہی عطیہ دیا۔

آخر میں جب رسید بکوں کا جائزہ لیا گیا تو اراکینِ بزمِ عاقلانِ ادب پر یہ راز عیاں ہوا کہ سب سے زیادہ چند
شہر کے مشہور "سیاسی سیٹھ" اور گڑھ کے سب سے بڑے تاجر سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی نے دیا ہے۔ سیٹھ قربان
سبحان بھائی نے گیارہ ہزار ایک سو اکیاون روپیوں کی گراں قدر رقم بزمِ عاقلانِ ادب کو چندے میں دی تھی ۔!

سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی ناٹے قد کے سیاہ فام اور خوب موٹے آدمی تھے۔ اُن کی توند اس قدر نکلی ہوئی تھ
کہ دور ہی سے نمایاں دکھائی دیتی تھی اور غور کرنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُنہوں نے اپنی قمیص کے نیچے گڑ کی بھیل
چھپا رکھی ہے۔

معیّنہ تاریخ کو جب مشاعرہ شروع ہوا تو سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی کو ایک اُونچی مسند پر صدرِ مشاعرہ ک
حیثیت سے بٹھایا گیا۔ اسٹیج پر اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے بیس پچیس شاعروں کے درمیان وہ بالکل ایسے ہی لگ رہے
تھے۔ جیسے چوہوں کے درمیان کوئی شکاری بلی ۔!

وقتِ مقررہ پر مشاعرہ شروع ہوا اور اپنی روائتی آن بان سے چلتا رہا۔ اس مشاعرے میں جو کچھ گایا گیا وہ ناقا
بیان ہے۔ وہ صرف سننے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ کیوں کہ ؂

اُن غیرتِ ناہید کی ہر تان تھی دیپک

جنھیں صرف سن کر ہی داد دی جاسکتی تھی اور جسے احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا تھا ہاں جو چیز احاطۂ تحریر میں لائی جاسکت
ہے وہ سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی کا خطبۂ صدارت تھا۔ یہ ایک ایسا عالمانہ و فاضلانہ خطبۂ صدارت تھا جس پر جب
تدرسر دُھنا گیا کم تھا۔ یہ وہ خطبۂ صدارت تھا جسے سُن کر حوتی چھاپ پبلک نے شامیانہ تالیوں کی گونج سے اُڑا دیا تھا

اسے حرف بحرف ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس خطبۂ صدارت کو پڑھ کر آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائینگے کہ سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی کی صرف تجوری ہی بھری ہوئی نہیں ہے بلکہ ان کی کھوپڑی کا اوپری خانہ بھی پوری طرح بھرا پڑا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :-

بھائیو! بہنو! اور شاعرو!

میں بزم ہاتملانِ ادب کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنے آل انڈیا مشاعرے کا صدر بنایا۔ ورنہ کہاں گڑ کی تجارت اور کہاں کسی مشاعرے کی صدارت -! (تالیاں)

حضرات! کسی مشاعرے کی صدارت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کئی گھنٹے ایک ہی جگہ صبر کر کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ جو بالکل ایسا ہی ہے جیسے منڈی میں تیزی کی آس لگائے مال کو گودام میں روک کے رکھنا -! پتہ پانی ہو جاتا ہے - یہ بڑے دل گردے کا کام ہے - اور حضرات! یہ شاعری بھی تو بڑے دل گردے کا کام ہے - شاعری میں دل کو وہی حیثیت حاصل ہے جو تجارت میں روپیوں کو -! جس طرح بغیر روپیوں کے تجارت نہیں کی جا سکتی ٹھیک اسی طرح بغیر دل کے شاعری بھی نہیں کی جا سکتی -! (تالیاں)

اور پھر ہماری شاعری صرف دل ہی کیوں تمام اعضائے رئیسہ کے اِرد گِرد گھومتی ہے اور جو تھوڑی بہت اعضائے رئیسہ سے بچ رہتی ہے، اسے معشوق کے لب و رخسار، چشم و ابرو، اور زلف و جبیں وغیرہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں -!

(زبردست تالیاں اور تحسین کے کلمات)

حضرات! شاعری ایسے ہی نہیں آجاتی۔ اس کے لئے بہت ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے سالوں محنت کرنا پڑتا ہے تب جا کر شاعری پختہ ہوتی ہے۔ جیسے تجارت محنت مانگتی ہے! مسلسل محنت !! ایک تاجر روز دو روز یا ہفتے دو ہفتے میں ہی بڑا تاجر نہیں بن جاتا۔ سالوں محنت مشقت کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کے آدمی بڑا تاجر بنتا ہے ؎

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

حضرات! کیا آپ یقین کریں گے کہ بیس برس قبل میں نے صرف دس روپیوں کی حقیر رقم سے اپنا یہ گڑ کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اور آج اپنی جہدِ مسلسل سے ترقی کرتے کرتے میرا یہ کاروبار لاکھوں روپیوں کا ہو گیا ہے۔ آج مجھے گڑ کی تجارت کا بادشاہ کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے حضرت جگرؔ مرادآبادی مرحوم کو اردو غزل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ آپ بھی اپنے فن کے بادشاہ بن سکتے ہیں۔ آج کے زمانے میں بادشاہ بننا کچھ مشکل نہیں ہے - جس کے پاس دولت ہے وہ بادشاہ ہے۔ آپ کے پاس شاعری اور دلکش ترنم کی دولت ہے آپ دنیائے ادب میں اپنے فن کے بادشاہ ہیں - میرے پاس روپیوں کی دولت ہے میں دنیائے تجارت میں گڑ کا بادشاہ ہوں (تالیاں)

دونوں ہی اپنی اپنی دنیاؤں کے بادشاہ ہیں۔ اور بادشاہوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بادشاہوں کی طرح رہیں -
مگر اپنے بارے میں تو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں بادشاہوں کی طرح رہتا ہوں۔ رہنے کے لئے محل نما

حویلی ہے، درجنوں نوکر چاکر خدمت کے لئے موجود ہیں۔ عیش و عشرت کا ہر سامان مہیا ہے۔ بالکل بادشاہوں کی سی زندگی ہے۔

آپ چونکہ شاعر ہیں۔ تخیل کی دنیا میں رہتے ہیں اور تصور ہی میں آپ نے وہ تمام چیزیں مہیا کر رکھی ہے جو میں نے حقیقی دنیا میں ۔۔ اس طرح دونوں ہی کے پاس بادشاہی کے لوازمات ہیں اس لئے دونوں ہی بادشاہ ہوئے۔ اپنے اپنے میدان کے ۔۔۔!! (تالیاں)

حضرات میدان پر ایک بات یاد آئی۔ جس طرح ہمارے یہاں کھیل کے میدان ہوتے ہیں، اسٹیڈیم ہوتے ہیں۔ سرکار کو چاہیئے کہ مشاعروں کے لئے بھی بڑے بڑے ہال تعمیر کروائے تاکہ مشاعروں میں نظم و ضبط پیدا ہو، ان کی تعداد بڑھے اور قوم میں ثقافتی ذوق پروان چڑھے ۔۔ (زبردست تالیاں)

حضرات! اب تو بس صرف ایک ہی تمنا ہے کہ بزم ماقلانِ ادب آل انڈیا مشاعرے کی طرح ایک آل ورلڈ مشاعرہ بھی کروائے۔ جس میں پوری دنیا سے ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ قسم کے گویّے شاعر بلوائے۔ خرچ کی بالکل پرواہ نہ کرے میں جو موجود ہوں ۔۔۔ اگر آل ورلڈ مشاعرہ منعقد کروانے میں دو چار لاکھ روپے بھی خرچ ہوں تو مطلق پرواہ نہ کیجئے۔ تمام اخراجات میں اپنی جیبِ خاص سے ادا کر دوں گا۔ زبان و ادب کی خدمت اور آپ حضرات کے اعلیٰ ذوق کی تسکین کے لئے دو چار لاکھ روپیوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ ہاں صرف ایک بات کا خیال رکھیں کہ آل ورلڈ مشاعرے کی کرسیٔ صدارت میرے نام محفوظ رکھیں۔ بس اور زیادہ کچھ نہیں ۔۔ اردو زبان و ادب اور عوام کے اس خادم کو اور کیا چاہیئے ۔ پہلے تجارت ۔۔۔ بعد میں آل ورلڈ مشاعرے کی صدارت اور اس کے بعد اگر اللہ کا فضل و کرم شاملِ حال رہا اور میں آنے والے الیکشن میں کامیاب ہو گیا تو پھر کرسیٔ وزارت! لیکن مشاعرے کی صدارت سے کرسیٔ وزارت تک صرف اللہ کے فضل و کرم سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ حضرات کی نظرِ عنایت بھی اس بندۂ ناچیز کو چاہیئے۔ پھر میدان میرے ہاتھ ہے۔ کہیئے تو پھر کیا کہتے ہیں آپ حضرات؟

"ہم آپ کے ساتھ ہیں"! پورا شامیانہ گونج اٹھا۔ پھر بزم ماقلانِ ادب کے ایک رکن نے مائیک پر آکے نعرہ بلند کیا۔ "سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی" "زندہ باد" حاضرین نے جواب میں شامیانہ شگاف نعرہ لگایا۔

"سیٹھ قربان بھائی سبحان بھائی کو"

"ووٹ دو"

اور پھر "زندہ باد" اور "ووٹ دو" کے نعروں سے پورا شامیانہ گونجنے لگا۔ نعروں کی اسی گونج کے درمیان مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا ۔۔!!

○○

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

۴ مُنارے کا شہر: حیدرآباد

قدیم زمانے میں بادشاہوں کو یادگار عمارتیں بنوانے کا شوق تھا جسے آنے والی نسلیں فخر و محبت سے
کرتی ہیں. محمد قلی قطب شاہ نے ــــــــــ چار مینار بنوا کر اطراف میں شہر حیدرآباد بسایا اور یہ
دُعا مانگی ؎

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر ٭ رکھیا جیوں توں دریا میں من یا سمیع

. یہ بات غور طلب ہے کہ چار مینار کے لئے شہر بسایا گیا یا شہر حیدرآباد کے لئے چار مینار بنوایا گیا تھا. مورخین سے
ارش ہے کہ وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں جس طرح سائنس داں "مرغی پہلے کہ انڈا" والے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں. ہمارے
. اتنا ہی کافی ہے کہ چار مینار اور شہر حیدرآباد لازم و ملزوم ہیں. حیدرآباد شہر کا دوسرا نام چار مینار ہے. ایک حیدرآبادی
پہچان بھی چار مینار سے ہوتی ہے. ایک مرتبہ دیارِ غیر میں ہمارا تعارف کروایا گیا کہ ہم حیدرآباد سے آئے ہیں. جواب میں
نی کا یوں اظہار ہوا "اچھا آپ چار مینار ہیں! اُس وقت ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا "نہیں صاحب ہمارے
ب دو مینار ہیں"

چار مینار کے علاوہ ہمارے شہر میں اور بھی تاریخی عمارتیں موجود ہیں جیسے قلعہ گولکنڈہ، قطب شاہی گنبدیں،
مو عثمانیہ، مکہ مسجد وغیرہ لیکن جو شہرت چار مینار کو حاصل ہے وہ دوسری عمارتوں کے حصہ میں نہیں ہے. چار مینار
شہرت میں تاریخ سے زیادہ معاشیات کا دخل ہے. چار مینار کی تصویر کے ساتھ سگریٹ چہار سمت دور دور تک قانونی
نباہ "تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے" پہنچاتا ہے. سوڈا، چوڑی، اور دوسری اشیاء چار مینار کے نام پر بازار میں
تا ہیں. چار مینار کی بہ نسبت دوسری تاریخی عمارتوں کی "مارکیٹ ویلیو" نہ ہونے کے برابر ہے. وہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی
یا اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حقائق کو مسخ کرنے کی حد تک نئی نسل تاریخ میں دلچسپی لیتی ہے. ہمارے لڑکے نے ہم
ے سوال کیا "ڈیڈی! تاج محل کس نے بنوایا تھا؟" ہم نے جواب دیا "ہماری طالب علمی کے دور میں شاہجہاں نے تاج محل

بنوایا تھا۔ آج کل کی بات ہمیں نہیں معلوم۔ ہمارا جواب سن کر لڑکے نے تعجب سے کہا "ہمارے تاریخ کے ماسٹر کہتے ہیں کہ تاج محل ان کے دادا جان مرحوم نے بنوایا ہے"۔ اس لحاظ سے محمد قلی قطب شاہ خوش قسمت ہیں کہ انھیں ابھی تک ایسے تاریخی ماسٹر نہیں ملے۔

اکثر بڑے لوگوں کو کسی ایک ہندسے سے پیار ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ان کے لئے خوش قسمتی کا باعث بھی قرار پاتا ہے۔ بانی حیدرآباد کو شاید چار کا ہندسہ پسند تھا اسی لئے ۴ مینار کی عمارت بنوائی اور اس کا نام بھی چار مینار رکھا۔ چار مینار پر چار گھڑیاں منصب ہیں جو آزادانہ طور پر وقت بتلاتی ہیں۔ چار مینار سے چار راستے جاتے ہیں۔ ایک راستے میں چاہ کے وزن کی دکانیں ہوا کرتی تھیں ان دوکانوں سے دور دور تک پہنچنے والی مخصوص آواز آج بھی لوگوں کے کانوں میں گونج رہی ہے دوسرے دو راستوں پر صنف نازک کو خوب سے خوب تر بننے کے لئے لاڈ بازار اور صرافہ مارکیٹ ہیں۔ بازار کی مہنگائی اور بیوی کی خواہشات سے پریشان حال شوہر کو چوتھے اور آخری راستے سے فرار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ بادشاہ وقت کو ۴ کے ہندسے سے پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ چار مینار سے کچھ دور پانی کا حوض بنوا کر اطراف میں چار عدد کمانیں بنوائی گئیں۔ وقت کے ساتھ حوض کا پانی سوکھ گیا اور آج یہی بے رونق حوض "سوکھا حوض" کے نام سے مشہور ہے۔

چار مینار کے اطراف بسایا ہوا شہر، آبادی میں اضافہ کے ساتھ وسعت اختیار کرتا گیا۔ پرانا اور نیا شہر کی اصطلاح رائج ہوئی۔ چار مینار کے آس پاس بسی ہوئی گنجان آبادی کو "پرانا شہر" "پرانی بستی" "پاتا نگرم" کہا جانے لگا۔ آج پرانا شہر نئے شہر سے بہت مختلف ہے۔ پرانے شہر میں گنجان آبادی کے باوجود رہن سہن کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نل میں پانی نہیں آتا، خستہ حال سڑکیں ہیں۔ کرنٹ آنکھ مچولی کھیلتا ہے بسیں کم چلتی ہیں۔ حیران اور پریشان کن گلے اور گلیاں ہیں بوسیدہ دیوڑھیاں اور عمارتیں پُروقار ماضی کی یاد دلاتی ہیں۔ پرانے شہر میں بہت کم دفاتر ہیں جو موقع ملتے ہی نقل مقام کرتے ہیں۔ ارباب اقتدار اور نہ ہی عہدیدار بستے ہیں۔ بارہا توجہ دلانے پر بانیٔ چار مینار قلی قطب شاہ کے نام پر پرانے شہر کے لئے ایک ترقیاتی بورڈ تشکیل دیا گیا جس پر بلیک بورڈ کا گمان ہوتا ہے۔ جب چاہا کچھ لکھ دیا اور پھر مٹا دیا۔

قطب شاہی بادشاہوں کی مذہبی رواداری مشہور ہے۔ اسی لئے چار مینار کی ایک جانب مسجد تو دوسری جانب مندر ہے۔ ہمارے شہر میں مذہبی رواداری بادشاہوں کے نظام کے ساتھ ہی ختم ہوئی آج چار مینار کے اطراف بسا ہوا پرانا شہر فسادات کا شہر ہے۔ ہر دو چار مہینوں میں ایک مرتبہ فساد ہوتا ہے۔ انسان درندگی و سفاکی پر اتر آتا ہے۔ دو تین ہفتے زندگی مفلوج بلکہ مہلوک ہو جاتی ہے۔ چار مینار پولیس چوکی بن جاتا ہے۔ پولیس کی گاڑیاں چار مینار کو گھیرے ہیں لئے "پیٹرولنگ... تھاسں گالنگ..." کرتے رہتی ہیں۔ چار مینار کی دیواروں پر پولیس کے جوانوں کے کپڑے سوکھتے نظر آتے ہیں۔ چند دن کرفیو بھی نافذ رہتا ہے۔ پرانے شہر کے ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات سے گھبرا کر اکثر لوگ ندی پار کر جاتے ہیں۔ اور نئے شہر میں بس کر پرانے شہر کو لعنت و ملامت کرنے لگتے ہیں۔

چار مینار ایک طرح سے اردو کی عمارت ہے شمالی ہند سے اردو زبان کی ٹہنی جنوب کی طرف
گئی ئے راستے میں ٹہنی، ڈالی بنی جو چار مینار کے اطراف پہنچ کر "ڈغالی" کہلائی گئی ۔۔د زبان کی
الی چار مینار کے اطراف ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتی گئی۔ چار مینار کے بانی کو اردو زبان کا
ماحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے چار مینار کے اطراف اردو اپنے انداز سے اپنائی
جسے "دکنی اردو" کا نام دیا گیا۔ آج اُسی اردو کو ۔ار مینار کی تاریخ لکھنے کے لئے بھی استعمال نہیں کیا جاتا!
دور دراز مقامات سے لوگ چار مینار دیکھنے آتے ہیں۔ ہم حیدر آبادی، چار مینار دیکھنے والوں کو عجیب
زیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ چار مینار دیکھنے والے ہمارے لئے تماشہ ہوتے ہیں اس لئے کہ بہت کم
رآبادیوں نے چار مینار کو اطمینان کے ساتھ جی بھر دیکھ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہوگا۔ چار مینار کے اطراف
ب زندگی بہت تیز حرکت کرتی ہے۔ چار مینار کے آس پاس کی جگہ، چہار سمت جانے والی بسوں سے
ی رہتی ہے۔ بسیں کھڑی رہنے کے بعد جو جگہ بچ رہتی ہے اس پر میوہ فروش اور مخصوص "ہر ایک مال"
لے ٹھیلے اپنا قبضہ جمائے ہوتے ہیں۔ بسوں اور ٹھیلوں کے درمیان رکشے اور سیکلیں چلتی ہوتی ہیں۔
ی جگہ، مختلف قسم کی آوازوں اور لوگوں کے ہجوم میں جو شخص بھی چار مینار دیکھے، وہ یقیناً تماشہ ہوتا
، اور اپنے ہی شہر میں تماشہ بننا ہم حیدرآبادیوں کو گوارا نہیں ہے۔ ہم بھی حیدرآبادی ہیں ہم نے بھی
ر مینار کو غور سے دیکھا نہ تھا۔ مضمون لکھنے کے ارادے سے چار مینار دیکھنے گئے۔ "موزتین روپے
جن ... سیب کشمیری سیب .... ہر ایک مال ۔ دو روپیہ .... رکشہ لے رکشہ ... بارکس میلو بارکس چلو
.. اللہ کے نام پر بابا ..." قسم کی آوازوں اور لوگوں کی ریل پیل میں ہمیں چار مینار بہت اونچا نظر آیا
نا اونچا کہ ہم پانچ صدیوں میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کرسکے۔ کم از کم چار مینار کے اطراف ہریالی اور
درخت ہی اُگا لیتے تاکہ دیکھنے والے آرام سے بیٹھ کر چار مینار کا نظارہ کرتے !!! □□

غزلیں

محمود حسن (کلکتہ)

آج بیگم تجھے ہوا کیا ہے
تیرے ہاتھوں میں بیلنا کیا ہے

آرہا ہوں میں سیدھا آفس سے
تجھ سے یہ کس نے کہدیا کیا ہے

صبر کر لوں گا نام ہی سن کر
صرف یہ کہہ دے تو پکا کیا ہے

ساری تنخواہ گول کر دوں گا
جیب کے پھٹنے میں رکھا کیا ہے

بٹوہ بیوی کا مارتے نہ جھجک!
اپنا ہی مال ہے برا کیا ہے

پیسہ پاکٹ میں گر رکھا ہی نہ تھا
تیرے آنچل میں پھر بندھا کیا ہے

صابر بہاری (رانچی)

دروازہ جہنم کا کھلا میرے لیئے ہے
شیطان ہی جب نفس مرا میرے لیئے ہے

اوروں سے چپک جاتا ہے وہ گوند کی صورت
دل اُن کا مگر چکنا گھڑا میرے لئے ہے

تھی عشق کی شادی، مگر اب کہتی ہے بیگم
کم بخت، میاں، خواجہ سرا میرے لئے ہے

دیکھا تھا پڑوسن سے مجھے آنکھ لڑاتے
گھر والی بس اب قہر و بلا میرے لئے ہے

کہتا ہے سر عام یہی آج کا نیتا!
کل جرم تھا جو، آج روا میرے لئے ہے

سالے تو اُڑاتے ہیں جلیبی و پراٹھے
شوہر ہوں مگر باسی غذا میرے لئے ہے

تم کرلو اٹم بم پہ، میزائل پہ بھروسہ
کافی ہے، اگر ایک خدا میرے لیئے ہے

جی بھر کے ستالے مجھے لے گڈو کی امی

انیس احمد خاںؔ
(ڈی ڈی اے کالونی نئی دہلی)

"گاندھی۔ گاندھی جی اور ہم"

گاندھی جی کا نام تو آپ سب نے سُنا ہی ہوگا۔ یہ نام کورس کی کتابوں اور نیتاؤں کی تقریروں میں بار بار تا ہے۔ ہم نے دلی میں ایک جگہ ان کی سمادھی بھی بنا رکھی ہے۔ جہاں آج کل غیر ممالک سے آئے ہوئے معزز مہمان پھول چڑھاتے ہیں اور دیسی نیتا جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ گاندھی جی کی بڑی بڑی تصویریں کورٹ کچہریوں اور پولیس سٹیشنوں پر ٹانگنے کے کام آتی ہیں اور ان کی نصیحتیں دیواروں پر لکھنے کے۔ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو ہمارے ودیشی مہمان پھول کہاں چڑھاتے، نیتا جھوٹی قسمیں کہاں کھاتے جھوٹے مقدمے کس کی تصویر کے سائے میں بیٹھ کر طے ہوتے۔ اور دیواریں تو بیچاری بالکل کنواری ہی رہ جاتیں۔!!

گاندھی جی کسی اور بھی کام آسکتے ہیں۔ اس بات کا پتہ ہمارے نیتا اور فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو اس وقت چلا جب ایک انگریز ڈائرکٹر سر رچرڈ ایٹن برا نے ان کی زندگی پر فلم بنا ڈالی اور بین الاقوامی شہرت کے ساتھ ساتھ ایک دو نہیں پورے آٹھ آسکر ایوارڈ جیت لیے۔ شخصیتوں پر تو ہمارے ہندوستانی ڈائرکٹر پروڈیوسروں نے بھی کئی فلمیں بنائی ہیں جیسے سلطانہ ڈاکو، پتلی بائی، پھولن دیوی وغیرہ وغیرہ۔ بس فرق اتنا رہا کہ ایٹن برا نے اپنے حساب سے سوچا اور ہمارے فلم والوں نے اپنے حساب سے۔

ویسے بھی ہم ہندوستانیوں کو گھر کی مرغی اور دال میں اسی وقت فرق معلوم ہوتا ہے جب کوئی پڑوسی اسے اپنی ہانڈی میں پکا کر ہضم کر جاتا ہے حالانکہ کبھی کبھی اس کارنامہ کے لئے ہانڈی بھی آپ کی ہی استعمال کرتا ہے گاندھی فلم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

گاندھی فلم میں نے دیکھی ہے۔ اور ایک پولیس والے کی مدد سے تین روپے کا ٹکٹ دس روپے بلیک میں لے کر دیکھی ہے۔ اس میں اسٹوری ہے ڈائیلاگ ہیں اداکاری ہے اور ڈائریکشن ہے۔ جو کہ عام ہندوستانی فلموں میں غیر حاضر ہوتی ہے۔ بس! یہیں پر سر رچرڈ ایٹن برا ہمارے ڈائریکٹروں دیروڈیوسروں سے پچھڑ گئے ہیں۔

ہمارے ڈائریکٹر کا بیان بھی ہے تو امیتابھ بچن جیسے ہیرو کے قدموں میں یا پھر ہیروئن کے ناز نخروں میں۔ گاندھی فلم دیکھتے وقت مجھے دور دور تک یہ احساس نہیں تھا کہ میں کوئی بہت ہی اہم فلم دیکھ رہا ہوں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے آج ہو رہا ہے جب میں اپنا سینہ ٹھونک ٹھونک کے دوستوں سے کہتا گھوم رہا ہوں کہ میں نے بھی آٹھ آسکر ایوارڈ ونر فلم دیکھ رکھی ہے۔

اس موضوع پر جب آج کل چوٹی پر بیٹھے مشہور ہدایت کار من موہن دیسائی سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ "میں بھی گاندھی جی کی شخصیت پر فلم بنانا چاہتا ہوں۔ میری اس بارے میں امیتابھ بچن سے بات ہو گئی ہے۔ وہ گاندھی جی کا کردار نبھانے کو راضی ہے اور اس کے لئے انہوں نے اپنا قد بھی گاندھی جی کے برابر کرنے کا وعدہ کر لیا ہے کستوربا کے کردار کے لئے ریکھا سے بات کی تھی لیکن امیت جی اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ لہٰذا پدمنی کولہا پوری کو ان کی جگہ لینے کا ارادہ ہے۔ موسیقی کے لئے برمن صاحب نے آج سے ہی ہالی ووڈ کی تمام دھنیں اکٹھی کرنی شروع کر دی ہیں۔ گاندھی جی کی زندگی پر بننے والی میری کروڑوں روپے کی لاگت سے بننے والی اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ سوئیزرلینڈ اور امریکہ میں ہوگی۔ ساتھ ہی ہماری تمام کوششیں اس پر صرف ہوں گی کہ فلم بننے کے بعد اسے کوئی انعام ملے یا نہ ملے باکس آفس ہٹ ضرور ہو۔"

منوج کمار ــــــ وہ نام جو مار دھاڑ، گلیمر اور سیکس سے بھرپور حب الوطنی پر فلمیں بنانے کے لئے مشہور ہے اور جس کی فلموں میں دیش کی دھرتی سونا اگلے اگلے ہیرے موتی' کے نعروں سے بھری ہوتی ہے۔ لیکن وہ بیچارے کیا کریں جب کہ وہی دھرتی گیہوں نہیں اگلتی جس سے جنتا بھوکوں مرتی ہے۔

میں نے جب ان سے پوچھا "آپ دیش بھکتی پر تو فلمیں بناتے ہیں آپ کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ کبھی گاندھی جی پر بھی فلم بنائی جائے؟"

انھوں نے خالص عبادت والی مسکراہٹ ہونٹوں پر چسپاں کر کے کہا ــــ "بھائی! بات تو آپ صحیح کہتے ہیں لیکن مجھے نوجوان پیڑھی کے مسائل نے زیادہ پریشان کر رکھا ہے۔ ابھی میں نے اپنے نوجوان بھائی کو پینٹر بابو میں پیش کیا ہے دونوں لڑکوں کو جو اب پوری طرح جوان ہو گئے ہیں دھندے سے لگانا ہے۔ اور پھر فلمی کاروبار سے بہتر دوسرا کوئی کاروبار نظر نہیں آتا۔ ان تمام باتوں سے چھٹکارا مل جائے تو پھر گاندھی جی کے بارے میں بھی سوچا جائے گا۔ ویسے میری تمام ہمدردیاں گاندھی جی کے ساتھ ہیں۔

راج کپور سے جب اس موضوع پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا ــــ "گاندھی پر فلم بنانا اچھی بات ہے۔ لیکن یہ خیال اگر میرے دماغ میں اپنے پاپا پرتھوی راج کپور کے زمانے میں آتا تو میں گاندھی کا کردار ان ہی سے ادا کراتا۔ پھر آپ خود ہی دیکھ لیتے کہ وہ اس میں حقیقت کا اتنا رنگ بھر دیتے کہ لوگ اصلی گاندھی کو بھول جاتے جیسے کہ مغل اعظم کے بعد اصلی اکبر کو بھول گئے ہیں۔

غیر ملکی فلموں کو ہندوستانی رنگ میں فٹ کر کے پیش کرنے والے فیروز خان اس سلسلے میں کچھ یادہ ہی پُر جوش نظر آئے۔ انہوں نے جھٹ سے کہا ـــــ "میں نے تو کاسٹ بھی ڈیسائیڈ کر لی ہے ۔ ناندھی کا رول میں کروں گا۔ کستوربا اپنی زینت ہوگی وہ اپنے کسٹیوم کی تیاری کے لئے پیرس جا چکی ہیں جہاں ہی ان کا بدن کم سے کم نظر آئے۔"

جب ان سے سوال کیا گیا کہ اسٹوری، ہدایت کاری، موسیقی اور ڈائیلاگ کا کیا ہوگا تو انہوں نے کہا۔ س کی کیا ضرورت! مسٹر رچرڈ اٹینبرا میری یہ پریشانی پہلے ہی حل کر چکے ہیں۔ بس مجھے اتنا کرنا ہے کہ ایک اسکو گیت اور قوالی اس میں جوڑنی ہے وہ میں کر ہی لوں گا۔"

آخر میں فلمی دنیا کے سب سے پرانے اور ابھی تک حیات ڈائرکٹر وی شانتا رام سے پوچھا تو انہوں نے اپنے سر کی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور اسے گھورتے ہوئے بولے ــــ بھائی آج سے پچھلے پچاس سال پہلے سے گاندھی پر فلم بنانا چاہتا تھا لیکن ایک غیر ملکی نے میرے حق پر ڈاکہ ڈالا اور گاندھی پر مجھ سے پہلے ہی فلم بنا ڈالی۔ یہ ایک سوچنے کی بات ہے کہ یہ غیر ملکی بابائے قوم پر صحیح فلم کیسے بنا سکتا ہے۔ یہ کام ہم ہندوستانی ہی ٹھیک طرح سے انجام دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی فلم بننے کو تو بن گئی اور اسے غیر ملکوں سے انعام بھی حاصل ہو گئے لیکن فلم گاندھی میں کہیں بھی ہمیں ہندوستانی تہذیب کے دیدار نہیں ہوئے۔ کیا فلم گاندھی میں کوئی مجرا کوئی رقص کوئی نغمہ ہے۔ جو ہماری ہندوستانی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اور میری ہر فلم میں درجنوں کے حساب سے موجود رہتے ہیں۔ اگر میں گاندھی فلم بناتا تو اس فلم میں تقریباً ڈیڑھ درجن گانے اور ایک درجن رقص ضرور رکھتا خواہ اس کے لئے مجھے گاندھی کی شخصیت کو نئے زاویہ سے کیوں نہ دیکھنا پڑتا۔

ان سب باتوں کی روشنی میں، میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اچھا ہوا گاندھی بے چارے ہندوستانی ہدایت کاروں کے ہاتھ نہ پڑے !!

▭▭

سرسوتی سرن کیف

کرنا سنجیدہ شاعری حضرت ادیب کا

ہنر گورکھپوری ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں اللہ نے حضرت ادیبؔ کی میراث عطا کی ہے۔ انتہائی ذہانت لے کر پیدا ہوئے۔ والد کسی وکیل کے منشی تھے لیکن ہنر صاحب کو دس برس کی عمر تک ہی ان کا سایۂ عاطفت ملا کیوں کہ شراب نوشی نے منشی جی کو جلد ہی دنیوی تفکرات سے بری کر دیا تھا۔ بیٹے کو ان کے چھوٹے بھائی نے پالا لیکن وہ بھی کیا دہ کیا کرتے، ان کے بھی کافی بال بچے تھے۔ چنانچہ ہنر صاحب مڈل پاس کر کے فکر معاش کے لئے مجبور ہوئے۔ اسی عرصہ میں جوڑ توڑ کر کے میٹرک کیا اور تھوڑا بہت گانا بجانا بھی سیکھا۔ تلاش معاش میں ہمارے شہر آئے۔ یونہی لستم پستم کام چلتا ہے، کہیں ٹیوشن کر لیتے ہیں، کچھ آمدنی افسانوں اور غزلوں سے ہو جاتی ہے۔ خوش نویس بھی ہیں لہٰذا مطالعے سے کبھی کبھی کتابت کا کام بھی مل جاتا ہے۔ تخلیقی صلاحیت اول درجے کی تو نہیں ہے لیکن کام چل جاتا ہے سابق ڈائرکٹر مصرا صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ اب بھی وہ سلسلہ قائم ہے۔ کیوں کہ مصرا صاحب کا محکمہ ہی بدلا ہے، وہ اب بھی اسی شہر میں ہیں۔ نئے ڈائرکٹر متل صاحب سے میں نے ان کا حال بیان کیا تو انھیں بھی ہمدردی ہوئی۔ اپنے بچوں کی ٹیوشن وغیرہ تو نہ دلائی لیکن ریڈیو اسٹیشن میں ان کا سلسلہ لگوا دیا اور وہ عارضی آرٹسٹ کے طور پر رکھ لئے گئے۔ خود کسی سے اپنے لئے کچھ کرنے کو نہیں کہتے۔ خود داری کو خطرہ پیدا ہو جائے تو بڑے بڑوں سے ٹکر لینے میں نہیں ہچکتے لیکن اپنے لئے کسی سے کچھ مانگتے وقت زبان پر تالا پڑ جاتا ہے۔ جب سے میں نے نئے ڈائرکٹر سے ان کی سفارش کی ہے وہ مجھے بہت ماننے لگے ہیں۔

ایک روز میرے گھر آکر کہنے لگے "نظامی صاحب، بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

مجھے سخت تعجب ہوا۔ ہنر صاحب تو اللہ سے مانگتے وقت بہت آگا پیچھا سوچنے والوں میں سے ہیں۔ یہ مجھ سے سیدھا سوال کیوں کر کر بیٹھے۔ میں نے کہا "فرمایئے، کیا بات ہے"؟

کہنے لگے "ادیب جانسوی ..."

میں نے ہنس کر کہا "بھائی جان میں مجبور ہوں۔ اس بھوت کا اُتارنا میرے بس کی بات نہیں۔ کسی پیر فقیر کے پاس جائیے۔"

ہنر صاحب بولے "فقیر تو میں پیدائشی ہوں، پیر ادیب جھانسوی بنائے دے رہے ہیں۔"

"یعنی؟"

"کہتے ہیں کہ مجھے شاعری سکھا دو کیوں کہ آدمی سنجیدہ شاعری نہ کرے تو ادب کی محفلوں میں عزت نہیں ہوتی۔"

میں نے مسکرا کر کہا "مبارک ہو۔ شاگرد تو لاکھوں میں ایک ملا ہے۔ کچھ مٹھائی وٹھائی بھی لائے ہوں گے۔ مجھے بھی کھلائیے۔"

"ضرور لائیں گے وہ مٹھائی۔ وہ روز سے کھانے کے وقت آجاتے ہیں اور میری روکھی سوکھی میں حصہ بٹاتے ہیں۔ وہی مثل ہے کہ باسی بھات میں بھی خدا کا ساجھا۔"

"مثل غلط ہے۔ یوں ہونی چاہیئے کہ باسی بھات میں شیطان کا ساجھا۔ خیر، تو آپ نے ان کی استادی قبول فرمائی؟"

"ان سے چھٹکارا پانا کس کے لئے ممکن ہے؟"

"تو حرج بھی کیا ہے؟ دو ایک باتیں بتا دیجئے۔ دو ایک شعر پر اصلاح دے دیا کیجئے۔"

"حرج صرف اتنا ہوتا تو آپ کے پاس کیوں دوڑا آتا؟ ہوتا یہ ہے کہ کم از کم چار گھنٹے دماغ کھاتے ہیں۔ جو بات بتائی جاتی ہے اس میں سو طرح ٹانگ اڑاتے ہیں۔ جو اشعار اصلاح کے لئے دیتے ہیں وہ تو ہر قسم کے وزن اور معنوی تسلسل سے آزاد ہوتے ہی ہیں لیکن ادیب صاحب زور بھی دیتے ہیں کہ مضمون لاجواب ہے اور اس شعر کا ہر لفظ ضرور قائم رہنا چاہیئے کیوں کہ وہ شعر کی جان ہے۔ ان کی بات صرف اس معنی میں صحیح ہوتی ہے کہ لفظ بھی مہمل ہوتا ہے اور شعر بھی بے معنی ہوتا ہے۔ معنوی مطابقت کے لئے کسی لفظ کو بدلنا چاہتا ہوں تو سوچنے کا موقع نہیں دیتے اور بدلے کے الفاظ کو مشین گن کی گولیوں کی طرح چھوڑ جاتے ہیں اور یہ الفاظ اصل لفظ سے کہیں زیادہ بے تکے ہوتے ہیں ساتھ ہی ان میں کوئی بھی اصل لفظ کا ہم وزن نہیں ہوتا۔ فعل کے وزن کے لئے مفعولن، مفاعیلن بلکہ مفاعیلاتان تک کے ہم وزن الفاظ عنایت فرماتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ ہر مشکل کا حل آدھے سیکنڈ میں نکل آئے گا کیوں کہ ہر سوال کے دو سیکنڈ کے بعد "ہوں۔ ہوں" شروع کر دیتے ہیں یعنی جلد جواب آ گیئے۔ اب بتائیے کوئی کمپیوٹر تو لگا نہیں ہے دماغ میں۔ پھر اصل فکر یہ ہونے لگی ہے کہ یہ روزانہ چار چھ گھنٹے دماغ کھاتے رہے تو جو کچھ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں وہ بھی نہ کر سکوں گا اور جو روکھی سوکھی ملتی ہے اس کا بھی سہارا نہ رہے گا۔"

معاملہ واقعی سنگین تھا۔ ادیب صاحب کو فن شعر سکھانے کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا کیوں کہ وہ سیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ ہنر صاحب کی روٹیوں ہی میں ساجھے داری نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کی محدود آمدنی کے ذرائع بھی مسدود کر رہے تھے۔ ہنر صاحب کوئی سردار شیر سنگھ تو تھے نہیں جو اپنے گھر آنے کے سلسلے میں ان پر فوجی سختی

کے ساتھ حکمِ امتناعی عائد کر دیتے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا۔ ہنر صاحب بھی خاموش ہو گئے۔ انہیں کچھ امید بندھنے لگی تھی کہ مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ سگریٹ تقریباً ختم ہو گیا تو میں نے کہا "بات تو بن سکتی ہے لیکن آپ کو تبدیلیِ قالب کرنی پڑے گی"۔

"کیا کرنا پڑے گا؟" ہنر صاحب منہ پھاڑ کر بولے۔

"بھئی پُرانی داستانیں یاد کرو۔ کسی کو اسمِ اعظم معلوم ہو جاتا تھا تو وہ اپنی روح کو کسی بھی دوسرے قالب میں ڈال سکتا تھا۔ میں بھی آپ کو ایک اسمِ اعظم دیتا ہوں۔ اس سے آپ کا قالب نہ سہی ذہن ضرور تبدیل ہو سکتا ہے اور ذہن کی تبدیلی ہی سے آپ کا کام بنے گا"۔

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا"۔

"بتاتا ہوں۔ کیڑوں کو مارنے کے لئے زہریلی دوائیں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ ادیب کی خباثت دوسروں کی شرافت ہی پر قائم ہے۔ آپ شرافت اور دیانت داری کو اُٹھا کر طاق پر رکھ دیجئے"۔

"یہ آپ فرما رہے ہیں؟" ہنر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"جی ہاں، میں ہی فرما رہا ہوں" میں نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ نے پوچھا ہے تو کہتا ہوں۔ بحث کرنے کے لئے اس معاملے میں میں بالکل تیار نہیں ہوں۔ آپ کی سمجھ میں آئے تو میری بات مانیئے ورنہ آپ کی مرضی۔ ہاں، اگر آپ میری بات منظور نہ کریں تو مہربانی سے اس مسئلے کو لے کر دوبارہ میرے پاس تشریف نہ لائیں"۔

میرے لہجے میں کافی درشتی رہی ہوگی۔ ہنر صاحب سکپکا سے گئے۔ کہنے لگے "فرمائیے"۔

میں نے کہا "نمبر ایک، ادیب صاحب سے ملنے کا وقت بدل دیجئے۔ انہیں چار بجے اپنے گھر بلائیے۔۔۔"

لیکن پانچ بجے تو مجھے ریڈیو اسٹیشن جانا ہوتا ہے"؟

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ چار بجے بلاتے پر وہ پونے چار بجے سے پہلے ہی آ جائیں گے۔ آپ ساڑھے چار بجے تک انہیں اپنا مغزِ مسلّم کھلائیں اس کے بعد ریڈیو اسٹیشن کو چل دیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ راستے بھر آپ کی جان عزیز تنا دل فرما سکتے ہیں۔ لیکن انہیں چائے ہرگز نہ پلائیں۔ کل ہی ان سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر نے سختی سے آپ کو چائے پینے کی ممانعت کی ہے۔ آپ خود ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین کی چائے پر اکتفا کریں"۔

"لیکن گھر آئے آدمی کو۔۔۔"

"دیکھئے، میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں بحث کیلئے تیار نہیں ہوں۔ آپ کو اسے آدمی سمجھنے کی غلطی چھوڑنی ہی پڑے گی"۔

"اچھا۔۔۔۔ اور؟"

"اور یہ کہ آپ ان کے سلام کی۔۔۔"

"ان کا کلام کہاں ہوتا ہے صاحب؟ وہ تو کسی نہ کسی پرانے غیر معروف شاعر کے اشعار اپنی طرف سے مسخ کرکے لاتے ہیں۔"

"وہی سہی وہ جو کچھ لائیں اس کی اصلاح کی ہرگز کوشش نہ کیجئے۔ غلطیوں کی خاص طور پر تعریف کیجئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو غزل کی مزید تخریب کردیجئے یہاں تک کہ کوئی مصرع کسی وزن میں رہ ہی نہ سکے اور نہ اس میں کوئی معنی رہ سکیں۔"

"نظامی صاحب، جان بوجھ کر۔ ۔ ۔"

"میرے پاس اور کچھ کہنے کو نہیں ہے" میں نے ڈھٹائی سے کہا "آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"

"اس سے فائدہ کیا ہوگا؟"

"فائدہ بہت ہوگا۔ آپ ہی کا نہیں سبھی کا فائدہ ہوگا لیکن ابھی آپ سمجھ نہ سکیں گے۔"

"اور معلوم ہونے پر وہ میرے سر آگیا تو؟"

"اس کا انتظام میں کردوں گا۔ آپ آتے جاتے مجھے حالات سے آگاہ کرتے رہیئے گا۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے "اچھا جیسا آپ فرماتے ہیں ویسا ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اجازت ہو۔"

ہنر صاحب کے جانے کے بعد میں دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ ہنر کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ گاؤدی آدمی ہے۔ میری بات پر عمل تو کرے گا نہیں، پریشان ضرور ہوتا رہے گا۔ ہوتا رہے، میری تو جان چھوٹی رہے گی۔

لیکن ایک ہفتے میں ہنر نے آکر بشارت دی کہ وہ میری ہدایتوں پر پوری طرح عمل کر رہے ہیں۔ ادیب صاحب بہت خوش ہیں۔ ان کا دیوان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ان کے محلے کے ہر جانے والے کو معلوم ہوچکا ہے کہ وہ مکمل شاعر بن گئے ہیں۔

میں نے ہنر کو شاباشی دی اور کہا "آپ نے آموختہ تو یاد رکھا ہے۔ اب امتحان آرہا ہے۔ اس میں کامیاب ہوں تو۔ ۔ ۔"

"کیسا امتحان؟"

"پندرہ بیس روز بعد نواب ذوالفقار حسین کی کوٹھی پر ایک طرحی مشاعرہ ہوگا۔ مصرع طرح ہے ع

تیرے دیدار کی حسرت میں ہیں سب دل والے

اب اس کے لئے ذرا محنت سے ادیب صاحب کی غزل تیار کرائیے چاہے خود آپ کی غزل بے کار ہو۔" میں نے سرگوشی میں انہیں کچھ اور ہدایتیں دیں۔ ہنر صاحب کی ہمت کھل گئی تھی، انہوں نے خندہ پیشانی سے میری تجویز مان لی۔

روز مقررہ پر مشاعرہ ہوا۔ شہر کے پندرہ بیس اعلیٰ مرتبت شعراء کی غزل خوانی ہونی تھی جن میں ادیب صاحب کا نام نامی بھی شامل تھا۔ اور سب کے آخر میں رکھا گیا تھا۔ ہنر صاحب سے معافی مانگ لی تھی کہ انہیں کام ہے اس لئے شروع ہی میں ان کی غزل پڑھوائی جائے۔ ادیب نے ایک مرتبہ تکلفاً کہا بھی "میں آپ کے بعد غزل کیسے پڑھ سکتا ہوں، آپ میرے استاد ہیں"۔ ہنر نے کہا "کوئی بات نہیں، میں بخوشی اجازت دیتا ہوں"۔ ہنر گورکھپوری نے سب سے پہلے غزل پڑھی اور سب کو سلام کرکے چلے گئے۔ نواب صاحب کو افسوس ہونے لگا کہ اچھا شاعر پہلے پڑھ چکا تو مشاعرہ کیا جمے گا۔ میں نے انہیں علیحدہ لے جا کر کچھ بات کی تو ان کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں وہ بھی یونیورسٹی کے شریر ترین طلبا میں سے تھے۔

دوسرے شعراء کا ذکر بے کار ہے۔ مجھے تو ادیب صاحب کا انتظار تھا۔ نواب صاحب خود ہی مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے اور منیر انصاری صدارت۔ اپنی باری آنے پر ادیب صاحب نے ہر طرف سلام پھینکے اور مطلع ارشاد فرمایا "آج گوبر ہی اٹھا لائے ہیں ہوٹل والے۔ ہو غرض جس کو وہ کھانا بھی یہیں پکوا لے۔

میں نے اور نواب صاحب نے غلغلۂ تحسین اٹھا دیا۔ منیر صاحب کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ نظر اور سردار صاحب نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ وضاحت فرمائیں گے ادیب صاحب؟"

ادیب صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا "اجی جناب، یہ نئے مضامین ہیں۔ سردار صاحب معاف فرمائیں، ہوٹلوں کا کھانا واہیات ہوتا ہی ہے۔ پھر آج کل گیس پر کھانا پکتا ہے اور گیس گوبر سے پیدا ہوتی ہے" خیال رہے کہ تجویز کے مطابق ہنر صاحب نے یہی نکتہ ادیب صاحب کے دماغ میں ٹھونسا تھا۔ اس وضاحت کے بعد کون کمبخت قافیے کی غلطی پر ان کو توجہ دلاتا حالانکہ مشاعرے کے اشتہار میں صاف کہہ دیا گیا تھا کہ قافیہ دل، منزل، ساحل وغیرہ ہے۔

میرے اشارے پر سارے معروف شاعر اور ادب نواز اصلیت سمجھ گئے تھے اور شور وغل میں میرا اور نواب صاحب کا ساتھ دینے لگے تھے۔ دو اشعار کے بعد نوجوان بھی سمجھ گئے اور محفل مشاعرہ زعفران زار بن گئی۔ صرف صاحب صدر اپنی متانت مضبوطی سے بغل میں دبائے اور ماتمی صورت بنائے بیٹھے رہے۔ ادیب صاحب کی پوری غزل دینا تو مناسب نہیں ہے نمونتہً تین اشعار پیش ہیں :-

ے تم نے بے کار ہی جھگڑا کا مجھے ان داستانوں پر ٭ آخری عمر میں ذہن ہو جاتے ہیں گاماں والے
ے شمع جو روئی تو پروانہ یہ بولا ٭ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھے روتے ہوئے جوبن والے
ے طور موسیٰ پہ اُگی گھاس ابھی تک نہ جلی ٭ گو کہ سر کو دھو آئے وہاں زلف کے شنیل والے

کچھ کلماتِ تحسین بھی ملاحظہ فرما لیجئے "کیا تخریب ادب فرمائی ہے!" "مات علیکم!" "کیا لچک دار مصرعے ہیں!" "خرد کے ڈھکوسلے مات ہیں!" "بدرو کے پانی سے دھوئے ہوئے اشعار ہیں!" "قافیوں کا قتل عام کیا ہے!" "مُرتبے حیا" وغیرہ وغیرہ!

... نیر انصاری نے جھک کر نواب صاحب کے کان میں کہا کب تک اس مصیبت میں پھنسائے رہیں گے مجھے؟
نواب صاحب نے محفل کے شور و غل کو دباتے ہوئے اونچی آواز میں کہا "حضرات، میں آپ سب کا، شعراء صاحبان کا اور خاص طور پر ادیب جھانسوی صاحب کا شکرگزار ہوں۔ ادیب صاحب نے آپ کو ہنسا کر آپ لوگوں کی صحت جسمانی میں اضافہ کیا ہے۔ آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ کسی انسان کے ہاتھوں شاعری کی کس حد تک مٹی پلید ہوسکتی ہے۔ اُمید ہے یہ ان کی آخری غزل ہوگی۔"

اب ادیب صاحب یہ حقیقت سمجھے کہ سبھی ان پر ہنس رہے تھے۔ ہنسنے والوں میں ادبی حلقوں کے لوگ تو تھے ہی، ریڈیو، ٹی۔ وی۔ اور پریس کے لوگ بھی تھے اور ادیب صاحب کو معلوم ہوگیا تھا کہ یہ مشاعرہ ان کی شاعری کی دعوتِ جہلم تھا۔
باہر نکل کر دانت پیستے ہوئے بولے "ابھی اس ہنر کے بچے کے گھر جا کر اس کا سر پھوڑتا ہوں۔"
میں نے کہا "ہرگز نہ جانا وہاں۔ اس نے اپنے گھر میں اُس پٹھان کو بسا لیا ہے جس کا قرض آپ سال بھر سے ٹال رہے ہیں۔"

□□

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

"شاعروں کی ترقی"

ہمارے شہر میں آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ شاعروں کی تعداد میں جتنی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ فی زمانہ ایسے بھی شعراء منظر عام پر آچکے ہیں جو شاعری کے فن سے ناواقف ہی نہیں بلکہ "س" اور "ش" کے فرق سے بھی ناآشنا ہیں۔ لیکن وہ اپنے استادوں کی بدولت اپنے معیار سے بلند اشعار سناکر سامعین کو اچھی طرح بے وقوف بنا رہے ہیں. یہ دیکھتے ہوئے ہمارے شہر کے چند باہمت نوجوانوں نے ان کے خلاف شدید احتجاج کیا اور شاعروں و مشاعروں کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کردی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر میں مشاعرے اور شعری نشستیں منعقد ہونا مشکل ہوگیا۔ جن کے باعث نو آموز شعراء اور ان کے اساتذہ سخت پریشانی میں مُبتلا ہوگئے۔ اس خطرناک صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے چند استاد شعراء ایک جگہ جمع ہوئے اور اپنے ذاتی اختلافات کو ختم کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے شعراء کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا جائے.

چنانچہ ایک بڑے میدان میں اُس جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام شعراء نے سب سے پہلے ایک دوسرے سے گلے مل کر اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا عہد کیا. پھر کافی غور و فکر کے بعد یہ طئے پایا کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس کا کوئی متبادل راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ آخر اس کا متبادل راستہ کون سا ہوسکتا ہے ؟

اس پر کافی دیر تک بحث ومباحثہ ہوتا رہا. کافی بحث وتکرار کے بعد ایک ضعیف العمر شاعر نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کا متبادل راستہ یہی ہوسکتا ہے کہ متعدد سہرا پارٹیاں بنائی جائیں۔ اس سے ہمارے کیڑے خود بخود کلبلانا بند کردیں گے اور پھر ہمیں ہماری محنت کا معقول معاوضہ بھی مل جائے گا۔ ویسے بھی شہر میں سہرا پارٹیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

کہنہ مشق شاعر کی اس تجویز کو بہ اتفاق رائے منظور کرلیا گیا۔ اب ہر استاد شاعر نے اپنے اپنے شاگردوں کو اپنے ہمراہ لے کر علیحدہ علیحدہ بیس جماعتیں بنالیں۔ بعدازاں یکے بعد دیگرے ہر جماعت نے یہ حلف لیا کہ وہ آئندہ آپس میں کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف نہیں رکھیں گے ورنہ مشاعروں کی طرح سہرا پارٹیوں پر بھی پابندی عائد ہوسکتی ہے اس جلسے میں مشترکہ طور پر یہ بھی طے پایا کہ وہ شعراء جو اپنے کلام تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں وہ سہرا نہیں پڑھیں گے البتہ صرف اپنی جماعت کے ساتھ شریک دعا کریں گے اور جو بھی معاوضہ جماعت کو ملے گا اس میں ان کا برابر کا حصہ ہوگا۔ سہرا پارٹی کی مقررہ فیس بھی طے کرلی گئی۔ اس لئے اس میں کسی بھی قسم کے مول تول کی گنجائش کو جگہ نہیں دی گئی۔ اس جلسے میں کچھ قوانین بھی بنائے گئے جن کی پابندی کرنا تمام جماعتوں کو لازمی قرار دیا گیا۔ اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر نہ صرف سخت جرمانہ مقرر کیا گیا بلکہ ان کے لائسنس منسوخ کرنے کا تصفیہ بھی کیا گیا۔ چوں کہ یہ ایک اچھا قدم تھا اس لئے جلسے کے اختتام پر شعراء ضرورت سے زیادہ خوش ہوگئے اب وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے اردو شاعری پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ ابھی ابھی ہمارے سامنے سے ایک بارات گزری ہے۔ کافی شور و غل سن کر ہم بھی بالکنی پر آکھڑے ہوئے، دیکھا کہ دولہا کے آگے ایک سہرا پارٹی اپنا کلام بہ آوازِ بلند پیش کر رہی ہے۔ غور سے دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ ایک استاد شاعر جناب "ط" گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے دولہے کی موٹر کے آگے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے شاگرد چاروں طرف سے انھیں گھیرے ہوئے ہیں۔ جناب "ط" اپنے ہی کلام پر سر دھن رہے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک عدد عود دانی بھی ہے جس میں سے لوبان کی بھینی بھینی خوشبو نکل رہی ہے۔ اِردگرد ایک جم غفیر ہے جو کچھ چلّر پیسے اور کبھی ایک آدھ نوٹ استاد پر سے نچھاور کرکے جماعت کو دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہم عش عش کر اٹھے۔ بارات جب آگے نکل چکی تو ایک شناسا نے ہمیں بتایا کہ اتنا سارا مجمع دراصل سہرا پارٹی کا کلام سننے کے لئے نہیں بلکہ جناب "ط" اور ان کے شاگردوں کو دیکھنے کا متمنی تھا۔

اِدھر ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ بارات جو ابھی ابھی ہماری نظروں کے سامنے سے گزری ہے، جب دُلہن کی ڈیوڑھی پر پہنچے گی تو اتنے سارے باراتیوں کو دیکھ کر دُلہن کے والدین اور رشتہ داروں کے دلوں کی دھڑکنوں کا کیا حال ہوگا؟

ہمارے کانوں میں یہ جملے بھی تیزی سے سُنائی دے رہے ہیں کہ اگرچہ شاعروں نے ترقی کرلی ہے لیکن اب وہ اسٹیج سے سڑک پر آچکے ہیں!

خواجہ غلام السیدین ربانی
(مومن پورہ۔ ناگپور)

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے

اچھی صورت ویسے کبھی بُری چیز نہیں ہوتی، لیکن آفت اس وقت آجاتی ہے جب اچھی صورت والوں کو یہ احساس ہوجائے کہ وہ خوبصورت ہیں۔

میرے ایک خالہ زاد بھائی ہیں۔ 'اچھن بھائی' ـــ نام بے چاروں کا اچھا خاصہ تھا اسرار احمد لیکن بزرگوں کی مہربانیوں نے ان کے نام کو بھی نزول کی زمین سمجھ کر اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق اس پر انکروچمنٹ کے تجربات کئے اور مناسب و غیر مناسب کی حدود سے اونچا اٹھ کر اسے آلٹر ALTER کر ڈالا۔

خدا اچھن بھائی کو اچھا رکھے۔ بے چارے بہت اچھے آدمی ہیں۔ صورت شکل تو خیر خدا کی بنائی ہوئی ہے ـــ لیکن جیسی کچھ بنائی ہوئی ہے اس میں آٹھ چاند لگانے میں اچھن بھائی کا اپنا ہاتھ زیادہ ہے۔ اچھی صورت کی وجہ سے ہمارے اچھن بھائی زمین پر بھی چلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے آسمان پر چل رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے میری ان سے پہلی ملاقات ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی ـــ ملاقات کیا ہوئی بس دور سے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ دوستوں نے مجھے دکھایا تھا کہ۔

"دیکھو دیکھو . . . بغیر ٹکٹ کے آج اچھن بھائی کو دیکھ لو، ورنہ ایسی چیزوں کو دیکھنے کے لئے zoo میں پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں"

میں نے بہت دلچسپی سے انھیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے ململ کے کپڑے کو بہت گہرا اسٹارچ دیدیا ہو ایکدم اکڑے اکڑے لگ رہے تھے اچھن بھائی۔ میں نے ذرا بے تکلفی دکھائی تھی۔

"اچھن بھائی السلام علیکم" ـــ

اچانک چونک کر رکوع کی حالت میں جاکر اپنے داہنے ہاتھ سے پیشانی پر ہوا کرنے لگے تھے میری سمجھ میں کچھ نہیں

یا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ سلام کا جواب دے رہے تھے۔
جواب بھی ایسا تھا کہ جس میں تمام آوازیں حلق سے نکل رہی تھیں۔
"میرا دوسرا سوال تھا" اچھن بھائی۔ آپ کی گردن سوتے وقت موچ کھا گئی کیا"؟
اچھن بھائی بولے تھے ——— نہیں تو۔ جی نہیں بالکل نہیں"
——— تو شہزادی کبوتر کی طرح گردن کیوں اکڑائے اکڑائے گھومتے ہیں آپ ؟" تھوڑی دیر تک وہ ہکلاتے رہے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں پائے تھے پاس پڑے ہوئے گلاس کا پانی خواہ مخواہ پی لیا تھا اس کے بعد میں تو بھاگ آیا تھا وہاں سے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اچھی اردو میں مجھے بہت ساری باتیں سنائی تھیں۔ یہ تھی میری اور اچھن بھائی کی پہلی ملاقات۔ اس دن کے بعد سے آج تک ہم دونوں میں 'گاڑھی اور پتلی' دونوں قسم کی چھنتی ہے۔ ہاں اچھی اردو پہ یاد آیا۔

ہمارے اچھن بھائی کو ادب اور زبان سے خاص لگاؤ ہے۔ لگاؤ کیا لکھنے لکھانے کا شوق بھی ہے۔ موقع بل جانے پر آپ لوگوں کی نظر بچا کر اردو پہ ہاتھ بھی صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات ویسے ٹاپ سیکریٹ ہے کہ آپ کی تعلیم کتنی ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، زبان و ادب تو بے چارے ایسے مظلوم ہیں کہ بے لکھے پڑھے لوگ اُن پر مہربانیاں فرمائیں۔

اب اچھن بھائی کا اس میں قصور بھی کیا ہے کہ کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا یہ تو تعلیم کی بدقسمتی ہے کہ وہ اچھن بھائی کو حاصل نہ کرسکی ——— تعلیم کی بات چھوڑ یئے اچھن بھائی کو کون سی نیم پلیٹ' بنوانی ہے یا 'لیٹر پیڈ' چھپوانا ہے اصل قابلیت تو یہ ہے کہ آدمی محفلوں میں رنگ جمانے والا ہو بس۔ تعلیم والیم سب بیکار ہیں۔

اور 'اچھن بھائی' تو خاص محفلوں کے آدمی ہیں۔ کوئی تقریب ہو، کوئی جشن ہو، کوئی جھگڑا ہو اچھن بھائی کا رنگ سب پر بھاری رہتا ہے۔ آپ ہمیشہ لوگوں کی دعائیں لیتے ہیں (انھیں ہنسا ہنسا کر) اُن کی اس غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے کئی رنگین واقعات وجود میں آئے ہیں۔ اور کئی مستند لطیفے آپ کی ذات سے منسوب ہو گئے ہیں۔

اچھن بھائی پہلے پہل اپنے حسن سے بیگانے تھے۔ لیکن ایک دن اچانک پتہ نہیں کس ANGLE سے خود کو دیکھ لیا کہ خود پر فدا ہو گئے۔ بس اُسی دن سے ۲۴ گھنٹوں میں سے تقریباً ۲۰ گھنٹے آئینے کے سامنے گزارتے ہیں (آپ شہر میں COSMETICS کے سب سے بڑے خریدار ہیں)

آپ ہر مہینے ایک نیا ہیئر اسٹائل اختیار کرتے ہیں۔ اور ایسے ایسے تجربے کرتے ہیں کہ محلے پڑوس والے شکریہ ادا کرنے آجاتے ہیں (کیوں کہ انھیں صرف ان ہیئر اسٹائلس کی وجہ سے بہت ہی نایاب پرندوں کے گھونسلے خود دیکھنے اور اپنے بچوں کو بھی دکھانے کو ملتے ہیں)

اچھن بھائی کو (ہر اچھے آدمی کی طرح) یہ خوش فہمی بھی ہے کہ ان میں ایک کلاکار چھپا ہوا ہے۔ کچھ دن تک
[illegible]

کردیا ہے تو فوراً یہ خیال ترک کردیا (اور 'جماعت' میں نام لکھوادیا) ویسے نئے نئے انداز سے فوٹو کھنچوا کر اچھن بھائی اپنے ذوق کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔

آج بھی مردانہ وجاہت کے سلسلے میں آپ کا معیار "ہالی وڈ" اور بمبئی کے پرانے ہیرو ہیں۔ چنانچہ۔ برجیس جیکٹ، کاؤ بوائے سوٹ وغیرہ پہن کر سائیکل چلانا، گرمیوں میں کانوں تک کالر والا گرم اوور کوٹ پہننا، فیلٹ ہیٹ لگا کر آدھی رات کو اندھیری گلیوں میں گھومنا، اماں باوا سے چھپا کر سگار لائٹر جیب میں رکھنا اور وقتِ ضرورت لوگوں کے سگریٹ سلگا کر دینا۔ بادل چھاتے ہی رین کوٹ پہن لینا آپ کی عادتوں میں داخل ہیں۔

ذوق کے معاملے میں 'اچھن بھائی' بہت نفیس انسان ہیں۔

اجنبی خواتین، کنواری لڑکیوں اور دوستوں کی بیویوں کو آرٹ سمجھ کر سراہتے ہیں۔ شاید اسی لئے خود کے لئے اس قسم کے کسی آرٹ پیس (Art piece) کا مستقل انتظام آج تک نہیں کر پائے ہیں ـــــ باوثوق ذرائع سے ملنے والی خبروں کے مطابق بھائی فی الحال ۴۰، ۴۱ کے پیٹے میں ہیں لیکن خود کو ۲۱، ۲۲ سے زیادہ کا نہیں سمجھتے۔ روزانہ شیو کرتے ہیں اور ایک دن آڑ خضاب لگواتے ہیں (اور آرٹ گیلریوں پر ہی کام چلاتے ہیں)

اپنی شخصیت اور لباس کے معاملے میں آج بھی آپ دوسروں کی رائے بغیر سوچے سمجھے مان لیتے ہیں لہٰذا بالوں کے اسٹائل قمیصوں کی تراش، پتلون کے ڈیزائن، ٹائیوں اور جوتوں کے رنگ بالکل گرگٹ کی سی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں۔

ایک دن کسی لڑکی نے آپ کو مونچھیں رکھنے کا مشورہ دیا۔ 'اچھن بھائی' کی باچھیں کھل کر کانوں تک پہونچتے بچیں۔ فوراً فوجی مارکہ مونچھیں رکھ لیں۔

لیکن دوسرے ہی مہینے پھر کلین شیو دکھائی دیئے ـــــ دوستوں نے وجہ پوچھی تو 'زکام پر مونچھوں کے اثرات' عنوان سے ایک لمبا چوڑا مقالہ زبانی سنادیا۔ اور ہمدرد دواخانے کی اصطلاحیں استعمال کر کے تمام لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی ـــ لیکن لوگ بھی جانتے تھے کہ ایک بہت مشہور مثل کی رو سے اچھن بھائی کو زکام تو ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا"

بعد میں پتہ کُھلا کہ چھینکوں کی اصل وجہ زُکام نہیں بلکہ مونچھوں کی بے ترتیبی تھی جو خود رو جھاڑیوں کی طرح ہونٹ کی سرحد سے گزر کر ناک کی حدود میں پہونچکر گدگدی پیدا کرتی تھیں۔

بے چارے اچھن بھائی کو شاید معلوم نہیں تھا کہ مونچھوں کے چھینک نہ لانے والے اسٹائل بھی موجود ہیں مثلاً تیلی مارکہ مونچھ یا چہرے کے کلاک پر سوا نو بجانے والی مونچھ۔

ایسا ہی ایک واقعہ اور ہوا اچھن بھائی کے ساتھ۔ ہوا یہ کہ پارسی تھیٹر Parsi Theater کی قسم کی کسی ڈرامہ کمپنی کا ایک شو اچھن بھائی دیکھ آئے اور اس کے ہیرو کی طرح اپنی قلمیں آدھے آدھے رخسار تک بڑھالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوس کے ایک بچہ نے اچھن بھائی کو غور سے دیکھا اور بھاگتا ہوا اپنی ماں کے پاس

یا اور کان میں کچھ کہنے بھی لگا۔ ادھر اچھن بھائی پریشان ہو گئے کہ اچانک بچہ کیوں بھاگا؟
کچھ اشتیاق تھا کچھ تذبذب تھا۔ دیوار کے اُوپر سے جھانک کر دیکھنے لگے۔
بچہ ناں سے کہہ رہا تھا "امی امی آپ تو کہتی تھیں اب کہانیوں والے جلاّد دنیا میں نہیں رہے۔ جلدی دیکھو اپنی
پڑوس میں ایک جلاّد آیا ہے۔"
اس سے آگے اچھن بھائی سن نہیں سکے۔ سیدھے حجام کے یہاں گئے اور شریفوں کی طرح بال کٹوا لئے۔ اب
چھن بھائی کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ ان کی تو پوری زندگی ایک کامیڈی فلم ہے۔ جہاں سے دیکھئے جتنی دیکھئے مزیدار
ل چسپ۔
اب سنئے کہ اچھن بھائی Beauty contest میں حصہ لینے والے ہیں۔ جس کے لئے وہ روز
بح و شام ورزش اور 'یوگا' کا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنے درزی دوست کے یہاں جاکر روز اس کی ٹیپ سے اپنا
یگر ناپتے ہیں۔ مجھ سے اب جب بھی ملتے ہیں کامیابی کی دُعائیں کرنے کو کہتے ہیں۔
کل ہی کہہ رہے تھے کہ "ارے مُنّا تجھے وہ مقابلے کا فارم بھرنا تو آتا ہوگا نا؟
کم بخت نے بڑی پُرانی انگریزی لکھی، ذرا مجھے فارم بھر دینا ہاں؟
میں نے حامی تو بھر لی ہے لیکن حیران ہوں کہ مقابلہ کس سے کریں گے اچھن بھائی اور مقابلہ کیسے ہوگا فارم
خیر بھر دیا جائے گا۔
اچھن بھائی پہنچ بھی جائیں گے مقابلہ میں لیکن دوسری شرکاء محترمات اور جج صاحبان کا کیا ہوگا؟
کیوں کہ جو فارم اچھن بھائی بھرنا چاہ رہے ہیں وہ MISS INDIA کے مقابلے کے لئے ہے۔ OO

لقب عمران (اچلپور)

کھوٹا ہے دل کا میرا شوہر موا کہیں کا
مرتا ہے دوسری پر بندر موا کہیں کا

احساس ہی نہیں ہے تشنہ لبی کا میری
دشمن کو دے رہا ہے ساغر موا کہیں کا

بس ایک میں ہوں جس کو اس نے رُلا کے چھوڑا
سب کو ہنسا رہا ہے جوکر موا کہیں کا

دامِ محبت اس نے پھیلا دیا میری خاطر
دیتا ہے مجھ کو دھوکا ہنس کر موا کہیں کا

چلتا ہے سر اُٹھا کر مغرور ہے وہ بے حد
کھا کر رہے گا اک دن ٹھوکر موا کہیں کا

سرقہ کی خو پڑی ہے بچپن سے اس کو شاید
کرتا ہے شعر میرے ازبر موا کہیں کا

پروا نہیں ہے اس کو جذبات دل کی میرے
جاتا نہیں اُدھر سے ہو کر موا کہیں کا

سو بار کہہ دیا ہے پکچر دکھاؤ مجھ کو
سنتا نہیں ہے میری پتھر موا کہیں کا

میرا ارادہ اس کی کالر پکڑ لوں لیکن
نکلے ہے صاف ہر دن بچ کر موا کہیں کا

احساس ہی نہیں ہے تکلیف کا مری کچھ
لاتا نہیں ہے کپڑے دھو کر موا کہیں کا

میرے لئے نہ لائی ساڑی گزری کی اب تک
کہتا ہے میں ہوں تیرا شوہر موا کہیں کا

میں جس کو زندگی بھر خوش دیکھنے کی خواہاں
کہتا ہے میرے غم کو بہتر موا کہیں کا

میری سمجھ میں اس کی اک بات بھی نہ آئے
بھن بھن سدا کرے ہے مچھر موا کہیں کا

دشمن میں میرے یارو خودداری کچھ نہیں ہے
اس بت کا بن گیا ہے نوکر موا کہیں کا

شوہر کی میرے دیکھو یہ بھی نمک حرامی
سوکن کا ہو گیا ہے نوکر موا کہیں کا

تھا انتظار مجھ کو خوشیوں کا زندگی میں
چڑھ آیا مجھ پہ غم کا لشکر موا کہیں کا

اشعار پڑھ رہی تھی میں جھوم کر لقب کے
ناراض ہو گیا ہے شوہر موا کہیں کا

موا کہیں کا

شکیل رضا بنگلوری

مصرعہ اُٹھانا...!

غم اُٹھانا تو انسان کی پُرانی عادت ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اٹھانا انسانوں کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے، جیسے روپیہ اُٹھانا یعنی کہ آج کل کے نوجوانوں کا اپنے رئیس باپ کی تجوری سے روپے اُڑانا اور شباب وکباب کی محفلوں پر خرچ کر کے لطف اُٹھانا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نقاب اُٹھانا یعنی کہ "آپ تو جانتے ہی ہیں"! یہ سب زندگی کے ایسے اُمور ہیں جو صرف انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں کوئی غیر شریک نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مذکورہ اٹھا پٹک جیسے اُمور میں ایک اور امر بھی شامل ہے۔ جو انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جسے اکثر اَدبی محفلوں میں سرانجام دیا جاتا ہے۔ غالباً آپ میرے کہنے کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ جی ہاں! آپ نے بالکل ٹھیک لفظ اُٹھایا ہے۔ یعنی کہ مصرعہ اٹھانا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آل انڈیا ریڈیو سے ہفتہ وار پروگرام میں ایک مشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔ اور حسبِ معمول شاعر کے شعر پڑھنے سے پہلے مہمان شعراء مصرعہ اٹھا رہے تھے! یہ دیکھ کر ہماری بیگم صاحبہ نے جنہیں اردو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، سوال اٹھایا کہ کیوں جی یہ آپ لوگ شاعر کو پڑھنے کیوں نہیں دیتے، شعر کیوں چاٹنے لگتے ہیں! تو ہم نے اپنی بیگم صاحبہ کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ "نہیں بیگم اِسے شعر چاٹنا نہیں کہتے بلکہ اِسے مصرعہ اُٹھانا کہتے ہیں"! جیسے کوئی دُلہا اپنی دلہن کے دائیں جانب والے کاندھے سے سہرا اٹھا کر کہہ رہا ہو کہ چلو دلہن ہم نے تمہیں قبول کیا!!

ادبی قاعدے کے مطابق مہمان شعراء کے ساتھ ساتھ سامعین حضرات بھی مصرعہ اُٹھانے کو اپنا ادبی حق تصور فرماتے ہیں، کیوں کہ کوئی بھی شاعر ملک کا کتنا بھی بڑا شاعر کیوں نہ مانا جاتا ہو، اپنا ہر شعر سب سے پہلے سامعین حضرات کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کرتا ہے یعنی کہ سامعین کے نذر کرتا ہے۔

کیوں کہ کسی بھی شاعر کو اپنا ہر شعر یا غزل کا پہلا شعر اس وجہ سے سامعین کی نذر کرنا پڑتا ہے کہ شعر کا مطلب سامعین کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے کچھ نہ کچھ داد تو ضرور ملتی ہے! اور پھر ہر شاعر کو نہ صرف اٹھانے بٹھانے بلکہ بڑا شاعر بنانے والے اصل میں سامعین حضرات ہی ہوتے ہیں!!

اس معاملے میں ہم ہر اُس شاعر کے طرف دار ہیں۔ جو اپنے اشعار سامعین کی نذر کرتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ہمارا شمار صرف اور صرف سامعین حضرات میں ہوتا ہے۔ دوسرا اس لئے کہ اکثر مشاعروں میں ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ شعراء برادری کی جانب سے اچھے سے اچھے شعر پر داد بہ مشکل ہی ملتی ہے! لہذا ہم نے اس راز کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ایک بزرگ شاعر صاحب سے راز دارانہ انداز میں استفسار کیا تو آپ نے بھی اسی انداز میں فرمایا تھا کہ آپ نہیں جانتے رضا صاحب! آج کل اس وجہ سے شعراء کے کلام پر داد نہیں ملتی کہ اکثر شعراء کا شمار میرے ہونہار شاگردوں میں ہوتا ہے، جو خالص میرا کلام پڑھتے ہیں۔ اور ہم عصر شعراء کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے شاگرد کو خاطر میں نہیں لاتے! اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے شاگردوں کے کلام پڑھنے پر داد دی جائے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ اور بھی معیوب کن بات ہوگی۔ کیوں کہ کوئی بھی عزت مند شاعر اپنے کلام پر خود ہی داد نہیں دیا کرتا! تو جناب اس طرح لے دے کر سامعین حضرات ہی رہ جاتے ہیں جن سے داد کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ جو خدا کے فضل سے ضرور پوری ہوتی ہے!!

یہاں ہم دل سے اس بات کے معترف ہیں کہ صنفِ شاعری، ادب میں ایک اُونچا مقام رکھتی ہے اور یہ ہر کس کے بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ شاعری کرسکے! ہاں جس پر خُدا مہربان ہو جائے وہی شاعر بن سکتا ہے!! جیسا کہ آپ نے وہ محاورہ تو ضرور سُنا ہوگا کہ "خُدا مہربان تو" ۔۔۔۔۔! خیر جانے دیجئے اگر آپ نے سُنا ہے تو پھر کیوں دُہرایا جائے! اگر شاعری کرنا ہر کسی کے بس کا روگ ہوتا تو آج ہم بخُدا یقین مانیئے شاعری کے اُفق پر اپنا کلر فل جھنڈا لہرا چکے ہوتے! خیر کوئی بات نہیں، جہاں ہم شاعری کا جھنڈا لہرا نہیں سکے وہاں ہم کئی اور جھنڈے لہرا چکے ہیں!!

بہر حال مشاعرہ پڑھتے نہ سہی، البتہ مشاعرہ سُنتے سُنتے ہم اس قدر ماہر ہو چکے ہیں کہ نہ صرف آسانی سے مصرعہ اٹھا سکتے ہیں۔ بلکہ پوری غزل بھی اُڑا سکتے ہیں! یہی وجہ ہے کہ ہمیں اکثر مشاعروں اور ادبی محفلوں میں مصرعہ اٹھانے اور داد دینے کے لئے مدعو کیا جاتا رہا ہے اور ہم مروت میں دور دراز کے مشاعرے نہ صرف سُن کر بلکہ دیکھ کر اور لیٹ کر بھی آئے ہیں!! آپ سوچتے ہوں گے کہ جناب مشاعرہ پڑھنا تو صحیح ہے، سُننا اور دیکھنا بھی اپنی جگہ سو فیصد درست ہے! مگر یہ مشاعرہ لیٹنا کیا ہوا؟ اس کا تو کہیں موقع و محل نظر نہیں آتا، تو میرے عزیز ہم آپ سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جو زنانہ وہ تو بخُدا سولہ آنے

سچ ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے مولانا کہ جہاں مشاعرہ لوٹنا صحیح ہوسکتا ہے تو وہاں مشاعرہ لٹنا صحیح کیوں نہیں ہوسکتا۔ چلئے جناب ہم آپ کو ایک قصّہ مختصر سناتے ہیں یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم مفت مشاعرے وغیرہ کرآتے تھے !!

یوں تو ہماری دانست میں بہت سارے دوست ہمارے قریب ہیں اور رہ چکے ہیں۔ جن میں چند دوستوں پر خُدا بڑا مہربان رہا ہے جو خیر سے بڑے اچھے شاعروں میں ان کا نام لیا جاتا ہے ان میں ایک شاعر دوست جن کے ساتھ ہم اپنے جیب خرچ پر کئی مشاعرے ہو آئے ہیں! ایک مرتبہ حسبِ معمول ہم اپنے ان دوست کے ساتھ ایک مشاعرے میں گئے۔ جو کئی ریاستی مشاعرہ کے نام سے منعقد ہوا تھا۔ ہمارا یہ معمول تھا کہ ہم جب بھی ان شاعر دوست کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تو ہم شعرا کے ساتھ ڈائس پہ پہنچ جایا کرتے تھے۔ کیوں کہ ہمارے مہربان دوست کو اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ مہمان شعراء کی جانب سے یہ مشکل داد وصول ہوتی ہے!

ہر مشاعرے میں مصرعہ اُٹھانا اور داد پہ داد دینا تو ہمارا مقصد عین تھا ہی اس لئے ہم شعراء کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور ہر غزل پر واہ واہ کے پھول برسایا کرتے تھے۔ ہم تو تھے ہی مصرعہ اٹھانے والوں میں تو شعراء حضرات بھی ہماری طرف اس نظر سے دیکھتے تھے کہ جیسے کہہ رہے ہوں میاں" ایک نظر ادھر بھی"!!

خیر تو جناب اسی ریاستی مشاعرے کی بات ہے کہ ہم شعراء کے ساتھ بیٹھے مصرعہ اٹھا رہے تھے اور داد کے پھول اور کلیاں بکھرا رہے تھے۔ لیکن مشاعرہ تھا کہ بس آگے ہی بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ ایک تو بڑا مشاعرہ تھا اور جتنے شعراء تشریف فرما تھے۔ اس لحاظ سے اور بھی بڑا بن گیا تھا۔ اور پھر ابھی ہمارے دوست کا نام پکارا نہیں گیا تھا اس لئے ہم بیٹھے اپنا فرضِ منصبی نبھا رہے تھے لیکن جناب محترم ہم بھی مجبور تھے! ایک تو دس گھنٹے سرکاری بس کا سفر اور دوسرا رات چار بجے تک مشاعرہ اٹھانے کے بعد کس اُلو کی آنکھ ہے جو کُھلی رہ جائے! ایک صاحب جو اپنی غزل سُنا رہے تھے انہوں نے اپنی غزل میں ایک شعر کچھ اس طرح باندھا تھا کہ اُدھر سامعین مکرّر مکرّر کی رٹ لگائے ہوئے تھے اور ہم اِدھر واہ واہ کی دھوم مچا رہے تھے۔ تو جناب عالی اس مکرّر اور واہ واہ کے بیچ احساس ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ہماری آنکھ کب لگ چکی ہے! اب آپ ہی ذرا ہمیں یہ سمجھا دیجئے کہ یہ مشاعرہ لٹنا نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا!

خیر جب ہم نیند سے جاگے تو پتہ چلا کہ مشاعرہ ابھی ابھی پورا ہوا ہے۔ لیکن ہمیں اپنے دوست کی فکر ستانے لگی تو ہم ہوٹل پہنچے اور معلوم ہوا کہ ہمارے دوست بہادر ہمیں سوتا دیکھ کر بغیر مشاعرہ پڑھے ہوٹل چلے آئے تھے اور اب نیند میں غزل سُنا رہے ہیں!! ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اچھا ہوا!!

ے نہ رہا بانس نہ بجی بانسری

توفیق فاطمہ

یہ مزاج داریاں

ہر کسی کو خوش کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ـ کس کس کو خوش کریں کس کس کی ناراضگی سے بچیں سمجھ میں نہیں آتا. ویسے غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اِرد گِرد سی آئی ڈی، خفیہ پولیس، جیب کترے، چغل خورے اور خوشامد پسندوں کا جال بنا ہوا ہے. سی آئی ڈی ہمارے بچے، خفیہ پولیس ہماری بیوی، بازار میں جیب کترے، نوکری میں چغل خورے اور کہیں کہیں گاہے ماہے خوشامد خورے بھی مل جاتے ہیں. ان سب کو برداشت کرتے ہوئے لوگوں کے مزاجوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے آیئے آپ کو چند شخصیتوں کے مزاجوں سے روشناس کروائیں جن سے ہم کو سابقہ پڑ چکا ہے. ہوسکتا ہے مستقبل میں کبھی آپ کا بھی سابقہ ہو اگلا گرا پچھلا ہوشیار ـ ہم نے بھری محفل میں قسم کھائی تھی کہ تادم حیات بلا تھکان بلا چوں وچرا بیوی کے ناز اٹھائے جائیں گے چشم بد دور آج تک اٹھائے جا رہے ہیں. رہے بچے تو یہ ازدواجی زندگی کے جزولازم ہیں اور ہم کو ان کی بال ہٹ کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے. تو ان دونوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد نوکر کی باری آتی ہے ـ نوکر جو ہماری گھریلو زندگی کی بیساکھی ہے اس سے جان چھڑائے نہ بنے والا معاملہ ہے. بیوی صاحبہ اس کی الٹی سیدھی حرکتوں پر اونٹتی رہتی ہیں۔ اور ہمیں جج بنا کر مقدمہ داخل کر دیتی ہیں. بیوی کی قسمت میں اونٹنا لکھا ہے اور ہماری قسمت میں اس کی مزاج داری ـ حسن اتفاق سے ناچیز صاحب جائیداد بھی ہے. چاہے وہ چھوٹی ہی سہی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آئے دن ہم کرایہ دار کو دھمکی دیتے یا کسی قسم کا مطالبہ کرتے لیکن وہی ہمیں دھمکی دیتا ہے ہم کسی قسم کا مطالبہ یا تقاضہ کر سکتے ہیں نہ حکم صادر کر سکتے. نہ ہی آنکھیں دکھا سکتے ہیں. کرایہ دار کہتا ہے جیسا STAY ORDER اس کا گھر ـ ویسے بھی عدل جہانگیر اب کہاں رہا ـ رشوت ستانی کا بازار گرم ہے دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی عام ہے ـ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو آیئے دیکھیں مزاج کس کس

کے گرم ہیں۔ نہیں صاحب سرد بھی ہو سکتے ہیں۔ بتلائیں آپ کو۔ ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے خمیر کی مٹی انکسار کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔ اور وہ شخص دل و جگر کے ساتھ ساتھ ایک عدد پتّا بھی رکھتا ہے۔ وہ ہے ایک تاجر۔ وہ اپنے بیوپار کے لئے آپ کو ہر طرح سے مطمئن کرا دے گا۔ اس کی حتی الامکان کوشش یہی رہے گی کہ آپ اس کے غلہ میں کچھ ڈال جائیں۔ بعض وقت تو وہ اس قدر مہربان ہو جاتا ہے کہتا ہے صاحب میں آپ کو مارکٹ سے کم دام پر دوں گا یا پھر مال لے جائیے پیسے بعد میں دے دینا یعنی وہ آپ کو ادھار کا لالچ بھی دیتا ہے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اس کی مصنوعی مسکراہٹ کے پیچھے اس کا غریب اور اکلوتا دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے جو صرف اور صرف اپنے مال کی نکاسی چاہتا ہے۔ اب اس کا غلہ بھرنے کا کام گاہک کے مزاج پر ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو بھرے چاہے تو بے التفاتی سے کام لے۔

اب سُنیئے صاحب چپراسی کا مزاج۔ چونکہ ہم اہلِ غرض ہیں آفیسر صاحب سے صاحب سلامت نہیں ہے لیکن کام بہت ضروری آپڑا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایڑی چوٹی کا زور بیٹھی کے چپراسی پر لگا دیا۔ کہ وہی یہ کام کر سکتا ہے۔ فائیلوں کی ہیرا پھیری اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور جہاں آفیسر صاحب سے ہزار میں کام نکلتا ہے وہاں چپراسی سو میں نکال دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے نکال لیا۔ ایک صاحب اور تھے جو ہینگ لگے نہ پھٹکری کے نسخہ پر کاربند تھے۔ زبانی خوشامد کئے جا رہے تھے۔ بلکہ ہتھیلی میں جنّت دیکھا رہے تھے۔ لیکن صاحب ماننا ہی پڑتا ہے چپراسی بھی چھوٹا موٹا سیاست داں ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ کاروباری نقطہ نظر سے جیب شناس بھی ہوتا ہے۔ باتوں کی چال میں آنے والا نہیں اس نے دیکھا کہ آدمی پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑا ہے۔ لازماً چپراسی کا مزاج بگڑ گیا۔ بڑی ہی طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تو پھر صاحب آپکا کام بھی کل ہی ہو جائے گا۔ آپ کل تشریف لائیے لیکن غریب کا خیال رہے۔ وہ صاحب جھانسے میں آگئے خوش خوش چلے گئے۔ اس کا ردعمل یوں ہوا کہ چپراسی نے ان کی فائیل سب فائیلوں کے نیچے رکھ دی خس کم جہاں پاک۔

ساس بہو کا مزاج ایسا ہے جیسے دو سپاہی اپنے اپنے مورچوں پر۔ میاں بیوی کا مزاج گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ یا پھر کبھی ڈھال کبھی تلوار۔ مہمان کا مزاج ہم پر جب چاہے مہربان ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ اب سُنیئے درزی کا مزاج۔ بش شرٹ کی آستین کسی دوسرے کپڑے کی لگا دی پوچھا گیا تو کہا۔ صاحب عید کا گراک زیادہ تھا جلدی میں غلطی ہوگئی آپ پہن لیجئے بعد عید کے درست کر دوں گا۔ غریب کی بیلی خطا معاف اس نے کچھ اس انکساری سے کہا کہ دل بجائے کھولنے کے پسیج گیا۔ اور ہم اپنا بگڑا ہوا بش شرٹ اور لٹکا ہوا منہ لے کر گھر پہنچے حجام ماموں کا مزاج بگڑا تو انھوں نے ہماری خواہش کے مطابق اسٹائیل بنانے کے بجائے ہیں ہپی بنا دیا۔ شکر ہے کہ ہپی اسٹائیل میں بال کچھ زیادہ ہی تھے مجبوراً ہمیں

دوسرے سیلون جانا پڑا۔

سُنا ہے جب بھی کوئی چور یا ڈاکو کسی طرف نگاہ اٹھاتا ہے یا قدم رنجہ ہوتا ہے تو مطلب صاف ہے کہ گھر صاف ۔ لیکن ایسا بھی سُننے میں آیا ہے کہ چور صاحب کا مزاج بدلے تو وہ اہل مکان پر مہربان بھی ہو جاتے ہیں۔ یعنی کچھ لے کر جانے کے بجائے کبھی کبھی کچھ دے کر بھی جاتے ہیں ۔ حسرت ہی رہی کہ ایسے چور ہمارے گھر بھی آئیں ۔ دھوبی نے کپڑے جلا لائے ۔ ہم چراغ پا ہو گئے اُس نے بڑے ہی مودبانہ انداز میں کہا صاحب خفا ہو یئے اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ ذرا استری کا مزاج بگڑ گیا تھا۔ سو یہ گڑبڑ ہو گئی۔

سُنا نہیں بلکہ دیکھا بھی ہے داماد وں کے مزاج بھی نرالے ہوتے ہیں۔ شاعر نے شاید ایسے ہی موقع کے لیئے شعر کہا ہوگا۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

ان کی لاکھ خوبیوں سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن بے عیب خدا کی ذات تو پھر اُن میں یہ عیب موجود ہے کہ یہ بیچارے ہر وقت 'ٹیپ' لئے سسرال والوں کی عزت ، رتبہ اور سلوک ناپتے رہتے ہیں۔ ہم نے لاکھ سمجھایا میاں تمہیں سسرال والوں سے خدا واسطے کا بیر کیوں ہے ؟ تو اُنہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ تمہیں سے محبت تمہیں سے لڑائی'۔ گلا اپنوں ہی سے ہوتا ہے پرائے سے نہیں ۔ بس ڈرائیور کا مزاج ۔۔ جب دیکھ لے گا کہ بس اسٹانڈ پر ہجوم زیادہ ہے بس نہیں روکے گا۔ اور بس نہ روکنے کا جواز ہے گاڑی میں اسٹانڈینگ پاسنجر زیادہ ہیں۔ اس کے برخلاف ڈرائیور کا دوست راستہ پر کہیں بھی نظر آئے گا تو بس روک دی جائے گی۔ اسٹیج کا ہونا کوئی ضروری نہیں ۔

ہم تو کہنا ہی بھول گئے تھے ۔ ایک شخص ایسا ہے جس کے دو مزاج ہوتے ہیں سرکاری دواخانے پر اس کی درشت مزاجی اور چڑ چڑے پن کو ہمیں سہنا ہی پڑتا ہے اس لئے کہ ہماری جیب ذرا کمزور ہے ۔ اسی نامور شخص سے آپ اگر پرائیوٹ کلینک پر ملیں گے تو جناب اس کے شیریں بیان کی لطافت اور بے حد ہمدردی و خلوص کا اتنا اثر پڑے گا کہ آپ کو تشخیص کی فیس بھی گراں نہ گذرے گی ۔ اور انشاء اللہ مرض میں بھی آدھا افاقہ محسوس ہوگا ۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ایک ہی آدمی کے دو مزاج کیوں کر ہو سکتے ہیں ۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ پہلے کسی ڈاکٹر سے سرکاری دواخانے میں پھر اس کے خانگی کلینک میں مل کر دیکھ لیجئے۔

□ □

مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور (بہار)

"یوسف ناظم کی خاکہ نگاری"

خاکہ کئی چھوٹی چھوٹی کیفیات سے مرتب زندگی کا رنگا رنگ اور کردار کا پہلو دار نقش ہوتا ہے۔ اسی نوعیت سے اپنے اسلوب میں خاکہ بہت حد تک انشائیہ کے قریب ہے۔ جس طرح انشائیہ مصنف کے ذہن کی ترنگ اور اس کے تخیل کے بے روک بہاؤ سے اپنا کیف و جمال حاصل کرتا ہے اسی طرح خاکہ ایک خاص کردار میں مصنف کی شخصی دلچسپی اور شخصی تاثرات کا بے تعلقانہ اظہار ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے خاکہ میں کبھی مزاح کے چھینٹے بھی مل سکتے ہیں، کبھی اس میں توصیف کی جھلک بھی مل سکتی ہے، کبھی تعجب کا احساس بھی داخل ہو سکتا ہے اور کبھی رحم و ہمدردی کے جذبات کی آمیزش بھی ہو سکتی ہے۔ گویا شخصیت کی بھرپور عکاسی خاکہ نگاری کے لئے ضروری ہے۔ اس بھرپور عکاسی میں کردار اور فنکار دونوں کی جھلک ہونی چاہیئے۔ یعنی جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہو اس کی صورت، سیرت، مزاج، ذہن کی افتاد، زاویۂ فکر، خوبیاں اور خامیاں سبھی کچھ نظروں کے سامنے آجائیں۔ خاکہ نگاری اس لئے بے حد نازک صنف ہے کہ یہ سوانح نگاری سے الگ چیز ہے۔ سوانح عمری میں پیدائش سے موت تک زندگی کے تمام اہم واقعات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جن سے شخصیت بنتی ہے۔ لیکن خاکہ نگاری میں شخصیت کے ان پہلوؤں کو چھونا ہوتا ہے جن سے کسی کی جیتی جاگتی شبیہہ سامنے آجاتی ہے۔ واقعات کو بھرپور طور پر یا نامکمل طور پر بیان کرنے یا رد کرنے کا اختیار خاکہ نگار کو ہوتا ہے۔ بقول سید ضمیر حسن آدمی کے لئے آدمی کی پرکھ کا کام آسان نہیں ہے۔ وہ جتنا باہر سے دیکھا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ اندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اسی چھپی ہوئی تہہ در تہہ شخصیت کو سمجھنے کے لئے ظاہری نگاہ سے کہیں زیادہ دروں بینی، بصیرت اور انسانی نفسیات کے فہم و ادراک کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کا ذکر اس کی نقالی یا اس پر تنقید اس کی فطرت ہے۔ خاکہ نگاری ادب کی ایسی صنف ہے جس میں شخصیت کی تصویریں اس طرح براہ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن میں

نقش ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے صرف قلمی چہرہ ہی نہ دیکھا ہو بلکہ خود اس شخصیت کو دیکھ بھالا اور سمجھا بوجھا ہے۔

آدمی خواہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو فرشتہ بہرحال نہیں ہو سکتا۔ خاکہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ اس کی نظر اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں پر بھی ہو جو ان کو فرشتہ ہونے سے بچاتی ہیں۔ خاکہ نگار خواہ کسی شخص کی اچھائی کرے یا برائی وہ خوبیاں گنائے یا خامیاں، اس کا رویہ ہمدردانہ ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ خاکہ نگار کا لب ولہجہ شخصیت کے مطابق ہو، اگر کسی سنجیدہ اور متین شخصیت کا خاکہ لکھنا ہو تو لب ولہجہ میں سنجیدگی اور متانت ہو، اگر کسی مزاحیہ کردار کا خاکہ ہے تو اسی قسم کی زبان کا استعمال ضروری ہوگا۔ خاکہ نگار کو شخصیت کے بیان میں غیر جانبدار رہنا چاہیئے اور جہاں تک ہو سکے وہ اس شخصی تحریر کو معروضی بنانے کی کوشش کرے۔

خاکوں کی ابتداء عام طور پر دوسری صدی قبل مسیح میں بتائی جاتی ہے جبکہ یونانی مصنف تھیوفریسٹس نے ارسطو کی کتاب "اخلاقیات" کے زیر اثر تیس مختلف قسم کی ذہنی کمزوریوں کو مختلف کرداروں کے ذریعہ ظاہر کیا۔ قرون وسطیٰ میں سبع قبائح کا تصور عام رہا اور اس کی جھلک اس زمانہ کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس پر مبنی کردار نگاری کی ابتداء سولھویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ سترہویں صدی میں کرداری خاکے عام ہو گئے اور جوزف ہال، تھامس اوربری اور جان اول نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا۔ اٹھارویں صدی میں جب صحافتی ادب نے اپنا سکہ جمانا شروع کیا تو ایڈیسن اور اسٹیل نے بھی اس رنگ میں لکھنا شروع کیا لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر تک انگلستان میں ناول نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی اور ناول نگاری نے خاکہ نگاری کے رواج کو بہت حد تک کم کر دیا۔ پھر بھی قابل قدر اضافے ہوتے رہے ہیں۔

اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے۔ قدرت اللہ قاسم کے "مجموعۂ نغز" سعادت خاں ناصر کے "تذکرۂ خوش معرکہ زیبا" اور محمد حسین آزاد کی "آب حیات" میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے مل سکتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشا کی کتاب "دریائے لطافت" میں بھی چند شاعروں کے خاکے ملتے ہیں۔ لیکن ان سب میں "آب حیات" سب سے اہم کتاب ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز میں سوانح نگاری کی ابتداء کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری کا رواج باضابطہ طور پر ہوا۔ فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عبدالرزاق کانپوری، عبدالحق، آغا حیدر حسن دہلوی، راشد الخیری، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، وغیرہ نے اچھے خاکے لکھے۔ ان اہم ناموں کے بعد جن خاکہ نگاروں نے نت نئے تجربے کئے اور اس صنف کو اپنی تحریر سے مالا مال کیا ان میں محمد طفیل، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، جگن ناتھ آزاد، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم وغیرہ بیحد اہم ہیں۔

یوسف ناظم اردو طنز و مزاح میں ایک بڑا نام ہے۔ لیکن خاکہ نگاری کی حیثیت سے بھی یوسف ناظم اردو ادب میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اس فن کو اس دلچسپی، بے ساختگی، بے تکلفی، دیانتداری اور خوش مذاقی

کے ساتھ اپنایا ہے کہ اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری (PROTO TYPE SKETCHES) کے فن، اور خاکے میں کن امور کو اہمیت دینی چاہیئے اس کے متعلق انتخار امام صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں یوسف ناظم فرماتے ہیں کہ "خاکہ نگاری اس لئے مشکل فن ہے کہ خاکہ جس کا لکھا جائے اس کا انتخاب پہلے مشکل ہوتا ہے، پھر اس کی بردباری اور فراخ دلی دونوں ضروری چیزیں ہیں۔ اچھے خاکے تو خیر میں نے لکھے نہیں، پڑھے بھی نہیں ہیں لیکن سوائے دو چار اچھے خاکوں کے جیسے فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ہے "نذیر احمد" پر یا عصمت چغتائی نے "دوزخی" لکھا ہے جو کلاسک کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی اچھا خاکہ نہیں نہیں ملتا۔"

ایک اور سوال ہے کہ "خاکے کی مختلف اقسام ہیں جسے کوئی بھی اپنے لئے منتخب کر سکتا ہے لیکن خاکہ نگاری میں مزاح کے جو عناصر ہوتے ہیں وہی خاکے کی روح ہوتے ہیں جو ایک مزاح نگار ہی کے بس کی بات ہے۔"

اس کا جواب دیتے ہوئے یوسف ناظم کہتے ہیں "بہت مشکل چیز ہے خاکہ، کیوں کہ اس میں سُبکی کا پہلو نکلتا ہے۔ ذم کا پہلو نکلتا ہے اور یہ پہلو عام طور سے مضمون میں آتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہیئے جب تک کہ صاحب خاکہ اجازت نہ دے یا پھر وہ بہت ہی فراخ دل ہو ــــ میں صرف ایک جملہ ابن انشا کے ایک خاکے کا سُناتا ہوں جو اُنہوں نے ایک بہت بڑے شخص کے لئے لکھا ہے: "وہ بہت نفاست پسند تھے، وہ دن میں دو مرتبہ کپڑے اور اپنا قول بدلا کرتے تھے"، اس جملے میں کچھ ہے نہیں، ہو سکتا ہے کہ عام آدمی کے سر سے یہ جملہ گزر جائے مگر دن میں دو بار اپنے قول بدلا کرتے تھے، کتنا معنی خیز ہے۔"

ایسی ہی معنی خیزی اور ایسی ہی مشکل پسندی یوسف ناظم کی خاکہ نگاری میں ہے۔ وہ حسین تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحات سے کام لے کر شخصیات کے داخلی پرت اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر ایک کشف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں یہ دو اقتباس دیکھئے:

" اچھا لکھنا اور لکھ کر چوٹی کا ادیب بن جانا، شاید مشکل بات نہ ہو، لیکن عملاً اور پیدائشی طور پر چوٹی کا ادیب ہونا صرف اُسی وقت ممکن ہے جب قدرت اس کا منصوبہ بنائے۔" (ہوئے تم دوست جس کے)

"بیدی کو کہانی لکھنے کا ملکہ ہی نہیں بلکہ ملکۂ معظمہ بھی ہے۔ ان کے تیز و تند قلم سے جو بھی کہانی نکلتی ہے۔ بحث اور توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ پنجاب کا یہ البیلا کہانی نگار اپنے طرۂ پیچ و خم کا ــــ پیچ و خم نکل جانے پر بھی دراز قامت ہی رہے گا۔" (دبلی کا ادبی جغرافیہ)

بیدی پر ہی ایک اور اقتباس دیکھئے:

"لڑکپن کے ہم ساز راجندر سنگھ بیدی آگے چل کر دوستوں کے دم ساز تو بنے لیکن زمانہ ساز نہ بن سکے۔ یہ فن انھیں نہیں آیا۔ وہ بس دوستوں پہ جان اور محفلوں پہ پان چھڑکتے رہے۔ جب وہ بے تحاشا پان کھاتے تھے تو نہ رستم کی پرواہ کرتے تھے نہ سکندر کی۔ ان کے اپنے مہرے تو پھر ان کے اپنے ہی کپڑے تھے لیکن دوسروں

کے کپڑوں سے بھی اُنہوں نے غیریت نہیں برتی۔ ان کا مخاطب ہمیشہ لہولہان ہوجاتا تھا۔" (پورا آدمی، ادھورا خاکہ)

ترقی پسند شاعروں میں جاں نثار اختر کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کی رباعیوں کے مجموعہ "گھر آنگن" میں خالص ہندوستانی شاعری ہے۔ سیدھی سادی عورت کے عکس سے اُنہوں نے اپنی شاعری کی رنگ آمیزی کی ہے۔ اس مجموعہ کے موضوعات کی روشنی میں یوسف ناظم کی یہ تنقید قابل داد ہے:

شاعروں کے تو بیسیوں مجموعے آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے لیکن "گھر آنگن" صرف شاعر ہی کا نہیں، شوہر کا بھی مجموعہ کلام ہے۔ "گھر آنگن" میں شوہریت، شعریت، شیرینی، شوخی اور شرافت سبھی کچھ ہے۔" (شاعر، شوہر اور شخص)۔

اردو افسانے اور ناول کی دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ادیب کرشن چندر تھے، کرشن چندر کی بعض عادتوں اور خوبیوں کے بارے میں یوسف ناظم رقمطراز ہیں:

" اچھے کاغذ پر لکھنا ان کی پُرانی عادت تھی۔ اب تو اتنا نفیس کاغذ کہیں نظر بھی نہیں آتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن جی نے کتنا لکھا ہے۔ کرشن جی لکھنے کو قلم سے لکھتے تھے لیکن وہ قلم نہیں تھا۔ طنز کی تلوار تھی۔ طنز کے معاملے میں وہ بُت طناز تھے۔ مروت کے آدمی تھے اور انہیں آسانی سے پھسلایا جاسکتا تھا۔" (کرشن کتھا)

" کرشن جی ہمارے پہلے ادیب ہیں جو اپنی ڈگری کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے تھے اور برسوں کرشن چندر ایم اے کے نام سے لکھتے اور چھپتے رہے۔ پھر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ وہ صرف کرشن چندر لکھنے پر راضی ہوگئے ــ اور کئی دن تک لوگ پوچھتے رہے کہ کیا یہ وہی کرشن چندر ہیں جو پہلے ایم اے تھے۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ چوں کہ وہ اردو کے ادیب تھے، اس لئے انہیں اپنی انگریزی کی ڈگری استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ بیسویں صدی کے ادیبوں کا حساب رکھا جائے تو کرشن چندر جی نے ان ادیبوں میں سب سے زیادہ لکھا۔ کوئی ستر کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ لیکن کرشن جی کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات نہیں، اُردو زبان سے بے پناہ محبت ان کا کارنامہ ہے۔" (کرشن کتھا)

خوش فکر اور خوش گلو شاعر سکندر علی وجد کی خاکہ نگاری کے سلسلے میں ان کی شخصیت اور شاعری کا یہ پہلو دیکھئے:

" وجد صاحب ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ۲ سال کے اندر ہی جنگ عظیم چھڑ گئی ــ ان کا ترنم دوسروں کو خاموش کر دیتا تھا۔ بالکل ساکت۔ اور لوگ ان سے ایلورا، اجنتا اور تاج محل سنا کرتے تھے۔ یہ بات تو لوگوں کو وجد صاحب کی وجہ سے معلوم ہوئی کہ ایلورا، اجنتا، اور تاج محل دیکھنے کی نہیں، سُننے کی چیزیں ہیں۔ رقاصہ کو بھی اُنہوں نے (کسی مصلحت کی بناء پر) سُننے کی چیز بنا دیا تھا۔ رقاصہ کو اس سے پہلے کسی نے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے سراپا کے موضوع پر کئی بے سرو پا نظمیں موجود ہیں ــ وجد صاحب کے بارے میں بھی سمجھی

جانتے ہیں کہ یہ بے حد خوش خط ہیں اور زمانۂ طالب علمی میں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے جعلی خط لکھ کر لوگوں کی ملازمت کی سفارش کیا کرتے تھے اور مولوی صاحب کو صرف اس وقت پتا چلتا تھا جب وہ غرض مند شخص اپنا کام ہو جانے پر ان کا شکریہ ادا کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ (کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں)

ممتاز ترقی پسند غزل گو مجروح سلطان پوری کے خاکے سے یوسف ناظم کی یہ نکتہ رسی ملاحظہ فرمائیے:

"ستمبر ۱۹۷۰ء سے دسمبر ۱۹۸۲ء تک کے حساب کو آپ کیا کریں گے۔ یہ پورے سوا بارہ سال ہوتے ہیں (گرم ممالک میں تو یہ سن بلوغ کی عمر ہے) اتنی لمبی مدت میں بھی اپنے کلام کا کوئی دوسرا مجموعہ پیدا نہ کرنا ہندوستان اور پاکستان کے جملہ شاعروں میں سے اگر کسی سے ممکن ہے تو وہ صرف مجروح سلطان پوری ہیں۔ انہیں غزل کہنے پر جتنا عبور حاصل ہے اتنا ہی قابو انہیں غزل نہ کہنے پر بھی ہے۔ اللہ کی دین ہے۔ مجروح سلطان پوری اصل میں غزل کو بہت مقدس چیز مانتے ہیں اور اسے بس کبھی کبھار ہی چھوتے ہیں۔ ان کی غزل، غزل کہاں ہوتی ہے سالانہ بیلنس شیٹ ہوتی ہے یا "نقوش" کے خاص نمبر کی طرح کی طویل وقفوں کی کوئی چیز۔ اگر وہ اپنی غزل کو ماہ نامہ نہ سہی سہ ماہی کی بھی شکل دے سکتے تو ان ۱۲ سالوں میں ان کا نصف سینکڑہ (جس کے لئے کرکٹ کھلاڑی جان کی بازی لگا دیتے ہیں) ضرور مکمل ہو جاتا لیکن یہ ریاضی انہیں کون سمجھائے"۔ (ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی)

محقق، ناقد، تبصرہ نگار، مترجم، سوانح نگار، لغت نویس، صحافی اور خطیب ظ انصاری کے خاکے سے یوسف ناظم کا انداز نگارش دیکھیں!

"لذت تقریر اور قوت تحریر کی یکجائی کی بدولت وہ دو آتشہ بن گئے ہیں۔ اس پر ان کا مزاج ۔ وہ ہمیشہ آتش زیر پا رہے ہیں، تقریری حادثوں نے تقریر کا اتنا خوگر بنا دیا ہے کہ وہ کہیں بھی بیٹھیں، یہ سمجھتے ہیں ڈائس پر بیٹھے ہیں۔ جس طرح غالب خلوت کو انجمن سمجھتے تھے، غالب شناس ظ انصاری بھی دو آدمیوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے کو مجمع سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر کے لئے تیسرے آدمی کا انتظار نہیں کرتے"۔ (وہ اپنا خدا سر سے ہیں تا ناخن پا گرم) مزاح نگار کا کام ہنسانا نہیں ہوتا۔ اچھا مزاح نگار ایک ماحول پیدا کرتا ہے شگفتگی کا، فضا پیدا کرتا ہے خوش دلی کی اور موتی بکھیرتا ہے لطف و انبساط کے۔ ابن انشا کے مزاح میں بھی یہ سب کچھ ملتا ہے۔ یوسف ناظم ان کے خاکے میں یہ نکتہ پیش کرتے ہیں "اردو میں ایک عام رسم یہ ہے کہ جب تک کسی ادیب اور شاعر کا کسی انگریزی یا روسی ادیب اور شاعر سے موازنہ نہ کیا جائے، دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں، میں "مدر انڈیا" کے ایڈیٹر بابو راؤ پٹیل کا قائل ہوں۔ وہ بڑی سے بڑی انگریزی ایکٹریس کا بھارتیہ کرن کرنے میں تکلف نہیں کرتے، گریٹا گاربو کو وہ شاید انگلش اسکرین کی کامنی کوشل کہا کرتے تھے۔ اگر میں بھی یہی معاندانہ رویہ اختیار کروں تو، وڈ ہاؤس، انگریزی زبان کے ابن انشا ہیں اور سیر و سیاحت کے لحاظ سے مارک ٹوین بھی ابن انشا ہی کہلائیں گے"۔ (بیسویں صدی کے انشا) ۔ کئی درجن خاکوں کے مصنف یوسف ناظم کے خاکوں کو پڑھ کر جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، چلتی پھرتی تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ جاتی ہے۔ انکے خاکے میں سادہ نثر اور سادگیٔ بیان کا اعجاز بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شگفتگی اور بذلہ سنجی ان کے خاکے کی ایک الگ انفرادیت ہے۔

□□

آندھرا پردیش میں مزدوروں کی فلاح و بہبود



ریاستی حکومت چیف منسٹر شری این۔ ٹی۔ راما راؤ کی رہنمائی میں مزدوروں سے متعلق کئی ایک فلاحی پروگرام زائد از ایک سال کے عرصہ میں کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لاچکی ہے۔ آندھرا پردیش آج پُرامن صنعتی فضاء سے ہمکنار ہے جو صحت مند اقتصادی فروغ اور پیداوار کے لئے سازگار ہے۔

○ ۱۶ مختلف علاقوں میں اقل ترین اُجرتوں سے متعلق قانون کے تحت آنے والے غیر منظم مزدوروں کی اُجرتوں کی سطح میں ۱۸۰ روپیے سے ۳۰۰ روپے فی ماہ اضافہ کردیا گیا ہے۔

○ جوٹ کی صنعت میں صنعتی مزدوروں کے لئے ۱۵۰ روپے کا اضافہ کیا گیا ہے اور اڈہاک بنیاد پر جوٹ انڈسٹری ورکرس کی اُجرت میں ۱½ فیصد الاؤنس کرایہ مکان بھی دیا جارہا ہے۔

○ رعایتی انڈسٹریل اسکیم کے تحت تعمیر کردہ ۵۴۱ مکانات آسان اقساط پر مکینوں کے حوالے کئے گئے ہیں۔

○ زرعی مزدوروں کی تعلیم و رہنمائی اور اُن کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ۴۰ بلاک علاقوں میں رورل آرگنائزرس کا تقرر عمل میں لایا جارہا ہے۔

○ کوئی ۸۵ لاکھ زرعی مزدوروں کے لئے ویلفیر فنڈ، میٹرنٹی اور اولڈ ایج بینفیٹس کو یقینی بنانے کے لئے زرعی مزدوروں سے متعلق مسودہ قانون زیر غور ہے۔

○ اقل ترین اُجرتوں سے متعلق قانون کے تحت برسرکار مزید ۳۰۰۰۰ غیر منظم مزدوروں پر مشتمل ایک زبردست جمعیت لائی گئی ہے۔

○ دوکانات و ادارہ جات سے متعلق قانون کے تحت حاصل ہونے والے فوائد کو ۹۱ نئے شعبوں کے ملازمین تک وسعت دی گئی ہے اب اس قانون سے کوئی ۶۵ء ۲ لاکھ ملازمین مستفید ہورہے ہیں۔

○ ۶۸۵ صنعتی تنازعات کی ریاستی مصالحتی مشنری کے توسط سے یکسوئی کی جاچکی ہے اور ۳۶۳ تنازعات تصفیہ کے لئے صنعتی عدالتوں سے رجوع کئے گئے ہیں۔

"حکومت جو مزدوروں کی فلاح و بہبود کے مقصد کی تکمیل کے لئے خود کو پابند بنا چکی ہے۔"

(محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش)

DIPR LR NO 12045 / ADVT II / C4 / 84 DT. 3-5-84

بال گا ہنگل
مترجم: محمد اسد اللہ (وروڈ)

سمندر ملنا ہی چاہیئے

(مراٹھی سے ترجمہ)

یہ قصہ ہے ملک عقل آباد کا جس کے متعلق دوسری حکومتوں کا خیال تھا کہ اس ملک میں ملک کے نام کے علاوہ عقل نام کی کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

مگر صورتِ حال اس کے برعکس تھی یعنی اس ملک کا ہر باشندہ گویا عقل مندی کا قطب مینار تھا اس ملک کے مشہور سربراہ "عقلمند" کو تو گویا عقل مالِ مفت میں ہاتھ لگی تھی بلکہ یوں کہیئے کہ وہ عقل کی ایک بہت بڑی خندق تھی۔ زرخیز کھوپڑیوں کے اس ملک میں ذہانت کی فصل اس قدر ہوتی کہ سرکاری خزانہ کا اصل مدنی فقط عقل مندی کے EXPORT سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ تھا۔ چونکہ ملک میں مذکورہ پیداوار کا استعمال عام نہ تھا لہٰذا یہ زیادہ تر غیر ممالک ہی کو سپلائی کی جاتی تھی۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس قدر عقل مند لوگ بڑے خوشحال ہوتے مگر ایسا بالکل نہ تھا۔ خدا خوش نصیبی (قسمت) میں بھی کچھ نہ کچھ GAP چھوڑ دیتا ہے۔ یہی حال عقل آباد والوں کا ہوا۔ ملک میں ہر طرح کا عیش و آرام تھا کمی تھی تو فقط ایک چیز کی یعنی عقل آباد میں کہیں بھی سمندر نہ تھا۔ ان کے لئے یہ ایک بڑی محرومی تھی۔ ہر شہری کو یہ ایک کمی محسوس ہوا کرتا۔

ویسے عقل آباد کے عوام کو سمندر کی کمی محسوس ہو سکے اتنی عقل ان کی کھوپڑیوں میں شروع ہی سے نہیں رہی، یہ احساس انہیں اس وقت ہوا جب عقل مندجی نے انہیں اس عظیم محرومی کا احساس دلایا۔ الکشن کے مینی فیسٹو میں بھرتی کرنے کے لئے جب وہ ایک شاندار قسم کا جملہ تلاش کر رہے تھے یہ نادر خیال اچانک ان کے ذہن رسا میں آیا بس اس خیال کا آنا تھا کہ اُنہوں نے دوسرے تمام نعرے یک قلم مسترد کر دیئے اور "سمندر ملنا ہی چاہیئے" کا نعرہ چن لیا۔ اور الکشن کے وقت ووٹرس کے حلقہ میں وہ بڑے طمطراق سے یوں گویا ہوئے

دوستو! اپنے وطن عقل آباد میں ایک کمی ہمیشہ میرے دل کو بے قرار کئے رہتی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ملک کو آزاد ہوئے اتنے برس ہو چکے ہمارے پاس ابھی تک ایک سمندر تک نہیں۔ دوستو! ذرا غور کرو اِتنے برس کی پلاننگ کے بعد ہمیں سمندر جیسی حقیر چیز تک نہ مل سکی کیا یہ ہمارے لئے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ (اس پر مجمع سے "شیم شیم" کی صدائیں بلند ہوئیں)۔

بھائیو اور بہنو! آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے سمندر نہ ہونے سے ہمارے یہاں سمندر کا کنارہ بھی نہیں، کشتی چلانے کا پیشہ نہیں، کشتیاں بنانے کے کارخانے نہیں۔ ماہی گیری نہیں، ماہی گیروں کی آبادی نہیں، ہمارے یہاں بندرگاہیں بھی نہیں ہیں، ہمارا اپنا غیر ملکی بیوپار نہیں* ہماری عقلوں کے پارسل بیرونی ممالک بھجوانے کے لئے ہمیں دوسروں کی بندرگاہیں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ جب تک ہماری اپنی بندرگاہیں موجود نہ ہوں ہم اس معاملہ میں خود کفیل کبھی نہیں ہو سکتے۔ خود کفیل بننا ہو تو ہمیں سمندر حاصل کرنا ہی ہوگا۔ اگر یہ نہ ملے تو اس کے لئے جدو جہد کرنا ہوگی۔ (ہیئر۔ ہیئر۔ صاحبِ عقل سامعین نے پکارا)

دوستو! ہمارا ذاتی سمندر نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے یہاں نمک کے کارخانے تک نہیں ہیں۔ نمک جیسی معمولی چیز کے لئے ہمیں دوسروں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں ہم دوسروں کا نمک کھا کر کب تک زندہ رہیں گے۔ (نہیں نہیں آوازیں) وطنِ عزیز عقل آباد سے بے وفائی کی حد تک ہم نمک حرام ہو چکے ہیں۔ (نہیں نہیں کبھی نہیں کے نعروں سے آسمان گونج اُٹھا)

معزز خواتین و حضرات! میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ دھوکے باز اور تنقید کرنے والے کوڑھ مغز مخالفین سے ہوشیار رہیں وہ آپ کو یہ باور کرائیں گے کہ ہماری مانگیں ناممکن اور بیوقوفی کی ہیں مگر میں آپ سے کہتا ہوں ہم جیسے عقل مندوں کے لئے دنیا میں کون سی چیز ناممکن ہے۔ (کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں۔ آوازیں) ہم سب مل کر اگر کوشش کریں تو کھارے پانی کا سمندر ملنا کیا مشکل ہے۔ ضرورت پڑے تو ہم سمندر کے لئے ستیہ گرہ بھی کریں گے۔ (کریں گے، کریں گے — آوازیں)

دوستو! میں آپ کے سامنے علانیہ عہد کرتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے منتخب کیا تو میں تن من دھن سے کوشش کروں گا کہ عقل آباد کو سمندر دلاؤں۔ عقل آباد زندہ باد۔

عقل مندوں کی یہ سبھا عقل مند جی زندہ باد، عقلمند سلامت رہیں، ووٹ فار عقلمند، ہم کو سمندر ملنا ہی چاہیئے سمندری انقلاب زندہ باد کے نعروں میں ڈوب گئی۔

اسی دوران انتخابات منعقد ہوئے اور عقلمند جی اکثریتی ووٹوں سے چن لئے گئے، ان کے مخالفین کے ڈپازٹ ضبط ہو گئے عقل مند جی کی سمندری پارٹی کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی اور سمندر پارٹی

بر اقتدار آگئی اس نے عقل مندجی کو اپنا لیڈر چنا اور یوں وہ عقل آباد کے مکھیہ منتری بن گئے۔
کرسی پر بیٹھتے ہی عقل مندجی نے ایک سمندر سمیتی بنائی عقل آباد میں سمندر کی درآمد سے متعلق کیا کیا جا سکتا ہے اسکے متعلق اس سمیتی کو اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ موثر اقدامات کئے گئے۔ سمیتی کو اس م کے سلسلے میں غیر ملکی ماہرین سے مشورہ کرنے کی اجازت دی گئی۔

سمیتی کے تقرر کا اعلان شام ۵ بجے ہوا اور اس کے ممبران سکریٹری وغیرہ کی جماعت ۔۔ ۱۱ بجے اسپیشل ائیٹ سے یورپ کے راستے امریکہ روانہ ہوگئی۔ اس کمیٹی کا مقصد جگہ جگہ سمندروں کا بذاتِ خود مشاہدہ کے ماہرین کی مدد سے ان کا گہرا مطالعہ کرنا تھا۔ سمندر سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کے لئے سمندری ازوں سے بھی سفر کیا گیا سمیتی کے سکریٹری اس قدر مستعد اور جوشیلے تھے کہ کئی میل تک خود انہوں نے تیر کر اور کئی اراکین نے آبدوزوں کے ذریعہ سفر کیا۔ یوں تو آٹھ ممبروں نے سمندر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ دو ایک نے فقط فلموں میں دیکھا تھا۔ پہلی بار سمندر پر نظر پڑتے ہی ان کے منہ سے مارے حیرت کے پ رے باپ" ! نکل گیا۔ جاپان میں جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں زمین سے زیادہ سمندر ہے تو جاپانی رپورٹر ڈل انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۔۔۔ تمہاری خوش نصیبی پر ہمیں واقعی رشک آرہا ہے۔

سمیتی نے نتائج نکال کر جو سفارش پیش کی وہ بذاتِ خود بہت دلچسپ ہے اسے مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

ہمارے مشاہدے میں یہ آیا کہ دنیا کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور صرف ایک چوتھائی حصّہ زمین ہے۔ لیکن اس کے باوجود عقل آباد کے لئے کوئی سمندر نہیں اس ملک کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ ہمیں انتہائی افسوس اور بے بسی سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے سمندر نہ ہونے کی وجہ سے واقعی ہمیں بہت نقصانات اُٹھانے پڑ رہے ہیں یہ بات ہماری رپورٹ کی دوسری جلد سے ہر کس و ناکس کے سمجھ میں آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کو بدلنا ہی ہوگا۔

غیر ملکی سمندری ماہرین سے مشورہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عقل آباد میں نیا سمندر پیدا کیا جائے۔ جس سمندر نے دنیا کا بڑا حصّہ اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے ایمان اور انصاف کے ساتھ اس کی دوبارہ تقسیم کی جائے۔ تب یہ سوال حل ہو سکتا ہے۔ دنیا کے دو بڑے سمندروں پیسفک اور اٹلانٹک کا کچھ حصّہ عقل آباد کو ملنا چاہیئے اس سلسلے میں ہم نے امریکی حکومت سے گفت و شنید کی ہے اور ہمیں سرکاری حلقوں کے علاوہ رائے عامہ بھی ہمارے حق میں نظر آئی۔

... اور اس سلسلے میں ایک خاص بات۔ انتہائی مسرت بخش ہے کہ ہمیں اس سمندر کے لئے غیر ملکی زرمبادلہ کی بھی ضرورت نہیں کیوں کہ ہمیں حسبِ ضرورت سمندر مفت ملنے کی قوی اُمید ہے۔

.... لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ سمندر یہاں کس طرح لایا جائے اور یہاں آجائے تو اُسے رکھا کہاں جائے یہ دو بڑے سوالات ہیں۔ اور چونکہ یہ ہمارے بس کے نہیں ہیں لہٰذا اس پر اظہار خیال کرنا سمیتی کے ممبران کے لئے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے لئے ہمارا خیال ہے کہ ایک علیحدہ سمیتی مقرر کی جائے۔

ہمارے عقل آباد میں عام طور پر کسی سمیتی کی سفارشات پر عمل نہیں ہوتا مگر سمندر کے متعلق عوامی بیداری کو دیکھتے ہوئے دو سمیتیاں فوراً بنا دی گئیں۔ کمیٹی کی سفارشات پر اتنی جلد عمل ہوتے دیکھ کر کچھ رپورٹروں نے حیرت کا اظہار کیا۔ اور بعض نے برسوں سے چلی آرہی روایت توڑنے پر اظہارِ افسوس بھی کیا۔ دوسری سفارشوں پر سرکار کا موقف کچھ بھی رہا ہو مگر نئی سمیتی بنانے کی سفارش پر حکومت نے کبھی اختلاف نہیں کیا اور صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ آئندہ بھی کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں کیا جائے گا۔

حاصل کلام یہ کہ دو کمیٹیوں کے تقرر کے بعد عقل آباد میں سمندر کس طرح لایا جائے اس سے متعلق تحقیقات کے لئے ایک سمیتی اپنے جملہ سازو سامان کے ساتھ نیویارک کو روانہ ہوگئی دوسری لندن کو بس ابھی روانہ ہونے ہی والی تھی۔ باہر سے لایا ہوا سمندر عقل آباد میں کہیں نہ کہیں تو رکھنا ہی تھا لہٰذا اس کے لئے پہلے پورے ملک کا سروے کرنے کے بعد جگہ کا تعین بھی کرنا تھا لہٰذا یہ مشورہ دیا گیا کہ اس کام کے بعد دوسری سمیتی باہر جائے۔ اس پر سمیتی استعفیٰ دینے والی ہی تھی کہ بڑی منت سماجت سے حکومت نے ممبران کو استعفیٰ دینے سے روکا اور انہیں کام کرنے پر راضی کرلیا۔

سنا ہے سمندر کو IMPORT کرنے والی سمیتی آج تک عقل آباد واپس نہیں لوٹی فی الحال ہوائی جزیرے میں کمیٹی کے ممبران آرام کر رہے ہیں۔ تازہ خبر کے مطابق سمیتی کے سامنے کھڑے اس عظیم مسئلہ کا حل نکلنے تک ہوائی جزیرہ میں رہنے کا فیصلہ اکثریتی رائے سے سمیتی نے کرلیا ہے۔ نیز نہر سویز کے بند ہو جانے سے سمندر دور کے راستے سے لانا ہوگا یوں اس سلسلے میں زیادہ خرچ بھی ہوگا۔ سمیتی نے اس بات پر تشویش کا اظہار بھی کیا۔

سمندر لانے کے بعد کہاں رکھا جائے اس کے متعلق بنائی گئی سمیتی نے پورے ملک کا دورہ کر کے شہریوں اور مختلف اداروں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کا پورا حال معلوم ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ مگر ان کے دورے کے دوران جو دو خاص باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ ہیں کہ عقل آباد میں سمندر آنا چاہئے اس کے متعلق عوام میں خاصہ جوش و خروش موجود ہے اور سمندر کے حق میں رائے عامہ ہر طرح ہموار ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر شخص کا یہ اصرار ہے کہ اپنے ضلع یا تعلقہ کو سمندر کا کنارہ ملنا چاہئے کیوں کہ ڈائرکٹ سمندر لینا ناممکن ہے۔ لہٰذا کمیٹی کے سامنے یہ ٹیڑھا مسئلہ کھڑا ہوا ہے کہ سمندر نہ لاتے ہوئے سب کو سمندر کا کنارہ کیسے دیا جائے؟ سمندر کے لائق صرف ایک قطعہ اراضی تھا۔

کمیٹیوں کا کام ٹھیک چلتے ہوئے بھی کچھ ہو نہیں پا رہا تھا سرکاری حلقوں میں ان کے کام پر اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ البتہ سمندر کی مانگ سے عوام بیدار ہو چکے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ اس مسئلہ کو حزب مخالف نے اپنے ہاتھ میں لیا یعنی ابتداء میں جب سمندر کے مطالبہ کو سرکار کی پشت پناہی حاصل تھی تب ظاہر ہے کہ مخالفین نے اس کی مخالفت کی کیوں کہ برسر اقتدار پارٹی کی مخالفت کرنا سیدھی سادھی پالیسی ہے۔ ان کی اصل پالیسی کیا ہے یہ اس وقت تک نہیں بتایا جا سکتا جب تک برسر اقتدار پارٹی کی پالیسی طے نہ ہو جائے۔ لہٰذا شروع ہی سے اس کام میں سرکار کا سہارا دیکھ کر حزب مخالف نے خاموشی اختیار کی تھی۔ مگر سرکار شروع میں اس مانگ کو اٹھا کر خاموش بیٹھ گئی تو حزب مخالف کی پالیسی خود بخود طے ہو گئی اور انھیں فوراً خیال آیا کہ سرکاری مانگ کس قدر اہم ہے اور فوراً ان میں ہلچل سی مچ گئی سمندر کے لئے ایک بڑے اندولن کا فیصلہ حزب مخالف کے لیڈروں نے کیا لیکن ایسا کرنے سے پہلے برسر اقتدار پارٹی کو نیچے کھینچنا ضروری تھا۔ اس کے لئے عوام کی تائید ضروری تھی۔ جو مانگ انھیں کسی زمانہ میں ایک بیوقوفی معلوم ہوتی تھی اب وہ عین عقل مندی تھی۔ سمندری انقلاب کا جھنڈا بائیں بازو نے لہرانا شروع کیا تو اور مزہ آیا۔

بند، ہڑتال گھیراؤ تمام حربے آزمائے جانے لگے ایک مرتبہ عقل مند جی اور دوسری بار ان کے اسسٹنٹ عقل خبط گھیراؤ میں بُری طرح پکڑے گئے مورچہ لے کر نعرے لگاتا ہوا جلوس عقل مند جی کے گھر پہنچا تو پہلے انہوں نے ملنے سے انکار کیا مگر پھر انھیں مجبوراً باہر نکلنا پڑا۔ مجمع سے مخاطب ہو کر وہ بولے۔

دوستو! یہ مسئلہ آپسی بات چیت سے طے ہو سکتا ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ آپ اس کے لئے تشدد کا طریقہ نہیں اپنائیں گے میری بھی یہی رائے ہے کہ اپنے ملک کو سمندر ملنا چاہیئے مگر تشدد کے ذرائع اپنانے سے سمندر ہم سے دور چلا جائے گا۔ . . .

واقعتاً مورچہ میں شامل لوگ بری طرح بگڑے ہوئے تھے مگر عقل مند جی کی لمبی چوڑی تقریر سے اتنے بیزار ہوئے کہ آخر اپنے گھر چلے گئے۔

حزب مخالف کی سرگرمی کی وجہ سے عقل مند جی اور ان کے صلاح کار شش و پنج میں پڑ گئے۔ لیکن عقل آباد میں عقل کا کیا کال تھا؟ الکشن کا موسم آتے ہی عقل مند جی نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے نام کو عقل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ وہ پبلک سبھا میں بولے۔ معزز خواتین و حضرات! ہمیں سمندر ملنا چاہیئے پانچ سال پہلے کی یہ مانگ ہم بھولے نہیں ہیں۔ آپ نے جب سے ہمیں اکثریتی ووٹوں سے منتخب کیا ہے ہم اسی فکر میں ہیں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہم نے جو کمیٹیاں بنائیں ان کا کام آپ کے سامنے ہے۔

دوستو! میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ لوگ حزب مخالف کی اُلٹی سیدھی باتوں میں نہ آئیں ہمارا

دیکھا دیکھی اب وہ بھی ڈھنڈورا پیٹنے لگے ہیں کہ ہمیں سمندر ملنا چاہیئے۔ مگر ان کے پینتروں کو سمجھئے۔ سمندر ملنا چاہیئے یہ ٹھیک ہے مگر اسے کہاں رکھا جائے گا مخالف لیڈروں نے ابھی تک نہیں بتایا۔ کل اگر سمندر مل گیا تو یہ لوگ اسے آپ کے ضلع میں لاکر رکھے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ذرا سوچیئے آپ کو سمندر تو مل ہی جائے گا مگر "جل سمادھی" بھی مل جائے گی۔

بھو دان میں ملی ہوئی وہ جگہ جس کا کوئی وجود نہیں اور جو کسی کو چاہیئے بھی نہیں ایسی زمین ہم سمندر کے لئے تلاش کر رہے ہیں مگر ماہرین کی رائے میں سمندر کے لئے وہ مناسب نہیں ہے۔ کافی غور و خوص کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں دراصل سمندر کا کنارہ چاہیئے۔

میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ حقیقت میں ہمیں کیا چاہیئے اس بات کو ٹھیک طرح نہ سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ سمندر کے لئے حلق پھاڑنا مخالف پارٹی کی ملک کے ساتھ غداری اور بے وقوفی کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ان ملک کی نیا ڈبونے والوں کو میں چیلنج کرتا ہوں کہ سمندر کے لئے ہم عقل آباد سے ایک انچ بھی زمین نہیں دیں گے عقل آباد کی پوتر دھرتی سمندر میں ڈبونے کے لئے میں اس ملک کا لیڈر نہیں بنا۔

"سمندر چاہیئے لیکن ہم انچ بھر زمین بھی نہیں دیں گے" یہ ہماری نئی پالیسی ہے اور سمندر کا کنارہ ہمیں ملنا ہی چاہیئے یہ ہمارا نیا نعرہ ہے آپ مجھے ووٹ دیں یا نہ دیں مانگ پوری کرنے کے لئے میں ۵ سال کیا ۵۰ سال لڑوں گا۔ بلکہ ۵۰۰ سو سال لڑوں گا۔

ظاہر ہے کہ یہ جلسہ عقل مندجی کی جے کے نعروں پر ختم ہوا۔ عقل مندجی اور ان کی پارٹی دونوں الکشن میں بھاری اکثریت سے منتخب ہو گئے یعنی مزید پانچ سال کرسی پر رہنے کے لئے اقتدار حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ یہ باتیں حقارت سے مخالف پارٹی والے کہتے رہے ہوں گے۔ مگر عقل مندجی نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی رپورٹروں سے کی گئی پہلی ملاقات میں انھوں نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ایک نئی کمیٹی تشکیل دینے والے ہیں۔

اس کمیٹی کا تقرر ۵ بجے شام کو عمل میں آیا۔ اس کے بعد فوراً یعنی رات کے گیارہ بجے اسپیشل فلائیٹ سے تمام ممبران وسکریٹریز مختلف ملکوں کے سمندری کناروں کا مشاہدہ کرنے کے لئے لندن کے راستے نیویارک روانہ ہو گئے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عقل آباد میں حکومت کے کام کس خوش اسلوبی سے انجام پا رہے ہیں۔

■□

No. 15822/68
17 Copy 5
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H/HD 6
May 1984 Phone : 557716





خواجہ عبدالغفور نمبر



NE 1984

Rs. 5.0

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۱۷

شمارہ ۶

جون

۱۹۸۴ء

خواجہ عبدالغفور نمبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ:

شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔۱

فون: 557716

کتابت: محمد عبدالرؤف، مسعود انور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔

فہرست

جانے والے کی یاد

قندِ مکرّر ہے تری یاد (حینِ حیات لکھے گئے مضامین)

پرورشِ لوح وقلم (تصانیف پر مقدمے اور پیش لفظ)

متاعِ لوح وقلم (انتخاب)

خود نوشت

مزاح

تنقید

★ ★

بال کی کھال (تبصرے)

★ ★



خواجہ عبدالغفور

کیریکیچر

از

عزیز کارٹونسٹ

(۲۵ جنوری ۱۹۸۲ء)



خواجہ عبدالغفور

کیریکیچر ـــ از ـــ شعیب کارٹونسٹ

(جنوری سنہ ۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور ــــ مختصر سوانح حیات

خواجہ عبدالغفور ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد کے ایک ذی علم گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ نصیر الدین صاحب محکمہ کروڑگری میں ملازم تھے۔ اور بفضلِ تعالیٰ وہ اور ان کی بیگم دونوں بقید حیات ہیں۔ خواجہ صاحب کی ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی ایس سی (آنرس) میں اول آئے۔ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد سیول سروس کا امتحان پاس کیا۔ اور برٹش انڈیا کی ٹریننگ کے بعد اعلیٰ ترین ملازمت سے وابستہ ہوگئے، پچھڑے ہوئے طبقات کی بازآبادکاری، بچوں کی بہبودی اور خواتین کی بھلائی کے لئے انھوں نے تندہی و جانفشانی کے ساتھ کام کیا اور انھیں کی کوشش سے ہندوستان میں پہلی بار حیدرآباد میں سوشیل ولفیر کا محکمہ قائم ہوا۔ اس موضوع پر غفور صاحب نے انگریزی میں دس کتابچے بھی لکھے۔ ان کے کام سے متاثر ہوکر اقوام متحدہ نے انھیں نیویارک مدعو کیا تاکہ امریکہ میں موجود ریڈ انڈین آدی باسیوں کی فلاح کے لئے اسکیمات پیش کرسکیں۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید کے موقع پر مہاراشٹرا منتقل ہوئے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ایڈیشنل چیف سکریٹری کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہوئے۔ طنز و مزاح کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے پر بمبئی یونیورسٹی نے ۱۹۸۳ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔

غفور صاحب ہی کی تجویز پر مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی قائم ہوئی جس کے وہ تادم آخر سکریٹری رہے۔ اکیڈیمی کا رسالہ 'امکان' اور حکومت مہاراشٹرا کا 'قومی راج' ان ہی کی زیر نگرانی شائع ہوتا تھا۔ ہندوستان کی مختلف اردو انجمنوں سے وابستہ رہے۔ نظامس اردو ٹرسٹ کے بھی ٹرسٹی تھے، ۲۶ر اپریل کو حیدرآباد اور بمبئی سفر کے دوران لوناوالا کے قریب حالت سفر میں انتقال کیا۔ پسماندگان میں بیوہ حبیبہ غفور، دو لڑکے حسن خواجہ آئی پی ایس، علی خواجہ اور دو لڑکیاں ہیں۔

اردو تصانیف:

قہقہہ زار ، شگوفہ زار ، لالہ زار ، گل و گلزار ، سمن زار ،

اور

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

شگوفہ کا

کتابت کے آخری مراحل میں

ہندوستانی مزاح نمبر

مہمان مدیر : یوسف ناظم

★ اُردو - انگریزی - ہندی - بنگالی - تمل - تلگو - پنجابی
کشمیری - مراٹھی - اڑیا - ملیالم - سندھی - کنڑی - میتھلی
اور راجستھانی کے مزاحیہ نثری ادب کا جائزہ ـــــ

★ منتخب مضامین کے تراجم ★ اُردو کے دس مصنفین کے خود نوشت خاکے اور مضامین۔

★ ملک کے مشہور تنقید نگاروں کی آراء اور انٹرویو ★ اردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل ببلوگرافی اور مقالہ نگاروں کی تصاویر

٥ ضخامت : ٢٥٠ صفحات، قیمت ٢٥ روپے

یہ خصوصی نمبر "شگوفہ" کے ١٢ شماروں کے علاوہ ہوگا جسے سالانہ خریدار دس روپے زائد ادا کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔ پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔

فکر تونسوی

غفور کے ساتھ ایک صبح

موت کا ایک دن معین ہے ہے لیکن اس کیلئے میں ایک نقص یہ ہے کہ وہ دن صرف خدا کو معلوم ہے، غفور صاحب کی رحلت پر ہی مجھے خدا کو تھوڑا بہت ماننا پڑا۔ ورنہ وفات سے چند دن پہلے جب ہم دونوں ناشتہ کر رہے تھے تو اُن کا چہرہ شک و شبہ سے بالاتر معلوم ہو رہا تھا۔ اور جب وہ بڑی متوازن تبسم کے ساتھ دوچار نئے ادبی لطیفوں سے میری یاسیت میں خوش نوائی پیدا کر رہے تھے۔ تو مجھے یوں لگتا تھا۔ اس شخص کے باطن میں تو خود ایک ایسا خدا موجود ہے، جو یاس و حرماں کی لاشوں کو زندہ کر دینے کی استطاعت رکھتا ہے۔

میں نے غفور صاحب سے کہا۔ "آپ جس کوٹھی میں اس وقت ناشتہ کر رہے ہیں۔ وہاں دو تین سال پہلے لال ڈنگا بطور نظر بند رہا کرتا تھا۔"

وہ بولے۔ "کون لال ڈنگا، میزورام کا باغی لیڈر؟"

میں نے کہا۔ "جی جناب! اور لال ڈنگا کے بعد آپ دوسرے شخص ہیں۔ جو میرے لئے قابل توجہ ہیں، کہیں آپ بھی تو یہاں لا کر نظر بند نہیں کر دیئے گئے۔"

"نہیں فکر صاحب! نظر بندی اپنے نصیب میں کہاں؟ میں تو ہنسنے ہنسانے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں، اس لئے دن رات میں قہقہوں کے پیچھے اور قہقہے میرے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ بلکہ مجھے بھگاتے پھرتے ہیں۔ کبھی بمبئی، کبھی پٹنہ، کبھی علی گڑھ کبھی دہلی اور کبھی حیدرآباد! لال ڈنگا کا نصیب مجھ میں نہیں، میرا نصیب لال ڈنگا میں نہیں۔ ایک ہنستا ہنساتا ہے۔ دوسرا ڈراتا دھمکاتا ہے۔ اُڑتا پنچھی ہوں، جانے کل کدھر نکل جاؤں۔"

وہ یہ فقرے بڑے آداب سے بول رہے تھے۔ آداب جو ہمیشہ سے ان کی خاندانی تخصیص رہی تھی۔ اُن کے لہجے میں احترام تھا۔ جو شخص خود قابل احترام ہو۔ وہ ہر کہ ومہ کا احتراماً ذکر کرے۔ موجودہ مشینی دور میں احترام کا یہ دوہرا رول سمجھنے کے لئے دیدہ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کم از کم مجھ میں غائب تھی —— مجھے ہمیشہ رشک آیا اُن کی دیدنی اور بینائی پر۔

اگرچہ میں صرف یہی سمجھا کہ غفور صاحب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے بلکہ صرف اُن کی گفتگو سنتے ہوئے خوشگواری کی تر و تازہ لہریں بدن میں کوندنے اور ناچنے لگتیں۔ اور خدا کی قسم! (میرا مطلب ہے تھوڑا بہت خدا) جب اُن کے منہ سے اُڑتا پنچھی کا لفظ سُنا۔ تو میرے ذہن میں اس لفظ کا خوشگوار تصور ہی آیا۔ مفہوم دیگر آیا ہی نہیں۔ مفہومِ دیگر اُن کے شگفتہ لہجے کے سامنے ٹھہرتا بھی نہیں تھا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ اُن کے اندر بسا ہوا بشاشت کا خدا کبھی کبھی سچ بھی بول دیتا ہے۔ اور یہ سچ آپ کو کتنا ہی ناموزوں لگے لیکن پنچھی واقعی اُڑ گیا اور اُس رُخ اُڑ گیا۔ جس رُخ میں سورج تک اُڑتے اُڑتے اندھیر مچا جائے، ڈوب جائے۔ مگر دوسری صبح وہ پھر اپنی روشن کرنوں کے ساتھ اُگ آتا ہے۔

مگر غفور صاحب کا اُڑتا پنچھی جو ہمیشہ قہقہوں کا تعاقب کرتا اور قہقہے اُن کا تعاقب کرتے تھے۔ آہ! قہقہوں کا یہ اُڑتا سورج ڈوب گیا۔ تو یہ سوچ کر اندوہ کا اندھکار چھوڑ گیا کہ اب میں شاید کبھی نہ اُگوں ؂ اور کہ ؂

ڈھونڈ اب مجھ کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر

کل مہر پارک کالونی کی جس کوٹھی میں ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک تیسرے حضرت بھی موجود تھے۔ جو اس بات پر پھول رہے تھے کہ خواجہ عبدالغفور ایسی بلند مزاج شخصیت سے وہ پہلی مرتبہ (اور شاید آخری مرتبہ) ہم کلام ہو رہے ہیں —— ناشتے کے جو تھے دن صبح میرے گھر وارد ہو گئے اور بولے "فکر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ غفور صاحب انتقال فرما گئے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "بکواس مت کرو۔"

"آپ کو یقین نہیں آرہا نا؟"

"نہیں، نہیں، نہیں —— سُنا نہیں آپ نے"

مگر رات کو جب ٹیلی ویژن نے بالکل ایسی ہی بکواس کر دی۔ تو وہ یقین جس پر ہمیشہ عدم یقینی کا احساس ہوتا ہے، میری روح میں آہستہ آہستہ چبھتے ہوئے کانٹے کی طرح کرب بن کر پھیلتی گئی۔ بکواس۔ جسے آپ ہمیشہ بکواس سمجھ کر مسترد کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صداقت کا اعتبار بن کر آپ کے جذبوں میں گھس جائے تو جبراً و قہراً آپ کو غفور صاحب کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کی حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ مگر اس کلیئے کی بدبختی یہ ہے کہ اُس دن کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے۔ اور وہ علم ہم تک صرف ایک بلند مرتبہ شخصیت کی لاش دیکھ کر ہوتا ہے جو دہلی سے حیدرآباد جاتی ہوئی ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں پڑی ہوتی ہے ——

اور یقین پھر بھی نہیں آتا۔ کہ دو دن پہلے جس نشاط آگیں صاحب کے ساتھ بیٹھے ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ یہ دوش اُسی قہقہہ آفریں سوختہ جانی کی ہے —— لیکن پھر اپنے آپ کو تسکین دینے کے لئے ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ مرگ ناگہانی ہے۔

مرگ ناگہانی کی ترکیب ہم انسانوں کی ایجاد ہے اور ہم اُسے صرف وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں خواجہ عبدالغفور ایسا بشاش بشاش، طبع نفس، احترام اور آداب کا مالک شخص، قہقہے لگاتے لگاتے ایک دم ہمیں یہ حکم دینے لگے کہ اب ذرا اشک فشانی بھی کر کے دکھاؤ۔

کیونکہ ہر قہقہے کی گہری تہوں میں آنسو چھپے رہتے ہیں۔

گذشتہ پانچ چھ سال سے غفور صاحب کا یہ وطیرہ بن گیا تھا کہ جب بھی دہلی تشریف لاتے۔ بہاراشٹرا سدن یا ہوٹل کے ریسپشن کاؤنٹر پر ہی میرے گھر ٹیلی فون کر دیتے۔ "قبلہ فکر صاحب! میں پھر دہلی آگیا ہوں۔ ملاقات کے سوچار لمحے چاہتا ہوں"!

اور پھر میرے پروگرام کینسل! اور رُخ بے تاب غفور صاحب کی اقامت گاہ میں۔ ایک مرتبہ میں نے ہچکچاتے ہوئے اپنی ہی شکایت کی کہ "مجھے آج ہائی بلڈ پریشر قدرے فزاں ہے، لیکن حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ٹیلی فون کے دس منٹ بعد ہی وہ کار سے اُتر کر غریب خانہ کی کال بیل بجا رہے تھے۔ میں نادم بلکہ میرا بی۔ پی زیادہ نادم۔ مگر غفور صاحب خوش! ـــ کہنے لگے کہ مجھے ایک عظیم ادیب سے اس کے گھر میں ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ خوشا ہائی بلڈ پریشر!

یہ عجیب طرفہ تماشہ تھا کہ وہ مجھے عظیم کہتے تھے اور میں اُنہیں عظیم سمجھتا تھا۔ عظمت کی تشریح ہم دونوں نے کبھی نہیں کی۔ کیونکہ شاید باطن میں ہم دونوں اپنے آپ کو حقیرانِ ادب میں شمار کرتے تھے۔ یوں عرفِ عام میں وہ آئی۔ اے۔ ایس آفیسر تھے۔ مگر بہ ظاہرے بہرے، چال ڈھال، لہجے اور بیان میں ایک شریف، معتدل اور معقول انسان لگتے تھے۔ بینکری سے محروم تھے۔ جو ہر بیوروکریٹ میں خدا جانے کیوں اور کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟

ہزارہا انسانوں کی محفل میں سٹیج پر کھڑے ہو جاتے تو بغیر خود ہنسے، سبھوں کو نان سٹاپ لطیفوں کی بوچھاڑ میں بھگو کے چلے جاتے۔ میرے خیال میں اُردو دنیا میں لطیفہ سنانے کا جو اسلوب غفور صاحب کے حصے میں آیا تھا ویسا نیا تُلا اسلوب ہندوستان کے کسی لطیفہ گو کو نصیب نہیں ہوا۔ بقول کرشن چندر۔

"کئی سو سال سے ہندوستان نے ہنسنا چھوڑ رکھا تھا۔ آج بھی مہذب سوسائٹی میں کھل کر ہنسنا فعل قبیح سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب خواجہ عبدالغفور صاحب برف پگھلا رہے ہیں۔ لطیفہ گوئی میں اُن کی جدت طرازی فکر و فن کی معنی آفرینی اور موضوع کی بوقلمونی اپنے نئے نئے گل کھلاتی جا رہی ہے ــــ"

ــ ــ

رشید عبدالسمیع جلیل

خواجہ عبدالغفور

ادب نواز بھی تھے جاں نثار بھی تم تھے
اگرچہ اہلِ زباں کا وقار بھی تم تھے

مزاح و طنز نگاروں کے قافلہ سالار
لطیفہ ساز و ظرافت نگار بھی تم تھے

شگوفہ زار، سمن زار، لالہ زار کے بعد
مزاح و طنز کا "بالاحصار" بھی تم تھے

صریرِ خامہ سے رقصاں ہوئے "گل و گلزار"
کہ حرف حرف نوید بہار بھی تم تھے

رواں تھا قافلۂ "زار" تا دمِ آخر
قدم قدم پہ نیا مرغزار بھی تم تھے

سنائی دیتی ہے اکثر جو دامنِ شب میں
حسِ مزاح کی دھیمی پکار بھی تم تھے

شکار گاہِ ظرافت کے تھے سدا نگراں
خبر اڑی تھی مگر خود شکار بھی تم تھے

مبالغہ ہے اگر یہ کہوں کہ ایک تھے تم
کہ ایک شخص کے اندر ہزار بھی تم تھے

تمہارا قرض چکا دیں یہ ہو نہیں سکتا
وہ خوش نصیب ہیں جن پر ادھار بھی تم تھے

ہے ریس کورس کی مانند جادۂ اردو
قلم کی دوڑ میں کاغذ سوار بھی تم تھے

ہو برشگال کہ گرما، ہر ایک موسم میں
ہمیشہ معتدل و خوشگوار بھی تم تھے

وہ فلم ہو کہ سیاست، سماج ہو کہ ادب
ہر ایک شعبہ میں بجتا ستار بھی تم تھے

سفر مدام سفر بمبئی تا حیدرآباد
تمام عمر یوں ہی بے قرار بھی تم تھے

بجرمِ زندہ دلانِ ہم سفر رہا پیہم
تب آس پاس بھی قرب و جوار بھی تم تھے

ہنسی مذاق تمام اک بہانہ تھا گویا
کہ غم زدوں کے لئے غمگسار بھی تم تھے

٭ ٭ ٭

بھارت چند کھنہ

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

ہم آج سوگوار ہیں، اور بجا طور پر سوگوار ہیں کہ حیدرآباد کے ایک نہایت ہردلعزیز مایۂ ناز اور قابلِ احترام زندہ دل ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے، اور بچھڑے بھی کس طرح، کہ بمبئی جانے کے لئے ریل گاڑی میں سوار ہوئے، اور بمبئی پہنچنے سے پہلے ہی جنت میں پہنچ گئے۔ ویسے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے ہم یہ تو بخوبی جانتے ہیں کہ اس دُنیا میں جو پیدا ہوتا ہے اُس کو ایک دن ضرور جانا ہوتا ہے۔ کیا بھروسہ زندگانی کا ہے اور آدمی بُلبُلہ پانی کا ہے، یعنی ذرا تیز جھونکا ہوا کا کہیں سے آیا اور یہ بُلبُلہ پھوٹا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری زندگی ابدی نہیں۔ پھر بھی پچھلے کچھ سالوں سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہمارے پروردگار کے دربار میں قہقہہ فروشوں اور لطیفہ تراشوں کی کمی ہوگئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ ہمارے زندہ دل، ہمارے طنز و مزاح کے سوداگر یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے اس مالکِ ہردو جہاں کے جوارِ رحمت میں پہنچتے جا رہے ہیں۔ گلی نلگنڈوی، سلیمان خطیب، ناظم مرزائی، کرشن چندر، ناظر خیامی، کنہیا لال کپور اور اب ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور! یہ سب حضرات میرے خیال میں اپنی پوری عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اس زیر و زبر کی دُنیا۔ اس سیم و زر کی دُنیا سے اُٹھ گئے۔ اور کچھ میرے جیسے گھٹیا لوگ جو سخت جان قسم کے واقع ہوئے ہیں ابھی تک ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔
سچ ہے اُس اُوپر والے کی مرضی کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی اور بقول نظیر

یہ کون جانے کہ کل کیا کیا اور آج مالک وہ کیا کرے گا ؛ کیسے بگاڑے کیسے سنوارے، کیسے ڈھائے کیسے گھڑے گا
کسی کے گھر کون ہوئے پیدا کسی کے گھر کون کب مرے گا ؛ کسی کو ہرگز خبر نہیں ہے کہ کیا کیا ہے وہ کیا کرے گا
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے ؛ جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

میں مرحوم خواجہ عبدالغفور صاحب کو اس زمانے سے جانتا ہوں، جب وہ نظام سرکار کی حکومت میں قبائلی فرقوں کی فلاح و بہبود کے محکمہ میں مامور تھے۔ نظام سرکار کی حکومت کے متعلق کبھی کبھی یہ یاد کر کے آنکھوں میں

آنسو بھر آتے ہیں کہ ہائے! وہ بھی کیسے دن تھے جب ملازم سرکار کو جو تنخواہ کاغذ پر تحریر میں بتلائی جاتی تھی وہ پوری کی پوری مہینہ کی پہلی تاریخ کو اُس کی جیب میں اُتر جاتی تھی۔ یہ اس طرح کہ اس وقت مولوی اِنکم ٹیکس صاحب عالم وجود میں نہیں آئے تھے!

خواجہ صاحب سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی جب ریاستِ حیدرآباد کی ہستی مٹائی جارہی تھی۔ اس تعلق سے اس ریاست کے بعض ملازمین کو بطور جہیز، ریاست کے اُن علاقوں کے ساتھ، جو علاقائی زبان کی اساس پر تشکیل کی ہوئی مہاراشٹرا اور کرناٹک کی ریاستوں میں ضم ہونے والے تھے، وداع کیا جارہا تھا۔ کیفیت کچھ ایسی تھی جو بادشاہ محمد تغلق نے اپنے دَورِ حکومت میں اپنی مملکت کے دارالخلافہ کو دیوگری منتقل کرتے وقت دلی والوں کی بنادی تھی۔ حیدرآباد کا ہر ملازم سرکار اس بلائے ناگہانی سے پریشان تھا۔

جی۔ اے۔ ڈی میں چونکہ اُس وقت سرویز (SERVICES) کا کام میرے تفویض تھا، اس لئے میں اُن ملازمین سرکار کے غم وغصّہ سے، جو باہر بھیجے جارہے تھے، نہ صرف بخوبی واقف ہوں، بلکہ منتقلی کے ایک دو مہینوں کے دوران، بڑے بڑے معزز صاحبین، علاقائی زبان کی اساس پر ریاستیں بنانے والوں کے شجرہ و نسب کے بارے میں مجھے ایسی معلومات سے آگاہی بخشی جو مرحوم خواجہ عبدالغفور صاحب کی تصنیف "شگوفہ زار" میں ہجو کی اقسام کی تفصیل کے تعلق سے درج ہیں۔ حیدرآباد سے باہر بھیجے جانے والے ملازمینِ سرکار کی بے چارگی اور اُن کے غم وغصّہ کے اظہار میں جن خیالات کو بیان کیا گیا وہ یقیناً ہزل، تضحیک، تعریض، فقرہ بازی، پگڑی اچھالنے، گالی گلوچ، پھکڑبازی، استہزار، تذلیل کلا درازی، پوچ، ضلع جگت، پھبتی اور بدیہہ گوئی کی تعریف میں بخوبی فٹ ہوسکتے تھے۔

جو ملازمین یہ سمجھتے تھے کہ اُن کے بیرونِ حیدرآباد اَلاٹ منٹ میں میرا ہاتھ تھا، اُنہوں نے میرے حسب و نسب کے بارے میں بھی مجھے کافی معلومات سے سرفراز فرمایا تھا۔

خواجہ صاحب بھی مہاراشٹرا جانے پر خوش نہیں تھے مگر اُن کی طبیعت میں ایک چھُٹی حسِ مزاح کی پوشیدہ تھی، جس سے اُن کے حواس خمسہ بحال رہے اور اُنہوں نے اس مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ مگر یکم نومبر ۱۹۵۶ء کے فوری بعد اُن ملازمین کی جن کو یہیں رکھا گیا تھا، اور جن کو خوش قسمت سمجھا جارہا تھا، کچھ ایسی گت بنی کہ وہ اپنے پیدائشی علاقہ میں ہی غیر سمجھے جانے لگے۔

بہرحال خواجہ صاحب حقیقت میں خوش قسمت تھے کہ وہ اِس نمک کی کان سے نکل گئے۔ ریاستِ مہاراشٹرا میں اُن کو اپنی ملازمت کے دوران نہ صرف اہم عہدوں پر مامور کیا گیا، بلکہ میدانِ اَدب اور خصوصاً قہقہوں کی دُنیا میں اُنہوں نے اپنے لئے ایک منفرد مقام حاصل کرلیا۔

خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف "قہقہہ زار" تھی جس میں لطیفوں کے مختلف اقسام کو بہ اعتبار مضمون درج کیا گیا تھا۔ دراصل لطیفوں کی اہمیت کا احساس اور ان کو طنز ومزاح کے ادب کا ایک حصّہ بنانے کی شروعات

زندہ دلانِ حیدرآباد کے قیام کے بعد ان کے دوسرے سالانہ جلسہ میں منجملہ ادبی اجلاس و مشاعرہ ایک نشست ایسی بھی ترتیب دی گئی تھی جس میں صرف لطیفے ہی سنائے گئے۔ یہ محفل بڑی مقبول ثابت ہوئی تھی اور اس کے بعد سے لطیفہ گوئی کی محفلیں زندہ دلان کے سالانہ پروگرام کا نہایت دلچسپ اور کامیاب حصّہ بن چکی ہیں۔

خواجہ صاحب کی پہلی کتاب "قہقہہ زار" بڑی تیزی سے لکھی گئی اور چھپی۔ اس کی شہرت کی گونج ابھی باقی تھی کہ انہوں نے "شگوفہ زار" کی تکمیل اور اشاعت کرکے ایک تہلکہ اس طرح مچادیا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی بہت جلد چھپوانا پڑا۔ "شگوفہ زار" اردو ادب کے طنز و مزاح کے شعبہ میں ایک نصاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو کی تعلیم کی نصاب کی کتابوں اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں غلط معلومات درج نہیں ہیں!

اس کتاب میں فن ظرافت کی اتنی مختلف اقسام پیش کی گئی ہیں کہ اس فہرست کو مکمل اور مستند سمجھا جائے گا۔ پھر ان مختلف اصناف پر بڑی خوبی سے ان کی بنیادوں پر بحث کی گئی ہے اور مطالب واضح کرنے کے لئے لطیفے پیش کئے گئے ہیں، جن سے ظرافت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اردو کے ہر کتب خانہ میں نہ صرف رکھنے کے لائق ہے بلکہ ان کی زینت بن سکتی ہے۔ اس میں قابل مصنف نے ظرافت پیدا کرنے کے گُر بھی سمجھائے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مقالہ "عصر حاضر میں طنز و مزاح" میں شگوفہ زار کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"اس دور کے طنز و مزاح میں خواجہ عبدالغفور صاحب کا کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ انہوں نے لطیفہ گوئی کو فن کا درجہ دے دیا ہے۔ خالص مزاح میں اُنہیں شفیق الرحمن کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ظرافت کی جملہ صورتوں کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے لیکن طبعی مناسبت کی بناء پر ان کا خاص میدان لطیفہ شعاری ہی ٹھہرا۔ نریش کمار شاد مرحوم اور احمد جمال پاشا نے تو صرف اردو شعراء کے یا پھر نصیر الدین آفندی کے لطیفے جمع کئے تھے۔ غفور صاحب کا حافظہ ساری دنیا کے رنگا رنگ لطائف کا نگار خانہ ہے۔ جنہیں وہ ہنرمندی سے اپنے مزاحیوں میں جڑ دیتے ہیں۔ سردار جعفری نے اسے تہذیب و شرافت کی دلیل کہا ہے کہ وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں لیکن اُن پر ہنستے نہیں۔"

شگوفہ زار میں تعارف کراتے ہوئے مرحوم کرشن چندر نے خواجہ عبدالغفور صاحب کو زبردست خراج تحسین دیا ہے۔ انہوں نے دو اور کتابیں گل و گلزار اور سمن زار بھی مرتب کیں جو اُن کی ہر تصنیف کی طرح مقبول ہوئی ہیں ـــــ مرحوم خواجہ عبدالغفور صاحب کے ایک نہایت منفرد اور کامیاب مصنف ہونے کے بارے میں اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ موصوف کو ان کے مقالہ "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" پر ڈاکٹریٹ کا رتبہ عطا فرمایا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس موضوع پر اس سے پہلے کسی [illegible] کو ابھی تک ڈاکٹریٹ نہیں ملی۔ موصوف مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے قیام کے بعد سے تاحیات اسکے معتمد و ڈائرکٹر رہے۔ آسمان میں بہت افسوس اس بات کا ہے کہ دست قضا نے انکے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیونکہ ایک نہایت مہذب شریف اور قابل انسان ہونے کے علاوہ، موصوف کو اپنی عمر اور صحت کے اعتبار سے ابھی کئی برس تک زندہ رہنا چاہیئے تھا! بالآخر میں دست بدعا ہوں کہ مرحوم خواجہ صاحب اپنے خالق کے رحم و کرم سے بہشت [illegible]

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

آہ! خواجہ عبدالغفور

دل پگھل اُٹھے ہوئے آنسو رواں
ہائے رے جانکاہ مرگِ ناگہاں
یہ اچانک کون رخصت ہوگیا
بزمِ یاراں آج ہے ماتم کناں

کر کے رنج و غم میں سب کو مبتلا
چل بسا وہ خواجۂ حق آشنا

تھا جو حسنِ خلق کا آئینہ دار
دوستوں کا دوست اور یاروں کا یار
تا دمِ آخر جو کرتا ہی رہا
گیسوئے اُردو کو پیہم تابدار

خدمتیں اس کی ہیں بے حد و حساب
اس نے بخشی ہے ادب کو آب و تاب

وہ تھا مخلص قدر دانِ علم و فن
باعثِ زیبائش ہر انجمن
فیض قدرت سے میسر تھا اسے
طرزِ دلداری کا سارا بانکپن

وہ سراپا پیکر اخلاص تھا
تب ہی تو مقبول عام و خاص تھا

دلنوازی میں تھی یکتا اس کی ذات
اس میں ذہن و دل کی تھیں روشن صفات
کاربردازیٔ جوش و ہوش کا
خوبصورت باب تھی اس کی حیات

بے نظیر اوصاف کا حامل تھا وہ
درحقیقت ایک صاحبِ دل تھا وہ

تھا نگاہِ خوش دلاں میں معتبر
اس کا فن، اس کا قلم اس کا ہنر
گلشنِ طنز و ظرافت کو دیئے
اس نے کیا کیا خوشنما گلہائے تر

اس کے اک اک حرف میں اعجاز تھا
اس پہ علم و آگہی کو ناز تھا

وہ تھا پختہ پیکر عزم و یقیں
شخصیت اس کی تھی بے حد دلنشیں
وہ رہا گفتار اور کردار میں
حیدرآبادی ثقافت کا امیں

ہر ادا میں اس کی تھا رنگِ فسوں
اس سے زندہ تھیں روایاتِ جنوں

بزم آرائی پہ تھا اس کو عبور
اس کا ڈنکا بج رہا تھا دور دور
خادمِ اُردو ہزاروں آئیں گے
اب نہ آئے گا مگر عبدالغفور

دردِ اُردو اس کے دل میں تھا سدا
وہ شکار آخر اسی کا ہوگیا

وہ اکادیمی کی جان اور آن تھا
اس کو اپنے فرض کا عرفان تھا
اک زمانہ اس کا شاہد ہے کہ وہ
خوش خصال و نیک دل انسان تھا

مغفرت فرمانا اس کی اے خدا!
اس کے حق میں ہے یہ منشا کی دعا

یوسف ناظم

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

خواجہ عبدالغفور صاحب جنھیں آج مرحوم کہنا پڑ رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ان ہونہار فرزندوں میں سے تھے۔ جن کی ذات سے اس مرحوم یونیورسٹی کا وقار وابستہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ برصغیر کی واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔

اُردو کو علمی اور ادبی زبان کا درجہ عطا کرنے میں جہاں ہمارے شعراء ادیبوں اور اسکالرس کا حصہ ہے وہیں جامعہ عثمانیہ کی خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔ خواجہ عبدالغفور نے برسوں پہلے اس یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی تھی اور میرے اندازے کے مطابق کامل ۴۰ سال بعد بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ اُن کی لگن اور قوت ارادی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

خواجہ صاحب نے عمر کے ۶۵ سال مکمل کر لئے تھے لیکن اس عمر میں بھی جب کہ اُن کی صحت ہر لمحہ تصحیح کی متقاضی تھی۔ وہ اتنے فعال، معروف، چاق و چوبند اور مستعد شخص تھے کہ ان پر صرف حیرت ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ ڈر لگتا تھا کہ خواجہ صاحب یوں اپنی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں قریب سے قریب تر شخص کا مشورہ اور ہمدردی قبول نہیں تھی۔ غالباً زندگی کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جرعۂ حیات کا آخری قطرہ تک سرور آور اور کیف انگیز ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے زندگی کو قید حیات و بند غم نہیں سمجھا بلکہ شہد و نشاط اور شعر و نغمہ سمجھا۔ حیدرآباد اور بمبئی کی ادبی اور ثقافتی محفلوں کی وہ صرف رونق ہی نہیں روح رواں تھے۔ خود اپنے مکان پر بھی وہ سماع اور موسیقی کی محفلیں منعقد کرتے اور دوستوں کو کام و دہن ہی کی نہیں، روح و ذہن کی آسودگی بھی بہم پہونچاتے۔ اپنے انتقال سے ایک دن پہلے یعنی ۲۵ راپریل کو وہ بمبئی میں منعقد ہونے والی ایک محفل موسیقی کے سرپرستوں میں سے تھے لیکن وہ ۲۰ رکو حیدرآباد سے یہاں نہیں پہنچ سکے اور ۲۰ رکو جب وہ مینار ایکسپریس سے بمبئی آرہے تھے تو رات میں کوئی ۳ بجے کے قریب پونہ اور لونا والا

کے درمیان انھوں نے اپنی شریک حیات کی موجودگی میں ٹرین میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ صرف اپنی زندگی ہی سے انہوں نے اپنی موت سے بھی ثابت کر دیا کہ زندگی مدام سفر ہے۔

اپریل کا پورا مہینہ انھوں نے سفر میں گذارا جیسے اُن سے کسی نے کہہ دیا ہو جن جن سے ملنا ہو مل لو۔ اپریل کے شروع میں وہ ناگپور گئے، بلڈانہ گئے۔ بلڈانہ سے بمبئی آئے تو دلی اور پٹنہ چلے گئے، ۷ر اور ۸ر اپریل کو پٹنہ میں پانچواں کل ہند جشنِ ظرافت منعقد ہوا تھا۔ اور عجب اتفاق ہے کہ جو ہر سال مدعو کئے جاتے تھے اور وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ اس مرتبہ پٹنہ گئے۔ اپریل کی گرمی میں پٹنہ جیسے دور دراز مقام کا سفر انھوں نے شاید صرف اس لیے کیا تھا کہ انھیں اپنا فرض اور قرض ادا کرنا تھا۔

خواجہ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بہت بعد میں کیا یعنی کوئی ۱۹۶۰ء کے اردگرد اور پچھلے ۲۰ سال میں اپنی پانچ مزاحیہ کتابیں قہقہہ زار، لالہ زار، شگوفہ زار، گل و گلزار اور سمن زار پیش کیں۔ قہقہہ زار ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی شائع ہوئی ہے۔ اور شگوفہ زار کا ترمیم ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے چند ہی سال بعد شائع ہوا۔ خواجہ صاحب بنیادی طور پر شفیق الرحمٰن کی قبیل کے مزاح نگار تھے۔ اور انھوں نے لطیفہ گوئی کو ایک فن کی حیثیت دی۔ حال ہی میں ان کی تنقیدی کتاب، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ شائع ہوئی۔ اس کتاب کی پذیرائی بھی بہت ہوئی اور کئی رسائل میں اس پر معتبر لوگوں کے تبصرے شائع ہوئے۔

خواجہ صاحب کی ادبی تصانیف کا رنگ اور زیادہ چوکھا ہے۔ مہاراشٹرا میں حکومت کی جانب سے ایک اُردو رسالے "قومی راج" کی اشاعت خواجہ صاحب ہی کی تجویز کی مرہونِ منت ہے۔ قاضی سلیم نے جو ۱۹۶۵ء میں مہاراشٹر میں ایم ایل سی تھے۔ اس بات کی کوشش کی تھی کہ مجلس مقننہ کے توسط سے یہ تجویز حکومت کے سامنے پیش کی جائے لیکن مجلس مقننہ میں تجاویز قرعہ اندازی کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں۔ اور اُردو تو ہر جوئے میں ہار جاتی ہے۔ بہرحال یہ بات جب خواجہ صاحب سے کہی گئی تو انھوں نے اس تجویز کو پیش کیا اور اُسے عملی لباس دیا۔ آج "قومی راج" ایک مقبول رسالے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اور حکومت مہاراشٹرا کی وسیع النظری اور اُردو کے ساتھ حسنِ سلوک کا مظہر ہے۔

خواجہ صاحب نے جب حکومت مہاراشٹرا کے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے جائزہ لیا تو حکومت کے سامنے اُردو اکاڈمی کی تجویز رکھی۔ شنکر راؤ چوان اس وقت وزیر اعلیٰ تھے اور موصوف بھی جامعہ عثمانیہ کے طالب علم رہے ہیں۔ اس تجویز کو منظور کرنا اُن کے لئے یوں بھی ضروری تھا کہ انھوں نے اپنی قانون کی تعلیم اُردو میں حاصل کی تھی۔ خواجہ صاحب اردو اکادمی کے ممبر سکریٹری کی حیثیت سے تادمِ آخر کارگذار رہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے رسوخ اور تعلقات کی بناء پر مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کو بہت جلد دوسری ریاستوں کی اکادمیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ اردو اکاڈمی کا میگزین "امکان" بھی خواجہ صاحب کی

زیرِ نگرانی کئی سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

بمبئی کے ایک درجۂ اول کے تہذیبی ادارے سے بھی وہ برسوں منسلک رہے بشر سنگار سمسد نے جب خواجہ صاحب کا تعاون حاصل کیا تو ان کے جلسوں کی فہرست میں ایک "شبِ قہقہہ" کا بھی اضافہ ہوا۔ بمبئی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ظریفانہ نثر کو عام جلسوں میں روشناس کرایا گیا۔ ہندوستان کے سبھی مزاح نگار سرسنگار سمسد کے پلیٹ فارم سے اپنے مضامین سنا چکے ہیں۔ سرسنگار سمسد کے ان مشاعروں کا تو ذکر ہی کیا جنھیں سننے کے لئے اضلاع سے لوگ دور دور سے بمبئی چلے آتے تھے یہاں مشاعروں میں جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ، مخدومؔ سبھی نے ان مشاعروں میں بارہا شرکت کی تھی۔

اُردو اکاڈمی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ بمبئی یونیورسٹی نے جو پچھلے ۱۰۰ سال سے اُردو کے شعبے سے محروم تھی پچھلے سال یعنی ۱۹۸۳ء میں اپنے ملک کی ایک اہم اور مقبول زبان کے لئے اپنی آغوش وا کی۔ اُردو کے معروف اور بلند قامت ادیب و افسانہ نگار کرشن چندر کے نام سے منسوب "اردو چیئر" کے قیام کے بعد یہ یونیورسٹی یوں سمجھئے اور زیادہ سربلند اور سرفراز ہو گئی۔ ایک کمی تھی جو بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ اردو اکاڈمی اور حکومت مہاراشٹرا کا یہ کارنامہ یقیناً ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔

خواجہ عبدالغفور صاحب نے حال حال میں انڈیا بک ہاؤس کے زیرِ اہتمام اُردو زبان کی تعلیم و تربیت، اُردو کا مکس لینگوافون ریکارڈ اور کیسیٹ کی تیاریوں کا کام شروع کیا تھا۔ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا ہے لیکن کیا تعجب خواجہ صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا بھی کسی دن شجرِ سایہ دار بن جائے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت نے ایک عام غلط فہمی دور کردی۔ لوگوں کے ذہنوں میں معلوم نہیں یہ خیال کیسے جگہ پا گیا تھا کہ سرکاری افسر خاص طور پر وہ افسر جو آئی اے ایس ہوں بے حد خشک مزاج ہوتے ہیں اور ان کے دماغ چاروں طرف سے کسی بینک کے سیف روم کی طرح بند ہوتے ہیں۔ یہ بات تو ان لوگوں سے پوچھنی چاہئے جو خواجہ صاحب سے ایک مرتبہ بھی ملے ہوں۔ وہ جس محفل میں بیٹھتے اُسے قہقہہ زار بنا دیتے۔ ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کسی کی مدد سے کبھی ہاتھ نہیں کھینچا۔ وہ فیض احمد فیض نہیں تھے لیکن فیض رساں ضرور تھے۔ انھیں دوسروں کا کام کرنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اُن کی شخصیت کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ اعلیٰ سوسائٹی اور اونچے درجے کے حلقوں کے آدمی ہیں لیکن جو لوگ ان سے قریب سے واقف تھے وہ جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب کا زیادہ وقت ان لوگوں میں گذرتا تھا جو ضرورت مند تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے گھر پر مسلسل فون آتے رہے کہ ہمیں خواجہ صاحب سے ملنا ہے اور ہمیں ان کے فلاں دوست نے بھیجا ہے۔

خواجہ صاحب زندگی بھر مصروف رہے۔ اُن کو اکیلے میں پکڑنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ صرف محفل ہی کے نہیں

مجمع کے آدمی تھے۔ نچلا اور تنہا بیٹھنا ان کے لئے دوبھر تھا۔ ان کے دوست سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے جن سے ان کی باضابطہ خط وکتابت تھی۔ محکمۂ ٹیلیفون اور محکمۂ ڈاک وتار کی بیشتر آمدنی خواجہ صاحب کے طفیل تھی۔ محکمۂ ریلوے کو بھی، اس کی ساری خرابیوں کے باوجود، انھوں نے بکثرت فائدہ پہنچایا اور ہر مہینہ بلا ناغہ کم سے کم ایک عشرہ ضرور سفر میں گذارا۔

خواجہ صاحب نے نہ صرف بھرپور اور پرمسرت زندگی گذاری بلکہ اپنے ہم نشینوں اور ہم جلیسوں کو بھی نشاط وانبساط کے لمحات فراہم کئے اور یہ کام صرف چند لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی محفلوں میں خواجہ صاحب کی کمی یقیناً محسوس کی جائے گی۔ میں تو خیر کئی وجہوں سے شخصی طور پر ان سے قریب تھا اور ان کی موت میرا شخصی غم ہے لیکن خواجہ صاحب سے جو شخص ایک مرتبہ بھی ملا ہوگا، اُسے ان کی موت کا یقیناً دُکھ ہوگا۔ ان کی اپنائیت اپنی مثال آپ تھی۔ ان کے آئی اے ایس ہونے نہ ہونے، ان کے مصنف ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اُن کی شخصیت کے نکھار ان کے عہدے اور طرزِ رہائش میں نہیں بلکہ اس دلسوزی اور ہمدردی میں تھا، جو جیسے جیسے وقت گذرتا جارہا ہے نایید ہوتی جارہی ہے۔ خواجہ صاحب نے بہت سی چیزیں پیچھے چھوڑی ہوں گی۔ لیکن یہ دولت اپنے ساتھ لے گئے۔ — —

∴ ∴ ∴ ∴ ∴

"ظرافت، مزاح اور طنز میں کیا فرق ہے۔ فن لطیفہ گوئی کب سے شروع ہوا۔ زوال کے بعد کون ادیب اس کو تھامے ہوئے ہیں ان تمام سوالات کا جواب خواجہ عبدالغفور صاحب نے اپنی زیرِ طبع کتاب "طنز کیا چیز ہے مزاح کیا ہے" میں دیا ہے۔ خواجہ عبدالغفور اُردو طنز میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر موضوع پر ان کے پاس نیا چٹکلا تیار ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے طنز ومزاح کو ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بعد خواجہ صاحب ہی طنز ومزاح کے محافظ ٹھہرائے جائیں گے۔ سنا ہے کتاب کا عنوان بدل دیا ہے لیکن عنوان بدل دینے سے کیا ہوتا ہے۔ طنز میں عنوان نگاری کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی"

از :۔ کے۔ کے۔ کھلر
'اُردو ادب میں طنز ومزاح'
مطبوعہ 'امکان'

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

خواجہ صاحب سے نصف ملاقاتیں

"غفور صاحب جیسی شخصیتیں ہماری ادبی و تہذیبی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں اور ایسی شخصیتوں کو دیکھ کر ہی ہمیں یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں شریف اور نیک نفس انسانوں کی پیدائش ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے ـــ "

ـــــــــ مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ)

خواجہ عبدالغفور صاحب سے میری "پوری ملاقات" تو اب تک نہیں ہوئی ہے۔ لیکن خطوط کے لین دین سے "نصف ملاقاتوں" کا سلسلہ قائم ہے۔ مجتبیٰ حسین کو ان سے پوری ملاقات کی سعادت نصیب ہو چکی ہے اس لئے انہوں نے خواجہ صاحب کی دلفریب شخصیت کا ذائقہ بہت قریب سے چکھا ہے اور اس ذائقہ کی لطافت کو اپنے مخصوص رنگ میں مزہ لے لے کر بیان بھی کیا ہے، جس کا اقتباس اوپر درج ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کی شفاف شخصیت کی جھلکیاں ان کے خطوط کے آئینے میں دیکھیں، جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے لکھے۔ مگر میرے اور مجتبیٰ حسین کے احساسات یکساں ہیں، یعنی ہم دونوں، حضرت میرؔ کے الفاظ میں

ایک ہی زلف کے اسیر ہوئے

اگر میرؔ صاحب ہمارے دور میں ہوتے، تو اپنی طبیعت کی اُفتاد کے باعث، عین ممکن تھا کہ خواجہ صاحب کے معاملے میں، ہم سے سبقت لے جاتے لیکن مجھے نہ مجتبیٰ سے رقابت ہے اور نہ میں میرؔ صاحب سے گلہ کرنے کی جرأت کرتا، کیونکہ شادؔ عظیم آبادی کی سرزمین کا رہنے والا ہوں اور ان ہی کی طرح قناعت پسند واقع ہوا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

صف اولیں تو ہے خاص صف، وہاں جا ملے یہ کہاں شرف
صف آخریں سے بھی دور تر، جو اشارہ ہو تو وہیں سہی

۱۹۷۶ء کے اواخر میں جب ہم چند دوستوں نے پٹنہ میں کل ہند جشن ظرافت کا پروگرام بنایا تو ممتاز ظرافت نگاروں میں سرفہرست خواجہ صاحب کا

نام رکھا گیا" اور ان سے استدعا کی گئی کہ وہ ہمارے پروگرام میں شرکت فرمائیں۔ انہوں نے شرکت کا زوردار وعدہ بھی کیا، سوونیر کے لئے اپنا ایک فوٹو گراف بھی بھیجا، اور ہم ان کا ایک مضمون سوونیر میں شامل کرکے، ان کی آمد کے انتظار میں دیدہ و دل فرشِ راہ کئے بیٹھے رہے۔ میں بے حد خوش تھا کہ ان سے بالمشافہ ملاقات کی دیرینہ تمنا پوری ہونے کا موقع آگیا ہے۔ لیکن کل ہند جشنِ ظرافت کے دو روزہ پروگرام میں مہاراشٹرا، حیدرآباد، کرناٹک اور دوسری ریاستوں کے مندوبین تو شرکت کے لئے آگئے، مگر خواجہ صاحب تشریف نہیں لائے۔ ان کے عوض ان کا خط آیا۔

"مکرمی و مشفقی، تسلیمات — یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ باوجود ساری تیاریاں مکمل ہونے اور ارادے مستحکم ہونے کے ہم پٹنہ پہونچ نہ پائے، ورنہ الہ آباد بھی ضروری تھا اور پھر واپسی میں ناگپور کی میٹنگ بھی۔ چند وجوہات اور ناگزیر حالات کی وجہ سے سب رہ گیا اور ہمیں افسوس ہی افسوس رہ گیا کہ ایسے اچھے موقع پر ادھر رہ گئے اور آپ نے دعوت دے کر جو اعزاز بخشا تھا وہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اب نہ معلوم کب ایسی صورت ہو کہ آپ سے ملنا ہو ...... اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مزاح نگار اور مزاحیہ شعراء کو اس بڑی تعداد میں جمع کرنا آپ ہی کا حق تھا اور یہ آپ ہی کی اعلیٰ شخصیت تھی کہ جس نے سب کو کھینچ کر یکجا کیا...

..... آپکی خدمت میں اپنی کتاب گل و گلزار پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔"

اس مومنی تحریر میں کتنا اخلاص و انکسار اور کتنی شرافت و لطافت گھلی ہوئی ہے، اسے قارئین خود محسوس کرسکتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب مجھے اطلاع ملی کہ خواجہ صاحب بیمار ہوگئے ہیں تو مزاج پرسی کے لئے ایک خط لکھا۔ اس خط کا جواب بھی موصوف نے بڑے خلوص سے دیا۔

"آپکی مزاج پرسی کا شکریہ۔ صحت کی مذکورہ دینا ضروری تھا۔ غفلت کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ بحمد اللہ اب بالکل اچھا ہوں اور حسبِ سابق مصروف بہ کار۔ یقیناً یہ آپ جیسے مخلص و بہی خواہوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور یہی آئندہ کے لئے ضمانت۔ اردو کی خدمت گذاری کے سوا اب اور کوئی مشغلہ نہیں اور یہی تمنا ہے کہ اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آپ کی صحت کے تعلق سے تشویش اسی وقت سے ہے جب کہ آپ نے ناسازئ مزاج کے باوجود پٹنہ کا کل ہند جشنِ ظرافت کامیاب اور شاندار بنایا تھا کہ جو اردو ادب کا ایک سنہری باب ہے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے کہ مستجاب ہوں اور آپ بھی بہ صحتِ کلّی ادب کی خدمت میں مدتوں مصروف رہیں...

... آپ نے جو تصویریں ارسال کی تھیں وہ تمام کی تمام میں نے جناب یوسف ناظم صاحب کو پہنچادیں ...."

جب میرا چھٹا مجموعۂ کلام "متاعِ واہی" چھپا تو آسے میں

نے انعامی مقابلے کے لئے یوپی اور مہاراشٹرا اُردو اکادمیوں کو بھیجا۔ یوپی اردو اکادمی نے انعامات کا اعلان پہلے کر دیا۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے مجھے لکھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ متاعِ واہی پر ڈاکہ ڈالنے کی فکر میں تھا کہ یوپی اردو اکادمی نے اس انمول خزانہ کے کچھ مول تول کر ڈالے، جو ہماری دانست میں بہت ہی حقیر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
پھر بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرکیف مبارکباد قبول فرمائیے"۔

۱۹۷۹ء میں، مہاراشٹرا اردو اکادمی کی جانب سے جب "مہاراشٹرا میں آزادی کے بعد اُردو ادب" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا جانے لگا تو ساتھ ساتھ 'شامِ تبسم ۔ شبِ افسانہ' کے انعقاد کا بھی پروگرام بنا، اس موقع پر خواجہ صاحب نے مجھے ایک ٹائپ شدہ دعوت نامہ بھیجا۔

'جناب چیرمین صاحب اور ممبرانِ بورڈ آپ کے شکر گذار ہوں گے، اگر آپ سیمینار میں شرکت فرماکر، مندرجۂ بالا موضوع پر کوئی مقالہ پڑھ سکیں۔ اس سیمینار میں آپ کے علاوہ جناب فکر تونسوی صاحب اور جناب آل احمد سرور صاحب کو بھی مدعو کیا جارہا ہے۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس دعوت کو قبول فرماکر مجھے جلد از جلد مطلع فرماسکیں'۔

اس خط کے معاً بعد، خواجہ صاحب نے ایک دوسرا بھی خط لکھا۔

"مکرمی و محبی۔ تسلیمات۔ میری غفلت ہے کہ میں نجی طور پر آپکو فوری طور پر بقلم خود خط نہ لکھ سکا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ کا اسی مضمون کا خط ملے گا۔ اس بارے میں چاہتا تھا کہ کچھ اس عنوان سے درخواست پیش کروں کہ ؎
بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اب بتائیے کہ کس انداز، کس التماس، اور کس طرح اپنی بات کو دہراؤں کہ آپ کو ضرور آنا ہی ہوگا۔ میری تمنا اور میری خواہش تو رہی ایک طرف، بمبئی آپ کے دیدار کی طالب اور پیاسی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سفر اور بھیڑ بھاڑ کی الرجی کتنی ستم ظریف ہوتی ہے، مگر پھر بھی یہ سفر آپ کو کرنا ہوگا۔ ہم سب ہی چاہتے ہیں، بغیر آپ کے یہ شامِ تبسم نہ ہو۔ ابھی وقت ہے آپ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ اور تیار کر لیجئے۔ یہ ہماری دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوگی۔ اس سلسلے میں جو بھی صعوبت اور دشواری ہو، اس کا کچھ نہ کچھ حل ضرور ڈھونڈ نکالیے، ورنہ ہم یہ سیمینار اور شامِ تبسم یک لخت منسوخ کردیں گے۔ اب آپ کے سوا اور ہے کون۔ اور جو کوئی اور ہوتا بھی تو ہمیں اس کی قطعی پرواہ نہیں، ہم تو صرف یہی جانتے ہیں کہ ہم آپ کے پرستار ہیں"۔

لیکن وائے رے مجبوری، کہ ان محبت آمیز تقاضوں کے باوجود، میں اپنی صحت کی خرابی کے باعث 'دیارِ خواجہ'

کی زیارت سے محروم رہا، حالانکہ دس برس قبل تک ملک کے طول و عرض میں، جہاں کہیں بھی مشاعرے ہوتے، میں ہر طرح کی صعوبتِ سفر برداشت کر کے اُدھر دوڑ جاتا تھا۔ بمبئی، مدراس، بنگلور، کلکتہ، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد اور ریاستِ بہار کے مختلف شہروں کے مشاعروں کے دعوت نامے آتے اور میں ان میں شرکت کیا کرتا تھا۔ لیکن ۱۹۷۳ء میں ایک بار، جب دہلی کے ایک بڑے مشاعرے سے پٹنہ واپس آنے لگا، تو دہلی اسٹیشن پر، ٹرین میں بھیڑ کی وجہ سے اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی، اور ایسی تکلیف ہوئی کہ موت آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔ اس عذاب کا وقفہ کوئی ایک گھنٹہ رہا، لیکن یہی وقفہ اس قدر تکلیف دہ ثابت ہوا کہ میں نے سفر کرنا ہی چھوڑ دیا اور اب تو پٹنہ کی ادبی تقریبات میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتا ہوں۔ سفر کے تصور سے وحشت کا یہ عالم ہے کہ جب ۱۹۷۶ء میں چوتھے لڑکے کی شادی ہوئی تو میں بارات پارٹی کے ساتھ سہرسا، جو پٹنہ سے شب بھر کی دوری پر ہے، خود نہیں جا سکا۔

بہر حال، سیمنار اور شامِ تبسم میں خود تو شرکت نہیں کر سکا، لیکن اپنی کچھ نظمیں اپنی ہی آواز میں صدا بند کر کے کیسٹ، خواجہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا، تاکہ میری غیر حاضری کی کچھ تلافی ہو جائے۔

خواجہ صاحب کا جواب آیا۔

"آپ نے زحمت کر کے اپنا ٹیپ ازراہ کرم روانہ کیا۔ اس کو ہم سبھوں نے بار بار سنا اور خود بھی ٹیپ کر لیا۔ وہ مسلسل سرکولیشن میں ہے اب چونکہ ہم نے اس کا ریکارڈ بنا لیا ہے اور محفوظ کر لیا ہے، بہت جلد آپ کا ٹیپ بصد شکریہ، واپس روانہ کروں گا۔ . . . آپ کے خط ملتے ہیں تو بڑی خوشگوار باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ کبھی کبھی آپ کی صحت کے تعلق سے بے حد تردد رہتا ہے۔ بہر کیف ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ ہیں اور بس ایک آرزو، ایک تمنا، ایک خواہشِ دیرینہ ہے کہ کبھی مل بیٹھیں۔"

مل بیٹھنے کا موقع ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء میں آتا رہا۔ ہم ہر سال کل ہند جشنِ ظرافت کے موقع پر خواجہ صاحب کو دعوتِ شرکت دیتے رہے، لیکن نہ تو وہ اپنی مصروفیتوں کی بنا پر پٹنہ آ سکے اور نہ میں ان کے بلاوے پر کبھی بمبئی جا سکا۔

ایک بار، خواجہ صاحب نے اپنے نورِ چشم کی شادی کا کارڈ بھیجا اور مجھے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ لیکن میں نے اس مرتبہ پھر اپنی عدم شرکت کی تلافی، ایک سنجیدہ نظم بھیج کر کی۔ خواجہ صاحب نے اس نظم کی رسید ان الفاظ میں بھیجی۔

"ہمارے لڑکے کی شادی میں آپکی شرکت نہ صرف باعثِ خوشی و شادمانی ہوتی۔ بلکہ پھر ملاقات اور بھی دلچسپ ہوتی۔ ہم نے تو سیمنار کئے، شادی رچائی، دعوت نامے دیئے، ہر طرح آپکو یہاں کھینچ لانے کی سعی کی، ناکام رہے۔ اس بار ایک اور سیمنار کر رہے ہیں، پاکستانی افسانہ نگاروں کے ساتھ، آپ کسی طرح اس میں شریک ہوتے تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ مگر آپ نے سفر ترک کر کے ہم سب پر ظلم کیا ہے۔ نہ معلوم یہ آپکی ضد کیسے ٹوٹے گی

جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے مناسب حال نظم ارسال
فرمائی ہے وہ سنہرے حروف میں لکھ کر فریم کروائی
جارہی ہے۔ ۲۵ راپریل کو یہاں پر شاندار ریسپشن
ہے۔ اس وقت شہر کے کسی خوش آواز سے اسے
پڑھوایا جائے گا اور آپ کی یاد تازہ کی جائے
گی۔ ہم اس کے لئے دل وجان سے مشکور ہیں۔"

خواجہ صاحب نے مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کا مجلہ 'نورس' بھی مجھے بھجوایا تھا، اور خواہش کی تھی کہ اُسے پڑھ کر میں اپنے تاثرات لکھ بھیجوں۔ یہ مجلہ اتنا نفیس چھپا تھا اور اس کے مضامین اتنے وقیع تھے کہ بے ساختہ دل سے واہ نکلی، اور مجھ سے جو کچھ ہوسکا، انھیں لکھ بھیجا۔ نورس کا نام جب 'امکان' میں تبدیل ہوا تو اس کا بھی ایک شمارہ خواجہ صاحب نے بھجوایا اور اس بار بھی خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے تاثرات لکھوں۔ یہ مجلہ بھی ہر اعتبار سے شاندار تھا۔ چنانچہ اسے پڑھنے کے بعد میں نے خواجہ صاحب کو اپنے منظوم تاثرات لکھ بھیجے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ منظوم خط، درج ذیل ہے۔

اے خواجہ و والیٔ "سمن زارِ" ظرافت
کل مجھ کو میسّر ہوئی امکاں کی زیارت
ممنونِ کرم ہوں کہ یہ خوش رنگ مجلّہ
بھجوایا ہے ناچیز کو از راہ عنایت
رعنائی و زیبائی میں نورس کا یہ ہمزاد
واللہ کہ ہے اک "گل و گلزارِ" صحافت
قامت بھی وہی ہے، قدِ موزوں بھی وہی ہے
آہنگ وہی ہے، وہی صورت وہی سیرت
ہے اہلِ نظر کے لئے جلوؤں کی گزرگاہ
الفاظ و معانی کا یہ دریائے لطافت
ہم راہ مضامین کے پڑھی، اس کی بھی روداد
کی آپکی نگرانی میں دفتر نے جو خدمت
اک شئے کی کمی اس میں نظر آتی ہے لیکن
جی چاہتا ہے عرض کروں گر ہو اجازت
جانی نہیں کیوں اس پہ نظر، اہلِ نظر کی
اک شعبۂ تنقید ہے جب طنز و ظرافت
اصنافِ ادب میں یہ کسی سے نہیں کمتر
اوروں سے کچھ اونچے ہی ہیں اسکے قد و قامت
افسانہ و تنقید و غزل، سب کا ہو چرچا
اس صنف پہ اُٹھے نہ مگر چشمِ عنایت!
جب غالبؔ و اقبالؔ پہ ہوتے ہیں سمینار
کیوں حضرتِ اکبرؔ، نظر انداز ہوں حضرت؟
یہ صنفِ ادب کوئی ہریجن تو نہیں ہے
سر جس کے منڈھی جائے چھوا چھوت کی لعنت
میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سب چیز نہ ہو۔ ہو
لیکن نہ ہو حق تلفیِ اربابِ ظرافت
امکاں کے اک گوشے میں ڈیکوڑے کا بھی بن ہو
دربار میں خواجہ کے ہو، اپنوں کی بھی شرکت
مُردوں ہی پہ کیوں داد کی بارش ہو ہمیشہ
زندوں پہ بھی بیداد کی قائم ہو روایت
ہوں پیاز کے چھلکے، بھی کبھی بحث کا مرکز
ہو "آدمی نامہ" پہ بھی کچھ وعظ و نصیحت
"گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی"

اس منظوم تبصرہ میں امکان یا ہمارا شترا اُردو اکیڈمی پر ہلکی سی تنقید تھی، لیکن خواجہ صاحب کی کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ انہوں نے مجھے فوراً جواب دیا، جو انگریزی میں تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں کہ آپ
کے مشورے (ظریفانہ ادب کی جانب بھی توجہ
دینے) پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ کسی سبب
سے یہ نکتہ نظر انداز ہوگیا۔ ہم اس کمی کو
پورا کریں گے۔"

کہتے ہیں کہ تحریر شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ خواجہ صاحب کی تحریر سے واضح ہوتی ہے۔ ہر چند کہ میں ان سے کبھی مل نہ سکا، مگر ان کی تحریروں میں ان کی شخصیت کے اتنے واضح نقوش میرے سامنے اُبھرے ہیں کہ ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ خواجہ صاحب سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ ان کی انشاء پردازی کا یہ سحر، کچھ ایسا جادو جگاتا ہے کہ قاری اور ان کے درمیان کی طبعی دوری ختم ہوجاتی ہے۔ اس منفرد خصوصیت کے پس منظر میں خواجہ صاحب کی پُرخلوص شخصیت، ان کی طبع رسا، اور ان کے قلم کا جوہر کارفرما ہے۔ اور میں مجتبیٰ حسین کے اس تجزیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتا ہوں کہ

"غفور صاحب جیسی شخصیتیں ہماری ادبی اور
تہذیبی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں۔"

پس نوشت

درج بالا تاثرات ماہنامہ چراغ (بمبئی) کے مدیر کی فرمائش پر دسمبر ۱۹۸۲ء میں قلمبند کئے گئے تھے، جبکہ وہ اپنے رسالے کا خواجہ عبدالغفور نمبر نکالنے کے لئے مضامین فراہم کر رہے تھے۔ اتنے میں ۱۹۸۴ء آگیا اور ہم لوگ ایک بار پھر پٹنہ میں جشنِ ظرافت کے انعقاد کی تیاریاں کرنے لگے۔ یوسف ناظم صاحب سے خبر مل چکی تھی کہ خواجہ صاحب کے پیر کا آپریشن ہوا تھا اور وہ کئی دنوں تک ہسپتال میں داخل رہے تھے لیکن حسب معمول اس بار بھی میں نے انھیں جشنِ ظرافت میں شریک ہونے کے لئے دعوت نامہ بھیجا۔ فوراً جواب آیا کہ "اگر ڈاکٹر دول نے اجازت دی تو ضرور شرکت کروں گا" جی خوش ہوا کہ اب نیم ملاقاتیں، ملاقات میں تبدیل ہونے والی ہیں۔

۷، ۸ / اپریل کو ہمارا دو روزہ پروگرام تھا۔ ایک دن قبل ٹیلی گرام ملا کہ آرہا ہوں۔ چنانچہ ۷ / اپریل کی صبح کی فلائٹ سے خواجہ صاحب پٹنہ پہنچے اور ایروڈروم سے سیدھے گورنمنٹ اردو لائبریری میں تشریف لائے، جہاں سیمنار کا سشن ہو رہا تھا۔ آتے ہی بغل گیر ہو کر فرمانے لگے "واہی صاحب میں محض آپ سے ملنے کے لئے پٹنہ آیا ہوں۔ ایک دیرینہ خواہش تھی جو آج پوری ہوئی۔" پھر مذاکرات میں شریک ہو گئے۔ سیمنار کے بعد وہیں لنچ کا انتظام کیا گیا تھا۔ دورانِ طعام اُردو کے مسائل پر باتیں کرتے رہے، گفتگو میں بڑی خوداعتمادی تھی۔ وہاں سے ٹورسٹ بھون واپس آئے جہاں قیام کا انتظام تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد، بہار انجمن ترقی اردو کی جانب سے دیئے جانے والے استقبالیہ میں گئے۔ وہاں سے ساہو جین ہال پہنچے جہاں ۷ بجے شام سے مزاحیہ نثری نشست کا پروگرام تھا۔ دیگر طنز نگاروں

کے ساتھ اپنا ایک مضمون اور چند لطیفے سنائے، خوش خوش قیام گاہ واپس آئے۔ دوسری صبح (۸؍اپریل) کوئی سات بجے میں ٹورسٹ بھون پہنچا۔ خواجہ صاحب جشنِ ظرافت میں آئے ہوئے بعض مہمانوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھے، چہرے پر اطمینان اور مسرت کے آثار نمایاں تھے، اُردو کے فروغ کے سلسلے میں انہوں نے جو منصوبے بنائے تھے، اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے، اس کا خاکہ پیش کر رہے تھے، چائے بھی پیتے اور پلا تے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کی میز پر انہوں نے ہمارے سمینار اور مزاحیہ نثری نشست کی تعریف کی اور کہنے لگے کہ پٹنہ آکر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب بمبئی جاکر ان تجربات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا۔ اس کے بعد کچھ دیر انہوں نے اپنے کمرے میں آرام کیا۔ سہ پہر کو پٹنہ کی سیر کے لئے نکلے گنگا ندی پر ایشیا کا جو سب سے بڑا پل تعمیر ہوا ہے، اُسے دیکھا، پرانے تاریخی مقامات کی سیر کی، اشوک اور چندر گپت موریا کے دور کے جو کھنڈرات اور آثار تھے، انھیں دیکھا اور آفتاب غروب ہونے سے کچھ قبل ہوٹل واپس آگئے، بہت خوش تھے، چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد بہار اردو اکادمی کی جانب سے دیئے جانے والے عصرانے میں شرکت کی۔ اپنے دیرینہ دوست سید شہاب الدین دسنوی صاحب کی قیام گاہ پر گئے، میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ لیکن ۷ بجے شام سے مزاحیہ مشاعرہ شروع ہونے والا تھا، وزیر اعلیٰ افتتاح اور کنور مہندر سنگھ بیدی صدارت کرنے والے تھے، اس لئے میں دسنوی صاحب کے یہاں انھیں چھوڑ کر مشاعرہ گاہ چلا گیا۔ مشاعرہ میں وہ مستقل طور سے سامعین کی صف میں بیٹھے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پروگرام کے اختتام پر ہوٹل واپس گئے۔

دوسرے دن یعنی ۹؍اپریل کو صبح کی فلائٹ سے ان کی واپسی تھی۔ میں سویرے سے ہی ان کے کمرے پر پہنچ گیا۔ وجاہت علی سندیلوی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ اُردو سکھانے کے لئے کوئی آسان قاعدہ مرتب کرنے کے سلسلے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ناشتے کی میز پر انہوں نے صرف چائے پی اور اُٹھ کھڑے ہوئے ایروڈرم جانے کا وقت ہو گیا تھا، کار پر سوار ہونے سے قبل بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے، جشنِ ظرافت کے خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہونے پر مبارکباد دی، امکان کے تازہ شمارے کے ساتھ اپنی خوبصورت کتاب 'طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ' عنایت کی اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ "واہی صاحب آپ ایک بار بمبئی آسیئے۔"

بمبئی پہونچ کر خیریت کا خط لکھا اور پٹنہ کے سفر کے تجربات پر مسرت کا اظہار بھی کیا۔ وقت گذرتا گیا۔ ۲۸؍اپریل کی منحوس شام تھی، میں گھر کے بچوں کے ساتھ بیٹھا، ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا، نیوز بولیٹن کا وقت تھا۔ اچانک آواز آئی ۔ "خواجہ عبدالغفور کا جو اُردو کے ایک ممتاز ادیب تھے، دورانِ سفر انتقال ہو گیا"۔ یہ خبر بجلی کے جھٹکے کی طرح دل و دماغ کو جھنجھوڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے ذہن ماؤف ہو گیا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ دوسری صبح ایک اردو روزنامے نے کسی قدر تفصیل سے اس

المناک حادثے کی خبر شائع کی ۔ اور اس طرح ایک روشن چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔
اب تو تا زندگی یہی حسرت رہے گی کہ ؎
"ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے"

— —

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ رو۔
دھرگھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹
بہرحال	"	مضامین	۷
بالآخر	"	"	۱۴
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۰
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	"	۱۲
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	"	۱۲

وجاہت علی سندیلوی*

کون جاتا ہے یہاں سے آج منہ موڑے ہوئے
درد کا اک سیل ہے ساری فضا گھیرے ہوئے

خواجہ عبدالغفور جیسے فرض شناس، مخلص، اور فرشتہ سیرت انسان ہمیشہ دنیا میں کم یاب رہے ہیں اور آج کل کے دور میں اُنہیں قریب قریب نایاب کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ایسے ایثار پیشہ لوگ جو اپنی خوشیوں پر دوسروں کی خوشیوں کو ترجیح دیں اب دیکھنے کو کہاں ملتے ہیں اور اُنھیں کھو کر ہی ہم اُن کی عظمت کا احساس کر پاتے ہیں۔ ؎

اپنے حصّے کی بھی غیروں کو پلا کر اُٹھ گیا
رند ایسا بھی کوئی، کیا اپنے میخانے میں تھا؟

ہلکا شہابی رنگ جو خون کی کمی کی وجہ سے مائل بہ زردی تھا۔ دل کش اور پروقار چہرہ، بڑی اور گہری آنکھیں اور اُن پر خوبصورت عینک، کُشادہ پیشانی، ذکاوت کی غمازی کرتی ہوئی ستواں ناک، سخت ارادے کا ضامن مضبوط جبڑا آنکھوں کے ساتھ ہنستے ہوئے مخروطی ہونٹ، سلجھی ہوئی باتیں شُستہ انداز تخاطب، نرم لہجہ، نشست و برخاست کے دل آویز طور طریقے۔ واقعی خواجہ صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش اور جاذب توجہ تھی اور اُن سے مل کر بیک وقت یہ احساس ہوتا کہ آپ ایک زیرک اور درّاک اعلا آفیسر یار ہتا، ایک بہت پڑھے لکھے عالم اور دانشور اور ایک بہت حساس اور درد مند دوست اور انسان سے مل رہے ہیں۔ اور ان مختلف شخصیتوں میں انسان سب پر حاوی محسوس ہوتا۔

خواجہ صاحب سے غائبانہ تعارف کافی دنوں سے تھا لیکن صرف اس قدر کہ اُن کی کوئی کتاب چھپتی تو وہ مجھے اور میری کوئی نئی چھپتی تو میں اُنہیں اس کی ایک جلد بھیج دیا کرتے اور رسمی طور سے ایک دوسرے کے لیے کچھ توصیفی کلمات کہہ دیا کرتے۔ اُن کی نئی کتاب ”اردو طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ“ میں اُنھوں نے جہاں میرا تذکرہ کیا ہے

کسی غلط فہمی کی بنا پر کچھ ایسی کتابیں بھی مجھ سے منسوب کر دی ہیں جو میری لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ میں نے ان ناکردہ گناہوں کو اپنے نامۂ اعمال میں دیکھ کر اُن سے فریاد کی تو فرمایا "اب تصحیح کی یہی صورت ہے کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا جائے یا آپ ہی زحمت کر کے اس عرصے میں یہ ناکردہ گناہ بھی کر ڈالیئے"۔

طنز و مزاح پر خواجہ صاحب کی تاریخی، تنقیدی، اور نفسیاتی گرفت، گیرائی اور گہرائی کی حامل تھی اور اسی موضوع پر اُنہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ ان کا اس میدان میں سب سے بڑا کارنامہ دنیا بھر کے لطیفوں کو جمع کر کے اُردو میں منتقل کر دینا تھا۔ یہ کام سہل ممتنع قسم کا ہے یعنی دیکھنے میں تو بہت آسان لیکن کرنے بیٹھے تو لوہے لگ جائیں۔ نہیں معلوم کتنے حضرات نے اس میدان میں بڑی ہمت سے قدم رکھا لیکن جب اس کے نشیب و فراز پر نظر کی تو جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ خواجہ صاحب نے اس کام کو بڑی توجہ اور لگن سے کیا اور اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کر دکھایا ہے۔ ؎

ریاض و سخت کوشی نے کیئے اہل نظر پیدا
صدف کے قلب کی گرمی سے ہوتا ہے گہر پیدا

خواجہ صاحب سے میری پہلی اور صد حیف کہ آخری ملاقات ۷ اور ۸ اپریل ۸۴ء کو پٹنہ میں محترمی رضا نقوی واہی اور مکرمی شفیع مشہدی کے منعقد کیئے ہوئے جشن ظرافت میں ہوئی تھی۔ ٹورسٹ بھون میں میرا کمرا اُن کے کمرے سے قریب ہی تھا اور دونوں دن ہم صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد سے رات میں سونے کے وقت تک شاید بہت تھوڑی ہی دیر کے لیئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے ہوں۔ جشن ظرافت کی کئی تقریبات کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کے جلسے اور بہار اردو اکیڈیمی کے استقبالیئے کی ادبی مصروفیات سے وقت نکال کر ہم لوگ ساتھ ہی ساتھ پٹنہ کا پل، اشوک میوزیم، پاٹلی پتر کے کھنڈر اور شہر کی لائبریریوں کو بھی دیکھنے گئے۔ اتفاق سے ۸ اپریل کو اتوار ہونے کی وجہ سے خدا بخش لائبریری جس کو کئی دفعہ دیکھنے کے باوجود ہم دونوں ہی کو دیکھنے کا اشتیاق تھا، بند تھی۔ مکرمی ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے ملنے کی بھی تمنا پوری نہیں ہوسکی۔ اخلاق الرحمان قدوائی گورنر بہار سے بھی ملنے کی کوشش کی گئی لیکن معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب اس تحریک کے حامی تھے کہ اردو کے کئی ہم آواز حروف میں سے کسی ایک آواز کے لئے صرف ایک حرف کا انتخاب کر لیا جائے۔ اُن کی رائے میں اُردو سکھانے کی راہ میں ہم آواز حروف بڑی دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں جو ایک مضمون قومی آواز میں لکھا تھا اُس کو اُنہوں نے پڑھا تھا اور اُنہوں نے اپنی مہاراشٹرا اکیڈیمی کے ترجمان 'امکان' کے لئے ایک ایسے ہی مضمون کو لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی۔

سوائے اس وقت کے جب خواجہ صاحب اپنے کمرے میں ہوتے لوگ، جن میں بیشتر ان کے مداح اور قدردان ہوتے اُنہیں گھیرے رہتے لیکن وہ اس قسم کے 'گھیراؤ' کے کچھ عادی نظر آتے۔ وہ ذرا بھی پریشانی کا اظہار کیے بغیر ہر ایک کی بات

کو غور سے سُنتے اور اُس کو بہت نرم لہجے میں انتہائی خوش اخلاقی سے جواب دیتے۔ فطرتاً وہ کم آمیز معلوم ہوتے۔ وہ سُنتے زیادہ اور بولتے کم تھے۔ اور جب اُن سے براہ راست کوئی سوال کیا جاتا تو وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں انہوں نے مہاراشٹرا میں اردو کے مستقبل پر بڑی بصیرت افروز تقریر کی تھی۔ ۷ اپریل کی شب میں انہوں نے جشن کا ظرافت کی نثری نشست میں بڑے پُر لطف اور تازہ بہ تازہ لطیفے سُنا کر ساری محفل کو زعفران زار بنا دیا تھا — حیف صد حیف اس وقت کسے خبر تھی کہ چند ہی دنوں میں یہ دیدہ زیب شخصیت منوں مٹی کے ڈھیر میں دفن کر دی جائے گی اور یہ موہنی صورت اور یہ شیریں لب و لہجہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائیں گے

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں !!

لیکن غالباً خواجہ صاحب جیسے لوگ مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے کارناموں اور تخلیقات اور اپنے چاہنے والوں کی یادوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

مناظر عاشق ہرگانوی
(مارواڑی کالج، بھاگلپور، بہار)

"خواجہ عبدالغفور کے نام"

طنز و ظرافت پھول بنفشی
باتیں اُن کی
چڑھتی جوانی
جن کی باس نویلی!
ان کے مضموں
سپنے سہانے
ان کا لہجہ
شبنم بھیگا
رُت کی سبز پہیلی!
وہ کیا بچھڑے
بچھڑ گئے ہیں
روشنیوں کے چاند ستارے
اپنی مٹی
اپنا ساحل
دشتِ حقیقت
اور شگوفے
طنز و ظرافت
پھول بنفشی!!

عبدالحفیظ خلشؔ تسکینی (اچلپور)

دل پر نہ کوئی پا سکے قابو وہ سانحہ

دل پر نہ کوئی پا سکے قابو وہ سانحہ
آنکھوں میں آئیں خون کے آنسو وہ سانحہ
چہرے اُتر گئے ہیں گلوں کے چمن میں آج
روتی ہے اہلِ قدر کو خوشبو وہ سانحہ
معمولی بات تو نہیں اک قدرداں کی موت
بیوہ سی آج ہو گئی اُردو وہ سانحہ
خواجہ عبدالغفور راہیِ ملکِ عدم ہوئے
چھائی گھٹا ملال کی ہر سو وہ سانحہ
کھینچا اُنہوں نے خدمتِ اردو سے آج ہاتھ
مندر کو جیسے چھوڑ دے سادھو وہ سانحہ
"وہ روٹھ کر چلا گیا شانہ بکف تھا جو"
اُلجھیں گے اور گیسوئے اُردو وہ سانحہ
خواجہ کی موت ایسی ہے دراصل حشر تک
جس پر بہاتے جائیں گے آنسو وہ سانحہ
ماؤف کر کے رکھ دیئے جس نے دل و دماغ
کیسے بھلا لکھے گا خلشؔ تو وہ سانحہ

عاتق شاہ

خواجہ، میری گلی میں

خواجہ عبدالغفور کی موت بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ لیکن ایسا کوئی ڈرامائی عنصر ان کی زندگی میں تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ دیکھنے میں وہ سیدھے سادھے تھے۔ جیسے تھے ویسے نظر آتے تھے۔ صحت بھی اچھی خاصی تھی۔ خوشی خوشی بمبئی جانے کے لئے ٹکٹ کٹوایا۔ اور ٹرین میں بیٹھ گئے۔ لیکن بمبئی پہنچے۔ اور نہ حیدرآباد لوٹے۔ بیچ راستے میں سے کسی اور لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ ضرور بکنگ کلرک نے کچھ گڑبڑ کی۔ کسی بھول یا غلط فہمی کی بنا پر اُن کے ہاتھ میں کسی نامعلوم مقام کا ٹکٹ تھما دیا۔ اور انھیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ یہ اُن کا آخری سفر ہے!

لسانی بنیادوں پر جہاں ملک کی تقسیم ہوئی وہیں ٹائپ رائٹر اور کرسی سے لے کر انسانوں کی بھی تقسیم عمل میں آئی۔ اور خواجہ عبدالغفور کو مہاراشٹرا کے حوالے کیا گیا۔ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد حیدرآبادیوں کو پتہ چلا کہ اُن کا ہم وطن غفور نامی ایک اہم شخص اب اُن کے ساتھ نہیں رہا۔ پتہ نہیں یہ غفور صاحب کا المیہ تھا یا حیدرآباد کا۔ لیکن یہ المیہ ضرور ہے کہ ان کی موت کے بعد بعض حلقوں میں یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ غفور صاحب بڑے مزاح نگار تھے یا چھوٹے؟

ان تمام سوالوں کا جواب تو ادب کا مورخ دے گا۔ لیکن ایسی باتیں کرنے والے معصوم دوستوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ صرف اُن کے نام باقی رہ جاتے ہیں جو اپنی ذات اور نام سے بلند ہو کر کام کرتے ہیں۔ اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ انھیں اس کا کیا صلہ ملے گا!

میں بھی خواجہ عبدالغفور سے اُس وقت واقف ہوا جب وہ بمبئی پہنچ چکے تھے۔ اور پہنچتے ہی جنھوں نے اپنی علمی، ادبی اور تہذیبی مصروفیتوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے اُن تمام، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے ذاتی

دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیا تھا جو کسی نہ کسی وجہ سے شہر بمبئی میں جمع ہوگئے تھے!

بھئی، جواب نہیں ان کا —— یہ تو بڑے کمال کے آدمی ہیں!

اندر کا آدمی مجھ سے کہتا

اور میں سوچتا رہتا کہ یہ نایاب شئے حیدرآباد میں اب تک کہاں چھپی رہی!

اپنے انداز میں خواجہ عبدالغفور نے اُردو کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی خدمت کی۔ اُردو اکیڈمی مہاراشٹرا کے سکریٹری کی حیثیت میں کئی مستحق ادیبوں، شاعروں اور اُن کی بیواؤں کی خدمت میں موٹی موٹی رقومات کے چک پیش کئے غرض جتنا بھی بن پڑا اُردو کی خدمت کی۔ اُردو کو کچھ دیا، اُردو سے لیا نہیں۔ حالانکہ لوگ اُردو کے نام سے اپنے گر تلے ہوئے کھنڈر جیسے گھروں کو بڑی اور اونچی عمارتوں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اور آخر میں نعرہ لگاتے ہیں، اُردو زندہ باد!

اور جواب میں پبلک تالیاں بجاتی ہے!

اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ان نعروں کے پیچھے کتنی اُونچی اونچی چمکیلی عمارتیں خاموش کھڑی ہیں!

میں خواجہ عبدالغفور کے تعلق سے کیا عرض کروں۔ کئی برسوں تک اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ملاقات کیا ہوتی میرا اُن سے تعارف ہی نہ تھا۔ اور نہ میں نے اُنھیں کبھی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی مہینوں میں اُن کی آمد کے تعلق سے ایک آدھ خبر مقامی اخبارات میں پڑھ لیتا۔ اور شاید ایک آدھ تصویر بھی کسی رسالے میں نظر سے گذری تھی لیکن تصویر سے کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ کبھی کبھی تصویر اصل شخصیت پر پردہ ڈال دیتی ہے، لیکن ایک دن یہ تصویر مسکراتی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھی!

کھلتا ہوا رنگ، چوڑی پیشانی، اونچی ناک اور چمکتی ہوئی آنکھیں ——————

میں خواجہ عبدالغفور ہوں —————— اُنھوں نے اپنا تعارف کرایا!

میں خواجہ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بغیر کسی دوستی، ملاقات اور تعارف کے انھوں نے مجھ غریب تک پہنچنے کی زحمت کی۔ واقعی یہ بڑے آدمی ہیں، جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا —!

اور بڑے آدمی کی تعریف میرے پاس یہی ہے جو دوسروں کی خوشیوں میں خود کو شامل کرلے، اور غموں کو بانٹ لینے کی کوشش کرے۔ حالانکہ غم بانٹے نہیں جاسکتے۔ لیکن غموں اور زخموں پر پھاہا تو رکھا جاسکتا ہے!

صبح کے گیارہ بج چکے تھے۔ وارڈ کی نرسیں ایک مریض سے دوسرے مریض تک پہنچنے کے لئے تیز تیز قدم اُٹھا رہی تھیں۔ ڈاکٹر اپنے اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد لوٹنے والے تھے۔ میں اپنے بستر پر چت لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ غفور صاحب پر نظر پڑتے ہی کچھ حیرانی اور کچھ اظہارِ تشکر کے ملے جلے جذبے کے ساتھ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

نہیں — نہیں — ایسا مت کیجئے۔!

غفور صاحب نے کہا۔ اور میرے پائینتی سے دائیں طرف کی اُس چھوٹی سی تنگ گلی میں آکر کھڑے ہو گئے۔ جہاں ایک کپڑے کا اسکرین اسٹانڈ دو بستروں کو آپس میں جُدا کرتا تھا۔

خواجہ، میری گلی میں!

میں انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ پھر سلام کے لیے میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ بجائے جواب کے وہ مجھ پر جھکے۔ میرے ہاتھ کو ہلکا سا دبایا۔ اور میرے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے اسٹول کو اپنی طرف کھینچ کر بیٹھ گئے۔

پہلی بار وہ مصطفےٰ کمال کے ساتھ آئے دوسری بار قدیر زماں کے ساتھ اور تیسری بار اپنی بیگم کے ساتھ۔ اور چوتھی بار تنہا آئے۔ ہر دوسرے، تیسرے دن وہ آتے اور عام وارڈ کے ایک بڈ کے پاس کی تنگ گلی میں اسٹول پر بیٹھ جاتے۔ اور میری دلجوئی کرتے۔ کتابیں اور رسائل پڑھنے کے لئے دیتے۔ اور کہتے، آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ صرف کولسٹرل کا پرسنٹیج بڑھ گیا تھا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں ——————

ہارٹ اٹیک تو مجھ پر ہوا تھا۔ آج سے بیس سال پہلے —————— اُس وقت میں غضب کا چین اسموکر تھا۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر میں نے یک لخت سگریٹ چھوڑ دی۔ آپ بھی چھوڑ دیجئے۔ —————— پھر کچھ نہیں ہوگا۔ دیکھئے نہ مجھے —————— اچھا خاصا ہوں —————— !!

بیس سال پہلے —————— میں جیسے گنگناتا۔

اور خواجہ عبدالغفور کو دیکھنے لگتا!

عثمانیہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد بھی میں اُنھیں دیکھتا رہتا۔ ادبی میٹنگوں میں، اخباروں کے کالموں میں، اور مہاراشٹرا اکیڈمی سے شائع ہونے والے رسالہ "امکان" کے صفحات پر۔ اور اگر وہ کہیں نظر نہ آتے تو میں بے چین ہو جاتا۔ اور مصطفےٰ کمال سے پوچھ لیتا، خواجہ عبدالغفور کیسے ہیں؟

کمال پلٹ کر کہتے، اچھے ہیں!

میں خوش ہو جاتا اور خود سے کہتا، ہاں کیا ہوا انھیں۔ اچھے خاصے ہیں۔ ذرا کولسٹرل بڑھ جائے تو ڈاکٹر لوگ اسے بڑی آسانی سے ہارٹ اٹیک کہہ دیتے ہیں۔ بھئی یہ بھی کوئی بات ہے۔ ذرا غفور صاحب کو دیکھئے —— اچھے خاصے ہیں —— پہلا ہارٹ اٹیک انھیں بیس سال پہلے ہوا تھا —— ذرا قوت ارادی چاہیئے —— بیس سال —— تیس سال —— سو سال —— میں جیسے گنگناتا!

جب کبھی میں کمال سے خواجہ عبدالغفور کی خیریت پوچھتا تو وہ اسے میری اخلاقی قدر پر محمول کر کے جواب دیتے۔ اور انھیں آج تک پتہ نہ چل سکا کہ خواجہ عبدالغفور میری کمزوری بن چکے ہیں۔ میں اصل میں کمال سے خواجہ عبدالغفور کی نہیں بلکہ اپنی خیریت پوچھ لیتا تھا۔ حالانکہ اپنے جواں سال بھائی ماجد شاد کی اچانک

…ت کے بعد میں اندر سے بُری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ لیکن خواجہ عبدالغفور کو دور سے اور قریب سے دیکھنے کے بعد اطمینان ہو جاتا تھا۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ ہر شئے اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن آج یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی شئے کھو دی ہے!

اب میں مصطفٰے کمال سے کیسے پوچھوں گا کہ خواجہ عبدالغفور کیسے ہیں؟

——

غفور صاحب کو حیدرآباد کی مختلف انجمنوں کا خراجِ عقیدت

حیدرآباد ۱۶ر مئی۔

ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ عابد روڈ پر ۱۶ر مئی کو شام مختلف ادبی اور تہذیبی انجمنوں کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اردو نے صدارت کی۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ اور جناب محمود انصاری مُدیر منصف نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مسرز محمد منظور احمد، عابد صدیقی اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر پی آئی بی، شریف اسلم (صحافی مقیم جدہ) طیبہ بیگم، سید مصطفٰے کمال مُدیر شگوفہ، دہلی کے ممتاز شاعر مہدی نظمی، خواجہ محی الدین (ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی) کنول پرشاد کنول، جلیل امرت (ورنگل)، سشیشا چاری ایڈوکیٹ کے علاوہ مہمانانِ خصوصی اور صدر جلسہ نے جناب خواجہ عبدالغفور کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تقریریں کیں اور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جلسہ کی کاروائی عابد سلطان شاہین نے چلائی۔ جناب محمود انصاری نے تجویز رکھی کہ ماہنامہ شگوفہ کا خواجہ عبدالغفور نمبر شائع ہونا چاہیئے نیز غفور صاحب نے کم سے کم مدت میں ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ اردو سکھانے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا اس سلسلہ میں نظامس اردو ٹرسٹ اور شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے تعاون سے اس اسکیم کو روبۂ عمل لایا جائے۔ آخر میں قرارداد تعزیت پیش کی گئی۔

سیدہ طیبہ بیگم

"اچھا! تو خدا حافظ!"

دیر تک کانوں میں غفور صاحب کی آواز گونجتی رہی۔ "اچھا تو خدا حافظ"۔ کل تک یہیں اسی سرزمین سے یہ آواز آئی تھی اور آج یہی آواز کہیں دور فضاؤں میں گم ہوگئی۔ یہ اس قدر اچانک اتنی دور کیسے پہونچ گئی؟ کیا ہوا غفور صاحب کو ؟ کہاں چلے گئے وہ ؟ طنز و مزاح کی دلفریب دنیا سے کیسے انہوں نے رشتہ توڑ لیا ؟ — کیا یہ حقیقت ہے ؟ کیا "منصف" کے اوراق میں چھپی انتقال پُر ملال کی خبر صحیح ہے ؟ نہیں — مجھے یقین نہیں آتا کہ ان کی زندگی کی سانسوں کی آمدورفت یوں اچانک منقطع ہوگئی ہے۔ دیکھ تو لیجئے کہ کہیں مذاق تو نہیں کیا ہے، غفور صاحب نے !! — لیکن اخبار کے جلی حروف کہہ رہے تھے، یہ حقیقت ہے۔ دفعۃً جذبات نے آنسو کے سوتے ختم کر دیئے۔ یہ کیسا اُلٹا مذاق ہوگیا۔ زندگی کو ہنسانے والا، گدگدانے والا، کیا موت کو تھوڑی سی گدگدی نہیں کرسکتا تھا؟ اسے اتنی بھی مہلت نہیں مل سکتی تھی کہ کچھ دیر اپنی صحبت سے موت کو محظوظ کرسکے ؟ اتنے بڑے مزاح نگار ہوکر موت کے سامنے ہار مان لی۔ زندگی کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ! نہیں غفور صاحب یہ کیا کردیا آپ نے ؟ یہ کیسا مذاق ہوگیا۔ کل تک آپ ہم اردو والوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور آج آپ کو "مرحوم" کہہ کر پکاریں ؟ یہ کیسے یقین کرلیں غفور صاحب کہ آپ کا وجود مٹ گیا۔ کل آپ ہم سے باتیں کررہے تھے۔ آج آپ نے چپ کیوں سادھ لی ؟ کہاں گئی آپ کی آواز، کہاں گئی آپ کی ہنسی اور قہقہے ؟ دل نہیں مانتا کہ آپ نہیں رہے۔ اور مسکراہٹوں کا دامن تار تار ہوگیا۔ ابھی ۳۰ مارچ کو میں نے "چراغ" کے لئے شاہد ندیم صاحب کی فرمائش پر مضمون بھجوایا تھا۔ "طنز و مزاح کے پروردگار"۔ اس قدر جلد میرا قلم ماتمی لباس پہن لے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ شاید پروردگارِ عالم کو یہ پسند نہیں آیا کہ میں نے آپ کو پروردگار لکھ دیا۔ کیسے کہوں خدایا کہ یہ شرک کا جملہ نہیں تھا۔ کیسے کہوں کہ یہ تو صرف ایک قلمکار کی خدمت میں دوسرے قلمکار کا نذرانۂ عقیدت تھا کہ اس نے طنز و مزاح کو پروان چڑھایا تھا۔ شاید تجھے بُرا لگا میرے خدا کہ خاک کا پتلا پروردگار کیسے بن سکتا ہے۔ اور تو نے اسے خاک میں ملا دیا۔ کیا

یہ میرے قلم کا قصور تھا کہ تو نے انھیں ہم قلمکاروں سے چھین لیا ! اگر یہ سچ ہے تو میں اس کی قصور وار ہوں۔ ایک بار پھر انھیں اس اردو دنیا میں لوٹا دے۔ ایک بار انھیں پھر یہ کہنے دے کہ وہ اُردو کو چلانے آئیں گے۔ اُنہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ " میں دوبارہ آؤں گا ! اپنی کتاب جو مجھے آپ کو دینی ہے "۔ آخر تحفہ میری نذر کرنے والے کو مجھے آخری سلام تو کرلینے دے۔ ایک بار شائستہ آواز میں ان سے سُن لینے دے " آداب عرض ہے ! کیسی ہیں آپ ! " غفور صاحب چلے گئے اور ہم یہ بھی نہ کہہ سکے کہ غفور صاحب آپ ہمارے ہیں۔ بمبئی والوں نے انھیں اپنا لیا۔ حیدرآباد کی مٹی میں اتنی کشش نہیں تھی کہ وہ انھیں روک لیتی، ان پر اپنا حق جتاتی کہ یہ خاکی تو میرا ہے۔ اسے یہیں آسودۂ خاک ہونا ہے۔ بمبئی اور حیدرآباد کی رسہ کشی میں چلتی ٹرین میں دونوں ملکوں کے بیچ دو منزلوں کے درمیان ملک الموت نے انہیں اپنی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ وہ تصفیہ نہ کرسکے کہ وہ کس کے ہیں اور کہاں رہیں ! بمبئی کی بزم آرائیاں بمبئی کی اُردو اکیڈیمی، بمبئی کے قدرداں جانتے تھے کہ وہ ان کے ہیں۔ بمبئی نے انہیں اپنایا۔ وہ بمبئی کی ادبی محفلوں کی روحِ رواں تھے۔ حیدرآباد میں ان کی روح کیسے مقیّد ہوسکتی تھی۔ ان کی سرشت میں بڑے وفاداری تھی، خلوص و محبت تھی۔ وہ ایک عظیم شخص تھے اور بمبئی نے ان کے مقام کو پہچانا تھا۔ ان کی زندگی میں ان کی عظمت اور صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا، پھر کیسے وہ انہیں اپنی خاک سے جُدا کرتی ! اور ملک الموت نے اس کا تصفیہ کردیا کہ وہ کس کے تھے شاید ایک دن کی تاخیر سے وہ روانہ ہوتے تو سرزمینِ دکن ان کا دامن پکڑ لیتی۔ لیکن نہ دن ٹلا نہ وقت اور نہ نفس ہی رُک سکی۔ ایک آواز کھو گئی، چلتی ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ میں ایک بے چین جسم دل تھام کر تڑپ کر رہ گیا۔ غفور صاحب کیا گئے۔ محسوس ہوا کہ سعد ہاشمی دوبارہ مرگئے۔ رشید احمد صدیقی پھر ایک بار چل بسے۔ یہ وہ شخصیتیں تھیں جن میں زندگی ہر دھڑکن کے ساتھ ہنستی اور چلتی تھی۔ جنھیں میں نے بہت قریب سے دیکھا، پڑھا اور ان کے کردار سے متاثر ہوئی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے ایسے ایسے چپکے چپکے آنکھیں موندلیں کہ آج بھی یقین نہیں آتا، اور نہ یہ ماننے کو جی چاہتا ہے کہ غفور صاحب اب نہیں رہے۔ قلم خونچکاں ہے، خیالات منتشر اور دل پریشان۔ موت ایک حقیقت ضرور ہے لیکن بے حد سنگدل اور ظالم۔ یہ نہ معلوم تھا کہ یوں اچانک دبے پاؤں ایسی زندہ دل، پُرخلوص، پرشفقت شخصیت کو دبوچ لے گی کہ خود مزاح بھی چیخ اُٹھے گا۔ اور طنز انگشت بدنداں رہ جائے گا کہ کہاں چلے گئے خواجہ عبدالغفور؟ مگر ایسی بھی کیا بے مروتی ہوگئی غفور صاحب کہ آپ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ اپنے وطن کی خاک آپ کے ایک نقشِ قدم پر سر جھکانے کی تمنا لئے کھڑی ہے۔ لوٹ آئیے غفور صاحب۔ ہم نہیں مانتے کہ کہیں کسی تاریک گوشے میں چھپ گئے ہیں۔ آپ کی باغ و بہار شخصیت تو اُجالے بکھیرتی تھی۔ یہ کیسے مان لیں کہ اب آپ ہم میں نہیں رہے۔ ہم آپ کو آپ کے لالہ زاروں، سمن زاروں اور گلزاروں میں ہی ڈھونڈ لیں گے غفور صاحب ! ۔

اچانک کہیں آس پاس سے آواز آئی۔ " اچھا ! تو خدا حافظ "

تب آنسوؤں کی جھڑی نے بتایا کہ ہاں غفور صاحب واقعی چل بسے اور یہی آنسو انکی خدمت میں میرا نذرانۂ عقیدت ہیں۔

——

خواجہ کریم الدین
بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد

خواجہ عبدالغفور صاحب کے ساتھ میرا آخری سفر

[خواجہ کریم الدین صاحب، خواجہ عبدالغفور صاحب مرحوم کے رشتہ دار ہیں۔ مرحوم کو خواجہ کریم الدین صاحب سے خاص لگاؤ تھا۔ سفر ہو کہ حضر وہ اکثر انھیں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اور کریم الدین صاحب بڑی مستعدی کے ساتھ خواجہ صاحب مرحوم کے کام انجام دیا کرتے تھے حیدرآباد تا بمبئی، خواجہ صاحب کے آخری سفر میں بھی بیگم حبیبہ غفور کے ساتھ کریم الدین صاحب شریکِ سفر تھے۔ ہماری خواہش پر موصوف نے اس المناک سفر کی تفصیل قلمبند کی ہے
——— مدیر]

یوں تو میں خواجہ صاحب کا پچھلے کئی برس میں کئی مقامات کا ہمسفر رہا ہوں۔ اتفاق سے ان کے حیدرآباد سے بمبئی کے آخری سفر میں بھی ساتھ رہا۔ ۱۹۵۳ء اور ۵۴ء میں جب کہ خواجہ صاحب ڈنڈی پراجکٹ، جو حیدرآباد سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے، اپنی ملازمت کے سلسلے میں فنی مشوروں کے لئے جایا کرتے تو اکثر مجھے بھی ساتھ رکھ لیا کرتے حالانکہ اس وقت میں کم عمر تھا۔ وہاں اکثر تالاب کی کنال میں پانی چھوڑ واکر میں اور غفور صاحب تیرا کرتے تھے۔ ڈنڈی سے قریب ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس پر ایک خوبصورت سا بنگلہ "نیلم گڑھ" کے نام سے بنا ہوا ہے جس میں ہم ٹھہرا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب تیراکی، گھوڑ سواری، نشانہ بازی (شکار) اور کئی گیمس خاص طور پر فٹبال کے اچھے مشاق رہے ہیں۔ جب ان کا تبادلہ بمبئی ہوا تو اکثر دفعہ بمبئی سے بذریعۂ کار حیدرآباد آتے اور جاتے وقت مجھے بھی ساتھ لیا کرتے۔ جب کلکٹر کی حیثیت سے عثمان آباد تبادلہ ہوا تو عثمان آباد کے پہلے سفر میں بھی میں ان کے ساتھ تھا۔ عثمان آباد کے قریب ہم لوگوں نے خرگوش، ہرن، چکارے، تڑس (ہائنہ) اور بور بچہ (بیاتھر) کا شکار کیا۔ پھر جب شولاپور تبادلہ ہوا تو ان کے ساتھ ریل اور موٹر میں کئی دفعہ ہمسفری کا موقعہ ملا۔ خواجہ صاحب نہ صرف حیدرآباد، بمبئی بلکہ ہندوستان کے کئی بڑے بڑے شہروں کے علاوہ امریکہ جاپان

سنگاپور، سعودی عربیہ اور امارات کے عوام میں بہت مقبول شخصیت رہے ہیں۔ شروع ہی سے سوشیل ورک اور عوام کی خدمت ان کا وطیرہ رہا ہے۔ حیدرآباد چونکہ ان کا وطن ہے اس لئے یہاں ان کی مقبولیت بہت زیادہ فخر کی بات نہیں مگر بمبئی جیسے وسیع اور کاسموپولیٹن شہر میں ان کی شخصی مقبولیت اور وہ بھی ہر شعبہ کے لوگوں میں قابلِ فخر بات ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ غفور صاحب کی اس قدر مقبولیت کی وجہ سے ان کو ہر روز اتنی دعوتیں آتیں کہ اکثر رات کا کھانا وہ باہر کھاتے۔ مروت اور لحاظ کا یہ عالم تھا کہ ہر کسی کی دعوت قبول کرلیتے یہ نہ دیکھتے کہ مدعو کرنے والا ان کے "اسٹیٹس" کا نہیں ہے۔ مہاراشٹرا حکومت کی ملازمت انتہائی پاکبازی مستعدی اور اوقات کی پابندی کا خیال کرتے ہوئے انجام دی اور مجھے یقین ہے کہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا جو یہ کہہ سکے کہ میں نے خواجہ عبدالغفور صاحب کو فلاں عہدے کے زمانے میں فلاں وقت رشوت دی ہے۔ ایسی ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ بہت مقبول ہوئے۔

وظیفہ کے دو تین برس بعد ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی لیکن خواجہ صاحب اپنی صحت کا خیال کئے بغیر قوم اور اردو کی خدمت میں شہر شہر، گاؤں گاؤں پھرتے رہے۔ حالانکہ طبیعت کا خیال کرکے ان کی بیگم صاحبہ حبیبہ ان کو بہت روکنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ کسی کی بھی کچھ نہ مانتے۔ اُردو کے لئے جہاں بھی انہیں بلایا جاتا چلے جاتے۔ حیدرآباد نظامس ٹرسٹ کی مختصر سی ملازمت کے دوران کئی دفعہ اُردو کے فروغ کے لئے بمبئی کا دورہ کیا کرتے تھے۔ چند دنوں سے آنکھوں کو برابر نظر نہ آنے کی وجہ سے ٹرین سے گر پڑے اور سر کی ہڈی کو سخت چوٹ آئی اور زخم ہوا۔ کئی ٹانکے لگے۔ پھر بھی اُس حالت میں مسلسل دورے کرتے رہے۔ لوگوں کی خدمت کی انتہا یہ تھی کہ ہر روز صبح سے رات تک لوگوں کے کام نکالنے کے لئے بے شمار ٹیلی فون اہلِ غرض حضرات کے لئے کرتے۔ کبھی یہ نہ دیکھتے کہ غرض مند مسلم ہے یا غیر مسلم۔ خواجہ صاحب بمبئی کے کئی غیر مسلم حضرات کے چہیتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے انتقال کے بعد لوگوں کے اژدھام سے ہوا۔ یہاں تک کہ آج بھی کئی خاندان حبیبہ کو پُرسہ دینے آتے ہیں۔ خطوط اور ٹیلی گرام کا کیا کہنا۔

خواجہ عبدالغفور صاحب دنیاداری کے اعتبار سے تو بہت اونچے درجے پر فائز کئے گئے تھے لیکن ساتھ ہی دین داری کے اعتبار سے کبھی رمضان کے روزے خرابیٔ صحت کے باوجود نہ چھوڑتے تھے۔ کئی روزے تو بغیر سحری کے رکھ لیا کرتے تھے۔ جاریہ رمضان نے پھر ہمیں ان کی یاد تازہ کردی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ میں ان کے آخری سفر میں بھی ساتھ ہوگیا کیونکہ خواجہ صاحب یا ان کی بیگم حبیبہ مجھے بہت چاہتے ہیں، اس لئے جب بھی وہ کوئی حکم دیتے تو میں نہ ٹالتا۔ میں اپنی یہ خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس ۲۴ر اپریل کے آخری سفر میں ساتھ رہ کر ان کی آخری خدمت کرنے کا مجھے موقع ملا۔ سر میں تکلیف ہوئی دبادیتا، پیر کھینچتے تو دبادیتا۔ ۲۴ر اپریل کے دن دوپہر تک لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔

ڈیڑھ بجے گھر آئے اور اپنے چھوٹے صاحبزادے علی خواجہ کو یاد کیا اور کہنے لگے کہ اگر علی آجاتا تو کچھ دیر اس
سے باتیں کرنے کا موقع ملتا۔ بار بار وقت دیکھتے۔ پھر جب علی میاں آئے تو ان سے کافی باتیں کیں۔
سوا تین بجے گھر سے نکلے۔ علی کی جیپ ویان نے چلاکر اسٹیشن لے گیا۔ غفور صاحب علی کے ساتھ پلیٹ فارم تک
اچھے خاصے آئے۔ پھر گاڑی میں سوار ہوئے۔ اسٹیشن پر اپنے چھوٹے لڑکے علی میاں کے ہاتھ سے لیمن پینے کے
بعد چھوڑنے آئے ہوئے حضرات کو خدا حافظ کہا اور کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ گاڑی چل رہی تھی منزل کی طرف
اور وہ منزل کا انتظار کر رہے تھے۔ میں پوچھا کہ غفور بھائی کچھ چاہیے یا تکیہ لگا دوں تو کہنے لگے نہیں
ذرا ابھی ضرورت نہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی۔ چونکہ ایسی حالت میں بھی کئی
سفر ہو چکے تھے۔ اس لئے کسی کو یہ خیال ہی پیدا نہ ہوا کہ اس سفر سے ان کو روکا جائے۔ شاید یہی
رضئ مولا ہو۔ دو گھنٹے کے بعد یعنی ۶ بجے جب ان کے جسم کو ہاتھ لگایا تو گرم محسوس ہوا۔ فوراً بڈنگ کھول
کر بچھا دی گئی اور تین تکیے دے کر ان کو نچلے برتھ پر سلا دیا گیا۔ رات کے کھانے کی بھی ان کو رغبت
نہ ہوئی، وہ ہلکے پھلکے اپنے مولا کے پاس جانا چاہتے تھے۔ رات میں تقریباً دو تین دفعہ استنجے کے لئے اٹھے
میں ساتھ لے گیا اور لایا۔ پھر ڈھائی بجے کے قریب پونہ سے نکلے ہوں گے کہ خواجہ صاحب پھر ضرورت کے
لئے اٹھے۔ ہمیں سوتا دیکھ کر جگانا مناسب نہ سمجھا اور خود بستر سے اٹھے ہی تھے کہ وہیں گر پڑے اور روح
پرواز کر گئی۔ فوراً حبیبہ نے ان کے حرکت کی آواز سنی تو مجھے پکارا کہ اٹھو بھائی دیکھو، وہ خود بھی
برتھ سے نیچے آگئیں اور میں بھی۔ پھر میں تفصیلی معائنہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ جسم میں روح نہیں رہی
کچھ اور لوگوں کی مدد سے میں نے انھیں اٹھاکر برتھ پر لٹا دیا اور فوراً کسی ڈاکٹر کی تلاش شروع ہوئی
اتفاق سے 'J' کمپارٹمنٹ سے ڈاکٹر آیا اور اس نے بھی ٹارچ اور کنجی لے کر بغور معائنہ کیا اور کہا کہ
"ختم"۔ میں کچھ دیر تو حبیبہ کو یہ بتایا ہی نہیں اور ایک چادر لاکر ان کو اڑھا دی۔ حبیبہ بار
بار مجھ سے پوچھتیں کہ غفور کیسے ہیں، میں ان کو دلاسا دیتا رہا۔ چونکہ پونہ سے آگے بڑھ چکے تھے۔ اس لئے
انہیں اتار لینا غیر واجبی تھا اور فائدہ بھی کیا ہوتا۔ جو وقت اور جو جگہ مقرر ہوتی ہے وہ ٹل نہیں
سکتی۔ یہ ایک سانحہ ان کی بیوہ اور بچوں کے علاوہ بہت سے عزیز رشتہ داروں اور وسیع حلقۂ احباب کا
ہے۔ اس سانحہ کا مجھ پر بھی بڑا اثر ہوا کہ انتقال کے بعد پندرہ بیس دن تک میں سنبھل نہ سکا۔ وہ واقعات
میری آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں ——————— بہرحال کسی طرح بمبئی پہنچے۔ بیٹی عزہ الہ
اور داماد فاروق کو لوناولا اسٹیشن سے ہی اطلاع دے دی گئی تھی، وہ ایمبولینس لے کر آگئے تھے۔ نعش
گھر لے جا کر رکھی گئی۔ بچوں کا انتظار رہا۔ علی میاں رات ۸ بجے کے قریب آئے۔ جب تک غسل اور کفن
ہو چکا تھا۔ پھر علی میاں اور تمام چاہنے والوں کے ساتھ کئی موٹروں اور ویانوں میں میت ناریل واڑی

قبرستان پہنچی۔ بعد عشاء جسد خاکی کو سپرد خاک کردیا گیا۔ إنّا للّٰہ وإنّا إلیہ راجعون۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں موصوف کی صحیح تعریف نہ لکھ سکا اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ خواجہ صاحب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

— —

زندہ دلان حیدرآباد کا تعزیتی جلسہ

حیدرآباد۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس کی صدارت میں منعقدہ ایک تعزیتی جلسہ میں جناب خواجہ عبدالغفور کے انتقال پُر ملال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اور اردو کے ایک مخلص خدمت گزار، طنز و مزاح نگار، ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے سرپرست کی حیثیت سے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ بزم گاہ پر منعقدہ اس تعزیتی جلسہ میں زندہ دلانِ حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈمی کے اراکین نے شرکت کی۔ جناب طالب خوندمیری معتمد عمومی نے کہا کہ زندہ دلان حیدرآباد کو خواجہ صاحب کے انتقال پر سخت دلی صدمہ پہنچا ہے۔ جناب محمد منظور احمد نے اپنی تقریر میں خواجہ عبدالغفور کی سرگرمیوں اور اردو خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ خواجہ صاحب نہ صرف خود کام کرتے تھے بلکہ دوسرے خدمت گزاروں کی سرپرستی کرتے اور خاص طور سے نوجوانوں کو اُردو میں لکھنے پڑھنے کے لیے مائل کرتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے کہا کہ خواجہ عبدالغفور ان چند عثمانین سیول سروس آفیسرز میں تھے جنھوں نے اپنی ہمہ صلاحیت اور شخصیت سے انتظامیہ کے علاوہ تہذیبی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں میں اپنا مقام بنایا۔ اگرچہ کہ انہوں نے بمبئی کو وطن ثانی بنایا تھا لیکن حیدرآباد آخری دم تک ان کی رگ و پے میں رواں تھا۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کی اعلیٰ قدروں کا ایک مجسمہ تھے۔ جناب سید مصطفیٰ کمال مدیر 'شگوفہ' نے کہا کہ خواجہ صاحب ہمہ جہتی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے بانی سکریٹری تھے اور اکیڈمی کی تشکیل کے بعد سے مسلسل حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود انہیں اس عہدہ سے ہٹایا نہیں گیا۔ مہاراشٹرا کا ہر وزیر خواجہ صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ صدر جلسہ جناب نریندر لوتھر نے اپنی تقریر میں کہا کہ خواجہ صاحب بہترین اڈمنسٹریٹر، اُردو کے بلند پایہ ادیب اور خدمت گزار تھے۔ انہوں نے طنز و مزاح کو خاص طور سے اپنایا تھا۔ ان کی چار کتابیں شائع ہوئیں۔ لطیفہ گوئی سے بھی انہیں شغف تھا۔ بمبئی اور حیدرآباد ہی نہیں سارے ملک میں ان کے مداح ان کے انتقال پُر ملال پر رنجیدہ ہیں۔ جلسہ کے اختتام پر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ قرار داد تعزیت منظور کی گئی، جس کے ذریعہ خواجہ عبدالغفور کی علمی، ادبی و تہذیبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

تمنا مظفر پوری

"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

خواجہ عبدالغفور ـــــ تحریر سے تصویر تک ـــــ

زمانہ قبل کی بات ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ کانفرنس سے جناب رضا نقوی صاحب واہی پٹنہ لوٹے تو وہ اہلِ حیدرآباد اور زندہ دلان حیدرآباد کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔ میں بھی ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کانفرنس کی تفصیل سنائی۔ پھر بتایا کہ مہاراشٹرا کے ایک آئی اے ایس افسر ہیں خواجہ عبدالغفور، وہ لطیفہ سنانے میں یکتا ہیں۔ بغیر تھکے اور بغیر جھکے (جھپکی لئے) رات رات بھر لطیفہ سنا سکتے ہیں۔ پھر خواجہ صاحب کے متعلق بمبئی کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں کی خبریں اخباروں میں دیکھنے کو ملنے لگیں۔ شگوفہ نے ان کے مضامین شائع کرکے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا ڈالا۔ پٹنے کے جشنِ ظرافت میں ان کو بلانے کی باتیں ہوئیں۔ دعوت نامہ بھیجا گیا مگر افسوس کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے انکار کرتے رہے۔ جب میں نے زندہ دلانِ بہار کے قیام کے سلسلے میں پہلا پروگرام شامِ ظرافت ۱۲ اپریل سنہ ۸۴ء منعقد کیا تو ان کو دعوت نامہ بھیجا۔ واہی صاحب کے توسط سے خط بھجوایا۔ ان سے شامِ ظرافت میں شرکت کی استدعا کی لیکن ہم لوگوں کی بدقسمتی تھی۔ ان کا خط آیا۔

محترمی تسلیمات!

آپ کا مکتوب ۱۰ مارچ موصول ہوا۔ کل ہند شامِ ظرافت میں شرکت کے دعوت نامے کا مشکور ہوں۔ چند در چند وجوہات کے باعث میں ۱۰ اور ۱۱ اپریل والے سیمنار اور مشاعرہ[1] میں شرکت سے قاصر ہوں۔ ان سے معافی مانگ لی ہے۔ اس لئے آپ کے جشن میں

---

[1] ۱۰ اور ۱۱ اپریل کو پٹنے میں جشنِ اکبر الہ آبادی بہار اردو اکادمی کی طرف سے منایا جا رہا تھا۔ اسی کا ذکر ہے۔ ۱۲ اپریل سنہ ۸۴ء کو گیا میں کل ہند شامِ ظرافت بھی اسی موقع کو مدنظر رکھ کر منعقد کی گئی تھی۔

بھی شریک نہ ہو سکوں گا۔

شامِ ظرافت کی کامیابی کے لئے میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مخلص۔ خواجہ عبدالغفور

خواجہ عبدالغفور نے نہ صرف یہ کہ مزاحیہ مضامین لکھے بلکہ اردو داں طبقہ کو مغربی لطائف سے متعارف بھی کرایا اُردو میں کارٹون کی کمی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی کتاب شگوفہ زار شائع ہوئی۔ فنِ مزاح اور لطیفے کے متعلق یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ موصوف نے اس کی تصنیف میں مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۷/ اور ۸/ اپریل ۱۹۸۴ء کو پٹنے میں پانچواں جشن ظرافت کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ عبدالغفور صاحب اس بار ضرور تشریف لائیں گے۔ باوجود کہ ۷/ اپریل کو میرے مکان مظفر پور میں شادی تھی، میں سیمنار اور نثری نشست میں شریک ہوا۔

۷/ اپریل ۸۴ء صبح ۱۰ بجے کا وقت ہے۔ گورنمنٹ اُردو لائبریری کی بالائی منزل پر ہال میں بہار اور ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے دانشور اور اہلِ علم حضرات جمع ہیں۔ خاص مہمان کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، خواجہ عبدالغفور نریندر لوتھر، فکر تونسوی بیدلگ کہہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ پروفیسر حامد حسین صاحب بھوپال سے اور لکھنؤ سے مشتاق پردیسی آتے ہیں۔ پروفیسر موسیٰ رضا، ڈاکٹر محمد محسن ماہر علم نفسیات اور ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کو مضامین پڑھنا ہے۔ یہ جوہر صاحب انتظام کے سلسلے میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ واہی صاحب جناب شفیع مشہدی صاحب کو کچھ بتا رہے ہیں۔ ان کے بغل میں تشریف فرما ہیں سید شہاب الدین دسنوی صاحب۔ شفیع مشہدی نے مائک سنبھالا اور عبدالمغنی صاحب کا صدارت کے لئے نام پیش کر دیا۔ تالیوں کی گونج میں اس کی تائید ہوئی۔۔۔ سیمنار کی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ اتنے میں صدر دروازے سے سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک معزز ہستی داخل ہوتی ہے۔ یہ خواجہ عبدالغفور ہیں۔ برسوں کی تمنا پوری ہوتی ہے۔ فوٹوگرافر دھڑا دھڑ فوٹو اُتارنے لگتے ہیں۔ ابھی مضمون پڑھا ہی جا رہا ہے کہ کنور مہندر سنگھ سحر صاحب تشریف لاتے ہیں۔

سبھی مقالہ نگار اپنے Papers پڑھ چکے ہیں سیمنار کا اختتام ہوتا ہے لوگ اُٹھ رہے ہیں۔ سحر صاحب خواجہ صاحب سے ملنے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ میں بھی ان کی طرف لپکتا ہوں۔ متعارف ہونے کے بعد ایک بار پھر وہ معذرت چاہتے ہیں۔

"مجھے افسوس ہے صاحب! میں آپ کی شامِ ظرافت میں شرکت نہ کر سکا۔ کئی بار کے دعوت نامے کے بعد اس بار موقع نکال کر پٹنہ آیا ہوں۔"

"آپ کو سننے کے لئے میں اور اہلِ بہار بہت دنوں سے مشتاق ہیں۔" میں کہتا ہوں۔

فرمانے لگے۔ "میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ آرام کی بھی فرصت نہیں ملتی۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آئندہ کبھی انشاء اللہ!"

مگر آئندہ کہاں! کل کس نے دیکھا ہے۔ مشیت کی پلاننگ سے کون واقف ہے۔ یہ تو اہلِ بہار اور پٹنہ والوں کی خوش قسمتی تھی کہ بار بار خواجہ صاحب کے نام کا اعلان سنتے رہے۔ اس بار ان کو دیکھنے اور سننے

کا بھی موقع مل گیا۔

میں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ ۷ر اپریل کو میری بہن کی شادی تھی اور مجھے جشن ظرافت میں شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔ پہلا شب میں جب نثری دور شروع ہونے والا تھا، پہلے سووینر کا رسم اجراء ہوا۔ تالیاں بجتی ہیں۔ نثری دور شروع ہوتا ہے۔ میں اپنا ایک نفسیاتی انشائیہ "اگر آدمی کو دُم مل جائے" سناتا ہوں۔ لوگ محظوظ ہوئے یا نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ کچھ سابق وزرا دُم کی بات سن کر چونک پڑے اور چمچہ کے علاوہ دُم چھلا کی بات سوچنے لگے۔ میں انشائیہ پڑھ کر اس فکر میں ہوں کہ خواجہ صاحب سے مل کر جاؤں مگر یہ ممکن نہیں۔ دو تین انشائیہ نگار اپنی تخلیقات سنا چکے ہیں۔ میں اس کشمکش میں ہوں کہ کیا کروں، مل کر جاؤں یا . . . . اور اسی تذبذب میں بہت دیر تک ہال سے باہر نکل کر کھڑا رہتا ہوں۔ پھر میں مظفر پور کے لئے روانہ ہو جاتا ہوں۔ جشن ظرافت سے جشنِ شادی میں آجاتا ہوں۔ جشنِ ظرافت کی ادھوری کارروائی کی یاد لئے۔

۲۵ر اپریل، آج رفیع گنج ضلع اورنگ آباد (بہار) میں مشاعرہ اور کوی سمیلن ہے۔ جوہر سیوانی صاحب تشریف لائے ہیں۔ جشنِ ظرافت کی مکمل روداد جوہر بھائی نے سنائی۔ خواجہ عبدالغفور صاحب کے متعلق بتایا کہ انہوں نے بہت سی تصاویر ٹورسٹ سنٹر میں اُتروائیں۔ کبھی اس کونے میں کبھی ان پھولوں کی کیاریوں کے پاس اور کبھی جھاڑ کے قریب۔ بالکل بچوں کی طرح وہ [illegible] بدل کر تصویر اُتروا رہے تھے۔ واجد صاحب بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے کہ خواجہ صاحب کی خواہش کیوں کر رد کی جائے۔

خواجہ صاحب کو اس قدر تصاویر اُتروانے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ ایک بڑا اہم شخص۔ ایک اعلیٰ افسر جس کی زندگی میں بمبئی سے لے کر غیر ممالک میں ہزاروں تصویریں اُتاری گئی ہوں گی، پھر یہاں بچوں کی طرح تصویر کھنچوانے کا کیوں خواہش مند تھا ـــــ ہاں خواجہ صاحب پٹنے والوں کی دعوت بہت دنوں سے لوٹا رہے تھے اور اب جبکہ وہ تشریف لا چکے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اسی آمد کو یادگار بنا دیں۔ شاید ان کی چھٹی حس کو خبر مل چکی تھی کہ ان کا یہ پہلا اور آخری سفر ہے لہٰذا خود کو پٹنے کے چپے چپے میں چپکا دیں اور خود میں پٹنے کے گوشے گوشے کو سمولیں۔

چنانچہ پٹنہ سے واپسی کے چند ہی دن بعد یہ خبر سننے میں آئی کہ لالہ زار، گل و گلزار، قہقہہ زار اور شگوفہ زار کا خالق سو گیا ہے۔ ہمیشہ کے لئے ــــ اہلِ بہار کے لئے پٹنہ کی وہ تصویریں ہی ان کی آخری یادگار ہیں۔

ــــ ــــ

قلمی معاونین سے

التماس ہے کہ تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

۔ ادارہ

نریندر لوتھر

خواجہ صاحب اور گل و گلزار

آج ۱۲ر تاریخ ہے۔ ۹ر تاریخ کو رات کے نو بجے جب میں کھانا کھا رہا تھا۔ میرے لئے مصطفیٰ کمال کا فون آیا۔ صحت کے ماہرین کی ہدایات کے مطابق کھانے کے دوران کبھی فون کال ریسیو نہیں کرنا چاہیے۔ بات کرنے والا چاہے خوش بخت ہو یا بد بخت اور چاہے نیک ہو یا بد ہر دو صورتوں میں ہاضمہ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ماہرین نے اس بات کی چھوٹ بھی دی ہے کہ چند لوگوں کے فون کھانے کے دوران بھی سنے جا سکتے ہیں وہ ایسے متوازن قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو حیدرآباد کی آب و ہوا کی طرح ہمیشہ معتدل قسم کی نیوٹرل خبریں سناتے ہیں جن کا بلڈ پریشر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مصطفیٰ کمال ان لوگوں میں سے ایک ہیں اور اس لئے جب بھی ان کا فون آتا ہے تو چاہے کہیں بھی رہوں یا کسی بھی حالت میں رہوں آلہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے۔

مصطفیٰ نے کہا "خواجہ صاحب حیدرآباد تشریف فرما ہیں"۔

یہ بات انہوں نے کچھ اس راز دارانہ انداز میں کہی جیسے پولیس کے پیشہ ور مخبر کسی اشتہاری اسمگلر کا اتہ پتہ دیتے ہیں

میں نے جواب دیا "کوئی بات نہیں۔ ان کے سسرال یہاں ہیں"۔

انہوں نے اس انتہائی اہم وجہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ان کی کتاب کی رسم اجراء ۱۲ر تاریخ کو ہونی طے پائی ہے"۔

"کون سی کتاب"

"گل و گلزار"۔ زندہ دلان کی طرف سے ریلیز ہو رہی ہے"۔ بہت اچھی خبر تھی۔ ایسی خبر کو ڈاکٹر کھانے کے دوران سننے سے منع کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ "تو کیا پروگرام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"آصف پاشا صاحب صدارت کر رہے ہیں۔ محمد علی صاحب اور عابد علی صاحب مہمان خصوصی ہوں گے"۔ میں

نے سوچا سب آسامیاں تو پُر ہو چکیں۔ اب صرف شرکت کا سوال ہے۔ مصطفیٰ نے سلسلۂ خیال توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زحمت دینا ہے۔"

"میں بخوشی آؤں گا۔ کہاں پر اور کتنے بجے؟"

"نہیں صاحب آپ کو نہ صرف آنا ہے بلکہ کچھ کہنا بھی ہے۔" پھر گویا ہوئے۔ "ہم نے اظہار خیال کے لیے چار اور جائدادیں نکالی ہیں کیوں کہ سرکاری قوانین کی رو سے (۲۵) فیصدی جائدادیں پسماندہ جاتیوں کے لیے ریزرو رکھنی پڑتی ہیں اس لئے کھنہ صاحب، قریشی صاحب اور اختر صاحب کے بعد چوتھی جائداد کے حقدار آپ ہوتے ہیں۔ آپ سے زیادہ موزوں یعنی پسماندہ شخصیت ملنی مشکل ہے۔"

میں نے کہا: "دیکھئے میں نے کتاب تو پڑھی نہیں۔ آپ مدیر اور پروفیسر ٹھہرے اور اس کیس میں تو آپ ناشر بھی ہیں۔ ایک ڈرافٹ "اظہارِ خیال" بھیج دیجئے میں اس کو کانٹ چھانٹ کر، اپنا کر اظہار کر دوں گا۔"

یہ ہمارا معاہدہ تھا جس کی بناء پر میں نے اس جائداد پر اپنا تقرر قبول کیا۔ آئین کچھ بھی کہے۔ ابھی تک پچھڑے ہوئے طبقوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہوا ——————

کمال صاحب نے اپنا وعدہ نہیں نبھایا۔ کل رات کو فون کر دیا کہ "میں نے ناشر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ کتاب میں شامل ہے اس کے علاوہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ تو خیر ہوئی کہ محترم مصنف خود کل تشریف لا کر بہ نفس نفیس کتاب کی ایک جلد مجھے دے گئے ہیں۔ میں نے سب کام چھوڑ کر کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔

"گل و گلزار" خواجہ صاحب کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے قبل "قہقہہ زار" "شگوفہ زار" اور "لالہ زار" منظرِ عام پر آ کر مقبولیت پا چکی ہیں۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ کتاب کے نام کی ردیف زار ہے۔ کئی لوگوں کو (RHYME) کا شوق ہوتا ہے۔ ہمارے والد مرحوم نے جو اپنی پیڑھی میں سب سے بڑے تھے۔ نہ صرف اپنے بلکہ اپنے بھائیوں کے بچوں کے نام کے بارے میں فرمان جاری کیا تھا کہ سب لڑکوں کے نام کا آخری لفظ "اندر" ہونا چاہیئے۔ نتیجتاً میرے حقیقی اور چچا زاد بھائیوں کے نام اندر پر ختم ہوتے ہیں۔ جب اندر پر ختم ہونے والے نام ختم ہو گئے تو ہمارے ایک چچا نے والد صاحب سے پوچھا کہ اب کیا کریں۔ اُنہوں نے جواب دیا اب بچے پیدا کرنا بند کر دو۔ (یہ بھی خاندانی منصوبہ بندی کا ایک اوریجنل طریقہ ہے)

خواجہ صاحب کے "نام کرن" کے محرکات بھی کچھ ویسے ہی لگتے ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے ہیں اور دونوں کے نام کے آخر میں "غفور" ہے۔ کتابوں کا نام زار پر ختم کرنے کی وجہ ہے کہ ان کے مضامین پڑھ کر زار زار ہنسی آتی ہے۔ ایک اور تھیوری ہے ان کے آبا و اجداد زار روس کے دربار میں کسی ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ اس لئے روس ہندی دوستی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر کتاب کے نام کے ساتھ زار کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کی آئندہ چھپنے والی کتابوں کے کچھ نام ایسے ہو سکتے ہیں — مرغزار، زعفران زار اور بیگم بازار — "زار - زار" یہ ان کی آخری کتاب ہوگی۔

خواجہ صاحب آئی۔ اے۔ ایس کے افسر رہ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم دونوں "ہم زلف" ہیں۔ یہ اتفاقی بات نہیں کہ آئی اے ایس کے جن تین افسروں نے اردو میں لکھا انہوں نے طنز و مزاح کو ہی اپنایا۔ اور ان کا تعلق بھی حیدرآباد سے ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یا تو حیدرآباد کی مٹی میں یا آئی۔ اے۔ ایس کی راہ میں کچھ ایسی بات ہے کہ بھلے چنگے افسر مزاح نگار اور طنز نگار بن جاتے ہیں۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی سے درخواست کروں گا کہ وہ کسی طالب علم سے اس موضوع پر ریسرچ کروائے اور اسے ڈاکٹر بنانے کی کوشش کرے۔

مزاحیہ ادب میں خواجہ صاحب کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔ اس صنف کا ہر ادیب یا تو طنز نگار یا مزاح نگار کے زمرے میں آتا ہے۔ خواجہ صاحب کو زمرے پسند نہیں اس لئے انہوں نے اپنا نیا پنتھ چلایا ہے۔ وہ اردو ادب کے لطیفہ گو ہیں۔ وہ لطیفہ کو پرو کر مضامین کی مالا تیار کرتے ہیں۔ ان کا مقصد پند و نصیحت دینا نہیں۔ نشتر آزمائی کرنا نہیں سماج یا انسان کی اصلاح کرنا نہیں۔ میرا خیال ہے ان کا مقصد اوروں کو اپنانا بھی نہیں۔ وہ صرف خود ہنسنے کے لئے لطیفے پڑھتے ہیں۔ سنتے ہیں اور پھر ایجاد کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف (RELAX) کرنا ہے۔ اس عمل میں اگر دوسرے لوگ بھی محظوظ ہو جاتے ہیں یا لطافت کا احساس کرتے ہیں تو اس میں خواجہ صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ ان کے لطیفے ہلکے پھلکے اور معصوم، شریف اور بے ضرر ہوتے ہیں۔ ان کے لطیفوں کے انتخاب میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے۔ شرافت اور معصومیت کی چھاپ ہر لطیفہ پر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے لطیفے دلچسپ نہیں ہوتے۔ معصومیت اور شرافت سے میرا مطلب ہے کہ وہ کھلے طور پر لطیفے سناتے ہیں اور ان کی نیت اتنی نیک اور صاف ہوتی ہے کہ اکثر محفلوں میں ایسے لطیفے سناتے ہیں جو صرف خواتین کے سننے کے لائق ہوتے ہیں اور جن کو سن کر مرد بیچارے بلش کر جاتے ہیں۔

کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ لطیفہ سنانا بڑا آسان کام ہے۔ رسالوں میں پڑھ کر ازبر کر لئے اور پھر سنا دیئے۔ یہ قول بالکل ویسا ہی ہے کہ "تقریر کرنا بڑا آسان کام ہے"۔ یہاں مجھے خود بطرز خواجہ صاحب ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔

ایک کلب کے ممبروں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر لطیفہ کو ایک نمبر دے دیا جائے اور ہر بار بجائے پورا لطیفہ سنانے کے ممبر صرف لطیفہ کا نمبر سنا دیں اور سامعین مناسب مقدار میں ہنس دیں۔ ایک بار ایک نیا ممبر آیا اور اس نے بھی ایک لطیفہ سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ اجازت ملنے پر اس نے کہا "لطیفہ نمبر ۷"۔ جب اس پر کوئی نہ ہنسا تو اس نے قدرے ناراضگی سے پوچھا کہ آپ لوگ اتنے زبردست لطیفے پر ہنستے کیوں نہیں۔ کلب کے صدر نے جواب دیا۔ لطیفہ تو آپ کا بے شک زبردست تھا۔ لیکن آپ کا سنانے کا انداز ذرا کمزور تھا۔

تو لطیفہ میں خاص انداز بیان کی ضرورت ہے جس میں راوی کی شخصیت، اس کی آواز کا جادو، اس کے چہرے کی دمک، اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے ہاتھ کی جنبش۔ اس کی اپنی زیر لب مسکراہٹ شامل ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے خواجہ صاحب نہایت ہی کامیاب لطیفہ گو ہیں۔ اس کے آگے چل کر مختلف لطیفوں کو ایک جگہ اکٹھا کر چکے۔

ان سے ایک مسلسل کہانی یا مضمون پیدا کرنا نہایت مشکل کام ہے جو خواجہ صاحب بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ وہ لطیفوں کو بڑی اچھی طرح توڑ مروڑ بھی لیتے ہیں۔ مثلاً ایک بار انھیں بمبئی کے روٹری کلب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا۔ موضوع کا تعلق سیکس سے تھا۔ روٹری والے عام طور پر مختلف موضوعات کے ماہر لوگوں کو بلاتے ہیں یہ ابھی تک راز ہے کہ خواجہ صاحب نے اس موضوع پر مہارت کہاں سے اور کب حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت بیگم کو یہ بتایا کہ ان کی تقریر کا موضوع "انگریزی پکوان اور ان کا صحت پر اثر" تھا۔ چند دن کے بعد کسی پارٹی میں روٹری کلب کے سکریٹری نے خواجہ صاحب کو خاص طور پر مبارکباد دی کہ آپ کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ اور پھر بیگم کو بھی مبارکباد دی کہ آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ آپ کے شوہر اس موضوع کے اتنے بڑے ماہر ہیں۔ بیگم نے کہا۔ "بس انھیں تو باتیں ہی کرنا آتی ہیں ویسے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔" روٹری کلب کے سکریٹری نے کہا۔ "نہیں ایسی بات تو نہیں۔ صاحب تو واقعی ایکسپرٹ ہیں"۔ بیگم نے کہا "کیا جی۔ تقریر کا تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ جب بھی انہوں نے کوشش کی ہے۔ بس ستیاناس کیا ہے"۔ سکریٹری صاحب بہت جھینپ رہے تھے۔ انہوں نے معاملہ بچانے کی آخری کوشش کی۔

"بہر حال یہ تو ماننا پڑے گا کہ اس موضوع پر مطالعہ تو بہت وسیع ہے۔" فرمایا ——— "یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ میں نے انھیں کئی بار سکھانے کی بھی کوشش کی ہے مگر ان کو اس موضوع سے کچھ دلچسپی ہی نہیں"۔

اس موضوع سے قطع نظر۔ بے شک خواجہ صاحب کا مطالعہ مزاح کے بارے میں بہت وسیع ہے۔ مزاح میں انہوں نے تخلیقی اور تحقیقی دونوں قسم کا کام کیا ہے۔ ان کی زیر بحث کتاب میں کم از کم چار مضامین ایسے ہیں جن پر میں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً تصویر کے دو رخ، ٹیلی فون، نوکری کا چکر اور بیوی، اساتذہ اور ان کا کلام اور جدید دکنی تحقیقی قسم کے مضامین ہیں۔ موخر الذکر مضمون اور شگوفہ زار کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب ان فنکاروں میں سے نہیں جو اپنے ہم عصروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ ان کو داد دیتے ہیں۔ اور حد سے زیادہ ان کی دریا دلی سے میں بھی مستفید ہو چکا ہوں۔

میں خواجہ صاحب کو زیادہ نزدیک سے نہیں جان پایا کیوں کہ جب میں حیدرآباد آیا تو وہ بمبئی جا چکے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور ان کی تخلیقات جو پڑھی ہیں اور ان سے جو چند ملاقاتیں ہوئی ہیں اس سے میں یہ اندازہ کر پایا ہوں کہ خواجہ صاحب کی خانگی زندگی میں امن و توازن رہا ہے مثلاً اگر دو لڑکے پیدا کئے تو دو لڑکیاں بھی۔ بمبئی کی کلچرل زندگی میں وہ پیش پیش ہیں اور ان کے مضامین اور لطائف سے جانچا جا سکتا ہے کہ محفلوں اور پارٹیوں میں نہایت ہی پرکشش مہمان اور میزبان ثابت ہوتے ہوں گے۔ عام طور پر شاعر کے مقابلہ میں نثر نگار ادیب کو (HANDICAP) رہتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو پارٹیوں میں نہیں سنا سکتا ہے۔ مجھے اکثر ایسے موقعوں سے دوچار ہونا پڑا جب کسی پری وش نے ...

کلام سننے کی فرمائش کی اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ میں شاعر نہیں۔ خواجہ صاحب کے مضامین (COLLAPSIBLE) قسم کے مشینی کھلونے ہیں۔ وہ انھیں توڑ کر پرزوں کو جیب میں رکھ کر پارٹیوں میں جاتے ہیں اور اگر کسی کی فرمائش ہوئی تو فوراً پرزے نکال کر ایک تخلیق پیش کی اور محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ واحد نثر نگار اور مزاحیہ ادیب ہیں۔ جس کے چرچے پری خانوں میں ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس لئے میں تجویز کروں گا کہ ان کی اگلی کتاب کا نام "پری خانے" ہونا چاہیئے۔

میں آخر میں خواجہ اور بیگم عبدالغفور کو ان کے چوتھے ادبی بچے کی پیدائش پر مبارکباد دیتا ہوں۔ ویسے بھی ان کے چار بچے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ توازن کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اپنی ادبی تخلیقات کا سلسلہ ختم نہیں کریں گے۔ بلکہ ادبی تخلیقات میں جو فیملی پلاننگ انہوں نے جوانی میں کی اب اس کا ازالہ کریں گے۔

کھنہ صاحب نے خواجہ صاحب کو قہقہہ نواز جنگ کا لقب دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ میری رائے ہے کہ وہ شہنشاہِ لطیفہ ہیں۔ انھیں دوسرے اور تیسرے درجے کے القاب کی ضرورت نہیں۔ **

یہ مضمون گُل و گلزار کی رسمِ اجرا کے موقع پر پڑھا گیا۔ (ادارہ)

خواجہ عبدالغفور چلے گئے

۲۶ر اپریل ۸۴ء کو ٹرین میں سفر کر رہے تھے ــــــ مگر ان کی رفتار ٹرین کی رفتار سے تیز تھی اور وہ خُدا سے جا ملے۔

پہلی مرتبہ جب خواجہ صاحب نے مجھے خط لکھا تو میں نے لکھا۔ صاحب آپ تو آئی، اے، ایس ہیں۔ اور آئی اے ایس حاکم ہوتا ہے مگر آپ کیسے آئی اے ایس ہیں کہ اس قصباتی فقیر کو یاد کیا اور وہ بھی ایسے کہ جیسے میں آپ کا ہمسر ہوں۔

جواب آیا کہ وہ میری ادبی تخلیقات اور صحافتی کوششوں سے متاثر ہیں ــــــ اور پھر خط آیا اور خط گیا ــــــ

اور میں ــــــ؟

میں سوچتا رہ گیا کہ ایک آئی، اے ایس جس نے "حاکم" کی بجائے خود کو ادیب اور ادب نواز بنایا وہ چلا گیا تو یہ قصباتی فقیر کس لئے زندہ ہے،

غفور صاحب تو مزاح میں محفل ہی سونی کر گئے۔ خدا ان کو جنّت کے سوا اور کیا دے گا۔ ایسا سادہ دل، ایسا کشادہ دل، ــــ جنّت ان کے بغیر سونی ہو جائے گی اور خدا جنّت کو سونی نہیں رکھ سکتا۔

سوگوار ــــــ کلام حیدری، (مطبوعہ "مورچہ")

مجتبیٰ حسین

خواجہ عبدالغفور

لطیفوں کا آدمی

پندرہ سولہ سال اُدھر کی بات ہے۔ میں کالج کی چھٹیاں گذارنے کے لئے ہر سال موسم گرما میں اپنے آبائی وطن عثمان آباد کو جایا کرتا تھا۔ عثمان آباد ایک چھوٹا اور خاموش سا شہر ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ـــــ اس شہر میں پہنچتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی کے سارے ہنگامے ختم ہوگئے ہیں۔ اب آگے صرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ سکون ہی سکون۔ نہ شور و غل نہ شور شرابہ۔ سارا دن رشتہ داروں کے ساتھ گذرتا۔ شام ہوتے ہی میں یا تو پہاڑیوں پر تفریح کے لئے نکل جاتا یا پھر اس لمبی سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکل جاتا جو اس شہر کی واحد سڑک ہے۔ یہ سڑک مجھے بہت پسند تھی اور آج بھی ہے، کیونکہ جب بھی مجھے اپنے ماضی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو یہی سڑک مجھے اپنے بچپن کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنے بچپن تک پہونچنے کے لئے اس سڑک کے سوا ـــــ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لمبی سڑک سے ایک گہری وابستگی کا احساس مجھے ہوتا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شہر میں اس اکلوتی سڑک کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ اندھیری راتوں میں کبھی کبھی یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا کہ اگر چور رات کے اندھیرے میں اس سڑک کو چرا کر کہیں لے گئے تو میں اس شہر سے باہر نہ نکل سکوں گا۔ ہر شام جب میں اس غیر معروف سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکلتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے میں اس واحد سڑک کا واحد مالک ہوں۔ کوئی مجھے اس سڑک سے بے دخل نہیں کر سکتا۔

اسی سڑک پر ایک شام میں چہل قدمی کے لئے نکلا تو راستہ میں ایک پرانا ساتھی مل گیا، ہم دونوں ایک بڑی کوٹھی کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ہم سے کچھ فاصلہ پر اس کوٹھی کا سنتری کھڑا پہرہ دینے کی کوشش میں مسلسل اونگھ رہا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ یہ سنتری آن کی آن میں ہوکس اور

الرٹ ہوگیا جیسے کسی نے بٹن دباکر اُس کے بدن میں برقی رو دوڑادی ہو۔ ابھی میں سنتری کی اچانک تبدیلی کا مطالعہ کرہی رہا تھا کہ اُس نے بڑی بلند آواز کے ساتھ ہمیں سڑک پر سے ہٹ جانے کو کہا ۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں اپنے آپ کو اس سڑک کا بلا شرکت غیرے مالک سمجھا کرتا تھا۔

سنتری کے اس حکم کو سن کر میرے بدن میں بھی برقی رو دوڑگئی۔ یوں بھی سولہ سترہ سال کی عمر میں آدمی کے بدن میں بجلی زیادہ ہوتی ہے خون کم۔ میں نے تنک کر کہا ۔ "تم کون ہوتے ہو ۔ ہمیں سڑک پر سے ہٹانے والے؟"
اُس نے کہا ۔ "زیادہ بکواس نہ کرو۔ کلکٹر صاحب باہر آرہے ہیں ... "
میں نے کہا ۔ "کلکٹر ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ سڑک پر کیسی کلکٹری۔ آنے دو کلکٹر صاحب کو اتنی بڑی سڑک ہے کہ اس پر سے سارے ہندوستان کے کلکٹر بیک وقت گذر سکتے ہیں ۔ پھر کلکٹر تو آدمی ہی ہوتا ہے کوئی ہاتھی تو نہیں ہوتا کہ اس کے لئے ساری سڑک کا تخلیہ کردیا جائے "

ابھی میں اپنی نوجوانی کے جوش کا عملی مظاہرہ کرہی رہا تھا کہ اچانک ایک موٹر کوٹھی کے اندر سے برآمد ہوئی۔ اس موٹر میں پچھلی سیٹ پر ایک کلکٹر بیٹھا تھا۔ بالکل ایک بُت کی طرح ۔ خدوخال کسی یونانی مجسمہ کی مانند۔ گورا رنگ لمبی اونچی ناک، جو اُس وقت مجھے ناک کم اور خطرناک زیادہ نظر آئی تھی ۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے گال ۔ گلا نکٹائی میں یوں پھنسا تھا جیسے یہ نکٹائی خود انھوں نے نہ باندھی ہو بلکہ کسی دشمن نے باندھی ہو۔
جب کلکٹر کا یونانی مجسمہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا تو میں نے کوٹھی کے پھاٹک پر نظر ڈالی۔ وہاں لکھا تھا "خواجہ عبدالغفور ۔ آئی ۔ اے ۔ ایس "

یہ تھی خواجہ عبدالغفور صاحب سے میری پہلی ملاقات جسے نہ جانے کیوں میں آخری ملاقات بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس دن کے بعد سے مجھے کلکٹروں، لمبی سڑکوں، یونانی مجسموں اور عبدالغفوروں سے چڑ سی ہوگئی۔ جب بھی میں شانتی آباد کی اس لمبی سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکلتا تو یہ خدشہ لگا رہتا کہ کہیں سڑک پر اچانک کوئی کلکٹر نہ نکل آئے۔ بھلا موت اور کلکٹر پوچھ کر تھوڑی آتے ہیں۔ پھر کئی برس بیت گئے ۔ وہ لمبی سڑک میرے حافظہ میں اور بھی لمبی ہوگئی البتہ کلکٹر کا خوف کچھ کم ہوگیا ۔

چار پانچ برس پہلے ایک دن مجھے یہ اطلاع ملی کہ بمبئی کے لیبر کمشنر خواجہ عبدالغفور صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اس وقت "سیاست" کے دفتر میں موجود ہیں ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ وہی خواجہ عبدالغفور ہیں جن کی خاطر کئی برس پہلے مجھے سڑک کا تخلیہ کرنا پڑا تھا — میں خالی الذہن حالت میں 'سیاست' کے دفتر پہنچا تو دیکھا کہ وہی "یونانی مجسمہ" ایک کرسی پر رکھا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مجسمے کے بال اب ذرا سفید ہوگئے تھے اور اس مجسمہ کا پلاسٹر بھی کہیں کہیں اُتر گیا تھا ۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اس مجسمہ کے ساتھ کوئی سنتری نہ ہو ۔ جب دور دور تک سنتری نظر نہ آیا تو یونانی مجسمہ نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا ۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ

غفور صاحب ان دنوں لطیفوں کی ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔
میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بھئی! کمال ہے اب تو یونانی مجسمے بھی لطیفے کہنے لگے ہیں، یہ قیامت کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں؟"
تھوڑی سی رسمی بات چیت کے بعد غفور صاحب نے مجھے دوسرے دن اپنے پاس آنے کی دعوت دی اور چلے گئے۔ میں سارا دن سوچتا رہا کہ ایک آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار کا لطیفوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ملک کی دفتریت قدم قدم پر لطیفوں کو جنم دیتی ہے۔ بہت سے ملازمین کو اُن کی وفات کے بعد ملازمت سے معطل کرتی ہے اور بہت سے ملازمین کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ اتنے سارے دفتری مذاق کے باوجود میں نے آئی اے۔ ایس عہدے داروں کو بے حد سنجیدہ پایا ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ فرشتے اور آئی اے ایس عہدیدار کبھی نہیں ہنستے چنانچہ میں نے بہت کم آئی اے ایس عہدے داروں کو ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ اس معاملے میں ایک صاحب کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جس طرح گھوڑے کو بیٹھی ہوئی حالت میں دیکھنا نحوست کا باعث ہوتا ہے اسی طرح کسی آئی اے ایس عہدیدار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو دیکھنا بھی کچھ کم نحوست کا سبب نہیں ہو سکتا۔
میں مسلسل اس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ خواجہ عبدالغفور آخر کس طرح لطیفے کہتے ہوں گے۔ اور ان پر کس طرح ہنستے ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگوں کو اپنے لطیفوں سے کہیں زیادہ اپنی کمشنری کے حکم پر ہنساتے ہوں گے۔ حکم دیا کہ ہنسو اور لوگ ہنسنے لگے۔
مجھے وہ لطیفہ بھی یاد آیا کہ کوریا کی جنگ کے زمانہ میں ایک امریکی جنرل کوریا کی سپاہیوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔ اور ایک مترجم اس کی انگریزی تقریر کا کوریائی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک مرحلہ پر امریکی جنرل نے اپنی تقریر میں ایک نہایت طویل لطیفہ سنایا۔ اور اس کے بعد مترجم نے اس طویل لطیفہ کے ترجمہ کے سلسلے میں صرف ایک جملہ کہا اور سارے کوریائی سپاہی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ امریکی جنرل بہت حیران ہوا کہ اس کے اتنے طویل لطیفہ کا ترجمہ صرف ایک جملہ میں کس طرح ہو گیا۔ سو اُس نے مترجم سے پوچھا "بھئی! تم نے ایک جملہ میں اتنے بڑے لطیفے کا ترجمہ کیسے کر دیا؟"
اس پر مترجم بولا۔ "حضور! میں نے لطیفہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ میں نے سپاہیوں سے یہ کہا ہے کہ ابھی ابھی جنرل صاحب نے ایک لطیفہ سنایا ہے لہٰذا تم لوگ زور زور سے ہنسنے لگ جاؤ۔
عہدیداری چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو مارے خوف کے ہنسنا ہی پڑتا ہے۔ غرض میں کچھ ایسے ہی خیالات لے کر دوسرے دن غفور صاحب کے پاس پہنچا۔ میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ آج مجھے مصنوعی طور پر اتنا ہنسنا پڑے گا کہ شاید میں اصلی ہنسی کو اگلے کئی دنوں تک بھول جاؤں گا۔ مگر غفور صاحب نے

جاتے ہی مجھے ایک ایسا لطیفہ سنایا جس نے ماحول کے سارے مصنوعی پن کو ختم کر دیا۔ انھوں نے کہا "ایک آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار کو اپنے ماتحتین کو لطیفے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر روز شام کے وقت اپنے ماتحتین کو طلب کرتے اور لطیفے سنانے لگتے۔ ماتحتین ان لطیفوں پر جی کھول کر ہنستے۔ ایک شام وہ حسب معمول اپنے ماتحتین کو لطیفے سنا رہے تھے، سب ہنس رہے تھے مگر ایک ملازم بالکل خاموش تھا۔ اس نے ایک لطیفہ پر بھی ہنسنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ محفل برخواست ہوئی تو اس ملازم کے دوسرے ساتھیوں نے پوچھا۔ "بھئی! آخر تم نے صاحب کے ایک بھی لطیفے پر ہنسنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر بات کیا ہے؟" اس پر ملازم نے کہا۔ "بھئی! اب مجھے ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو کل سے وظیفہ پر علٰحدہ ہو رہا ہوں۔ تم لوگ ابھی برسرِ خدمت ہو لہٰذا تم پر ہنسنا فرض ہے ورنہ صاحب تمہارا EXPLANATION طلب کرلیں گے۔"

غفور صاحب نے یہ لطیفہ کچھ اس روانی سے سنایا کہ تکلف کی ساری فضا تہس نہس ہوگئی۔ یوں لگا جیسے غفور صاحب کا "لکڑی والا یونانی مجسمہ" اچانک پیڈسٹل سے نیچے اُتر آیا ہو اور ایک جیتے جاگتے گوشت پوست والے آدمی کے روپ میں مجھ سے ہمکلام ہو۔ کئی سال سے یہ مجسمہ میرے ذہن میں جامد و ساکت کھڑا تھا جب اس مجسمہ کا پتھر پگھلنے لگا تو میں جی ہی جی میں خوش ہونے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے آبائی وطن کی سڑک پر پھر سے میرے مالکانہ حقوق بحال ہو گئے ہوں۔

غفور صاحب کا یہ روپ مجھے بہت پسند آیا اور اس کے بعد سے آج تک میں نے اُن کے اسی روپ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھا ہے۔ اُس دن انھوں نے بے شمار لطیفے سنائے۔ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر، وہ سچ مچ لطیفوں کے سوداگر ہیں۔ آپ کو جتنے لطیفے چاہئیں ان سے لے لیجئے۔ عمدہ لطیفے، اعلیٰ قسم کے لطیفے، پائیدار لطیفے۔ کسی موضوع یا مسئلہ پر اگر وہ لطیفے سنانا شروع کردیں تو مسئلہ تو ختم ہو جائے گا۔ لیکن غفور صاحب کے لطیفے ختم نہیں ہوں گے بلکہ بعد کو اُن کے لطیفے خود ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ بات میں سے بات یوں پیدا کریں گے جیسے ہم ہندوستانی بڑی صفائی سے بچے پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک کے بعد دُوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا میں اُن سے حیدرآباد میں متعارف ہوا تھا۔ چند دنوں بعد انہوں نے مجھے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ سرسنگار سمند کے قہقہہ پروگرام میں شرکت کرنے کے لئے۔

بمبئی میں غفور صاحب کو دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ بیماریوں کے معاملہ میں "زندہ طلسمات" کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت بمبئی کی تہذیبی زندگی میں غفور صاحب کو حاصل ہے۔ آپ کو کوئی بھی تہذیبی عارضہ لاحق ہو جائے تو آپ سیدھے غفور صاحب کے پاس چلے جائیے۔ بمبئی کا ہر تہذیبی مسئلہ غفور صاحب سے شروع ہوتا ہے اور ان ہی پر ختم ہوتا ہے۔ سردار جعفری نے غفور صاحب کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ "بمبئی کی تہذیبی زندگی غفور صاحب کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔" اس جملہ میں، میں یہ اضافہ

کرنا چاہتا ہوں کہ "مگر بمبئی کی تہذیبی زندگی کے بغیر غفور صاحب کافی مکمل رہتے ہیں"۔ جس کسی شخص کے ذہن میں بمبئی کی تہذیبی زندگی کو خوش گوار بنانے کا سودا سماتا ہے وہ سیدھے غفور صاحب کے پاس چلا جاتا ہے۔

اگر آپ کو کسی ادیب کی سالگرہ منانی ہو تو غفور صاحب کے پاس چلے جائیے۔ کسی فنکار کی برسی منانا چاہتے ہوں تو غفور صاحب کو پکڑ لیجئے۔ کسی کا تعزیتی جلسہ منعقد کرنا ہو تو غفور صاحب موجود ہیں۔ موسیقی کی محفل آراستہ کرنا ہو تو غفور صاحب سے رجوع کیجئے۔ حد تو یہ کہ قوالی کی محفلیں بھی غفور صاحب کی زد میں آجاتی ہیں۔ یہ کرنا ہو تو غفور صاحب، وہ کرنا ہو تو غفور صاحب، کہیں یہ ہو رہا ہو تو غفور صاحب، کہیں وہ ہو رہا ہے تو غفور صاحب۔ غرض بمبئی میں غفور صاحب کا حال اُس اعرابی کے اونٹ کا سا ہے جس سے کسی نے پوچھا کہ "میاں تم کیا کھاتے ہو؟" اعرابی نے کہا "اونٹ"۔ "کیا پیتے ہو؟" اعرابی نے جواب دیا: "اونٹ"۔

"کیا پہنتے ہو؟" - "اونٹ"

"کہاں رہتے ہو؟" - "اونٹ"

مخاطب اس "اونٹ، اونٹ" کی تکرار سے چڑ کر بولا۔ "میاں یہ کیا تم نے اونٹ اونٹ کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

اعرابی بولا۔ "صاحب اونٹ کا گوشت کھاتا ہوں۔ اونٹ کا دودھ پیتا ہوں۔ اونٹ کی کھال پہنتا ہوں۔ اور اونٹ کی کھال کے خیمہ میں رہتا ہوں۔ بھلا اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ غفور صاحب بمبئی کی تہذیبی زندگی کے "اونٹ" ہیں۔ اور بمبئی کی تہذیبی زندگی ان کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو اعرابی اونٹ کے ساتھ کرتا ہے۔ لہٰذا کبھی کبھی تو بمبئی کی تہذیبی زندگی غفور صاحب کی کھال بھی پہن لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ادھر کئی برسوں سے بمبئی کی تہذیبی زندگی کا یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا ہے۔ لوگ اسے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ اب یہ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ شاید یہ اونٹ لطیفوں اور مزاح نگاری کی کروٹ بیٹھ جائے۔

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ غفور صاحب کو صرف لطیفوں سے ہی نہیں بلکہ سارے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہے۔ موسیقی سے انہیں بے پناہ لگاؤ ہے۔ ایک بار میں نے اُن کے مکان پر بمبئی کے ایک مشہور فلمی میوزک ڈائرکٹر کو اُن سے موسیقی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہیں غفور صاحب "پلے بیک میوزک ڈائرکشن" بھی نہ دیتے ہوں اور ہمیں اب تک اس کی خبر نہ ہو سکی ہو۔ ان کا گھر بمبئی کے فلمسٹاروں، فنکاروں، مصوروں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کا مرکز ہے۔

وہ ہر شخص سے اس کے پسندیدہ موضوع پر بات کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ صحافی سے بات کریں گے تو صحافی بن جائیں گے۔ مصور سے بات کریں گے تو مصور بن جائیں گے۔ صرف ایک ہی معاملہ میں، میں

لے انھیں بے بس پایا ہے۔ یعنی جب وہ اپنی بیوی سے بات کرتے ہیں تو خود بیوی نہیں بن سکتے۔ کیا کریں یہ تو قدرت کی مجبوری ہے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ یہ بھی بن جاتے۔ اتنی تیزی سے مختلف سانچوں میں ڈھلنے والی شخصیتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔

غفور صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس کام میں منہمک ہوجاتے ہیں اُسے پورا کر کے رہتے ہیں، پھر کسی رکاوٹ یا مجبوری کا خیال نہیں کرتے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جس کا تعلق سردی سے اُن کی "الرجی" سے ہے۔ الرجی بڑی عجیب وغریب اور لطیف شئے ہوتی ہے۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی شئے سے الرجی ہوجاتی ہے۔ مثلاً امیر آدمی کو غریب سے الرجی ہوتی ہے۔ تاجر کو انکم ٹیکس کے عہدیداروں سے الرجی ہوتی ہے۔ سوتنترا پارٹی کو سوشلزم سے الرجی ہوجاتی ہے۔ امریکہ کو ویٹ نام سے الرجی ہوتی ہے۔ ماوزے تنگ کو روس سے اور اسرائیل کو عربوں سے الرجی ہوجاتی ہے۔

غفور صاحب چونکہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں ہیں اسی لئے انھیں صرف سردی سے "الرجی" ہوجاتی ہے جیسے ہی کوئی سرد شئے غلطی سے اُن کے بدن میں پہونچ جاتی ہے، سکنڈوں میں ان پر کھانسی کا شدید دورہ پڑتا ہے۔ پھر کھانسی بھی ایسی شدید کہ سانس لینا دوبھر ہوجائے اور دیکھنے والا خوف زدہ ہوجائے۔ ایک دن وہ اپنے مکان پر بیٹھے حسب معمول نئے نئے لطیفے سنا رہے تھے کہ غلطی سے انھوں نے دوا کی ایسی گولی کھالی جس سے انھیں الرجی ہوجاتی ہے انھوں نے آدھا لطیفہ ہی سنایا تھا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ لطیفہ جوں کا توں رہ گیا اور ہم سب لوگ پریشان ہوگئے اب غفور صاحب نہ سانس لے سکتے ہیں نہ بات کرسکتے ہیں اور نہ ہی چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر میں بھی سانس لینا کم وبیش بھول گیا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا اور جیسے ہی اس نے اینٹی الرجی انجکشن دیا وہ اچانک نارمل حالت پر آگئے۔ میں اس وقت تک اس ادھورے لطیفے کو بھول گیا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں کس کی شامت پکاری ہے کہ وہ لطیفے کے بارے میں سوچے لیکن جیسے ہی غفور صاحب کا نظام تنفس بحال ہوا اور وہ بات کرنے کے قابل ہوئے اُنہوں نے اپنی تکلیف یا الرجی کے بارے میں کوئی رسمی اظہار خیال کئے بغیر اچانک وہ ادھورا لطیفہ سنانا شروع کردیا کہ "ہاں بھئی! تو ہمارا لطیفہ کہاں تک پہنچا تھا۔ تو پھر آگے یوں ہوا کہ ــــ" اور پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے نہ صرف لطیفہ کو مکمل کیا بلکہ لطیفہ سے متعلق ضروری ہنسی بھی ہنس دی۔

غفور صاحب کا حلقۂ احباب بے حد وسیع ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ انواع واقسام کے دوستوں سے کس طرح نباہ کرلیتے ہیں۔ تاجر، ادیب، فنکار، موسیقار، سرمایہ دار، سیاستداں، مزدور، فلمی اداکار غرض ہر قماش کا آدمی ان کا دوست ہوگا اور آپ ان کی شخصیت کی لچکداری کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران رہ جائیں گے۔

اُردو طنز ومزاح سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے۔ انہوں نے ہر سطح پر اس صنف ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

"قہقہہ زار" کے بعد "شگوفہ زار" "لالہ زار" اور "گل وگلزار" کی اشاعت کے ذریعے انہوں نے اُردو طنز ومزاح

کو بہت کچھ دیا ہے۔ کنہیا لال کپور نے ایک بار ایک محفل میں "شگوفہ زار" کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ کتاب اُردو طنز و مزاح کی ایک ڈائریکٹری ہے اور اسے ہر مزاح نگار کو پڑھنا چاہیئے۔"

غفور صاحب ادبی محفلوں میں لطیفے بھی سناتے ہیں۔ لطیفہ سنانے کا ڈھنگ انھیں خوب آتا ہے۔ وہ لطیفہ کو آدمی کے اوپر اچانک مسلط نہیں کرتے بلکہ دھیمے دھیمے لطیفے کی لطافت کو سننے والے کے اندر اُتار دیتے ہیں۔ یہی انداز ان کے مزاحیہ مضامین کا بھی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین پڑھئے تو احساس ہو گا کہ آپ بیک وقت شرافت اور ظرافت دونوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

غفور صاحب جیسی شخصیتیں ہماری ادبی و تہذیبی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں اور ایسی شخصیتوں کو دیکھ کر ہی ہمیں یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں شریف اور نیک نفس انسانوں کی پیدائش ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے۔ شریف آدمی اگر پیدا ہونا چاہیں تو وہ پیدا ہو سکتے ہیں اور اپنے کئے کی سزا پا سکتے ہیں۔

— —

(آدمی نامہ) ۱۹۷۰ء

مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور (بہار)

"خواجہ عبدالغفور سے ایک انٹرویو"

خواجہ عبدالغفور صاحب سے یہ انٹرویو اسی سال کے اوائل میں لیا تھا۔ کیا پتہ تھا کہ اتنی جلدی کچھ اور بتائے سے قبل وہ ہم سے بچھڑ جائیں گے۔

خواجہ صاحب اپنی تحریروں میں جتنے غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں، عملی زندگی میں وہ اتنے ہی سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کا یہ سلسلہ شہری زندگی، صنعتی برق رفتاری، متوسط طبقہ کی نمائندگی اور رسم و رواج کے پھیلاؤ سے جا ملتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے طنز و مزاح میں وسیع ذوق، گہرا سماجی و معاشی شعور، مشاہدہ، باریک بینی، اور عمیق غور و فکر نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں تلخی کا گزر نہیں ہے۔ خوشی ہے، مسرت ہے اور شیرینی ہے۔ ویسے شیرینی کی یہ چاشنی ان کی شخصیت میں بھی ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب میرے کرم فرما رہے ہیں اس لئے "شیرینی" سے "آشنائی" کا میں گواہ ہوں، اپنی بے حد مصروف زندگی سے وقت چرا کر انہوں نے میرے سوالات کے جوابات دیئے ہیں، پھر بھی وقت کی تنگی کا احساس ہوتا ہے۔

میں نے ان سے پہلا سوال کیا!

ہرگانوی: — آپ کی پیدائش کب ہوئی؟

غفور: — وظیفۂ حسنِ خدمت حاصل کر کے چھ سال ہوئے ہیں۔

ہرگانوی: — آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟

غفور: — عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس میں تعلیم بذریعہ اردو ہوئی اور پھر یہ سلسلہ سول سروس کی کلاس تک جاری رہا۔ عملی تربیت برٹش انڈیا اور بالآخر یو این او (U.N.O.) کے فیلوشپ پر نیویارک کے مستقر پر ہوئی۔ فیڈرل سیکوریٹی ایجنسی واشنگٹن (ڈی سی) سے پبلک ویلفیر اینڈ منسٹریشن کا ڈپلوما ملا اور میرٹ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ خوش قسمتی سے تعلیم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بمبئی یونیورسٹی کے پاس پیش کیا۔ لیکن ہر

شخص کی تعلیم سے بڑھ کر اس کی تربیت ہوتی ہے۔ میرے والدِ محترم نے مجھے اس تنظیم سے تربیت دی کہ اپنی زندگی میں وہ سب کچھ ملا جس کی میں تمنا اور آرزو کر سکتا تھا اور ایسی کوئی حسرت نہیں کہ جس کے لئے میں اللہ تعالیٰ سے گِلہ کر سکوں۔

ہرگانوی :۔ آپ نے کون کون سی ملازمت کی ہے ؟

غفور :۔ میں نے سچ پوچھئے تو ملازمت کی ہی نہیں اور نہ آفیسری کی۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اہلکار اور خدمت گار (خدمت گزار) سمجھا۔ سول سروس کا رکن ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو سول سرونٹ ہی سمجھا۔ بعد کو یہ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس میں تبدیل کردی گئی۔ اس لحاظ سے میں نے ایڈمنسٹریٹو کا روپ دھارلیا اور بالعموم ۔۔۔ جس طرح کی ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں وہ سب میں نے سنبھالیں۔ کبھی اسسٹنٹ کلکٹر تو کبھی آفیسر برائے ترقیات عامہ ۔ کلکٹر ۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈائرکٹر۔ انڈسٹریز ۔ کمشنر ٹرانسپورٹ ۔ کمشنر سیلس ٹیکس تو رہا ہی لیکن ڈائرکٹر سوشل ویلفیر کے عہدہ اور اس کی کارکردگی سے پندرہ سال لگاؤ رہا۔ اس عہدہ کی بدولت آج کے کمیونٹی پراجکٹ کے منصوبوں اور اسکیموں کی داغ بیل ڈالی بشریات (عمرانیات و نفسیات) اور انتھراپولوجی کو عملی شکل سے ڈھالینے کے لئے APPLIED ANTHROPOLOGY پر بالکل نئے انداز لئے کام کیا۔ پندرہ کتب اور جریدے انگریزی میں شائع کئے جن میں سے کچھ U.N.O. اور I.L.O. کی جانب سے شائع کی گیئں۔

ہرگانوی :۔ اچھا! آپ کے ادبی سفر کا آغاز کب ہوا ؟

غفور :۔ اچھا ہوا آپ نے سوال ادبی سفر کا پوچھا۔ ادبی کارنامہ کہا ہوتا تو مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑتا کہ کارنامہ کی اصطلاح سرکاری زبان میں اس کتاب کے لئے استعمال کی جاتی ہے کہ جو نان گزیٹیڈ ملازم سرکاری سروس کا کچا چٹھا ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کا اشارہ ادبی سفر کی طرف ہے۔ جب زندگی کا سفر شروع ہوا تو کسی لحاظ سے ادبی نہیں تھا۔ محض سفر تھا۔ کم عمری ہی میں نشرگاہ لاسکی حیدرآباد سے کچھ نہ کچھ ہنسنے ہنسانے کی باتیں سنا لیا کرتا۔ پہلا مضمون "شیر کا شکار" تھا۔ یہ شیر نہ تو میرا تھا، نہ میں نے شکار کیا تھا۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ رہ کر جو دیکھا تھا اس کے مضحک پہلو بیان کئے تھے یہ آج کہلائے جاسکتے ہیں، پھر انگریزی ادب کا سلسلہ چلتا رہا اور یہ کمند اس وقت ٹوٹی جب دورانِ ملازمت اتنی تبدیلیاں ہوئیں کہ کوئی مضمون یا موضوع قابو میں نہیں رہا۔ تب تو اپنے پہلے عشق اردو کی طرف رجوع ہونا پڑا۔

ہرگانوی :۔ آپ نے طنز و مزاح کی طرف ہی کیوں توجہ دی ؟

غفور :۔ طنز و مزاح کی طرف میں نے توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ طنز و مزاح نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر قدم پہ، ہر ماحول میں ہر جگہ آدمی کو مزاح اور ظرافت ملتے ہیں بشرطیکہ اس کے مزاح کی حِسِ تانہ دم رہے اور اس میں تبسم لطیف کی کمی نہ ہو۔ ہمارے کسی عزیز کی منّی سی لڑکی اپنے والدین کے ساتھ آئی تو ہم نے کہا "ارے بھئی اس کو کچھ چاکلیٹ تو دینا" ملاقات کی گرمجوشی میں ہماری بیگم نے یہ بات برابر سے نہیں سنی۔ سلسلۂ گفتگو ایسا چلا کہ سب ہی مصروف ہوگئے۔ کچھ دیر بعد اس منّی نے چاکلیٹ والی بات یاد دلانے کی خاطر کہا "انکل کی بات تو کوئی سنتا ہی نہیں"

اس طرح کے سینکڑوں واقعات اور مضحکات ہوتے ہی رہتے ہیں اور کہیں نہ کہیں ایسی بات ہوتی ہی ہے کہ جو طنز و مزاح، ظرافت، بذلہ سنجی وغیرہ کی صنف میں جکڑی جا سکتی ہے اور جس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجھے شروع سے یہ بات کچھ پسند نہ تھی کہ اتنی ساری اصنافِ سخن بے شمار اسلوبِ بیان، بے حد و حساب اقسامِ گفتگو ہوتے ہوئے کہ جو اپنی حد تک ایک مستقل موضوع ہیں، ہم سب کو طنز و مزاح کہہ کر لپیٹ لیتے ہیں۔ میں نے حد بندی یا درجہ بندی شروع کی تو مجھے تقریباً ۱۲۵ اصناف اور انواع ایسی ملیں کہ جو علیحدہ علیحدہ ظرافت و لطافت کی نمائندہ ہیں۔ وہیں سے میں نے اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز کی۔ چنانچہ "شگوفہ زار" کو میں شاہکار نہ سہی اپنا کارنامہ ضرور سمجھتا ہوں۔ اس درجہ بندی یا صنف بندی کے تعلق سے میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ چاہے وہ رشید احمد صدیقی ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا۔ جب کبھی طنز و مزاح کے تعلق سے کچھ لکھتے ہیں یا اپنا مقالہ جیسا انشائیہ ترتیب دیتے ہیں تو وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو کا اسلوب کیا ہے، کرشن چندر کس طرح لکھتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا اندازِ بیان کیا ہے، راجندر سنگھ بیدی نے کیا لکھا، شفیق الرحمن کی تحریروں میں کیا خاص بات ہے، راجہ مہدی علی کی پیروڈی کیسی ہے۔ رضا نقوی واہی کا مزاحیہ کلام کس نوعیت کا ہے۔ یہ سب کے سب ادیبوں شاعروں کا چوکھٹا بناڈالتے ہیں۔ ان کو طنز و مزاح کے کسی خاص فریم ورک میں نہیں بیٹھاتے — اس ضرورت اور اس کمی کو میں نے پوری کرنے کی کوشش کی ہے جس کی سب نے سراہنا کی اور اس کام کو سنگِ میل قرار دیا۔

ہرگھانوی:۔ نئی نسل کیا چیز ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

غفور:۔ نئی نسل کیا چیز ہے، نئے اور پرانے میں حدِ فاصل کہاں ہے؟ خطِ استواء کی طرح دراصل یہ بھی ایک نظریاتی حد بندی ہے۔ ہے بھی اور نہیں بھی، کوئی نہیں بتا سکتا، کہاں ہے! — جہاں اختلاف رائے ہو تو ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک طرف روایتی دقیانوسی خیالات والے صف آرا ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف نئی سوجھ بوجھ اور جولانی طبع والے۔ آج کے جدید یئے آنے والے کل میں قدیم ہو جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں نئی نسل والے وہ ہیں کہ جو فرار کی طرف مائل ہیں۔ جو پرانی باتوں اور پرانے ماحول سے بور ہو چکے ہیں — خواہ مخواہ، بعض کسی ضرورت کے تحت اور بعض تو یوں ہی، اس طرح کہ جیسے اچھے بھلے گھرانے والے مرفع الحال نوجوان HIPPY بن جاتے ہیں، اس طرح ہمارے نوجوان طبقہ میں بھی بغاوت کے جذبے ابھرتے ہیں اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا تعلق نئی نسل سے ہے، اس کی خاطر وہ بہت سارے کرتب دکھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی کرامات ہیں اور وہ ان کے مظہر ہیں بلکہ مظہرالعجائبات۔ ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادیت اور شخصیت کو اپنے پہلے قدم سے ہی منوانا چاہتا ہے، جن میں خداداد صلاحیت اور اہلیت ہوتی ہے وہ بے شک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی لکیر پیٹتے ہیں اور دوسروں کو لکیر کا فقیر سمجھتے ہیں۔

ہرگانوی :۔ فن اور مواد میں آپ کس کو کس پر ترجیح دیتے ہیں ؟

غفور :۔ فن اور مواد میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ فن فنکار کو بڑا آدمی بناتا ہے۔ وہ صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اہلیت، کارکردگی کو اجاگر کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ فنکار کی شخصیت کو جھلکاتا ہے۔ برخلاف اس کے مواد محض ایک انبار ہوتا ہے جس میں سب کچھ ہوتا ہے۔ کوڑا کرکٹ ہوتا ہے، گند ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر مواد وہ بنیاد تیار کرتا ہے کہ جس پر فنکاری اور صناعی کی مدد سے شاندار عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا استعمال چابک دستی سے کیا جائے۔

ہرگانوی :۔ آپ اپنے موضوعات کا انتخاب شعوری طور پر کرتے ہیں یا پھر موضوعات آپ کے تجربوں اور مشاہدوں سے ابھر کر آتے ہیں ؟

غفور :۔ موضوعات میں جہاں انتخاب ہوتا ہے وہاں پر ان کے اطراف ایک فصیل کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر اپنی فکر و دانش کو محصور کرنا پڑتا ہے۔ وہ موضوعات قابلِ اعتنا ہوتے ہیں کہ جو لاشعوری طور پر فکر و بصیرت کو دعوت دیتے ہیں۔ کبھی کبھار مشاہدہ موضوع کو سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ مزاح کی رگ پھڑک اٹھتی ہے اور شعور موضوع کا ایک ہیولا کھڑا کر دیتا ہے، اس لئے یہ امر واقع ہوا ہے کہ تجربہ، صورت واقعہ یا سانحہ ایک IMAGE کھڑا کر دیتا ہے، اس وقت جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ امیجری یا خاکہ نگاری کا پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی تمثیل اس طرح پر دی جا سکتی ہے کہ کسی کی نظروں کے سامنے ایک مچھلی رکھ دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ اس پر ایک مضمون لکھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ مچھلی کے خد و خال اس کے جسم کا تناسب اور اس طرح کی جسمانی اور ظاہری تصویر کو الفاظ کا جامہ دے سکے گا۔ برخلاف اس کے کوئی صاحبِ بصیرت اپنے مشاہدہ، اپنے تصور، اپنی IMAGERY کے زور پر کچھ باتیں شعور اور لاشعور اور فکر سے دماغ میں سجھاتا ہے پر اپنے اسلوب تحریر اور نگارشِ قلم سے کچھ صفحے کالے کرتا ہے، موضوع خود بخود سلونتا ہے اور بالآخر ایک انشائیہ، افسانہ، شعری تخلیق جنم لیتے ہیں۔ یہ ہے اصل فن

ہرگانوی :۔ آپ اپنی تحریروں کا، اپنے مزاح کا محاسبہ کس طرح کرتے ہیں ؟

غفور :۔ اپنی تحریروں اور اپنے مزاح کا محاسبہ میں خود کرنے بیٹھوں تو اتنی ساری دماغی الجھنوں میں مبتلا ہو جاؤں گا کہ آئندہ قلم اٹھانا بھی محال ہو جائے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص روزانہ یا وقتاً فوقتاً اپنے ضمیر کو للکارتا ہے کہ ذرا بتانا تو میں نے کیا کیا گناہ کئے ہیں ؟ میں نے تو ہمیشہ قلم برداشتہ لکھا ہے اور لکھنے کے بعد ایک نظر صرف اس غرض سے ڈالی ہے کہ کہیں کوئی انہونی بات تو ضبطِ قلم نہیں ہوئی جو کسی کے دل کو دکھ پہنچائے یا کسی اور معیار سے ہٹی ہوئی نہ ہو۔

ہرگانوی :۔ کیا ہمارے گزشتہ طنز و مزاح نگاروں کے یہاں تنوع اور انفرادیت زیادہ تھی ؟ آج اور کل کے تناظر میں مزاحیہ ادب یا مزاح نگاروں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ؟

غفور :۔ طنز و مزاح نگاروں کو بلکہ کسی بھی ادیب یا شاعر کو مرحوم نہیں سمجھتا۔ اگر اس کی تحریر زندہ ہے اور آج بھی پڑھی جاتی ہے تو وہ خود آج کا انسان ہے۔ امتزاجِ زمانہ کے ساتھ نگارشات میں بے شک تنوع آتا رہا ہے۔

یہ گردشِ دوراں کا اثر ہے۔ ادیب کے احساسات اور تاثرات کا نتیجہ ہے۔ بدلتے ہوئے ادوار میں اردو زبان نے تو بطور خاص زمانہ کا ساتھ دیا ہے اور ہر ترقی پسند تحریک میں اردو ادب آگے رہا ہے۔ گزشتہ دور میں مزاح نگاروں نے کبھی مزاحیہ کردار کی تخلیق کر کے ان کے سہارے ظرافت پیدا کی ہے کبھی ملا رموزی کی طرح گلابی اردو کو وسیلہ بنایا، کہیں ریختی نے کہیں پیروڈی نے تو کہیں بیربل ملا دوپیازہ کی چشمک نے ملا نصیرالدین کو ترکی سے گھسیٹ لیا۔ لیکن نئے دور کے نئے لکھنے والوں نے زندگی کی ہما ہمی، روزمرہ کی روانی میں جو ناہمواریاں، جو مضحکات دیکھے انہیں کو قلم بند کیا۔ مشاہدہ نے وہ کام کیا جس کے لئے وسیلہ یا کسی گیمک کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی سے زیادہ قریب ہیں اور لائق ستائش۔

ہرگانوی :۔ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو زیادہ تر نقاد میسر نہیں ہو سکے اس کے کیا اسباب ہیں؟

غفور :۔ اردو کے طنزیہ یا مزاحیہ ادب کو نقاد کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ یہ جب روزمرہ سے متعلق ہو گیا تو ہر ہر قاری اور سامع اس کا نقاد ہے اس لئے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ادب کی اس صنف کے لئے کوئی نقاد نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ طنز و مزاح کی اصناف، اقسام یا انواع کی درجہ بندی اب تک نہیں کی گئی۔ میری تصنیف "شگوفہ زار" اس خصوص میں پہلی کاوش ہے جو مزاحیہ ادب کی ایک طرح کی تنقید ہے۔ نقادوں نے مخصوص ادیبوں کے مزاحیہ اسلوب کی پذیرائی کی یا ان کی خامیاں چن کر نکالیں، تنقید نہیں کی۔ اس لئے یہ صنف متروک نظر آتی ہے۔

ہرگانوی :۔ کیا خوش مزاجی کو یا خوش مذاقی کو یا محض شگفتگی کو مزاح کہا جا سکتا ہے؟

غفور :۔ خوش مزاجی، خوش مذاقی اور شگفتگی مزاح کے محرکات ہیں، بذاتِ خود مزاح نہیں، اس طرح شئے لطیف اور مزاح کی حس بھی محرکات ہیں۔ انہیں سے بذلہ سنجی پیدا ہوتی ہے۔ البتہ طنز و استہزا کی قدریں علیحدہ ہیں۔ وہ ان جذبات و احساسات کے الٹ ہیں اور ان سے مزاح نہیں بلکہ ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔

ہرگانوی :۔ WIT تک پہنچتے پہنچتے مزاح کتنے مدارج طے کرتا ہے؟

غفور :۔ WIT بذلہ سنجی کا نام ہے اور یہ مزاح کی اعلیٰ ترین صنف ہے جب تک آدمی دانشور نہ ہو، اس کی فکر اعلیٰ نہ ہو، یہ صنف کسی کے قابو میں نہیں رہتی اس کے لئے حاضر دماغی بھی لازمی ہے۔ جب تک مزاح کے نچلے مدارج طے نہ ہو جائیں ہر کسی کو WIT پر قدرت نہیں حاصل ہوتی۔

ہرگانوی :۔ ملکی اور غیر ملکی طنز و مزاح نگاروں میں آپ کن کن سے متاثر ہوئے؟

غفور :۔ سچ پوچھئے تو میں مزاح نگاروں سے نہیں بلکہ روزمرہ کی عملی زندگی میں جو مزاح، ظرافت، اور لطافت پائی جاتی ہے، اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ مشاہدہ اور سماعت اپنے تابع ہوں تو ہر طرف مزاح بلتا ہے اور اس کے موڈ کو پکڑ لیا جائے تو وہی بہترین مزاح ہوتا ہے۔

ہرگانوی :۔ آپ نے صنفِ لطیفہ گوئی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ کیا یہ صنف مقبولیت حاصل کرے گی؟

غفور :۔ میں نے لطیفہ گوئی کو ایک خاص مقام عطا کرنے کی کوشش اس لئے کی ہے کہ فنونِ لطیفہ میں اس کا جائز

مقام ضرور تھا۔ ملا نصیر الدین، راجہ بیربل، ملا دوپیازہ، شیخ چلی اور اس طرح کی کتنی ہی شخصیتیں ہیں کہ جو ابھرنے کے بعد آج تک زندہ ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی ان کی باتیں دہراتے ہیں اور اپنے دل سے جوڑ جوڑ کر اس سرمایہ کو بڑھاتے جاتے ہیں۔ اور یہی سب سے زیادہ معروف و مقبول صنف ہے۔ اس لئے اس کو صیقل دینے اور چمکانے کی ضرورت تھی کہ یہ زندگی کا لازمی جز ہے، جس طرح سے کہانی مقبول ہوتی جارہی ہے، اسی طرح لطیفے چٹکلے بھی ہر دل عزیز ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور کنہیا لال کپور نے میری اس کاوش کی ستائش کی ہے۔

ہرگانوی :۔ نثری نظم اور آزاد غزل کے تجربے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

غفور :۔ نثری نظم اور آزاد غزل کے تعلق سے میں اپنی رائے یہاں پیش نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ وہ موضوع ابھی اس دور سے گزر رہے ہیں کہ جہاں غائر مطالعہ کی ضرورت ہے اور سچ پوچھئے تو میں اس خصوص میں کسی قسم کی رائے دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔

ہرگانوی :۔ ترجمے کی افادیت کیا ہے؟

غفور :۔ اردو ادب کے لئے ترجمہ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ۷۵ سال پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں جس وقت اردو میڈیم سے تعلیم دینے کا تصفیہ کیا گیا تو سب سے پہلے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور اس سے اردو ادب مالا مال ہوا، آج بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ نہ صرف بدیسی زبانوں بلکہ ہندوستانی زبانوں کے جواہر پارے کو اردو میں منتقل کرنا ضروری ہے۔

ہرگانوی :۔ ہمارے بچوں کے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

غفور :۔ بچوں کے ادب سے جتنی بے اعتنائی برتی گئی ہے اور اس کو جس قدر NEGLECT کیا جارہا ہے اس سے سب ہی واقف ہیں، اس کے لئے بطور خاص کوشش کی جانا از حد ضروری ہے۔ ورنہ آئندہ نسل اردو سے بے بہرہ اور جاہل مطلق رہ جائے گی۔ اس کے لئے کارٹون اور فلموں، ڈراموں کو مقبول بنانا از حد ضروری ہے۔

ہرگانوی :۔ ادب میں جنس کس حد تک جائز ہے؟

غفور :۔ جنس زندگی اور حیات کا لازمی جز ہے۔ اس کو ادب سے علیٰحدہ کرنا گناہ عظیم کا ارتکاب ہے۔ زندگی کی حقیقت پر کسی طرح پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ البتہ زبان و الفاظ کا صحیح انتخاب فحش نگاری سے اجتناب ضروری ہے۔

ہرگانوی :۔ حسن و عشق کے متعلق آپ کا نظریہ؟

غفور :۔ حسن و عشق بھی لوازمات زندگی میں سے ہیں۔ ادب سے اس کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

ہرگانوی :۔ آپ کی دانست میں آج کے انسان کے کرب کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

غفور :۔ جدید ادب کا رجحان آج کے انسان کے کرب کی طرف ہے۔ انسان ہر دور، ہر زمانہ میں کرب و اذیت کا مقابلہ کرتا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی نفاست اور اس کی اچھی باتیں بھی ساتھ چلتی رہی ہیں۔ لیکن بدقسمتی

آج کا نوجوان طبقہ کرب کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ جس سے کبھی کبھی طبیعت منغض ہو جاتی ہے، اور گھٹن محسوس ہوتی ہے۔

ہرگانوی:۔ کیا آپ اردو کے مستقبل سے مطمئن ہیں؟

غفور:۔ اردو کے مستقبل سے میں ہر طرح مطمئن ہوں، بالخصوص (ہندی) فلموں نے اس کو بڑا زبردست سہارا دیا ہے۔ غزل، قوالی اور گیت کی مقبولیت اس کا بین ثبوت ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی کے نام خواجہ صاحب کا آخری خط

بمبئی ۱۲/۱/۹۴

مکرم بندہ۔ تسلیمات

آپ کا کرم نامہ موصول ہوا۔ آپ کا ارسال کردہ انٹرویو بھی دفتر میں ملا۔ لاجواب اور بہت خوب ہے۔ میں دو ہفتہ ہسپتال میں تھا اس لئے بر وقت آپ کی یاد آوری کا جواب نہ دے سکا۔ 'توازن' کے لئے میں انشاء اللہ بہت جلد کچھ بھیجوں گا۔ 'محرک' کا ایک شمارہ ملا بشکور ہوں۔ علمی و ادبی اعتبار سے بہت خوب ہے۔ لائق تحسین ہے۔ کوہسار کے لئے منتظر ہوں۔

بہت جلد تفصیلی خط لکھوں گا۔

تازہ شمارہ 'امکان' علیحدہ مرسل خدمت ہے۔ دو ایک کتابیں مل جائیں تو وہ بھی روانہ کردوں گا۔ مخلص۔

خواجہ عبدالغفور

ہرگانوی:۔ اردو اکیڈمیوں کے ذریعے ابھی تک اردو کے کاز کے لئے ٹھوس کام نہیں ہو سکا۔ آخر کیا وجوہ ہیں
غفور:۔ یہ غلط ہے کہ اردو اکیڈمیوں کے ذریعے اردو کے کاز کے لئے ٹھوس کام نہ ہو سکا۔ جو اس خیال کے حامی ہیں آخر وہ بتائیں تو کہ اکاڈمیوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور کیسا کرنا چاہیئے۔ اردو ترقی بورڈ پر یہ الزام کیوں

ہیں عائد کیا جاتا. لوگ اس کی کارکردگی سے خوش ہیں تو اکاڈمی بھی تو وہی کر رہی ہے۔ ریاستی اردو اکاڈمی بورڈ
کارکردگی پر کیوں نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ اکاڈمیوں سے کیا توقعات وابستہ ہیں کوئی اس کی صراحت کرے
اردو کے کاز کا بھلا ہوگا۔ محض بہتان اور الزام لگانے سے کام نہیں بنے گا۔

ہرگانوی :۔ کیا آپ اردو صحافت سے مطمئن ہیں ؟

غفور :۔ اردو صحافت سے میں ہر طرح مطمئن ہوں اور اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اس کے اعلیٰ معیار کو بھی میں مانتا ہوں۔

ہرگانوی :۔ ان دنوں آپ کیا کچھ لکھ رہے ہیں ؟

غفور :۔ ان دنوں "قومی راج (پندرہ روزہ)" اور "امکان" کی ادارت ہمہ وقتی ذمہ داریاں ہیں۔ اکاڈمی ... سیمینار، مشاعرے، مذاکرے یہ سب مشغول و مصروف رکھتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی پروگرام بھی میری توجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ جامعۂ اردو علیگڑھ کی گورننگ کونسل کا رکن اور نظامس اردو ٹرسٹ کا ٹرسٹی بھی ہوں۔

ہرگانوی :۔ اردو میں آپ کی کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں !

غفور :۔ "قہقہہ زار، لالہ زار، گل و گلزار، سمن زار، اور طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے مراٹھی اور ہندی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ "شگوفہ زار" کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا۔

ہرگانوی :۔ شکریہ۔

غفور :۔ شکریہ۔

خواجہ عبدالغفور کے نام شکیل الرحمٰن کا ایک خط

محترم خواجہ صاحب، آداب۔

رات آپ کی محفل سے اُٹھا تو محسوس ہوا جیسے اپنے ساتھ پوری محفل لئے جا رہا ہوں۔ یہ آپ کی دلنواز شخصیت کا کرشمہ ہے کہ ساڑھے بارہ بجے لاڈ پہنچا اور دیر تک اُن لمحوں میں کھویا رہا جن میں آپ سب ملے تھے۔ آپ کی پرخلوص شخصیت کا ذکر تو سُنا تھا، اتنے قریب سے دیکھا نہ تھا، بے حد متاثر ہوں آپ کی محبت اور شکیل نوازی سے۔ اس محفل میں مجھے بھی یاد کیا اس کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔

صاحب! آپ نے ایک رشتہ قائم کر لیا ہے دیکھئے ٹوٹے نہ کبھی!

۲۴ر فروری کی صبح روانگی ہے انشاء اللہ، اس سے قبل آپ سے ایک ملاقات اور ہو جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی تصور کروں گا۔ میرا پتہ اوپر درج ہے جب چاہے بُلا لیجئے۔ آپ سے ایک ضروری مشورہ بھی کرنا ہے۔

آپ کا تیار کیا ہوا کیسٹ بہت قیمتی ہے۔ ترمیم و اضافے کے بعد اسے اور بھی بہتر صورت دے سکتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس کی بڑی ضرورت ہے اور خصوصاً ان طلبہ و طالبات کے لئے جن کا تعلق باہر کے ملکوں سے ہوتا ہے، اُردو کی تعلیم کے لئے اُن کے داخلے اپنے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو حروف اور رسم خط کے متعلق جذباتی انداز سے گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ منطقی اور سچی بات کرنے کی ضرورت ہے۔ کبھی موقع ملا تو اس موضوع پر اپنے خیالات رکھوں گا۔ آپ کا عنایت کیا ہوا تحفہ بہت قیمتی ہے، آج اس کا مطالعہ کیا، ایسے عمدہ کام پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ بلاشبہ "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" جدید اُردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

دو باتیں:

(۱) اس کتاب کا نام صرف "طنز و مزاح" ہونا چاہیئے تھا، "تنقیدی جائزہ" کی ضرورت نہیں تھی، اس سے عنوان ہلکا ہو جاتا ہے، "تنقیدی جائزہ"، غالباً اس لئے شامل ہے کہ یہ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے یا اس کا کوئی طویل حصہ ہو، رجسٹریشن کے وقت نگراں حضرات عنوانات اور موضوعات کے سلسلے میں ایسے تماشے کرتے ہیں۔ اشاعت کے وقت خیال رکھا

جاسکتا تھا، یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کا مزاج دوسرا ہے۔ تیور عام تنقیدی مقالوں سے مختلف ہے، اس کا قد اونچا ہے، یہ عام تنقیدی جائزہ نہیں ہے، طنز و مزاح پر عالمانہ گفتگو ہے جو ابھی تک کسی نے نہیں کی ہے۔ اس سے اور بھی چراغ روشن ہوں گے۔ اور

(۲) "حرفے چند" کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کا پیش لفظ کافی تھا، قالین میں ٹاٹ کے یہ پیوند بھلا کیوں؟ دوسرے ایڈیشن کے وقت ایک بار ان دونوں باتوں پر ضرور غور کیجئے گا۔ پسند نہ آئے تو نظر انداز کر دیجئے گا۔

آپ کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آہستہ آہستہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیتی جاتی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں اردو کے کسی ناقد کی نہیں بلکہ انگریزی کے کسی صاحبِ طرز نقاد کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نثری اسلوب، شاعری کا مارا ہوا اسلوب نہیں ہے بلکہ خیالات کو پیش کرنے کا ایک منفرد فطری اسلوب ہے جس کی بنیادی Exactness خصوصیت ہے۔ جو بات کہی ہے اس کے وزن کا پہلے ہی اندازہ کر لیا ہے۔ اردو کی ادبی تنقید اور تحقیق دونوں اب تک اس انداز سے محروم ہیں۔

'طنز و مزاح' کے موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، اس موضوع پر پچھلے تمام کارناموں سے آگے بڑھا ہوا کارنامہ ہے۔ یہ چند قدم جو آپ نے آگے بڑھائے ہیں قابلِ ستائش بھی ہیں اور قابلِ فخر بھی، یہ کام ایسا نہیں ہے کہ کوئی پڑھا لکھا شخص اسے الٹ پلٹ کر دیکھ کر آگے بڑھ جائے، اسے صرف رکنا نہیں پڑے گا بلکہ ٹھٹھک کر دیکھنا اور سوچنا بھی پڑے گا، بعض پہلوؤں پر نئی روشنی پڑی ہے، بعض اہم نکات سامنے آئے ہیں، آپ نے بلاشبہ علم میں اضافہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

"طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" ساتھ لیتا جاؤں گا، سری نگر پہنچ کر اپنی مفصل رائے لکھوں گا۔ سکینہ صاحب کے خلوص کا تاثر بھی گہرا ہے۔ ملاقات ہو تو آداب کہیئے گا میری طرف سے۔ آپ سے اب کب ملاقات ہوگی؟ میرے پاس فون نہیں ہے، ایک کارڈ ڈال دیجئے گا یا کسی سے پیغام بھجوا دیجئے گا۔ فقط

آپ کا اپنا شکیل الرحمٰن
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
کشمیر یونیورسٹی

کرشن چندر

مقدمہ — قہقہہ زار

عبدالغفور صاحب مجموعہ اضداد ہیں۔ بڑے حاکم ہیں۔ یعنی انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے رکن۔ حکومت کے اعلیٰ ترین منتظمین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن اپنے دوسرے احباب کی طرح یہ محض ایک سرکاری منتظم ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ یہ صاحب علم و فن بھی ہیں۔ APPLIED ANTHROPOLOGY اور SOCIAL WELFARE ان کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ اور انگریزوں کے زمانے سے ان کا شمار اس موضوع کے گنے چنے ماہرین میں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتابیں یونائیٹڈ نیشن تک نے چھاپی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک مصنف بھی ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ اس پر مستزاد یہ کہ لطیفے بھی کہتے ہیں۔

APPLIED ANTHROPOLOGY جیسے بظاہر خشک اور سائنسی موضوع پر ہمہ گیر دسترس رکھنے والا لطیفے بھی کہے، بجائے خود ایک لطیفہ ہے۔ اس لئے تو جب آپ نے اپنا مجموعہ مجھے مطالعے کے لئے دیا تو مجھے ایک گونہ حیرت ہوئی۔

پھر میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ لطیفہ گوئی بھی بالآخر ایک طرح کی APPLIED - ANTHROLOGY - ہی ہے۔

جناب خواجہ عبدالغفور صاحب باغ و بہار آدمی ہیں۔ لطیفہ گوئی کو انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ ایک مستقل فن کی حیثیت دی ہے۔ اپنے چند دوستوں کی اعانت سے انہوں نے بمبئی میں لطیفہ گو حضرات کی ایک انجمن بھی ترتیب دی ہے اکثر نجی محفلوں میں یہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی فراست طبع کا امتحان لینے کیلئے لطیفہ آزمائی کیا کرتے ہیں۔ دو یا تین برس پہلے بمبئی کے خوش ذوق نوجوانوں کی ایک انجمن نے کہ جو پوپیا کے نام سے پکاری جاتی ہے باقاعدہ ایک پبلک ہال میں ایک محفل منعقد کی تھی جس میں چیدہ چیدہ لطیفہ گو حضرات نے عمدہ سے عمدہ لطیفے پیش کئے تھے اور اب یہ سلسلہ چل نکلا ہے۔

گزشتہ سال حیدرآباد میں لطیفہ ڈے منایا گیا۔ جس کے روح رواں مجتبیٰ حسین تھے اور اس

سال جناب عبدالغفور صاحب بمبئی میں پھر لطیفہ گویانِ ہند کا ایک ہنگامہ برپا کرنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔ یعنی بیٹھے بٹھائے لطیفہ گوئی کا ہلکا پھلکا مشغلہ ایک ادبی فن کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے اور اگر اس کی ترقی کی یہی رفتار رہی اور اس کی مقبولیت کا یہی عالم رہا تو کوئی عجب نہیں کہ ایک دن حکومت بھی اس کی فنی حیثیت تسلیم کرلے اور اس ملک میں ساہتیہ اکاڈیمی اور سنگیت اکاڈیمی کی طرح لطیفہ اکاڈیمی کا قیام بھی عمل میں آئے۔ اور اگر کبھی یا کسی دن یوں ہوا تو کیا عجب کہ ہمارے مہربان عبدالغفور صاحب ہی اس اکاڈیمی کے صدر یا سکریٹری مقرر کردیئے جائیں۔

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ عبدالغفور صاحب نے فن لطیفہ گوئی پر ایک کتاب تصنیف کر پائی ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جس میں انھوں نے سینکڑوں بہتر سے بہترین اور نادر سے نادر ترین لطیفے یکجا کرنے کے علاوہ اس مشکل ترین فن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور عبدالغفور صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ پہل کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ وہ APPLIED ANTHROLOGY ہو یا لطیفہ سازی۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ عبدالغفور صاحب ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کے بھی رسیا ہیں اور بمبئی میں جتنی بھی بڑی سے بڑی سنگیت محفلیں منعقد ہوتی ہیں اُن کی سرپرستی یہ ضرور فرماتے ہیں۔ سنگیت سے لطیفے تک ذہنی دھنک کا جو سلسلہ پیدا ہوا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالغفور صاحب نے ایک سائنسی دماغ پایا ہے جو شعوری طور پر سنگیت اور لطیفے میں بھی مماثلت ڈھونڈ لیتا ہے۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ سنگیت کی بہت سی صفات لطیفے میں پائی جاتی ہیں۔ ہر لطیفے کا ایک اندرونی ردم ہوتا ہے۔ اس میں ایک سُر بھی زائد نہیں لگایا جاتا ہے۔ ہر لطیفہ سم پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح سے گویا جو لطیفہ ہے وہ ہماری حسِ مزاح کا سنگیت ہے۔

عبدالغفور صاحب نے یہ کتاب بے حد دلچسپ، دلنشیں اور دلکش پیرائے میں لکھی ہے۔ سینکڑوں عمدہ لطیفے مختلف عنوان کے تحت جمع کئے ہیں اور یوں گویا لطیفوں کے جنگل میں گھس کر چمن بندی اور صف آرائی کی کوشش کی ہے۔ جو بہرصورت کامیاب ہے۔ ممکن ہے لطیفوں کے اس نادر مجموعے میں آپ کو دو چار لطیفے ایسے بھی ملیں جو پہلے بھی آپ کی نظر سے گزرے ہوں۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک حسین عورت کی طرح ایک حسین لطیفے سے دوبارہ ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ جی خوش ہوتا ہے۔ رُوح کو بالیدگی عطا ہوتی ہے۔ اور آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔

اُمید ہے قارئین کرام اس مجموعے کو اس درجہ پسند فرمائیں گے کہ عبدالغفور صاحب سے

اس ضمن میں مزید مجموعوں کی فرمائش کی جاسکے۔ کیونکہ لطیفہ گوئی ایک بحرِ ذخار ہے۔ جس کی شناوری کرتے کرتے اس وقت چند گوہر آبدار ہی آپ کی خدمت میں پیش کئے جاسکے ہیں۔ بہت سے عنوانات رہ گئے ہیں جن پر آئندہ طبع آزمائی ہوسکتی ہے۔ جنسی لطیفوں کا موضوع اس قدر تشنہ رہ گیا ہے کہ جب میں نے عبدالغفور صاحب کی توجہ اس طرف دلائی تو مسکرا کر بولے "تعزیراتِ ہند مانع ہے۔ ورنہ میرے پاس تو ایک ذخیرہ ہے جس سے صرف اسی موضوع سے متعلق ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس باب میں صرف ایسے ڈھکے چھپے۔ شریف منکسر المزاج۔ نیک رو لطیفے جمع کئے گئے ہیں جنھیں مستند اور ثقہ حضرات بھی گوارا کرسکیں۔"

ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ کئی سو سال سے ہندوستان نے ہنسنا چھوڑ رکھا تھا۔ آج بھی ساری مہذب سوسائٹی میں کھل کے ہنسنا ایک فعلِ قبیح مانا جاتا ہے۔ مگر اب برف پگھل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ ہنسنے کی ضرورت محسوس کررہے ہیں۔ چاہے اپنے آپ پر ہنسیں یا حالات پر یا دونوں پر، فنِ مزاح پر، لطیفہ جس کی ایک اہم صنف ہے۔ سنجیدہ اور علمی کام ہورہا ہے زیرِ نظر کتاب لطیفہ گوئی کے فن پر ایک کامیاب کاوش کا درجہ رکھتی ہے، جسے عبدالغفور صاحب کی جدت طرازِ طبیعت نے اپنے فکر و فن کی معنی آفرینی، اسلوب کی رنگینی اور موضوع کی بوقلمونی سے سبدِ گل کی صورت عطا کیا ہے۔

کرشن چندر

تعارف

قہقہہ زار کے بعد لطیفوں کے باب میں "شگوفہ زار" خواجہ عبدالغفور صاحب کی دوسری کتاب۔ یعنی نقش اول سے نقش ثانی بہتر اور اگر مجھے ایک اصطلاح گھڑنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ یہ کتاب پہلی کے مقابلے میں زیادہ "قہقہہ خیز" ہے۔

اس کتاب میں صرف لطیفے ہی درج نہیں ہیں بلکہ ان کی اصناف و اقسام اور ماخذ و منبع سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یعنی ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیا کرنے کے علاوہ ظرافت سازی کے فن پر بھی کما حقہٗ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے عبدالغفور صاحب کی یہ کاوش قہقہہ بردوش ہونے کے علاوہ علمی اور ادبی اعتبار سے بھی بلند پایہ اور مستند مانی جائے گی۔

اس ضمن میں عبدالغفور صاحب نے اس کی ترتیب و تدوین میں اس قدر کاوش سے کام لیا ہے۔ اور فنِ ظرافت کی اتنی اقسام اور اس کی اس قدر مثالیں مشرق اور مغرب سے جمع کر کے گنوائی ہیں کہ قاری کے علاوہ لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا ظرافت ہے اور جو اس میدان کے ماہر ترین کھلاڑی سمجھے جاتے ہیں انھیں خود بھی اس پر حیرت ہوگی اور وہ عبدالغفور صاحب کی فنی عرق ریزی، نظرِ انتخاب، اور متنوع ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ چٹکلوں، لطیفوں اور کارٹونوں اور مثالوں سے قطع نظر، فن ظرافت کی انواع و اقسام کے اعتبار سے "شگوفہ زار" ایک چھوٹی موٹی انسائیکلوپیڈیا کی، حیثیت رکھتی ہے۔ اور کوئی بھی صاحب نظر جو ظرافت کی زندگی بخش قدروں کا قائل ہے اور کشاکشِ حیات کے تکدر کو دور کرنے کے لئے حسِ مزاح کی اہمیت سمجھتا ہے۔ اس کتاب سے استفادہ اٹھاتے ہوئے خواجہ عبدالغفور صاحب کی قہقہہ نوازی کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

اکثر لوگ انسان کو اس لئے اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں کہ وہ حیوان ناطق ہے۔ مگر اس زمرے میں دوسرے بہت سے جانور بھی آتے ہیں۔ اور مختلف سائنس دانوں نے جنگلوں میں رہ کر بندروں چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی بولیوں کو سمجھ کر ان کے قوتِ نطق کے مدارج طے کر دیئے۔

اس لئے محض اس بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات سمجھنا غلط ہوگا

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام جانوروں میں انسان سب سے زیادہ ذہین اور طباع ہے۔ اس لئے وہ اشرف المخلوقات
ہے۔ مگر ادھر ڈالفن نام کی سمندری مچھلی پر جو ریسرچ کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈالفن کا دماغ کسی
طرح انسانی دماغ سے کم نہیں اور ڈالفن میں دماغی ذہانت کی حیرت انگیز خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ لیجئے اس معاملے
میں انسان اور ڈالفن تقریباً برابر ہیں۔

میری نظر میں تیسرا نظریہ سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے جس کا استدلال یہ ہے کہ انسان اس لئے اشرف المخلوقات
ہے کہ وہ ہنستا ہے اور جو لوگ ہنستے نہیں ہیں مجھے ان کے اشرف المخلوقات تو کیا انسان ہونے میں بھی شبہ ہے
کیوں کہ ذی روح افراد میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو حسِ مزاح رکھتی ہے۔

مگر ہم ہنستے کیوں ہیں؟ فلسفۂ مزاح کے شیدائیوں نے اس کی بہت سی توجیہات کی ہیں۔ جن میں کلاسیکی
توجیہہ کیلے کے چھلکے سے پھسلنا ہے۔ یعنی کیلے کے چھلکے سے پھسلنے سے جو مضحک صورتحال پیدا ہوتی ہے۔
اس پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ گو اس میں پھسلنے والے کے تئیں کبھی قدر تضحیک کا پہلو بھی چھپا رہتا ہے۔ مگر
بالخصوص ہنسی اس تضاد پر آتی ہے جو ایک نارمل طریقے سے چلنے والے فرد کی رفتار اور کیلے پر سے پھسلنے والے کی
ہیئت کذائی میں نمایاں رہتا ہے۔ اب یہ تضاد چال کا ہو سکتا ہے کردار کا ہو سکتا ہے۔ سماج کا ہو سکتا ہے زبان
کا ہو سکتا ہے، تہذیب کا ہو سکتا ہے۔ نشست و برخواست کا ہو سکتا ہے۔ سمجھ کا ہو سکتا ہے۔ ذہانت کا ہو سکتا
ہے۔ اولیت اور جدت کا ہو سکتا ہے۔ مبالغے یا تحریف کا ہو سکتا ہے، ہر ہنسی میں ایک مخصوص طرح کا تضاد چھپا
ہوا ہوتا ہے۔ یعنی جو نارمل ہے جسے ہم جانتے ہیں جو ہمارے علم میں ہے اس سے صرف ایک ایسی متضاد کیفیت ہمارے
سامنے آتی ہے جس سے ہماری حسِ مزاح کو تحریک ہوتی ہے۔ مزاح کے جتنے مکاتیب ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں اس تضاد
کو پیش کرتے ہیں۔ اگر یہ تضاد مخفی ہے تو اسے کھول کر سامنے لے آتے ہیں۔ اگر ظاہر ہے تو اسے نمایاں کرتے ہیں۔ اگر
نمایاں ہیں تو اس کے بیان میں اس حد تک مبالغہ آرائی کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آنے لگتی ہے۔

تضاد کے مزاحیہ اظہار میں کسی نہ کسی طرح کی تنقید بھی چھپی رہتی ہے چاہے اس کی نوعیت بالکل ذاتی کیوں نہ
ہو۔ یعنی ہم کیلے کے چھلکے پر سے پھسلنے والے سے ہنس کر یوں کہتے ہیں۔ اے بے وقوف اگر تو سنبھل کر چلتا تو اس حال تک
کیوں پہنچتا؟ یہ تو مزاح کی ذاتی تنقید ہوئی۔ مگر بالعموم اس تنقید کا دائرہ زیادہ وسیع رہتا ہے۔ اور تنقید سے کوئی
مزاح خالی نہیں ہوتا۔ خالص مزاح خالص ادب کی طرح ناپید ہے۔

مقصد کے بغیر مزاح کی تخلیق ناممکن ہے۔ بالعموم سب سے زیادہ آسان مزاح کا نشانہ ذاتی تنقید پر مبنی ہوتا
ہے۔ یعنی کسی فرد کی چال ڈھال گفتار اور اس کی ان ابنارمل حرکات کی کھلی اڑائی جاتی ہے۔ جنھیں صاحب ظرافت
احمقانہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی ذاتی تنقید کو صاحب رائے مزاح کی نچلی سطحوں میں شمار کرتے ہیں۔ ضلع جگت سکھڑ

بازی پگڑی اچھالنا۔ رکیک کلامی وغیرہ ظرافت کے ایسے مدارج ہیں جن سے ڈوم، بھانڈ، میراثی بہروپیے اور بھٹ بخوبی واقف ہوتے ہیں اور وہ عام طور پر اس قسم کے تمسخر تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں

اس تمسخر کی سب سے نچلی سطح دشنام طرازی، گالی گلوچ، فحشیات، مبتذل گوئی اور حرکتیات ہیں۔ بہت سے لوگوں کو اس قسم کے تمسخر میں بھی مزہ آتا ہے۔ اور چونکہ اس نچلی سطح کو برتنا بہت آسان ہے اس لئے اس کے شیدائی بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں خواجہ عبدالغفور صاحب نے اپنی اس کتاب میں ظرافت کی ان اقسام کی بھی اچھی طرح نشاندہی کردی ہے۔ اور جابجا ان کی مثالیں پیش کر کے ان کے کرن اچھی طرح نمایاں کیا ہے۔

لیکن مزاح کی سطح اس وقت بلند ہوتی ہے جب مزاح نگار ذاتی تنقید سے گزر کر حالات، سماج، معاشرہ، سیاست، واقعات اور ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس سطح پر پہنچ کر مزاح طنز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور رکاکت سے گریز کرتے ہوئے انسانی ماحول کا بہترین نقاد بن جاتا ہے۔ بہترین اس لئے کہ لوگ سنجیدہ تنقید سے جلد بور ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو تنقید ہنستے بولتے مزاح کے پیرائے میں پیش کر دی جائے اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں، ذات سے لے کر سماج تک مزاح کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ہر صنف میں اعلیٰ پائے کے ادیبوں اور شاعروں نے بہترین مزاحیہ اور طنزیہ تخلیقات سے ہمیں نوازا ہے۔

چونکہ مزاح کا دائرہ اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ "قہقہہ زار" کے بعد خواجہ عبدالغفور صاحب کی قلمی اور ادبی کاوشوں نے "شگوفہ زار" کی شکل اختیار کی جس میں فنِ مزاح اور ظرافت کے تمام مدارج اور مکاتب خیال کا احاطہ کیا گیا ہے۔

تضاد اور تنقید سے دلآزاری کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ نچلی سطحوں پر یہ دلآزاری بہت کھردری اور ناشائستہ ہوتی ہے چاہے اس کا نشانہ کوئی فرد ہو۔ یا قوم ہو۔ یا ملک یا کوئی تحریک ہو۔

یورپین ایشیائی قوموں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایشیائی یورپی اقوام کی تہذیب کو نشانہ بناتے ہیں، سردار جی کے لطیفے ایک پوری قوم کی تضحیک کرتے ہیں۔ سیکڑوں لطیفے ایسے گڑھ لئے گئے ہیں جن میں سکھ قوم کے ہر فرد کو بیوقوف ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیا گیا ہے۔ مسلمان دھوتی پوش ہندوؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، ہندو مسلمانوں پر آوازہ کسنے سے نہیں چوکتے۔ فرانسیسی ہر بات میں جس طرح انگریزوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ ہاں مقصد تنقید نہیں ہے بلکہ تنقیص و تضحیک ہے۔ مگر ظرافت جتنی اعلیٰ ہوگی اتنا ہی اس میں دل آزاری کا پہلو کم نکلے گا۔

چند مثالیں پیش کروں۔

۱۔ ذاتی۔ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی۔ پطرس ۲۔ سماجیات۔ ارہر کا کھیت۔ رشید احمد صدیقی۔
۳۔ سیاسیات۔ گلیورس ٹراول۔ سوفٹ ۴۔ قومی سودیشی ریل شوکت تھانوی ۵۔ معاشرہ کا ندید والظیر احمد
۶۔ گوگول کا انسپکٹر، اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

یہاں مزاح کے پردے میں طنزیہ تنقید کی گئی ہے اور دل آزاری کے پہلوؤں کو جہاں تک ہو سکے دبا دیا گیا ہے۔

یا ان پہ انتہائی دبیز شائستگی کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ بہرحال اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت میں بھی فلتہ دل آزاری کا پہلو تو موجود رہتا ہے اس سے مفر ممکن نہیں۔ شائد اس کے بغیر انسان ہنس نہیں سکتا کیوں کہ بالعموم وہ اس وقت ہنستا ہے جب اس کا نشانہ خود اس کی ذات نہیں ہوتی دوسرے ہوتے ہیں۔ اپنے آپ پہ ہنسنا سب سے مشکل ہے اور مزاح کی اعلیٰ ترین صنف ہے جس کی اچھی مثالیں مجھے انگریز انشاپردازوں میں نظر آئیں۔ جیسے چسٹرٹن، اے اے ملنے، اور رابرٹ لینڈ!

عبدالغفور صاحب نے اس کتاب میں مزاح کی مختلف النوع اقسام و اصناف سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی تشکیل اور تفرز کا علمی اور ادبی احاطہ کیا ہے۔ ہمارے ادبی سرمائے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور یاد رکھ کے لئے ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اردو کی کسی بھی لائبریری کو اس کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔

خواجہ عبدالغفور صاحب نے طنز و مزاح کے باب میں ان اقسام و اصناف کی حد بندی کرتے ہوئے آپ کو صرف اردو ادب تک ہی محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ یورپی اور امریکی ادب سے بھی براہ راست استفادہ کرتے ہوئے اپنے موضوع کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ یوروپی ظرافت میں گزشتہ دس سالوں میں جو تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں اور جو نت نئی گوشے گانیاں اس فن میں ہو رہی ہیں ان سب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ کوشش بلاشبہ کامیاب ہے اور لائق تحسین ہے۔ مزاح کی ان نت نئی صورتوں کے لئے اردو کے متبادل الفاظ ڈھونڈنا بجائے خود ایک مشکل کام تھا۔

RIBALDRY — BAWDRY.

HARLEQUIN — PANTOMIME

MIME — QUIRK — YOKEL

HICK — CHARAD — IMPROMPTU. SQUE'CH —

اور اس قسم کی درجنوں اصناف کا اردو میں ترجمہ کرنا محال تھا اور پھر ان کی مثالیں ڈھونڈنا اور بھی مشکل مگر خواجہ عبدالغفور صاحب نے اس تقریباً ناممکن کام کو اس خوبی سے ممکن کر دکھایا کہ بے اختیار تعریف و تحسین کے کلمات زبان پہ آجاتے ہیں۔

مگر یہ صرف ایک علمی ادبی سائینسی کتاب نہیں ہے عبدالغفور صاحب نے اپنے موضوع کی تشریح اور توا ترمیں درجنوں ایسے لطیفے بطور مثال کے طور پر پیش کئے ہیں جن سے نہ صرف اس مخصوص صنف کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان لطیفوں کی برجستگی اور شگفتگی طبیعت کو گدگداتی ہے۔ چمن ظرافت میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی دکھائی دیتی ہیں اور دُور، دُور تک دل کے گوشے گوشے میں شادابی کی لہریں دوڑتی چلی جاتی ہیں۔

دنیائے ظرافت میں عبدالغفور صاحب نے اپنا پہلا کارنامہ "قہقہہ زار" کی صورت میں انجام دیا "قہقہہ زار" کو اردو ہندی سنگم لکھنؤ نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں ایوارڈ دیا اور اس تقریب میں "قہقہہ زار" کے ہندی ایڈیشن کی رسم اجرائی عمل میں آئی۔ قہقہہ زار کا مراٹھی ایڈیشن اب زیر طبع ہے۔ اور پروفیسر رام پنجوانی اس کا سندھی ایڈیشن تیار کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے عبدالغفور صاحب کے مزاحیہ مضامین اکثر نشر ہوتے رہتے ہیں اور بزرگ ریسیو گروپ اور لائینس کلب ایسے ادارے بھی مزاحیہ محفلوں کے لئے عبدالغفور صاحب سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی بعید نہیں کہ خواجہ عبدالغفور صاحب کا یہ دوسرا کارنامہ قہقہہ زار پر بھی سبقت لے جائے۔ اور فن ظرافت کے باب میں اسے شہرت دوام حاصل ہو۔

علی سردار جعفری

دیباچہ — لالہ زار

خواجہ عبدالغفور صاحب کے دلکش مضامین کا مجموعہ میرے دیباچے کے ساتھ ناظرین کرام کی خدمت میں آرہا ہے۔ میرے دیباچے کی حیثیت داماں باغبان وکف گلفروش سے زیادہ نہیں ہے۔ اصل رنگ و بو، حسن و لطافت تو ان پھولوں کی خوبی ہے جو بازار میں آتے ہیں۔ سبد گل تو محض ایک بانس یا بید کی ٹوکری ہے۔ جس کی وقعت پھولوں نے بڑھادی ہے۔

دراصل غفور صاحب کے مضامین کو میرے دیباچے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پھول شاخِ گل سے صاحبانِ ذوق کے دست وگریبان اور طرۂ دستار تک براہ راست پہنچ سکتے ہیں۔ کسی باغبان و گل فروش کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حسن کی داد دینا اور صداقت کی گواہی دینا بجائے خود ایک مبارک فعل ہے۔ یہی میرے دیباچے کا جواز ہے۔

غفور صاحب سے میری ملاقات بمبئی میں چند سال پہلے اس طرح ہوئی تھی کہ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا اور ہمارے ایک شاعر دوست کی "خودی" کچھ اس طرح ضرورت سے زیادہ "بلند" ہوگئی تھی کہ خدا بھی یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا کہ "بتا تیری رضا کیا ہے" اور غفور صاحب مشاعرے کے منتظم تھے اور میرے پاس بغیر کسی تعارف اور بغیر کسی تکلف کے مشورہ کرنے چلے آئے تھے۔ ان کے لب و لہجہ اور انداز نشست و برخاست سے میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سراپا حیدرآباد کی تہذیب کا ڈھالا ہوا ہے اور بے شمار حیدرآبادی دوستوں کی تصویریں نظروں میں پھر گئیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ آپ ایک حیدرآبادی سے دوستی کرلیجئے اور پھر چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے گا اور ہر حیدرآبادی آپ کو اپنا دوست نظر آئے گا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ پتہ چل گیا کہ غفور صاحب میرے بہت سے دوستوں کے دوست ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم چاک گریبانوں سے اتنے قریب ہونے کے بعد وہ ابھی تک اپنے گریبان کو صحیح وسلامت رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یعنی آپ

حکومت کے ایک اعلیٰ افسر بھی ہیں۔

وہ جسے انگریزی میں بیورو کریسی اور آج کل کے اُردو ترجمے میں نوکرشاہی کہتے ہیں اس کے لئے ہمارا ایک قدیم لفظ اہل کار رہے جو انگریزی اقتدار کے زمانے میں کلرک کے معنوں میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ زمانۂ قدیم میں اہلکار واعظ، ملّا اور زاہد ہوتے تھے جو قاضی اور محتسب کے عہدے پر فائز کئے جاتے تھے اور ہمارے قدیم شعراکی رائے ان کے متعلق کچھ اچھی نہیں تھی۔ حافظ شیرازی کی شگفتہ بیانی نے صرف ان کے خلوت میں جاکر "کارِ دیگر" کرنے کی مذمت کی ہے لیکن شیخ سعدی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "معزوری کے وقت یہ اہلکار شبلی اور بایزید کی طرح پاکباز بن جاتے ہیں لیکن جب پھر برسرِ اقتدار آتے ہیں تو شمر ذوی الجوشن اور یزید کی طرح ظالم اور سفاک ثابت ہوتے ہیں۔" ؎

اہلکاران بوقتِ معزوری — ہمہ شبلی و بایزید شوند
چوں بیایند باز برسرِ کار — شمر ذوی الجوشن و یزید شوند

حالانکہ آج کل کے اہلکار زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ مہذب اور زیادہ وسیع القلب ہوتے ہیں، پھر بھی رائے عامہ ان کے حق میں کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ عام طور سے ان کو رعونت کا شکار سمجھا جاتا ہے اور سُرخ فیتے کی کارستانیوں میں ان کی مہارت کا جواب ہی نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آج کے عہد میں ایسے اہلکار کا وجود ممکن ہے جو برسرِاقتدار رہتے ہوئے بھی اپنی طبیعت میں شبلی اور بایزید کا سا سوز و گداز رکھتا ہے اور دل میں عام انسانوں کے لئے درد کی کسک محسوس کرتا ہے۔

غفور صاحب بظاہر مجموعۂ اضداد معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی پہلو دار شخصیت کا کرشمہ ہے کہ وہ بیک وقت اچھے سرکاری افسر اور اس سے بھی اچھے دانشور ہیں اور وصف یہ ہے کہ اس دانشوری میں خشونت نہیں ہے۔ وہ رندِ خشک اور زاہد تر ہیں۔ خشک رہ کر رندی کو باقی رکھنا بڑی بات ہے اور زہد کے بعد بھی تردامنی کے احساس کو زندہ رکھنا اور بھی بڑی بات ہے۔ عمرانیات اور سماجی علوم کے ماہر ہونے کے بعد بھی ان میں وہ شئے لطیف کم نہیں ہے جو دل کو طنز و مزاح کی طرف مائل کرتی ہے اور شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے پر اُکساتی ہے۔ روزہ نماز اور مذہب کی ساری رسومات کی پابندی کے باوجود وہ رقص و موسیقی سے پرہیز نہیں کرتے بلکہ موسیقی میں تو اُنہوں نے ذوقِ دل کے ساتھ علمی بصیرت بھی حاصل کرلی ہے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں اور اپنے اوپر ہنس لیتے ہیں لیکن دوسروں پر ہنسنے سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ تہذیب و شرافت کی دلیل ہے۔ ان کے اندر وہی کیفیت ہے جس کو کسی فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "اس کے ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے میں لوہے کی تہائی جس سے ٹکرا کر جام پاش پاش ہو سکتا ہے ہر ہوس ناک آدمی کو جام اور تہائی سے کھیلنے کا حق نہیں ہوتا" ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

یہ جو انگریزی سے اُردو تک غفور صاحب کے مضامین اور تصانیف میں تنوع پایا جاتا ہے اور
رنگا رنگ کیفیت نمایاں ہے، یہ ان کی پہلو دار شخصیت کے مختلف جلوے ہیں چنانچہ قہقہہ زار اور شگوفہ زار کا
مصنف زیارتِ دیارِ حبیب پر بھی لکھتا ہے اور زائرینِ حرم کی خدمت میں الفاظ کے ذریعے سے کعبۃ اللہ کو بھی
پیش کرتا ہے۔ اس کا قلم مہاتما گاندھی کی خوش اخلاقی اور مخدوم کی لطیفہ گوئی کا احاطہ کرتا ہے، پھر بمبئی کی
بارش پر چھینٹے اُڑاتا ہے۔ وہ شاعری کر کے بہت "بیزار" ہونے کی منزل میں بھی قدم رکھتا ہے اور جاں نثار
اختر کی رُباعیوں پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔ جب آپ یہ مضامین پڑھیں گے تو ان کے ظاہری مزاحیہ لباس کے
اندر سے ایک نہایت سنجیدہ شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آئے گی لیکن جب آپ اس کو آداب عرض غفور صاحب
کہہ کر مخاطب کرنا چاہیں گے تو وہ پھر مزاح کے پردوں میں جا چھپے گی اور آپ کا شوقِ ملاقات اور بڑھ جائے گا۔

اور غفور صاحب سے ملاقات کے بہت سے مقامات ہیں۔ بمبئی کی ہر ادبی اور تہذیبی محفل میں وہ نظر
آئیں گے۔ لیکن خاص طور سے نُر سنگار سمسد اور اُردو سرکل میں نمایاں ہوں گے۔ وہ اپنے دفتر میں سرکاری کام
کرتے نظر آئیں گے اور گھر کے اندر احباب کے حلقے میں ہنستے بولتے اور انہیں لمحوں میں وہ کوئی نہایت سنجیدہ
تجویز لے کر سامنے آجائیں گے۔ جیسے کسی لغت کی تیاری یا اُردو، ہندی، مراٹھی، گجراتی کی بہترین نظموں پر
کام۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مشورے کے ساتھ ساتھ وہ سارا سامان بھی موجود ہوگا جس سے یہ تجویز
عملی جامہ پہن سکے۔

اور اس طرح انہوں نے بمبئی کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں اپنے لئے ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے۔ آج
بمبئی کی زندگی غفور صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس کتاب کے پڑھنے والے اس کے مضامین کے ذریعہ
سے غفور صاحب کی ایک جھلک دیکھ سکیں گے اور پھر ملنے کے لئے مشتاق نظر آئیں گے۔ اور اگر ملاقات
ہوگئی وہ نہایت نفیس چائے پلائیں گے اور نہایت اچھا کھانا کھلائیں گے۔ اور بیگم غفور زیادہ سے زیادہ
کھانے پر اصرار کریں گی۔

میں غفور صاحب کی نئی کتاب کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس میں تجدیدِ ملاقات کا وصف ہے۔
بمبئی جون ۱۹۷۴ء

-٠-

مصطفیٰ کمال

پیش لفظ — گل و گلزار

نامور ادیب جناب خواجہ عبدالغفور کے مضامین کا مجموعہ "گل و گلزار" زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں "قہقہہ زار" "شگوفہ زار" اور "لالہ زار" بمبئی سے شائع ہو چکی ہیں۔ موصوف کی تصنیف کردہ "زار سلسلہ" کی یہ چوتھی کتاب ہے۔ پچھلے چند برس میں جناب خواجہ عبدالغفور نے طنز و مزاح کی صنف میں خاص دلچسپی لی ہے۔ نہ صرف یہ کہ تخلیقی کام کرتے رہے ہیں بلکہ اس صنف کی ترقی کے لئے ہمہ جہت کوششوں میں منہمک ہیں۔ بمبئی کی مشینی و صنعتی زندگی کے اکتا دینے والے ماحول کو طنز و مزاح کی مہک سے گل و گلزار بنانے میں موصوف کی کاوشوں کو خاص دخل ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ موصوف کی زیر نظر تصنیف زندہ دلانِ حیدرآباد کی وساطت سے منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

"گل و گلزار" پندرہ انشائیوں اور دیگر تین مضامین سے آراستہ ہے۔ موضوعات کا تنوع شاہد ہے کہ مصنف کی نگاہ رمز شناس اور پختہ کار عمیق مشاہدہ نے گرد و پیش سے انہیں اخذ کیا ہے۔ روزمرہ کے معاملات سے جو مضحک پہلو اور پُرمزاح گوشے موصوف نے منتخب کئے ہیں وہ نئے نہ ہونے کے باوجود ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ کسی نازک موقع یا حادثہ کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے اور لطف یہ ہے کہ ان کے ترکش کا ہر تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ مزاح کے پردے میں ناصحانہ رنگ اختیار کرنے اور معلومات فراہم کرنے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔ اکثر لطیفوں کے سہارے بات کہہ جاتے ہیں اور یوں ہنسی ہنسی میں زندگی کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ عبدالغفور کے مزاحیہ مضامین کا ایک نمایاں وصف مقصدیت و افادیت ہے۔ اس کی تکمیل کے ساتھ مزاح کا دامن تھامے رہنا مزاح نگاری کی معراج ہوتی ہے۔ خواجہ عبدالغفور نے مزاح کو نثر کی مختلف اصناف میں بڑی خوبی کے ساتھ تحلیل کیا ہے۔ انشائیے، تبصرے، خطوط حتیٰ کہ علمی، معلوماتی اور سماجی موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہوئے ان مضامین کو پُرمزاح انداز سے گل و گلزار بنا دیتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ بے ہنگم سرکاری مصروفیات کے باوجود اس قدر بسیار نویسی سے کام لیتے رہے۔ اب جبکہ وظیفۂ حسنِ خدمت پر علیحدہ ہو چکے ہیں، یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ ان کے قلم کی یہ موشگافیاں طنز و مزاح کے سرمایہ میں مزید اضافہ کا موجب بنیں گی۔

— —

پریم گوپال متّل

حرفے چند*

"اس دور کے طنز و مزاح میں خواجہ عبدالغفور کا یہ کارنامہ بھی یاد رہے گا کہ انھوں نے لطیفہ گوئی کو فن کا درجہ دے دیا۔ خالص مزاح میں انھیں شفیق الرحمان کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ظرافت کی جملہ صورتوں کا مطالعہ دقّتِ نظر سے کیا ہے لیکن طبعی مناسبت کی بنا پر ان کا خاص میدان لطیفہ نگاری ہی ٹھہرا ...... غفور صاحب کا حافظہ ساری دنیا کے رنگارنگ لطائف کا نگارخانہ ہے، جنھیں وہ اپنے مزاح میں ہنرمندی سے جڑ دیتے ہیں

——— ڈاکٹر قمر رئیس

طنز و مزاح سے لگاؤ خواجہ صاحب کو بچپن سے ہے اور اوائل عمر سے آپ کے مطالعے میں انگلستان کے "پنچ" اور "ڈیلی میل" رہے ہیں۔ شروع شروع میں انگریزی طور کے مذاق سے دلچسپی تھی اور اُردو ادب کے طنز و مزاح کی طرف کبھی ذہن راغب نہیں ہوا تھا لیکن کچھ مدت بعد اُردو کی کچھ ایسی کتابیں زیرِ مطالعہ آگئیں جو دامن کش دل ثابت ہوئیں اور انھوں نے باقاعدہ دلچسپی سے اس ادب کا مطالعہ شروع کیا اور ایم اسلم، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، شفیق الرحمان اور مُلّا رموزی ان کے پسندیدہ فن کار بن گئے۔

اس کتاب سے پہلے اب تک خواجہ صاحب کی پانچ کتابیں قہقہہ زار، شگوفہ زار، سمن زار، لالہ زار اور گل و گلزار اُردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے قہقہہ زار کا ہندی اور مرہٹی میں اور شگوفہ زار کا ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

---

* "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" سے۔

خواجہ صاحب کے فن مزاح نگاری اور لطیفہ گوئی کی وکالت کے قطع نظر ان کے انشائیہ مضامین میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں ان کی قوتِ تخلیق اور تحریر کی برجستگی اور بے ساختگی کا اظہار ہوا ہے۔ ان کے وہ مضامین جن میں لطیفوں کو موتی کی طرح پرویا گیا ہے، بہت اچھے ہیں اور ان گنے چنے انشائیوں کے باعث ہی وہ مزاح نگاری میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کر گئے ہیں۔ ان کے مضامین میں لطیفوں کا شعوری استعمال بڑی چابک دستی اور روانی کے ساتھ ہوا ہے۔

خواجہ صاحب کے لطیفے ان کی کتابوں کی اشاعت کے وقت بڑی حد تک اچھوتے اور نئے تھے لیکن ان کی اشاعت کے بعد وہ اتنے مقبول و معروف ہوئے کہ ہزاروں بار دوسروں کی تخلیقات میں شامل ہو گئے۔ جس طرح موسیقی میں سرگم تال سُر لے کے ساتھ ٹھمری خیال صدیوں سے گائے جاتے ہیں اور موسیقار ان ہی حدود سے بندھا ہوتا ہے۔ لطیفوں کی نوعیت بھی یہی ہے اور ان کو سُنا ہوا یا پُرانا نہیں کہا جا سکتا۔

خواجہ صاحب کی شخصیت میں مزاح کی چنگاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حالانکہ ان کے موضوعات ہر وقت نئے نہیں لیکن اندازِ بیان بالکل نیا ہے۔ مزاح کے پردے میں ان کے یہاں کہیں کہیں ناصحانہ انداز بھی آجاتا ہے لیکن اس کے باوجود شگفتگی اور لطیف و مزاح کی ایک زیریں لہر ان کی تحریروں میں جاری رہتی ہے۔

خواجہ صاحب کی لطیفہ گوئی اور مزاح نگاری کی بھرپور صلاحیت کا اعتراف ملک کے اغلباً تمام مشاہیر نے کھلے دل کے ساتھ کیا ہے، یہاں کرشن چندر کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو "قہقہہ زار" پر ان کے ایک مطبوعہ مضمون سے اخذ ہے۔

"کئی سو سال سے ہندوستان نے ہنسنا چھوڑ رکھا تھا۔ آج بھی ساری مہذب سوسائٹی میں کھل کر ہنسنا ایک فعلِ قبیح مانا جاتا ہے مگر اب برف پگھل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ ہنسنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ "قہقہہ زار" لطیفہ گوئی کے فن پر ایک کامیاب کاوش کا درجہ رکھتی ہے جسے عبدالغفور صاحب کی جدت طرازی نے اپنے فکر و فن کی معنی آفرینی، اسلوب کی رنگینی اور موضوع کی بوقلمونی سے سبدِ گل کی صورت عطا کی ہے۔ . . . خواجہ عبدالغفور نے قہقہہ زار میں سیکڑوں بہتر سے بہترین اور نادر سے نادر ترین لطیفے جمع کرنے کے علاوہ اس مشکل ترین فن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا۔ اُردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے"

پیشِ نظر کتاب طنز و مزاح کے تحقیقی سفر میں ایک اہم سنگِ میل ہے اور مجموعی طور پر اُردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ مصنف کی عرق ریزی، سنجیدہ کاوش اور موضوع سے تخلیقی دلچسپی کا بیّن ثبوت ہے۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ ریسرچ اسکالرز کیلئے گائڈ بک کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اُردو ادب میں بالکل نئی چیز ہے اور بالکل نئے انداز سے پیش کی گئی ہے کتاب میں نہ صرف اُردو ادب میں طنز و مزاح کا بلکہ یوروپ اور امریکہ کی تہذیبی اور ثقافتی فضا میں مزاح اور ظرافت کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

— —

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

خود بینی و خود آرائی

محترم خواجہ عبدالغفور نے انتقال سے کچھ دن قبل 'شگوفہ' کے 'ہندوستانی مزاح نمبر' کے لئے یہاں مدیر جناب یوسف ناظم کی فرمائش پر مختصر سوانح حیات (خود نوشت) عنایت کی تھی، جسے غفور صاحب سے موسوم اس خصوصی شمارہ میں شریک کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

نوشتۂ تقدیر جس کو تدبیر نے بدلا اور نہ بدلنے کی کوشش کی گئی، آج خود نوشت قلمی خاکہ کے روپ میں پیش خدمت ہے۔

پیدائش اسی برصغیر کے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں آج سے ۶۰ سال سے بھی پہلے ہوئی لیکن ہمارا ۶۰ سالہ جشن نہیں منایا گیا اور نہ ایسی کوئی تجویز ہے۔ اب تو نہ برصغیر باقی ہے نہ حیدرآباد کہ جو کبھی مملکت آصفیہ تھا۔ بعد ازاں رضاکارانہ دور آیا جس نے آزاد مملکت کے خواب دیکھے۔ جس کے معاوضہ میں پولیس ایکشن کے بعد فوجی راج ملا۔ جس کو سیول اڈمنسٹریشن میں بدلا گیا، حتیٰ کہ راج پرمکھ کا دور بھی ختم ہوا، اور حالات پُرسکون ہوئے، اور دیگر صوبوں کی طرح ریاست حیدرآباد بنی۔ جس میں تلنگانہ کو اہمیت رہی۔ ریاست حیدرآباد کے بہت بعد جب آندھرا پردیش بنا تو وہ حیدرآبادی جو ہماری طرح تھے، یعنی جو تلنگے تھے نہ کنڑ، بلمبئی پرانت کو برآمد کئے گئے اور یہی علاقہ بعد کو مہاراشٹرا بنا۔

حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی بنی کہ جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور نظم ونسق کی زبان بھی ۵۰ سال تک اردو رہی۔ حسنِ اتفاق سے ہم اسی دور کی پیداوار ہیں جنھیں اردو سیکھنے، برتنے اسکو بڑھاوا دینے کا موقعہ ملا۔ مستقل طور پر بمبئی منتقل ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بھی سیول سروس اور آل انڈیا اڈمنسٹریشن سروس کے تعلق کی وجہ سے ہر محکمہ میں سلجھتے رہے اور اس کو سجاتے بھی رہے۔

چوں کہ اُردو زبان پہلی محبوبہ تھی، وہی عشق آج بھی قائم ہے۔ بلکہ اس کے گیسو سنوارنے اور اس کو حسن و رعنائی عطا کرنے والے اساتذہ اور دانشوروں نے ایسے Inspiration عطا کیے کہ خدمت کا جذبہ اُجاگر ہوا۔ یہ نہیں کہ طنز و مزاح کا میدان خالی تھا۔ بلکہ بچپن کے شوق کو مزاح کی حس اور شئے لطیف کی موجودگی نے کچھ نکھار بخشا۔

لوگوں نے پوچھا بھی کہ اڈمنسٹریٹو سروس اور اُردو کے ذوق کا امتزاج کیسا؟

یہ شائد حادثے ہیں خوشگوار کہ اسیر زلف گرہ گیر ہو کر ہم زلفوں کی محفل میں ہمیں بھی چھوٹی سی جگہ مل گئی۔ جس کا ثبوت یہی ہے کہ ہم بھی اس اجتماع میں موجود ہیں۔

اُردو سے متعلقہ مشاغل کی فہرست میں جامعہ اردو علی گڑھ کی گورننگ کونسل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی رکنیت، اُردو ترقی بورڈ کے پینل کی رکنیت، اردو ٹرسٹ کی ٹرسٹی شپ، "امکان" سہ ماہی اور قومی راج پندرہ روزہ کی ادارت اور اردو اکادیمی کی معتمدی، بورڈ آف اسٹڈیز بمبئی یونی ورسٹی کی رکنیت، آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی کی اڈوائزری ممبری — کچھ اعزاز اور ذمہ داریاں ہیں جن کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

بمبئی یونی ورسٹی میں اُردو شعبہ اور کرشن چندر چیئر، مہاراشٹر کے بیشتر اضلاع میں الکٹورل رول کی اردو میں اشاعت کا سہرا ہمارے سر ہے۔

مختلف اوقات میں آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن بھارتی کے لیے لکھے ہوئے مزاحیہ انشائیوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض کے ایک سے زائد اڈیشن نکلے اور ہندی اور مراٹھی میں تراجم بھی شائع ہوئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کو اردو اکادمیوں کے علاوہ دیگر ایوارڈ بھی ملے۔

انگریزی میں سوشیالوجی، انتھراپالوجی پر کئی ریسرچ ورکس شائع ہوئے ہیں جن میں سے بعض اقوام متحدہ اور I. L. O. کی جانب سے طبع ہوئے ہیں۔

اردو ادب میں طنز و مزاح پر اساتذہ نے بھی جب بھی قلم فرسائی کی ہے تو طنز و مزاح کی حد بندی نہیں کی بلکہ شخصیتوں اور تخلیق کاروں کو مزاح کی اصناف کے لحاظ سے تقسیم کیا اور بتایا کہ فلاں فنکار کا فن اس جوکھٹے میں بیٹھتا ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے فن کی نشاندہی کی جاتی پھر فن کار کا مقام متعین ہوتا۔ اس طرح کی سعی و کاوش شگوفہ زار کے نام سے راقم الحروف نے کی ہے، جو کافی مقبول ہوئی ہے۔ پھر نئے سرے سے "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" شائع کیا۔

اُردو کی ترویج، تبلیغ، اشاعت اور اس کے بڑھاوے کے لئے اردو اکادیمی کی جملہ کارگزاریوں پر اردو کی ریڈر شپ بڑھانے کی اسکیم کو ہم نے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے کہ جو نسل اُردو اچھی طرح جانتی ہے، بولتی ہے اور سمجھتی ہے اور ذوق رکھتی ہے۔ اس کو رسم الخط سکھایا جائے تاکہ وہ گالب کی گجل کو غالب

کی غزل کہہ سکے۔

چوں کہ اب زمانہ بولتا قاعدہ کا نہیں، ماڈرن میڈیا جیسے Audio Visual کا ہے۔ چنانچہ اسی طریقۂ کار پر V.C.R ویڈیو کیسٹ تیار ہوچکا ہے جس کی مدد سے کچھ گھنٹوں میں اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اسکیم کامیاب ہونے پر اُردو چہار دانگ عالم میں نئی نسل کے لئے بڑی کارآمد ہوگی۔

— —

نظامس اُردو ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام تعزیتی جلسہ

حیدرآباد۔ ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء

ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کے انتقالِ پُرملال پر ۱۵ مئی کی شام جناب حامد علی عباسی کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے جناب بشیرالدین احمد سابق ڈائرکٹر ٹرائبل ویلفیر نے سوشیل ویلفیر ڈپارٹمنٹ کے لئے خواجہ صاحب کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے کہا کہ بمبئی کے اجنبی ماحول میں خواجہ صاحب نے اردو کے چراغ کو روشن رکھا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین احمد نے کہا کہ غفور صاحب دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ نے خواجہ صاحب کی اردو خدمات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے ذریعہ اُنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے انکا تفصیلی ذکر کیا۔

جناب محمود انصاری مدیر "منصف" نے نظامس اردو ٹرسٹ سے خواہش کی کہ ویڈیو کے ذریعہ اردو کی تعلیم کے پروجکٹ کو تکمیل تک پہنچائے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ غفور صاحب نے لطیفہ کو فن کا منصب بخشا۔ ان کا مقالہ تحقیق کی نئی راہ دکھاتا ہے۔ جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس نے کہا کہ ہم مجوزہ عالمی جشنِ مزاح' میں ان کی کمی شدت سے محسوس کریں گے۔ جناب بھارت چند کھنہ نے طنز و مزاح میں غفور صاحب کی خدمات کا جائزہ لیا۔ جناب حامد علی عباسی نے اپنی صدارتی تقریر میں اعتراف کیا کہ غفور صاحب نے بحیثیت ٹرسٹی نظامس اردو ٹرسٹ میں جان ڈال دی تھی۔ جناب محمد منظور احمد نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ آخر میں دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

خواجہ عبدالغفور

پاگلوں کے لطیفے

عقلمندوں کی باتیں تو عقل و ادراک سے بھرپور ہوتی ہی ہیں کبھی اُن کی باتیں بھی تو سُنی ہوں گی آپ نے جن کو دنیا فاترالعقل کا خطاب دے کر سوسائٹی سے باہر کر دیتی ہے اور ان کے متعلق سب کچھ بھول جاتی ہے۔ خیر اب تو پہلے کی طرح ان کو پاگل خانہ میں نہیں بلکہ علیٰحدہ مخصوص دواخانوں میں رکھا جاتا ہے کہ جہاں ان کا علاج ہوتا ہے اب بتائیے اس دُنیا میں ایسے کتنے مکمل انسان ہیں کہ جو دوسرے کو کم عقل اور اپنے آپ کو بلا حجاب عقلمند کہہ سکتے ہیں. ایک مچھلی کے شکار کے شوقین کسی بڑی اُونچی دیوار کے سایہ میں ندی کنارے بیٹھے شکار کا شوق فرما رہے تھے. اس اُونچی دیوار پر سے کسی نے جھانک کر دریافت کیا کہ کیا شغل ہو رہا ہے؟ انہوں نے اپنی بات بتائی تو پھر پوچھا کہ کچھ مچھلی ہاتھ لگی جواب دیا کہ نہیں، تو پھر دریافت کیا کب سے بیٹھے ہو تو اس نے بتایا کہ صبح سے۔ اس پر ان مچھلی پکڑنے والے صاحب سے کہا" تو پھر آپ اندر ہمارے ساتھ کیوں نہیں آ کر رہ جاتے"؟

وہ دیوار تھی دماغی بیماریوں کے ہسپتال کی اور مشورہ دینے والے تھے اس کے مکیں۔

کسی پاگل خانے میں ایک بڑے عہدہ دار بغرض معائنہ تشریف لے گئے. اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اُنہوں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک معقول صورت صاحب محو مطالعہ بیٹھے ہیں انہوں نے دریافت کیا" جناب آپ یہاں کیسے آئے یا لائے گئے؟" پاگل خانے کے اس مکین نے بتایا کہ انہوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے اور پھر اس کے سارے مسلک اور اصول بتائے جو یکجہتی انسانیت اخوت اور اسی طرح کی اچھی اچھی باتوں کا مجموعہ ہیں —— عہدہ دار اُن کی سمجھداری کی باتوں سے کافی مرعوب و متاثر ہوئے اور پوچھا کہ یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ دُنیا کو آپ کی قدر کرنا چاہیئے تھی یہاں کیوں پہنچا دیا؟ تو وہ بولے" خدا نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا تھا تاکہ جاہلوں کو راستہ دکھاؤں لیکن لوگ میرے دشمن ہو گئے۔

وہیں کہیں پاس میں ایک اور صاحب بیٹھے بڑے غور و خوض سے یہ باتیں سُن رہے تھے اور جب انہوں نے یہ

دعویٰ سُنا کہ خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو یہ انتہائی رعونت اور خفگی کے عالم میں چلائے "یہ جھوٹ بکتا ہے ہم نے اس کو کبھی پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا"۔

روایت ہے کہ موسلادھار بارش کی ایک تاریک رات میں کسی ملک کے وزیر اعظم کی گاڑی راستہ میں بگڑ گئی۔ اپنے نوکر کے ساتھ جھلملاتی روشنی کا سہارا لے کر ایک بڑی بھاری بلڈنگ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے پر بتایا کہ وہ وزیر اعظم ہیں اور رات کو انہیں سہارا چاہیئے۔ ان کو فوراً داخلہ کی اجازت دے دی گئی اور دربان نے کہا "اندر تشریف لائیے یہاں پر پہلے سے نصف درجن وزیر اعظم موجود ہیں آپ ایک اور سہی۔ یہ تو یہاں کا سب سے بڑا پاگل خانہ ہے"۔

کہیں اعداد و شمار کے ماہر بیٹھے تھے انہوں نے یہ راز افشا کیا کہ پاگل خانوں میں مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں تقریباً دگنی ہے۔ اس پر کسی نے دریافت کیا کہ مردوں کو پاگل خانے بھجوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

پاگل خانے میں ایک معقول صورت آدمی بیٹھا ہوا اخبار کے پرزے پرزے کر کے اِدھر اُدھر بکھیر رہا تھا کسی نے پوچھا کہ یہ کس لئے؟ جواب ملا "اس طرح یہ میں دلوانے کُتّوں کو بھگا رہا ہوں"۔ اردگرد کہیں ایک کتا بھی نظر نہ آنے پر پاگل سے استفسار کیا۔

"مگر یہاں پر تو کتے کہیں نظر نہیں آتے؟"

پاگل نے جواب دیا "ہاں میری اسی کارگر تدبیر کی وجہ سے تو آپ کو آس پاس کتے نظر نہیں آتے"۔

ایک نیم پاگل آدمی کو چھوٹے سے شہر کی بلدیہ نے ۳۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور اس کو یونہی اس کام پر لگایا کہ شہر کے باغ میں رکھی ہوئی توپ کو روز صاف کر دیا کرے۔ اس نیم پاگل نے ۱۲ سال تک اس کام کو خوب جانفشانی اور دلچسپی سے انجام دیا اور پھر بلدیہ کے دفتر میں آکر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا بلدیہ کے عہدہ داروں نے پوچھا "کیا اب تم کو یہ کام پسند نہیں رہا؟" اس نے جواب دیا۔

"مجھے بے حد پسند ہے مگر ان تمام برسوں میں میں نے کافی روپیہ بچا کر جمع کر لیا ہے۔ اب میں خود اپنی توپ خرید لوں گا اور اپنا کاروبار چالو کر دوں گا"۔

خواجہ عبدالغفور

بمبئی کی بارش

عام طور پر تو بے شک و شبہ بمبئی جنت نظیر ہے۔ یہاں جیسی گھما گھمی دن رات کی رونق، بالخصوص رات کی جگمگاہٹ اس عروس البلاد کے سوا اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ یہاں کے موسم بھی ایسے ہیں کہ گرما اور سرما کا تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ایک موسم ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔ البتہ بارش کا موسم بڑی دھوم دھام سے آتا ہے۔ اور اس کی آمد آمد کی نشانیاں بڑی واضح ہیں۔ سب سے پہلے تو چوپاٹی پر قلفی اور چاٹ اور اسی طرح کی دیگر دوکانوں کے اوپر ایک بڑا شامیانہ پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے ایک بڑا ملک دوسرے چھوٹے ملک کے اوپر نیوکلیر چھتری چڑھا دیتا ہے۔ چھتری بھی ہر جگہ نظر آنے لگتی ہے، سب سے پہلے تو دوکانوں میں، دوکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر اور اسٹالوں پہ اور پھر اس کے بعد ہر آدمی کے ہاتھ میں اور سر پر بلکہ کبھی لوگوں کی آنکھوں میں بھی۔

ہم جس کو چھتری کہتے ہیں وہ حفاظت و مدافعت دونوں کے کام آتی ہے۔ چنانچہ شہر بمبئی میں جیسے ہی بارش کے موسم کے آغاز کا وقت قریب آتا ہے لوگ چھتری یا سے لیس ہو کر نکلنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہم نے اپنے ایک دوست کو تو اس سج دھج سے نکلتے دیکھا ہے کہ ہاتھ میں دو دو چھتریاں ہوتی ہیں اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کہ ہو لے بارش دیکھتے ہیں ہم بھی، ہمارا کیا بگاڑ لے گی، بال بیکا ہونا تو بڑی بات ہے ایک بال بھی بھیگ جائے تو جب ہار مان لیں۔ ان کو اسی حال میں کئی بار دیکھ کر ہمت سے ہم نے ایک بار پوچھ ہی لیا۔ بھائی صاحب، یہ دو، دو چھتریاں کس لئے؟ کیا ایک چھتری سے آپ کا بچاؤ نہیں ہو سکتا! انھوں نے مسکراہٹ میں پنہاں بجلیوں کو اسی طرح گراتے ہوئے کہ جس طرح بارش میں بادلوں کی ٹکر سے آسمان پر بجلی کوندجاتی ہے، جواب دیا — مجھے ایک بری عادت ہے اکثر جگہ اپنی چھتری کو بھول جاتا ہوں اور جب بارش ہوتی ہے تو بہت بھیگ جاتا ہوں، اسی لئے احتیاطاً دو چھتریاں ساتھ میں رکھتا ہوں۔ بات

معقول تھی اور ہم نے ان کی بات کو سراہا بھی، کچھ دن بعد فلورا فاؤنٹن کے پاس لب سڑک مڈبھیڑ ہوئی تو ان کو بارش میں شرابور دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ ہاتھ میں ایک چھتری بھی ہے۔ دریافت کرنے پر کہ ماجرا کیا ہے، وہ چمک کر بولے "ایک چھتری تو ہم کہیں بھول گئے۔ اور ارے! یہ تو ہم کھولنا ہی بھول گئے۔"

اب آپ نے تو جان لیا کہ چھتری اور بارش کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے کہ بغیر چھتری کے آپ ایک قدم بھی گھر کے باہر نہیں نکال سکتے۔ ایک اور دوست کا ہمارا ساتھ سینما میں ہوا۔ پکچر ختم ہونے پر باہر نکلنے لگے تو وہ بڑی یاد سے منیجر کے کمرے میں گئے اور اپنی رکھائی ہوئی چھتری کا ٹکٹ بتا کر چھتری حاصل کی اور اس آدمی کو ایک روپیہ بخشش میں دیا۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا' بھئی یہ اتنی فیاضی کی ضرورت کیا تھی کہ ایک روپیہ عطا کیا تو انھوں نے اس طرح ہمیں جواب دیا کہ جیسے کسی بڑے احمق کو عقل سکھا رہے ہوں۔ "دیکھتے نہیں کہ اس نے کتنی بڑھیا اور کیسی نئی چھتری ہم کو دی ہے؟"

یہ تو رہی بارش کی اور چھتری کی بات، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ انسان کو اپنی جان چاہے جتنی عزیز ہو اس سے کہیں زیادہ اپنے پہننے کے کپڑے عزیز ہوتے ہیں۔ چھتری پر ہی کیوں اکتفا کیا جائے، صاحب عقل لوگوں نے مزید حفاظت کی غرض سے برساتی یعنی واٹر پروف کوٹ بھی ایجاد کر رکھا ہے۔ جس کو بڑے اہتمام سے پہنا جاتا ہے۔ اور اپنے کپڑوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کے ہلکے پھلکے واٹر پروف سے پہلے ربر کے موٹے موٹے لبادے پہنے جاتے تھے۔ جس سے آپ چاہے آسانی بارش سے بچ جائیں لیکن جسم سے اُبلتے ہوئے پسینے کے فواروں سے تو نہیں بچ سکتے تھے۔ اور جتنا اوپر سے بچ جاتے ہیں، اتنا ہی اندر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ معقول پہناوا ہوتا ہے لیکن ہم نے بمبئی میں دیکھا ہے کہ لوگ اس طرح اُلٹ کر بھی پہنتے ہیں کہ اس کے بٹن سامنے کی بجائے پیٹھ کی طرف لگے ہوتے ہیں، یہ کوٹ خاص قسم کا واٹر پروف نہیں ہوتا، بلکہ استعمال میں آنے والے کو ہی اس طرح پہنا جاتا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو جائے کہ آپ آگے کو آ رہے ہیں یا پیچھے جا رہے ہیں۔ لیکن اصل معاملہ یہ ہوتا ہے کہ سائیکل اور موٹر سائیکل سوار اس کو اس طرح پہن لیتے ہیں تاکہ بارش کا رخ تیز رفتار سواری میں آپ کو محفوظ رکھے۔ ایک بار ہم نے ایک صاحب کو دیکھا جو دفتر کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد بڑی متانت سے اپنی پتلون اُتارنے لگے۔ اس وقت بہت سارے لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن معاملہ صرف یہ تھا کہ ان کی پتلون بھی واٹر پروف تھی جو اُنہوں نے اپنی پتلون کے اوپر پہن رکھی تھی۔

بمبئی کی بارش میں ایک اور حفاظتی اہتمام ہوتا ہے۔ جس کو گم بوٹ کہتے ہیں۔ اس کو جوتوں کے اوپر سے پہن لیا جاتا ہے۔ ان شریر بچوں کی طرح جنھیں تالوں، کھنڈروں اور پانی کے ڈبروں میں سے چل کر جانے میں مزہ آتا ہے۔

اب تصور کیجئے اس بارش کا جو اور جگہوں پر تو بڑے سلیقے سے برستی ہے، ایک رُخ قائم رہتا ہے اور وہ اس طرح کہ خاص زاویہ کو سنبھال کر چلیں تو آپ کو چھو نہ سکے۔ پرانے زمانے کا قصہ ہے کہ جب لوگ شمشیرزنی یا تلوار کا ہاتھ چلانے کے ماہر تھے اور کبھی بغیر اپنی تلوار کے باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ ایک بار ایسے کہنہ مشق کو بارش نے آگھیرا، نہ کہیں بچاؤ کی صورت تھی اور ان کو بھیگنے کا شوق تھا، فوراً ہی انھوں نے تلوار کو اس طرح گھمانا شروع کیا کہ بارش کا ایک بھی قطرہ ان کے جسم کو چھو نہ سکا اور یہ بحفاظت تمام اپنے گھر پہونچ گئے۔

بمبئی کی بارش کے تعلق سے جو جی چاہے کہہ لیجئے۔ گھنگھور گھٹاؤں کے ساتھ اور بجلی کی کڑک کے ساتھ برستی ہے لیکن ہم نے تو بمبئی کی بارش میں یہ کبھی نہیں دیکھا سے

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی　　جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

ناز ہے تجھ کو برسنے پہ تو اے ابر ذرا　　میری آنکھوں کی طرح سے تو برس اب کے برس

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو

سیاہی ہے، سفیدی ہے گھٹا ہے ابر باراں ہے

اسی لئے تو بمبئے کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری سے کنارہ کرتے ہوئے ترقی پسند شاعری کو اپنایا ہے۔

(مجموعہ 'لالہ زار' سے)

خواجہ عبدالغفور

دفتر میں افسر اور گھر میں بیوی

کہتے ہیں بنی نوع انسان نے بڑی بھاری ترقی کرلی ہے، بالخصوص اس بیسویں صدی کے وسط میں تو چاند پر انسان کا پہنچ جانا، پھر وہاں سے ٹیلی ویژن پر تصویریں اور پیام و سلام بھیجنا ایسی باتیں ہیں گویا پریوں کی کہانیاں حقیقت بن گئی ہیں ۔ مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طئے ہو جاتے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی دنیا کے دوسرے کونے سے سوال اور جواب ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ آج حضرتِ انساں کیا نہیں کر سکتے۔ لیکن! ..... جی ہاں یہ بہت زبردست لیکن ہے۔ آج کا یہ انسان ان تمام باتوں کے باوجود جس بندھن میں جکڑا ہوا ہے وہ اسی بندھن کا تسلسل ہے جس میں وہ ابتدائے آفرینش کے وقت ماما حوّا کے وجود میں آتے ہی مبتلا ہوا تھا یعنی گھر کی حد تک بیوی کا ہمہ گیر اور غیر مرئی تسلط ۔ کیا مجال کہ مردان بند شوں سے آزادی حاصل کر سکے جو گھر کی فرماں روا بیوی نے اس پر لاگو کر رکھی ہیں۔ کہنے کو تو وہ صاحبِ خانہ ہے، گھر کا مالک ہے لیکن گھر گرہستی کی ڈور تو بیوی کے ہاتھ میں ہے اور وہی مختار کل ہے۔ ہمارے ایک دوست دعویٰ کرتے ہیں کہ گھر کی حد تک وہی مقتدر اعلیٰ ہیں، اہم معاملات میں ان کی بیوی ان کے فیصلوں پر عمل پیرا ہوتی ہے اور غیر اہم مسائل میں بیوی کا فیصلہ اٹل اور آخری ہوتا ہے۔ اہم اور غیر اہم کی توجیہہ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ گھر کے تعلق سے اہم معاملات بے شمار ہیں. جیسے گھر والے چناؤ کے وقت کس کو ووٹ دیں گے۔ قیمتوں کے بڑھنے کے رجحان کو روکنے کے لئے کیا قدم اٹھائے جائیں۔ ہندوستان کی داخلی اور خارجی پالیسی کیا ہونا چاہیئے۔ ان تمام باتوں میں ان کی رائے صائب رہے گی اور سب کو قبول کرنا ہوگا۔ باقی رہے غیر اہم گھریلو معاملات جیسے گھر کی آرائش، موٹر کی خریدی، گھر کے اخراجات، بچوں کی تعلیم، کن امور میں کفایت برتی جائے، دعوت ہو تو کون مدعو کئے جائیں۔ ڈنر کے لوازمات کیا ہوں، یہ سب معاملات ان کی بیوی کے فیصلے کے محتاج ہیں۔ لیجئے یہ ہے ان کا اقتدار ۔ یہاں تک تو بیوی کی شخصیت گھر پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ ہر روز صبح جلدی جلدی تیار ہوتے ہیں۔ دفتر سے جلد لوٹنے کا وعدہ

بیوی سے کرتے ہیں اور اس تاکید کو بھی قبول کرتے ہیں کہ واپسی پر گھر کی ضروریات بشمول سبزی ترکاری لیتے آئیں گے۔ اور اس اُمید کے ساتھ دفتر کا رُخ کرتے ہیں کہ لو بھلے سے گھر کی چار دیواری اور اس چار دیواری پر اقتدار رکھنے والی بیوی سے تو سات آٹھ گھنٹوں کے لئے گلو خلاصی ملی۔ اب ان کی انا اُونچی ہوتی ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو بلند ہوتے محسوس کرتے ہیں اور تصوّر ہی تصوّر میں خوش ہوتے ہیں کہ اب میں اپنے دفتر میں تو اپنی حاکمانہ شان اور اقتدارِ اعلیٰ کا مظاہرہ کروں گا، رعب جھاڑوں گا اور گھر کے سولہ، سترہ گھنٹوں میں شکست کھانے والی خود اعتمادی کو بلند و برتر کرکے دکھاؤں گا۔ رعونت و تکبّر کے ساتھ دفتر والوں کا سلام قبول کر لوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے پیشانی پر بل ڈالے چہرہ پر افتخار اور بلند مرتبت کے سارے آثار پیدا کرکے دفتر کے حدود میں داخل ہوتے ہیں۔ درجہ چہارم، درجہ سوم، درجہ دوم اور درجہ اول کے ماتحت عہدیداروں سے نظر ملائے بغیر خشونت کے ساتھ ان کے آداب و سلام کا ادھورا سا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ چپراسی دروازے کے پٹ کھولے کھڑا ہے، اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اقتدار کے مظہر یعنی اجلاس پر پہنچ جاتے ہیں۔ ویسے محاورہ تو ہے عہدہ کی کرسی۔ مگر ہماری نظر میں عہدہ کی کرسی نہیں، بلکہ عہدہ کا میز زیادہ اہم ہے اس لئے کہ ایڈمنسٹریشن یا مینجمنٹ کا سارا لب و لباب اور سارا پلندہ مثلوں اور فائلوں کا روپ دھارے ہوئے میز پر پڑا ہوتا ہے جس پر 'ضروری'، 'اہم'، 'فوری'، جیسے سلپ لگے ہوتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ماتحتین نے ان کارروائیوں میں اپنی نااہلی اور تساہل کی وجہ سے کافی دیر لگادی ہے اور اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان مثلوں پر یہ حاکم مجاز اپنی دستخط جلد سے جلد ثبت کردیں تاکہ ان ماتحتین کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے کارروائی اور زیادہ خراب نہ ہو۔ غرض سب کچھ تو میز پر ہوتا ہے، وہیں پر ٹیلی فون رکھے ہیں، وہیں پر باہر سے سکریٹری یا چپراسی کو بلانے کے لئے گھنٹی لگی ہوتی ہے۔ اس طرح عہدہ کا امتیاز کرسی سے نہیں بلکہ میز سے ہے۔ اور جو افسر جتنا بڑا ہوگا وہ اپنی میز اتنی ہی بڑی رکھنے کی سوچے گا تاکہ آنے والوں پر اس کا زیادہ سے زیادہ رعب پڑے۔ پرانے زمانے میں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں اور بادشاہوں کے سامنے کاغذات اور مثلیں تو پیش نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ تخت پر براجمان ہوتے تھے، میز کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن حالات کے بدلتے بدلتے اقتدار کا مرکز تخت سے کرسی پر آیا اور چونکہ کرسی اور میز کا سمبندھ گہرا ہے اس لئے اقتدار کرسی سے میز پر منتقل ہوگیا۔ تو اب اپنے اجلاس پر متمکن ہونے کے بعد حاکم، چاہے وہ کسی سرکاری دفتر میں ہو کہ صنعتی یا تجارتی دفتر میں، سوچتا ہے کہ لو اب ہم بھی کچھ ہیں۔ گھر میں بیوی جھک جھک، بچوں کی چیخ و پکار، مہمانوں کے شور و شغب میں ہماری ہستی ڈوب کر رہ گئی تھی لیکن یہاں ہم ہی سب کچھ ہیں۔ کسی کو بھی بلا کر ڈانٹ سکتے ہیں۔ کسی کا اضافہ تدریجی نامنظور کر سکتے ہیں۔ کسی کی رخصت کاٹ سکتے ہیں، کسی کو ترقی سے محروم کر سکتے ہیں اور اپنے کسی منظورِ نظر کو اعلیٰ مدارج عطا کر سکتے ہیں اس سوچ سے ہی اپنی انا کو ضرورت سے زیادہ اونچا کرتے ہوئے سینہ پھلا

کر لکھنے پڑھنے کی عینک کو ناک پر سجاکر کچھ کام شروع کرنا ہی چاہتے ہیں کہ ٹیلی فون کے ذریعہ یا چپراسی کی زبانی یہ پیام ملتا ہے۔ "صاحب نے سلام دیا ہے۔" لیجئے وہ تاش کے پتوں کا محل جس میں یہ براجمان تھے، وہ سلطنت جس کے یہ بے تاج بادشاہ تھے، وہ اقلیم جس پر ان کی حکمرانی تھی ان کے پیروں کے نیچے سے کھسک جاتی ہے اور ہوش و حواس ٹھکانے لگتے ہیں، یہ احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ وہ سب کچھ ہی نہیں ان کے اوپر بھی کوئی ہے جو یہ تصفیہ کرتا ہے کہ ان کو کن حدود میں رکھا جائے، ان سے کتنی بیگار لی جائے اور ان کو کہاں کس درجہ تک رہتے دیا جائے۔ یعنی ان حاکم کا حاکمِ اعلیٰ جو آج بھی فرنگی حکومت کے اداب کے لحاظ سے سلام کہلواتا ہے یعنی ان کو طلب کرتا ہے۔ "حکمِ حاکم مرگِ مفاجات" : وہ جو فرماں روائی تھی یک لخت تابعداری میں بدل جاتی ہے اور یہ احساس اُجاگر ہوتا ہے کہ گھر میں بیوی اور دفتر میں حاکم — جی ہاں، حاکم جس کو "باس" بھی کہا جاتا ہے جو موقعہ بے موقعہ سر کھاتا ہے اور جس کو ہر وقت "سر" کہنا پڑتا ہے، چاہے اس کے سر میں بھیجہ ہو کہ نہ ہو جس کا سر اس کے اپنے کندھوں پر برابر ہو کہ نہ ہو۔ بہر حال یہ حقیقت بڑی جان لیوا ہوتی ہے اور یہیں سے پھر کمتری کا احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ وہ نہ گھر پر کچھ ہے نہ اپنے دفتر میں کچھ۔ گھر پر بیوی دفتر میں حاکم۔ اب مجبور محض انسان جائے تو کہاں جائے۔ بہت سارے لوگ گھر اور دفتر سے تھک تھکا کر اپنی خود اعتمادی کو سہارا دینے اور کبھی کبھی بڑھاوا دینے کلب کا رُخ کرتے ہیں کہ جہاں وہ کچھ کھیلوں میں حصہ لے کر حاکم اور بیوی دونوں کو بھلا دیتے ہیں لیکن کلب ہمیشہ سہارا نہیں دیتے اس لئے کہ بہت ساری بیویاں وہاں بھی ساتھ ہو جاتی ہیں اور دل بہلانے کے لئے کچھ کھیل رہے ہوں، وہ کھیل کی غلطیوں کو یاد دلا کر شرمندہ کرتی ہیں اور ہار پر لعن طعن۔ کسی سے کبھی دفتر اور کاروباری بات چیت چھڑ جائے تو ٹوک دیتی ہیں کہ لیجئے اب یہاں بھی وہی فضول کی بکواس، جیسے ان باتوں کی کوئی اہمیت ہے نہ اس کے دور رس اثرات قابلِ لحاظ۔ سگریٹ دوسرے تیسرا جلالیا تو ٹوک دیئے گئے کہ چلو بہت ہو گئے سگریٹ۔ اور پھر تمباکو نوشی کے نقصانات پر ایک لیکچر۔ غرض کہ چھوٹی بڑی باتیں سب ایک ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ گھر پر بیوی، دفتر میں حاکم۔ چکی کے یہ دو پاٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ گھریلو اور دفتری زندگی ان دونوں کے بیچ پستی رہتی ہے۔

(گُل و گلزار ہستہ) — —

خواجہ عبدالغفور

بچپن سے پچپن تک

بچپن وہ زمانہ ہے جب فکرِ فردا ہوتی ہے نہ اور کسی قسم کی فکر — اور جو کوئی فکر ہوتی ہے وہ محض پڑھائی سے اور استاد کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کی فکر ہوتی ہے یا پھر یہ فکر کہ کب چھٹی ہوگی اور کب کھیل کے لئے وقت ملے گا۔

بچپن کے سہانے سپنے اب بھی یاد آتے ہیں تو دل مچل جاتا ہے کہ کاش ان کی تعبیر اب بھی مل جائے اور زندگی کے دن دلچسپ ہو جائیں۔

بچپن کی یاد آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے۔

پڑھائی کا خیال آتا ہے تو اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب نظروں میں پھر جاتی ہے اور ان کا وہ سبق یاد آتا ہے —

"ایک لڑکی بگھارتی ہے دال
دال کرتی ہے عرض یوں احوال

اس کے بعد وہ تمنا کہ

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس کے ساتھ وہ حب الوطنی سے بھرا ترانہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بچپن میں کرید تجسس، ہر چیز کی اصلیت او ماہیت معلوم کرنے کی فکر — نہ مصلحت نہ دوراندیشی جو دل میں ہو وہی زبان پر اور جو کہیں اس کا وہی مطلب۔

ہمیں یاد ہے کہ ایک طالب علم جھوٹ بولتے پکڑے گئے تو ماسٹر صاحب نے بڑا لمبا لکچر دیا، جھوٹ کی برائیاں سمجھائیں اور کہا، " دیکھو صاحب زادے ہم تمہاری عمر میں کبھی جھوٹ نہیں کہا کرتے تھے"۔ ان

برخوردار نے جھٹ سے کہا — "تو صاحب، آپ نے کس عمر سے جھوٹ بولنا شروع کیا ہے؟"

ایک بار شرارت پر سخت پٹائی ہوئی اور تنبیہاً بڑے بھائی صاحب نے کہا: "جانتے ہو ہم نے تمہاری پٹائی کیوں کی؟ (اور خود ہی کہا) اس لئے کہ ہمیں تم سے پیار ہے اور ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔"

لڑکے نے معصومیت سے کہا "کاش کہ بھیّا ہم بھی آپ کے پیار کا جواب اسی طرح دے سکتے!"

ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ہاتھ گھر کے خوبصورت قالین پر سیاہی گر گئی۔ جب ہماری اس حرکت پر گوشمالی کی گئی تو ہم نے پوچھا "کیا سیاہی اتنی قیمتی چیز ہے کہ اتنی سی گر گئی تو ہم پر اس قدر سخت غصہ کیا جاتا ہے۔"

ہماری دسویں سالگرہ پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ ایک بڑا سا کیک اور دس موم بتیاں منگوائی گئیں، چونکہ ہمارے بہت سارے دوست آرہے تھے۔ ہم نے فرمائش کی کہ ایک موم بتی اور دس کیک منگوائے جائیں۔

بچپن وہ زمانہ ہے کہ جب آداب و اخلاق سکھائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جب کوئی ہمیں بہت ساری مٹھائی اور ٹافی دے رہا ہو تو لینے کو بے اختیار جی چاہے بھی تو تہذیب و اخلاق کے پردہ میں یہ کہا جائے "جی بس، شکریہ اور نہیں چاہیئے۔" ہم نے اس سبق پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ ہمارے دوست کی سالگرہ کی پارٹی ختم ہونے کو آئی تو اس کی والدہ نے ہم سے کہا "پیٹ بھر کھا لو بیٹا"۔

ہم نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔ "جی پیٹ تو کبھی کا بھر چکا"۔ اس پر مہربان خاتون نے کہا "تب تو کچھ ٹافی اور چاکلیٹ جیب میں رکھ لو"۔ ہم نے سچ سچ کہہ دیا کہ "جی ہمارے دونوں جیب بھی بھرے ہوئے ہیں۔"

اور جب گھر لوٹنے کا وقت آیا تو یکایک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میزبان خاتون نے کہا: "چھتری اور برساتی لیتے جاؤ"۔ ہم نے شکریہ ادا کیا تو بولیں۔ "یقیناً تمہاری ماں بھی میرے بیٹے راجو کی اسی طرح دیکھ بھال کرتیں۔" ہم نے کہا "جی میری ماں تو راجو کو ایسے میں کھانا بھی کھلا کر اپنی موٹر میں واپس کرتیں"۔ کھری کھری بات کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر۔

بچپن کی باتیں بھی خوب ہوتی ہیں نہ لاگ نہ لپیٹ، نہ طنز نہ استہزا۔ بلا سوچے سمجھے بھی بڑے پتہ کی باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ ہم نے ایک بار اپنی امی سے کہا "آپ کی سالگرہ پر ہم آپ کو بہت ہی بڑھیا تحفہ دیں گے" امی نے پوچھا "وہ کیا؟" ہم نے بتایا "چینی کے برتنوں کا سیٹ"۔ امی نے کہا "بیٹا وہ تو میرے پاس ہے"۔ ہم نے کہا "جی ہے نہیں، تھا — جو تھا وہ ہمارے ہاتھوں چکنا چور ہو چکا ہے۔"

ہاسٹل سے ایک برخوردار نے اپنے والد بزرگوار کو خط لکھا "عرصہ سے آپ کی خیریت کی کوئی اطلاع نہیں ملی جس کی وجہ سے پریشانی ہے۔ فوراً سو روپے کا منی آرڈر بھجوائیے تاکہ آپ کی خیر خیریت معلوم ہو۔"

ایک بار ہمارے ابّا کے دوست نے ہم سے پوچھا۔ "بیٹا کیا تم اسکول جاتے ہو؟" ہم نے جواب دیا۔

"جاتا نہیں، بھیجا جاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد انھوں نے ہم سے پوچھا "بیٹا کوئی گانا وانا آتا ہو تو سناؤ۔" ہم نے صداقت بھرا جواب دیا۔ "جی ہم سے ابّا گانے کی فرمائش اس وقت کرتے ہیں جب انھیں اپنے بن بلائے مہمانوں کو بھگانا ہوتا ہے۔"

ہمارے ایک ہم عمر ہم جماعت نے بتایا کہ اس نے اپنے ابّا سے کہا "ابّا جان اگر میں آپ کے دس روپے بچا لوں تو آپ مجھے پانچ روپے دیں گے؟" ابّا جان نے کہا "ضرور" تو پھر اس نے کہا۔ "نکالئے پانچ روپے، آپ نے کہا تھا کہ ہم اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہوں گے تو آپ دس روپے انعام دیں گے۔ ہم اچھے نمبروں سے نہیں پاس ہوئے ہیں لہٰذا آپ کے دس روپے بچا دیئے ہم نے۔ تو پھر پانچ روپے دے دیجئے۔"

بچپن کے بعد جوانی کا دور بھی بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ جب ہر چیز پر بہار ہوتی ہے۔ ہر شئے حسین ہوتی ہے۔ دنیا حسین تھی مرے عہدِ شباب کی۔ اس کے بعد ؎

شباب مٹ گیا، یادِ شباب باقی ہے
ہے بو شراب کی ساغر میں اب شراب نہیں

اب جو بچپن سے بڑی طول طویل منزلیں طے کر کے بچپن سے آگے نکل آئے تو بار بار یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

بچپن کے دن بھی کیا دن تھے
اڑتے پھرتے تتلی بن کے

بچپن بھی عجیب و غریب عمر ہے کہ جہاں قرار ہے نہ سکون۔ دل میں یہی کسک اور پچھتاوا ہے کہ کاش ہم نے نوعمری اور جوان سالی میں یہ کرلیا ہوتا، وہ کرلیا ہوتا، اپنی زندگی اس طرح بتائی ہوتی۔ یہ پچھتاوے کسی تاسف کے تحت نہیں محض اپنی دانشمندی اور دانشوری کے زعم میں یہ احساسات اجاگر ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر سے زندگی لوٹا دی جائے اور یہ اختیار ہو کہ اس کو جس طرح بھی چاہے بتایا جائے تو یقیناً ہم اسی ڈھنگ اور اسی نہج پر گزاریں گے۔ اور خوشی محسوس کریں گے۔ یہ احساس اس لئے ہوتا ہے کہ آئندہ کچھ اور کرنے کا عزم مصمم ہوتا ہے۔ اس کے لئے گئے گزرے دور کا سہارا لیا جاتا ہے۔ حالانکہ عمر رواں اس طرح رواں اور دواں ہے جس طرح عمر رفتہ سے آگے بڑھنا مقسوم میں ہے۔

بچپن میں زیادہ تر "میں بن" تھا تو اب کلیتاً تجربہ کا سہارا ہے، بچپن ایسی عمر ہے جس کو منجدھار کا اگلا دوآبہ کہا جاسکتا ہے۔ جہاں آدمی تھک ہار کر کچھ دیر سستاتا ہے اور دم لیتا ہے، عمر گزشتہ کا جائزہ لیتا ہے اور آگے کی باتیں دھیرج سے سوچتا ہے۔ کبھی اس کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ پیچھے کو لوٹ

جائے مگر یہ ناممکن العمل ہے۔

پچپن عمر کا وہ نازک دور ہے جب آدمی محنت ومشقت سے کتراتا ہے — تساہل اور کاہلی کا شکار ہوجاتا ہے مگر بزعم خود یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ جن بیویوں کو اپنے شوہروں سے سخت اور دقت طلب کام لینا ہوتا ہے تو وہ اس طرح کہتی ہوئی سُنائی دیتی ہیں کہ لو اب رہنے بھی دو اب اس عمر میں آپ سے گھر کے لان کی پوری کھدائی اور وزنی فرنیچر کو ایک طرف سے دوسری طرف رکھنے کا کام کیا ہوگا؟" جہاں پیرانہ سالی کا حوالہ دیا کہ بس طیش طیش میں سخت سے سخت محنت کا کام بھی چٹکی بجاتے میں کر ڈالتے ہیں اور اپنی مستعدی اور طاقت کا سکّہ جما تے ہیں۔ ویسے کام ٹالنا ہو تو ضرور کہیں گے کہ بھئی رہنے بھی دو اب تو ہم پچپن کے ہوگئے لیکن بہت سوں کو دیکھا کہ ساٹھ کے قریب ہوں گے تو ساٹھا اور پاٹھا پر عمل کرنے تیار ہوجائیں گے۔ ("سمن زار سے")

-۱-

کلی کے لئے پھول بننا جس طرح آسان ہے اسی طرح خواجہ عبدالغفور کے لئے بات کو پھلجھڑی بنانا۔ خود اُن کا بیان ہے کہ اُن کا مزاج لڑکپن سے ظریفانہ ہے اور اس پر انگریزی چھاپ اُترتی رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا وہ اعتراف نہیں کرتے کہ ان کے طبعی رجحان نے ابتداء میں چاہے جس مزاح کا اثر قبول کیا ہو، اس کی حقیقی نشو ونما جامعہ عثمانیہ کے ماحول میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ بادۂ علم کے جام بھی دیتی تھی اور ظرف کو سنوارنے کا انتظام بھی کرتی تھی۔ اس تعلیم وتربیت کے فیضان نے خواجہ عبدالغفور کو شائستہ مزاح کی رنگارنگ فضاء میں اُبھارا، اگرچیکہ اُن کا قہقہہ اپنی بلند آہنگی میں آزاد ہی رہا۔ اس لئے کہا جاتا ہے خواجہ عبدالغفور قہقہے لگاتا ہے اور اس کی تحریر مسکراتی ہے ۔۔۔۔

غفور صاحب کا ایک لطیفہ سُنیے۔

ایک حاکم اپنے دفتر میں ماتحت افسروں کو جمع کرکے لطیفے سُنایا کرتے تھے ماتحت افسر ہر لطیفے پر خوب خوب ہنستے۔ ایک دن ایک صاحب بالکل نہیں ہنسے بُرا سا منہ بنائے بیٹھے رہے۔ ان کے ایک دوست نے پوچھا "کیوں یار ہنستے کیوں نہیں؟" وہ بولے "میں تو کل سے وظیفہ پر گھر بیٹھ رہا ہوں، مجھ پر ہنسنے کا لزوم نہیں"۔

——— رشید قریشی

—— (مضمون "طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ" سے اقتباس) ——

خواجہ عبدالغفور

ہنسی اور قہقہے کی مختلف اشکال

KINDS OF FUN ANDLAUGHTER

مسکراہٹ اور قہقہے کے محرکات کے ساتھ ساتھ بطور ردِّ عمل جو تاثرات ظاہر ہیں ان کی ہیئت پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے چنانچہ مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہے کے درمیان بھی بہت ساری ایسی اشکال ہیں کہ جو اندرونی کیفیات کو کبھی نرمی سے تو کبھی تندی سے ظاہر کرتی ہیں اور انسان کی نفسیاتی کیفیات کو بھی واضح کرتی ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر نے کہا تھا کہ انسان کے اندر جو زائد قوت یا توانائی ہوتی ہے وہ ہنسی سے چھلک جاتی ہے۔ اسی لئے صحت مند آدمی کبھی ہنسنے ہنسانے سے نہیں جھجکتے۔ اسٹیفن لی کاک اور تھامس ہابز کا خیال ہے کہ احساس برتری کا اظہار ہنسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب انسان دنیا اور اس کے سارے عناصر سے موافقانہ جذبات رکھتا ہے تو بات بات پر ہنسی اُبل پڑتی ہے۔ ہر حساس آدمی اپنے گرد ایک تنظیم اور ضابطہ دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس کو ہم آہنگی کا فقدان نظر آتا ہے تو وہ تضاد اور ناگواریِ خاطر پر ہنس دیتا ہے اور اس کی یہ ہنسی یا تو ردِ عمل ہوتی ہے یا سماجی اصلاح کا پیش خیمہ ؛ مسلمہ قدروں اور ضوابط سے ہٹتے ہوئے دیکھنے پر جو ناگواری ہوتی ہے۔ اس کے خلاف مدافعت یا فرار کی نیت سے بھی انسان ہنس کر ان تاثرات کو دور کرتا ہے۔ ہنسنا سماجی اقدار کے بغیر ممکن نہیں۔

ہر موقع اور محل کے لحاظ سے چہرے کے اعصاب لاشعوری اور غیر اختیاری طور پر اثر پذیر ہوتے ہیں، ہلکی معمولی سی بات پر صرف مسکراہٹ، اس سے بڑھ کر ردِ عمل ہو تو ہنسی اور بہت زیادہ تاثر ہو تو قہقہہ۔

گلوگیر ہنسی (GIGGLE) : قہقہے کی دبی دبی شکل کہ جب پورا منہ کھول کر ہنسا بھی نہ جائے اور ہنسی کی شدت کو روکا بھی نہ جائے۔ بہرکیف یہ واضح بھی ہو کہ قہقہے کو دبانے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے اور گلے سے ایسی آوازیں نکلیں کہ جو سب سن سکیں۔ بسا اوقات یہ خود اعتمادی کی کمی کو بھی آشکارا کردیتی ہے اور بدتمیزی کا بھی اظہار ہوتا ہے جو نہ تو محظوظ ہونے کی علامت ہے نہ خوش طبعی کی۔

چکس (CHUCKLE) : جب ہنسی قہقہے سے بہت کم تر ہو اور اس کی اٹھان ایسی ہو کہ اگر موقع ملے بھی تو قہقہہ نہ بن سکے۔ کبھی کبھار تو کسی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے خوش طبعی سے ٹالنے کے لئے بھی ایسی آواز نکالی جاتی ہے۔

خندۂ استہزا (SNICKER) : دبی دبی ہنسی جو کہ کھسیانے پن سے ہو یا کسی اور کی تضحیک کی نیت سے ہو۔ یہاں پر بجائے استہزائیہ یا ہجو یہ جملوں کے صرف ہلکی سی مسکراہٹ یا دبی چھپی ہنسی یا آنکھوں کے اشارے سے وہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے جس کا مقصد تضحیک ہوتا ہے۔

اخّاہ (GARGIE) : بوقت ہنسی ایسی آوازیں کہ جیسے کوئی غرارہ کر رہا ہو اور پھر یہ اوروں کے لئے ہنسی کا باعث بن جاتی ہیں۔

قلقل (TITTER) : صراحی سے جب رُک رُک کر پانی گرتا ہے تو ایک خاص قسم کی آواز نکلتی ہے۔ عین اسی طرح بعض لوگ ہنستے وقت آوازیں نکالتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہنسی کے موڈ میں نہیں۔

زیرلب تبسم (GRIN) : بعض لوگوں کے لئے کھلکھلا کر ہنسنا دوبھر ہوتا ہے اور بہت سارے لوگ قہقہے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہنسی ہونٹوں پر کھل کر رہ جاتی ہے جیسے کہ فرض ادا ہو گیا ہو۔

غنچے، تری زندگی پہ دل ہلتا ہے   بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا   یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

جگ ہنسائی (PUBLIC RIDICULE) : یہ سب سے زیادہ خطرناک اور خوف ناک ہنسی ہوتی ہے جس سے ہر شخص لرز کر پناہ مانگتا ہے۔ شرم و حیا اور اپنی عزت و ناموس جن کو عزیز ہوتے ہیں ان کے لئے یہ بہت بڑی سزا ہوتی ہے۔

ہنسے تو مجھ پہ ہنسے اور وہ بھی سرِ عام   سنتا ہے آپ تو ڈرتے ہیں جگ ہنسائی سے
یہ سمجھنے والے ظاہر ہے کہ سارے جگ کے ہنسنے کے خوف سے کس قدر پریشان ہوتے ہوں گے۔

قہقہہ (GUFFAU) : یہ خوش طبعی اور ذہین دماغ کی علامت ہوتا ہے۔ جس آدمی میں احساس کمتری ہوتا ہے۔ وہ البتہ اپنے احساس کو چھپانے کے لیے بدتمیزی سے قہقہے لگاتا ہے اور جس میں احساس برتری ہوتا ہے وہ دوسروں کی تضحیک کی خاطر باآواز بلند قہقہہ لگاتا ہے۔ لیکن نرم دل آدمی کا قہقہہ اس کے

خوش مذاق ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔

دیوارِ قہقہہ (HOMERICK LAUGH) : فلک شگاف قہقہے مبالغہ ظاہر کرتے ہیں اس صورت حال کو کہتے ہیں کہ دیوارِ قہقہہ کھڑی ہوگئی اس لیے کہ قہقہے مسلسل ہوتے ہیں۔

قلقاری (SNIGGER) : بلند قہقہہ جس سے بھونڈا پن نمایاں ہوتا ہے۔ کچھ جہل کا عنصر بھی شریک ہوتا ہے لیکن بے اختیاری ہوتی ہے۔ بالعموم بچوں کی بے اختیار بہ آوازِ بلند ہنسی کو قلقاری کہا جاتا ہے۔

اس خصوص میں بعض عنوانات مستقل طور پر توجہ کا مرکز رہے ہیں جیسے کہ واعظ اور زاہد کا تمسخر، شیخ سے چھیڑ چھاڑ، محتسب کے نام کے پس پردہ صاحب فہم و ذکا حضرات کی مٹی پلید کرنا، تاکہ سننے والے محظوظ ہوں۔ بعض مسکراہٹیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو آنسو کا عطر کہا جا سکتا ہے جو انتہائے غم پر آجانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ خوشی میں ہنسنا اور غم میں رونا انسان کی فطرت اور جبلت ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں، روز کا معمول ہے لیکن مصیبت میں مسکرانا اور قلقل مینا کے پردے میں رونے کا عرفان کرلینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

— —

●

▫ کسی صاحب کا بڑا ہی عمدہ اور بڑھیا نسل کا کتا کھو گیا۔ انہوں نے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ جو کوئی اس کتے کو ڈھونڈ کر واپس پہنچا دے گا اس کو ۵۰۰ روپے بطور انعام دیئے جائیں گے اور کتے کی شناخت کے لئے ساری تفصیلات بھی دے دیں۔ جس دن یہ اشتہار شائع ہوا اس کی دوپہر کو موصوف اس اخبار کے دفتر گئے یہ دریافت کرنے کے لئے کہ کتے کا کچھ پتہ چلا بھی کہ نہیں۔ جب یہ پہنچے ہیں تو سارا دفتر ہی سونا پڑا تھا۔ دربان، چوکیدار سے لے کر مدیر اعلیٰ تک غائب تھے۔ اِدھر اُدھر پوچھا تو کسی نے بتایا کہ آج جو کتے کے لئے اشتہار چھپا ہے اسی کتے کی تلاش میں سب کے سب گئے ہوئے ہیں۔

●

▫ کسی خاص برانڈ کے گھی کے متعلق اشتہار دیا جاتا ہے کہ یہ گھی کھانے والا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، اس کے گھر کبھی چوری نہیں ہوتی اور اس کو کتا نہیں کاٹتا۔ جب اس کی وضاحت چاہی گئی تو بتایا کہ ایسا آدمی جوانی میں ہی داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے اس لئے بوڑھا نہیں ہو پاتا، چونکہ رات بھر کھانسی کے مارے جاگتا رہتا ہے اس لئے چور گھسنے کی ہمت نہیں کرتے اور ناتوانی کے مارے لکڑی کا سہارا لے کر چلتا پھرتا ہے تو کتا اس کے قریب ہی نہیں آتا۔

— —

خواجہ عبدالغفور

مخدوم ـــــ احوالِ دیگر

[مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۸ فروری ۱۹۸۰ء کو یادِ مخدوم کی تقاریب اہتمام کے ساتھ اورنگ آباد میں منائی گئی تھیں۔ دوروزہ سیمنار کے صدراتی خطبہ میں غفور صاحب نے مخدوم محی الدین سے وابستہ دلچسپ باتوں کا تذکرہ کیا اور مخدوم کے کھلنڈرے پن، کالج کے دور کی شوخیوں، لطیفہ گوئی اور بزلہ سنجی کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔ اس مضمون کے ذریعہ غفور صاحب نے شوخ و شریں مخدوم کی یاد کو متازہ کیا تھا۔]

آج کے اس سیمنار میں مقالہ نگار اور قابل مقررین نے مخدوم کی فنی شعری صلاحیتوں اور اس کی سیاسی زندگی پر بصیرت افروز تقریریں کیں اور شاید اس کی شخصیت کی عظمت اور اس کے مدبرانہ اور شاعرانہ افتخار کے پیش نظر اس کی طالب علمی اور نوجوانی کے اس دور کو بالکل نہیں چھیڑا کہ جس میں ایک اعلیٰ درجہ کا ظریف بذلہ سنج خوش باش خوش مزاج انسان کے روپ میں ہر جگہ چمکتا دمکتا رہا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر کچھ ایسی ہی باتیں آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں ـــــــــ

مخدوم کی جوانی کا احوال سبط حسن کی زبانی سنیے:۔

آبنوسی رنگ کا ایک نہایت وجیہہ نوجوان۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ چوڑی پیشانی۔ ستواں ناک۔ دیوتاؤں جیسے ترشے نقوش۔

علی سردار جعفری مخدوم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی تیزی۔ آبنوسی چہرہ جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات۔ رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار۔ بلند پیشانی۔

زور دار ٹھوڑی اور بھنچے ہوئے ہونٹ ۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کرتی ہیں ایک ہلکا تبسم، دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے ٹپک پڑے گی اور اس کی سرمئی رنگ کی شیروانی کو بھگو دے گی۔

آگے کے دور میں زینت ساجدہ نے مخدوم کو جیسا دیکھا، اس کی عکاسی وہ اس طرح کرتی ہیں :۔

مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے نہ لوگ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں ۔ اس لئے میں اس کی جوانی میں اس کا جشن منانا طے پایا --- خدا جانے کب سے اس نے یہ ٹرک رکھی ہے کہ اس کا عمر کا پہیہ اُلٹا گھوم رہا ہے۔ خدا معلوم اس نے مصری لیموں کا کون سا نسخہ استعمال کیا تھا کہ اس میں کبھی تبدیلی نظر نہیں آئی ۔

مخدوم پر عثمانیہ یونیورسٹی کی پوری چھاپ تھی اور رگوں میں جد امجد بلال حبشی رسول اللہ کے صحابی کا اصلی خون بلڈ بنک کا لیا ہوا خون نہیں --- مخدوم کی سوانح حیات اس کے فکر و شعور، حوصلہ، صبر و تحمل، خیالات کی بلندی، رومان پروری اور سیاسی اُپج کی آئینہ دار ہے۔ طالب علمی کا زمانہ بالعموم ہر انسان کی آئندہ زندگی کی بنیاد ہوتا ہے لیکن کالج کا طالب علم رومان پرور، خوش فکر، خوش کلام، لطیفہ گو، چٹکلہ ساز، شمع محفل، یار باش، چرب زبان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ خانہ بدوش، دن میں تیس چالیس پیالی کا عادی، لااُبالی، لیکن کردار، اصول اور فکر کی خود اعتمادی اس میں بھرپور تھی اسی لئے تنگدستی نے اس کو ذہن، ضمیر اور اپنا کیریر بیچنے پر مجبور نہ کیا ورنہ آج ہم اُس کو شاعر، مدبر اور ایک خوبصورت انسان کی طرح یاد نہیں کرتے۔ آگے چل کر محفلوں، مجلسوں اور بڑے اجتماع میں سنجیدہ مدبر اور سیاسی رہبر بن گیا۔ عوام الناس اب اس کی جوانی کی زندگی کو بھلا بیٹھے ہیں۔

مخدوم کی شخصیت اس کے فن اور اس کے کردار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے حلقۂ احباب کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں پیش پیش سکندر علی وجد، میر حسن، اشفاق، نور الہدیٰ، ظفر الحسن، یحییٰ، صدیقی، شنکر جی، اکبر وفاقانی، شہریار کاوس جی، جسونت راؤ، سبط حسن، غلام علی، شکور بیگ، عاقل علی خان وغیرہ ایسی بے شمار ہستیاں ہیں کہ جنھوں نے ہر اعتبار سے آگے چل کر علم و ادب اور عملی زندگی میں نام کمایا۔ سکندر علی وجد نہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر بنے بلکہ حیدرآباد کی سیول سرویسز کے ممتاز رکن۔ اسی طرح یحییٰ اور غوث وغیرہ نے بھی سیول سرویس میں نام کمایا۔ میر حسن، اشفاق، ظفر الحسن نے اُردو ادب اور آل انڈیا ریڈیو میں سرخروئی حاصل کی۔ اکبر وفاقانی، سبط حسن نے صحافت کے میدان میں شہرت حاصل کی۔ غلام علی صاحب، شکور بیگ شعری ادب میں ابھرے اور اس دور کے صف اوّل کے طلبہ نے اپنا مقام پیدا کیا۔ صف دوم میں صاحبزادہ محمد علی میکش، صدر رضوی ساز سبزواری، نظر حیدرآبادی، سعادت علی خان، عباس علی خاں)، صاحبزادہ اشرف اور راقم الحروف نے بھی اپنے اپنے میدان میں کامیابی حاصل کی۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ثابت ہوئے لیکن ان میں کوئی بٹے باز تھا نہ کوئی اور بازی کی علت میں گرفتار۔ جامعہ عثمانیہ کے علم پرور، یا ادب، مہذب اور شستہ ماحول میں ہر ایک کی صلاحیتوں

نے جلا پائی۔ جن اساتذہ اور پروفیسروں کے آگے ان ہونہاروں نے زانوے ادب تہہ کیا انھوں نے بھی ان کی زندگی بنانے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ جن کی بہت لمبی چوڑی فہرست ہے اور جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔

مخدوم فطرتاً کھلنڈرے، چلبلے، عملی مذاق کے جویا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپ بازی اور بچوں سے کھیلنے کے شائق تھے۔ اسی لئے جملہ ساتھیوں سے بڑھ چڑھ کر شرارتیں کیں۔ ہم جماعت اور ہم عصر طلبہ کو ستایا لیکن کسی کا دل نہیں دُکھایا۔

ہاسٹل کی زندگی میں اہم حادثے اور واقعات اس وقت ہوتے ہیں جب قدیم طلبہ نواردوں کو طرح طرح سے ستاتے ہیں اور ان سے بطور تاوان احمقانہ حرکتیں کرواتے ہیں یا مٹھائی اور دعوت کی رشوت حاصل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک موقعہ پر جب نئے طالب علم نے احتجاج کیا تو اس کا پیلا دوشالہ چرالیا گیا اور جب اس نے مودب (وارڈن) سے شکایت کی تو دوسرے سینئر طلبہ جھنجلائے لیکن مخدوم کی شرارت بھری ذہانت نے ایک مرصع چٹخارے دار نظم لکھ ڈالی ـــــ اور یہی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اُبھرنے کا باعث ہوا۔

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا ــ وہ پیلا دوشالہ
رنگ اُڑگیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا ــ وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلاوڑ تھا جو چٹ کرگیا تجھ کو ــ پٹ کرگیا تجھ کو
تو کون سے موئے کا بنا تازہ نوالا ــ وہ پیلا دوشالہ
اے گرم کن پہلوئے من بازبیائی ــ گریم زجدائی
آن روز بیاد آر کہ من زیر تو بالا ــ وہ پیلا دوشالہ

یہ نظم جب تیار ہوگئی تو دوشالہ کے مالک سے اظہار ہمدردی بلکہ اظہار تعزیت کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اور جب یہ نظم خاص لحن اور ترنم کے ساتھ بہت بڑے اجتماع میں سنائی گئی تو آناً فاناً اس کو ہمہ گیر شہرت نصیب ہوئی اور ہمارے نوجوان شاعر کو آن کی آن میں ہیرو کا مرتبہ مل گیا۔

پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ ہر اقامت خانہ (ہاسٹل) اور کالج کی ہر محفل میں روئداد اور کارروائی اسی نظم کی خوش الحانی سے شروع ہوتی۔

اس تاریخی نظم کے ساتھ ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ جس کا کسی دور یا کسی عہد میں پھر سے وقوع پذیر ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں ایک اندوہناک زلزلہ آیا جس پر ساری دنیا والوں کے دل دہل گئے۔ جامعہ عثمانیہ کے نوجوانوں نے بھی اس زلزلے سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے ایک شو منعقد کرنا طے کیا۔ اس شو کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ اس کی سرپرستی شہزادہ معظم جاہ بہادر نے قبول کی

اور وہ بھی اس گرم جوشی سے کہ ان کی یورپ سے واپسی کی خوشی کے موقع پر اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ نے ڈنر کی شاہی تقریب منعقد کی ہوئی تھی اور جب اس شو کے انعقاد کا علم ہوا تو فرمانِ خسروی جاری ہوا کہ ڈنر جلدی ہی ختم ہو جائے اور بندگانِ عالی ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام بہ نفس نفیس جلوہ افروز ہوں گے۔ ان کے جلو میں رزیڈنٹ بہادر، مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت وزیراعظم خسرو دکن بار بار ہر ایک سے کہہ رہے تھے میرے بچے ڈرامہ کر رہے ہیں وہ بھی زلزلے کے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے۔ اس شاندار موقع پر مولانا شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی بھی تشریف فرما تھے۔ اس شو میں مخدوم کا لکھا ہوا ڈرامہ 'مرشد' پیش کیا گیا۔ جس میں مرشد کا رول مخدوم نے ادا کیا اور اس کا میک اپ خواجہ حسن نظامی کی طرح تھا جس کو خود خواجہ صاحب نے اور حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ اس ڈرامے کے سلسلے میں مخدوم کو ایکٹنگ کے انعام ملے۔

اس شو میں مخدوم کی معرکتہ الارا نظم بیلا دوشالہ بھی ٹھیٹھ قوالی کے انداز میں اس کے سارے آداب و مراتب، تہذیب و تنظیم کے ساتھ پیش کی گئی۔ اسٹیج کے بیچوں بیچ مشہور شاعر غلام علی صاحب کو باوقار مرشد کے روپ اور بہروپ میں متمکن کیا گیا۔ سر پر زرّین عمامہ، ہاتھ میں تسبیح، گلے میں رومال، شیروانی اور چہرہ پر مقطع داڑھی۔ مرشد کے حلقہ بگوش عقیدت مندوں کا گھیرا جو قوال بھی تھے اور ردّادی بھی۔ خالقِ نظم مخدوم نے شانِ نزول اور پس منظر اپنے دل فریب انداز میں سنایا اور پھر قوالی کا دور شروع ہوا۔ مرشد کو حال آتا اور کیف طاری ہوتا۔ وہ خود داد دیتے اور ان کے یارانِ طریقت جھومتے، سر دھنتے، سماں باندھتے کبھی کھڑے ہو جاتے اور کبھی حال کی وجہ سے بے حال ہو جاتے، داد دیتے اور بے داد کا منظر بن جاتا۔

اس قوالی میں مرشد کو حال آتا۔ وجد اور کیف کے عالم میں وہ رنگ جمتا کہ اس خاص مصرعہ کی تکرار ہوتی۔

وہ خاص مصرعہ تھا ــــ　"وہ کون بلاوڑ تھا کہ جو چٹ کر گیا تجھ کو　　پٹ کر گیا مجھ کو"

اس پر مجمع چلاتا "پھر بول، پھر سے بول"۔ کبھی "ارے پھر بول بلاوڑ"۔ "فلک شگاف قہقہے اور ہر مصرعے پر تکرار۔ عروج و کلائمکس آخری شعر تھا جس میں مخدوم پیلے دوشالے سے کہتا ہے ــ

او گرم کن پہلوئے من بازیبائی　　گرم زجدائی

آں روز بیا دآر کہ من زیر و تو بالا　　او پیلا دوشالہ

اسی فارسی زبان کو تسخیر کا ٹیکہ بنا کر مرشد کہتے ہیں ــــ "ارے اردو بول، ارے اپنی اردو پنج بول" زبان کے چٹخارے، نظم کی ترتیب و تزئین محفل کا سماں۔ مخدوم جیسے گمنام طالب علم کا شاعر، نقال، مزاح نگار کے روپ میں ابھرنا، سب کچھ ہی تھا لیکن مرشد نے ایک اور دلچسپ حرکت کی۔ حالت کیف و سرور میں جہاں بے دھڑک داد دے رہے تھے وہیں وہ دانستہ طور پر بطور داد و دہش اپنے نذرانوں میں سے مختلف چیزیں قوال کو عطا کر دیئے تھے۔ جب ہاتھ کا میل، روپیہ ہاتھ سے نکل گیا تو اپنا عمامہ اتار کر قوال

کو نذر کیا پھر اپنا رومال عطا کیا اس کے بعد جو شیروانی زیب تن تھی وہ بھی دان کردی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ عطا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی شرارت کی رگ پھڑکی اور انہوں نے اپنی نقلی ڈاڑھی نکال کر قوال کی خدمت میں پیش کردی۔ اس پورے شو کا ماحصل یہی تھا اور مخدوم کی ساری صلاحیتوں کا کلائمکس۔ طنز و مزاح، لطف و لطافت، ظرافت اور علمی مذاق کی اس سے بہتر تمثیل نہ پیش ہوئی ہے نہ پیش ہو سکے گی۔ مخدوم ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ ایک کامیاب فن کار ہے، کاریگر یا کار پرداز نہیں۔

ویسے تو مخدوم کی ذہانت بھری شرارتیں کالج کے ابتدائی دور میں کلاس روم اور ہاسٹل سے شروع ہو چکی تھیں۔ لازمی مضمون دینیات کی جماعتوں میں وہ اپنے بہت سارے شرکار کے ساتھ یا تو حاضر نہ ہوتا یا اُلٹے پلٹے سوال کر کے استادوں کو تنگ کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں غیر حاضری کی پاداش میں امتحان سے روکا جارہا تھا کہ وہ مضحکہ خیز استاد کو چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔

مخدوم کی ایک اور معصوم شرارت ہم سب کو یاد رہے گی کہ گاؤں سے آئے ہوئے ایک نووارد طالب علم کو اپنے ہاتھ میں ہمیشہ چھتری لئے گھومتے دیکھ کر سب ہی اُکتا گئے کہ موسم کچھ ہی ہو یہ چھتری بردار رہتے بلکہ چھتری پتی بنے رہتے۔ ان کو لاکھ سمجھایا گیا لیکن یہ ماننے والے نہیں تھے۔ ان کے لئے چھتری اسٹیٹس سمبل تھا اور حیدرآباد میں اور وہ بھی جامعہ عثمانیہ کے ماحول میں گاؤدی پن کا علم۔ مخدوم نے اس کا نام چھتری رکھ دیا۔ سب ہی اس کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ مخدوم نے بالآخر اس کی چھتری چُرا کر ہاسٹل کے صحن کے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر مضبوطی سے کھول کر باندھ دی۔ جس کی بھی نظر پڑتی وہ برخوردار کو خالی ہاتھ دیکھ کر مستانہ وار جھوم اُٹھتا اور ٹھٹھے لگاتا۔ اس شرارت کی وجہ سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ہاسٹل چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے اور اساتذہ اور مودب نے پوچھ تاچھ کی، پیشیاں ہوئیں، سزائیں تجویز ہوئیں لیکن شرارتیں کم ہوئیں نہ شوخیاں۔ ماحول دلگداز، خوش گوار اور حوصلہ افزا رہا۔

اسی طرح کی سیکڑوں شرارتوں کے موجد بہت سارے تھے لیکن مخدوم کو نت نئی سوجھتی تھی۔ ان کا محبوب مشغلہ تھا کہ ڈائیننگ ٹیبل پر دو ایک ساتھیوں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ جاتے، درمیان میں کسی نووارد طالب علم کو بٹھا کر اس کے آگے کچھ اور ساتھی بیٹھ جاتے۔ جب سب ہی کھانے میں مشغول ہو جاتے، میز پر بچھے موم جامہ والے میز پوش کو میز کی سطح سے نیچے تھوڑا اُلٹ دیتے اور ایک سرے سے پانی انڈیل کر اس کو وہاں تک بہنے دیتے کہ جہاں وہ غریب لڑکا بیٹھا ہوتا اور اس کے آزو بازو بیٹھے ہوئے لڑکے عین اس غریب کی گود میں اس پانی کو انڈیل دیتے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ شرارت باقاعدہ اسکیم کے تحت کی گئی اور اس کا نشانہ یہ غریب نیا طالب علم ہوتا۔

اب ساتھیوں اور ہم عصروں سے ہٹ کر اساتذہ پر بھی وار کئے جاتے۔ مودب مقیم رات گئے دیر

ے آسنے والے تھے۔ ان کے کمرے میں کسی طرح سڑک کے ایک گدھے کو پہنچا دیا گیا اور جب وہ تھکے ماندے ئے۔ اپنا کمرہ کھولا، بجلی جلائی تو گدھے نے ہنکارنا شروع کیا۔ اگر فی الحقیقت شیطان ہوتا تو شاید یہ اتنا اچھلتے کودتے۔ چلّا چلّا کر کہنے لگا۔ یہاں پر یہ گدھا کہاں سے آگیا۔ مخدوم اپنے ساتھیوں کے تھ اس ہنگامے کو دیکھنے موجود تھے۔ یک زبان ہوکر سب نے کہا صاحب! یہ (یعنی گدھا یعنی استاد موصوف) یہیں رہتا ہے۔

علی مذاق کی سیکڑوں مثالیں دماغ میں تازہ ہیں لیکن ان سے بڑھ کر وہ خزانہ ہے کہ جو مخدوم ے اپنی جولانئ طبع سے لطیفہ گوئی۔ چٹکلہ سازی اور طبعی ظرافت بھر دیا۔ آپس کی چشمک حریفانہ وار گپ بازی سب چنچل موڈ کے نتائج ہوا کرتے۔ ارزانی اور تن آسانی تھی۔ روزگار کی پریشانی تھی نہ مستقبل بھیانک ائی دیتا۔ سب آج کے جوان تھے۔ ہاسٹل میں پڑھنے والے کمرے کو کتب خانہ۔ مے کش کے کمرہ کو مے خانہ ہر و لڑکے کی رہائش پری خانہ بلکہ اس سلسلے اور قبیل کے سب ہی نام رکھے جا چکے تھے۔

ان تفصیلات سے ہٹ کر مخدوم کی جولانئ طبع کے سب سے بڑے جوہر اس کی لطیفہ سازی اور لطیفہ ی تھے کہ کسی کو بخشتے نہ خود کو اپنے مذاق کا نشانہ بنانے سے چوکتے۔ اپنی کمزوریاں مسکرا مسکرا کر سناتے ر دوسروں کو ہنساتے۔

شہر کے قدیم کالج اور ہاسٹل، حیدرآباد کے خوشنما باغ عامہ سے قریب تھے اور جب مخدوم اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلاسوں کے درمیانی وقفۂ راحت کو گذارنے اس باغ کی روشوں پر کھیلتے تو اس کے مہتمم/ ظم کو شرارتیں بُری لگتیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی روک ٹوک نے زبردست محاذ تیار کر دیا اور اس کا بدلہ ت نئی شرارتوں سے نہیں بلکہ ایجاد و اختراع کے ذریعے لطیفے گھڑے جانے لگے۔ بارش ہو رہی ہے۔ سارے لی مالن کسی سائبان کے نیچے کھڑے سستا رہے ہوں تو یہ ناظم صاحب کے پاس پہنچ کر شکایت کریں کہ دیکھئے پ کا اسٹاف کاہل اور سست ہے، کام چور ہے۔ درختوں کو پانی دینے کا وقت بیتا جا رہا ہے اور یہ تھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اور خود ہی تجویز کریں کہ بارش ہو رہی ہو تو کیا ہوا آپ انہیں چھتریاں لا دیجئے تاکہ چھتری تلے وہ پڑتی بارش میں درختوں کو پانی ڈالیں۔ یہ خود کہیں اور خود ہی سب میں مشہور ریں کہ دیکھئے ناظم صاحب اب چھتریوں کی حفاظت میں پانی ڈلوانے کی خاطر سب کو چھتریاں خرید کر دے رہے ہیں۔ کبھی یہ منسوب کیا جاتا کہ درخت لگانے کے لئے جب گڑھے کھودے جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دور کہیں کسی اور کھڈ سے میں یہاں کی نکلی ہوئی مٹی ڈالی جائے اور وقت ضائع ہو، اسی گڑھے کے برابر دوسرا گڑھا کھود کر اس طرح نکلنے والی مٹی کو اس میں وہیں کے وہیں ڈال دیا جائے۔

یہ تو ہوئیں باغ عامہ کی شرارتیں۔ یہاں سے ہٹ کر بھی مخدوم نے شہزادہ معظم جاہ بہادر کے

دربار میں ان ہی ناظم باغ عامہ کی حاضری پر لطیفے گھڑنے شروع کئے۔ چنانچہ اس کی شہرت دیدی کہ صاحب موصوف سرپر دستار اس طرح پہنتے ہیں کہ جو حصہ چہرے کے رُخ ہونا چاہیئے وہ الٹی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سب کو یہ بتائی جاتی کہ کبھی کبھار اچانک طور پر اگر شہزادہ والاتبار پیچھے کے رُخ سے آجائیں تو کم ازکم ان کی دستار صحیح طور پر ان کا خیر مقدم کرے۔ چاہے ان کی پیٹھ اُدھر ہو۔ شہزادے کے محل ہل فورٹ سے حسین ساگر میں شام کے وقت ڈوبتے سورج کا منظر بڑا دلفریب ہوتا ہے اور اکثر شام میں پھوٹتی شفق کے رنگوں کی چمک دمک بڑی دیر تک دل چسپی سے دیکھی جاتی۔ غروب آفتاب سے کچھ پہلے شہزادہ والاتبار سے جب رخصت کی اجازت مانگی تو ان سے کہا گیا کہ کچھ ہی دیر میں سورج غروب ہونے والا ہے۔ اس دلفریب سماں کو دیکھنا چاہیئے۔ مخدوم نے یہ لطیفہ گھڑا کہ ان حضرات نے اپنی مصروفیت کا عذر کرتے ہوئے دست بستہ معافی مانگی اور کہا۔ آج مجھے معاف فرمائیے گا۔ کل صبح آن کر غروب آفتاب کا منظر دیکھ لوں گا۔

میں نے مخدوم کی زندگی سے ان کے کھلنڈرے پن اور ان کی شوخیوں اور شرارتوں کی کچھ جھلکیاں پیش کی ہیں کہ جو اس دور کی تہذیب اور زندگی کا بانکپن سمجھی جاسکتی ہیں۔

ان سے ہٹ کر مخدوم کو دیکھا جائے تو وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ جس کا مرغوب مشغلہ دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکنا اور بچوں سے کھیلنا تھا۔

اس کی شاعرانہ زندگی کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے عوام کے قریب رہنا چاہتا تھا تاکہ وہ ان کے دل کی دھڑکنیں سنے۔ ان کے دکھ درد اور ان کے سکھ کا پاس کر سکے۔ مخدوم مشاہدات و تجربات کو دماغ میں محفوظ رکھ لیا کرتا اور اس کا کہنا ہے کہ یہی بعد میں شعر کی صورت میں ابھرتے تھے۔

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو
گاہ ہنستی ہوئی گاہ روتی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

اب تک آپ نے مخدوم کو ایک کھلنڈرا، ہنسوڑ، بذلہ سنج، خوش دل، نقال، ایکٹر، لطیفہ ساز، شوخ و شنگ، شرارتی نوجوان کے روپ میں دیکھا۔ اس کی زندگی کے تین زاویے ہیں ڈرامہ، شاعری اور سیاست۔ آپ نے کہانیاں لکھیں، پھول اور پتھر، آدم کی اولاد، کھوے ہوئے تارے، پاپی وغیرہ۔

اس کی مزاحیہ شاعری کا نمونہ "پیلا دوشالہ" بے مثال ہے۔ اس نے تین ڈرامے لکھے ہوش کے ناخن، مرشد اور پھول بن لیکن یہ شائع نہ ہو سکے۔ البتہ اسٹیج پر بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے جس پر مخدوم نے بھی اداکاری کی اور بہترین اداکار کا انعام حاصل کیا۔ راقم الحروف نے اپنے تین بڑھیا سوٹ اداکاروں کو مستعار دیئے تھے۔ اس لئے مجھے بھی ایک خاموش رول ملا جو اعلیٰ حضرت ظل اللہ شہزادوں اور

شہزادیوں، مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم سراکبر حیدری رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نائیڈو کی حضوری میں پیش کیا گیا۔ مرشد کے متعلق علیحدہ لکھا جاچکا ہے۔ مخدوم نے ہمزاد، ظاہر باطن، حشرات الارض میں کامیاب اداکاری کی۔ لگتا ہے کہ مخدوم کی پوری زندگی ایک ڈرامہ تھی۔ ابتدائی دور کی مخدوم کی رومانی شاعری، اس کی میٹھی آواز، رسیلا ترنم، آواز کا اُتار چڑھاؤ جادو جگاتے۔ سامعین گم سم ہوجاتے اور کیف طاری ہوجاتا۔ بالخصوص "طور" انتظار، ساگر کے کنارے اور تلنگن۔ یہ سب ہر نوجوان کے دھڑکتے دل کی پکار ہوتے اور سنگین سے سنگین دل بھی محبت کرنے کے لئے تڑپ اُٹھتا۔

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم کی غزل گوئی ۱۹۵۹ء میں شروع ہوتی ہے اور روایتی لہجہ اسلوب اور آہنگ ملتا ہے۔
مخدوم کے نجی خطوط، کہانیاں، سفر کی جھلکیاں، مقالے، ڈرامہ نگاری، رومانی اور سیاسی شاعری سب ہی اپنی اپنی جگہ عظیم المرتبہ ہیں۔
رومانی اور حسن و عشق کی شاعری کے بعد مخدوم نے:۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

جیسی نظم لکھا اور اس کے بعد ہی اس کا رنگ نکھر گیا اور مخدوم نے جنگِ آزادی والی معرکتہ الآرا نظم لکھی اور سرخ سویرا کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہوا۔

لو سُرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گل نار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اور پھر مخدوم سرخ سویرے کا شاعر کہلانے لگا۔ اس کے بعد "گل تر" دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا۔

نکہت یار سے آباد ہے ہر کنجِ قفس مل کے آئی ہے صبا اس گل تر سے پہلے

بساطِ رقص نامی نظم ہی سے مخدوم نے اپنے تیسرے شعری مجموعے کا نام دیا۔

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

الغرض مخدوم نے اپنی شعری زندگی کا آغاز مزاحیہ "پیلا دوشالہ" سے کیا۔ پھر بھرپور رومان اور آخر میں سیاسی نظمیں۔ جنگ آزادی، سپاہی اسٹالن، انقلاب، باغی، مشرق وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے مقالہ نگاروں نے مخدوم کی فنکارانہ صلاحیتوں کا بڑی تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔ بالخصوص ان کی سیاسی زندگی کے دیرینہ ساتھی اور جگری دوست ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے۔ سکندر علی وجد اوائل عمر ہی سے ساتھ رہے ہیں اور ان کا حافظ اور بہت ساری حکایتیں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ میں نے زیادہ تر ان کی شخصیت اور ظرافت کے نمونے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ ---

("امکان" (بمبئی) سے)

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

غیر اُردو داں طبقہ کو اُردو سکھانے کے مسائل اور اُنکا حل

اُردو جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، ہندوستان بھر میں شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں ہر صوبہ کی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی سبھوں کی پیاری ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو ملاتی ہے۔ اصل میں تو اس زبان نے اس دیس میں ہی جنم لیا اس طرح پر کہ باہر سے آنے والوں کو ہمارے دیس میں رہنے والوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ وہ فارسی بولتے اور یہاں کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔ فوجی لشکر کو بھی تو اپنی ضروریات پوری کرنی تھیں۔ آپس میں بولنا بتانا تھا۔ اس طرح ایک خوبصورت زبان بنی جو لشکر سے نکلی تو زبان زد عام ہوئی۔ اور بڑھتے بڑھتے شاہی دربار اور رئیسوں، امیروں، راجوں، مہاراجوں کے حلقہ میں، عوام میں مقبول ہوئی۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اپنایا۔ شاعرانہ مزاج دیا، نفاست دی، خوش کلامی اسی زبان کا حاصل بنی۔ ایک دور گل و بلبل، عشق و محبت کا رہا۔ پھر صوفیوں اور بزرگانِ دین نے اس کو استعمال کیا۔ آزادی کی تحریک میں ممدومعاون رہی۔ برطانوی سامراج کو اکھاڑ پھینکنے والی تحریک آزادی اسی زبان کی وساطت سے پھیلی۔ بغاوت، پھر انقلاب اور پھر بالآخر مکمل آزادی اسی کی بدولت نصیب ہوئی۔

حضرت امیر خسرو نے سب سے پہلے اُردو میں شاعری کی۔ ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

اور اسی طرح کی شاعری کے ذریعہ فارسی کو اُردو کے سانچے میں ڈھالا۔

اُردو کو سب ہی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہندی کے روپ میں سنیماؤں اور فلموں میں اسی کا چلن ہے۔ اسی کی چاشنی ہے قوالی غزلوں کے پروگرام مقبول عام ہیں۔

اب سوال صرف لپی یعنی رسم الخط اور تحریر کا ہے، کہتے ہیں کہ فارسی رسم الخط مشکل ہے، غور کیجئے تو کیا انگریزی زبان اسی قدر مشکل نہیں ؟

ABC کو دیکھئے۔ کہتے اے ہیں مگر اے سے انگریزی میں آندھرا لکھتے ہیں تو اے کا تلفظ 'آ'

ہوجاتا ہے۔ بی سے بد میے لکھتے ہیں تو بی ، یا بن جاتا ہے۔ آپ میں سے کوئی انگریزی کی اسی طرح مثال دے سکتے ہیں۔ جی ہاں — BUT بٹ ہوتا ہے تو PUT پُٹ ہو جاتا ہے ۔

برنارڈ شا نے ایک مرتبہ GHOTI لکھا۔ اور کہا اس کو فش FISH پڑھئے۔ سب ہی حیران تھے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ انھوں نے سمجھایا ENOUGH کے آخر میں جو GH ہے۔ وہ F کی آواز دیتا ہے۔ WOMEN میں O کو I کی آواز دے کر وی من کہا جاتا ہے۔ اور رہا TI تو آپ ATTENTION میں TION کو SHON نہیں بولتے۔ یعنی کہ TI - SH بھی ہوسکتا ہے۔ تو لیجئے GHOTI = FISH - FISH ہوا نا؟

انگریزی کا بھی O جیسے OVEN میں آتا ہے تو A یعنی آ کی آواز دیتا ہے۔ SCHOOL میں "ا" ہے نہ E لیکن اس کو اسکول پڑھتے ہیں۔ STATION لکھ کر اسٹیشن بولتے ہیں۔ کر اُردو کے حروف تہجی LETTERS OF ALPHABETS اتنے مشکل نہیں کہ جتنے سمجھے جاتے ہیں ۔

الف کے لئے تو سیدھا سادھا کھڑا۔ ا۔ لکھ دیتے ہیں۔ یہ ہر حال میں اور ہر جوڑ کے ساتھ اسی طرح ایستادہ ہوتا ہے یہ انگریزی I جیسا لکھا جاتا ہے۔ ہندی میں अ اتنا سیدھا سادا نہیں۔ انگریزی میں ا یعنی A کی آواز کے لئے O کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ جیسے OVEN میں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ا پر (ــ) اس قسم کا نشان (مد) بنائیں تو اس کی آواز اونچی ہو جاتی ہے۔ آ۔ آنا۔ آج۔ آپ۔ آگئے۔ یہ لیجئے یہ ایک سیدھی سی لکیر ہے ________

اب اس کے پانچ ٹکڑے کرتے ہیں۔ پہلے ٹکڑے کے نیچے ایک نقطہ دیتے ہیں ب تو یہ بے ہوگیا دوسرے ٹکڑے کے نیچے تین نقطے دیتے ہیں پ یہ پے ہو جاتا ہے۔ تیسرے ٹکڑے کے اوپر دو نقطے اس کو ت بنا دیتے ہیں۔ چوتھے ٹکڑے کے اوپر تین نقطے لگا کر ہم ث بنا لیتے ہیں۔ سیدھا سادھا طریقہ ہے۔ اب ایک اور حروف ہے ٹ ، اسی سیدھے خط کو نقطے سے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے ط سے ٹ بنا لیا ، ایک سیدھی لائن کو کاٹ کاٹ کر ہم نے ب پ ت ث ٹ یعنی ۵ حروف آسانی سے بنالئے۔ اب ان کو یاد رکھ لیجئے۔

ان پانچ حروف کے ساتھ کچھ دلچسپ اشعار سنیے ۔

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا   آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

آتی ہے بات بات مجھے بار بار یاد کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

آگے جو حروف تہجی آتے ہیں ان میں بھی ہم شکل ہیں ج چ ح خ یہ سب ح سے بنتے ہیں۔ ایک نکتہ اس کے پیٹ میں دے دیا۔ ج۔ تین دیئے چ۔ بے نقطہ چھوڑ دیا ح رہ گیا۔ اور اسی کے اوپر ایک نکتہ دیا تو خ ـــ صرف یہ یاد رکھئے کہ نقطوں کا سب کھیل ہے۔ اوپر نیچے پیٹ میں سر پر نکتہ دے دیا تو وہی ب پ ت ٹ ث ہو گئے۔ ج چ ح خ ہو گئے۔

ج اور ح : انگریزی میں ج J اور ح H تو ہے۔ چ کے لئے CH جوڑتے ہیں۔ خ کے لئے KH یہی CH کہیں K بھی بن جاتا ہے جیسے CHRIST - CHORUS

جانا جانا جلدی کیا ہے ان باتوں کو جانے دو ٹھہرو ٹھہرو دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش تو آنے دو
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

د ڈ ذ ـــ یہ تین حروف بھی ایک سے ہیں۔ دال بالکل خالی خولی ہے۔ دوسرے پر چھوٹا سا ط۔ لگا دیجئے ڈ ہو گیا اور بجائے ط کے نقطہ لگا دیجئے تو ذ ہو گیا۔

انگریزی میں د ڈ جیسے الگ الگ نہیں اسی D کو SOFT یا HARD بولنا پڑتا ہے۔ URDU کو چاہیئے تو اُرڈو بولئے یا اُردو۔ د اور ڈ والے اشعار سنیئے۔

شکر ہے تم نے مرے درد کی کچھ داد تو دی نہ دوا کی، نہ سہی رخصتِ فریاد تو دی
کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بنک میں تلاش کر دیا مجھے دو چار ٹیکس نے

ر ڑ ز ژ ـــ سادہ سا بے نقطہ 'ر' ہے۔ جیسے رام میں، راستہ میں۔ اس پر ط لگاؤ تو یہ ڑ کی آواز دے گا۔ لڑکی میں ڑ ہے۔ صرف ایک نقطہ دیجئے تو ز جو زخم میں آتا ہے۔ اور اس ر کے اوپر تین نقطے رکھئے تو ژ ۔ ژالہ باری، برف باری ـــ ر اور ز والے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

رقیبوں سے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

س۔ ش ـــ سادہ سا 'س'، سنیما میں، سورج سمجھ میں۔ اس پر تین نقطے دیجئے تو ش، شور شان، شراب، اسی س۔ ش کو سـس۔ شـش بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن آواز یا معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے س کو تین نقطوں سے بآسانی شـش بنا لیا۔ انگریزی میں S اور H کو ملا کر ش بناتے ہیں۔

انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں بن کر
شباب لٹ گیا یادِ شباب باقی ہے ہے بو شراب کی ساغر میں اب شراب نہیں"

ص۔ ض ــــ دو اور حروف تہجی ہیں۔ ان کی آواز ث اور ذ۔ ز۔ س ۔ سے ملتی ضرور ہے لیکن یہ ان سے بہت مختلف ہیں۔

ص لکھئے۔ اس سے صبر، صندوق وغیرہ بنتے ہیں۔ اسی پر ایک نقطہ دے دیجئے تو ض۔ زا اور ظ سے ملتا جلتا۔ جیسے ض سے ضروری۔ ضدی۔

ط ۔ ت جیسا ہے TT - T بہت ہی SOFT ط سے طالب علم

ظ ۔ اوپر ایک نقطہ دے دیا۔ ظ یہ ز ۔ ض ۔ ذ کی بھی آواز دیتا ہے۔ ظالم۔ ظاہر۔ زر۔ ضد۔ ذکر۔

کہئے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بھولا سانجھ آئے
چھوڑ کر سگرے جھگڑے اپنا رب سے دھیان لگاؤ جی

ع ــ جیسے ج چ ح خ لکھا تھا اسی شکل و صورت کی یہ عین ہے ۔ ع سے عباس، عابد، عالم۔ اسی نقطہ دیدیجئے غ بن گیا۔ غبارہ ۔ غالب ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ف ۔ ق ۔ یہ بہت اہم حروف تہجی ہیں۔ فرق نقطوں کا ہے اور کچھ تھوڑا سا پیچ اور خم دینے کا ہے، ف سے فرض ۔ ق سے قرض۔

فانی کا شعر سنئے۔

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ کوئی مزار میں کوئی سر مزار ہے
قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اب تک نقطوں سے حروف اور ان کی آوازیں بدلتی رہیں۔ تمام تر نقطوں کا کمال ہے

ک اور گ میں نقطے نہیں صرف ایک اور دو اوپر کی لکیروں کا فرق ہے۔ اسی کاف سے کبوتر، کتاب کالج لکھتے ہیں۔

ایک اور لکیر اوپر بڑھا کر گا بناتے ہیں۔ گل۔ گاما۔ گلاب۔ گاندھی جی۔

کہتی ہے زراہ کبر وہ گرل کیا تجھ سے طول کہیں کا تو ڈیوک نہ ارل
پانی ہے باغ جہاں میں ہم نے گل کی زندگی رنگ بن کر آئے ہیں تو بو بن کر اڑ جائیں گے

ل اور م ـــ یہ بڑے ہی سیدھے سادے حروف ہیں نہ نقطے ہیں نہ کوئی لکیریں نہ ان سے ملتی جلتی آواز کے کوئی اور حروف تہجی۔ ل سے لندن، لاہور، لالہ جی ۔ م سے مدراس

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس یوں تو دنیا میں سب ہی آئے ہیں مرنے کے لئے

موت سے کس کو رُستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

ن - بھی اسی طرح تن تنہا ہے البتہ اس کے پیٹ میں نقطہ ہو تو منہ بھر کر آواز نکالنی ہوتی ہے۔ جیسے خود نون میں، خون میں، نارنگی میں۔ اور جب یہ آخر میں آتی ہے اور اس میں نقطہ نہیں ہوتا تو بڑی ہمر، خاموش اور دھیمی سی آواز ہوتی ہے بلکہ آواز ہوتی ہی نہیں مگر یہ اپنی جگہ پر ڈٹی رہتی ہے۔ جیسے مجنوں، جنوں، میں نون بے آواز ہے۔ اس بے آواز نون سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

و - اپنے آپ ایک پہرہ دار جیسا ہے۔ واہ واہ، لو، تو۔ آگے پیچھے کہیں بھی کھڑا کر دیجئے۔ یہ ٹوٹتا نہیں اور اپنی شکل پر قائم رہتا ہے۔

ہ - آہ - आह - आहे - आहट - H A - آہ - واہ - اور جب اس کی آواز میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے تو ھ لکھ کر دو چشمی، دو آنکھوں والی ہ کہتے ہیں۔ جیسے چھ، چھپ، چھری۔

ء - یہ بہت ہی دل چسپ ہے۔ تنہا یہ کچھ نہیں اور کہیں بیٹھتا بھی نہیں - ے پر لگے تو آئے۔ گئے، نئے، پرائے۔ اس کی واؤ سے بڑی دوستی ہے۔ آؤ، جاؤ، کھاؤ سے بڑی جمتی ہے۔

حروف تہجی کے آخری ی اور ے ہیں۔ لے لی، دے دی، دی ہوئی، لیے، جوڑے، بڑے، چھوٹے۔

اس طرح سیدھے سیدھے طریقہ پر حروف تہجی لکھتے ہیں تو رسم الخط کچھ بھی تو مشکل نہیں۔ البتہ دقت ہے تو یہی ہے کہ ہماری زبان کی تحریر SHORTHAND کی سی ہے۔ ہم لکھنے کی سہولت کے مدنظر ہر حرف کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ الف ہر حال میں سیدھا سیدھا رہتا ہے۔ اور دیگر حرف اس کے ساتھ اسی حال میں جڑ جاتے ہیں، آنا، لانا، نانا، چاچا۔

ب پ ت ٹ ث کو کسی سے جوڑنا ہو تو اس کو مختصر کر دیتے ہیں۔

ب پ ت ٹ ث - ب ا سے با بنا، ت ا سے تالا بنا لیا، پ سے پیتا۔ ث سے ثابت، ٹ کو چھوٹا کرکے ا کے ساتھ ٹاٹا کرنا آسان ہے۔ حروف تہجی یاد رہیں تو ان کی آواز خود بخود معنی خیز ہو جاتی ہے

اسی طرح ج چ ح خ سب کو کاٹ کر صرف اوپر کا علاماتی مختصر سا حصہ رکھ لیا۔ ج کو الف سے جوڑ کر جا۔ چ کو چا۔ ح کو حا۔ خ کو خا کر لیا۔ آواز اصل ہے چاروں حروف تھوڑی سی کانٹ چھانٹ کر جـ چـ حـ خـ گلے کی مالا کی طرح جڑ گئے

اسی طریقہ پر ص ض کے نچلے جسم کو کاٹ کر ان کے سر باقی رکھ لیجئے اور کسی بھی حرف کی شروعات یا بیچ میں جوڑ دیجئے۔ یاد رکھئے آخر میں آئیں گے تو یہ مضبوط رہیں گے۔ آپ ان کا دھڑ نہیں کاٹیں گے

ص کے ساتھ الف جوڑے تو صاحب کا صا، صابن کا صا، ۔ واؤ کے ساتھ صورت۔ ض کو مختصر کر کے ضامن، ضروری میں جوڑیئے۔

ہم آگے بتائیں گے کہ کچھ حروف پسند نہیں کرتے کہ ان کی کانٹ چھانٹ ہو۔ آپ نے ط دیکھا آگے پیچھے درمیان میں ہر جگہ یہ اپنی وضع پر قائم رہتا ہے۔ چاہے وہ طوطا ہو کہ طالب۔ اس پر نقطہ لگائیے تو بھی یہ اسی طرح ظ کے روپ میں قائم رہتا ہے۔ ظالم۔

ع اور غ کے نچلے دھڑ کو اسی طرح کاٹ دیجئے اور ان کی مُنڈی ء غ مختصر لے لیجئے۔ اور دوسرے حروف کے ساتھ جوڑتے جائیے۔ الف سے جوڑیئے۔ عا جیسے عابد میں۔ غ کے لئے غا جیسے غالب میں، واؤ سے جوڑیئے۔ عورت۔ غ کو واؤ سے لگا یئے غوغا۔

جس طرح ح ج چ خ کی گردن رکھ کر نچلا حصہ کاٹ دیا تھا۔ اسی طرح ع غ کے ساتھ بھی کاٹ کوٹ کردی جاتی ہے۔ س ش ص ض ف ق ک گ ل م وغیرہ بھی کٹتے ہیں۔

ف اور ق بھی کٹ کٹا کر مختصر سے ہو جاتے ہیں۔ ف سے الف جڑ کر فا۔ و سے چپکا سے تو فوری کا فو۔ قا بھی اسی طرح الف سے قابل کا قا۔ و سے قدرت۔

خدا کی قسم اس نے کھائی جو آج　　　قسم ہے خدا کی مزا آگیا

ک اور گ بھی بالکل اسی طرح الف سے لگائے تو کاغذ کا کا۔ گا۔ گانا۔ ل سے گلاب

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن　　　کیا کریں گر انتظار نہ کریں

ہے خبر گرم ان کے آنے کی　　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ل بھی الف سے جڑے گا تو مختصر سا لہ رہے گا۔ لال۔ لندن۔ لانبا۔ لانگ۔ ل سے لطیفہ یعنی چٹکلہ، مزہ دار بات۔ لیکن بہت ہی مختصر رامن نے اپنی سمجھ کے مطابق بہت ہی دلچسپ حکایت بیان کی اور جب دیکھا کہ کوئی ہنستا نہیں ہے تو کہا ۔ ابھی میں اس میں نمک مرچ لگا کر چٹخارہ دار بناؤں گا۔ کسی نے کہا ہاں ہاں ضرور نمک مرچ لگا کر اس لطیفہ کا اچار ڈالئے۔

م بھی چھوٹا سا رہ جاتا ہے جب اس کو کسی اور سے جوڑنا ہوتا ہے۔ اس کا نچلا جسم چھوٹ جاتا ہے۔ مالک، مادر، ماما، لیکن آخر میں ل اور م آتے ہیں تو اپنا پورا جسم اور دوسرے تمام حروف کی طرح قائم رکھتے ہیں۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　　اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

ن بھی کٹ کر چھوٹا ہو جاتا ہے نانا۔ نانی۔ ن کی آواز کے لئے الف کو آخر میں لکھ کر اس طرح کی علامت جوڑنے پر ٹیچ پر فون کی آواز نکلتی ہے۔ جیسے فوراً۔ آناً۔ فاناً۔

و، ہر حال میں ہر جگہ اپنی وضع قطع برقرار رکھتا ہے چاہے وہ شروعات میں آئے کہ درمیان یا آخر میں۔ واہ واہ۔ کہاوت۔ ولی۔ بولی۔

ہ — دو قسم کی ہے۔ آہ واہ میں تو قائم رہتی ہے۔ لیکن شروع میں آئے تو کٹ جاتی ہے۔ ہالا ہانڈی۔ ہاتھ میں اس کا روپ تھوڑا سا بدل جاتا ہے۔ ایک اور طرح سے اس کو دوچشمی جب لکھتے ہیں۔ تب بھی یہ کہیں ھ بدلتی نہیں۔ پچھ۔ مونچھ۔ پکھو۔

ی اور ے — ان کو توڑ تاڑ کر چھوٹے بناتے ہیں تو یہ ب ت وغیرہ کی طرح یہ ایسے ہو جاتے ہیں اور ان کے نیچے دو نکتے لگتے ہیں۔ اُردو تحریر تمام کی تمام نقطے پر ٹکی ہوتی ہے۔

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

زیر۔ زبر۔ پیش۔ تشدید — کسی حرف کے نیچے زیر لگائیے جیسے عِلم زیر سے جڑ گئے اور عِلم بن گیا۔ اسی علم کے ع پر زبر لگائیے تو عَلم ہو گیا۔ پیش چھوٹی سی واؤ ہے۔ غلام کی غ پر یہ لگائی جاتی ہے تو غُو کی آواز نکلتی ہے۔

کسی حرف پر زور دینا ہو تو اس کو دوبارہ نہیں لکھتے۔ بلکہ تشدید ّ چڑھا دیتے ہیں۔ غلّہ کے ل پر تشدید کے بعد غلّہ بن جاتا ہے۔ ورنہ یہ غلہ بھی ہو سکتا تھا غلہ بھی۔ ہندی میں حرف کو دوبارہ لکھا جاتا ہے جیسے कत्ता

ا کے زیر سے اِنسان۔ ا کے زبر سے اَنیس۔ ا کے پیش سے اُنس اور ا کے بعد نون پر تشدید سے اُنّیس۔

ہم نے بتایا تھا کہ اُردو SHORT HAND والی تحریر ہے۔ اور ہر حرف ٹوٹ جاتا ہے۔ سوائے د ڈ ذ ر ڑ ز ژ۔ ط ظ۔ و۔ ا۔ ء۔ چاہے وہ شروعات میں ہو، درمیان میں ہو، لیکن ایک حرف کسی لفظ کے آخر میں آتا ہے تو وہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ سالم کا سالم رہتا ہے۔ جیسے لال، آم جام۔ کام۔ کان۔ کاف۔ آنچ۔ سیخ۔

اُردو میں مذکر اور مونث بھی آسان ہے۔ لڑکا کے الف کو نکال کر ی لگائیے تو لڑکی۔ چچا سے چچی۔ بچہ بچی۔ ملتی جلتی آواز والے حروف نئے سیکھنے والوں کو ضرور پریشان کرتے ہیں کہ ان میں سے کس کو کہاں لگایا جائے صوتیاتی لحاظ سے وہ ایک سے ہیں۔ لیکن ان کا مخرج یا وہ مقام کہ جہاں سے بن کر آتے ہیں جدا ہوتے ہیں، اس لئے ان میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس نوبت پر آپ اس فرق کو بالکل بھلا دیا لیجئے۔ اور جہاں آپ کو جو سمجھ میں آئے وہ استعمال کر لیجئے۔ ت۔ ط۔ ث س ص۔ ح ہ — ذ ز ظ — خ ق — اس قسم کی باتیں انگریزی میں بھی ہیں جیسے W اور

۷ یا OX ۷e x کا x K = CH — F اور CH TION = میں SH ۔

اُردو کے ۳۶ حروف تہجی کو ہم نے مشابہت رکھنے والے ۱۵ حروف میں جوڑ لیا۔ اب آپ کو پورے پورے ۳۶ حروف کو ABCD وغیرہ کی طرح یاد رکھنے کی مشق کی ضرورت نہیں۔ نقطوں کی مدد سے ہم نے اُردو کے حروف تہجی کو باقاعدہ طور پر خانوں میں بند کرلیا۔

ان سبقوں کی مدد سے کچھ ہی گھنٹوں میں اُردو لکھنا پڑھنا بآسانی آ جائے گا۔ اور اب تک جس زبان کو آپ صرف سمجھتے اور بولتے تھے لکھ پڑھ سکیں گے۔ — —

(سہ ماہی 'اِمکان' سے)

قطعات تاریخ وفات جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور صاحب

آئی اے ایس (ریٹائرڈ) معتمد مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈمی

۰۰۰ ۰۰۰ ۰۰۰

اجل سے تھے مجبور عبد الغفور ہیں آنکھوں سے مستور عبد الغفور
ملا سال رحلت کا، صاحب لکھو ارم میں گئے دور عبد الغفور

۱۹۸۴ء

دیگر

اُٹھ گئے اِس جہانِ فانی سے
ہو گئے داخل اس کی رحمت میں
سال رحلت کا اب ؔ ملا صاحب
کہہ دو عبد الغفور جنت میں

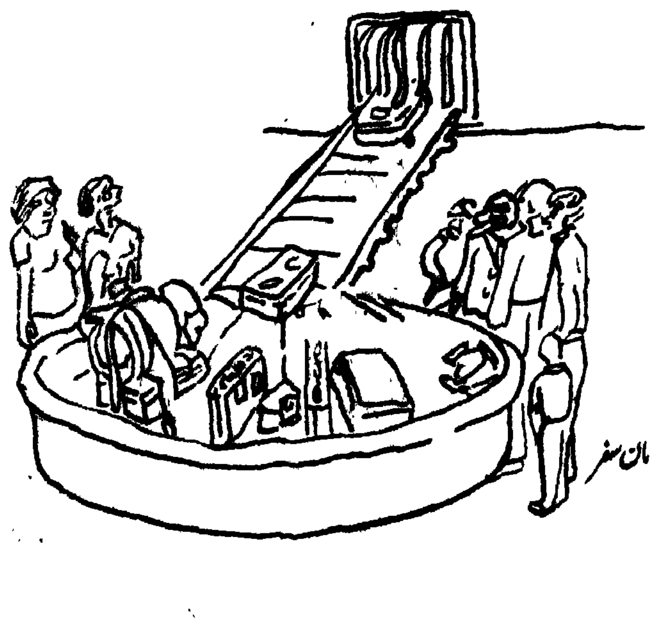
تدخلہ ۳ عدد ۱۹۸۴ء

از :- جناب سید مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی



ارے واہ، یہ فلم تو ہم انڈیا میں دیکھ چکے ہیں۔

'امریکہ میں ہندوستانی' کے موضوع پر خواجہ عبدالغفور کے دو کارٹون



ہندوستانی ایرپورٹ ـــــ بے شکا سامان سفر

تبصرہ نگار:

○ محبوب راہی

○ محمد منظور احمد

بال کی کھال

(تبصرے)

دراصل

(طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مصنف: شکیل اعجاز

رابطہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. جامعہ نگر. نئی دہلی

: پھلاری گلی. مومن پورہ. اکولہ ۴۴۴۰۰۱

قیمت: مجلد ۱۲ روپے غیر مجلد ۸ روپے۔

شکیل اعجاز آج ایک مشہور و معروف فنکار کا نام ہے۔ یہ قابلِ رشک شہرت اس کی مختلف الجہات منفرد فنی صلاحیتوں کی دین ہے۔ مختلف علمی و ادبی کتابوں کے معنی خیز ٹائٹل، صفِ اول کے ہمعصر شعراء و ادباء کے علاوہ متقدمین کی نایاب تصاویر اور خاکے نیز فلمی اور سیاسی شخصیتوں کی تصاویر بنا کر یہ نوجوان اور ہونہار فنکار علمی و ادبی فلمی اور سیاسی میدانوں میں انتہائی قلیل مدت میں شہرت و ناموری حاصل کر چکا ہے۔ لیکن اس کی صلاحیتوں کے بیکنار و بیکراں اور موج سمندر نے صرف مصوری کے کوزے میں بند رہنے پر اکتفا کرنے کی بجائے فکر و فن کے نئے نئے میدانوں کی جستجو میں پھیلاؤ اختیار کیا اور شکیل اعجاز نے برش کے ساتھ قلم کی جولانیوں کے مظاہرے بھی شروع کر دیئے۔ پچھلے دو تین برسوں میں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے ان کے انشائیوں میں ارباب نقد و نظر نے شکیل اعجاز کو مستقبل کے ایک صاحب طرز انشائیہ نگار کے روپ میں دیکھ کر بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ "دراصل" ان توقعات کی بلندیوں تک پہنچنے کا پہلا پائیدار زینہ ہے۔

دراصل شکیل اعجاز کے منتخب انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے یہ انشائیے خوش رنگ اور معنی خیز سرورق میں لپٹے ڈیمائی سائز کے ۱۰۶ صفحات پر محیط ہیں جن کے ہلکے پھلکے اور سادہ عنوانات سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے مواد میں ایسی پہلو داری اور اس قدر رمزیہ معنویت ہوگی کہ پرتیں اٹھاتے جایئے اور مفاہیم کے نئے نئے جہانوں کی سیر کیجئے۔ یہ عنوانات اس طرح ہیں۔ لیٹر پیڈ، مرغ کھانا منع ہے، عیادت اس کو کہتے ہیں۔ چند کہیں کا۔ ریڈیو ادبی رسائل اور ریوم ہوسٹنگ. تمام مضامین نہ صرف عنوان کے اعتبار سے بلکہ ذائقے سے بھی جدا جدا ہیں۔

امادہ یا تکرار نہیں ہے۔ ان مضامین میں رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم وغیرہ کے رنگوں کی جھلکیاں تلاش کرنا بھی بے سُود ہے۔ انشائیوں میں اس نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا ہے۔ زبان وبیان میں شگفتگی و تازگی کے ساتھ ساتھ بات میں بات پیدا کرنے کا ہُنر بھی شکیل اعجاز کو خوب آتا ہے۔ لیٹر پیڈ، عیادت اس کو کہتے ہیں، ریڈیو اور ادبی رسائل میں کہانی در کہانی کا لطف طلسم ہوشربا کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ان مضامین میں ہمارے گرد و پیش کے روزمرّہ مسائل پر بڑی دلچسپ چوٹیں کی گئی ہیں۔ لیکن ان کے طنز کا ہدف زیادہ تر شاعر، ادیب اور مدیران رسائل ہیں۔

شکیل اعجاز نے جا بجا اپنے عزیز ترین دوستوں، حتیٰ کہ اپنی ذات پر بھی طنز کر کے خود کو ایک دیانتدار طنز نگار ثابت کیا ہے۔ اس کا طنز بے حد لطیف ہوتا ہے ایسا کہ قاری کے حلق سے بے ہنگم قہقہہ چھوٹنے کی بجائے صرف ایک تبسّم زیرِ لب آ کر رہ جاتا ہے۔ اس کا مزاح ذہن کے سمندر میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا نہیں کرتا سطحِ آب پر ایک خفیف سا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا طنز پُرشور جھرنا نہیں ایک پُرسکون اور شفاف جھیل ہے۔ سب سے اہم یہ کہ اس کا ہدف جھلاہٹ میں ردّعمل پر آمادہ ہونے کی بجائے خود اپنے آپ پر ہنسنے میں اہلِ محفل کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ متذکرہ بالا اعتنا کے ثبوت میں "دراصل" سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"تاریخ نویسوں نے قدیم شہنشاہوں کے بارے میں یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ انھیں عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ دراصل انہیں لیٹر پیڈ بنوانے کا شوق تھا۔ تاج محل۔ کو بھلے آپ مقبرہ کہیں ہم تو لیٹر پیڈ کہیں گے۔ دیکھئے کیسا خوبصورت، خوب رنگت اور خوب قیمت لیٹر پیڈ ہے۔ (لیٹر پیڈ)

منہ پھیر کر لیٹا تو ایک اسکرٹ نظر آیا اس میں ایک نرس تھی جو ہاتھ میں گلاس لئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

(عیادت اسی کو کہتے ہیں)

بچے اپنی شرارتوں کے جھلتے کبوتروں کو کچھ خوف اور کچھ احترام کے صندوقوں میں بند کر کے چھوٹے چھوٹے پیروں سے گلی کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں۔" (ریڈیو)

"پورے ملک میں ادبی رسائل کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی سیاست میں شریف لوگوں کی۔ یہ رسائل کئی دفعہ آخری سانسیں لیتے ہیں۔ (ادبی رسائل)

شکیل اعجاز کے مضامین کا یہ پہلا مجموعہ ہے اور وہ خود اس وقت ملک کا سب سے کم عمر طنز و مزاح نگار ہے اس کے باوجود اس کی یہ خود اعتمادی قابلِ تعریف ہے کہ اس کتاب میں کسی بھی نامور ادیب یا نقاد کا مقدمہ۔ یا فلیپ کی رائے شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری۔ شمس الرحمٰن فاروقی، فکر تونسوی، یوسف ناظم اور ڈاکٹر مظفر حنفی وغیرہ نے اس کتاب پر پسندیدگی کے خطوط لکھے اور ان میں سے بعض حضرات نے شکیل اعجاز کے طرزِ تحریر کو بہت سراہا ہے۔ میں اپنے اس تبصرہ کا اختتام پاکستان کے معتبر نقاد الار سدید کے ان جملوں پہ کرتا ہوں ــ

سال نو کے دوران مجھے ہندوستان سے جتنے تحفے ملے یہ کتاب ان سب میں زیادہ قہقہہ افروز ہے۔ شکیل اعجاز کے مزاح کی لطافت تہذیبی حدود کے درمیان رہتی ہے

اور طنز جراحت کے بجائے شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ وہ لفظ کو فطری انداز میں مس کرتے ہیں لیکن اسی لمس سے لفظ کے بطون میں گدگدی سی محسوس ہونے لگتی ہے اور قاری بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ میں نے یہ کتاب ایک ہی نشست میں پڑھی ہے اور ختم کر چکا تو افسوس ہوا کہ اتنی جلدی کیوں ختم ہو گئی۔" — محبوب راھی

شاہنامۂ ہند، جلد اوّل

علامہ سریر کابری گیاوی مینائی مرحوم

پہلا ایڈیشن ۵۵ – ۱۹۵۴ء، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء صفحات ۲۰۸ – سائز ۲۶×۱۷ (فل اسکیپ)

ناشر :- سید محمد داؤد اختر کابری، فرزند سریر کابری، سریر منزل – محلہ کریم گنج – گیا – بہار

قیمت مجلد (۲۵) روپے – قیمت غیر مجلد (۲۰) روپے

ملنے کا پتہ :- ظفر بک ڈپو – جی – بی – روڈ – گیا – بہار

شاہنامۂ ہند جلد اول کا زیر تبصرہ دوسرا ایڈیشن جناب مشتاق علی خاں رئیس بھدیہ دگیا سابق اسٹیٹ منسٹر بہار کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں علامہ سریر کابری کی تصویر بھی دی گئی ہے جس کے نیچے سریر مرحوم کا یہ شعر درج ہے ؎

مری تصویر کو کیا دیکھتے ہو مرا ہر شعر ہے تصویر میری

علامہ سریر نے اسے اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں والیٔ ریاست حیدرآباد دکن کے نام معنون کیا ہے۔

سریر اپنے عہد کے ممتاز اور مقبول شاعر تھے۔ وہ بہار اسٹیٹ کے پہلے شاعر ہیں جنھیں مرکزی سرکار نے ۱۹۵۷ء میں (۱۰۰) روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا —— سریر کا ۲۰ر مارچ ۱۹۶۳ء کو انتقال ہوا۔ اُن کے فرزند سید محمد داؤد اختر کابری نے شاہنامۂ ہند جلد اول کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ سریر کی مرتب کی ہوئی ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے جو دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ بقول نیاز فتحپوری "سریر مرحوم نے تاریخ کے خشک واقعات کو خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے" سریر حکیم سید عابد علی کوثر خیرآبادی کے تلامذہ میں شامل ہیں جو امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ کوثر خیرآبادی کی رحلت کے بعد وہ امیر مینائی کے جانشین جلیل مانک پوری کے شاگرد ہوئے اور ان سے بیس برس تک اپنے کلام پر اصلاح لی۔ سریر کے کلام میں امیر مینائی جلیل مانک پوری اور کوثر خیرآبادی کی خصوصیاتِ کلام کی جھلکیاں ہیں۔ لالہ سری رام نے اپنے ضخیم تذکرہ "خم خانہ جاوید" میں سریر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ فارسی میں شاہنامہ فردوسی اور اردو میں حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام سریر کابری کے لئے ہندوستان کی منظوم تاریخ لکھنے کا محرک ہوئے انکا پیش کیا ہوا یہ تاریخی مرقع ایک عمدہ نمونہ ہے —— زیر نظر جلد میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ دوسری جلد میں قطب الدین ایبک سے لیکر جلال الدین اکبر تک کے تاریخی واقعات بیان کئے جائینگے۔

محمد منظور احمد

خُرافات

پیارے مصطفیٰ کمال!

غفور صاحب کا انتقال واقعی کربناک ہے۔

ان کے انتقال سے ایک مہینہ پہلے میں نے اُن کی ذات اور ادب پر ایک بھرپور مضمون قلم بند کرکے اُنھیں بھجوا دیا تھا۔ جس کے لئے شکریہ اور داد کا ایک خط بھی میرے پاس موجود ہے۔ میرا خیال تھا اُنہوں نے شگوفہ کے لئے بھیج دیا ہوگا۔ لیکن اب لگتا ہے یا اُن کے گھر پہ ہے یا اُمکان کے حوالے کر دیا ہوگا۔

اب آپ کے پرچہ کے لئے کوئی چیز لکھوں تو ڈرتا ہوں۔ ٹکرا نہ جائے بہر کیف آپ کا حکم ہے۔ تو چند دنوں میں دو اڑھائی صفحات کا ایک جذباتی مضمون بھجواؤں گا۔ فکر تونسوی۔ نئی دہلی۔

سیادت مآب برادر محترم و مکرم زاد لطفہ۔ سلام و شوق

شگوفہ کا شمارہ بابت جنوری ۸۴ء موصول ہوا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ یہ شمارہ مجموعی طور پر بہت دلچسپ اور مفید ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کا تبصرہ خاصے کی چیز ہے۔ ان کے ایسے ہی تبصرے برابر چھپتے رہیں۔ بڑا منفرد انداز ہے۔ ہندوستانی مزاح نمبر کا ابھی سے منتظر ہوں۔ خدا آپکو آپکے عزائم میں استحکام اور کامیابی عطا فرمائے۔ یہ بڑا اہم کام ہوگا۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ۔ (آرہ)

جناب مصطفیٰ صاحب۔ سلام و خلوص!

تازہ شمارہ پڑھ رہا ہوں غنیمت و نعمت ہے اس دور میں آپ کا ماہنامہ شگوفہ کہ اس دور گراں میں صحت بخش ٹانک ہے۔ کتنے میرے جیسے دل جلے اس سے سکون بخش ہوتے ہوں گے خدا اسے نظر بد سے بچائے۔

مُدیر شگوفہ کے نام ——

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کا آخری خط

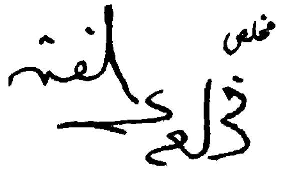
مئی ڈیر مصطفیٰ کمال

تسلیمات۔

ابھی ابھی پٹنہ کے جشن ظرافت سے لوٹا ہوں بڑے پُرلطف سیشن دسمی نار رہے۔

میں انشاء اللہ ۱۷ ار کو حیدرآباد پہونچ رہا ہوں ملاقات رہیگی۔

مخلص



حضرت خواجہ عبدالغفور کی موت مزاحیہ ادب کے لئے عظیم نقصان ہے پہلی اور آخری بار موصوف کو پٹنہ کے جشن ظرافت ۸۴ء میں دیکھا انکی شخصیت و سراپا نظروں میں رقصاں ہے خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت دے اور پسماندگان کو صبر جمیل بخشے آمین۔ آپ نئے لکھنے والوں کو موقع دیتے ہیں خوب ہے۔ اللہ آپکے سایہ شگوفہ پہ تاقائم دائم رکھے آمین۔ صابر بہاری (رانچی)

محترمی سید مصطفیٰ کمال بسلام و مسنون!

ادھر کچھ ضروری کام سے پٹنہ جانیکا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے شگوفہ تلاش کیا میری خوش نصیبی کہ ایک شمارہ ماہ جنوری کا ہاتھ لگا رسالہ کی طباعت و کتابت میں کافی حد تک سدھار ہوا ہے۔ حضرت رضا نقوی واہی کی نظم "اردو کی لسیندی" نے رسالہ کی زینت بنکر رسالہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں

کریک بتیادی۔

اداریہ

خواجہ عبدالغفور صاحب کے انتقال پر مختلف ادبی اور تہذیبی انجمنوں کی جانب سے حیدرآباد میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں جناب محمود انصاری مدیر روزنامہ منصف نے تجویز رکھی تھی کہ 'شگوفہ' کا خواجہ عبدالغفور نمبر شائع ہونا چاہیئے۔ اس خواہش کے احترام میں اسی جلسہ میں اعلان کر دیا گیا کہ جون کا شمارہ مرحوم خواجہ عبدالغفور کے لئے وقف ہوگا۔ ان دنوں ہندوستانی مزاح نمبر کا کام تیزی سے چل رہا تھا لیکن مناسب یہ معلوم ہوا کہ ہندوستانی مزاح نمبر سے پہلے غفور نمبر شائع کر دیا جائے۔ کیوں کہ زندہ دلان حیدرآباد کی ساری توجہات نومبر ۱۹۸۴ء میں منعقد ہونے والے عالمی جشن مزاح کی طرف مرکوز ہو جائیں گی جس کے نتیجہ میں غفور نمبر کی اشاعت میں تاخیر ہو سکتی تھی۔ البتہ ہندوستانی مزاح نمبر کے کام کو موضوع کی یکسانیت کے باعث اس جشن کے ساتھ جوڑ دیا جاسکتا ہے۔

زیرِ نظر خصوصی شمارہ ڈیڑھ ماہ کی مختصر مدت میں تکمیل پایا ہے بمبئی اور حیدرآباد کے فسادات کی وجہ سے اس خصوصی نمبر کی اشاعت میں بڑی موانعات حائل رہیں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ہم نے حسب اعلان بروقت یہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس کے لئے ہم خاص طور سے ہمارے قلمی معاونین کے ممنون ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر فوری مضامین لکھے اور ہمیں ارسال کئے۔ ان مضامین کے ذریعہ خواجہ صاحب کی شخصیت اور فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اس خصوصی نمبر میں غفور صاحب کی زندگی میں لکھے گئے جناب نریندر لوتھر اور جناب مجتبیٰ حسین کے دو مضامین بھی ان کی انفرادیت کے باعث شاملِ اشاعت کر لیے گئے ہیں۔ آخر میں غفور صاحب کی تحریروں کا انتخاب شریک کیا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ 'شگوفہ' کی مجلس مشاورت کے سابق رکن محترم خواجہ عبدالغفور صاحب مرحوم کی یاد میں پیش کردہ اس حقیر نذرانۂ عقیدت کو ادبی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

★ زندہ دلان حیدرآباد کے زیرِ اہتمام بہت بڑے پیمانہ پر ۱۶، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹، نومبر ۱۹۸۴ء کو عالمی جشن مزاح منانے کے سلسلے میں ابتدائی تیاریوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ امکان ہے کہ لندن سے نامور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ پاکستان اور دنیا کے مختلف ممالک کے ممتاز طنز و مزاح نگار بھی اس جشن میں شرکت کریں گے اس ضمن میں تشکیل دی گئی کمیٹی کے صدر جناب گجپتی راجو وزیر تعلیم حکومت آندھرا پردیش اور کارگزار صدر جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس ہیں۔ چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر این ٹی راما راؤ اس کے سرپرست ہیں۔

(یونانی دوا)

زندہ طلسمات

کامیاب اور
بے ضرر علاج!
جس سے ضمنی
اور مضر اثرات
بالکل نہیں ہوتے

اطمینان کر لیجئے کہ
ٹین کی مہر بند ہے



زندہ طلسمات سر درد، کھانسی، زکام سے فوراً
آرام دیتا ہے ___ اور کئی امراض مثلاً پیچش، ہیضہ
فلو، نزلہ کے لئے ___ کامیاب علاج!

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات
حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳



شگوفہ

27/7/84

JULY 1984 Rs. 3.0

کے اسپیشٹ

ؤری

زملے

۷. پیری سوئنٹس اینڈ ٹافیس
۸. ڈرنک جھوٹان فوڈ بیا ڈکنس
۹. چمپئن دہائٹ روشس

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۷

جولائی ۱۹۸۴ء

شمارہ ۷

ایڈیٹر : سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت :

راجندر سنگھ بیدی

بھارت چند کھنہ

نریندر لوتھر

مجتبیٰ حسین

قیمت ۳ روپے

زرِ سالانہ : ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے : ۱۰۰ روپے

کتابت : محمد عبدالرؤف

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

ناکردہ گناہوں کی سزا

"ناکردہ گناہوں کی سزا" کسی علامتی افسانے یا جدید نظم کا عنوان نہیں ہے۔ یہ حقیقتاً اس سزا کا نام ہے جو ہم حیدرآبادی شہری کرفیو کے دوران بغیر گناہ کئے بھگتتے ہیں۔ ہمارے شہر میں وقتاً فوقتاً کرفیو نافذ کیا جاتا ہے بلکہ ہر وقت کرفیو نافذ ہونے کا اندیشہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے۔ رات آزاد سو کر صبح کرفیو میں اٹھتے ہیں۔ کبھی دفتر پہنچنے پر پتہ چلتا ہے کہ شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا ہے۔ بگڑے ہوئے حالات کو قابو میں لے آنے یا سدھرے ہوئے حالات کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے شہر کے حکام کے پاس کرفیو ہی واحد علاج اور شہریوں کے ناکردہ گناہوں کی سزا ہے۔

کرفیو، اردو شاعری میں رباعی کی طرح ہے۔ رباعی میں سمندر کو کوزے میں سمٹ دیا جاتا ہے ایسے ہی کرفیو کے دوران سمندر جیسی شہری زندگی کی خانہ بندی کی جاتی ہے۔ کرفیو کے دوران ہماری ملاقات پڑوسیوں سے ہوتی ہے حیدرآباد میں کرفیو کے نفاذ سے قبل پڑوسیوں کو ہم جانتے بھی نہ تھے۔ ہمارے خیال میں کرفیو ہی وہ وقت ہوتا ہے جب گھر کے تمام افراد یکجا ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہماری لڑکی کو "کرفیو کی چھٹیاں" بہت پسند آتی ہیں۔ کہتی ہے کرفیو میں ہمارا اسکول نہیں ہوتا، بھیا کا کالج بند رہتا ہے اور ممی، ڈیڈی کو دفتر بھی نہیں جانا پڑتا۔

کرفیو ایک سزا ہی تو ہے۔ کام کاج اور روٹی روزی پیدا کرنا چھوڑ کر چار دیواری میں قید ہو جانا پڑتا ہے۔ یہ سزا مختلف مدت کے لئے دی جاتی ہے ہمارے شہر میں زیادہ سے کئی کئی دن مسلسل کرفیو نافذ رہتا ہے۔ گھر میں موجود راشن اور ایندھن ختم ہو جاتا ہے فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔ بچے دودھ کے لئے بلکنے لگتے ہیں۔ مریضوں کے لئے ڈاکٹر اور دوائی نہیں ملتی۔ اس پر بالائے ستم نلوں سے پانی نہیں آتا۔ روشنی غائب رہتی ہے۔ گھر کی حالت نار سے بیزار ہو کر باہر نکلنا چاہیں تو پولیس کی گالی، لاٹھی اور گولی استقبال کے لئے موجود رہتی ہیں۔ ایک صاحب دوران کرفیو پولیس سے الجھ پڑے "صاحب چاول ختم ہو گئے ہیں" جواب ملا "کرفیو ہے" چار دن سے کام پر نہیں گیا فاقہ ہو رہا ہے" جواب میں پھر "کرفیو ہے" کہا گیا۔ "صاحب محلے پر میوہ پڑا خراب ہو رہا ہے" گالی دے کر سمجھایا گیا "کرفیو ہے" صاحب موصوف نے زچ ہو کر کہا "عجیب کرفیو ہے۔ شہر کی حالت بہتر تو شہریوں کی حالت

ابتر ہو رہی ہے "۔ اس بار کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس والوں سے کچھ ہوتا نہ دیکھ طول
تک نافذ رہنے والے کرفیو کے مصائب وآلام سے نجات حاصل کرنے کے لئے حیدرآبادی شہری جب مالکِ حقیقی سے دُعا مانگتا
ہے تب بھی کرفیو ہمارے اور مالکِ حقیقی کے بیچ دیوار بنا رہتا ہے کم از کم اجتماعی دُعا کا تو تصور ہی اُٹھ چکا ہے۔

شہر کے کسی بھی حصہ میں ڈاکہ پڑنے پر تمام چوروں کو جمع کر کے پوچھ تاچھ کی جاتی ہے اس کے بعد اصل چور کی تلاش شروع
ہے ! ایسے ہی شہر حیدرآباد میں کہیں بھی گڑبڑ ہو پرانے شہر کے علاقہ میں کرفیو ضرور نافذ کیا جاتا ہے۔ پرانے شہر اور کرفیو میں چ
دامن کے رشتے کے پیش نظر ہمارے ایک دوست کی تجویز ہے کہ اس علاقہ کا نام "کرفیو نگر" رکھا جائے "حساس علاقہ" تو پہلے
سے کہلایا جاتا ہے اسی لئے ہو سکتا ہے کہ تبدیلیٔ نام کی ایسی کوئی تجویز ارباب اقتدار کے زیر غور بھی ہو۔

پچھلے چند سالوں سے ہمارے شہر میں کرفیو اتنی مرتبہ نافذ ہوا کہ اب ہم کرفیو کے عادی ہو چکے ہیں۔ کرفیو کے دوران پریشا
ہونے کے بجائے گلی اور کوچوں کے لوگ مل جل کر سیاست پر بحث ومباحثہ، حالات حاضرہ پر تبصرے، کھیل تماشے اور دعو
کرتے ہیں۔ ہمارے محلہ میں کرفیو تقریبات میں پولس والے بھی شامل رہتے ہیں۔ صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی شہر کے اخبارات کے اطراف سیا
کیلئے محفل جمتی ہے۔ کوئی منہ میں برش لئے تو کوئی کولے سے منہ کالا کئے محفل میں آتا ہے۔ کسی دروازے سے کوئی لنگی سنبھالے تو کوئی نائٹ گون پہنے محف
نادر ہوتا ہے۔ محفل میں تبصرے ہوتے ہیں۔ آئندہ کیلئے پیش قیاسیاں ہوتی ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار، پریس بلیٹن اور سیاسی قائدین کے بیانات پر کو
بھی یقین نہیں کرتا۔ ہر ایک کا اپنا ایک خیال ہوتا ہے جو افواہوں کا باعث بنتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ناشتہ کے لئے محفل برخواست ہ
ہے ناشتہ کے بعد حسب مذاق چھوٹی چھوٹی انڈور محفلیں جمتی ہیں۔ کہیں تاش تو کہیں کیرم کھیلا جا رہا ہے۔ ایک طرف شطرنج تو دو
طرف چکیسی بھی ہے۔ کہیں فلمی گانے تو کہیں غزلیں گائی رہی ہیں۔ کہیں سائنس تو کہیں فکشن پر بات چیت ہو رہی ہے۔ دوپہر
انڈور محفل برخواست کی جاتی ہے۔ لوگ کھانا کھانے اور قیلولہ کے لئے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ سہ پہر آؤٹ ڈور اجتماع ہو
ہے۔ کبڈی، کرکٹ، فٹ بال جیسے کھیل کھیلے جاتے ہیں جس میں پانچ سے لے کر پچپن سال تک کے حضرات حصہ لیتے ہیں۔ رات میں
لوگ مل کر پاٹ لک کھانے کی محفل سجاتے ہیں۔ حفاظتی انتظامات کو قطعیت دی جاتی ہے۔ رات دیر گئے اکثر لوگ سونے
جاتے ہیں تو چند نوجوان محلہ کی رکھوالی کرنے لگتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام محفلوں میں ہندو مسلم پڑوسی سب
حصہ لیتے ہیں جبکہ کرفیو ہندو مسلم فساد کی وجہ سے نافذ کیا جاتا ہے۔

دورانِ کرفیو شہر کے مقامی اخباروں کی اہمیت اور قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اخبار "گرم کیک" کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک
ہے۔ وہ حضرات جو عام دنوں میں اخبار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، دورانِ کرفیو اخبار کو مقدس کتاب کی طرح سطر
سطراً پڑھتے نظر آتے ہیں۔ ہر اخبار واقعات، بیانات اور اپیلوں سے بھرا پڑا ہوتا ہے۔ چہار دیواری میں مقید لوگ اخبار
خبروں پر تبصرے کرتے ہیں۔ انھیں اصلیت چھپانے کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ ریڈیو کے تعلق سے بات دوسری ہوتی ہے
ریڈیو اسٹیشنوں کی وقعت نہیں رہتی۔ جیسے دیکھئے صبح میں "وائس آف امریکہ" اور شام میں "بی بی سی" سے خبریں اور تبصرے سن
یہاں سے نشر ہونے والی خبروں کی صداقت مسلمہ سمجھی جاتی ہے تبصرے حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید ہی ایک

ہوتا ہے جب ہمارے شہر کا نام ان اسٹیشنوں سے نشر ہوتا ہے۔ سچ ہے دوسروں کی تخریب سے ہر کسی کو دلچسپی ہوتی ہے۔

عام حالات ہی میں پولیس کا رویہ ناقابل فہم ہوتا ہے۔ کرفیو کے دوران پولیس کے رویہ سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ یوں سمجھئے کرفیو میں بھوکے سانپ نکلتے ہیں۔ شہریوں سے کچھ بھی سن سن کرنا نہیں چاہتے بس لاٹھی گھمانا جانتے ہیں۔ ایک بار ایک شخص کرفیو کے دوران سڑک پر نکل آیا۔ پولیس والے لاٹھیاں برسانے لگے وہ چیخا "صاحب کچھ میری بھی سنیئے" کوئی بھی پولیس والا اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہوا مسلسل لاٹھیاں گھماتے ہوئے "بھاگ! جا بھاگ! تیری . . . بھاگ! ہانکتے رہے۔ مار کھا کر نڈھال شخص روتے ہوئے کہنے لگا "رحم کیجئے صاحب! میری ماں مرگئی ہے۔ رحم صاحب رحم! پولیس والوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ جمعیت کے انچارج نے ڈانٹ کر پوچھا "بہت افسوس ہوا۔ لیکن کرفیو میں تیری ماں کیسے مری؟ مظلوم شخص نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "میری ماں ضعیف تھی۔ قدرتی موت مری ہے" یہ سن کر اسے واپس جانے کے لئے کہا گیا "یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ کرفیو میں بلوائیوں یا پولیس والوں کے ہاتھ موت واقع ہوتی ہے۔ جا بھاگ!

پولیس کے ہاتھوں مرنے اور پٹنے کے علاوہ گرفتاری کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے۔ معصوم شہریوں کو گرفتار کرنا پولیس والوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ پہلے گالی گلوج کی جاتی ہے مارا اور پیٹا جاتا ہے پھر بھی تشفی نہ ہونے پر گرفتار کیا جاتا ہے۔ اکثر گرفتاریوں میں ناک بچانے (بچاؤ یوجنا مہم کے تحت) کے لئے پرچہ چاک نہیں کیا جاتا۔ ایک صاحب کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لایا گیا الزام تھا کہ دوران کرفیو انہوں نے آگ لگانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے صفائی پیش کی "حضور اگر میرا ارادہ آگ لگانے کا ہوتا تو میں یہ کام چوری چھپے کرتا، پہلے سے پروگرام بنا لیتا اور یوں آسانی سے رنگے ہاتھ پکڑے نہ جاتا۔ میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے تیلی جلائی تھی" ان سے سوال کیا گیا "مگر تمہارے پاس سے صرف ماچس برآمد ہوئی ہے" "جی سرکار! سگریٹ کی ڈبیہ راستے میں مجھ سے لے لی گئی" انہوں نے اپنی بےگناہی کا ثبوت دیا "خیر جب آپ کو گرفتار کر لیا گیا ہے اب چھوڑنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے!" یہ کہہ کر انہیں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اور دوسرے دن اس شرط پر انہیں چھوڑا گیا کہ وہ ایک مبینہ مجرم کے خلاف گواہی دیں گے۔

اشیاء کی قلت سے مہنگائی بڑھتی ہے۔ کرفیو کے دوران ہر شئے کی مصنوعی قلت ہوتی ہے۔ اشیائے ما تحتاج کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ہر چیز بلیک ہونے لگتی ہے۔ صفر آمدنی کے مقابلے آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمتیں زندگی کو بہت گراں بار کر دیتی ہیں کئی لوگ مقروض بلکہ کنگال ہو جاتے ہیں۔ غرض کرفیو وبال جیب ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر کرفیو زدہ شہری کرفیو الاؤنس ایجاد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مطالبہ قبول ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے، کرفیو کے تابوت میں آخری کیل کے طور پر تعزیری جرمانہ عائد کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے اکثر غور کیا جاتا ہے۔

کرفیو کے نفاذ سے اگر عافیت کا کوئی پہلو ہے تو وہ بیویوں اور شوہروں کو حاصل ہے۔ اکثر شوہر صبح گھر سے نکلتے ہیں تو رات دیر گئے واپس ہوتے ہیں۔ کرفیو کے دوران ایسے اور ہر قسم کے شوہر گھر پر ہی رہتے ہیں ـــــــــــ اور گھر پہ ہر شوہر کو بیوی کے تابع رہنا پڑتا ہے ہماری بیوی کا کہنا ہے کرفیو کا نفاذ میرے لئے نعمت مترقبہ ہے وہ گھر پر رہتے ہیں

گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ بچے انھیں پہچاننے لگتے ہیں۔ "اب آپ سے کیا چھپائیں کرفیو کے دوران ہم بیوی کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بچوں کو نہلاتے، کھلاتے اور پڑھاتے ہیں گھر کی صفائی کرتے ہیں اور تو اور ہم نے چائے بنانا اور املیٹ پکانا بھی سیکھ لیا ہے" شعراء کو کرفیو کے دوران سامعین مل جاتے ہیں۔ سامعین کے لئے کلام لکھنا اور ان کی سامعہ خراشی کرنا کرفیو میں شعراء کا نصب العین ہوتا ہے۔ ہم اپنے ایک شاعر دوست کا تذکرہ کرتے ہیں جو ہر کرفیو کے بعد اپنا تازہ مجموعہ کلام شائع کرتے ہیں۔ شائد اسی لئے کبھی کبھار ہمارے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ کرفیو کے نفاذ میں کہیں شعراء کا عمل دخل تو نہیں ہے ؟

کرفیو ختم ہونے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دوام کی سزا کاٹ کر چھوٹے ہیں۔ عزیز و اقارب اور دوست احباب کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ کسی کو پرسہ دیتے ہیں تو کسی کی ضمانت دینی پڑتی ہے۔ کسی سے ملنے جیل تو کسی کی عیادت کے لئے دواخانہ جاتے ہیں۔ قصہ مختصر ہم حیدرآبادی شہری دعاگو رہتے ہیں کہ ناکردہ گناہوں کی سزا برداشت کرنے کے صلہ میں روزِ محشر، کردہ گناہوں کی سزا میں تخفیف ہو۔ آمین !

وجاہت علی سندیلوی

گھن چکر

میرے ایک پروفیسر کو کتوں سے سخت نفرت بلکہ ان کے نام ہی سے چڑھ تھی۔ لیکن جب اُن کے ہمسائے کے کتے نے ان کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں ضرورت سے زیادہ چھیڑنا شروع کر دیا تو مجبوراً انھوں نے بھی ایک بھیانک قسم کا کتا پال لیا تاکہ جس صورت سے ہمسائے کا کتا ان کے لیے خواب پریشان بنا ہوا تھا اسی صورت سے ان کا کتا ہمسائے کے لیے وبال جان بن جائے "اور دونوں طرف ہیں ڈاگ برابر لگے ہوئے" والا مضمون درپیش ہو جائے۔ قریب قریب کچھ ایسی ہی صورت حال اور اسی قسم کی نیت سے مجھے گھن چکر جیسے عظیم الشان بور (BORE) سے تعلقات پیدا کر کے انھیں اپنے گھر بلانے کی مجبوری لاحق ہو گئی تھی۔

نام کچھ اور تھا لیکن ان کی لفاظی، چرب زبانی اور بے پناہ قوت گویائی کے باعث کسی مسخرے نے انھیں گھن چکر کا لقب دے دیا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ پھر اس کے مقابلے میں ان کا اصلی نام یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ گفتگو کی تیز رفتاری در خلاء میں لامتناہی پرواز کی رعایت سے انھیں راکٹ بھی کہا جا سکتا تھا لیکن غالباً گھن چکر کے لقب سے ان کی اس صلاحیت کی طرف واضح اشارہ مقصود تھا کہ وہ گھوم پھر کر دائروں میں گفتگو کرتے اور ایک بات میں سینکڑوں باتیں پیدا کر کے اور رائی کی گٹھلی سے جامن کا درخت نکال کر اس میں کھجور کی قلم باندھتے اور اس سے خربوزے توڑ کر سننے والے کو زندگی سے بیزار یا پھر آمادہ بہ پیکار کر دیتے۔ حکایت شروع کہیں سے کرتے اور ختم ـــــ خیر ختم تو وہ کوئی بات کبھی کرتے نہ تھے۔ ایسے کدا تے پھاندتے، طرح طرح کی قلابازیاں لگاتے اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ ان کا ہر آئیڈیا دیتی ہوئی چلتی اور پھر جب بچوں کے بچے اور ان کے بچے ضبط تولید کے تمام قیود توڑ کر لاتعداد اور بے شمار ہونے لگتے تو پھر ان کے مورث اعلیٰ کا مفقود الخبر اور سامعین کا مخبوط الحواس ہو جانا نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہو جاتا۔

گھن چکر دنیا کے ہر موضوع پر بلکہ بہت سے موضوعات پر بیک وقت ہفتوں اور مہینوں بے ساختہ اور بے تکان بول سکتے تھے۔ ان کی معلومات کا ذخیرہ ان کی قوت گویائی سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ کہنے کو تو وہ گریجویٹ تھے اور کچھ سال

کا طویل عرصہ انہوں نے علم کی تلاش میں (یا علم نے ان کی تلاش میں) صرف کرکے وہ ایک نقلی سی ڈگری سے بھی سرفراز ہو چکے تھے (یا ممکن ہے کہ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے یونی ورسٹی کے ذمہ داران نے اس ڈگری کا الزام زبردستی ان کے سر تھوپ دیا ہو) لیکن ان کی بیشتر معلومات ہر قید و بند سے آزاد اور طبع زاد بلکہ مادر زاد تھیں۔ اُن کا سر چشمہ ان کے جملہ حقوق محفوظ، قسم کے ذاتی تجربات اور مشاہدات تھے اور یا پھر ان کی لن ترانیاں اور بدحواسیاں۔

چوں کہ وہ ہر موضوع پر یکساں عبور رکھتے ہیں لہٰذا انھیں اپنی گفتگو کا موضوع تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی موضوع کے متعلق وہ شبہ کا فائدہ ہمیشہ دوسروں کو دیتے۔ لہٰذا زیادہ تر وہ دوسروں کی گفتگو کے درمیان دخل درمعقولات کرتے ہوئے گھس جانے کے عادی تھے کہیں جنازہ رکھا ہوتا اور مرحوم کے اوصاف و خصائل پر روایتی گفتگو ہو رہی ہوتی۔ وہ پہنچ جاتے تو انھیں اپنے "گھس چکری" جوہر بلکہ جواہرات دکھانے کے لئے صرف موضوع کی بُو سونگھ لینا کافی ہوتا۔ وہ ایک دم سے چیخ پڑتے "جی ہاں مرحوم کو آم بھی بہت مرغوب تھے بلکہ سچ پوچھئے تو اسی شوق کی بدولت انہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا!" مرحوم کے اعزا حیرت سے ان کا منہ تکتے رہ جاتے اور وہ آموں کے متعلق ایک مفصل مقالہ پڑھ دینے کے بعد ان کے اقسام بیان کرنا شروع کردیتے۔ پھر نمکنڈ میں آم کی قلمیں لگائے جانے کے امکانات پر قیاس آرائی کرنے لگتے۔ پھر عام جغرافیائی حالات کے ساتھ موسمیات پر جولانی طبع دکھانے لگتے۔ موسمیات کی گفتگو میں مختلف ممالک کے مختلف بموں کے اثرات کا ذکر چھڑ جاتا ایک قدرتی بات تھی اور پھر ان گلی کوچوں سے کترا کر نکل آنے کے بعد وہ دُنیا کی عالم سیاسیات کے لق و دق صحرا میں پہنچ جاتے اور یہاں انھیں اپنے راکٹ اسٹیشنگ اور جوہراتی بم چھوڑنے کے بے پناہ موقعے مل جاتے۔

گھس چکّر کی یاوہ گوئی اور ہذیان سرائی سے سارا محلہ آسیب زدہ معلوم ہوتا۔ ان پر نظر پڑتے ہی لوگ گھبرا جاتے، ان کے گھر کی طرف تو کسی واقف کار کے رُخ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ کس کی شامت آئی تھی جو آ بیل مجھے مار والی مثل اپنے اُوپر صادق کرتا؟ وہ خود جس کے گھر پہنچ جاتے وہ رسیاں تڑانے لگتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے خود اپنے گھر سے باہر نکلتا۔ راستے میں وہ دکھائی پڑتے تو لوگ منہ پھیر کر اور فاتحہ لاحول پڑھتے ہوئے دوسری طرف چل دیتے۔ غرض کہ محلہ بھر انھیں شیطان یا جلاد سے کم نہ سمجھتا۔ شاید انھیں خود بھی احساس ہو چلا تھا کہ ان کی بے پایاں معلومات سے مستفید ہونے کے بجائے لوگ بھاگتے اور کنّی کاٹتے ہیں لہٰذا جو کوئی بھولا بھٹکا مسافر ضرورت مند یا اپنی جگہ سے نہ ہٹ پانے والا دوکان دار انھیں موقعے سے مل جاتا تو وہ اپنی پوری کسر اسی غریب سے نکال لیتے اور اس پر اپنے معلومات کے لوکر دن پر لوکر انڈیل کر اپنی زبان کی مقررہ روزانہ ورزش میں ہرگز کوئی فرق نہ آنے دیتے۔

ایسی یگانۂ روزگار ہستی سے دوستی کرکے میں نے جو تاریخی حماقت کی اس کی ذمہ داری میرے گھر کے جغرافیہ پر تھی جو حد سے زیادہ غلط فہم کا واقع ہوا تھا۔ میرے گھر کے دائیں جانب ایک میر صاحب رہتے جو افیون کے شیدا ہونے کے علاوہ میر تقی میر کے بڑے شیدائی تھے اور بائیں جانب ایک مرزا صاحب رہتے جو کبوتروں کے عاشق زار ہونے کے ساتھ مرزا غالب کے زبردست طرف دار تھے۔ ان دونوں کے درمیان یہ بحث [illegible] سال سے چل رہی تھی کہ میر اور غالب میں کون بڑا شاعر

اور اس سلسلے میں اپنے امیدوار کو اونچا کرنے اور آگے بڑھانے سے زیادہ اُن کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے کے امیدوار کی پگڑی اچھال کر اس کی ٹانگ گھسیٹ لی جائے۔ اگر ایک غالب کو شعریت سے عاری اور مہمل گو کہتا ہے تو دوسرا میر کو ایذا پسند اور مبتذل گو گردانتا بلکہ شاید ہی کوئی ایسا الزام باقی رہ گیا ہو جو آئے دن ان عظیم المرتبت لیکن قابلِ رحم شعرا پر حملے یا جوابی حملے کے طور پر ایک افیونی اور دوسرے کبوتر باز کی جانب سے نہ تراشا جاتا ہو۔ یہ بحث جتنی طویل سے طویل تر اتنی ہی تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی۔ بارہا آستینیں چڑھ چکی تھیں اور اکثر ستونوں کی بہت دھول دھپا بھی ہو چکی تھی لیکن دونوں عادت سے مجبور تھے اور روزانہ بلاناغہ آپس میں بحث کئے بغیر شاید زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب شومئی قسمت سے میرا مکان دونوں حضرات کے مکانوں کے بیچ میں واقع ہوا تھا لہٰذا دونوں نے میرے ہی گھر پر اکھاڑہ قائم کر رکھا تھا۔

آندھی آئے، پانی برسے یا لو چلے سویرا ہوتے ہی دائیں جانب سے میر صاحب اور بائیں جانب سے مرزا صاحب لپکتے جھپکتے آتے اور میرے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر آکر آمنے سامنے رونق افروز ہو جاتے پہلے کچھ افیون کی گرانی اور کبوتروں کی بے وفائی پر ہلکا پھلکا تبصرہ ہوتا۔ پھر میر صاحب میر تقی میر کی شان میں ایک قصیدہ پڑھتے اور غالب پر کچھ چھینٹے کستے اس پر مرزا صاحب فوراً آتش زیر پا ہو جاتے اور غالب کی مداح سرائی کے بعد میر پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے پھر دونوں میں اس قسم کے اشعار کا تبادلہ ہوتا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اب گویا بارود میں چنگاری پڑ جاتی اور دونوں میں کچھ ایسی ہم ہمچی مچتی جیسے کسی بند جگہ پر دو کتے لڑ نہیں بلکہ ڈنڈوں سے مارے جا رہے ہوں۔ ایسے موقع پر محض دنیا سازی سے مجھے درمیان میں آجانا پڑتا "اجی ہٹائیے اس بحث کو۔ بتائیے آپ حضرات چائے پئیں گے یا شربت؟" میر صاحب بولتے "چائے"! مرزا صاحب کہتے "شربت"!

میں اس امید پر گھر کے اندر چائے اور شربت کے انتظام میں بھاگ جاتا کہ جب تک لوٹ کر آؤں گا یہ حضرات سر پھٹول کر کے اسپتال یا حوالات روانہ ہو چکے ہوں گے مگر پلٹ کر آتا تو دونوں کو سرخ چہروں اور چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر بدستور چپکا اور غراتا ہوا پاتا۔ چائے اور شربت کی موجودگی میں بحث کچھ دائرۂ اعتدال میں آکر ایک دوسرا رُخ اختیار کر جاتی۔

مرزا صاحب: "اجی کیا شعر کہہ دیا ہے غالب لاجواب نے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

میر صاحب: غالب کو طرفدار ضرور ملے لیکن افسوس سخن فہم کبھی نصیب نہ ہو سکے۔ آپ یہ شعر پڑھ کر صرف اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ غالب نے خدائے سخن میر کے کلام سے کیسی کیسی چوریاں اور خوشہ چینیاں کی ہیں۔"

مرزا صاحب: اجی کیا کفر بک رہے ہیں آپ؟ غالب اور میر کی خوشہ چینی؟ خود لعل و جواہر لٹانے والا بازار کے ٹھیکروں پر نظر کیا

نہیں ڈال سکتا"

میر صاحب: "بس بس! زبان نہ کھلوایئے۔ چار جز کا دیوان اور اس میں کئی دنگلتا لگے کا سامان! اب آپ کا پڑھا ہوا غالب کا شعر میر کے اس شعر کا چربہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو ۔۔۔ دیر سے انتظار ہے اپنا

مرزا صاحب: (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بس حد کردی قبلہ آپ نے لعل و جواہر ہمیشہ ریتوں میں ہی تلتے ہیں۔ کنکر پتھر کی طرح ان کے چٹے نہیں لگائے جاتے۔ اب آپ کو غالب کا ہر شعر میر کے کسی نہ کسی شعر کا چربہ نظر آتا ہے تو معاف کیجئے گا اس میں غالب کا نہیں آپ کی سخن فہمی کا قصور ہے۔ انھیں اشعار میں دیکھئے کہاں حضرت غالب کا شیر اور کہاں بے چارے میر کی بکریا۔"

میر صاحب: "اجی حضرت! قصور معاف! میر کا شعر آپ کی فہم سے بالاتر ہے۔ غالب کا شعر اس کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی کو سرقۂ مذموم کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب: "جی ہاں محترم یہ سرقۂ مذموم نہیں بلکہ شکوۂ مغموم ہے۔ میر کے شعر میں لفظ انتظار نے سارا مزا کرکرا کردیا۔ ہم خود اپنا انتظار کر رہے ہیں تو اس میں وارفتگی، ربودگی اور محویت کیا باقی رہی؟"

اور پھر اس شدت سے دونوں اشعار کی باریکیوں پر بحث کی، جنگ و جدال ہوتا کہ ان دونوں ہی اشعار کا اطلاق ہمارے جیسے مظلوم اور مجبور سامع پر ہونے لگتا۔

یہ بحث کچھ دھیمی پڑنے لگتی تو میر صاحب کوئی نیا شگوفہ چھوڑ دیتے "لیکن حضرت میر نے غالب کی طرح ایسے مہمل اور سنگلاخ اشعار کبھی نہیں بکے ؎

شوخیٔ نیرنگ صید وحشت طاؤس ہے ۔۔۔ دام سبزہ میں ہے پرواز چمن تسخیر کا"

مرزا صاحب: "حضور والا۔ یہ تو ادب عالیہ ہے۔ غالب، جہلا کے لئے میر کی طرح ایسے مبتذل اشعار کبھی نہیں کہتے تھے ؎

آشنا دو بے بہت اس دور میں ۔۔۔ گرچہ جامہ یار کا کم گھیر ہے

اب اسی نئی بحث کا خاتمہ اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میر صاحب کو اپنی افیون اور مرزا صاحب کو اپنے کبوتر یاد نہ آتے اور جب بادل ناخواستہ یہ دونوں حضرات دوسرے دن آکر اپنے اپنے مخالف شاعروں کے پرزے اڑا ڈالنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے تو میرا دماغ قریب قریب ماؤف ہو چکا ہوتا اور دوسرے دن کے لئے زندہ رہنے کی کوئی امید میرے دل میں باقی نہ رہتی۔

سخت عاجز کر رکھا تھا اس جوڑی نے اپنی بکواس سے! کوئی دوسرا مکان ہی نہیں ملتا ورنہ میں تو ایسے مکان پر جو ہمیشہ دو بموں کا میدان جنگ بنا رہتا لعنت بھیج کر نہیں معلوم کب کا بھاگ چکا ہوتا۔

یہ حالات تھے جن کے ماتحت مجھے طوعاً و کرہاً گھن چکر کو اپنے گھر بلانا پڑا۔ اُن کے لئے مشہور تھا کہ وہ نہیں معلوم کتنی محفلیں برہم کر چکے اور ایک مرتبہ جب وہ ایک ایسے کلب کے ممبر ہو گئے تھے کہ جس کے ممبر قریب پچاس کے تھے تو ایک ہی ماہ بعد

وہ صرف تنہا مصروف رہ گئے تھے۔

میر صاحب اور مرزا صاحب حسب دستور تشریف لا کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چونکہ ان دونوں ہی بزرگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ میں ان کی سہ رنگ سرائی اور اپنے تضیع اوقات سے فرصت سے زیادہ مستفید اور محظوظ ہوتا ہوں۔ لہٰذا معمول کے مطابق بحث کے آغاز میں مجھ سے رسمی چھیڑ چھاڑ، افیون اور کبوتروں کا سرسری کچھ تذکرہ کرنے کے بعد وہ اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹ گئے اور لگے غالب اور میر کے قلعوں پر گولہ اندازی کرنے۔ اور پھر ایک دم سے بلائے ناگہانی کی طرح گھمن چکر نازل ہو گئے

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم ٭ وہ بلائے ناگہانی اور ہے

اُنہوں نے خود دم لینے کے لئے میر صاحب اور مرزا صاحب کو چند لمحوں کا موقع دیا اور پھر وہ ان دونوں پر بیک وقت ایسا جھپٹے جیسے کسی بھوکے کتے کو دو رسیلی ہڈیاں ساتھ ساتھ مل جائیں۔

گھمن چکر چیخے! "اجی یہ آپ لوگ کیا گڑی ہوئی ہڈیاں نکال نکال کر چچوڑ رہے ہیں۔ میر اور غالب کو اپنی اپنی جگہوں پر چھوڑیئے۔ میں نے تو اگر کسی شاعر کو واقعی شاعر پایا تو وہ حضرت سلفہ تھے۔ کیا دماغ پایا تھا ظالم نے۔ وہ شعر کہتا نہیں بلکہ ڈھالتا تھا۔ اشاروں ہی اشاروں میں ایسے پتے کی بات کہہ جاتا تھا کہ بس داد دیتے دیتے جان دے ڈالنے کو جی چاہنے لگتا

کبھی میں کسی سے نہ شکوہ کروں گا ٭ جو سلفہ بھروں گا تو سلفہ پیوں گا

اب اسی شعر میں جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول کو تخلص کے شاہ کار تصرف کے ساتھ کس دلآویزی سے بیان کر دیا کم بخت نے کہ بس واہ! واہ! نہیں معلوم کون سی مشین لگی تھی اس کے دماغ میں۔ ادھر اُس کے کان میں نثر ڈال دیجئے اور ادھر فوراً اس کے منہ سے نظم اگلوا لیجئے۔ نابکار کو بکریاں پالنے کا بھی غضب کا شوق تھا۔ ایک روز میرے ساتھ تیتر کا شکار کھیلنے گیا۔ اور پھر جو گھمن چکر کی چرخی چلی ہے تو میر صاحب اور مرزا صاحب منہ کھولنے کو ترس گئے۔ گھمن چکر کی گفتگو کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے۔

ارادہ کرنا گھمن چکر اور سلفہ کا شکار کا۔ تیاری شکار مع انتظامات بالتفصیل۔ بحث درمیان گھمن چکر و زوجہ گھمن چکر بابت اقسام طعام ناشتہ فضائل کدو بہ زبان زوجہ گھمن چکر فضائل بیگن بہ زبان گھمن چکر۔ کھو جانا بندوق گھمن چکر کی بر وقت روانگی شکار۔ تلاش بندوق مع مکالمات متفرق۔ خانہ تلاشی سلفہ کے گھر کی۔ مل جانا بندوق کا ایک نالی میں۔ مکالمہ گھمن چکر برادر سلفہ بابت سرقہ بندوق بالفاظ تلخ و ترش یاد دلانا سلفہ کا گھمن چکر کو بابت دینے بندوق عاریتاً۔ روانہ ہونا گھمن چکر اور سلفہ کا سفر شکار پر مع قطعہ روانگی مصنفہ سلفہ۔ مصائب سفر بالتفصیل و بالتصویر مع لطائف و ظرائف۔ پہنچنا ایک جنگل میں اور دکھائی پڑنا ایک حسینہ کا۔ لپکنا شکاریوں کا جانب حسینہ اور آ جانا درمیان میں ایک ریچھ کا۔ بھاگنا سلفہ مع بندوق و ناشتہ دان۔ دیکھنا گھمن چکر کا کشتی ریچھ سے۔ تفصیلات داؤ پیچ کشتی کے۔ مارا جانا ریچھ کا اور واپس آنا سلفہ ایک درخت کے اوپر سے۔ کھا جانا بھوک کا گھمن چکر کو اور خالی پانا ناشتہ دان کو شرمندہ ہونا سلفہ کا اور کہنا قطعہ وفات ریچھ کا

میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کرسیاں چھوڑ کر بھاگ نکلے

دوسرے روز پہلے مرزا صاحب آتے دکھائی دیئے لیکن اُنھوں نے گھن چکر کو میرے برآمدے میں دیکھ کر اُلٹے پیروں بھاگنا شروع کر دیا۔ گھن چکر نے آواز دے کر انھیں بلایا بھی لیکن اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے اپنی واپسی کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ ؎

دوسری جانب سے میر صاحب آرہے تھے   کیوں نہ بھاگوں کہ یاد کرتے ہیں

اُنھوں نے جو گھن چکر کو مرزا صاحب کو پکارتے سُنا تو یہ سمجھ کر کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے فوراً ایک قریبی گلی میں سفر در پیچ گئے۔

مجھے میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں سے نجات تو حاصل ہو گئی لیکن اب روز علی الصبح جب گھن چکر آکر میرا دماغ روئی کی طرح دھنکتے اور میرے ہوش و حواس کے سلفے بھر بھر کر پیتے ہیں تو مجھے اپنے وہ بچھڑے ہوئے بزرگ بہت یاد آتے ہیں ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پاؤں

مفلس فاروقی

تلقین سمجھ بیٹھے

یک کو بھی اپنی تحسین سمجھ بیٹھے
یک چند خود کو شاہین سمجھ بیٹھے

تذلیل کی باتوں کو عزت کا سبب جانا
توقیر جہاں پائی توہین سمجھ بیٹھے

لوم نہ تھا ہم کو کرنا ہے اداکاری
ین اسے دیکھا غمگین سمجھ بیٹھے

قوال میں شاعر میں کچھ فرق نہ کر پائے
کیوں قاف کو نادانو تم شین سمجھ بیٹھے

مفت میں ہاتھ آئی گدڑی بھی پھٹی ہم کو
وشالہ سمجھ بیٹھے قالین سمجھ بیٹھے

فرمان خدا جانا ہر حکم کو بیگم کے
ہر بات کو سرکاری آئین سمجھ بیٹھے

ں عاشق رنگیں تھا واعظ مجھے گردانا
اظہار تمنا کو تلقین سمجھ بیٹھے

خود ساختہ رسموں سے جو انکی ہوا منکر
اس شخص کو مولانا بے دین سمجھ بیٹھے

یہ انکی نگاہوں کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
ئیں ایک تھا وہ مجھ کو دو تین سمجھ بیٹھے

ہر چیز کو ساون کے اندھے کی طرح تم تو
سرسبز سمجھ بیٹھے، رنگین سمجھ بیٹھے

جو چال چلی سیدھی جو داؤ چلا الٹا
پیدل کو ہمیشہ تم فرزین سمجھ بیٹھے

کڑوی ہو، کسیلی ہو وہ تلخ کہ پھیکی ہو
ہر بات کو تیری ہم نمکین سمجھ بیٹھے

کچھ ایسے بھی مخلص ہیں اس دور نمائش میں
جو ٹاٹ کو مفلس کے قالین سمجھ بیٹھے

○

پاگل عادل آبادی

غزل

جو غسل کی کرتے ہیں تاکید بیانوں میں
حمام نہیں ہوتے خود اُن کے مکانوں میں

گھر دار کرو شامل پنج سالہ پلانوں میں
تنگ آ گئے رہ رہ کے بھاڑے کے مکانوں میں

ہوتا ہے شمار اُن کا سیّد نہ پٹھانوں میں
جب سے وہ نظر آئے گا سنجے کی دوکانوں میں

مُرغے نے اذاں دے کر معدے پہ کیا قبضہ
دل لُوٹا پلاؤ نے سُو طرح کے کھانوں میں

اِس دور کے رہزن بھی اِس دور کے رہبر بھی
تلتے بھی ہیں پیسوں میں بکتے بھی ہیں دالوں میں

لمبوں کے مقدر میں فٹ پاتھ کا بستر ہے
اُلّوں کا بسیرا ہے ان اونچے مکانوں میں

ہُوہا کے سوا یارو ڈسکو میں دھرا کیا ہے
وہ بات کہاں جو تھی نوشاد کے گانوں میں

شعراء کا چلے بس تو اک روز یہ دیوانے
سورج کو اگا دیں گے برفیلی چٹانوں میں

پاگل کو مبارک ہو اعزاز کم عقلی کا
وہ کھینچتے لگے اسکو پولس کے جوانوں میں

سر ٹپٹ حیدرآبادی

تھا گھر میں جو بھی زیر و زبر لیکے آگیا
چھوڑا تھا جو پدر نے پسر لیکے آگیا

ہڑتال ہوٹلوں کی تھی، دوکانیں بند تھیں
کھانے کو میں کچپ لو مٹر لے کے آگیا

کی دل نے کامیابی کی کوشش بہت مگر
نمبر نہ لا سکے تو صفر لے کے آگیا

پوری ہوئی کبھی نہ میری اُس کی گفتگو
گاہے اگر، میں گاہے مگر، لے کے آگیا

گم صُم رہا، نہیں کہی اس نے کبھی نہ ہاں
میں واں سے خود کو بیچ ادھر لے کے آگیا

نکلا تھا کل جہاں سے میں بے عزتی کیساتھ
پھر دل وہیں پہ بارِ دگر لے کے آگیا

فصل خزاں جب آئی میں آزاد ہوگیا
یادِ قفس، بچے کھچے پر، لے کے آگیا

بیٹی فراق میں نظر آئی جو غم زدہ
داماد کو خود اپنے خسر لے کے آگیا

شیطان مجھ کو لایا جہنم کی راہ پہ
جانا کہاں تھا مجھ کو کدھر لے کے آگیا

لانے کو اور کچھ نہ ملا اس کے ماسوا
جنت سے میں گیہوں کا شجر لے کے آگیا

سر ٹپٹ کو اُس کے چال چلن نے کیا ذلیل
اپنے کو وہ اَیہ سے، لوٹر لے کے آگیا

غزلیں

رسائی ہوتی ہے حاصل ہمیں جس دن زمانے تک
پہونچ جاتی ہے نوبت خود بخود چٹنے پٹانے تک

ہمارے بعد چھا جائے گی تاریکی نہ ہر جانب
ضیا بزم ادب میں ہے ہمارے ٹمٹمانے تک

بنایا قوم نے بعد از رہائی لیڈر و نیتا
کسی کی بھی نظر میں کچھ نہ تھے ہم جیل جانے تک

وہ لائیں ساتھ ہی تھرماس میں چاء اور بسکٹ بھی
جنھیں خواہش ہو آنے کی مرے دیوان خانے تک

بلاناغہ تماشہ دیکھتے ہیں دیکھنے والے
رُلائے جاتے ہیں ہم بعد ان کے مسکرانے تک

تبھی تکمیل ہوگی کنبہ بندی کے اصولوں کی
گھرانا اُن کا جب آجائے گا میرے گھرانے تک

کوئی مہمان گر بعد از غروب آفتاب آئے
تواضع کرنا ہی پڑتی ہے اسکی شب کے کھانے تک

وہ رہ جاتا ہے بن کر ڈھول کا اک پول یا آخر
بھرم عاشق کا ہے معشوق کا ہر ناز اٹھانے تک

اسی کی بندگی ہے بندگی کہلانے کے لائق
جبیں جس کی جھکائی گئی خود آستانے تک

خزاں آجاتی ہے فوراً چمن میں ان کے جاتے ہی
نہیں آتا چمن میں موسم گل ان کے آنے تک

ہے میری ہر غزل انمول سرمایہ مرا سرٹپٹ
ملے ہیں گیارہ شعروں کی غزل کے قیدہ آنے تک

رؤف خوشتر (بیدر)

گپ کی داد

چُپ رہتے رہتے جب خود کو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے پایا تو علم ہوا کہ اب چُپ رہنے والوں کی بات بھی زمانہ نہیں سُنتا۔ کامیابی کا حل پانے کے لئے ہم چُپ چاپ، زیادہ شور مچانے والے اس دوست کے پاس پہنچے جو خود کو محلے کا بلا شرکت قائد سمجھتے تھے۔

وہ بڑی دیر تک چُپ چاپ (شاید پہلی بار) ہماری خاموشی کے کرب کو صبر سے سُنتے رہے۔ جب ہم چُپ ہوئے تو وہ یوں گویا ہوئے۔

" میاں مولانا حالی نے اگر چپ کی داد لکھی تھی تو یہ اُس دور کے غالب رجحان کی غمازی ہوتی ہے۔ تم اردو میں یہ نظم اور انگریزی میں اس مقولہ SILENCE IS GOLD خاموشی سونا ہے، ازبر کر کے اُس پر عمل کرنے کی غلطی بھی کر بیٹھے۔ برخوردار اب خاموشی سونا نہیں بلکہ خاموشی سے جینا سونا ہو گیا ہے۔

" جان ہے تو جہان ہے " کا مقولہ اب " زبان ہے تو جہان ہے " میں بدل گیا ہے۔ جو جتنا زیادہ منہ کھولے گا لوگ اُس کا اتنا ہی بھرتے جائیں گے۔ لن ترانی، چرب زبانی اور دروغ گوئی کے ساتھ گپ شپ اب بشری زندگی کے لوازمات ہیں۔ میاں یہ مشغلے کامیابی کے زینے ہیں۔ اب گپ بازی کا رواج ہے اور گپ ہانکنے کا دائرہ عالی شان مکانوں اور کافی ہوٹلوں سے ہو کر بیت الخلاؤں تک پھیل گیا ہے۔

نئی نسل کو گپ شپ کے لئے کسی مکتب یا مشق کی ضرورت نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ گھروں میں بڑوں کو بڑھ چڑھ کر گفتگو کرتے اور گپ ہانکتے پاتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ مکانوں سے باہر قدم نکالتے ہیں یہی منظر دیکھتے ہیں۔ محلہ ہو یا مکتب، ہو یا ملازمت ہر جگہ انہیں یہی عمل نظر آتا ہے۔ اور وہ چُپ کو چھوڑ گپ پر اتر آتے ہیں۔

میاں یہ دور روپیہ، جتھے بندیوں کے علاوہ لفظوں کے بے جا استعمال کا دور ہے۔ اب جلسوں میں سچ پر گالیاں اور گپ پر تالیاں ملتی ہیں۔ سامعین کو کچھ دیر کے لئے خیالی جنت میں ذہنی ہجرت کروانے کے لئے قائدین کے لئے

ضروری ہوتی ہے۔

اگلے وقتوں میں فرصت اور دولت کے طفیل کبوتر، بٹیر، شطرنج اور پتنگ بازی ہوتی تھی۔ اب کثیر العیال اور ضعیف الخیال کے صدقے گپ بازی سستا مشغلہ سمجھ کر سبھی اسی میں مشغول ہیں۔ دراصل اب گپ بازی ہی ہمارا قومی کھیل بنتا جا رہا ہے۔

پچھلے دنوں دوستوں کی محفل میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ تھا۔ سب نے ایک سے بڑھ کر ایک شاندار جھوٹ بولنے کا مظاہرہ کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ کل شام میرا جلسہ عام ہے۔ وہیں چلے آنا۔ تقریر کے بعد دوستوں نے مجھے مسلسل تین گھنٹے تک جھوٹ بولنے پہ انعام اول سے نوازا۔

ضروری نہیں کہ عوام ہی قائد کے جھانسے میں آ جائیں۔ بعض وقت معاملہ برعکس بھی ہوتا ہے۔ میرے مخالف قائد (جن کی زندگی رنڈی اور برانڈی سے عبارت ہے۔ جن کا پہلا اصول غریب پرستی رمز اول ہے۔ اور جو ہمیشہ زیر لب "ہم تے تو داسیوں میں گزاری ہے زندگی" گنگناتے رہتے ہیں) نے جب قحط زدہ علاقہ کے دورہ کے بعد جلسۂ عام میں جذباتی انداز میں کہا۔

"اے خدا! میں اب اور عوام کے جیب خالی اور زبوں حالی نہیں دیکھ سکتا۔ یا تو بارش برسا یا پھر مجھے اس دنیا سے اٹھا لے"

سامعین نے فوراً ایک آواز ہو کر کہا۔

اُٹھا لے اٹھا لے
وہ دنیا کے رکھوالے
اسے جلد یہاں سے اُٹھا لے

کسی زمانہ میں صرف انشورنس اور میڈیکل ایجنٹ ہی گپ بازی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اب تو ہر کس و ناکس اس میدان کا سورما نظر آتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اب گپ سے کام لیا جا رہا ہے۔ اپنے دورہ کے دوران ایک تاریخی شہر میں محل دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ محل کے ایک ایک کمرہ کی تفصیلات بتلاتے ہوئے گائیڈ نے ایک کمرہ میں ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے انکشاف کیا کہ مہاراجہ نے اسی کمرہ میں آخری سانس لی تھی۔

سیاحوں میں کسی نے گائیڈ کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ پچھلے سال اُس نے دوسرا کمرہ بتلایا تھا۔ ہم سب سانس روکے گائیڈ کے جواب کے منتظر تھے۔ گائیڈ نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کمرہ کی مرمت ہو رہی ہے اس لئے مہاراجہ کو اس سال اس کمرہ میں آخری سانس لینی پڑی۔

اب گائیڈ اور دوسرے حضرات بڑی آسانی سے عصری سہولت کی خاطر تاریخ کو بدل رہے ہیں ہم نے گائیڈ سے کہا۔

محلوں میں رہنے والے ہیں تیرے شہر سے کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ بول کے لئے جب مول نہیں تو پھر بولنے میں کیوں ٹال مٹول۔ اس لئے بے تکان بولتے جاؤ کہ سننے والا اپنے آپ بیزار ہو جاتے اور تم سے پناہ مانگتے۔

اب گپ ہر موڑ اور ہر موقع پر کام آتا ہے۔ مثلاً مجھے مکان جانے میں تاخیر ہو گئی۔ بیگم کی دھواں دھار تقریر جس میں

چولہے کا دھواں الگ) سے بچنے کے لئے اسی گپ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مکان جانتے ہی ایک من گھڑت واقعہ
یسے بیان کرتا ہوں کہ وہ حیرت اور تعجب کے سمندر میں غوطے لگاتی ہے اور تاخیر کا سبب پوچھنا بھول جاتی ہے۔
اب تو وہ ہر روز ایک نیا واقعہ حادثہ سُننے کی عادی ہوگئی ہے۔ چنانچہ جب بچہ ایک نئی کہانی سُنانے کی
فرمائش کرتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ٹھہر جا میرے لال تیرے ابا ایک نیا قصّہ لے کر آتے ہی ہوں گے۔
خیر اب تم بھی گھر جاؤ اور بیگم کے قہر سے بچنے کے لئے گپ کا سہارا لو، یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔
اور ہم کھڑے کھڑے سوچتے رہے کہ کس کس کے قہر سے بچنے کے لئے کتنا گپ کہہ سکیں گے۔ کہیں گپ کہتے کہتے
ہماری زندگی ہی جھوٹ کے گھُپ اندھیرے میں نہ ڈوب جائے۔
آج کے شاعر چُپ کی داد نہ لکھتے ہوئے کچھ اور ہی لکھنے پر مجبور ہیں۔ اور اُن کی نظم کا عنوان ہوتا ہے:

گپ کی داد

OO

تم .....

ظہیر احمد قدسی

(خواجہ عبدالغفور صاحب کے انتقال کی خبر سن کر)

بحرِ ادب خموش، تلاطم اُداس ہے — لہروں کا اور بھنور کا ترنم اُداس ہے
پروانے چپ ہیں، تتلیاں بے چین ہو گئیں — پھولوں کا شوخ و شنگ تبسم اُداس ہے
خوشیوں کے سوتے سوکھ گئے، آئی وہ گھڑی — گم ہو گئی ہنسی، تو تکلم اُداس ہے
اک پل میں سارے باغ کا نقشہ بدل گیا — کلیوں کی آنکھ بھیگی "شگوفہ" اُداس ہے
طوفان کوئی آیا، نہ آندھی کہیں چلی — پھر کیوں زباں کا چاہنے والا اُداس ہے
کیا سفر تھا، جو سفرِ آخرت بنا — یہ سوچ کر ہر ایک شناسا اُداس ہے

اُردو اکیڈمی کی زباں اور مزاح کا دل
یوں چپ ہوا کہ سارا زمانہ اُداس ہے

طنز و مزاح کی راہ کا راہی چلا گیا — اردو زباں کا ایک سپاہی چلا گیا
جب تک سفر میں تھا، تو اُجالا تھا ساتھ ساتھ — رخصت ہوا تو دے کے سیاہی چلا گیا

دیوارِ گریہ بن گئی، دیوارِ قہقہہ
زندہ دلوں کے لب پہ یہی مرثیہ بجا
"پھولوں میں رنگ و بو نہ رہا دل کشی گئی
تم کیا گئے بہار گئی، زندگی گئی"

○

مجیب الرحمن بزمی

غزل

مسخرہ سیاست کا ڈائس پہ جب آتا ہے — داستاں ترقی کی من گھڑت سناتا ہے
دھرم اور فرقے کی آگ کو ہوا دے کر — دیش کے مسائل سے ذہن کو ہٹاتا ہے
بھوک، تنگی جنتا کو دوغلے کے بھاشن سے — دال اپنے مطلب کی روز وہ گلاتا ہے
اپنے رشتے داروں کی جیب جس سے بھاری ہو — ایسے ہی کچھ منصوبے نت نئے بناتا ہے
گھر کا ذمہ داری کا پاس تک نہیں جس کو — رعب چمچہ گیری کا ہر طرف جماتا ہے
مسندِ وزارت کی چاہ میں میاں بزمی — گیت دیش بھگتی کا محفلوں میں گاتا ہے

یوسف قریشی (دلی)

چاندنی

کبھی کبھی کوئی معمولی سی بات بھی بڑی دل چسپ ہو جاتی ہے۔ غریب کی ضرورت کی طرح دل چسپ بات کا کوئی کچھ
ر ستہ نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی کہیں سے بھی رونما ہو جاتی ہے اور لمحہ بھر کے لئے انسان کے تفکرات سے گھرے ہوئے دل و دماغ
لالہ زار بناتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

ہمارے گھر کے بالکل نیچے کرایہ کی دری چاندنی اور برتنوں وغیرہ کی ایک دکان ہے جس سے ہم نے ہمیشہ ناجائز فائدہ
ٹھایا ہے۔ فائدہ جائز ہو یا ناجائز ہوتا بڑا فائدہ مند ہے اور دل چسپ بات یہ کہ ہمارے اس فائدہ کے پس پشت ہماری
ی لیاقت، ذہانت یا ہشیاری کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ سادا دل دکاندار کی سادگی بلکہ سراسر بے وقوفی کا ہے وہ اس
رح کہ وہ کمبخت خدا جانے کیوں ہماری بہت عزت کرتا ہے۔ بس اس کی اسی بات سے ہم نہایت خاموشی سے لابھ لیتے
ہے ہیں اور جب جس چیز کی ہم کو ضرورت ہوتی ہے بلا جھجک اس کی دکان سے اپنے استعمال کے لئے اُٹھا لاتے ہیں اور کبھی
ئی کرایہ ادا نہیں کرتے، یہی نہیں بلکہ اس کو یہ تاثر بھی دیتے ہیں کہ اس کی چیزوں کو استعمال کر کے ہم نے اس کی عزت افزائی
ہے۔ کرایہ جائے سالکیا، وہ تو ایک آنی جانی شے ہے۔ عزت بڑی چیز ہے یہ زندگی میں کسی کسی کو میسر آتی ہے۔
کسی بھی چیز کے وزن یا معیار کو ناپنے کا کوئی نہ کوئی پیمانہ بھی ہوتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی دکاندار کو ہم گاہکوں
ے صرف پانچ دس روپے کے فرق پر لڑتے اور گالم گلوچ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس احساس سے ہمارا سینہ فخر سے پھول
جاتا ہے کہ یہ آدمی ہماری صرف عزت ہی نہیں کرتا بلکہ بے پناہ عزت کرتا ہے کیوں کہ گاہک کی عزت کو تو وہ صرف دس پانچ
روپے کے لئے اتار اتار کر دری چاندنی کی طرح تہہ کر کے رکھ دیتا ہے اور ہم ہیں کہ اس کے کرایہ کے سامان کو نہ معلوم کب
سے مال مفت کی طرح استعمال کر رہے ہیں اور اس نے آج تک ہم سے ایک پائی بھی طلب نہیں کی ہے۔ تو دوستو یہاں ہی یا تو
ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ بے وقوف دکاندار ہماری عزت اندرا گاندھی سے بھی زیادہ کرتا ہے۔
بات ابھی تک تمہید ہی میں اٹکی ہوئی ہے۔ چاندنی کا کیا قصہ تھا اس سے متعلق تو کوئی بات ابھی تک آئی نہیں ——

ہوائیوں کہ جس وقت ہم نے ایک ادبی نشست اپنے گھر پہ کرنے کا پروگرام بنایا تو اس سے متعلق بہت سے مسائل کا خیال آیا جو اس سلسلہ کی بڑی بنیادی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ہمارے پاس چاندنی تو تھی مگر سفید نہیں بلکہ چار خانے والی، دس بندرہ چاء کی پیالیاں بھی تھیں مگر سب الگ الگ رنگ اور الگ الگ ڈیزائن کی ۔ چار خانے کی چاندنی پر شعراء اور ادیبوں کو بٹھا کر رنگ برنگی پیالیوں میں چائے پلانا نہ صرف تخلیق کاروں کی بے حرمتی ہے بلکہ اپنی زبوں حالی اور افلاس کا اشتہار بھی ہے۔ اس بیلے کا خیال آتے ہی ہمیں اپنی حالتِ زار اور کاتبِ تقدیر کے بٹوارے پر بڑا غصّہ آیا اور ہماری آنکھیں نم ہوگئیں۔ لیکن رونے دھونے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ یہ بات تو پہلے سوچ لینے کی تھی اب تو نشست کے بلاوے بھی جا چکے تھے۔ آخر پھر وہی کیا جو ایسے موقعوں پر کرنا پڑتا ہے۔ بقول دانشوروں کے جو گھونسہ لڑائی کے بعد یاد آئے کہ ایسے مارتے ویسے مارتے وہ گھونسہ وقت نکل جانے کے بعد اپنے ہی کو مارنا پڑتا ہے ورنہ وہ گھونسہ ہمیشہ خلاؤں میں ناچتا ہی رہتا ہے، چنانچہ اس ناچتے ہوئے گھونسے کی روک تھام کے لئے کوئی فوری تدبیر ضروری تھی، کچھ مزید دانشوروں کے اقوال کو کھنگالا تو اُمید کی کرن نظر آئی۔ کسی دانشور نے یہ قول بھی کہیں کہہ رکھا تھا کہ "مَرد باید کہ ہراساں نہ شود" یہ قول مَردوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور بہرحال جنسی اعتبار سے اس زمرہ میں ہم بھی آتے ہیں، چنانچہ رونے دھونے اور فکر کرنے کے پروگرام کو کینسل کیا اور ذہن کو نااُمیدی کے بجائے تدبیر کی طرف موڑا اور جلد ہی ایک خاطر خواہ نتیجہ بھی نکال لیا۔ اپنے اسی دیرینہ اور بے دقوف محسن یعنی کرایہ کی دری چاندنی والے دکاندار کا خیال آتے ہی یکلخت ایسا محسوس ہوا کہ جیسے نہ صرف یہ کہ نشست ہوئی بلکہ ایک کامیاب نشست ہوئی کہ یہ دونوں چیزیں یعنی سفید چاندنی اور ایک ہی رنگ اور ایک ہی ڈیزائن کی پیالیاں [illegible] کے یہاں ہمیشہ دستیاب ہوتی ہیں اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ ہلدی اور پھٹکری کا بھی کوئی خرچہ نہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ہمارا یہ دوسی دکاندار ہماری بے پناہ عزت کرتا ہے۔

بس جناب، پھر کیا تھا" بلا کسی تاخیر ہم اس دکاندار کے پاس جا دھمکے اور اِدھر اُدھر کی تمہیدی گفتگو کے بعد چاپلوسی کے اپنے انفرادی انداز میں حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہوئے ہم نے اس سے کہا کہ فلاں فلاں تاریخ کو ہم اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا نشست کر رہے ہیں جس کے لئے ہمیں ایک سفید براق سی چاندنی اور دس بارہ ایک ہی رنگ اور ایک ہی نسل کی پیالیاں درکار ہوں گی، فوراً ہی اس بے چارے نے ہماری توقعات کے عین مطابق جواب دیا کہ آپ کی دکان ہے جب جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف کہہ دیں، دری چاندنی اور پیالیاں آپ سے بڑھ کر تھوڑی ہیں، انسانیت اور فراخدلی کی حدوں کو پھلانگتے ہوئے اسی نے ہم کو مزید عزت بخشتے ہوئے آگے کہا کہ آپ کہیں تو اس دن دس بارہ سفید چادریاں بھیج دوں؟ اس کی یہ انوکھی پیشکش ہمیں اندر ہی اندر بڑی مضحکہ خیز محسوس ہوئی کہ ایک چھوٹی سی نشست کے لئے دس بارہ سفید چاندنیاں! کیا احمقانہ پیشکش ہے نشست نہ ہوئی کوئی احتجاجی ریلی یا بس حادثہ ہوگیا کہ جس میں مرنے والوں کے لئے ایک ہم سے اتنی تعداد میں سفید کپڑوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے، بہرحال یہ کہ ہمارے اندر کی ظریفانہ بات تھی اس بے چارے نے تو یہ پیشکش بڑی معصومیت سے کی تھی چنانچہ ہم نے اس بات کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا کیوں کہ معصومیت کا اب رواج ہی ختم

ہوگیا ہے۔ چھوٹے بچوں اور بچیوں میں سے بھی معصومیت اب رخصت ہو چکی ہے۔ بھولے پن اور چنچل اور بچپنے باک اور گستاخ ہونے لگے ہیں۔

قصہ مختصر ہم نے اس دکاندار کی اس انوکھی پیشکش کا جواب نہایت شکرانہ انداز سے دیتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ نہیں میاں نہیں۔ دس بارہ سفید چاندنیوں کا کیا کام، دس بارہ تو کل شرکاء ہیں شاعروں اور ادیبوں کی نشست کے لئے نہ صرف ایک سفید چاندنی چاہیئے کوئی خدانخواستہ ان سب کو الگ الگ سفید چاندنیوں میں لپیٹنا تھوڑی ہے، ابھی تو وہ سب نوجوان ہیں نئی نسل کے نمائندے ہیں اللہ ان سب کی عمر دراز کرے انھوں نے ابھی پریشانیوں اور بے روزگاری کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو ان کو بہت کچھ دیکھنا باقی ہے مثلاً انسان اور انسانیت کی مکمل تباہی و بربادی تیسری اور آخری جنگِ عظیم، ایٹم بم، قتل و غارت گری اور وغیرہ وغیرہ۔

ہماری یہ بات اس کی سمجھ میں کتنی آئی تھوڑی یا بالکل نہیں یہ کہ وہ خود ہی بہتر جانتا ہے کیوں کہ اس وقت ہمارا مقصد نئی نسل کے علمبرداروں کا تعارف یا انسانیت کی آنیوالی تباہی کا ذکر کرنا مقصد نہیں تھا جو ہم اس بات کو طول دیتے اس وقت تو اپنا کام نکالنا ہی مقصد تھا چنانچہ بات کو وہیں ختم کر دیا اور چند لمحوں تک ہمارے اور اس کے درمیان گونگے اور بہروں والی کیفیت ہو گئی اور ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم نے اس دکاندار سے بہت کچھ کہہ کر بھی کچھ نہیں کہا اور اگر غلطی یا مجبوری سے کچھ کہہ بھی دیا ہے تو وہ اس نے ہرگز نہیں سُنا۔ ویسے اگر اتفاق سے وہ ہماری سُن بھی لیتا تو بھی کیا ہو جاتا ہم دونوں مل کر بھی اس طرح کی گفتگو کے بعد تیسری جنگِ عظیم کو کون سا ٹال دیتے۔۔۔ ہمارے اور اس دکاندار کے درمیان جو ذہنی فاصلے تھے اس کی لمبائی اندازوں سے بھی ناپی نہیں جا سکتی تھی۔

دری چاندنی کے علاوہ ہم نے حالاتِ حاضرہ پر جو کچھ بھی اس سے کہا وہ لمحے بالکل ایسے ہو گئے کہ جیسے کوئی انگریز ٹورسٹ کسی اہلِ پرانی دلی سے اپنی زبان میں کسی ہوٹل یا اسٹیشن کا پتہ معلوم کرلے اور جواب میں اسے لفظی اور مقامی ہاتھ کے اشاروں والی گالی ملنے پر بھی بے چارہ پردیسی انگریز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرکے اپنے کیمرہ میں ان تہذیبی اور ثقافتی اشاروں کو محفوظ کرنے تو اس وقت بالکل ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے سب کچھ سُن لینے اور سمجھ لینے کے باوجود بھی گوری نسل کا یہ نمائندہ سُنی ان سنی کر گیا ہے ۔۔۔ قربان جایئے ان انگریزوں کے کتنے زندہ دل ہوتے ہیں یہ! اور شاید اپنے اس کردار کی وجہ سے یہ انگریز ہوتے ہیں ورنہ تاریخ اٹھا کر دیکھئے کیا کوئی انگریز آج تک ہندوستان میں پیدا ہوا ہے؟

معاف کیجئے گا، بات کہیں دور نکل گئی

بات تو صرف نشست کے لئے سفید چاندنی کی اٹھائی تھی جس کا مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا تھا۔ لیکن اب ہم اس دکاندار کا پیشکش شکریہ ادا کرنے کے بعد نکلنے ہی والے تھے کہ اس کے ایک چھوٹے سے سوال نے ہمارے اندر ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ بڑی معصومیت سے اس نے ہم سے پوچھا کہ یہ جو دعوت ہم کر رہے ہیں اس میں صرف شاعروں وغیرہ کو ہی کیوں بلایا ہے کیا ہم میں کوئی مسٹ ہو جاتا؟ وہ اگر سوال یا تو لاجواب ہو جاتے ہیں یا پھر ناقابلِ جواب ۔۔۔ اس کے اس سوال کو ہم کس نظر

میں جگہ دیں ایک لمحہ کیلئے ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ بہرحال جواب تو دینا ہی تھا، ہم نے جس کیفیت میں اس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا اس کیفیت کا نام تو ہمیں نہیں معلوم بہرحال جو جواب ہم نے اسے دیا وہ یہ تھا کہ "میاں۔ دعوت دادت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مشاعرہ کا پروگرام صرف ایک چھوٹی سی نشست ہوگی بس نشست۔ وہ مجسم سوال بن کر کھڑا ہوگیا۔

شادی بیاہ، ولیمہ، چوتھی چالا، عقیقہ، سالگرہ، تیجا، تیرھویں چالیسواں، جلسہ وعظ، مشاعرہ، اس طرح کے سبھی فنکشنوں سے وہ بخوبی واقف تھا لیکن یہ نشست کیا بَلا ہوتی ہے یا ہوتا ہے یہ بات اس کے دماغ میں کسی طرح بیٹھنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، اور اپنی تمام تر دلچسپی اور تجسس کے ساتھ وہ میدان میں کود پڑا۔ اور ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اچانک گونگے ہوگئے ہم آخر کن الفاظ میں اس کو یہ بتاتے کہ یہ نشست کیا ہوتی ہے، ہمارے سامنے نشست کا مطلب اور تصویر لاکھ واضح سہی لیکن سوال تو یہ تھا کہ یہ تصویر اس کے ذہن میں ٹرانسفر کیسے ہو؟ اور اس کے تجسس کا یہ عالم تھا کہ اگر ہم اسے یہ نہیں بتا پائیں گے کہ یہ نشست کیا ہوتی ہے تو شاید وہ ہمیں چاندنی اور پیالیاں دینے سے انکار کر دے گا۔

خود کو اس قدر لاچار اور مجبور پاکر ہم نے اپنی ظریفانہ حس کا سہارا لیتے ہوئے جو کچھ کہنا شروع کیا وہ اس طرح تھا۔ ہم نے کہا "میاں کیا بتائیں تم کو کہ نشست کیا ہوتی ہے یہ تو ہمیں خود ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہمیں خود بھی نہیں معلوم کہ نشست کیا ہوتی ہے بس یوں سمجھ لو کہ ایک پاگل پن ہوتا ہے جب آدمی کا دماغ خراب ہوتا ہے تو نشست ہوتی ہے، تم کہاں اس میں اُلجھ گئے اگر تم کو یہ جان لینے کا بہت زیادہ شوق اُٹھ رہا ہے تو یوں سمجھ لو کہ ایک چھوٹا سا مشاعرہ "ٹائپ" ہوتا ہے جس میں پڑھنے والوں کی تعداد سننے والوں کے بالکل برابر ہوتی ہے ایک دو کا بھی فرق نہیں ہوتا دوسرے اس میں لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا، تیسرے اسمیں ہوٹنگ نہیں ہوتی، چوتھے اسمیں بلوہ نہیں ہوتا پانچویں اسمیں کسی طرح کا گھپلہ نہیں ہوتا، چھٹے اس میں پولس کا عملہ نہیں ہوتا ساتویں یہ کہ اس میں شرکاء کچھ بھی پڑھ دیں "ڈی، آئی، آر" کا خطرہ نہیں ہوتا پڑھنے اور سننے والوں کی پوری توجہ ہوتی ہے، خلوص ہوتا ہے رواداری ہوتی ہے صاحب خانہ سے تعلقات اور اس سے کہیں زیادہ اس کی طرف سے کی گئی تواضع اور لوازمات کا احترام ہوتا ہے۔ گاؤ تکیئے ہوتے ہیں، ایش ٹرے ہوتی ہے پان ہوتے ہیں اگالدان ہوتا ہے اور جب نشست برخواست ہو جاتی ہے تو شرکاء کی روانگی کے بعد گھر میں پیسوں کا حساب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ کہنے کے بعد ہماری کیفیت بالکل وہ ہوگئی تھی جو سقراط کی زہر پینے کے وقت ہوئی ہوگی۔

بہرحال ہم وہاں سے یہ سب کہہ کر کھڑے ہوگئے۔ چلتے ہوئے اس کم علم دکاندار سے اتنا اور کہا کہ ہمیں پوری اُمید ہے کہ اب تم ضرور سمجھ گئے ہوگے کہ نشست کیا ہوتی ہے۔ چلتے ہوئے ہم نے اس کی آنکھوں میں جو منظر دیکھا وہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ نشست سے متعلق بہت سے ضمنی سوال اس کے ذہن میں اُتر چکے تھے جس کی غمازی اس کی آنکھیں کر رہی تھیں۔ ہم نے اس کی آنکھوں کی طرف دوبارہ نہیں دیکھا اور گھر آکر بے دم ہو کر پڑ گئے اور دس بارہ سگریٹ لگاتار سلگا کر اپنے ٹوٹے ہوئے وجود کو پھر کسی اور موقع پر ٹوٹنے کے لئے تیار کیا۔

OO

اعجاز وارثی

چنڈو خانے کا مشاعرہ

(۱)

آئی جو چنڈو خانے کے ماحول میں بہار
نشّے کا راگ چھیڑتے ہی ساز بل گئے
بھپکے اُڑے افیون کے کرے مہک اُٹھے
اک بولا، کوئی جشن خرافات چاہیئے
فرمایا دوسرے نے کہ تجویز خوب ہے
مابین شرق و غرب ذرا چہرہ لایئے
قطع کلام کرکے ہوا تیسرا مخل
بزم سخن کی آج ہی بُنیاد ڈالیئے
جم جائے اک مشاعرہ فی الفور، فی البدیہہ
شاعر اگر نہیں ہے کوئی اس جگہ تو کیا
چل جاتا ہے مشاعروں میں تیرے کماں
عینک اگر لگی ہو رفاقت کی آنکھ پر
ہو جائے جشن اگر تو متاعِ حیات ہے
آخر سقول کا دَور چلا، قصّہ مختصر
اک "جی حضور یئے" کو نظامت ہوئی سپرد
ضیغم بنا کوئی، کوئی عصفور بن گیا
بد ذوق ایک ذوق کا پس خُردہ بن گیا
"خود ساختہ" تھے ایک وہ کالج کے سربراہ
بازار وادگی میں جو کوڑی کے تین تھے
[illegible]

ہر چنڈو باز دوش ہوا پر ہوا سوار
مریل پرندوں کو پرِ پرواز بل گئے
طائرِ تخیلات کے سوئے فلک اُٹھے
"تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے"
لیکن رُخِ جناب شمال و جنوب ہے
دو چار چھینٹے آبِ خنک کے لگایئے
کہنے لگا کہ سلسلہ ہو کوئی مستقل
تخیل و فکر و ذہن کے گوشے کھنگا لیئے
آوازیں — کوئی غم نہیں شیریں ہوں یا کریہہ
بندھ جاتی ہے کبھی کبھی نا اہلوں کی ہوا
ہو انتظام داد تو کودن بھی نکتہ داں
بگلہ بھی یاروں کو نظر آتا ہے سیخ پر
استاد ہونا بھی کوئی دشوار بات ہے
صدرالصدور بیٹھ گئے اک تپائی پر
شطرنج کی بساط پہ جو تھا مثالِ "پیدل"
انگوٹھا جو لگاتا تھا "دکتور" بن گیا
مغلوب ایک غالبؔ آزردہ بن گیا
حالانکہ مبتدی بھی نہ تھے پھر بھی خواہ مخواہ
اس اجتماعِ خاص میں وہ سامعین تھے
ہر سمت داد اور ستائش کا شور تھا

مفلوج بحریں ہوگئیں، مصرعے سکڑ گئے
پیراہنِ عروض کے بخیے اُدھڑ گئے

اظہار تمکنت یہ تھا حزبِ واہ وا
شعروں کے ابتذال و تنافر پہ واہ وا

نشہ چڑھا تو لفظوں کے راہی بھٹک گئے
لب وا ہوئے تو ناک میں مصرعے اٹک گئے

پڑھتے ہی پڑھتے دَم بھی لگے ہچکیاں چلیں
اعضا بھی ٹوٹنے لگے، انگڑائیاں چلیں

ناگاہ ایک چیخ فضا میں ہوئی بلند
دیکھا تو فرش خاک پہ تھے صدر ارجمند

پینک کا جھونکا آیا، توازن بگڑ گیا
بوڑھا درخت آندھی میں جڑ سے اکھڑ گیا

چہرہ لہولہان تھا مضروب پسلیاں
ٹانگیں پھنسی ہوئی تھیں تپائی کے درمیاں

ہر چند سارا کھیل بد انجام ہوگیا
بایں ہمہ مشاعرے کا نام ہوگیا

اس حادثے کی جیسے ہی مجھ کو خبر لگی
میری زباں سے نکلا "کسی کی نظر لگی"

○

رؤف رحیم

غزل

جینے کے کچھ اصول نہ مرنے کا ڈھنگ ہے
ہر چھوٹی چھوٹی بات پہ آپس میں جنگ ہے

جب سے سُنا ہے "نظم دی ڈے" افسر" کا حال
کھمبوں سے سب نے باندھ کے رکھا پلنگ ہے

ٹی وی پہ گائے بھینس پکاریں گے روز ہی
اردو زباں سے اس میں زیادہ ترنگ ہے

آیا ہے کیسا دور سیاست میں دوستو
راعی بھی خوش نہیں، رعایا بھی تنگ ہے

آپ اپنے ہاتھ اُجاڑ نہ لیں یہ جنوں پرست
شیشہ کے گھر میں رہتے ہوئے مشقِ سنگ ہے

"اب کے برس میں پائیں گے اردو کے سب حقوق"
سُنتے ہوئے زمانہ ہوا، عقل دنگ ہے

غرباء کے ساتھ لنچ تو امراء کے سنگ ڈنر
گائے کٹا کے سینگ یوں بچھڑوں کے سنگ ہے

واعظ کو میکدے میں جو دیکھا تھا میں نے کل
اُڑتا ہوا جناب کے چہرے کا رنگ ہے

کرسی پہ جب تھے کچھ نہ کیا آپ نے مگر
ہٹ کر پکارنا تو فقط عذرِ لنگ ہے

سرسوتی سرن کیف

رکھتا احسان ادیب کا سرول پر
ریڈیو اور ٹی. وی کے

میں کھانے پینے کے معاملے میں کافی محتاط رہتا ہوں. پھر بھی کچھ کاہلی اور کچھ دنیوی تفکرات کی وجہ سے ادھر دوتین مہینوں سے معدے کی کوئی نہ کوئی شکائت لگی رہتی تھی اور ڈاکٹر نے کہدیا تھا کہ صرف گولیوں اور سفوفوں سے کام نہ چلے گا. اگر ہاضمہ درست رکھنا ہو تو شام کے وقت دوتین میل ٹہلنا ضروری ہے. اب اُدھر تو ڈاکٹر کا نادری حکم ادھر اس کی تعمیل پر کمربستہ بیگم صاحبہ ہزار بہانے بناتا "آج منسٹر صاحب کی تقریب میں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑا" "آج سر میں سخت درد ہے" "آج کچھ اسہال کی شکائت ہے، کمزوری محسوس ہو رہی ہے" وغیرہ وغیرہ. لیکن جب کوئی بہانہ کارگر نہ ہوا تو میں نے خود کو مکمل طور پر بیگم کی مرضی پر چھوڑ دیا. خانگی معاملات میں میں ہمیشہ دیکھتا تھا بیگم صاحبہ ڈسپلن کے معاملے میں کتنی سخت ہیں. کوئی چیز اپنی مقررہ جگہ سے دو فٹ دور پائی گئی اور گھر پر کسی نہ کسی کی شامت آگئی. چنانچہ فوجی سختی کے ساتھ وہ مجھے سات بجے گھر سے گھسیٹتی ہوئی لے جاتیں، دوتین میل سڑکوں پر گھسیٹتیں اور آٹھ بجے گھسیٹتی ہوئی گھر لے آتیں مجھے اپنی صحت کے بارے میں تو نہیں معلوم لیکن اس چکر میں بیگم صاحبہ کے رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی تھی اور میں نے متعا بار یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اب میرے رقیب پیدا ہو جائیں گے. بیگم صاحبہ ہر مرتبہ مسکرا کر مجھے جھڑک تو دیتیں لیکن شام کی جبری سیر کے معاملے میں کسی مدد عائت کے لئے تیار نہ ہوتیں.

ایک شام کو اسی طرح گھسیٹے جانے کے پروگرام کے بعد میں پندرہ منٹ تک صوفے پر مکمل آرام کے خیال سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو آرام کی گنجائش نہ دیکھی. فرید اور بانو دونوں ریڈیو سیٹ کے سر پر سوار تھے. ریڈیو سیٹ سے مجھے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی لیکن جب دونوں مل کر اس کے کان اینٹھتے اور وہ چیختا تو بااستراحت کو گھبرا کر بھاگنا ہی پڑتا. میں دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گیا. جوان بچوں کو ریڈیو سننے سے کون باپ روک سکتا ہے. چنانچہ بڑے دل سے صرف اتنا پوچھا "آج کوئی خاص پروگرام ہے؟"

فرید نے کہا "بہت ہی خاص. بلکہ خاص الخاص"

"کیا؟"

"آج ادیب جہانسوی کا خاکہ اڑایا جائے گا۔"

"کیا؟" میں نے پھر پوچھا اور صوفے سے اُچھل پڑا۔

تفصیل دی گئی کہ ساڑھے سات بجے اعلان کیا گیا تھا کہ سوا آٹھ بجے جناب ادیب جہانسوی ریڈیو پر ایک مزاحیہ خاکہ نشر کریں گے۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وقت ضائع نہ کرو اور اگر ریڈیو سننا ہی ہے تو کوئی اور اسٹیشن لگا لو لیکن یال ہٹ بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے جتنی تریا ہٹ۔ نہ بیگم صاحبہ کو شام کی سیر کرلینے سے باز رکھنا ممکن تھا نہ بچوں کو ادیب جہانسوی کا خاکہ سننے سے۔ اس کے پہلے دو بار ادیب صاحب مجھ سے اصرار کر چکے تھے کہ میں ریڈیو پر ان کا پروگرام سنوں اور میں دونوں بار ٹال گیا تھا۔ بچوں کو آج پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ ادیب صاحب کی بے ادبی براڈ کاسٹ بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے سننے پر مصر تھے۔ غالباً ان کا ارادہ خاکے کا خاکہ اڑانے کا تھا۔

میں بے دلی سے بیٹھا رہا لیکن اناؤنسر نے جس ڈھنگ سے اعلان کیا اس سے میرا موڈ درست ہوگیا اور میں دھیان سے سننے لگا تھا۔ اناؤنسر نے کہا تھا "سامعین! اب حضرت ادیب جہانسوی اپنا نیم مزاحیہ خاکہ پیش کریں گے۔" ظاہر تھا کہ اناؤنسر کا ادبی ذوق قابلِ داد ہے۔ افسروں کی ڈانٹ کا خطرہ اُٹھا کر جو اناؤنسر "نیم مزاحیہ" جیسی اصطلاح استعمال کر سکتا ہے وہ سرکاری پابندیاں نہ ہونے پر ضرور اس خاکے کے لئے "قابلِ تاسف" یا اسی طرح کی کوئی اور اصطلاح گھڑتا۔ خیر صاحب، ادیب صاحب کی جانی پہچانی آواز ریڈیو سے آنے لگی لیکن گھبراہٹ کے ساتھ۔ فرید اور بانو بڑے اشتیاق سے اس پروگرام کا انتظار کر رہے تھے لیکن چار پانچ منٹ ہی میں منہ بنا کر اُٹھ گئے۔ اِدھر میں نے پروگرام سننے کے لئے خود کو جس بے دلی سے تیار کیا تھا اسی درجے کی توجہ سے ادیب صاحب کا خاکہ سننے لگا تھا کیوں کہ خاکے نے میری تحقیق کی رگ پھڑکا دی تھی اور میں انگلیوں پر گننے لگا تھا کہ اس خاکے میں کتنے مزاح نگاروں کی کترنیں استعمال کی گئی ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، پطرس، حاجی لق لق کے جسموں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے سٹا کر رکھ دیئے تھے اور وہ ٹکڑے اپنی اپنی جگہ پھڑک رہے تھے۔ کچھ اور ٹکڑے بھی پھڑک رہے تھے لیکن میرا مزاحیہ ادب کا مطالعہ اتنا نہیں ہے کہ پہچان سکوں کہ ان ٹکڑوں کو حاصل کرنے کے لئے کس کس غریب کی گردن پر چھری پھیری گئی ہے۔ خاکے میں کئی اور خصوصیات بھی تھیں جن میں دو قابلِ توجہ خاص و عام تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ پتہ نہیں چلا کہ خاکے کا موضوع کیا ہے۔ جو موضوع ادیب صاحب نے بتایا تھا وہ خاکے میں ڈھونڈے نہ ملا۔ بلکہ ہوا یہ کہ خاکے میں موضوعات کی بوقلمونی نے مجھے اتنا مرعوب کر دیا کہ ادیب صاحب کا بتایا ہوا موضوع دماغ سے محو ہو گیا۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ خاکے میں مزاح کے ساتھ مناظرِ قدرت کی عکاسی، تصوف کی چاشنی اور تاریخی اور جغرافیائی واقعات اس کثرت سے شامل کر دیئے گئے تھے کہ غریب مزاح کسی گوشے میں دبکا بیٹھا تھا اور گاہے گاہے ہی نظر آتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اناؤنسر نے ادیب صاحب کی جانبداری کی تھی کہ خاکے کو نیم مزاحیہ کہا تھا ورنہ خاکے میں مزاح کا عنصر نیم حکیم سے بھی کچھ کم تھا۔ ویسے یہ بات تعجب خیز نہیں تھی اگر آپ فسانۂ آزاد سے تا بڑ توڑ اقتباس اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر لے لیں کہ اس ناول میں مزاح کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو نتیجہ یہی ہوگا۔

دوسرے روز دفتر میں پھر ادیب صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ میں نے آہ سرد بھری۔ ادیب اسے نظر انداز کرکے بولے
نظامی صاحب! کل رات خاکسار کا خاکہ سنا تھا ریڈیو پر؟"

"جی ہاں . . . . اچھا تھا" میں نے بات ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کوشش میں ناکام رہا۔ ادیب صاحب بولے "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔"

"نہیں تو" میں نے تعجب سے کہا۔ "میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو یہ خیال کس طرح . . . . ."

"اگر آپ صحت مند ہوتے تو اسطرح منہ بنا کر اچھا تھا کہتے؟ راجی صاحب، وہ خاکہ تھا کہ لوگ سُن کر عش عش کرنے لگے
صبح سے اب تک تین ٹیلیفون آچکے ہیں . . . . ."

ادیب صاحب بات کرتے وقت بالکل توجہ نہیں فرماتے کہ بات کس حد تک بے تکی ہے۔ یہ بھی بھول گئے کہ درزی کی جس کھپریل میں رہتے ہیں وہ خود مجھے دکھا چکے ہیں۔ اور اگر اس کھپریل میں ٹیلیفون لگ سکتا ہے تو ایورسٹ پر وہیل مچھلی بھی پائی جا سکتی ہے۔ ان کی اس بد تہذیبی پر بھی برا ماننے میں کوئی تُک نہ تھی کہ اگر کوئی ان کی تعریف نہ کرے تو ضرور بیمار ہوگا۔ پھر وہی تشبیہ دینی پڑ رہی ہے کہ اگر ادیب کے مزاج میں کچھ بھی لطافت ہوتی تو ایورسٹ پر وہیل مچھلی ضرور پائی جاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بلائے آسمانی کو کس طرح ٹالوں تبھی رحمت یزدانی کی طرح ائیر صاحب آگئے۔ ائیر صاحب مقامی انگریزی روزنامہ کلیرین (CLARION) کے نامہ نگار خصوصی ہیں۔ جنوبی ہند کے باشندے ہونے پر بھی بے تکلف ہندوستانی بولتے ہیں کیوں کہ لڑکپن ہی میں دہلی آگئے تھے اور بیس برس دہلی میں گزار چکے ہیں۔ ہمارے شہر میں دو برس سے ہیں۔ حد درجہ ہنس مکھ اور پیارے سے آدمی ہیں۔

ادیب صاحب سے تعارف ہوا تو اپنی بدبختی اور میری خوش نصیبی سے بول اُٹھے "کل رات آپ ہی کا مضمون براڈکاسٹ ہوا تھا!"

اب یہ تو کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بھیڑیے کے سامنے موٹی بھیڑ آجائے تو وہ ہاتھ کے میمنے کو چھوڑ کر ضرور اسے دبوچ لے گا۔ ادیب جھانسوی نے میری جان بخش دی اور ائیر صاحب کو دبوچ لیا۔ ان سے بُری طرح چمٹ گئے اور ان سے چمٹے چمٹے ہی دفتر سے باہر چلے گئے۔

اس کے تیسرے روز کلیرین میں ادیب صاحب کی تصویر کے ساتھ ان پر ایک فیچر بھی دیکھا تو گمان ہونے لگا کہ ائیر صاحب کہیں دار المجانین جانے کی تیاری تو نہیں کر رہے۔ خیر مجھے کیا لینا دینا تھا۔ اگر وہ جہنم میں بھی جانا چاہیں تو میں کیوں روکوں۔ میں اس فیچر کو تقریباً بھول چکا تھا۔ چار، پانچ روز بعد کلیرین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بلدیو شرما سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوگئی۔ ملتے ہی بولے "نظامی صاحب، آپ کی وجہ سے ہمارے ائیر کو بڑی پریشانی اُٹھانی پڑی۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شرما جی نے مفصل حال بتایا۔ چوبیس گھنٹے تک ادیب صاحب ائیر کے پیچھے پڑے رہے۔ دفتر میں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انہیں یقین دلایا کہ "نظامی صاحب میرے بڑے مداح ہیں۔ وہ خود تو آپ سے نہیں کہیں گے لیکن

آپ میرے متعلق فیچر لکھ دیں تو آپ سے ان کے ہی نہیں شہر کے سارے ادبی ثقافتی حلقوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔ میری تصنیفات ہندوستان اور پاکستان کے سارے مشہور جریدوں میں چھپتی ہیں۔" ایڈیٹر اُنھیں جانتے نہیں لیکن چونکہ انھیں آپ کا بہت خیال ہے لہٰذا فیچر لکھ دیا۔ فیچر چھپنا تھا کہ ایڈیٹر مسٹر چکرورتی کے پاس کئی ٹیلیفون آئے کہ وہ ادیب جیسے آدمی پر فیچر دے کر کیا اُردو کے ساتھ مذاق کرنا چاہتے ہیں۔ بنگالی بابو گھبرا گئے اور سارا نزلہ ایئر پر اُتار بیٹھے۔

میں نے کہا "غلطی ایئر کی تھی۔ مجھ سے ادیب کے متعلق بات تو کر لی ہوتی اُنہوں نے"۔

"انہوں نے کہا کہ نظامی صاحب نے ادیب کی کسی بات کی تردید نہیں کی تو میں نے سمجھا۔۔۔۔"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" میں نے بگڑ کر کہا "کل میرا نام لے کر کوئی ہزار روپیہ مانگے تو دے دیں گے وہ؟"

"خیر، غلطی تو ان کی ہے ہی" شرما جی نے کہا "شاید اسی لئے آپ سے کوئی شکایت نہیں کی اُنہوں نے"۔

سننے میں آیا کہ ادیب صاحب نے کسی رشتہ دار سے کچھ رقم ادھار لی اور اس روز کے کلیرین کی سو کاپیاں خریدیں اور مختلف جگہوں پر اپنے متعلق فیچر کے تراشے بھیجے۔ میرے پاس کوئی تراشہ نہیں آیا۔ شاید کسی نے ادیب تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ میں اپنے نام کے مسلسل بیجا استعمال کی وجہ سے ان سے ناخوش ہوں۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس ناخوشی کی وجہ سے ادیب صاحب مستقل طور پر میرا پیچھا چھوڑتے لیکن اس فیچر کے بارے میں خاموش رہنے میں ان کا کوئی نقصان بھی نہ تھا۔

ایک روز ریڈیو کے صیغۂ ادب کے سربراہ جناب بھیم سنگھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ میری زبان سے ادیب جالنسوی کا نام نکلا ہی تھا کہ انہوں نے اس تیزی سے چار پانچ گالیاں دے ڈالیں کہ میں چکرا گیا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ گالیوں کا ہدف میں نہیں تھا ادیب جالنسوی تھے۔ بھیم سنگھ صاحب کے غصے کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ ادب کی اتنی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ادیب جالنسوی کے مقالے نشر کئے جائیں لہٰذا اُنہوں نے ادیب صاحب کی خوشامدوں یا دھمکیوں کسی کا اثر نہیں لیا اور بعد میں یہ نوبت آگئی کہ چپراسی کو سختی سے تاکید کر دی گئی کہ ادیب بھیم سنگھ کے کمرے میں داخل نہ ہو سکیں۔ لیکن ادیب صاحب ہار کہاں مانتے ہیں۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کے گھر جا کر ان کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کی بیوی کو ادیب صاحب پر رحم آگیا اور انہیں دو تین موقعے دے دیئے گئے۔ یہاں تک بات غنیمت تھی۔ اس کے بعد ادیب صاحب ہر ممکن موقعے پر بھیم سنگھ کو چڑانے لگے۔ بھیم سنگھ صاحب بھیم اور سنگھ دونوں ہونے کے باوجود خون کے گھونٹ پینے کے لئے مجبور ہو گئے کیوں کہ ادیب کی باتوں کا جواب سرعام ان کے چار چھ چانٹے لگا کر ہی دیا جا سکتا تھا لیکن ایسا کرتے تو بھیم سنگھ صاحب کی ملازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ بخت سُست وہ کئی بار ادیب کو سنا چکے تھے لیکن ادیب پر اس کا کیا اثر ہوتا؟

اتفاق سے اس وقت مقامی دور درشن کیندر کی اردو پروگراموں کی انچارج مس نیلی براؤن بھی موجود تھیں۔ چالیس پینتالیس برس کی ہشاش بشاش قسم کی خاتون ہیں۔ کہنے لگیں "بھیم سنگھ صاحب، آپ تو انہیں ہر طرح کی گالیاں بھی سنا لیتے ہیں۔ میں عورت ذات ہوں۔ میں کیا کروں ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے؟"

میں مس براؤن سے گاہے گاہے مذاق بھی کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا "مبارک ہو، کوئی تو پیچھے پڑا آپ سکے"

ہنسی مذاق کے دوران اُنہوں نے بتایا کہ ٹی. وی. کے اسٹیشن ڈائرکٹر کے پیچھے پڑ کر ادیب جھانسوی نے اپنا انٹرویو بھی ریکارڈ کرالیا ہے۔ چوں کہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں انٹرویو کرنے کے لئے کوئی شاعر یا نقاد تیار نہیں ہوگا لہٰذا مس براؤن کو خود ان کا انٹرویو کرنا پڑا. شروع میں مس براؤن نے پروگرام کی کامیابی کو مدنظر رکھ کر سنجیدہ سوال کئے لیکن چوں کہ ادیب کی ادبی واقفیت تقریباً صفر ہے اس لئے کسی سوال کو سمجھے تک نہیں، صحیح جواب کیا دیتے. بعد میں مس براؤن کا موڈ بھی اکھڑ گیا اور اُنہوں نے مضحکہ خیز سوالات کئے جن کا ادیب صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا. مس براؤن کو ادیب صاحب سے زیادہ اسٹیشن ڈائرکٹر پہ غصہ تھا. وہ چاہتی تھیں کہ ان کی خبر لی جائے لیکن مجبور تھیں. آخر کار ان کی ماتحت ہی تھیں۔

" شاید میں آپ کی خواہش پوری کرسکوں" میں نے کہا "ٹیلی کاسٹ کس روز ہے؟"

" اگلے منگل کے روز"

نیلی براؤن سے کی ہوئی بات چیت کے باوجود میں ادیب صاحب کا ٹی. وی انٹرویو بالکل بھول چکا تھا. ویسے بھی میری ٹیلی وژن رکھنے کی نہ حیثیت تھی نہ خواہش کیوں کہ خریدا اور بالا دونوں کی کتابیں طاق پر رکھوانے کا کوئی ارادہ نہ تھا. چنانچہ گھر میں ٹی. وی. سٹ تھا ہی نہیں اور کسی دوسرے کے ہاں کیوں جاتا ادیب صاحب کی صورت دیکھنے! لیکن ع

اتفاقات ہیں زمانے کے

منگل کی شام کو کسی کام سے نظر صاحب کے گھر گیا اور ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں رنگین ٹی. وی سٹ دیکھا تو ادیب صاحب یاد آگئے. میں نے نظر سے ادیب کے انٹرویو کا ذکر کیا تو وہ بھی مشتاق ہو گئے. پروگرام دیکھنے کے لئے. ہم لوگوں نے بڑی ہنسی خوشی اور بڑی ژرف نگاہی سے پروگرام دیکھا.

پروگرام کے بعد میں نے کلیرین کو فون کیا. اتفاق سے ایڈیٹر مل گئے میں نے کہا "ایڈیٹر صاحب! آپ اس روز کی خفت دور کرنا چاہیں تو ساقط قلم اُٹھائیں اور جو میں بولوں اسے شارٹ ہینڈ میں لکھ لیں۔"

صبح کو کلیرین میں میرا بولا ہوا تبصرہ ایڈیٹر صاحب کے نام سے چھپا جس میں ادیب جھانسوی کے "ٹی. وی." پروگرام کی تواضع کی گئی تھی. تفصیل سے تو کچھ نہ معلوم ہوا لیکن سننے میں آیا کہ دو روز تک دوردرشن کیندر کے ڈائرکٹر صاحب روتے رہے اور تین روز تک ادیب جھانسوی ہر منگل پہ جھاگ اور آنکھوں میں آگ لئے دوڑتے رہے۔

اپنے اندر کسان کا دل رکھتے ہیں



آندھرا پردیش کے کسان ریاست کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاستی حکومت نے مسٹر این۔ٹی۔ راما راؤ کے زیر قیادت کاشتکاروں کی ہمہ جہتی ترقی اور اضافہ پیداوار کے لئے کئی ترغیبات دیئے ہیں۔ ان ترغیبات کے نمایاں خد و خال ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

سال ۸۵۔۱۹۸۴ء کے دوران موازنہ میں زراعت کے لئے ۱۱۷ کروڑ روپے مختص کئے گئے۔

۸۴-۱۹۸۳ء

زرعی پیداوار کی معقول قیمت مقرر کی گئی۔

کم تر درجے کے تمباکو کو فروخت کرنے کے لئے کسانوں کو ۲ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔

۳۶۸۱۰ ٹن اعلیٰ قسم کے بیج فراہم کئے گئے۔

مقامی بیج کے بدلے میں ۱۶۳ ٹن زیادہ پیداوار دینے والے بیج مہیا کئے گئے۔

۶٫۹۹ لاکھ ٹن کیمیائی کھاد تقسیم کی گئی۔

محکمہ جاتی قرض ۴٫۷۰ کروڑ روپے کو آپریٹیو اداروں اور بینکوں کے توسط سے ۲۱۵ کروڑ روپیوں کے قلیل مدتی قرض فراہم کئے گئے۔

موسم خریف کے لئے فصل کی بیمہ اسکیم میں ۲۰۶ تعلقوں کو شامل کیا گیا، موسم ربیع کے لئے فصل کی بیمہ اسکیم میں ۱۱۶ تعلقوں کو شامل کیا گیا۔

۸۵-۱۹۸۴ء

۴۰ ہزار ٹن اعلیٰ قسم کے بیج سربراہ کئے جائیں گے۔

بیجوں کے تبادلے کے پروگرام کے تحت ۸۰ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

۹٫۲۵ لاکھ ٹن کیمیائی کھاد تقسیم کی جائے گی۔

۵ کروڑ روپے محکمہ جاتی قرض کے طور پر کسانوں کو دیئے جائیں گے۔

فصلوں کی بیمہ اسکیم کو جاری رکھا جائے گا۔

جاری کردہ:

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حیدرآباد

آندھرا پردیش

DIPR 12045/ ADET/C4 /84 DATE: 21-6-1984

ڈاکٹر سمیع بن سعد (العراقی)

غالب کے نقطے شوشے

؎ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

خود تو عمر بھر تنگ دست اور مقروض رہا اور مقروض ہی مرا۔ لیکن ہزاروں کی روزی روٹی کا سامان مہیا کر گیا۔ اگر وہ شعار تخلیق نہ کرتا تو وہ بے چارے محققین و ناقدین و مفکرین کیا کھاتے جو اس کی پیدائش کے دن اور تاریخ، آباد اجداد بچپن و پرورش۔ شادی بیاہ۔ رہن سہن کھانا پینا مشغلے اعمال و افعال۔ اشعار و خطوط پہ طرح طرح کی بحثیں کر کے بیچارے کم سواد قارئین کو حیران و پریشان کئے ہوئے ہیں اور ناطقہ کا سر گریبان میں ڈالنے پر مجبور کر رہے ہیں اور نہ چوکتے ہیں نہ تھکتے ہیں بلکہ اپنے وارث پیدا کر کے ان کی روزی روٹی کا سامان بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ پہچانا آپ نے یہ نیک بندہ کون تھا۔ جی ہاں غالب۔

زمانہ تحقیق کا ہے۔ آج "جوں" کے دماغ کی رگوں کی بناوٹ میں کام آنے والے ریشوں کے مادہ کے خلیوں کے عناصر ترکیبی کا کیمیاوی تجزیہ جیسے موضوع پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ تو بے چارے غالب نے تو بغیر عینک کے پڑھے جانے والے خطوط اور اشعار کا مذہبی نہیں دل پر مرتسم کئے ہیں۔ پھر ان پر اور اس کی ہر چیز پر اور اس سے تعلق رکھنے اور نہ رکھنے والی ہر چیز پر تحقیق کیوں نہیں ہو سکتی، سو ہو رہی اور دھڑا دھڑ ہو رہی ہے، ہوتی رہے گی اور ہوا کرے گی۔ ؎

"عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"

آج غالبیات ہمارے ادب کا مستقل شعبہ بلکہ کارخانہ روزی سازی بنا ہوا ہے غالب اور متعلقات و غیر متعلقات غالب پر سیکڑوں ہزاروں زاویوں سے تحقیق ہو چکی ہے ہو رہی ہے اور ابھی اس ساحل کے ریت کے چند دانے ہی استعمال ہو سکے ہیں ابھی تو پورا ساحل باقی ہے۔

لاکھوں عناوین ایسے ہیں جن کو راقم ہیچ مدان کی رائے میں تحقیق کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ دنیائے ادب کا نقصان عظیم ہونے کا ڈر ہے۔ اس لئے ہمارے سیکڑوں بہی خواہوں نے اسی میدان میں اپنی طبع کے خچر دوڑانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے

اور یونیورسٹیوں اور سپروائزروں کی روزی روٹی کا بندوبست کرنے کے لئے تحقیق کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مثلاً ایک ماہر غالبیات کا ارادہ ہے کہ وہ غالب اور چکنی ڈلی پر کئی کلو سپاری کے وزن کا ایک نادر و نایاب علمی و ادبی و تاریخی مقالہ لکھے۔ اس میں وہ سب سے پہلے لفظ "چکنی ڈلی"۔ عرف سپاری کے لغوی اور اصطلاحی معنی تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ پھر اس کی اصل کی طرف رجوع کریں گے اور ثابت کریں گے کہ سب سے پہلے حضرت حوّا نے جنّت میں اس درخت کا سراغ لگایا۔ سپاری کو پسند خاطر فرمایا۔ پھر جنّت سے رخصتی کے وقت کسی نہ کسی طرح ایک ڈلی سپاری ساتھ لیتی آئیں اور مغربی گھاٹ پر گرا گئیں۔ جہاں اس کا درخت اُگا۔ چکنی سپاری اسی سپاری کے خاندان سے ہے۔ جنّت میں یہ بڑی خوش ذائقہ خوش رنگ و بو تھی۔ زمین کی ہوا نے اسے سیاہ رنگ میں رنگ دیا اور دوسری قسم کی سپاریاں اس کی نسل سے ہیں وغیرہ وغیرہ اس کے بعد سپاری کی پیداوار، اس کے لئے زمین، آب و ہوا، اقسام اس کے عناصر و اجزائے ترکیبی۔ اس میں وٹامنوں کی موجودگی وغیرہ پر اس قدر تفصیل سے سرچ لائٹ ڈالی جائے گی کہ سپاری والا یہ باب انسائیکلوپیڈیا کی ایک جلد سے کم نہ ہوگا اور ماہرین اسے پڑھ کر دانتوں سے سپاریاں کاٹا کریں گے۔

اس کے بعد سپاری کے متعلقات اس کے بارے میں دنیائے علم و ادب کی آراء اس کے کھانے کے فوائد نقصانات وغیرہ قلمبند ہوں گے۔ اور پھر ان اشعار کے ہر ہر لفظ پر اسی قسم کی تحقیق کر کے حق تحقیق ادا کیا جائے گا اور ہے جو صاحب کے کف دست میں چکنی ڈلی ہے الخ تک وہ وہ نکات بیان ہوں گے کہ پڑھنے والے اپنے سروں پر سپاریاں پھوڑنے نہ لگیں تو تعجب۔ اُن کو یقین ہے کہ جب غالب اور چکنی ڈلی والا مقالہ مکمل ہو جائے گا تو اس کے تن و توش کو دیکھ کر طلسم ہوش رُبا کے ہوش بھی اُڑ جائیں گے۔

اسی طرح ایک نامور محقق سپروائزر نے اپنے ایک شاگرد کو "غالب اور آم" پر تحقیق کی دعوت دی ہے اور اس کی رہنمائی کے لئے وہی خطوط مقرر کئے ہیں جو غالب اور چکنی ڈلی کے ہیں۔ یہ مقالہ بھی آم پر انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھے گا۔ اس میں آم اس کی زراعت، اقسام، اجزاء، وٹامن، فوائد نقصانات وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات ہوں گی۔ یہ مقالہ بھی محکمۂ زراعت اور آم فروشوں میں کافی مقبول ہوگا اور یقین ہے کہ اس کا بھی لائبریریوں میں اچار پڑے گا۔

اسی طرح اساتذہ نے طے کیا ہے کہ غالب کے دیوان میں جس قدر مرئی اور غیر مرئی اشیاء ہیں ان سب پر تحقیق کی جائے اور جو موجود نہیں ہیں، لیکن ہو سکتی ہیں ان پر بھی کی جائے مثلاً غالب نے کلکتہ کا ذکر کیا۔ تو ہندوستان کے دوسرے شہروں نے کیا گناہ کیا۔ غالب اور بھوپال، غالب اور حیدرآباد قسم کے مقالات تو تحریر ہو گئے۔ جہاں غالب نے قدم بھی نہ رکھا۔ اب اس قسم کے مقالات کی باری ہے۔ غالب اور پانڈیچری۔ غالب اور گوہاٹی۔ غالب اور بنگلور۔ غالب اور بن ستائی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ جو باتیں کلام غالب میں موجود ہیں مثلاً غالب اور جیسی روٹی۔ غالب اور سیم کے بیج یا غالب اور دال تو یہ عنوانات بھی رجسٹر ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ تلاش جاری ہے کہ کوئی موضوع باقی نہ رہ جائے۔

پھر کچھ حضرات نے یہ بھی طے کیا ہے کہ وہ غالب پر ماڈرن ریسرچ کریں گے۔ اس کے لئے بھی عناوین کی کمی نہیں۔ مثلاً غالب اور ایٹم۔ ہیڈروجن۔ غالب اور لیسر۔ غالب اور راکٹ۔ غالب اور اسکائی لیب، غالب اور پولو۔ غالب اور اسپیس شٹل

غالب اور مینا سلیمن۔ غالب اور کمپیوٹر وغیرہ کسی کو اگر شک ہو کہ غالب اور ایٹم اور ہیڈروجن پر کیا ریسرچ ہو سکتی ہے تو کیا غالب کا یہ شعر کائنات کے ایک بہت بڑے معمّے کا حل پیش نہیں کرتا ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزر بادِ یاں

اسی میں تو ایٹم، ہیڈروجن، تخلیق کائنات سبھی کی تھیوریاں مضمر ہیں۔ پھر ایسے عنوانات سے یہ بھی تو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ یہ کل علوم ہیں کمپیوٹر، اس کا نظام، اس کے کام، ایجاد، فوائد نقصانات پر پورا مقالہ لکھ دینے کے بعد حاصل مطلب میں یہی لکھا جائے گا کہ غالب نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا آج وہ ہوتے تو اپنے محققین کے مقالوں کو کمپیوٹر میں ڈال کر دیکھ لیتے کہ ان کا ریسرچ سے کیا تعلق ہے کیوں کہ جو جی میں آئے لکھ دینے لایعنی لاتعلق باتیں لکھ دینے کا نام ہی تو آج کل تحقیق ہو گیا ہے۔

اسی طرح "غالب اور شراب" کے عنوان سے ایک مقالہ رجسٹر ہوا ہے۔ یقین ہے کہ اس میں لفظ شراب کی تحقیق تو ہوگی ہی لیکن دنیا بھر کی شرابوں کا تفصیلی ریماد، مخمورانہ انداز میں ذکر بھی ہوگا۔ اس میں دیسی بدیسی کھوپڑی، مہوا، گڑ چھال، جانی واکر، ہاتھ بھٹی کی، کارخانہ کی انگریزی وسکی، رم، جن وغیرہ پر مکمل معلومات درج ہوں گی۔ جس سے شرابی، بار میں، شراب ساز وغیرہ استفادہ کریں گے۔ اس میں غالب کا ذکر صرف اس قدر ہوگا کہ وہ شراب پیتے تھے اور وہ بھی ترمن کی پیتے تھے۔ عالم سرور میں شعر کہتے تھے وغیرہ وغیرہ غالب اور شراب کا یہ تعلق صفحہ دو صفحہ پر محیط ہوگا۔ باقی تمام دفتر غرق مے ناب رہے گا کیوں کہ حاصل مقالہ شراب ہوگی۔ اس کا خمار قارئین کے دل و دماغ پر بے مدتوں نہیں اترے گا۔ رہے صاحب مقالہ تو وہ عملاً تحقیق میں مصروف رہے ہوں گے۔ اس لئے فردوس میں شراب طہور کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔

غالب پر یہ اور اس قسم کے ہزاروں عنوانات پر مقالے تحریر ہوتے رہیں گے۔ راقم ہیچمدان نکتہ دان بھی غالب پر ایک نئے نقطۂ نظر سے تحقیق کا ارادہ رکھتا ہے۔ راقم "غالب کے نقطے شوشے، مرکز، جھٹکے، زیر زبر پیش، جزم، تشدید، مد، حروف" کے عنوان پر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اس میں غالب کی مطبوعہ غیر مطبوعہ، منقولہ غیر منقولہ، معلوم نا معلوم موجود نا موجود ہر قسم کی تحریروں میں استعمال شدہ نقطوں، شوشوں، مرکزوں، جھٹکوں، زیر زبر، پیش، جزم، مد، تشدید وغیرہ کو شمار کرکے ان کی فریکوینسی، استعمال، خصوصیات ان کے ہونے نہ ہونے کے فوائد، نقصانات اہمیت، ادب میں اضافہ وغیرہ پر مفصل بحث ہوگی۔

بطور مثال نقطوں کا باب لیجئے۔ اس میں اس امر پر اظہار خیال ہوگا کہ نقطہ کیا ہے، اس کی اصل کیا ہے، کہاں سے آیا کہاں جائے گا۔ کس کی ایجاد ہے۔ غالب کے کلام میں کتنے نقطے استعمال ہوئے ہیں۔ کتنے نہیں ہوئے۔ کتنے ہو سکتے تھے۔ کتنے لکھے گئے، کتنے نہیں لکھے گئے، چھاپے گئے، اڑ گئے، بڑھائے گئے، باریک کتنے، موٹے کتنے۔ نقطوں نے کتنا سیاہی اور کتنا کاغذ خراب کیا۔ کاتب کتنے کھا گئے، کتنے روپے صرف نقطوں پر ضائع ہوئے۔ نقطے نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ غالب بے نقطہ سناتے تو کیا ہوتا۔ اور کیا حرج تھا۔ بے نقطہ کے نمونے میر جعفر زٹلی سے لے کر موجودہ زمانے تک، وغیرہ وغیرہ تمام

ہر چیز میں نکتہ پیدا کیا جائے گا۔ بال کی کھال پر کے بال کھینچے جائیں گے۔ ہر ہر عنوان پر ایسی ہی تفصیل سے کام لیا جائے گا کیونکہ مقالہ جتنا ضخیم ہوگا ممتحن اسی قدر مرعوب ہوگا اور اس کی ہر جلد یونیورسٹی کے کلرکوں کی نشست کے بخوبی کام آئے گی اور اس کی ہر ایک قدر کرے گا۔ میں اس مقالہ میں ثابت کردوں گا۔ غالب سے بڑھ کر نقطہ داں، نقطہ شناس، شوشہ چھوڑنے والا۔ اور حروف استعمال کرتے والا کوئی نہ تھا۔

پیارے قارئین ۔ آپ کو یہ اچھوتا عنوان ضرور پسند خاطر آئے گا۔ ایسے عجیب و غریب عنوانات کی آج کل کافی بھیڑ ہے۔ ذرا ہماری یونیورسٹیوں اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹوں میں زیر تحقیق عنوانات پر ایک نظر تو دوڑائیے کہ کیا جہانِ معنی آباد ہے اور ان میں غالب کو کسی طرح چیرا اور ادھیڑا جارہا ہے اور کس طرح غیر متعلق باتوں پر تحقیق کے نام پر قلابازیاں کھائی جارہی ہیں اور پھر مقالات کو بھی تو دیکھیے کہ کس طرح لکھے جارہے ہیں۔ اور تحقیق شدہ مقالات پر بھی نظر ڈالئے کہ کیا کیا نئی دریافتیں ہورہی ہیں۔

راز سنتوکھسری

جدید پنجابی نظم میں
طنز و مزاح کا رنگ و آہنگ

جب سے اِنسان نے دُنیائے آب و گِل میں چشمِ ہوش وا کی ہے، وہ ہنسا بھی ہے اور رویا بھی۔ ہنسنا اور رونا ایک سکّے کے ہر دو رُخ سمجھئے، جیسے مزاح اور انسان دکستی لازم و ملزوم ہیں۔ مزاح سے خالی انسانیت بے معنی ہے اور پُر مقصد انسانیت کے بغیر مزاح کی تخلیق ممکن نہیں۔

چند سال پیشتر امریکہ میں اسی امر کا جائزہ لیا گیا تھا کہ ایک امریکی شہری اوسطاً ہفتے میں کتنی بار ہنستا ہے۔ مکمل جائزے کے بعد پتہ چلا کہ ایک امریکی شہری فی ہفتہ اوسطاً دو بار ہنستا ہے۔

تین سال قبل ہندوستان کے معروف و منفرد طنز و مزاح نگار ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کا اس ضمن میں جائزہ جملہ اخبارات میں طبع ہوا جس پر مشہور کارٹون بنانے والوں نے بے شمار کارٹون بنائے۔ ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر نے اپنے جائزہ میں یہ انکشاف کیا کہ ہندوستان میں طنز و مزاح روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی تسلیم شدہ زبانوں میں سب سے زیادہ لطیف مزاح اُردو میں ملتا ہے۔ دوسرے نمبر پہ پنجابی میں۔ تیسرے نمبر پہ مراٹھی میں، چوتھے پہ تامل اور پانچویں پہ بنگلا زبان میں ہے۔ جہاں تک ہندی زبان کا تعلق ہے وہ مزاح سے تقریباً تہی دامن ہے۔ ہندی کے بعض بہی خواہوں نے دوسری ریاستی زبانوں سے مزاحیہ تخلیقات کے تراجم ہندی میں کروائے ہیں۔ لیکن ہندی میں طبع زاد مزاح کی بے حد کمی ہے۔

ہندوستان کی جملہ ریاستوں میں سب سے زیادہ زندہ دل لوگ پنجاب کے ہیں۔ وہاں اکثر لوگوں کا یہ مقولہ ہے:

کدی ہنس دے منّا، کدی کھیڈ دے منّا
اِس جگ نہیں آؤنا ایہیں پھیر دے منّا

یعنی جب تک دُنیا میں رہیئے، جشنِ شادی منائیے ماتم اور گریہ و زاری سے پرہیز کیجئے۔

پنجابی طنز و مزاح زیادہ تر غیر مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ مطبوعہ صورت میں اس کا دسواں حصہ یا اس

سے بھی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ عوامی ادب جس کا قابل قدر سرمایہ عوامی "بولیاں" ہیں مزاح سے مالامال ہے لیکن ان "بولیوں" کو اب تک بھی ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ طنز و مزاح سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے جس کی ایک ایک سطر اس لازوال سرمایہ سے مالامال ہے۔

جدید پنجابی طنز و مزاح کا آغاز انیس، ایس، چرن سنگھ شہید نے کیا۔ چرن سنگھ نے زیادہ تر نثری ادب تخلیق کیا ہے لیکن منظوم صورت میں بھی طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ان کی دین معتدبہ ہے۔ چرن سنگھ اس ضمن میں "جلّن جٹ" سے بے حد متاثر ہوئے۔ جلّن جٹ موضع سرسنگھ ضلع امرت سر میں قیام رکھتے تھے ان کے منظوم اقوال لوگوں کو اب تک زبانی یاد ہیں "ہسٹری آف پنجابی ہیومر" کے صفحہ ۳۸ پر مولف ایس۔ ایس سروج نے جلّن جٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ وہ ایک جاٹ تھا، اس لئے رب العالمین کے بہت قریب تھا۔ لیکن ہر ایک جاٹ ربّ کو اُس وقت یاد کرتا ہے جب اُسے اور کوئی کام نہ رہے۔ چنانچہ جلّن کا قول ہے کہ :

نکّے ہندے ڈھگے، وڈّے ہوئے ہل واہیا
بڈّھے ہوئے بالا بھیری، ربّ دا اُلا نجا لاہیا
وڈّا ٹبّر دَ ڈھکے جپ مال بنایا
اُچّے بُتے بہہ کے ٹھاہ ٹھاہ وجایا
لوکاں دیاں جپ مالیاں، جلّن دا جپ مال
ساری عمر جپیندیاں، اِک نہ کُھتّا وال

جلّن جٹ کا تجربہ کرامات سے کچھ کم نہ تھا۔ اناج کی اہمیت سے پاکستان واقف ہے یا گرسنہ لوگ۔ جلّن نے اناج کا تجربہ صوفیانہ انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

بُھکّے دے منہ پاؤنا ایں، دشمن ہے تیری کھٹّی
دِھیاں پُتراں تے لادنا ایں، بھریں سنا دی چٹّی
رَجے دے مُنہ پاؤنا ایں جلّنا، جیوں مجھ ملیدے تھٹّی
ہمتیں دے اِی اِے ہمتیں لئی اے ہمتیں ہینئے ہتّے
اَیسا کوئی نہ جلّنا جو موشیاں نوں گھتّے
اَنّ ڈیہٹی، اَنّ لاڑھا، اَنّ دا دِیاہ سارا
اَنّ موٹا، اَنّ گاڑھا، اَنّ رووے اَنّ ہسّے
جلّن جس گھر نہ تکّے اَنّ، نہ کوئی رووے نہ کوئی ہسّے

جنّت اور دوزخ کے متعلق عوامی ذہن میں کوئی صریح نظریہ نہیں۔ بعض غلط فہمیوں کا لوگ شکار ہیں جلّن کے خیالات

سلسلے میں واضح ہیں،

نرک بھی جھوٹھا، سُرگ بھی جھوٹھا، جھوٹھے بھجن بارے
ایسی بات کو جو ہم جھوٹھ کہتے ہیں، کھلّر پئے سناوے
جَلّن داسس کو لے گئے اندر دریا رے
جَلّن ساکھی ہے جو کچھ ہر دے میں دھارے
بالک اوسا چینک ہاس ہاس جگ ڈھکتی آوے
پانچ ڈنٹ کو مار لویں بھی کدے نہ آ دے
کر بہتکاری آپنے، کوئی وبیر کر نہ آ دے
مُردہ دکھنی لے گئے، جنہے کہاں آ دے
جَلّن پرکی بھگت بن سُکھ کیسے پاوے

"ستھرا شاہ" گورو گوبند صاحب کے دربار میں ایک مسخرہ تھا۔ اُس نے نام نہاد سادھوؤں پر طنز کیا ہے:

لوک ڈرادن کارنے، کئی تیّں بھیکھ بنایا
بنر اُدھم ٹکڑا کھاونا بابا نام سدایا
جیوں جیوں چڑھن شیرنیاں، تیوں تیوں وعدا یا
دے دعائیں کُھلیاں، اگلی گل نہ کا

لاشبہ ہم ایس۔ ایس چرن سنگھ شہید کو جدید پنجابی مزاحیہ شعری ادب کا بانی تسلیم کرتے ہیں۔ اُنہوں نے پنجابی ادب اور زبان کو مقبول بنانے کے لئے کوی درباروں (مشاعروں) کی وساطت سے اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا مظاہرہ کیا۔ جو لوگ پنجابی زبان سے ناآشنا تھے اُنہوں نے بھی اس کا علم حاصل کیا جو شہید کی ترغیب و تلقین کا نتیجہ تھا۔ اُن کا اخبار "موجی" جو خالصتاً طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات شائع کرتا تھا عوام میں بے حد مقبول ہوا۔ اُن کی بہترین طنزیہ و مزاحیہ منظومات پر مشتمل ان کا مجموعہ "بادشاہیاں" ہے۔

ہمارے معاشرے میں عورت کی نسبت لوگوں کا عام طور پر اندازِ فکر بے حد پست ہے۔ لوگ اُسے "پاؤں کی جوتی" کہتے ہیں۔ چرن سنگھ نے اس قماش کے لوگوں کو منہ توڑ جواب دیا ہے:

جگ وچ بھی بھوت سب کیوں جُتّی اگے بھجدے نے
جُتّی پناں کہڈ آدمی کدی نہ بندے بے پج دے نے
اِس دا مطلب اِہو نکلیا، جُتّی ہو یار تسیں
رب نہ کرے کہ جُتّی نیہرے، جُتّی جگ وچ تھیپڑی آ دے

نا ری نوں جو مُتی آکھن، اُہ خود بھی اِک چھترنے
جیہہ اُنہاں دی گُتی ہے تے عقل اُنہاں دی گُتی ہے

چرن سنگھ شہید نے گدھوں کی مثال کے ذریعے فطرتِ انسانی کا خاصہ بیان کیا ہے۔ کئی بار ہم خوشحالی اور فارغ البالی کے حصول کی خاطر گدھوں کی مانند اپنی قدر و قیمت بتدریج کم کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر ہماری کوئی قدر و قیمت ہی نہ رہے تو چاہے امیر کبیر بھی ہو جائیں، وہ امارت کس کام کی؟!

سرشٹی دے آرنبھ وِچ من کھوتے بڑے سیانے
اِنہاں توں من عقل سکھدے ہنڑی راجے رانے
اِک پرکھ لے پال رکھے من بنجی کھوتے موہنے
چنویں مدتی مان سبھے نیتی وان من موہنے
تر توں بے عقلی دا ڈھنیہ گدھیاں نوں ہے لگا
کیونکہ سوار تو دس اُنہاں چوں پرکھوئی بنیا ڈھگا

ایک شانتی سروپ سنت (سراپا انکسار زاہد) کو شہید نے لوں ہدفِ ملامت بنایا ہے :-

شانتی سرُوپ نام ہے اُس دا رکھے پُورن شانتی
اتِ گنبھیر دھیر تے ہمز ستیل ہے ہر بسانتی
مَیں بھی کہا مَنا اِچل درشن مہا پرکھاں دے پائیے
نالے اُس دی شانت ہزتاؤں دی کجھ اندا لیئے
لوک سینکڑے بیٹھے تن ہریں جا آدیس اُچارسی
مہاراج! کی نام آپ دا؟ ہتھ بنھ عرض گذاری
ذرا اُکُ تلخی نال تک کے بولنے بھگت پیارے!
شانتی سرُوپ نام ہے میرا دسیا ہے سو وار ے
چھیویں ستویں وار جدوں پھر پرشن اُہی مَیں کیتا
پھر تاں ماتو نگ گیا جھٹ خشک پروڈ پلیتا

چرن سنگھ نے "پہل" (اولیت) کو بے حد اہمیت دی ہے۔ لامحالہ کامرانی اُسی کو نصیب ہوتی ہے جو کام دوسروں سے پہلے شروع کرے۔ کاہل اور اپنے فرض سے غافل انسان زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں:

جالندھر دے ہسپتال اِک بُڈھو کھوتا لیایا
ڈاکٹر نے دیکھ بیماری نسخہ لکھ پکڑا اُس

کہن لگا اوہ چیزاں بیہہ کے اک نلکی وچ پائیں
نلکی ایس نال دی راہیں مہیلں مغز تہ بچ جاوے
تیرے ای کھوتے نوں مڑ ال گھوڑے وانگ بناوے
کچھ چرپچھوں لھوئیں کھوول کردا مڑ ہوڑ کے آیا
بجّو وانگوں بُرا ادی نے ہے سی مُنہ بنایا
کہن لگا ہتکورے لے کے جو چیزاں سب لٹیاں
پیس پوس کے چھان چھوٹا کے میدے وچ ہوگئیاں
نلکی وچ پا، نلکی اُس دے نتھنے دچ ٹکائی
دوجی طرفوں پھوک لان ہِت میں نلکی منہ وچ پائی
میری پھوکوں پہلاں ہی جا پھوک اوس نے ماری
میرے گل دے اندر دھس گئی جھٹ دوائی ساری
اللہ بخشے پھوک اوس دی وانگ ہنیری آئی
نلکی دی لنگھ جانی سی ہیں پھڑکے نال بچائی
جہدی پھوک دیچ جاوے پہلاں جت اوس دی کہندے
تیرے جیسے سُست نکھد رہنے نعل رعں کردے رہندے

چرن سنگھ شہید کی بہترین نظم "میلہ دیکھنے کے لئے جانا دس دیہاتیوں کا" ہے۔ اس میں میلہ کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کا ہر ایک مصرع ایک کہانی بیان کرتا ہے :-

دساں بینڈوداں تائیں وساکھی دا چڑھیا چا
ڈباں وچ روپیے بنھ کے گئے شہر تول دھا
پیسے دے کے چڑھے یگوڑے ایسے آئے بھوں
اک نوں اوتھے ہی نش پے گئی، باقی رہ گئے نوں
نواں دوستاں اگے جا کے کیلے کھادے سیتھ
اک نوں تے آن آن لگیاں باقی رہ گئے آٹھ
آٹھاں نے دل پتیا دا تے ٹھنڈی ہو گئی اٹھ
اک نوں پھڑ لے گیا سپاہی، باقی رہ گئے ست

دوہاں متنددوں روٹی کساد ھی دِتی کیتی جس ہِکّ
اک نوں لگ گئے دست او تھے ہی باقی رہ گیا اِکّ
اُس دی ڈبیاں کسے اُچکّے پیسے لیتے کھول
بیدل تُر کے گھر پہنچاتے لگا د جادن ڈھول
"لوکو! میلے نہ جانا، ہے اُتھے دُکھاں دی فوج
"ستھرا" میلے کدے نہ جاندا، تھرے بھوگدا فوج

چرن سنگھ "ستھرا" تخلص کرتے تھے۔ کیا مزاح نگار درحقیقت غم سے اس قدر بیگانہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ خنداں وفرحاں رہتا ہے؟ اکثر مزاح نگار بقول گرنام سنگھ تیر "سنسان کالیاں راتاں وچ میں روندا روندا ہسدا ہاں" اپنے مصائب ہی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ کسی شخص نے "ستھرے" سے اِس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کو کہا تو اس نے دوٹوک جواب دیا:

اِک بندے نے پُچھیا، ستھرے! توں نِت ہسدا دِسدا ہیں
خبرے جگ تے توں کی تکھیا، کدے نہ روندا دِسدا ہیں
مَیں ہس کے کہیا انجانے توں بے شک میں نوِتّ رہندا ہاں
ذرا ذرا گل پچھے رو رو نِت ہنجھے نہ لیہندا ہاں
سُہندا ہاں تاں سب نوں دس کے، روندا ہاں تاں لُک لُک کے
کراں بچکراں اڈیاں چک چک دردوندا داں جھک جھک کے

ہر بات کی اِنتہا نقصان دہ ہے۔ اس نکتے کی نسبت چرن سنگھ کا لطیف طنز ملاحظہ کیجئے۔

کہندے اَتّ تماہے احمق تے اَت مدّھرا فتنہ ہے
اَت موٹاہے حلوہ کدّو، تپلا کرلی جتنا ہے
اَتّ مہنگائی، اَتّ سستائی، اَتّ کنگالی ماڑی ہے
اَتّ چستی، اَتّ سستی، اَتّ خوشحالی ماڑی ہے
اَتّ نال ہے ویر ربّ دا، اَتّ مُکّت با مَتّ بُری
"ستھرے" ہر گل گبھلی چنگی، اَتّ بُری، بھئی اَتّ بُری

سردار ایشر سنگھ "بھاپیا" نے جدید پنجابی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں بہت بلند مقام حاصل کیا ہے۔ وہ گجرانوالا کے رہنے والے تھے۔ ان کا جنم ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اُن کے کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ہیں جن میں سے "بھاپیا" "دھرمی بھاپیا" "رنگیلا بھاپیا" "نوّاں بھاپیا" "گُرسکھ بھاپیا" وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔ مذہب کا جو غلط روپ آج کل پیش کیا جاتا ہے اور اس روپ کا جو ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اُس کو بھاپیا نے کیا خوب [illegible]

کبے پائی ساڑھی تاں مذہب نوں خطرہ
کبے تھبی داڑھی تاں مذہب نوں خطرہ
کبے اِٹ اُکھاڑی تاں مذہب نوں خطرہ
اِہ مذہب نہ ہویا، ہوئی موم بتی
پگھل گئی فوراً لگی دُھپ تتی

بھاپا جی کے طنز سے محبت کا سا لطیف جذبہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ کیوں کہ بھاپا جی کے خیال میں محبت میں سے صداقت و خلوص کا عنصر غائب ہو چکا ہے:

پریم اج کاہدا ہویا پانی تے لکیر ہے
جنا کھنا رانجھا اتے جنا کھنا ہیر ہے
حُسن چھپ گیا ہے، حُسن دی لالی وِچ
چاہ "اِشیر" ڈُب گئی ہے چاہ دی پیالی وِچ

بشیر سنگھ "بھاپا جی" کے علاوہ "اِبشیر" تخلص کا استعمال بھی کرتے تھے۔ آخری تک (مصرع) میں لفظ چاہ پہلے مقام پر محبت کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ چائے کے مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے:

بھاپا جی نے فرسودہ رسومات کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنی نئی نویلی دلہن کو بھی معاف نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو دلہن کی سج دھج اور اس کے خیر مقدم کا منظر:

ڈولی وچوں نکلی میری دُلہنی رانی
اس نوں دیکھن آ گئی سب اُمتی کانی
اپنی قسمت دیکھ کے میں کھڑ کھڑ ہستاں
داج لے آندا اوس نے ہکی گن گن دستاں
دو ہاتھی، دو اُونٹھ سن کنجھ سوہنے طوطے
دو گیدڑ، دو شیر سن، دو کالے کھوتے
اُہ ریڑدے بنے من پر جا بیٹے دارے
جس بنائے سن اوس نوں جا بیٹے بلہارے
کالا اُس دا رنگ سی پر گوری دل دی
مہندی رہندی جیوں کوئی کلی ہے کھلدی

بھابو دا اُس آوندیاں ہاویں منّو ٹھپیّا
ذرا جے اکّوں بولدی جھٹ گتّوں پھڑیا

دَورِ حاضرہ کی سیاست کو ہدفِ طنز بناتے ہوئے ابن الوقت سیاست دانوں پر کس لطیف انداز میں چوٹ کی گئی ہے اشعارِ ذیل میں دیکھئے :

نہ کانگرس، نہ جن سنگھی، نہ میں کوئی اکالی ہاں
رگڑ جا ناداں ڈر دتّے کے جھکّوں بلدی کلائی ہے
میں اِک لوٹن کبوتر ہاں، کئی میں بازیاں لا داں
میں جھجرّو ہاں مداری دا، میرے ہتھ وچّ صفائی ہے

بھابیا کی مزاحیہ نظم "بھابیئے والمرنا" (انتقال بھابیا کا) اُن کی شاہکار منظومات میں سے ہے۔ اور پنجابی کے مزاحیہ شعری ادب میں بھی خاص مقام کی حامل ہے۔ اس بے حد نازک بلکہ جان لیوا موضوع پر بھابیا کی طبع لطیف اور تخیّل کی بلند پروازی ملاحظہ کیجئے :

رات دا پچھلا پہر سی میں اَنت گھبرایا
دہی سُتّی پئی سی، اُس تا میں جگایا
ڈُبدا میرا جا رہا سی دل وچارا
تڑپ رہا سی اس طرح جیوں تڑپے پارا
گدڑاں نوں میں دودھ کے ڈرپوک گھنیرا
دہی رو رو آکھدی، ہائے ڈُو لیا شیرا

ماتم اور گریہ و زاری میں مصروف عورتیں متوفی کو "ہائے ہائے شیرا" کہہ کر یاد کرتی ہیں۔ یہ سُنتے ہی بھابیا کی حسِ ظرافت پھڑکی :

ناں جد سُنیا شیر دا ہنسوں آ گیا ہاسا

پاس پڑوس کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ اس بزمِ ماتم میں خوب رنگ جما :

تڑکے ساریاں آ گئیاں کجھ بُڈھیاں بُڈھیاں
پٹ پٹ جنہاں حسرتاں سب دل دیاں کڈھیاں
یا پا لمبے وَین کہندیاں ہائے ہائے شیرا
رو دن اپنے گھراں نوں ناں لے لے میرا

بڈیاں دی اک مُٹھ سال میں تولہ ماسہ
ناں جدشنیا شیر دا سینوں آگیا ہاسا

بھابڑیا کوئی ایرا غیرا تو تھا نہیں، آخر شاعر تھا۔ شعر جیسے فن لطیف کا خدا بھی قدردان ہے، اس لئے خدائے ذوالجلال کی طرف سے بھابڑیا کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔

میرے سواگت لئی رب آپوں آیا
میری حضوری ہر فرشتے آسیس جھکایا
پورا سی پر بندھ رہی نہ کوئی خامی
اِک سو اک توپاں دی دِتی گئی سلامی

خدائے لم یزال خود استقبال کے لئے موجود تھا، فرشتے سربسجدہ ہو رہے تھے۔ شاعر اور فن شعر کی نسبت قادرِ مطلق نے یوں گوہر فشانی کی:

رب نے کہا: کوئی ہے اس تے ناز ہے مینوں
کونا چ چھپیا دسدا قدرت دا راز ہے مینوں
کوتا مینوں جگ دے وچ ہے سب توں پیاری
کوتا دے بل تے کھڑی ہے خلقت ساری

بھابڑیا کی بعض مزاحیہ شعری سطریں لوگوں کی زبان پر چڑھ گئی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے:

جس دی کوٹھی دانے، اہدے کملے دی سیانے
کاٹھ دی ہانڈی وار وار نہیں چڑھدی چلھے
اک لون کی روٹی اپی، اوت گیا ای آوا
کولے دی دلالی وچ منہ کالا
اکھیں ویکھے تے کتا چٹے، آنا گھٹے کر نہ گٹے
چوڑی دوہاں دی سوہنی ربّی، اوہدے گل بدھی ٹلی

عصر حاضر کی سیاست اور سیاسی لیڈروں کی قلعی کھولتے ہیں بھابڑیا نے فنکارانہ اخلاقی بیباکی کا ثبوت دیا ہے:

میں آج دا نواں عاشق نہیں جم توں پہلاں عاشق ہاں
میرا عاشق پیو دادا، میں عاشق خاندانی ہاں
میں کتیا ہندا ہندو دانے کونڈا کیتیا مسلم دا
اہ سب میرے کرشمے نے میں ہر فتنے دا بانی ہاں

مذہب میرا دغابازی، سمگلنگ میرا پیشہ ہے
نہ ہندو، سکھ، مُسلم ہاں، یہودی نہ قرانی ہاں
جے باسرول دیکھو دِستاں وال روپیہ چپا دَھدھ ڈگا
تے دِچوں میں گھسی پٹی ہوئی کھوٹی چوانی ہاں
کئی پچھدے نے بھائیا جی! تُہاڈی ذات کیہڑی اے؟
میں کہنا داں کہ لیڈر ہاں، مرد ہاں نہ زنانی ہاں
تناں سالاں دی کٹ کے جیل ہُنے آیا اوُدھاں وچ
یونیورسٹی سوا بی۔ اے، عالم فاضل تے گیانی ہاں

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے بھی مزاح نگاری پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اکثر اُنھوں نے نظم مُعرّا کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صنفِ نظم میں مزاح نگاری اثر آفرین نہیں ہوسکتی۔ ہمارا معاشرہ بھوت پریت اور گنڈے تعویذ کے وہم میں بُری طرح مُبتلا ہے۔ "بھوت" عنوان سے دیوانہ نے عوام کی اوہام پرستی پر طنز کیا ہے، اس نظم میں انسانی کردار کے کھوکھلے پن پر بھی چوٹ کی گئی ہے:۔

کی چنگا ہُندا میں لکھ سکدا
بُھوتاں دی وار
پچھلے بھُوت، مَن دے بھوت، بھوکھ دے بھوت
سدّھے ہی بھُوت، اسدّھے بھُوت
کچّے بھُوت، ننگے بھُوت
خاموش بھوت، بڑبولے بھُوت
جادُو دے بھُوت، اکھڑے بھُوت

اننت سنگھ کابلی نے بھی طنز و مزاح نگاری میں نام پیدا کیا ہے۔ اُن کے کچھ مجموعہ ہائے کلام طبع بھی ہوچکے ہیں وہ اب تک لکھ رہے ہیں۔ ان کی بہترین مزاحیہ نظم "الٹی سکھیا" ہے:

جوڑی انہاں نوں آکھئے جو دکھرے دکھرے بہن
دو جوتاں، دو مُورتاں، ہردم لڑدے رہن

نئی نویلی دلہن بنی لڑکی کے تئیں نصیحت کا انداز دیکھئے:

اج کل گلاں دا کھٹیا کمائی دا اے
گلاں ساڈیاں تُوں دی دو چار لے جا

سچ پھلا ہیں جہاں اندر
پنڈ جھوٹھ دی سالتوں اُدھار لے جا
دھکے مار سس سوہرے نوں باہر کڈھیں
تیرے کول رہن دا اینہاں دا کم کی اے
ساڈی انت وچ اِہو اسیں بچی
جوڑی گھر وچ ہی کھیہ اُڈا ڈنڈی رہے
آپی دوروں نہ آون دا کشٹ کرنا
تتی دا ہتا دی سالوں آڈنڈی رہے

مشہور ہے کہ عورت اپنی صحیح عمر کبھی نہیں بتاتی۔ کاکی نے عورت کی اس کمزوری کا طنز کا نشانہ خوب بنایا ہے۔

تے حدوں دی توں
اپنی عمر دسن لگیاں
جھوٹھ بولیں گی
اپنے آپ نوں
جوان دسیں گی
تاں میں تیری گل دی تردید کرنا نہیا
کیول اِہ کہہ دیاں گا
"جو کہے سو بڈھی سچ ہے"

اس میں طنز یہ ہے کہ پنجابی میں بڈھی عورت اور بڑھیا ہر دو معنی میں مستعمل ہے۔
دنیا بھر میں جملہ مذاہب کا محور "خداوند تعالیٰ" ہے۔ کاکی کی جرأتِ رندانہ ملاحظہ ہو کہ اُس نے کردگار و پروردگارِ عالم کو بھی طنز کے معاملے میں کسی رعایت کا مستحق نہیں جانا۔

تیری بھال وچ میں ٹھیڑیاں ٹکراں ماریاں
مندراں دے ٹل وجائے
گوردواریاں دے چکر کڈھے
مسجداں وچ کناں تے ہتھ دھر کے
بانگاں دتیاں
اس لئی کہ شاید تینوں اُچیاں سُندا ہووے

پر مینوں اِنج لگا جویں
وِیؔ توں "انڈر گراؤنڈ"
چلا گیا ہووے.

گوپال داس شباوی عام طور پر کوئی دربادوں (مشاعروں) میں حصہ لیتا ہے۔ اُس کے کلام میں بھی طنز و مزاح موجود ہوتا ہے۔ "جدید اقدار" کو اپنانے کی دھن میں جس طرح ہم اپنی "پرانی" قدروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں. گوپال داس اس کا ذکر اس لطیف انداز میں کرتا ہے:

جگ دے جمے او جگ دے نیک بختو
جھوٹھو جھوٹھ چوتا لیا ہو گیا اے
کِسے کول نہیں شرم حیا چھڈّی
بندہ بندہ دِلوالیہ ہو گیا اے

ایک رکشا ڈرائیور کی آنادلی پر اس طرح طنز کیا گیا ہے:

رِکشے والیا! ربّ دا واسطہ ای
ہَولی ہولی او ئے ہولی چلا رکشا
وائی جہاز دا نگوں اُڈدا جا رہا ایں
رتا سڑک دے نال تاں لا رکشا
وِچ لوڈّ تے گڈّے دے نیب توں اوڈے، ہتّی اُتّے نہ دیئیں چڑھا رکشا
تیری رکشا وِچ بھُل کے بہ گیا میں، ہَیں نہیں جا پدا کرے خدا رکشا

نشی کانت

مہنگائی کے خلاف ایک لیڈر کی تجویز

ٹی کے تیل کی ہوئی کمی
یش کے لئے اچھا ہوا
ں کے لئے آپ لوگ
دا سے دُعا مانگیے
ب ہماری ایک صلاح مانئے
ی بہانے دیش کی
یکاری دور کیجئے
ھر گھر میں چھوٹے چھوٹے
کارخانے قائم کیجئے
یعنی کولہو لگائیے
مٹی ڈالئے
ور اس کا تیل نکالئے!!

(ہندی سے)

ترجمہ: سری نیواس لاہوٹی

مدھوپ پانڈے
ترجمہ: سری نیواس لاہوٹی

دِل کی بات

ایک حسینہ نے
وزن کرنے کی مشین میں
سکّہ ڈالا
وزن کا کارڈ نکالا
پھر اس نے
اپنی چپل اُتاری
اور مشین میں
سکّہ ڈالا
وزن کا کارڈ نکالا
پھر اس نے
بدن پر لپٹا ہوا
ریشمی ڈوپٹا اتارا
اور مشین میں
سکّہ ڈالا
وزن کا کارڈ نکالا
اب وہ جیسے ہی
مشین سے اُتر کر
پرس کھولنے لگی
اسے ٹٹولنے لگی
مجمع نے گھیرا ڈالا
اور سب نے مل کر
اس حسینہ کو
بڑے پیار سے سمجھایا
میڈم!
ریزگاری جتنی چاہیے
اتنی مل جائے گی
لیکن اپنا پروگرام جاری رکھیے
اسے اسی طرح سے چلنے دیجئے!

رؤف خیر

"تردید"

مجموعۂ کلام محبوب راہی

یہ بات تو طے ہے کہ تردید وہی شخص کرسکتا ہے جو کسی لکیر کو چھوٹا ثابت کرنے کا ہُنر جانتا ہو بھلے ہی وہ لکیر خود اس کی اپنی ہی کھینچی ہوئی کیوں نہ ہو۔ خود اپنی لکیر کو چھوٹا ثابت کرنا تو اور بھی ظرف کی بات ہے۔ اپنے فن سے یہ تشکیکی کی یہی کیفیت تو اسے نئے جہانوں کا کولمبس بناتی ہے اب یہ الگ بات ہے کہ وہ دریافت کرنا کچھ چاہتا ہے ہونا کچھ ہے۔

محبوب راہی کا نیا مجموعۂ کلام "تردید" میرے پیش نظر ہے بہت خوبصورت چھپا ہے۔ بعد حمد و ثنا غزلیں ہیں۔

محبوب راہی کی تخلیقات اکثر چھوٹے بڑے رسائل میں چھپتی رہتی ہیں وہ بہت لکھتے ہیں اور کچھ رسالوں کے مُدیر اُن سے خوش بھی ہیں اور خاص طور پر بچوں کے رسالوں کے مُدیر۔ محبوب راہی بچوں کے لئے بھی بڑی پابندی سے لکھتے رہیں ان کی نظمیں کھلونا، پیام تعلیم، غنچہ وغیرہ میں چھپتی رہتی ہیں "رنگا رنگ" تو ان کا وہ خوبصورت مجموعہ ہے جس میں بچوں کے لئے ہر موضوع پر نظمیں ہیں

اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کا تیسرا ایڈیشن نکل رہا ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی انداز کی بڑی پیاری نظمیں ہیں۔ ان کی بعض نظمیں حکومت مہاراشٹر نے بچوں کے نصاب میں بھی شامل کی تھیں۔

محبوب راہی ایک عرصے سے غزل کہہ رہے ہیں۔ ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ناوابستہ فکر کے مالک ہیں۔ کسی خاص نظریہ حیات یا کسی خاص تحریک سے وہ وابستہ نہیں یا کسی خاص مُرشد کے سپرد بھی نہیں۔ "ثبات" (محبوب راہی کا پہلا مجموعہ کلام) تک یہی عالم رہا خود راہی کو اس کا احساس ہے

تو بھی ہو جاتا کسی گٹ میں جو شامل راہی
تذکرہ تیرا بھی پھر مغرب و مشرق ہوتا

از مغرب تا مشرق (یا مشرق و مغرب میں) تذکرہ ہوتا بھی کہ نہیں یہ اتنا اہم نہیں۔ فی الحال اس اعتراف کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ راہی کتنی گہری

شامل نہیں۔ (یہ گٹ بھی غالباً کوئی مقامی بولی کا لفظ ہے) یہ نا وابستگی بھی عجیب چیز ہے کوئی تخلیق کار اگر اسٹیبلشمنٹ (ESTABLISHMENT) کا آلۂ کار نہیں ہوتا تو اس کی شناخت ذرا مشکل ہی سے ہوتی ہے ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اور اگر کوئی فنکار ادب میں زہد اختیار کرے تو کافرانِ ادب اُسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ ادب میں کفر بھی شرط ہے اور اگر کوئی کافرِ ادب پر ایمان بھی لے آتا ہے تو آفاق میں گم ہونے کی حد تک ہی رہ جاتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ اعلیٰ ادب اسی وقت خلق ہو سکتا ہے جب فنکار میں آفاق گم ہو جائے یا کم از کم سوتے جاگتے کا سا عمل ہو۔

محبوب راہی بھی لگتا ہے صراطِ مستقیم کے شاعر ہیں۔ میں اپنی تائید میں "تردید" سے کچھ شعر (بلا تخصیص یعنی جو صفحہ نکل آئے اس سے ایک ایک شعر) پیش کروں گا۔

سردی کی گئی ہے رُت جب سے آیا ہے جو موسم گرمی کا
محفل محفل بستی بستی دن رات ہے ماتم گرمی کا

نقشِ قدم قدم پہ جمائے تو دیکھنا
وہ [illegible] کے سامنے آئے تو دیکھنا

آپ اپنے راز ہائے نہاں کھولنے لگے
کیوں لوگ بات بات میں سچ بولنے لگے

جانے ہمارے شہر میں کیا ماجرا ہوا
ہر شخص بات بات میں سچ بولنے لگا

اس انداز میں آواز میں تاثیر ایسی تھی
سبھی تھے دم بخود اس شخص کی تقریر ایسی تھی

کربِ حیات حسرتِ ناکام خودکشی
ہے زندگی کا دوسرا اک نام خودکشی

ہاتھ پھیلائیں دُعا کر دیکھیں
آؤ اب یہ بھی ذرا کر دیکھیں

ٹوٹنے ہی کو ہے بس تیرگیٔ شب کا فسوں
آمدِ صبحِ نگاراں کوئی پل باقی ہے

یہ اداسی یہ شکستہ بال و پر ایسے نہ تھے
کچھ برس پہلے مری بستی کے گھر ایسے نہ تھے

پھر محبوب راہی تردید کرتے پر مائل ہوئے تردید بھی کس کی؟ خود اپنی اور یہ تردید بھی دراصل اُنہوں نے ڈاکٹر مظفر حنفی کی تائید میں شروع کی گویا کسی کافر بچے کی ضد میں ایک ہزار رکعت پڑھنے کی نیت باندھی ہو۔

محبوب راہی کہتے ہیں:

"اپنے بیس سالہ تخلیقی سفر میں مجھے تاہنوز کسی رہبر کامل کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا نہیں۔ صورت حال آج بھی وہی ہے لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ پچھلے دو سال سے ہند و پاک کے منفرد صاحب طرز شاعر و ادیب محترم ڈاکٹر مظفر حنفی سے بے حد قریب رہنے کے مواقع بارہا میسر آرہے ہیں لہٰذا اس مجموعے کی غزلوں میں ان کے فیضانِ صحبت کے پرتو جابجا دکھائی دیں گے۔"

ایک مقطع میں بھی راہی نے کہا کہ ؎

لے لے اسلوبِ مظفر راہی
اپنے شعروں کو معانی دے دے

ڈگریاں ساری بہہ جائے گی
صرف اک موجِ سفارش تیز تر

ڈالیوں میں اب کھجوروں کے نہ لٹکے کا کوئی
آسماں سے جو گرے گا وہ زمیں پر آئے گا

(یہاں کتابت کی غلطیوں سے "کی" کے بجائے "کے" چھپ گیا)

سرو قامت بنے پھرتے ہو تو کیا
نہ سایہ ہے نہ پھل کچھ بھی نہیں ہے

(سروقامت کو مفاعیلن کے بجائے فاعلاتن کے وزن پر باندھنا چاہیے تھا)

برائے مصلحت جس وقت چپ رہنا ضروری ہے
ہمارے واسطے حق بات کا کہنا ضروری ہے

شاد عارفی کی دو کاربن کاپیاں ہیں جن میں سے پہلی کاپی مظفر حنفی اور دوسری کاپی فضا کوثری۔ دوسرا کاربن کچھ اتنا مستعمل تھا کہ وہ کاپی بڑی پھیکی نکلی اور اس پر لکھا ہوا برابر پڑھا ہی نہیں جاتا۔ (اور بھی کاربن کاپیاں ہوں تو ان کا حال اس سے بھی بُرا ہوگا) البتہ پہلی کاربن کاپی بڑی گہری ہے اور اس میں بعض الفاظ ایسے بھی آگئے ہیں کہ اصل کاپی میں شاید ٹائپ رائٹر کے ربن (RIBBON) کی خرابی کی وجہ سے صاف پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہرحال اصل و نقل کی اس خوش آہنگی سے ہٹ کر بھی مظفر حنفی اک چلا وا ٹائپ کی چیز ہے ؏۔

"ہم اور چند غالب و میر و فراق اور" کہنے والے حنفی نے اپنا قیاسی گھوڑا دوڑایا اور جھولا ماتم کے سہ سمہ میں پریوں کے جھرمٹ میں گھری سب سے خوبصورت پری کے بارے میں کہا کہ ؎

شکر یئے کے طور پہ ماتم سے ہم بستر ہوئی

محبوب راہی اور مظفر حنفی کی بمبری بھی موسیٰ و خضر کی ہم لگتی ہے۔ خضر اکثر ایسے کام کر گزرتے ہیں جن کا مو… کو شعور تک نہیں اور مشکل یہ بھی ہے کہ سوال کرنے… خضر نے موسیٰ کو منع کر رکھا ہے کہ سوال کیا اور ساتھ چھوٹا

نہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

سو — اُس سفر میں بے چارے موسیٰ پر جو گزری سو گز… اب اس کا اعادہ ہی کیا ضرور تھا۔ خضر کے حصّے میں آ… حیات اگر آئے بھی تو وہ موسیٰ کو ایک قطرہ بھی دینے… روادار نہ ہوں گے اور ایسی جگہ ساتھ چھوڑیں گے جہاں ڈھونڈنے سے پانی تک نہ ملے گا اور اُلٹا یہ ا… بھی سر آئے گا کہ "موسیٰ — !

تم سے صبر نہ ہو سکا — سو تمہارا ہمارا ساتھ ختم"

محبوب کو صرف گیلا تولیہ نچوڑ کر پیاس بجھانی… تو اس سے بہتر تو وہی تر دامنی تھی کہ جس کے نچوڑنے فرشتوں کو وضو کرنے کا موقع تو ملتا۔ ◻

خرافات

مراسلے

محبّی، آداب!

"شگوفہ" کا "خواجہ عبدالغفور نمبر" وصول ہوا۔ بتا نہیں سکتا کس قدر افسوس ہوا۔ کاش۔ اس نمبر کی اشاعت کا موقع اور کئی برسوں بعد آتا۔ کئی، کئی، کئی برسوں بعد ـــــ خواجہ صاحب ابھی اور ہمارے درمیان ہوتے، مسکراتے، گنگناتے، مہکتے، مہکاتے! ان پر خصوصی اشاعت ابھی شائع نہ ہوتی بلکہ دیگر خصوصی اشاعتوں میں اُن کے رشحاتِ قلم ہوتے۔

خواجہ صاحب سے میرے کچھ ایسے شخصی مراسم نہیں تھے، حیدرآباد ہی میں دو، تین مرتبہ ملاقاتیں رہیں اور کچھ اتنے ہی ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھے ہوں گے۔ لیکن اگر ملاقاتوں اور نیم ملاقاتوں ہی سے شخصیات کو جانا پہچانا جاتا ہے تو اعتراف ہے کہ میں خواجہ صاحب کو نہیں جانتا تھا۔ اور اگر فن اور خدمات بھی اہمیت رکھتی ہیں تو کہنے دیجئے کہ میں خواجہ صاحب سے بہت زیادہ واقف تھا۔ اُن کی کتابیں کس نے نہیں پڑھی ہیں۔ خاص طور پر "شگوفہ" میں اُن کی تخلیقات کس کے زیرِ مطالعہ نہیں رہیں "امکان" جیسے خوبصورت علمی و ادبی جریدے کو کون اردو کے آبرومند جرائد میں شامل نہیں کرتا اور بہار اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے سلسلے میں اُن کی زبان و ادب کی خدمات سے کون متاثر نہیں؟

خواجہ صاحب اپنی ملازمتوں کے سلسلے میں جہاں بھی اور جیسے بھی مصروف رہے ہوں لیکن وہ اُردو کے رہے۔ روز و شب، آٹھوں پہر ـــــ وہ ایچ۔ سی بی تھے اور ایچ۔ سی۔ پی (آئی۔ اے۔ ایس وغیرہ) عہدیداروں کی محنت، اپنے کام سے شغف، احساسِ ذمہ داری، وقت کی پابندی اور رکھ رکھاؤ کا انھوں نے اپنی سرکاری ذمہ داریوں میں کیسا ہی استعمال کیا ہو، اردو کی خدمت کرتے ہوئے ان ساری باتوں سے نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے کام لیا۔ بظاہر طنز و مزاح پر انھوں نے زیادہ توجہ دی لیکن اُردو کی ہر نوع کی سرگرمیوں سے وہ منسلک رہے۔ جیسے ان کا موضوع خاص اور میدانِ عمل یہی رہا ہو۔ اور ہر شعبے میں انھوں نے کامیابی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ علم و ادب سے ان کی والہانہ وابستگی کا کیہی اظہار کم ہے کہ انھوں نے آخر دم تک خود کو طالب علم متصور کیا۔ ابھی ابھی تو انھیں بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ ایسے فعال، متحرک اور فنکار کردار ادیب اردو کیا، دیگر زبانوں میں بھی کم ہی ہوں گے۔

خواجہ صاحب کے انتقال کی اطلاع پڑھ کر جو بے اندازہ صدمہ ہوا تھا اس کا اظہار کیسے کروں اور پھر آپ سے جن کے لئے یہ سانحہ اور زیادہ جانگداز تھا ـــــ چاہتا تو تھا کہ "شگوفہ" کے لئے مضمون ارسال کردوں لیکن جی نہ ہوا قلم نے چلنے سے جیسے صاف انکار کردیا ہو۔ پتہ نہیں بعض شخصیتوں کو مرحوم متصور کرنے کو دل کیوں نہیں چاہتا اور ایسے میں یہ مضمون لکھنے سے ہاتھ اور قلم دونوں معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ (اسی سلسلے میں عرض کردوں یہ لطیفہ یا شاید پر مضمون لکھنے کے لئے ان کے انتقال کے تین بعد سے سوچ رہا ہوں۔ ذہن میں مضمون گویا تیار بھی ہے لیکن دو قلم نے گویا بغاوت کر رکھی ہے، بات نہیں بنتا) ـــــ خواجہ پر یہ مضمون لکھا نہ گیا۔ اُن سے ملاقاتوں کی یاد تازہ ہوگئی ملاقاتیں، مختصر، مختصر سی! تعلقات اور دو فرشتوں کو ادبی نشست تھی۔ خواجہ صاحب کو بھی شریک ہونا تھا

آپ ہی کے ہمراہ وہ یہاں آئے تھے کسی نے رسماً تعارف کرایا اور وہ ایسے ملے جیسے عرصہ دراز سے ملتے رہے ہوں. اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوئی ۔ اور پھر گھر پر آنے کے لئے کہا. وقت کی کمی کے باعث دولت کدے پر حاضری میرے لئے ممکن نہ تھی. فون کیا اور دفتر پہنچا. وہ ان دنوں نظامس چیاریٹی ٹرسٹ کے معتمد تھے ۔ میں نے کارڈ بھیجا، فوراً بلایا۔ اگر کوئی فائیل لے آتا تو برائے نام اُس طرف متوجہ ہوتے. زیادہ وقت گفتگو۔ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر ۔ "امکان" کا تازہ شمارہ دیا اور "امکان" میں لکھنے کی دعوت بھی ــــ میں نے چند ہفتوں بعد، اُن کے حیدرآباد کے پتے پر "امکان" کیلئے مقالہ روانہ کیا. اس کی وصولی اور پسندیدگی کی اطلاع دی. بعد میں کبھی ایک آدھ خط بھی ملا کہ حیدرآباد آؤں تو ملوں ــــ پھر نہ تو حیدرآباد میں ملنا ہوا اور نہ بمبئی میں. اس دوران بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تھا. فون کیا. مگر پتہ چلا کہ وہ بمبئی میں نہیں ہیں ــ اُن کے ڈاکٹر ہونے کی اطلاع بھی ملی. سچ تو یہ ہے کہ علم و ادب سے اُن کا شوق، شوق نہیں جنون تھا کہ اُنہوں نے یہ کام کیا اور ایسا اعلیٰ معیار اور معتبر کام ۔ جہاں تک ڈاکٹریٹ کا تعلق ہے، خود اُن کے اَدبی کارنامے ایسے ہیں کہ اُن پر پی ایچ ۔ ڈی ہونا چاہیئے بلاشبہ ایسا کام ہو رہا ہوگا یا جلد ہی ہوگا ۔

غرض آج "شگوفہ" کے خاص نمبر نے خواجہ عبدالغفور صاحب کے بارے میں یادوں کی شمعیں سی جلا دیں. شیشۂ ذہن پر کئی کئی تصویریں اُبھر آرہی ہیں. اُن سے اور ملنے کا ارمان تھا. لیکن اب یہ ارمان، ارمان ہی رہے گا ــــ ویسے سچ بتائیے خواجہ عبدالغفور صاحب کا واقعی انتقال ہو چکا ہے. کبھی کبھی تو مجھے یقین نہیں آتا ۔ فرشتۂ اجل کے آگے بھی وہ دو ایک لطیفے سنا دیتے۔ وہ نیک بخت ما ہنستے ہنستے دو ہرا ہو جاتا اور سب کچھ بھول بھال کر چلا جاتا. کیوں خواجہ صاحب نے ایسا نہیں کیا. بہرکیف مجھے تو یقین کم ہی آتا ہے. کیا عجب آپ ہی آئندہ کسی شمارے میں معذرت شائع کر دیں. کہیں ایسا تو نہیں اس ماحول سے ناراض ہو کر وہ کہیں چلے گئے ہوں اور پھر اچانک آجائیں. وہ یوں دنیا سے طنز اور دوستوں سے مزاح سے پیش آئے ہوں ۔ خواجہ صاحب جیسی باغ و بہار اور گل و گلزار شخصیات مرتی کب ہیں. وہ تو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں زندہ رہیں گی. خواجہ صاحب بھی ز[illegible]یا، کہئے آپ کا کیا خیال ہے ؟ ۔ اس خط کے آخر میں دل نہیں چاہتا کہ آپ کی خیریت دریافت کروں ــــ خواجہ صاحب کے غم میں تو آپ ہم سب ساری اردو دنیا سوگوار تھی، ہے اور رہے گی خیر خیریت کیسی ؛ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، تریتی.

کمال صاحب آداب !

ماہِ رمضان کا یہ کمال اور برکت کہ آپ کے شہر جا کر بھی آپ سے ملاقات نہ ہو سکی. ویسے اس میں کچھ "اِدھر اُدھر" کے اشارے اور شرارے بھی شامل تھے گویا الہٰی اور ظلِ الہٰی دونوں ہی ہم سے برگشتہ تھے. خیر مستقبل قریب میں سہی.

خواجہ عبدالغفور نمبر ملا ۔ اس کی داد دینا زخموں کو گدگدانا اور غموں کو جگانا ہے. پھر بھی اتنا کہے بغیر رہا نہیں جا سکتا ہے نمبر بھرپور ہے ۔ خواجہ صاحب کی شخصیت اور فن پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے. کبھی اس کا ایک ایڈیشن اور نکالئے اور نئے مضامین بھی شامل کیجئے.

"ہندوستانی مزاح نمبر" اور عالمی جشنِ مزاح کا شدت سے انتظار ہے ۔

شفیقہ فرحت

بھوپال

15822 '68
Copy 7
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H/HD 6
July 1984 Phone : 557718



دن بھر کی خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:



کارخانہ زندہ طلسمات - حیدرآباد ۱۳۰۰۲



AUGUST 1984 Rs. 3.00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد ۱۷
شمارہ ۸
اگست ۱۹۸۴ء

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: سمیع جلیل
ٹائیٹل:
غیاث قریشی

قیمت: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف، محمود سلیم، مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد - ۱
فون: 557716

زندہ دلانِ حیدرآباد کے

زیر اہتمام ـــــ اپنی نوعیت کا منفـــرد

عالمی جشنِ مزاح

۱۶ ر تا ۱۹ ر نومبر ۱۹۸۴ء عالیشان پیمانہ پر منعقد ہوگا۔

صدر :
نریندر لوتھر

معتمد عمومی :
طالب خوندمیری

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

فہرست

بھارت چند کھنہ

وہ بھی کیا زمانہ تھا

کوئی زمانہ وہ بھی تھا جسے ہم نے نہیں دیکھا، مگر جس کا حال ہم نے اُردو کی پہلی کتاب میں پڑھا تھا۔ یعنی وہ زمانہ جب ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی، باپ حقہ پی رہا ہوتا تھا، بچے بغل میں جزدان اور دل میں یہ دھیان لئے اسکول جاتے تھے کہ جب وہ پڑھ لکھ کر بڑے ہوں گے تو والدین کی خدمت اور خاندان کا نام روشن کریں گے۔ یہی وہ زمانے تھے جب اُردو محاورے کے مولوی خلیل خاں صاحب فاختے اُڑایا کرتے تھے!

اَب یہ زمانہ آگیا ہے کہ اُردو کی پہلی کتاب اپنی مسخ شدہ حالت میں بھی بازار میں نہیں ملتی، ماں (جو بہت سے بچوں کی ماں ہے) گود کے بچے کو پنگھوڑے میں پھینک کر راشن کے دودھ کا پیکٹ لینے بلکہ لوٹنے علی الصباح قطاروں میں کھڑی ہوتی ہے۔ باپ حقہ نہیں پی سکتا کیوں کہ اس پر نہ صرف بہت وقت صرف ہوتا ہے بلکہ اس کے لوازمات مثلاً سانچے کو سُلگانے کو اُپلے گُڑاکو وغیرہ پر بھی بہت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے باپ نے شروعات سگریٹ سے کی اور جب سے سگریٹوں کی قیمت اس کی پہنچ سے باہر ہوگئی ہے وہ بیڑیاں دُھونکتا ہے ــ ایسی بیڑیاں جن میں تمباکو کم اور پتا زیادہ ہوتا ہے۔ مگر کیا کرے بُری عادت سے مجبور ہے ؎

چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ بیڑی لگی ہوئی

بچے بغل میں کھانے کے ڈبے دبائے اسکولوں کو جاتے ہیں۔ دل میں اُن کے یہی دھیان ہوتا ہے کہ گھر واپس پہنچنے سے پہلے سینما کے صبح کے شو میں "قاتل کے قاتل کا قتل" دیکھیں یا "ٹھنڈی آگ" ــ اور مولوی خلیل خاں صاحب کی موجودہ نسل اب فاختے اُڑانا تو درکنار، دن میں تین چار مرتبہ جسم اور روح میں رشتہ برقرار رکھنے کی کشمکش میں ایسی کیفیت سے ہمکنار ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑنے لگتے ہیں!

ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب سفر کرنے کا خیال صبح کے وقت آتا، اور ریل گاڑی دوپہر میں چھوٹنے والی ہوتی، تو انسان نہایت اطمینان سے رختِ سفر باندھتا، اور گاڑی چلنے سے بیس منٹ پہلے اسٹیشن پر پہنچ کر ٹکٹ خریدتا، اور نہایت

آرام سے قلی کی مدد سے سامان کے ساتھ ریل کے ڈبّہ میں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بیٹھ جاتا تھا!

اور اب اگر آپ کو ریل گاڑی کے ذریعہ کہیں پہنچنا ہو تو تاریخ سفر سے تین ہفتے پہلے جگہ محفوظ کرانی ہوتی ہے۔ قصہ کے گناہ کی یادداشت میں آپ کو اسٹیشن پہنچ کر ایک فارم بھرنا پڑتا ہے جسمیں نام، حلیہ، ولدیت، پیشہ اور شاید یہ بھی بتلانا ہو کہ بیوی کے بطن سے وطن کی آبادی بڑھانے میں آپ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں! یہ فارم بھر دینے کے بعد آپ کو سفر سے ایک ہفتہ پہلے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ مقررہ دن اور وقت پر جب آپ اسٹیشن پر کر آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو اُس دن کھڑکی کے پیچھے کوئی اور شخص براجمان ہوتا ہے جس کو کوشش کرنے پر بھی آپ کا فارم نہیں ملتا وہ بتلاتا ہے کہ کلرک صاحب متعلقہ رخصت پر ہیں، آپ دو دن بعد تشریف لائیں۔ دو دن بعد جب آپ وہاں تشریف لے جاتے ہیں تو اُس کھڑکی کے سامنے ریل گاڑی سے لمبی قطار مرد عورتوں کی لگی ہوتی ہے۔ اس قطار کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر دو گھنٹے بعد جب آپ کھڑکی کے سامنے پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو جس آگاہی سے آپ کو بخشا جاتا ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی جگہ محفوظ ہوجانے کا ابھی تک کوئی یقین نہیں اُن میں آپ کا نمبر ایک سو سینتالیسواں ہے! اس حالت میں آپ ایک شعلۂ پیچ و تاب بن جانے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں!!

ان زمانوں کی یاد کیسے بھلائی جا سکتی ہے جب ایک سو کپڑوں کی دھلائی صرف پانچ روپے تھی اور گوالے منہ اندھیرے آپ کے گھر کے سامنے گائے یا بھینس لا کر کسی گھر والے کی موجودگی میں دودھ نچوڑ کر دیدیتے تھے۔ اُس نادر زمانے میں ایک سیر دودھ کی جو قیمت تھی اُس سے اب ایک پیالی خراب چائے بھی نہیں ملتی۔۔۔۔ اور کیفیت اب تو یہ ہے کہ خالص دودھ تو درکنار خالص گائے یا بھینس بھی نظر نہیں آتی!

اس زمانے میں صاف ستھری چیزوں میں سراسر غیر متعلقہ عناصر کی آمیزش کا تصوّر بھی کسی کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ کوئی بھلا مانس یا بُرا مانس بھی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ چاولوں میں کنکر گیہوں میں کوڑا کرکٹ، سمنٹ میں راکھ، کالی مرچ میں پپیتے کے بیج ملا کر ان کا حجم اور وزن بڑھایا جا سکتا ہے۔ دودھ کی مقدار بڑھانا بہت آسان ہے کہ اس میں جتنا پانی ملاؤ اُتنا ہی دودھ بڑھ جاتا ہے ــــ اور لوگ اب تو اپنے مقدر کے اس قدر قائل ہو چکے ہیں کہ اُن تمام خالص دودھ بیچنے والوں کو خالص شریف اِنسان سمجھتے ہیں جو دودھ میں خالص پانی ملا کر بیچتے ہیں!!

اور پھر وہ زمانہ بھی بھلایا نہیں جا سکتا جب اچھے مکان بلا کسی تگ و دو کے یا کسی نہایت اہم شخصیت کی سفارش کے بغیر مناسب کرایہ پر مل جاتے تھے۔ اور مالکِ مکان ایک مرتبہ کرایہ کی رقم کا فیصلہ ہوجانے کے بعد اس کو بڑھانے یا مکان خالی کر دینے کی دھمکی نہیں دیتے تھے۔ آج کل اکثر و بیشتر کرایہ دار کرایہ بڑھانے یا مکان سے نکال باہر کر دینے کے نوٹس پر عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے ہیں اور وکلا کے لئے ذریعہ معاش کا ایک نیا پہلو بن چکے ہیں!

اب جو گھر وہاں کی بات چلی ہے تو اس ضمن میں یہ بھی ہو رہا ہے کہ جس رقبہ زمین پر پہلے ایک گھر بنتا تھا اُسی اراضی پر سر بفلک عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں جن میں سینکڑوں فلیٹس بنا دیئے جاتے ہیں، جن میں سر چھپانے کے لئے لوگ سر بفلک قیمتیں ادا کرکے

خوشی سے رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کل ڈبل ڈیکر بسیں ہی رائج نہیں بلکہ اِن فلیٹس میں ڈبل یا ٹریپل ڈیکر پلنگ بھی استعمال کئے جاتے ہیں، مکان کی چھتیں اِتنی نیچی ہوتی ہیں کہ پلنگ کی تیسری منزل پر اگر کوئی شاعر لیٹا ہو تو وہ پنسل سے چھت پر لکھتے ہوئے کوئی پھڑکتی ہوئی مرصّع غزل بھی موزوں کر سکتا ہے ۔ اور اگر اتفاق سے تینوں پلنگوں پر تین شاعر لیٹے ہوں تو ایک MINI آل پلنگ مشاعرہ بھی برپا ہو سکتا ہے اور داد دینے کے لئے ہاتھ اُٹھانے کے بجائے نیچے سے لات سے ٹھوکے دیئے جا سکتے ہیں! کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جس رفتار سے آج کل رہائشی فلیٹس سکڑ رہے ہیں، کوئی زمانہ شاید ایسا بھی آجائے جس میں کوئی مجرد شادی سے پہلے' ہونے والی دُلہن کا اختصار بنا کر اُس سے شادی کا قصد کرے گا!

اُن اچھے پُرانے وقتوں کی جب یاد آتی ہے تو دل میں اک درد سا اُٹھتا ہے اور میں چپکے چپکے روتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ وہ بھی کیا دن تھے جب سڑکوں پر موٹر چلانا راحت بخش تھا۔ جب سڑکوں پر سائیکلوں، بسوں، منی بسوں، اسکوٹروں، اسکوٹر رکشاؤں، وَن مین پاور رکشاؤں، موپیڈوں، بیل گاڑیوں، ٹھیلے والوں، ٹرکوں، ٹریکٹروں اور بے پناہ پیدل چلنے والوں کے انبوہ، ہر قدم، ہر موڑ اور ہر راستہ روکے ٹریفک کے ہر اصول کو کچلتے نظر نہیں آتے تھے۔ میرے دو جاننے والے موٹر چلانے کی وجہ سے عارضۂ قلب کا شکار ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں آج کل کسی مُجرم کو جو سزائے موت کا مستحق قرار دیا گیا ہو، اگر شہر کے گنجان علاقوں میں دن میں آٹھ گھنٹے مسلسل کوئی حادثہ کئے بغیر اور خود کو حادثہ سے بچاتے ہوئے' موٹر چلانے کی کڑی سزا دے دی جائے تو وہ شخص چھ ماہ کے اندر خود بخود موت کے گھاٹ اُتر جائے گا۔

وہ زریں زمانہ کہاں گیا جب لفظ راشننگ کا اندراج صرف ڈکشنریوں میں ہوتا تھا، جب امتحانوں میں نقل مارنے کا فن ابھی دریافت نہیں ہوا تھا، جب پیٹرول ایک روپیہ گیلن کے حساب سے فروخت ہوتا تھا، جب مشینوں کے نقلی پُرزے بنانے میں ہمارے ملک کے جیالوں نے مہارت حاصل نہیں کی تھی، اور پھر جب اِنکم ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا۔ کیفیت اب یہ ہے کہ اگر آپ ساری عمر اپنی کمائی میں سے اِنکم ٹیکس دینے کے بعد کچھ رقم بچا کر ایک گھر رہنے کے لئے بنا لیں تو اپنے ہی گھر میں خود رہنے پر بھی اِنکم ٹیکس دینا پڑتا ہے! حَد یہ کہ اگر آپ زندہ رہنے کی کشمکش میں مَر جائیں اور بغرضِ محال پسماندگان کے لئے کچھ جائیداد چھوڑ جائیں تو مَر جانے پر بھی (DEATH DUTY : موت کا ٹیکس) ادا کرنی پڑتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی یہ ابتری کیوں؟ پہلے اشیا کی افراط کیوں تھی؟ قیمتیں کیوں کم تھیں؟ زندگی میں موجودہ تناؤ اور کھینچا کھنچی پہلے کیوں نہیں تھی؟ ہمارا ملک وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کی دھرتی اب بھی سونا اگلتی ہے' بلکہ اب تو بہت زیادہ سونا اگلتی ہے' لیکن اسکے باوجود یہ سب کیوں؟ یقیناً اسلئے کہ گزشتہ تیس برسوں میں ہندوستانیوں نے آبادی کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری گھر کی کھیتی میں کبھی قحط نہیں پڑتا۔ یہ سدا بہار' ہری بھری اور بار آور ہے۔ اس بارے میں حکومتیں کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس مرض کا علاج خود ہر ہندوستانی کو کرنا ہوگا، ورنہ وہ وقت دور نہیں جب پینے کا پانی جو کمیاب ہوتا جا رہا ہے، نایاب ہو جائے اور ہوا بھی پھانکنے کو میسّر نہ آئے

آیئے کہ آج ہم سب مل کر یہ دُعا کریں کہ آئندہ کم از کم تا حکم ثانی کیلئے ہمارے ملک کی سب عورتیں بانجھ ہو جائیں!!

رضا نقوی واہی

اولمپکس ۸۴ء

سّو میٹر کی دَوڑ میں سونے کا تمغہ جیت کر
نوجواں شوہر جب آیا شاد و فرحاں اپنے گھر

باپ ماں بھائی بہن اس کامرانی پر تھے خوش
ہار پھولوں کے پنھائے اس کو سب نے چوم کر

اس کی بیوی لیکن اک کُتّے کو پہلو میں لئے
ڈالتی تھی بار بار اُس پر محبت کی نظر

ہار بھی کُتّے کی گردن میں تھا شوہر کے عوض
ساس نے ٹوکا کہ یہ ہے بدشگونی سر بسر

مُسکرا کے ساس سے بولی بہو، اے آنٹی!
راز کی اک بات کہتی ہوں، نہ کرنا مُشتہر

سّو میٹر کی دوڑ کا آغاز جیسے ہی ہوا
تیرے بیٹے کی طرف جھپٹا، یہ موذی جانور

میرے شوہر نے یہ سمجھا کاٹنے دوڑا ہے یہ
اور اس پر خوف طاری ہوگیا کچھ اس قدر

پاؤں رکھ کے سر پہ اپنے بے تحاشہ دَوڑنا
جاں بچانے کے لئے بھاگا وہ کہتا اَلحذَر

اصل میں سونے کا تمغہ تو ہے اس کُتّے کی دین
دوڑ میں کیا جیت ہوتی، یہ نہ دوڑاتا اگر

(خیال ماخوذ)

یوسف ناظم

"جس سے جگرِ شعلہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم"

[یہ خاکہ بزمِ علم و ادب (بھیونڈی) کی جانب سے رفیعہ شبنم عابدی کے اعزاز میں منعقدہ جلسہ میں پڑھا گیا۔]

* * *

آج کی محفل کی نوشاہ ایک خاتون ہیں۔ میں انھیں نوشاہ ہی کہوں گا کیونکہ بین الاقوامی سطح پر عدالتوں میں یہی طریقہ رائج ہے اور عدالت کی کرسی میں اگر کوئی خاتون مجسٹریٹ بیٹھی ہوتی ہے تو وکیل استغاثہ اور وکیل دفاع دونوں اس خاتون کو "می لارڈ" ہی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بس یہی ایک قانونی نکتہ ہوتا ہے جس پر یہ دونوں بیچ بولنے والے وکلا ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ خاتون مجسٹریٹ کو کوئی مائی کا لال مائی لیڈی نہیں کہتا۔ ڈرتا ہے۔ یہی طریقہ کمیٹیوں کے معاملے میں رائج ہے۔ وہ اسٹینڈنگ کمیٹی ہو یا انڈر اسٹینڈنگ کمیٹی۔ اس کی خاتون صدر کو چیئرمین ہی کہا جائے گا۔ چیئر وومن نہیں۔ حالانکہ وہ بیچاری اندرونی طور پر خاتون ہی ہوتی ہے۔ خواتین کو مردانہ القاب سے مخاطب کرنے کا یہ مہذب طریقہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مردوں نے عورتوں کو یعنی سمجھدار عورتوں کو ہمیشہ ہم رتبہ اور ہم چشم سمجھا۔ لیکن اس کے بعد بھی نتیجہ وہی ہے کہ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو بدنام ہو جاتے ہیں۔ اور وہ قتل کرنے پر بھی چھوٹ جاتی ہیں۔ اس لئے اگر میں نے انھیں نوشاہ کے لقب سے مخاطب کیا ہے تو اس پر حاضرین میں سے سوائے ایک حاضرین کے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

رفیعہ شبنم سے اس خاکسار کی ملاقات کہئے یا شناسائی کوئی ایک نسل پرانی ہے۔ یہ جب کالج میں پڑھتی تھیں اس وقت میں نے انھیں بہ نظرِ طائر دیکھا اور بگوشِ غائر سنا تھا۔ یہ تقریریں کرتی تھیں اور اس بات کی احتیاط کرتی تھیں کہ شہر بمبئی کے کسی کالج کا کوئی تقریری مقابلہ اُن سے چھوٹ نہ جائے۔ موسم کوئی ہو ان کی تقریر دھواں دھار ہوتی تھی۔ اور جب تک یہ اعلان نہیں ہو جاتا تھا کہ یہ مقابلے میں اوّل آئی ہیں۔ ان کی تقریر جاری رہتی تھی۔ ان کے اوّل آنے کے

اعلان پر اگر تین نہیں تو دو منٹ تک تو ضرور تالیاں بجتی رہتی تھیں۔ اور ان کے بجنے کے انداز ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بجا طور پر بجی ہیں۔ کرائے کے والنٹیروں سے بجوائی نہیں گئی ہیں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ان کا ایک سے زیادہ مرتبہ جج رہا ہوں (ان کا جج ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے تقریری مقابلوں کا جج)۔ تقریری مقابلوں کا جج ہی لارڈ تو نہیں ہوتا لیکن چیف ایگزیکیٹو مجسٹریٹ سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ رفیعہ شبنم ان دنوں رفیعہ شبنم منچری کہلاتی تھیں اور لوگ حیران رہتے تھے کہ یہ منچری کیا شئے ہے۔ اس قسم کا سرنیم یا تخلص اس سے پہلے کہیں سننے میں نہیں آیا تھا۔ اکثر لوگ جن میں، میں بھی شامل ہوں اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس لفظ کے معنی اختراع کرتے اور خوش ہوتے کہ واہ کیا معنے نکالے ہیں۔ غنیمت ہے کہ رفیعہ شبنم منچری بہت جلد منچری سے عابدی ہوگئیں اور عابدی کے معنے فوراً ہی سب کی سمجھ میں آگئے۔ بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ منچری اس وجہ سے تھیں کہ جس قصبے سے انھیں نسبت ہے اس کا بگڑا ہوا نام منچر تھا اور اصل نام منوچہر۔ منوچہر نام کے احترام میں انھوں نے اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایم۔ اے کیا۔ کیونکہ فارسی میں دستگاہ حاصل کئے بغیر خود کو منچری کہنا انھیں کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ اتنی زیادہ فارسی پڑھنے پر انھیں سونے کا تمغہ بھی ملا اور بعد میں فارسی پڑھانے کی ملازمت بھی ملی۔ یہ ملازمت بھی اتفاق سے سونے کی ہی تھی۔ فارسی ہے ہی کچھ اتنی میٹھی زبان کہ ہر بات لوری معلوم ہوتی ہے۔ خود بخود نیند آجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کالجوں میں فارسی کی کلاس میں جتنی خاموشی ہوتی ہے کسی اور کلاس میں نہیں ہوتی۔ ویسے یہ ایک مستند بات ہے کہ وہ بہت اچھی معلّمہ ہیں اور ان کے پڑھائے ہوئے طالب علم کوشش بھی کریں تو فیل نہیں ہوسکتے۔

عام طور پر لوگ صرف بی۔ اے یعنی مجرّد بی۔ اے کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں لیکن رفیعہ شبنم اس معاملے میں بھی صرف بی۔ اے نہیں معزز بی۔ اے ہیں یعنی انھوں نے بی۔ اے آنرز کیا ہے۔ اس میں آنرز کی کیا بات ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے اور اس منوچہر کو تو بالکل نہیں معلوم۔ ان کی اس ناواقفیت کا فائدہ رفیعہ شبنم نے خوب اٹھایا اور اپنے خاندان والوں کو ہمیشہ یہی سمجھایا کہ انھیں بی۔ اے کی ڈگری کے ساتھ ساتھ گارڈ آف آنر بھی دیا گیا ہے۔ اب وہ ماشاء اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور جیسا کہ ہم آپ سب جانتے ہیں، پی۔ ایچ۔ ڈی بننے کے لئے ایک مقالہ لکھنا پڑتا ہے۔ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کی خوشی ظاہر ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن اس بات کی خوشی زیادہ ہے کہ رفیعہ شبنم نے اپنا مقالہ خود لکھا ہے۔ اُن کی اس ڈگری سے قوم و ملک کو کیا فائدہ پہنچے گا اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا۔ یوں بھی دنیا اُمید پر قائم ہے۔

ایک خاتون کا شوہر اور بچوں کی موجودگی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا مائیکل فریرا کے مسلسل تین سال تک بلیرڈ چیمپین بننے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مائیکل فریرا کی ساری توجہ صرف بلیرڈ ٹیبل پر تھی جب کہ رفیعہ شبنم کی توجہ رائٹنگ ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل اور ٹائم ٹیبل تینوں پر تھی اور میں نے یہ تک سنا ہے کہ کبھی کبھی وہ کھانا بھی اپنے تھیسس کی مدد سے پکاتی تھیں اور ان کے پکائے ہوئے کھانے میں بھی پیراگراف ہوا کرتے تھے (رُک رُک کر کھانا پڑتا تھا) شکر ادا کرنا چاہئے کہ تھیسس تھے

وقت انھوں نے رفیعہ کے شاہی دسترخوان سے مدد نہیں لی۔

رفیعہ شبنم کی علمی، ادبی اور ازدواجی مصروفیات بے پناہ ہیں۔ بے پناہ کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے پناہ مانگی جائے۔ بلکہ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مصروفیات کی کوئی حد نہیں ہے۔ مصروف تو سبھی لوگ رہتے ہیں لیکن میں معقول مصروفیات کا ذکر کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے یہ خبر سنی تھی کہ مسز اور مسٹر رفیعہ شبنم عابدی کی صاحبزادی نے مدرسے کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس خبر سے مجھے اندازہ ہوا کہ وقت کتنا تیز بھاگتا ہے۔ میں محترمہ کو اب تک یعنی اس خبر کے چھپنے تک وہی رفیعہ شبنم سمجھ رہا تھا جو تقریری مقابلوں میں موضوع سے ہٹ کر تقریریں کرتی اور تالیاں پٹواتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ روانی جو اُن کی تقریروں میں تھی ان کی زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔

علمی، ادبی مصروفیات کا جہاں تک تعلق ہے انھوں نے ان مصروفیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اوڑھنا بچھونا بہت پرانا محاورہ ہے۔ یہ اُس زمانے کا محاورہ ہے جب اوڑھنے بچھونے پر توجہ زیادہ تھی۔ شاعرہ تو وہ پہلے سے تھیں نقاد، وہ بعد میں بنیں۔ (اگر لفظ شاعرہ صحیح ہے تو نقادہ کیوں غلط ہے)۔ شاعری اور تنقید ان دونوں اصنافِ ادب میں کون سی صنف زیادہ آسان ہے یہ میں نے اُن سے کبھی نہیں پوچھا اور نہ آئندہ پوچھنے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ ان کے لئے کوئی چیز مشکل ہے ہی نہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "نظر نظر کے چراغ" میں ان کی سات کتابوں کے زیرِ طبع ہونے کا اعلان ہے جن میں ایک افسانوں کا مجموعہ اور دو ناولیں بھی شامل ہیں۔ اب باقی کیا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ رفیعہ شبنم کوئی اخبار بھی نکالیں۔ میری رائے ہے کہ انھیں ایک اخبار ضرور نکالنا چاہیئے کیونکہ صحافت ہی ایک شعبہ ہے جس میں عورتوں کی نمائندگی کم سے کم ہے۔ حالانکہ صحافت میں بولنے کی گنجائش زیادہ ہے۔ اور خواتین کو سب سے بڑی سہولت یہ حاصل ہے کہ وہ ہر جگہ حسنِ ظن سے کام لے سکتی ہیں۔

رفیعہ شبنم شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی خاتونِ اوّل بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ مشاعرے کی اناؤنسر بھی ہیں۔ آج کل شاعروں کو مشاعرے لوٹنے کا موقعہ کم ہی ملتا ہے۔ اناؤنسر پہلے ہی اسے لوٹ لیتا ہے اور شاعروں کے حصے میں جو چیز آتی ہے اس کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔ رفیعہ شبنم بتاتی نہیں ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اناؤنسر کی حیثیت سے بھی کئی مشاعرے لوٹ چکی ہیں۔ وہ مشاعرہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جو اقبال صدی تقاریب کے دوران شہر بھیونڈی میں ہوا تھا اور اس کی اناؤنسنگ حسن کمال اور رفیعہ شبنم دونوں نے انجام دی تھی۔ اس وقت چونکہ حسن کمال یہاں موجود نہیں ہیں اس لئے یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مشاعرے کا نصف بہتر رفیعہ شبنم کے ہاتھ رہا۔ ان کے ہاں حسنِ کلام زیادہ تھا جو حسن کمال کے حسن کمال سے ٹکر لے رہا تھا۔ لیکن یہ تو صرف ایک قلعہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ ایسے کئی قلعے فتح کر چکی ہیں۔ اب صرف لال قلعہ باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ دلّی جو کسی زمانے میں دلّی کے نواح میں پہنچنے پر بھی دور رہتی تھی، ان دنوں سمندر پار ملکوں کے لئے بھی دور نہیں رہی ہے۔ جسے دیکھئے کسی بہانے سے مہمان بن کر دلّی پہنچ جاتا ہے۔ رفیعہ شبنم بھی دلّی جائیں گی لیکن [illegible] ایشیاڈ یا جوگم میں نہیں۔ یہ گئیں تو لال قلعے کے مشاعرے ہی میں جائیں گی۔ ویسے دیکھا جائے تو اب انھیں

دلّی جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ جو اُنھیں سُننا چاہتے تھے وہ خود دلّی سے بمبئی آئے۔ مہاراشٹرا کالج گئے اور ان سے ان کی نظم سُن لی[۱]۔

عورتیں ذہین بھی ہوسکتی ہیں اس کا ثبوت آپ کو رفیعہ شبنم کے ایک مضمون سے ملے گا جو انھوں نے سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی سے متعلق لکھا ہے۔ وہ چاہتیں تو اسی مضمون پر ڈاکٹریٹ حاصل کرسکتی تھیں لیکن وہ تو لکھنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں۔ ادب کے میدان میں چہل قدمی تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن رفیعہ شبنم اس میدان میں تفریح کرنے کے لئے نہیں آئی ہیں، ان کا ارادہ گلگشت کا نہیں، باضابطہ سفر کا ہے اور رختِ سفر کے طور پر ہر قسم کا سامان انھوں نے تیار کر رکھا ہے۔ اشعار کا بستر، تنقید کا تکیہ، ناول کی چادر اور افسانوں کی اشیائے خورد و نوش۔ ان پر مستزاد ڈاکٹریٹ کا ہاٹ کیس۔ بہ سفر رفتنت مبارکباد کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہوگا ہی مبارک۔

اس مضمون کا عنوان میں نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے اور وہ ہے "جس سے جگرِ شعلہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم "۔ اقبالؔ کے مصرعے میں یہ ترمیم کیوں کرنی پڑی، اس کی ضرورت، ضرورتِ شعری نہیں، ضرورتِ شرعی ہے[۲]۔

---

[۱]۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں صدر جمہوریہ شری ذیل سنگھ مہاراشٹر کالج تشریف لائے تھے۔ اس جلسہ میں رفیعہ شبنم عابدی نے ایک استقبالیہ نظم سنائی تھی جو کافی پسند کی گئی۔

[۲]۔ رفیعہ شبنم کے شوہر سید حسن اختر عابدی شعلہؔ تخلص کرتے ہیں۔

* *

پروفیسر حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی، مہاراجہ کالج، آرہ

جہلِ مرکب

آج کے اسکول و کالج جہل کی دوکان ہیں
ٹیچری کا ہے کو ہے قدرت کا اک انعام ہے
کچھ پڑھانے کا سلیقہ ہے نہ کچھ پڑھنے کا شوق
ڈگریاں ہیں لمبی لمبی آگہی کچھ بھی نہیں
شکسپیئر کو یہ کہتے ہیں کہ تھے وہ "شیخ پیر"
ورلڈ میں نایاب ہوگا ان کے ڈھب کا آدمی
Byron کو سائرن کا قافلہ بتلاتے ہیں
طول یوں دیتے ہیں یہ ہر قصۂ کوتاہ کو
گولڈ اسمتھ کو سمجھتے ہیں کہ تھا کوئی سنار
ان کی منطق ہے جدا تحقیق ہے ان کی نئی
میر صاحب کو بتاتے ہیں عظیم آباد کا
شیخ سعدی کو سمجھتے ہیں کہ پاکستانی تھے
ان سے آکر کوئی پوچھے معنیٔ غیب و شہود
جانتے ہیں یہ کلیم الدین احمد کو وکیل
کیا ہے موزوں اور ناموزوں نہیں ان کو خبر
میڑ ان کے آگے کپڑا ناپنے کی چیز ہے
علم کچھ ان کو نہیں تانیث اور تذکیر کا
ہے غرض اس سے کہ بس تنخواہ ملنی چاہیئے
ان کے شاگردوں کی حالت اور بھی دلدوز ہے
پڑھنے لکھنے کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں
آدمی کے خال و خد میں اک سے اک حیوان ہیں
ہوگیا اُستاد وہ جو ہر جگہ ناکام ہے
واقفیت میں اضافہ ہو نہیں کچھ اس کا ذوق
ان کو عرفانِ حقیقت واقعی کچھ بھی نہیں
مل نہیں سکتی زمانے میں کہیں ان کی نظیر
Longfellow کو سمجھتے ہیں یہ لمبا آدمی
پوچھئے تاریخ تو جغرافیہ بتلاتے ہیں
بادشہ گردانتے ہیں جارج برنڈ شاہ کو
رات کو اُٹھ اُٹھ کے اکثر جو بجاتا تھا ستار
ان کی معلومات پر سر پیٹتی ہے آگہی
اور غالب کو سمجھتے ہیں چچا فرہاد کا
اور خسرو ہند کے شاعر نہیں ایرانی تھے
ان کے آگے طفلِ مکتب قاضیٔ عبدالودود
جو ہمیشہ پیش کرتے ہیں کوئی تازہ دلیل
توڑتے رہتے ہیں یہ اشعار کی نازک کمر
ان سے کوسوں دور فنِ شعر کی دہلیز ہے
"مدعا عنقا ہے ان کے عالمِ تقریر کا"
ہر جگہ سوسائٹی میں جاہ ملنی چاہیئے
کیا بتائیں ان کا عالم کس قدر جاں سوز ہے
اور اگر سچ پوچھئے تو اس کی فرصت ہی نہیں

ہیرو ہیروئن کی نقالی سے ان کو کام ہے
فلمی گانوں اور قوالی سے ان کو کام ہے

رقص کرتا ہے کوئی انگریزی دھن اور ساز پر
کوئی مرتا ہے 'لتا' کی دل نشیں آواز پر

تازہ ترفیشن کی ان کو جانکاری ہے بہت
کورس کی ہر ایک پستک ان پہ بھاری ہے بہت

جادۂ آوارگی پر صبح سے تا شام ہیں
ہوسٹل ہوں یا کہ ہوٹل ہر جگہ بدنام ہیں

ہر برائی میں سرِ فہرست رہتے ہیں یہی
گندگی کے نالے میں بے خوف بہتے ہیں یہی

فیل ہو جانے سے گھبراتے نہیں زنہار یہ
ٹیچروں کو پیٹ دیتے ہیں سرِ بازار یہ

ان سے ڈرتے ہیں سپاہی بھی سپہ سالار بھی
ان سے عاجز ہے ہمارے ملک کی سرکار بھی

الغرض اسکول و کالج اب کسی قابل نہیں
خرچ ہے ان پر بہت لیکن کوئی حاصل نہیں

علم کی صہبا نہیں باقی کسی کے جام میں
سب کے سب ننگے نظر آتے ہیں اس حمام میں

بہاءالدین ریاضؔ (دکنی)

غزل

رخِ خوباں پہ آفت آئے گی اس سال گرمی میں
حسیناں ہوں گی لگتا ہے بہت بدحال گرمی میں

بلا کی دھوپ ہے نکلو نہ ٹھنڈی چھاؤں سے ہرگز
پگھل جائیں گے دیکھو یہ سنہرے بال گرمی میں

گل اندامو‌ں کے کمروں میں لگا ہوگا نیا کولر
تصور جب کیا اس کا تو ٹپکی رال گرمی میں

گزارے جا کے تینی تال سوچا موسمِ گرما
مگر مفلس کی خواہش ہو گئی پامال گرمی میں

سلگتی آگ پہ لگتا ہے اک بارود کا دانہ
تمہارے آتشیں رخسار کا یہ خال گرمی میں

لئے پھرتے ہیں جب وہ مورپنکھی ہاتھ میں اپنے
یہ لگتا ہے کہ ان پر آپڑا جنجال گرمی میں

نہ اس میں پھول پتی ہے نہ جھرنا ہے نہ پانی ہے
ریاضؔ دل کی حالت لگتی ہے کنگال گرمی میں

انیس احمد خان (نئی دہلی)

صحافت سے سڑک تک

ہر آدمی کے اندر ایک اور آدمی ہوتا ہے جسے لوگ ضمیر کہتے ہیں۔ ضمیر کی شکل آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔ لیکن آدمی کتنا غریب، بُرا یا بدکردار کیوں نہ ہو اس کا ضمیر اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔ بس مشکل یہ ہے کہ اسے بے وقت جاگنے یا سوجانے کی عادت ہے۔ کبھی وہ بے وقت جاگ جاتا ہے تو بُرے سے بُرا آدمی بھی اچھا آدمی بن جاتا ہے۔ خونخوار ڈاکو تک ہتھیار ڈال دیتے اور دفتر روزگار کی لائین میں لگ جاتے ہیں۔

اور کبھی ـــــ یہ بے وقت سو جائے تو اچھا بھلا آدمی لیڈر بن جاتا ہے!!

سُنا ہے کُتّے اور گدھے کا ضمیر کبھی نہیں سوتا۔ اس لئے یہ ہمیشہ کتّے اور گدھے ہی رہتے ہیں۔ گدھا اپنے دھوبی کی مستقل مزاجی کی وجہ سے گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اور کُتّے کی دُم بارہ برس تک نلکی میں رہنے کے باوجود ٹیڑھی نکلتی ہے۔ حالانکہ ان بارہ برسوں میں کُتّا کب کا مر کھپ چکا ہوتا ہے ـــــ مگر ہم ہندوستانیوں کو کُتّے اور گدھے سے اتنی نفرت نہیں جتنی کہ ضمیر سے ہے۔ اس لئے اخبارات میں روزانہ اخلاقی گراوٹ کی خبریں چھپتی ہیں۔ فساد ـــــ قتل .... غارت گری... بازار سے راشن معہ دکانداروں کے غائب ـــــ معصوم طلباء پر پولیس کا لاٹھی چارج ـــــ پولیس میں لوگوں کی آنکھیں چھیننے کا شوق بالجبر کی انوکھی وارداتیں۔ آج کل کے روزانہ اخبارات بھی جاسوسی ناولوں کی سی سنسنی پھیلانے لگے ہیں۔

یہ اخبار والے بھی پرلے درجے کے باضمیر ہوتے ہیں۔ ایسی ایسی خبریں چھاپتے ہیں کہ نہ خود انھیں نیند آتی ہے اور نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں۔ ان "دوسروں" میں میرا شمار نہ کریں کہ میں خود اخبار والا ہوں۔ اور ہمارے لیڈروں کا شمار بھی نہ کیجئے کہ وہ اپنے ضمیر کو افیون کھلانے کا ہُنر جانتے ہیں۔

ایک دن میرا ضمیر اچانک جاگا اور خود بخود ایک وزیر کے شاندار بنگلے کی طرف میرے قدم اُٹھ گئے۔ میں نے سوچا کہ آج ذرا ان وزیر کے ضمیر کی خیریت پوچھ لی جائے بنگلہ کے احاطہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے دیکھتے ہی تین سفید کھادی پوش

مجھے اس طرح ہتھیار ڈالتا دیکھ اُنہوں نے اپنے ڈنڈے نیچے کرلئے اور تینوں نے ایک ساتھ مجھ پر سوالات کی بارش کردی

کیا نام ہے؟
کیا کام ہے؟
کہاں رہتے ہو؟
کیوں رہتے ہو؟
اس بنگلے پر آنے کی جرأت کیوں کی؟
جانتے نہیں یہ وزیر کا گھر ہے۔ جانوروں کا باڑا نہیں کہ منہ اُٹھایا اور چلے آئے۔

سوالات بہت تھے اور میری زبان ایک۔ وہ غریب تو ڈر کے مارے منہ میں ہی چھپی رہی ہاں میں نے جلدی سے اپنے تھیلے میں سے قلم اور نوٹ بک نکال کر انہیں دکھائی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ صحافی نام کی مخلوق سے ضرور واقف ہوں گے۔ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ قلم اور نوٹ بک دیکھ کر ان کی آنکھوں کے شعلے سرد پڑ گئے۔ اور ان میں سے ایک شخص اثبات میں سر ہلا بولا ـــ "اچھا! پترکار ہو۔ منتری مہودے کا انٹرویو کرنے آئے ہو۔"

مجھے اُمید کی کرن نظر آ ہی رہی تھی کہ ان میں سے دوسرے شخص نے بے حد کرخت لہجے میں کہا ـــ "یہ پترکار ہے۔ کوئی منسٹریز کار نہیں کہ منتری جی بہک جائیں۔ اور اپنے اصول توڑ دیں۔" پھر اس نے اسی لہجے میں مجھ سے کہا "جاؤ جی جاؤ۔ انہیں انٹرویو دینے کا وقت نہیں ہے۔"

اب میری زبان حرکت میں آئی۔ میں نے کہا "مگر میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا میرا ان سے ملنا نہایت ضروری ہے میں اپنے ضمیر کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ اور آج تک میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبایا اور نہ اس کی بات ٹالی ہے۔"

"ضمیر؟ کون ضمیر ـ؟؟" ایک نے کہا

"اچھا تمہیں ضمیر صاحب نے بھیجا ہے پہلے کیوں نہیں کہا۔" دوسرے نے اچانک آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور اتنے ہی لہجے میں کہا۔ گستاخی معاف آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہیئے تھا کہ آپ مسٹر ضمیر کے آدمی ہیں۔ وہ تو ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ اُنہوں نے پچھلے ہفتے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ ہمارا آدمی آئے گا اسے منتری جی سے کچھ کہنا ہے۔ اس وقت اندر کمرے میں منتری جی شیرش آسن میں ہیں آپ خاص آدمی ہیں جائیے منتری جی سے۔ جو کچھ لینا ہے خود ہی جاکر لے لیجئے۔"

اچانک ہی ان تینوں کے رویئے میں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ میرے بائیں طرف مؤدب کھڑے ہوئے تھے۔ میرے سامنے کوئی دیوار نہیں تھی۔ میں اس سنہری موقع کا ایک پل بھی ضائع کئے بغیر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف تیسرا ا کر رہا تھا۔

واقعی اعلا حضرت پوری طرح اپنے آپ میں تھے ٹانگیں اُوپر اور سر نیچے، ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا پیٹ سمنٹ کے بورے کی مانند ہوا میں ڈول رہا تھا۔ اُنہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے میرے قلم اور میری نوٹ بک کو دیکھا اور

یں ہراتی اپنی دونوں ٹانگوں کے ذریعے میرے آداب کے جواب میں آداب کیا۔ پھر اچانک وہ حادثہ ہوا جس کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ اچانک کمرے میں زلزلہ آگیا۔ سیمنٹ کا بورا قالین پر لڑھک گیا۔ میرے اوسان بحال ہونے تک وزیر باتدبیر سیدھے ہو چکے تھے۔ اور مجھے ایک شرارتی بچے کی طرح داد طلب نظروں سے تاک رہے تھے۔ جب انہیں میری طرف سے کوئی داد نہ ملی تو انہوں نے اپنی ناک سے سوں سڑاپ، سوں سڑاپ کی تین چار آوازیں نکالیں اور قالین پر پالتی مارتے ہوئے بولے۔

" شکل سے تو صحافی لگتے ہو۔ کہاں تک پڑھے ہو؟"

میں انٹرویو لینے آیا ہوں دینے نہیں اس کے باوجود میں نے عرض کیا

— " صحافت کی سبھی ڈگریاں حاصل کر چکا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی اُنہوں نے پیٹ بھر کر قہقہہ لگایا جس کے زور سے کھڑکی اور دروازے کے شیشے تک جھنجھنا اُٹھے۔ قہقہے کو خدا خدا کرکے بریک لگا اور انہوں نے ارشاد فرمایا — "دیکھا بچو! میں نے تو اسکول کے پہلے درجے تک میں نام نہیں لکھوایا۔ اور اس کے باوجود تمہاری روزی روٹی کا مالک ہوں۔"

" وہ کیسے —؟؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

ہماری بدولت تمہاری خبریں بنتی ہیں۔ اگر ہم خبریں نہ بنائیں تو تمہیں چھاپنے کے لئے کیا خاک ملے گا۔ اگر ہم سبھی کام قاعدے قانون سے کرانے لگیں تو دیش میں امن وامان ہو جائے گا۔ تمام اشیاء کی قیمتیں گر جائیں گی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کا کال پڑ جائے گا۔ دنگے فساد کرانے والے بھوکوں مرنے لگیں گے تو پھر تمہیں چٹ پٹی چیزیں کہاں سے ملیں گی۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ہمارے دَم سے تمہارے اخبار چل رہے ہیں۔

میں پہلی بار کسی وزیر کو سچ بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سچ بھی اتنا تلخ کہ میرے حلق میں جم کر رہ گیا۔ پھر ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ انٹرویو کے لئے کس کا انتخاب کیا۔ لیکن جب میں آ ہی گیا تھا تو انٹرویو لینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ "چند نہیں صرف دو۔" اُنہوں نے دو انگلیاں اُٹھائیں۔ "آج میرے کوٹے میں صرف چھ سوال آتے ہیں جن میں سے چار سوالوں کا منہ توڑ جواب پارلیمنٹ میں مخالف پارٹیوں کو دوں گا تم صرف دو سوال کر سکتے ہو۔"

وزیر موصوف کی یہ شرط مجھے بوکھلانے کو کافی تھی۔ جو سوال میں نے سوچے تھے وہ بجلی کے سستے بلب کی طرح پھٹ سے اُڑ گئے۔ اس عالم میں جو سوال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا میں نے وہی پوچھ لیا۔ "عزت مآب۔ ملک میں علیحدگی پسندوں کی تحریک زور پکڑ رہی ہے اس کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں؟"

" ہم بھی کیا کہہ سکتے ہیں۔" انہوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "کچھ اُوپر والا کرتا ہے اور نیچے آپ دیکھ ہی رہے ہیں ہم اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے مخالفین کی صوبائی حکومتیں دھڑا دھڑ گرا رہے ہیں تاکہ مکمل طور پر اپنی حکمرانی نافذ ہو جائے اس طرح ملک کو ایک دھاگے میں پرو دیا جا سکتا ہے۔ دیکھتے جاؤ۔ ایک دن ہم پورے دیش کو اپنی ایکتا کے دھاگے میں پرو کر خوبصورت پھولوں کا ہار بنا کر دیوی ماں کے چرنوں میں پیش کر دیں گے۔

"اعلاحضرت! آپ کی حکومت نے اب تک دیش کی ترقی میں کیا رول ادا کیا ہے؟

"بہت کچھ کیا ہے" درجنوں نعرے دیئے ہیں مثلاً جب ہم تخت نشین ہوئے تو ہم نے پنچ شیل کا نعرہ دیا لیکن حیف صد حیف لوگوں نے اسے رشوت کے لین دین کا طریقۂ کار سمجھا اور ۵، ۵۰، ۵۰۰، ۵۰۰۰ ۵۰ ہزار کے آنکڑوں میں باتیں کرنے لگے۔ پھر ہم نے غریبی ہٹاؤ کا نعرہ دیا لیکن اس دیش کی جنتا نے ہم کو ہی ہٹا دیا اب بڑی مشکل سے ہم اپنی کرسی پر دوبارہ آئے ہیں اور اس بار بھی ہم نے ایک نعرہ 'شرم میوٗ جیتے' دیا ہے۔ اب اس کا مطلب تم اخبار والے کچھ بھی نکالو میرے نزدیک تو اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ تم مزدوری کرو ہم خوش ہوں گے ۔ لہٰذا تم بھی قلم چھوڑو اور باہر لان میں پڑی کدال اٹھا کر میرے مالی کے ساتھ کام پر لگ جاؤ۔ اگر ہم تمہارے کام سے خوش ہوئے تو تمہیں مالامال کر دیں گے۔"

اس کے بعد وزیر موصوف نے میری ایک نہ سنی اور ٹانگیں ہوا میں اچھال کر دوبارہ سر کے بل کھڑے ہوگئے انٹرویو ختم ہو چکا تھا میں تھکے قدموں سے باہر آیا جہاں رشتوں والنٹیر کسی نذرانے کی امید لگائے ہاتھ پھیلا کھڑے تھے میں نے ان کی شکلیں دیکھیں اس وقت میرا ضمیر پوری طرح بیدار تھا۔ اس لئے میں نے بلا تکلف ایک کو اپنا قلم، دوسرے کو نوٹ بک اور تیسرے کو اپنا پھٹا ہوا تھیلا دے دیا اور اس امید پر سڑک کے بیچوں بیچ آن کھڑا ہوا کہ ادھر سے کوئی ٹرک دندناتا ہوا گزرے گا اور مجھے "منزلِ مقصود" تک پہنچا دے گا۔ ●●

رؤف رحیم (ایم۔اے)
(حیدرآباد)

کرفیو

لفظ "کرفیو" ہمارے شہر یا ملک میں تعارف کا محتاج نہیں۔ ہم اس سے بخوبی واقف ہیں اور عید ہو کہ تہوار انتخابات ہوں یا جلسہ و جلوس ہم جیسے اُس کے منتظر رہتے ہیں یہ کرفیو وہ ہے جو حکومت کی جانب سے نافذ ہوتا ہے ایک کرفیو وہ بھی ہے جو ہم اپنی خاتونِ خانہ کے حکم پر اپنے اوپر لادلیتے ہیں جس میں چھوٹ اوقاتِ دفتر میں ملتی ہے اگر اس کی خلاف ورزی ہوگئی تو جواب طلبی کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔

جلوس پہلے بھی نکالے جاتے تھے اور ہم اپنے بچپن میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ جوق در جوق خوبصورت پوشاکیں زیب تن کرکے بڑی عقیدت کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے جب ہمیں ہندو یا مسلم کا کوئی فرق ہی معلوم نہ تھا (خدا وہ دن پھر لوٹائے) جب کبھی جی چاہتا ہے کہ کسی جلوس کو دیکھ آئیں ماں کہتی ہیں "بیٹا! مرنا ہے تو ہماری نظروں کے سامنے مرو۔ کیوں اُدھر جاتے ہو۔؟ خاتون خانہ کرخت لہجے میں کہتی ہیں "ابھی تنخواہ بھی نہیں ملی . . . ."

بہرحال عید اور تہوار میں جو خوشی نصیب ہوا کرتی تھی اب اُس کی جگہ خوف نے لے لی ہے۔ 'دیا دلی' میں دیپ جلتا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں گھر ہی جل نہ جائے۔ پٹاخہ چھوٹتا ہے تو دل دہل جاتا ہے کہ یہ کہیں بم نہ ہو۔ جمعۃ الوداع آتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ یہ آخری جمعہ تو نہیں۔ خیر!

جلوس کے دن ہم اپنے کمرے میں بند ہو کر جاڑے بخار کا بہانہ بناتے ہیں اور رضائی اوڑھ کر اپنے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں جبکہ گرمی سے بُرا حال ہوتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے گزشتہ جلوس کے مناظر فلم کے فلیش بیک کی طرح آجاتے ہیں اور ہم آنکھیں موندنے کے باوجود بھی اُس سے فرار حاصل نہیں کرسکتے اور حواس باختہ بستر پر پڑے رہتے ہیں اس دن دفتر کو جانا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا ہم اس ارادے سے رخصت نہیں لیتے کہ کرفیو کا نفاذ اسی روز سے ہونے والا ہے اور ریاستی حکومت سیاسی قائدین (جو عوام کے نام نہاد ہمدرد ہوتے ہیں) کے بیانات پر ہماری غیر حاضری کو خصوصی رخصتِ اتفاقی میں تبدیل کردے گی جبکہ اُن کے بیانات کے بغیر بھی حکومت اس فیصلہ کے لئے مجبور ہے ہم اپنے بستر

سے اُس وقت اُٹھتے ہیں جب ریڈیو پر خبریں نشر ہونے والی ہوں۔ اور ریڈیو سے کان لگاتے ہیں جیسے ہمیں خواب میں یہ معلوم ہوگیا کہ "آج سے پُرانے شہر میں غیر معینہ مدت کا کرفیو نافذ ہوگیا ہے" اور ریڈیو اس خبر کی تصدیق کر دیتا ہے!

اس مرتبہ بھی ۲۳ر جولائی کو ہم نے دفتر نہ جانے کا فیصلہ اپنے ماں باپ کے حکم پر کیا۔ ہمیں آر ٹی سی کی ہڑتال کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیوں کہ بسوں کے نہ چلنے سے اپنے دفاتر بند تو نہیں ہو سکتے ہم کسی آٹو رکشا میں چلے جا سکتے ہیں بشرطیکہ آٹو ڈرائیور صاحب رحم دل ہوں یا کسی اسکوٹر والے سے لفٹ لے سکتے ہیں ایسے حالات میں کوئی نہ کوئی بندۂ خُدا مل ہی جاتا ہے! جب بزرگوں نے ٹوکا، دفتر جانے سے روکا تو ہم متذکرہ بالا آزمودہ بہانہ بنا کر رضائی میں گھس گئے۔ ریڈیو سے وہ منحوس خبر سُننے میں آئی جس کا شاید ہر ایک کو انتظار تھا۔ ریڈیو سے ہو کہ اخبار سے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ سات افراد چاقو زنی کی واردات میں ہلاک ہوگئے حالات پُر سکون ہیں۔ کئی مکانات لوٹے گئے دکانات نذرِ آتش ہوئے۔ حالات پُر سکون ہیں۔ معصوم بچے، بے گناہ خواتین اور ضعیف اشخاص اشرار کے تشدد کا نشانہ بنے حالات پُر سکون ہیں۔ ہم دہشت آمیز سکون میں تھے کہ پولیس کی گاڑیوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی کہ ہم کرفیو زدہ علاقے میں ہیں۔

اسے ہماری بدبختی سمجھئے کہ ہم پُرانے شہر کے پُرانے محلے اور پُرانے خیالات والے ارکانِ خاندان کے پُرانے گھر میں پیدا ہوئے (سُنا تھا کہ پُرانی کتاب اور پرانی شراب بہت قیمتی ہوتی ہے لیکن پُرانے شہر اور پُرانے گھر نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا) جب کبھی کہیں دنگا فساد ہوتا ہے پُرانا شہر اس کا نشانہ بن جاتا ہے پولیس ہو کہ اشرار اس پُرانے شہر کے پیچھے ہاتھ دھوئے بغیر پڑ جاتے ہیں شاید وہ کسی بھی پُرانی چیز کو رکھنا نہیں چاہتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ کرفیو زدہ علاقے میں رہنے کے باوجود ہمیں کارڈز کھیلنا نہیں آیا، کیرم بورڈ اپنے پاس نہیں اور شطرنج سے ہم واقف نہیں ہیں پہلے معلوم نہیں تھا کہ حکومت اور اشرار کی جانب سے اتنی تعطیلات ہمارے حصے میں آئیں گی ورنہ ضرور سیکھ لیتے یہ تو ہماری بیکاری دور کرنے کے لئے خُدا نے ہاتھ میں قلم تھما دیا کہ اس کے ذریعہ ہر پڑھے لکھے انسان کی ناک میں دَم کر دیں!

کرفیو کے اعلان کے ساتھ ہی ہمارے پسینے چھوٹ گئے کیوں کہ سرکاری ملازم کے لئے مہینے کا آخری دن قرض مانگنے اور دکاندار سے ادھار لینے کا ہوا کرتا ہے لیکن ایسے حالات میں کوئی ہمدرد بھی قرض نہیں دیتا کہ اُس مال سے اُسے دوگنی قیمت نفع مل سکتی ہے اور وہ بے خطرہ کیوں مول لے۔ ایسے موقعوں پر جان کی سلامتی کی ضمانت نہیں ہوتی اور خدانخواستہ ادھار دے کر کون پچھتائے۔ ہمیں اُن کا خیال آنے لگا جو روزمرہ کما کر کھاتے ہیں جو محنت مزدوری کر کے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں اُن کے بلکتے بچے جب دودھ مانگتے ہیں تو ماں شیشی میں پانی ڈال کر دلاسہ دیتی ہے وہ کھانا مانگتے ہیں تو لوری دے کر کہتی ہے کہ کھانا پک رہا ہے بچے بھوک کے سو جاتے ہیں اور ماں باپ کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے ہیں۔

امن بحال کرنے کے لئے یک جہتی کی ضرورت ہوتی ہے سرکار ٹیلی ویژن اسٹیشنوں میں اضافہ کر کے یک جہتی کو فروغ [illegible]

گھر ٹیلی ویژن نہیں وہ گندی بستیوں میں مچھروں اور زہریلی فضاء کی پرواہ کئے بغیر سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر پڑے رہتے ہیں جو یک جہتی کو امراء کی جاگیر سمجھ کر اُس طرف نظریں اُٹھانے کو جرم تصور کرتے ہیں۔ خیر! ہمیں اس سے کیا لینا؟ ٹیلی ویژن کو فروغ ملے گا تو پیداگری اس میں اضافہ ہوگا اور پیداگری اس میں اضافہ ہوگا تو یہ چہرہ بھی اس کی زینت بنے گا جب داداکونڈکے اور اوم پوری پردہ سیمیں کی زینت بن سکتے ہیں تو کیا ہم ٹی وی کے اسکرین کو داغدار نہیں بنا سکتے؟

کرفیو میں پولیس کی طلبا گردی اور گدھوں کی آوارہ گردی کا نہ جانے کیا سمبندھ ہے سڑکوں پر صرف دونوں دکھائی دیتے ہیں۔ بیچارے پولیس والے ایسے دلوں بے حد پریشان ہو جاتے ہیں ان کے بڑے عہدیدار اُنھیں سختی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں وہ انسانوں کو گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ ہم سے عقلمند تو یہ گدھے ہوتے ہیں جنھیں فرقہ واریت نہیں معلوم اور ان فسادات در کرفیو سے بے نیاز گھومتے رہتے ہیں۔

ہم پہلے کرفیو کے نام سے گھبراتے تھے اب عادی ہو چکے ہیں دن بھر خاتونِ خانہ کی خوبصورتی کی تعریف کرنے پر مجبور رہتے ہیں حالانکہ اس سے بچنے کے لئے ہم حالات کرفیو میں بھی دفتر جانا پسند کریں گے۔ گلی کوچوں کے مکانات میں دکانیں کھلنے کی اُمید میں جاتے ہیں لیکن نا اُمید لوٹ آتے ہیں۔ دودھ کو پانی کی شکل ہی میں سہی حاصل کرنے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ جب کرفیو میں چھوٹ ملتی ہے ہم کسی دکان پر خریدی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن وہاں اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ ہم بغیر کوئی سامان لئے واپس لوٹ جاتے ہیں اگر اتفاقاً کامیاب ہو جائیں تو دوگنی قیمت دے کر آنا پڑتا ہے اس ہجوم میں خواتین اور بچوں کو دیکھ کر ہماری ہمت نہیں ہوتی کہ اُنھیں ڈھکیل کر خریدیں۔

جب ۲۷؍ جولائی کو پولیس کی جانب سے دن کے کرفیو کی برخواستگی کی خبر پڑھی اور سُنی تو ہمیں خوشی ہوئی کہ محکمہ بلدیہ ہر ماہ کی ۲۷ تاریخ کو تنخواہ ایصال کرتا ہے اور ہم تنخواہ لے کر پھر کرفیو کا انتظار کریں گے۔ خوشی خوشی دفتر پہنچے حالانکہ اس خوشی میں گزشتہ پانچ دن کے خوف کی جھلک ضرور تھی دفتر کے لوگ ہمارے صحیح سلامت رہنے کو کرشمہ سمجھ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ گزشتہ کرفیو کے باعث تنخواہیں روزِ مقررہ پر نہیں ملینگی ہم اپنے دفتری کام میں جُٹ گئے حالانکہ دل میں وسوسے آرہے تھے کہ ملا جانے کب کیا ہوگا؟ جمعہ کے باوجود ہم نے کسی مسجد کو جانے کا خیال نہیں کیا دو بجے کے قریب جب ہم ڈرافٹنگ میں مصروف تھے ہمارے عہدیدار نے یہ منحوس خبر سنائی کہ پرانے شہر میں پھر سے فساد پھوٹ پڑا ہے اور ہمیں اجازت ہے کہ ہم دفتر سے چلے جائیں اب ہم سوچ رہے تھے کہ جائیں تو کدھر جائیں۔

اگر نہ پہنچ پائیں تو بیمار والد صاحب پریشان ہو جائیں گے اُن کی محبت مسلمہ ہے اور گھر پہنچنے کی کوشش کریں تو پتہ نہیں زندہ بھی پہنچ پائیں گے کہ نہیں۔ اسی سوچ میں کانپ رہے تھے کہ ہمارے آفیسر کی جیپ کے ڈرائیور نے ہماری ہمت بندھائی کہ وہ ہمیں گھر تک پہنچا دیں گے۔ پُرانے شہر کے ملازم بلالحاظ مذہب و ملت اس جیپ میں بیٹھ کر مسرور تھے کہ وہ جیپ نشین ہو گئے ہیں جب نئے پل (جو اَب نیا باقی نہیں رہا) تک پہنچے تو ہماری جیپ کو روک دیا گیا کہ ہم اس پل کو پار کرکے ادھر نہیں جا سکتے پھر پلٹ کر ہم سالار جنگ پل پر سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے تقریباً تین بجے کے قریب اپنے گھر محفوظ پہنچ گئے راستے

کا وہ منظر بڑا دل دوز تھا جب خواتین بوڑھے بچے عالم پریشانی میں بھاگ رہے تھے اُس منظر سے قیامت کے منظر کا اندازہ ہوگیا۔ خدا کے بعد محکمہ پولس کا شکریہ ادا کیا جن کے ڈنڈوں کے بغیر صحیح سلامت بچ گئے۔ اور میدان حشر کا نقشہ بھی آنکھوں میں پھر گیا۔

ہم حسب معمول اپنے گھر کے دروازے بند کر کے اپنی شاعری میں مشغول رہے۔ فسادات کے خلاف ہماری نظم اُسی دن اخبار میں شائع ہوئی تھی جس کی تعریف پر ہم مگن تھے اس نظم سے ہم یک جہتی اور بھائی چارگی کا پیام دے چکے تھے۔ رات آنکھوں میں خوف اور خوشی کے عالم میں کٹ گئی۔

دوسرے دن دوپہر کا وقت تھا موسم میں خنکی تھی اور ریڈیو پر یہ گیت بج رہا تھا ؎

آج موسم بڑا بے ایمان ہے ۔۔ آنے والا کوئی طوفان ہے ۔۔۔

ہم اپنے کمرے میں گیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بیگم صاحبہ سے آنے والی ٹی وی فلم پر تبصرہ کر رہے تھے اور انھیں یقین دلا رہے تھے کہ کرفیو کے ختم ہوتے ہی انھیں تھیٹر لے جا کر فلم دکھائیں گے اور کچھ دن کے لئے میکے کی سیر کروائیں گے۔ ہم منصوبے بنا رہے تھے کہ پولس کی گاڑیوں کی آوازوں نے ہمارے دل میں ایک ہیبت طاری کر دی ہم نے اپنی کھڑکی (جو بند ہونے کے باوجود باہر کا نظارہ آسانی سے کرواتی ہے) سے دیکھا کہ پولس کے اعلیٰ عہدیدار سامنے کے مکان میں بے جھجک گھس گئے ہیں کیوں کہ کرفیو کے دوران خانہ تلاشی اور گرفتاریاں محکمہ پولس کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ کچھ ہی لمحوں میں ہمارے غریب خانے پر دستک ہوئی ہم نے والدہ صاحبہ سے کہا کہ وہ جلد دروازہ کھول دیں ورنہ ایک ہی دھکے میں بوسیدہ دروازہ اپنی دیواروں کے ساتھ زمین پر آجائے گا اور تعمیر کا مسئلہ آج کل بے حد مشکل ہے ہم باہر والے تو نہیں جو تعمیر کرالیں ہمیں ترمیم کے لئے بھی قرض لینا ممکن نہیں۔ دروازہ کھلا تو ہم نے اسی میں خیریت سمجھی کہ اپنے آپ کو روبرو پیش کریں ہم نے انسپکٹر صاحب سے سوال کرنا چاہا کہ آخر بات کیا ہے؟ کیوں ایک شریف ملازم سرکار، ذمہ دار شہری اور مشہور شاعر کو آپ لیجانا چاہتے ہیں؟ لیکن سوال حلق سے باہر آنے کی گستاخی نہیں کر سکا ہم اُن کے اشارے پر گاڑی میں بیٹھنے کے لئے تیار ہوگئے ہمیں اس بات کا علم تھا کہ ہم کچھ مزاحمت یا حماقت کریں گے تو کانسٹیبل صاحبان کے ڈنڈے اور گالیاں ہم پر بجلی کی برسات کی طرح پڑیں گے جس کے ختم ہونے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمیں پولس کی گاڑی کی آواز کے ساتھ ہی خیال آیا کہ ہم لنگی میں بے حد مشکوک نظر آتے ہیں ہم نے فوری پتلون پہن لی ورنہ لنگی میں ہماری موٹی تازی شخصیت نئے کانسٹبلوں کے لئے مشق ستم کا سامان ہوتی ہمیں باعزت گاڑی میں بٹھایا گیا برسات زوروں سے شروع ہوگئی اور اس برسات میں والدہ کے آنسو نہ جانے کدھر کھو گئے اور گاڑی کی آواز میں والد محترم کی کھانسی کی آوازیں نہ جانے کہاں دب گئیں۔ والد صاحب نے ہمارے کارناموں یعنی ہماری چھپی غزلوں کے ریکارڈ کے طور پر رجسٹر ہمارے ہاتھ تھما دیا ہم نے لاکھ سمجھایا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں پر گدھے گھوڑے ایک ہو جاتے ہیں اور فساد کے خلاف لکھی نظموں کی کوئی اہمیت نہیں۔

جس طرح ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے اُسی طرح کسی ایک کے لئے محلے کے ہر گھر سے ایک ایک نوجوان

پکڑ کر گاڑی میں بھر دیا گیا جب کوٹہ مکمل ہو گیا تو ہمیں پولس اسٹیشن لے جایا جانے لگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ہمیں پبلسٹی بہت ہیں افسوس اس بات کا ہوا کہ ہمارے ساتھ یہ عمل آج سے آٹھ دس برس پہلے کیوں پیش نہیں آیا اکثر شاعر وادیب ہرت کے بھوکے ہوتے ہیں پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت ہماری اتنی شہرت ہوتی تو عجب نہیں کہ ہم آج تک کنوارے رہتے ی داماد بنانے کی غلطی کبھی نہیں کرتا۔

ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ محلے کے ان لوگوں کی نظروں میں بھی ہم معتوب ہو گئے جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ار سے ہمارا دور کا واسطہ بھی نہیں اور خون خرابہ تو دور کی بات ہم کسی کو انجکشن دیتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن افسوس ی نے اتنی ہمت نہیں کی کہ کہتے "ہمیں چھوڑ دیں" یہ کام تو ہمارے قائدین کا ہے جو ووٹ لینے سے قبل ہمارے غریب خانے بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں ہمارے جان و مال کے تحفظ کا یقین دلاتے ہیں اور موقع پڑنے پر نہ جانے کہاں ہوتے ں اور کرفیو کے دوران اُن کو ڈھونڈ نکالنا بھی ناممکن ہوتا ہے ہم برسات کی ٹھنڈی ہواؤں کے باوجود پسینے میں شرابور ر رہے تھے اندر سے ہونے والی کپکپاہٹ کو سردی کے نام سے چھپا رہے تھے انسپکٹر صاحب نے جو بے حد رحم دل ے ہمارے ماں باپ کو دلاسہ دیا کہ ہم کچھ پوچھ تاچھ کے بعد چھوڑ دیئے جائیں گے لیکن نہ جانے کیوں اُنھیں پولس کی بات یقین نہیں آرہا تھا شاید اُن سے کسی نے یہ کہدیا تھا کہ پولس لے جاتے وقت ایسا ہی کہتی ہے اور جانے کے بعد اُن کا رویہ ل ہو جاتا ہے۔ ہم نے والد صاحب کو یقین دلایا کہ جو بھی ہو ہم بھگت لیں گے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم ے بے قصور ہونے پر مطمئن تھے لیکن وہ اپنی محبت پدری سے مجبور تھے وہ جو سرد ہواؤں سے گھبراتے ہیں موسلا دھار ش میں اس کوشش کے لئے نکل گئے کہ ہمیں کسی طرح اُس نرگ سے بچائیں۔ اُنھیں ڈر تھا کہ ہم سیاسی قیدی تو نہیں کہ ں بریانی کھلا کر نظر بند رکھا جائے گا۔ بلکہ ہمارا گھونسوں اور گالیوں کے ساتھ استقبال کیا جائے گا جس کا ہمیں ایک بلکہ بھی تجربہ نہیں۔

ہمیں پولس اسٹیشن جانے میں کوئی شرمندگی نہیں تھی کیوں کہ جیل تو ہمارے رہنما (نیتا) جا کر آئے ہیں ہم لیڈر نہیں بننا ہتے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب نکلتا ہے اور ایک شریف انسان کی قضا آتی ہے تو وہ لیڈر بنتا ہے۔ کیوں کہ ہم ملازم سرکار اور سیاسی داؤ پیچ سے نابلد ایک شاعر ہیں اور ہمیں اس لیڈری سے کیا لینا دینا تقریباً دو گھنٹے بعد پولس اسٹیشن پہنچے جبکہ انسپکٹر صاحب نے اتنے وقت میں ہمیں اپنے گھر پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ سب کو کمرے میں بھر دیا گیا جو کوتاہ دامانی کا شکوہ کر رہا تھا ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ی پی صاحب نے جس چور کی داڑھی میں تنکا نظر آیا اُسے پکڑ لیا اور بغیر کسی گالی گھونسے کے ہم سے ہماری مصروفیت کے

ملازم ہیں اور اُنہیں یہ واقعہ دُہرایا کہ ہم فساد کے وقت اس پُرانے "شہر فسادات" میں نہیں تھے بلکہ اپنے دفتر میں موجود تھے
کی تصدیق بھی کی جاسکتی ہے ہمیں کچھ دیر بعد چھوٹ جانے کے امکانات نظر آئے لیکن وہ خواب جو ہم نے اپنی بیگم کے سا
سُنایا تھا کہ آج کی فلم ہم تم مل کر دیکھیں گے، چکنا چور ہوگیا اور تقریباً دس بجے شب ہمیں رخصت ہونے کی اجازت ملی انسپکٹر
نے شاید ہماری شخصیت اور شاعری سے متاثر ہوکر یا والد و والدہ کی آہ وزاری سے متاثر ہوکر ہمیں حسبِ وعدہ اپنی جی
میں ہمارے گھر پہنچا دیا ہم نے دل کی گہرائیوں سے اُن کا شکریہ ادا کیا بیچارے اپنی ڈیوٹی کے لئے مجبور رہتے ہیں۔ ہم وا
لوٹے تو تیس مار خاں بنے ہوئے تھے جیسے ہمیں کوئی گولڈ میڈل ملا ہو۔ بڑی حماقت کے ساتھ احوال بیان کرنے لگے
جب بستر پر لیٹے تو نیند کا کوسوں پتا نہیں تھا ہر آہٹ پر دل دہل رہا تھا کسی حالت نہیں بہل رہا تھا۔ گھر کے کمزور درو
بدلنے کی تجویز رکھی گئی اور پھر یہ تجویز بھی زیرِ بحث رہی۔ کہ کرفیو کے ختم ہوتے ہی گھر بدل دیں گے پُرانے شہر کو چھوڑ کر نئے
چلے جائیں گے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ دل بدلنے کی طرح گھر بدلنا آسان نہیں۔ رات آنکھوں میں گزر گئی صبح ہوئی تو سسر
رشتہ دار خیریت دریافت کرنے پہنچ گئے اُنھیں شادی سے پہلے ہی ہماری شخصیت پر شک تھا اس کی تصدیق چاہی۔
نے اپنا کارنامہ بیان کیا تب کہیں جاکر اُنہوں نے بھروسہ کیا کہ ہم واقعی شریف ہیں محلے کے ہر اُس شخص نے بھی خیر
پوچھی جو ہمیں جانتے بھی نہیں تھے ہم نے بڑی متانت سے اُنھیں اپنی حماقت بیان کی اور سب کی نظروں میں بڑے
سورما ہوگئے۔

دوسرے دن ریڈیو پر جب وہی گانا ۔ آج موسم بڑا بے ایمان ہے ... شروع ہوا تو ہم نے دوڑ
ہوئے جاکر ریڈیو بند کردیا کرفیو کے دوبارہ نفاذ کے بعد ہم گھر کے آخری کمرے میں رضائی میں منہ چھپائے پڑے
ہیں اس ڈر سے کہ کہیں دروازہ توڑ کر کوئی ہاتھ ہمارے کالر تک نہ آجائے۔ شیو بھی پابندی سے بنا رہے ہیں
بڑھتی ہوئی داڑھی میں ہماری صورت کسی مجرم سے کم نہیں لگتی۔ اب سوتے وقت بھی سوٹ میں ملبوس رہتے
ہیں کہ خواب میں بھی کسی پولیس سے واسطہ پڑ جائے تو اپنے کپڑوں کا رعب ڈال سکیں یا کوئی خواب سے بیدار
کے لئے آجائے تو اسی حالت میں باہر نکل سکیں۔

خیال آتا ہے کہ اب گھر بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا سب کے دل بدلنے کی ضرورت ہے ہم اپنے ہاتھوں ا
گھر اُجاڑ رہے ہیں یہ بات ہر شہری کو سُنانی ہے کہ ؎

کرفیو لگا کے ہم نے شب و روز کا رحیمؔ
ناحق بنا لیا ہے حوالات شہر کو

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

..... اور کرفیو اُٹھ گیا

زندگی کے اقدار بدلتے رہتے ہیں۔ چند سال قبل ہم حیدرآبادی شہری عید و تہوار پر مل جل کر خوشیاں مناتے
ور ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے تھے۔ خلوص و محبت سے سرشار دل گلے ملتے تھے۔ لیکن آج اسی شہر میں عید و تہوار کے
ام سے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں۔ فساد کے اندیشہ سے دل تہہ و بالا ہونے لگتا ہے۔ کرفیو کے نفاذ اور کرفیو کی صعوبتوں کے
یال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچتے دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برخلاف شہر سے کرفیو برخواست
ہوتے ہی حیدرآبادیوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ گلی کوچوں میں چہل پہل
وتی ہے۔ سڑکوں اور بازار کی رونق لوٹ آتی ہے۔ عید کا سماں بندھ جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے
ر گلے ملتے ہیں۔ اب ہمارے شہر سے کرفیو اٹھ گیا ہے۔ قارئین! ہماری اور مدیر شگوفہ کی جانب سے کرفیو اُٹھنے کی خوشی میں
ر خلوص مبارکباد قبول فرمائیں۔ اور اسی خوشی میں تازہ شمارہ کے توسط سے ہم آپ سے مل رہے ہیں!

کبھی چاند تو کبھی کیلنڈر دیکھ کر ایک ایک دن کے حساب سے عید کے دن کا انتظار کیا جاتا ہے۔ جبکہ ٹی وی اور
یڈیو سے خبریں سُنتے ہوئے گھنٹوں کے حساب سے کرفیو اُٹھنے کا انتظار ہوتا ہے۔ صبح اور شام ریڈیو کے اطراف لوگ کان
وڑے خبریں سُنتے اور تبصرے کرتے ہیں "کرفیو نافذ ہو کر پورے ایک سو گھنٹے ہوئے سچویشن کے باوجود کرفیو اُٹھنے کا
علان نہیں ہوا" حد ہوگئی! کرفیو میں ڈھیل دیئے بغیر آج کچھ کم ڈیڑھ سو گھنٹے پورے ہوگئے۔ گنیز بک آف ریکارڈس میں تھوڑے
تھوڑے وقفہ سے ہمارے شہر میں نافذ ہونے والے طویل کرفیو کو جگہ ملنی چاہیئے؟ اور جب کرفیو اُٹھنے کا اعلان ہوتا ہے تو ہر
دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے چاہے وہ نوزائیدہ بچہ ہی کیوں نہ ہو پچھلے دنوں کرفیو اٹھنے کے ساتھ ہمارے دو سالہ لڑکے
نے اور تتلاتے ہوئے "ڈیڈی کرفیو کھل گیا، کرفیو کھل گیا" کہہ کر اچھل کود کرنے لگا۔ تب ہم نے جانا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔
[illegible]

احباب سے ملاقات کرنا اور نہ صرف ان کی خیریت دریافت کرنا بلکہ بقید حیات رہنے پر دلی مبارکباد پیش کرنا انسانیت کا تقاضہ ہوتا ہے۔ کرفیو اٹھتے ہی جسے دیکھئے عزیز و اقارب سے ملنے دوڑا چلا جارہا ہے۔ ایک مرتبہ کرفیو اٹھنے کے بعد ہم نانی اماں کے پاس نہ پہنچ سکے تو انہوں نے خود باوجود ضعیفی و علالت ہمارے گھر پہنچ کر خیر خیریت دریافت کی اور کہا "میاں! ہم پچھلے وقتوں کے آدمی ہیں۔ ابھی تمہاری طرح ہمارا خون سفید نہیں ہوا" عید کے دن دوست احباب سے چند مخصوص سوالات کئے جاتے ہیں۔ جیسے نماز کہاں پڑھی، کون سا عطر لگایا، کپڑے کہاں سے خریدے، کہاں سلوائے، سیویاں کیسے خریدیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح کرفیو اٹھنے کے بعد دوست احباب سے مل کر ایک مخصوص قسم کی گفتگو کی جاتی ہے آپ کے محلہ میں فساد کیسا رہا، اسکور کیا ہے، کرفیو کے دوران اشیائے ماتحاج کیسے حاصل کرتے تھے، پولیس نے زیادتی، بہت زیادتی اور بے انتہا زیادتی کی ہوگی، فسادات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے وغیرہ وغیرہ۔ عید کے موقع پر ان دوست احباب کی یاد ستاتی ہے جو ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ایسے ہی کرفیو اٹھ جانے کے بعد ہم حیدرآبادی ان عزیز و اقارب کی یاد میں آنسو بہاتے اور مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ جو فساد کی نذر ہوئے اور جناب عید کے دن تمام گلے شکوے بھول کر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ دل کی کدورت دور کرتے ہیں۔ کرفیو اٹھتے ہی ایسا ہی فعل دہرانے کی ناکام سعی کی جاتی ہے۔

دوران کرفیو حیدرآبادی شہری قید کر دیئے جاتے ہیں۔ نوجوان شہریوں کو پولیس پکڑلے جاتی ہے۔ جبکہ دوسروں کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دیا جاتا ہے۔ کسی بھی صورت میں گھر پر قید ہونے کو توقیت دی جاتی ہے لیکن جناب گرفتاری سے بچنا ایک مسئلہ ہے اس کے لئے بعض نوجوان نقل مقام کر جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کرفیو کے نفاذ کے ساتھ اپنے تمام بچوں کو گھر کے تہہ خانے میں قید کر دیتے ہیں۔ رات دن سخت نگرانی کرتے ہیں۔ بچوں کو گھر سے باہر جھانکنے تک نہیں دیتے۔ بچوں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ انھیں وقت پر کھانا مہیا کرتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں گرفتاری سے بچانے کے لئے مجھے بچوں کو قید کردینا پڑتا ہے۔ جو پولیس کی گرفتاری سے بہتر ہے" کرفیو اٹھتے ہی گھروں میں قید کئے گئے شہریوں کو رہائی مل جاتی ہے۔ ایک صاحب کرفیو اٹھنے کے بعد آزادی ملنے کی خوشی میں سڑک پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر انگڑائی بھی لینے نہ پائے تھے کہ دہشت پھیلانے کے الزام میں دھر لئے گئے۔ اسی لئے جناب آج کل کرفیو اٹھنے کے بعد بھی گرفتاری کا خدشہ لگا رہتا ہے جس طرح کہ ہمارے شہر میں امن بحال ہونے کے بعد پھر سے فساد ہوتا ہے۔

ہمارے شہر میں پست تعلیمی معیار کی ایک اہم وجہ کرفیو بھی ہے۔ اسکول اور کالجوں کو گرما، سرما اور بارش کے موسمی تعطیلات کے علاوہ عید و تہوار اور پیدائش و اموات کی کئی تعطیلات ملتی ہیں۔ تعطیلات کی طویل فہرست میں کرفیو کی چھٹیوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ کئی دن تعلیمی ادارے بند رہتے ہیں۔ امتحانات ملتوی کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ آج کل گھر سے تعطیلات ملنے پر بچے اسکول جارہے ہیں۔ تعطیلات ختم ہونے کے بعد بچوں کو پھر سے اسکول بھیجنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ تعلیم کی اہمیت جتانی پڑتی ہے ٹافی، چاکلیٹ اور پیسوں کی رشوت دی جاتی ہے پھر بھی اکثر بچے سوال کر بیٹھتے ہیں کیا کرفیو پھر نہیں لگ سکتا؟" منت سماجت، خوشامد کر کے اور رشوت دے کر اسکول بھیجنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بچہ کا تعلیمی

معیار اتنا پست ہو چکا ہے کہ وہ اپنا نام تک صحیح نہیں لکھ پایا۔ مزید براں گالی گلوچ کرنی سیکھ لی ہے اور ذہن فرقہ واریت کی گندگی سے متاثر ہو چکا ہے۔

کرفیو، جسمانی و ذہنی اذیت میں مُبتلا کرتا ہے۔ کرفیو برخواست ہونے پر ہم حیدرآبادی شہریوں کو ان تکالیف سے نجات ملتی ہیں۔ جسمانی تکالیف پھر بھی سہہ جاتے ہیں لیکن ذہنی اذیت اپنا رنگ جماتی ہے۔ کرفیو کے دوران بے یقینی کی کیفیت، حالات سے پریشانی اور مستقبل کی فکر ایک سوال "اب کیا ہوگا" بن کر دماغ پر لاٹھی چارج کرتا رہتا ہے نتیجۃً انسانی سوچ کرفیو زدہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا "کرفیو کے دوران میں اتنا الجھا رہتا تھا کہ میری بیوی کو سوت کے وجود پر شک بلکہ یقین ہو چلا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کرفیو کی پریشانی کے بجائے یہ بات اگر سچ ہوتی"۔ کچھ لوگ کرفیو سے اتنا متاثر ہوئے کہ کرفیو اٹھنے کے بعد شاعری کرنے اور انشائیے اور افسانے لکھنے لگے ہیں۔ کرفیو زدہ شعراء اور ادیب کی بہتات اخبارات اور رسائل کو کرفیو نمبر شائع کرنے کی محرک بن سکتی ہے۔ لیکن جناب معاملہ واقعی سنگین ہے۔ سنتے ہیں چند ایک لوگ کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پر پتھروں کو انسانیت کا درس بھی دینے لگے ہیں۔

کرفیو کی وجہ سے شادیاں ملتوی ہو جاتی ہیں جو کرفیو اُٹھنے کے بعد انجام دی جاتی ہیں۔ ہمارے شہر میں شادی کے رقعوں پر آج کل ایک اہم اطلاع منسلک ہوتی ہے۔ حالات پُر امن رہنے کی صورت میں شادی مقررہ تاریخ پر ہوگی۔ بصورت دیگر کرفیو اٹھنے کے بعد ہوگی۔ کرفیو اُٹھتے ہی بغیر بارات اور بینڈ باجہ دولہا ایسے جاتا ہے جیسے چوری کرنے جا رہا ہو۔ جہیز لئے بنا دولہا، دولہن کو لے جانے میں اپنی خیریت سمجھتا ہے۔ شادی کی خوشی سے زیادہ لوگوں کو شہر کے حالات میں دلچسپی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے شادی کی رسومات کا خاطر خواہ اہتمام ہو نہیں سکتا۔ ہمارے ایک دوست کو اپنی شادی کا آج بھی قلق ہے وہ کہتے ہیں "شادی کرفیو اٹھتے ہی کی گئی تھی جو صرف ایجاب و قبول تک محدود رہی"۔ کاش کرفیو نافذ ہونے سے پہلے عقد ہو جاتا تو کرفیو کے دنوں میں اضافہ کی دُعا مانگتا۔

کرفیو اٹھنے کے بعد دل میں کئی ارمان کروٹ لینے لگتے ہیں۔ سڑکوں پر چہل قدمی کرنے، ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے اور گلی کے نکڑ پر کھڑے سگریٹ پھونکنے کو دل چاہتا ہے۔ خود کو اور ڈاکٹروں کو آزاد دیکھ کر بیمار ہونے کو جی متلاتا ہے۔ اور تو اور جناب شکم سیر ہو کر کھانے کو دل للچاتا ہے۔ کرفیو کے دوران بھوک تو رہتی ہے لیکن کھانے کو نہیں ملتا۔ کرفیو اٹھنے کے بعد ہم ایک دوست سے ملنے گئے۔ انھیں دیکھا۔ شیو بڑھا ہوا، بال الجھے اور گال پچکے ہوئے۔ چہرے کی ہڈیاں نمایاں۔ دس دن کے کرفیو نے گویا ان کی عمر عزیز کے دس سال بڑھا دیئے تھے۔ دریافت کرنے پر اُنہوں نے بتلایا کہ قوم کی حالت کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اس حال کو پہنچے ہیں۔ یہ سن کر ہمیں تعجب ہوا۔ لوگ قوم کے غم میں لنچ و ڈنر اڑاتے اور اپنا وزن بڑھاتے ہیں۔ بعد از تحقیق انکشاف ہوا کہ موصوف نے پچھلے دس دنوں میں صرف دو مرتبہ کھانا کھایا تھا۔

دوران کرفیو اخبارات ، قتل و غارت گری، بھر ازنی، پتھراؤ، لاٹھی چارج، فائرنگ، پولیس کی جانب سے گرفتاریوں

اور زیادتیوں کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں سچ پوچھئے تو ہمیں اخبارات سے ڈر لگتا ہے۔ اخبار ہاتھ میں لیتے ہوئے دل دُعا کرتا ہے "میرے مولا! کم از کم میرے قتل کی اطلاع کل کے اخبار کی زینت نہ بنے۔" کرفیو اٹھنے کے بعد اخبارات دلچسپ ہوتے ہیں۔ مختلف قائدین اور سیاسی پارٹیوں میں نوک جھونک شروع ہوتی ہے۔ "فساد اس قائد نے کروائے ہیں" "فرقہ واریت کو اس پارٹی نے پروان چڑھایا ہے" "اگر الزام ثابت ہوجائے تو میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گا۔" حکومت سے استعفیٰ کا مطالبہ" وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لگتا ہے مُردہ جانور کے اطراف گِدھ بیٹھے نوچ کھسوٹ کر رہے ہیں۔

کرفیو اُٹھنے کے بعد حیدرآبادی شہری چند اہم کام انجام دیتے ہیں۔ تھیلیاں اور ڈبّے اکٹھا کئے بازار کا رُخ کرتے ہیں۔ پولیس چوکیوں اور عدالتوں کے چکر کاٹتے ہیں۔ عزیز واقارب کی ضمانت دے کر انھیں گھر لے آتے ہیں زخمیوں کی عیادت کرنے دواخانے جاتے ہیں۔ ڈیتھ سرٹیفکٹ اور امداد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ پھر سے کرفیو میں مقید ہونے کی تیاری کرنا بھی ہوتا ہے اس لئے کہ ہمارے شہر میں فسادات کچھ کم ماہواری فیچر بن گئے ہیں۔ فساد کے ساتھ کرفیو نافذ ہونا اس شہر کا مقدر بن چکا ہے۔ لہٰذا ہم قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ کم از کم غذائی اجناس اکٹھا کرلیں اور جو غذائی اجناس اکٹھا نہ کرسکیں وہ فاقہ کشی کی عادت ڈال لیں۔ اور آخری مشورہ — یہ مضمون جلد ختم کریں۔ کہیں کرفیو پھر سے نافذ نہ ہوجائے۔

برق آشیانوی

شعرا کا ٹریننگ اسکول

شعرائے وقت جب ہوئے دوشِ سخن پہ بار
اونچی ہوئی فضاؤں میں یہ وقت کی پکار
ناداں سخن وروں کو ٹریننگ دیجئے
کہتے ہیں کہ شعر یہ کوچنگ دیجئے
کچھ انتظام بہتر و معقول چاہیئے
شعرا کی تربیت کا ایک اسکول چاہیئے
بلڈنگ ایک خستہ و پامال دیکھئے
سبزہ اُگا ہوا در و دیوار پر رہے
اوقات، شب کے دس سے رہیں تا بہ صبح چار
دن میں کیا کریں غم و آلامِ روزگار
یا دن تمام کوچۂ جاناں میں پڑ رہیں
اور شام تک وہیں غمِ دوراں میں سڑ رہیں
نکلیں جو کوئے یار سے لیں راہ سوئے بار
گر مفت کی ملی تو بھلا ورنہ پھر اُدھار
نکلیں جو میکدے سے تو پھر شہر گھومتے
ہو جائیں شب میں داخلِ اسکول جھومتے
کرتا و پائجامہ، یا دھوتی ہو یونیفارم
موسم کے اعتبار سے وہ کولڈ ہو یا وارم
شعرا کے سر کے بال ہوں حد سے بڑھے ہوئے
گنجا اگر ہو کوئی تو رومال باندھ لے
در ایک سال کا ہو مقرر کوئی نصاب
مضمون پر ہر ایک ہو تصنیف اک کتاب
سب کے لئے ہوں چند مضامین لازمی
شعر و سخن کی سائنس کہ تاریخ شاعری
اِن میں ہوں اختیاری مضامین پانچ سات
جیسے جدید نظم، غزل اور رباعیات
گر بیش ہوں کتابیں تو چالیس کا بیان
تعلیم ہو گئی ہے بہت آج کل گراں
بیڑی نکال دیجے قواعد کی پاؤں سے
اور شاعری کو قید سے آزاد کیجئے
پابندیاں صحیح زباں کی اُٹھائیے
تقطیع اور بحر کی زلفیں کٹائیے
پھر صفحۂ سخن سے مٹا دیجئے عروض
حرکات اِن کے کوئی نہ ان کے کوئی نیو ض
مصرعہ ہو ایک لانگ تو اک مصرعہ شارٹ ہو
یوں نظم اک نمونۂ ماڈرن آرٹ ہو
سبجکٹ ہوں تھیوری کے تو ساتھ ہو عمل
دس بارہ لیجئے گا کلاسس پریکٹیکل
کروائی جائے مشق فنِ سرقہ کی کڑی
اشعار کس طرح سے دئے جاتے ہیں تڑی
استادِ فن کے شعر کی گردن مروڑ کر
بھر لیں پھر اس میں اپنے تخلص کو جوڑ کر
تعریف ہو تو کیسے کیا جاتا ہے سلام
ہوٹنگ ہو تو کیسے چلیں چھوڑ کر مقام

(سلسلہ صـ۳۲ پر)

بتلائیے گا اُن کو ترنم کے قائدے
اور ہو سکے تو تھوڑے سے گانے کے قاعدے
گرتا ہو کوئی شعر کو کیسے سنبھال لیں
کس طرح فلمی گیت کے سانچے میں ڈھال لیں
دو چار لیشن اور کچھ اڈوانس بھی سکھاؤ
گانے کے ساتھ ساتھ ذرا ڈانس بھی سکھاؤ
شعرائے فلم ان کے مقرر ہوں لکچرار
اور اک پرنسپل ہو پرانا سنگیت کار
طور و طریق شعر کا ماہر بنائیے
القصہ مختصر انہیں شاعر بنائیے

لہ lesson

-:- -:- -:- -:-

جگر نظام آبادی

غزل

مرنے کے نہیں مجھ کو یقیں ہے مرے دشمن
مانا کہ کئی روز سے بیمار بہت ہیں
جس جیب میں ہو نوٹ کترتے ہیں وہی جیب
جو ہے بھی مرے گھر کے سمجھدار بہت ہیں
صحرا میں چھپے بیٹھے ہیں خونخوار درندے
بستی میں جو کتے ہیں وہ خونخوار بہت ہیں
لیڈر کی کسی بات کو گرنے نہیں دیتے
چمچے جو ہیں لیڈر کے وفادار بہت ہیں
صورت تو ہے کالی مرے محبوب کی جگرؔ
جو داغ ہیں چیچک کے چمکدار بہت ہیں

ساغر شولاپوری

ڈسکو پوئٹری

سوکھی زلفوں کو سویاں لکھ دو
ترچھی آنکھوں کو ٹانیاں لکھ دو
جھاڑو تارے کی شکل کو شاعر
جی میں آئے تو کہکشاں لکھ دو
خوبصورت ہیں گول گول اگر
اس کے گالوں کو روٹیاں لکھ دو
جان پیاری ہے گر تمہیں اپنی
آج قاتل کو ہمسریاں لکھ دو
سیدھا کرنا ہے گر زمانے کو
آڑا نام اپنا پہلواں لکھ دو
ڈگریاں دینے والی بلڈنگ پر
ردی کاغذ کی ہے دکاں لکھ دو
سن کو سنگیت بپتی لہری کا
ناچ رہیں بوٹے پوٹیاں لکھ دو
دال روٹی مرے تلک — ہمنا
اُن کے حصے میں مرغیاں لکھ دو
ڈسکو پوئٹری کہتے ہیں اس کو
ٹیوب لائٹاں کو چمنیاں لکھ دو

-:- -:- -:-

رحمت اللہ خاں مالوی
(اکولہ)

تمہارا کیا کام ہے ....

گانا ایک فعل بھی ہے عمل بھی۔ ہونٹوں کی جنبش زبان کی حرکت اور حلق کی خرخراہٹ جب متفقہ طور پر شرارت پر آمادہ ہوں تو "گانا" سرزد ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اس حرکت کے سرزد ہونے میں طبیعت کی گدگداہٹ کو بڑا دخل رہتا ہے۔ گلے اور پھیپھڑوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، گانا گانے والوں کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جہاں ذرا طبیعت لڑکھڑائی "الاپنا شروع"۔ اس میں انسان اور حیوان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ ماحول کا خیال نہ زمانے کی پرواہ۔ سنجیدہ و غیر سنجیدہ ہر دو ایک ہی کشتی میں سوار نظر آتے ہیں۔ عمر اور مرتبہ کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی جیّد قسم کا بزرگ عالم تنہائی یا بے خودی میں "چھوڑ بابل کا دیس میں تو چلی پیا کے دیس" گنگنانے لگے تو حیرت یا تعجب کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی انہیں ٹوک کر دل توڑنا چاہیئے ہر دو صورتوں میں خفت آپ ہی کو اٹھانی پڑے گی۔

حلق سے گانا سرزد ہونے میں "بے ساختگی" کا زیادہ ہی حصہ ہوتا ہے۔ یہ بے ساختگی موسم کا اثر بھی ہو سکتی ہے یا اچانک خوشی بھی۔ گدھا ہری گھاس دیکھ کر ہی "گانا" شروع کر دیتا ہے۔ اور موسم سرما میں ٹھنڈے پانی کا غسل انسان کو پکا گانا گانے پر مجبور کر دیتا ہے "ہائے رے انسان کی مجبوریاں"۔

گانا پسندیدہ بھی ہوتا ہے اور ناپسندیدہ حرکت بھی۔ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا انحصار گیت کے مزاج پر ہے گیت کی سرشت ہوتی ہی ہے کچھ ایسی۔ اسے اتار چڑھاؤ کہتے ہیں۔ جو سنگیت کے "بہاؤ" میں بہہ جاتی ہے اسے "بھاؤ" کہتے ہیں۔ یہ بھی بازار کے بھاؤ کی طرح گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ آج کل لمبی اور بے سری تانیں پسند کی جا رہی ہیں (شاید مہنگائی کے مزاج کے مطابق) گانے کی پسندیدگی کا سبب آواز کا لوچ اس کی مٹھاس اور رس ہے۔ لیکن جب سے شکر مہنگی ہوئی ہے کڑوی کسیلی دھنوں کا رواج چل پڑا ہے۔ کرخت اور بے ہنگم آوازیں مقبول ہوتی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پتھروں کی کھڑکھڑاہٹ ایک قسم شیشوں کی کھنک بے لطف و بے مزہ شہری۔

گانا سننے کے شائقین کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ شور و شغب والی موسیقی اور کرخت آوازوں پر وہ اچھل کود

جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اس اچھل کود کا نام ڈسکو ہے۔ جس سے نظریۂ ڈارون کو تقویت ملتی ہے۔ وجدیا حالتِ وجد اب نایاب چیز ہے۔ پہلے لوگ بھی عجیب تھے سُریلی آوازوں پر ہی جھوما کرتے تھے وہ بھی دور سے اور اپنی جگہ بیٹھ کر۔ کیا خاک مزہ آتا ہوگا انہیں۔ خیر TRADITIONS بدلتے ہی رہتے ہیں۔

گانے کے بول بھی "عجیب الخلقت" ہوتے ہیں۔ جب تک ان کا تعلق صرف "فلمی دنیا" سے تھا یہ بول کانوں میں رس گھولا کرتے تھے لیکن ادھر "فلمی دنیا" سے "رشتہ ازدواج" استوار کرنے کے بعد یہی "بول" ذہن میں زہر گھول رہے ہیں۔ رشتہ ازدواج ہے ہی چیز ایسی۔

گیت اور گلوکار کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے یہ رشتہ جلدی قائم بھی نہیں ہوتا اور قائم ہو جائے تو موت پر ہی ٹوٹتا ہے۔ بڑی لمبی تان ہوتی ہے اسکی۔ گلوکاروں اور گانا سننے والے شائقین کے درمیان بھی عجیب ربط ہے۔ سامعین کا گلوکاروں کے ساتھ TREATMENT مختلف و نامساوی ہوتا ہے۔ اگر آپ یا ہم گائیں تو لوگ علامت کے طور پر گدھے یا کوّے کی تصویر ـــــــــ دکھا دیں کہ عقلمند کو اشارہ کافی ہے اس پر جو نہ سمجھے وہ اناڑی ہے اس کے بعد کی راہ ملامت اور حجامت سے ہو کر ندامت پر آکر ٹھہرتی ہے۔ ایسی حالت میں محلہ یا پڑوس میں گانا خطرناک ہوتا ہے۔ پڑوسی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں اگر کسی کو گانا سننے کا شوق ہی ہو اور طبیعت نہ مانتی ہو تو اسے چاہیئے کہ شہر سے باہر چلا جائے یا جنگل کی طرف منہ کر کے خوب زور زور سے گا کر دل کی بھڑاس نکال لے۔ یا رات کے سناٹے میں گھر کی کھڑکیاں دروازے مضبوط بند کرکے اور دل ہی دل میں لمبی تان نکال کر اطمینان سے سو جائے پیٹ کا درد بھی اچھا ہو جائے گا کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا شرافت پر بھی کوئی آنچ نہ آنے پائے گی۔

بعض حضرات اس معاملہ میں بڑے ہی ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ "چاہے "انھیں" کوئی کچھ بھی کہے"۔ اپنی ہی الاپتے رہتے ہیں انجام کار محلّہ والوں کو حیا آتی ہے اور وہ دربدری پر مجبور ہو جاتے ہیں مستند گلوکار چاہے جیسا بھی گائے اسے پسند کیا جاتا ہے حالانکہ وہ علی الاعلان کہتا ہے۔

" گانا آئے یا نہ آئے گانا چاہیئے"

اور سامعین بھی ٹھمک ٹھمک کر داد دیتے ہیں اتنے ہی پر قناعت کرتے تو کچھ اور بات ہوتی " مگر ستم بالائے ستم اپنے آپ کو گانے والے کی جگہ فرض کر لیتے ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت قابلِ دید ہوتی ہے جب گانا رومانٹک ہو اور ڈوئٹ بھی ہو۔ اس حالت میں بھی کیف و سرور اس وقت دونا ہو جاتا ہے جب "سننے والا" گلوکار کے اور "سننے والی" گلوکارہ کے بول دہراتے ہیں۔ اگر سامعین کنوارے ہوں۔ ایک ساتھ کالج میں پڑھتے ہوں اور پڑھنے کے بہانے باغ میں بیٹھے ہوں تو پردہ سیمیں کا منظر بھی سامنے رہتا ہے اور دل ہی دل میں وہ سب کچھ انجام دے لیتے ہیں جو پردہ سیمیں پر دیکھا تھا۔ بعض حالات میں تو وہ بھی جو دیکھ نہیں سکے تھے۔ اسی لئے کنوارے جب کبھی پکنک پر جاتے ہیں کچھ لے جائیں یا نہ لے جائیں ریکارڈ پلیئر ضرور لے جاتے ہیں بائے بے چارہ ریکارڈ پلیئر۔

اگر سامعین نئے نئے شادی کے بندھنوں میں بندھے ہوں تو میاں ریڈیوگرام کے سامنے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی نظروں سے نئی نویلی دلہن کو دیکھتے جاتے ہیں جو کچن میں آٹا گوندھ رہی ہوتی ہے۔ وہ بھی جوابا ً یوں ہے کہ مصداق دزدیدہ نگاہی سے میاں کی طرف دیکھتی ہے اور گلوکارہ کے بول دہراتی ہے اور آٹا گوندھنے کا عمل زیادہ ہی تیز ہوجاتا ہے ایسی حالت میں انھیں کوئی تیسرا دیکھ لے تو بے چارے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور گانے پہ بے تکا تبصرہ شروع ہوجاتا ہے اور بعد میں گانے کے اچھے یا برُے ہونے کا حکم صادر کردیا جاتا ہے۔ اسی لئے ہماری طرف مقامی زبان میں مثل مشہور تین تگاڑا کام بگاڑا۔

پرانے شادی شدہ جوڑوں پر رومانٹک گیت بالکل اثر نہیں کرتے کہ "راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے" اگر چنگاری میں ہلکی سی بھی رمق باقی ہو تو تھوڑی دیر کے لئے بھبک اٹھتی ہے ضرور غصہ میں پیچ و تاب کھاکر سرد ہوجاتی ہے۔ اس لئے کوئی "پرانے" بزرگ موجودہ رومانوی گیتوں کو سن کر غصہ ہوں تو حیرت یا تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اور ہوتا بھی یہی ہے۔ ساری جھلاہٹ گانے پر نکلتی ہے یا موجودہ تہذیب پر۔ شرح و بسط کے ساتھ اس گیت پر تبصرہ ہوتا ہے اور آخر میں گیت کو "اخلاق سوز" گردانا جاتا ہے۔ ریڈیوگرام بند کرالیں ہے دل سوزی کی۔ گانا تو سن ہی چکے تھے اب کر بھی کیا سکتے ہیں"

گیت یا گانا لکھنا بھی ایک مستقل فن ہے لیکن آج کل یہ بھی سہل ہوکر رہ گیا ہے اور وہ بھی سدا ہم (ہن) کی بدولت ہم اس فن کو شروع شروع میں مشکل سمجھتے رہے لیکن اب دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو شاعر کہہ سکتے ہیں۔ فلمی شاعر نہ سہی فلمی شاعر تو ہیں۔ گانا لکھنا بھی کوئی مشکل کام ہے۔

گوری او گوری کہاں ہے دُوری
لا آباندھ دوں ، دوں ، دوں تیرا منہ . . . ہُنھ
بکواس کرتی ہے زیادہ کیا ہے تیرا ارادہ
لا آباندھ دوں دوں تیرا منہ . . . ہُنھ

اس قسم کے گیت لکھنے کے لئے وزن کی ضرورت نہیں۔ وزن تو شاعری جیسی خرافات کے لئے ہوتا ہے کہ شاعر کا کوئی "وزن" نہیں ہوتا۔ یہاں گیت کار کا ہی وزن کافی ہے جو چل گیا وہی سکہ۔ اس کے بعد بھی ستار کی گت بننے لگے تو گلوکار کی بے ہنگم آوازیں کافی ہیں اس لئے گانا لکھتے وقت

آہا آہا۔ یاہیو۔ ارارا دھم دھم یا
کھمبا ہو کھمبا بجلی کا کھمبا

جیسی آوازوں والے فقرے یا الفاظ تراش لیجئے اس لئے کہ ڈکشنریوں میں نہیں ملیں گے۔ معاملہ برابر۔ کبھی اپنے ظرف کے مطابق میر و غالب کے مصرعہ استعمال کر لیجئے گانا مکمل۔ باقی جھول موسیقاروں کے سازوں میں ایسا دب جائے گا کہ عمر بھر اُلجھنے کا نام نہ لے گا مثلاً۔

"قید حیات و بند غم" سوز و الم و رنج و محن
آنسوؤں کا ہوا ایسا ملن گھبرایا میرا پیارا سجن
کشتی جیون کی ٹوٹ گئی
او رانی تو کیوں روٹھ گئی

ہدایت :- یہ گیت بڑی ہی پُرسوز لے میں گایا جائے گا۔ ہیرو پر فلمایا جائے گا۔ ہیرو کبھی گھر میں۔ کبھی ساحل سمندر پر ریت کے کنارے کبھی فٹ پاتھ پر گاتا ہوا نظر آئے گا۔ اُدھر ہیروئن سطح سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر برفانی علاقے میں یہ گیت ٹیپ ریکارڈ یا ٹرانزسٹر پر سن رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے گلیسرین ٹپ ٹپ رواں ہوگی اور تھیٹر میں بیٹھی ہوئی خواتین بھی زار و قطار رو رہی ہوں گی۔ گانا ہٹ فلم چل نکلی باکس آفس پر ہُن برسے گا اور گیت کار شاعر اعظم۔ (مگر غالب کو اتنی کوفت ہوگی کہ وہ کوفتہ ہو جائے گا) یوں تو گانا گانے سے گانا لکھنا ہی زیادہ سود مند ہے (ہم دونوں تجربوں سے گزر چکے ہیں) مگر یہاں فن سے زیادہ فن کار کو دیکھا جاتا ہے۔ یہاں فنی چابکدستی سے زیادہ فنکارانہ ہشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ گیت کار اور گلوکار دونوں بھی گیت کے "بھاؤ" میں بہہ جاتے ہیں صبح تک جو گیت کار پسندیدہ تھا شام کو OUT DATED قرار دے دیا جاتا ہے آخری پائیدان کب پہلا پائیدان بن جائے اور پہلا پائیدان کس مرحلے میں آخری پائیدان سمجھی جائے کہا نہیں جا سکتا۔ فلمی دُنیا کا دستور یہی ہے۔ کہ

جسے چاہا سر پہ بٹھا لیا
جسے چاہا در سے اٹھا دیا
تیری سمجھ کے ہیں یہ فیصلے
بڑے نصیب کی بات ہے

یہ حمام ایسا ہے جس میں ۔ ۔ ۔ ۔ جس کے پاس چالاکی ہشیاری۔ اور مکاری کا TRADE MARK نہ ہو یہاں قدم نہ رکھے۔ (ٹریڈ مارک سے بازار میں چیزیں کھپتی ہیں) اس سے بہتر ہے کہ اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہے۔ اور طبیعت زیادہ ہی گدگداتی ہو تو اپنا حمام ہی کیا برا ہے۔ تنہائی بھی ہے شاور باتھ کی شہنائی بھی اور لے بھی اپنی اور شعر بھی اپنا اسی پر بڑی بے فکری سے گنگنایا جا سکتا ہے "تمہارا کیا کام ہے"۔

کہ یہی علاجِ دلِ بے تاب سمجھا!

○○

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ تخلیقات پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیں ۔۔۔!

بے دھڑک مدراسی

آج کا تازہ اخبار

سُرخیوں میں بُو لہو کی، چیختی عبارتیں
امن اور فساد سے لدی ہوئی اداریں

حرف حرف حادثے و لفظ لفظ سانحے
سازشیں، بغاوتیں، سیاسی حربے، غارتیں

شور و غل سبھاؤں کے، ضمیر بے صداؤں کے
کھوکھلے بیان دیتی دوغلی وزارتیں

تکیے ریڈیو کے روزنامہ کی رضائیاں
بے حسی کے بستروں پہ اونگھتی بشارتیں

ارضیات کی خریدی رشوتوں کی بھیڑیں
محنتوں کا خون پیتی سر بلند عمارتیں

گم فسانہ کاریوں میں کُل حقائقِ جہاں
کرتبیں صحافتوں کی، کاغذی مہارتیں

کالموں میں قید و بند بلبلاتے واقعے
ننگے اشتہار کی نقاب میں تجارتیں

وہ بھی بک چکا ہے جس کا سُرخیوں میں نام تھا
لکھنے والو لکھتے جاؤ وقت کی شرارتیں

قطعات

محمد عبدالکریم ماہر

قدِ زیبا کی زیبائش نئی ہے
مکان بوسیدہ آرائش نئی ہے
چمک سی آگئی ہے جھرّیوں میں
پُرانا شوز ہے پالش نئی ہے

مورسے بھی خوبصورت نوجواں
جب ہوئی منگنی تو شیرِ نر بنا
حال اس کا کیا کہوں شادی کے بعد
رفتہ رفتہ خر بنا خچّر بنا

میرے کاندھے سے وہ بت جب آلگا
چھا گیا نس نس پہ میری نشہ سا
ہوش گم تھے اور جب آیا ہوش میں
وہ نہ تھا اور میرا بٹوہ بھی نہ تھا

شادی میں اک عزیز کی سب کچھ بجا ہوا
تاخیر رونمائی میں ہونا بُرا ہوا
آئندہ دلہنوں کا ریڈی میڈ ہو نقاب
منہ دیکھنے دکھانے کو زِپ ہو لگا ہوا

اک چاہنے والے کو بنا کر اُلّو
نکلی تھی پئے نکاح مس گل شبّو
لوٹا دیا عاشق کو مگر خالی ہاتھ
قاضی ہی پہ وہ ہوگئی ایسے لٹّو

مکان

اقبال ہاشمی

کیا کروں میں، مجھ میں جان ہے
وہ مُقر ہیں اور منہ میں پان ہے
میری حکمت کی یہی پہچان ہے
گھر کے پچھواڑے میں قبرستان ہے
میرا گھر بھی کیسا عالی شان ہے
جو ہے کمرہ بس وہی دالان ہے
اب زمینداری اسے کہہ لیجئے
میرے گھر کے سامنے بھی لان ہے
میٹھا میٹھا بولتے ہیں اس لئے
پھیکا پھیکا آپ کا پکوان ہے
ہاشمیؔ اس سے تمہیں کاہے کا ڈر
جو مقابل ہے خطابی خان ہے

یوسف یکتا

جس کا اونچا مکان ہے پیارے
آدمی وہ مہان ہے پیارے
ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اپنا
جانِ زندہ دلان ہے پیارے
مال و اسباب کچھ نہیں اس میں
کیسی "تیرھویں" دوکان ہے پیارے
راستہ ہو ہی جائے گا ایک دن
یہ جو اونچا مکان ہے پیارے
ساٹھ کا ہو گیا تو کیا یکتاؔ
"دل ابھی تک جوان ہے پیارے"

منہ پھٹ جونپوری

آدمی وہ مہان ہے صاحب
جس کی گز بھر زبان ہے صاحب
سر پہ جو آسمان ہے صاحب
بس وہی سائبان ہے صاحب
گھر تمہیں کس طرح سے دکھلاؤں
ٹوٹا پھوٹا مکان ہے صاحب
سچ کہوں تو ہے ایک بیوی بھی
جو بڑی دھان پان ہے صاحب
دو کبوتر جو اس نے پالے ہیں
مجھ کو اُن کا ہی دھیان ہے صاحب
غور کیجے تو اب سیاست میں
کس قدر کھینچ تان ہے صاحب
ایک کرسی وزیر اعظم کی
سب کا اُس پر ہی دھیان ہے صاحب
یہ "شگوفہ" ہے یا کہ ٹانک ہے
دور، پڑھ کر تھکان ہے صاحب
گھر جلائے ہیں تاپنے کے لئے
یہ الگ داستان ہے صاحب
ہر عضو دیکھئے نمایاں ہے
جسم پر تائیلان ہے صاحب
کوئی بھی کیا بگاڑ لے گا میرا
جب خدا مہربان ہے صاحب

محمد ابراہیم سُہاؔ قادری

یہ بھی فیشن ہے

پھرے بے پردہ بازاروں میں عورت، یہ بھی فیشن ہے
دکھائے ہر کس و ناکس کو صورت ، یہ بھی فیشن ہے

پہنتی ہیں برائے نام اکثر عورتیں بُرقع
کھُلا ہو چہرہ اور سر، کیا قباحت ، یہ بھی فیشن ہے

جو پوچھا کیوں لئے پھرتے ہو یوں بیوی کو بے پردہ
تو اک صاحب نے فرمایا کہ حضرت ، یہ بھی فیشن ہے

بٹھا کر گھر میں شوہر کو وہ شاپنگ خود ہی کرتی ہیں
رہے ہمراہ شوہر کیا ضرورت ، یہ بھی فیشن ہے

جواں لڑکوں کے ہمرہ لڑکیاں پڑھتی ہیں کالج میں
کسی سے گر کسی کو ہو جو اُلفت ، یہ بھی فیشن ہے

ہے مردوں سے زیادہ اِن کو شوقِ سنیما بینی
یہ عادت ہوگئی ہے اِن کی فطرت، یہ بھی فیشن ہے

سرِ بازار لڑکے، لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھے
اگر ہو جائے سینڈل سے مرمت ، یہ بھی فیشن ہے

اگر چھینکیں تو پھٹ جائے لباس تنگ ہو ایسا
نہیں پرواہ اگر جاتی ہے عزت، یہ بھی فیشن ہے

تنِ عُریاں دِکھا کر انتخابِ حُسن میں آئیں
ہے تھوڑی بے حیائی، پھر ہے شہرت، یہ بھی فیشن ہے

جو دِکھلاتی نہ تھیں غیروں کو اپنا ناخنِ پا بھی
وہ اب دیتی ہیں نظّارے کی دعوت، یہ بھی فیشن ہے

سراسر ہے خطا مردوں کی یہ آزادیٔ نسواں
کریں خود کارِ بد، شیطاں پہ لعنت، یہ بھی فیشن ہے

سُہاؔ سب ہی نظر آتے ہیں اس حمام میں ننگے
مگر ہے شیوۂ پند و نصیحت ، یہ بھی فیشن ہے

○ ○ ○

غزل

سراجؔ نرملی

آرزو تھی کہ کوئی اک تو کلکٹر نکلے
ناخلف، شاعر و ڈرائیور و اَنٹڈر نکلے

جو بھی آئے ترے کوچے میں وہ بیٹلر نکلے
پہلواں باپ ، برادر ترے فائٹر نکلے

وہ تو بد تھا، مگر یہ لوگ تو بد تر نکلے
فلم کے فیلڈ میں ہٹلر کے بھی فادر نکلے

ہر طرف خوں ہے، کٹے سر ہیں، جلے گھر ہیں یہاں
"جن کو انسان سمجھتے تھے وہ پتھر نکلے"

آج انسان بھلا اتنا چھچھورا کیوں ہے
کی جو تحقیق تو اجداد ہی بندر نکلے

اپنی حالت سے تو شوفر ہی نظر آتے تھے
پوچھی تفصیل تو میڈم کے وہ شوہر نکلے

شیخ صاحب کی نصیحت سے سبھی سدھرے ہیں
بیاڈلک دیکھئے فرزند ہی لوفر نکلے

ساتھ رشوت کے منسٹر کی سفارش لائیں
چاہتے ہوں کہ سراجؔ! آپ کا تُنڈر نکلے

آندھرا پردیش

اپنے عوام کو معاشی آسودگی فراہم کرنے کا عہد کرتا ہے

جنوری 1983ء میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسٹر ین۔ ٹی۔ راما راؤ، کی فعال قیادت کے تحت حکومت آندھراپردیش نے کمزور طبقات کی بھلائی کے کئی ترقیاتی پروگرام بشمول پرگتی پدھم اسکیمات کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لائے ہیں مختلف شعبوں میں ان پروگراموں کے قابل ستائش نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

امتیازی حیثیت کے حامل پروگرام :-

1)۔(1) دو روپے فی کلو چاول — 80ء 95 لاکھ خاندان مستفیض ہوئے۔

(2) ارزاں نرخ کی دوکانیں — 32000 سے بھی زیادہ ہیں۔

(3) چاول کی مقدار سربراہ کردہ — اب تک تقریباً 25 لاکھ ٹن چاول سربراہ کیا گیا۔

2)۔ کسانوں کی امداد :-

(1) اعلیٰ قسم کے بیجوں کی تقسیم — 51000 ٹن

(2) کیمیائی کھاد — 16ء 9 لاکھ ٹن

(3) فصلوں کے لئے قرض — 51ء 159 کروڑ روپیے

(1983-84) سابقہ برسوں میں اسکی نظیر نہیں)

(3) دیہی ترقی :-

بائیو گیس پلانٹ — 8801

(4) کمزور طبقات کی بہبودی :-

درج فہرست اقوام۔ درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات کے خاندانوں کی تعداد، جن کو فلاحی پروگراموں سے فائدہ پہنچا۔	9،10 لاکھ

(5) بہبودی خواتین :-

تروپتی میں خواتین کی یونیورسٹی کا قیام۔

جائیداد میں خواتین کو مساوی حصہ دینے کے لئے قانون کی تدوین۔

(6) غرباء کے لئے مکانات :-

(1) پختہ مکانات تعمیر کئے گئے	1،34 لاکھ
(2) تعمیر امکنہ کے لئے اراضیات کی تقسیم ..	5،50 لاکھ

(7) غذائیت سے معمور دوپہر کے کھانے کی اسکیم :-

37 لاکھ سے زیادہ بچے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

(8) توانائی :

(1) بجلی سربراہ کئے گئے مواضعات اور قریوں کی تعداد ...	2424
(2) برقائے گئے پمپ سیٹوں کی تعداد	80292

(9) صنعتیں :-

دیہی اور چھوٹے پیمانے کی قائم کردہ صنعتی یونٹوں کی تعداد	20,386
(10) پینے کے پانی کے نئے وسائل فراہم کئے گئے	24,962

ریاست ایک تابناک مستقبل کی دہلیز پر ٹھیری ہوئی ہے

جاری کردہ :-

ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR. Lr. No. 21859/Advt/CA/34-7/10.8.84.

راز سنتوکھ سنگھ (چنڈی گڑھ) (بسلسلہ گزشتہ)

جدید پنجابی نظم میں طنز و مزاح کا رنگ و آہنگ

دورِ حاضرہ کے دو سخنوروں صوبہ سنگھ اور ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر نے صنفِ طنز و مزاح میں خوب نام پیدا کیا اگر یہ کہا جائے کہ جدید دور کے وہ دونوں سب سے مشہور اور مسلّمہ طنز و مزاح نگار ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ حا[لانکہ] صوبہ سنگھ کو گرنام سنگھ تیر کا اُستاد ہونا چاہیئے تھا لیکن حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ صوبہ سنگھ کو گرنام سنگھ تیر کا شاگرد بننا پڑا۔ صوبہ سنگھ کو پنجابی رسم الخط میں لکھنے کی مشق و مہارت گرنام سنگھ تیر نے کروائی اور اول اپنے اخبار "پنجاب پتر کا" کا مُدیرِ معاون مقرر کیا جہاں صوبہ سنگھ کے خوب جوہر کھلے۔

صوبہ سنگھ نے عام موضوعات پر بھی طنزیہ مزاحیہ تخلیقات پیش کیں جن کے چند مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ[چکے] ہیں۔ صوبہ سنگھ کی اس صنف میں شاہکار تصنیف منظوم "ہیر" ہے۔ اس میں صوبہ سنگھ طنز و مزاح نگاری میں ب[ہت] بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ اُس نے اپنا یہ سحر کرداروں، مخصوص صورتِ حالات (SITUATION) اور واقعات پر [ڈالا] ہے۔ علاوہ ازیں مکالموں اور اسلوب میں بھی یہ سحر کاری نمایاں ہے۔

صوبہ سنگھ کے طنز و مزاح سے کوئی بچ کر نہیں جا سکتا۔ وہ ہیر رانجھے کے معاون "پنج پیر" ہوں یا عصرِ حاضر کے ملاحظہ ہو اس کے طنز کی کاٹ:

دُدّھ پی کے کرن الاٹ پیراں ، اُہ کوئی رانجھے کا ل دے پتراں نہیں
ستاں پیڑھیاں توں پیشہ عاشقی دا، ساڈی مجنوں توں شان حقیر تاں نہیں
سچّے پیار دا اساں اظہار کیتا، کیتی چوناں دے وچ تقریراں نہیں
میوں محفل وچ سُندے گھوڑے ہویئے کوئی گُدڑیں لتھا وزیر تاں نہیں

عام موضوعات پر اس کا طنز و مزاح پنجابی کے شعری ادب میں بے مثل ہے۔ اس کی قابلِ ذکر خصوصیت برجستگی ا[ور] حاضر دماغی ہے۔ آمد کا وہ زور ہے جیسے کوئی دریا رواں ہو:

غصّہ اوس گوانڈھن داکی کرنا۔ بنیاں بالخوں جو سڑی بلی جاوے
ہرگی چوں بھونکدے پین کُتّے۔ کیہڑا عاشق پھر یار دی گلی جاوے
رونا اِک لوں کی، آدا اُدتیا اے، سارا شہر بلیک تے پلی جاوے
تیری یاد سجنی! بجلی وانگ ہوئی، اک دن آجاوے دس دن چلی جاوے

دسویں وار جد دسویں چوں فیل ہویا ، کرلئی ڈگری مجنوں سپیل اُتے
کوے ہوگیا ہجر دی اگ سڑ کے ، پوچا پھر گیا عقل دلیل اُتے
لیلیٰ بھالدا کالیاں عینکاں لا ، ٹھیڈی چھوکرے جس طرح جھیل اُتے
ہاتھی گزاں تے جھگاں نوں لبھدا نہیں ، لڑکی دیکھ لیندے یار ان میل اُتے

یہ تو ماڈرن مجنوں بیاں کی رسوائی کی داستان تھی ۔ اب گندا نئے حالات میں ماڈرن عاشق کا قصہ سنئے :

کرٹو بیلے ڈنگیڑاں داہ چھڈے ، ڈگ رانجھے دا چرے تاں چرے کتھے
گیا حسن دا اُٹھ اعتبار مڈھوں ، عشق چاکری کرے تاں کرے کتھے
لچھے بول تے بیڑیاں پیندیاں نے ، لوکاں اَج جھناواں دے دہن موڑے
کچے گھڑے نوں ہک دے نال لا کے ، سوہنی ڈُب کے مرے تاں مرے کتھے

کھانے کے مقابلے میں صوبہ سنگھ نے احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیا ہے ، عاشقوں کو البتہ غم کھانے سے کون روک سکتا ہے ،

کھان دالیاں چیزاں دی تھوڑ کوئی نہ ، کھاؤ سوچ کے پر بہت کم کھاؤ
بسکٹ ... دے ، دال کنکراں دی ، جان رکھیا لئی دَم دَم کھاؤ
قسماں کھان لئی ڈھیراں دے ڈھیر پٹیاں ، کھاؤ سکیاں تے بھاویں نم کھاؤ
جے کر مال حرام دا نہیں ملدا ، لاؤ عشق تے اوس دا غم کھاؤ

عشق کے مقابلے میں ہمارے معاشرے کی قدیم و جدید اقدار کا موازنہ جس لطیف انداز میں صوبہ سنگھ نے کیا ہے ، صنف طنز و مزاح میں مشکل ہی سے کسی اور فن کار کے ہاں یہ تیکھا انداز ملے گا :

گرمی عشق دی سوہیاں وچ چنگی ، کیوں کہ عاشقاں نوں جوڑا کوٹ کوئی نہ
ساگر لہر ھانیاں دا کویں تر لیئے ، کھڑا تیتاں تے تلا ، لوٹ کوئی نہ
چوچک سند کے آکھیا رانجھنے نوں ، تیرے رُوپ وچ بلیا کھوٹ کوئی نہ
تیرے نال پر ویاہ دیاں ہیر کداں ، تیرا جھنگ سیالاں وچ ووٹ کوئی نہ

سردار پرتاپ سنگھ کیروں مرحوم نے اپنی وزارت اعلیٰ کے زمانہ میں گرنام سنگھ تیر ، صوبہ سنگھ اور شمشیر سنگھ سروج کو چنڈی گڑھ میں آباد ہونے کے لئے اپنے گھر گھاٹ بنانے کی خاطر پلاٹ الاٹ کرنے کی پیش کش کی لیکن ان لوگوں کو تو خود چنڈی گڑھ شہر کے آباد ہونے میں شبہ تھا ، اس لئے یہ جیسیں بیض میں پڑے رہے ۔ بحالات موجودہ صوبہ سنگھ اسی پلاٹ کی رعایت سے کیتنا اعلیٰ پایہ کا طنزیہ کلام پیش کرتا ہے کہ باید وشاید !

کی ہوگیا جے داڑھی بھور ہوگئی، ہویا عشق توں دل اُچاٹ تاں نہیں
میرے ہوکیاں دا ودھے مُل کیتاں، چنڈی گڑھ دے اِہ پلاٹ تاں نہیں
کوئی نال سوا داں دے کسائی جاپئے، غم ہجر دا اے کوئی چپاٹ تاں نہیں
دیئیں جام ساقی! ڈِنا شیخ توں کی، شیخ شیخ ای اے، کوئی لاٹ تاں نہیں

ماڈرن مجنوؤں کی عشق کے بازار میں جو ارزانی ہے، ذرا اُس کا حال زار بھی ملاحظہ ہو:

موٹر اڈّے تے کھڑی سی ٹیپ رانی، مجنوں سمجھیا پیار پچھان والی
اکھیں ہنجو چھلکا کے بولیا اُہ، جیہڑی گل سی اک شان والی
سُن کے رانی نے سینڈل نوں ہتھ پایا، میاں مجنوں نے جھٹ پٹ گل ملٹی
غصّہ کرو نہ بھین جی! پچھیا سی، کہڑی بس لدھیانے نوں جان والی

صوبہ سنگھ شاعر کا تذکرہ کرتا ہوا جن حقائق کو پیش کرتا ہے، انھیں جان کر بے اختیار زبان سے نکلتا ہے
"اتنی بلندی! اتنی پستی!!"

کوئی اصل بھگوان دا روپ ہُندا، ساگر ٹپ سکدا، پربت رو ڑھ سکدا
پیٹھے گیڑے اِتہاس نوں پھیر دیوے، گڑھ راج ہنکار دا توڑ سکدا
چند سورج اِہ جھولے وچ پائی پھردا، ایہدے بولاں دے وچ تیاتاں نے
ڈردی موت دی ایس توں کنبدی ہے، پر اِہ ڈیٹی دا کہا نہیں موڑ سکدا

دورِ جدید کے عشق کی کیفیت اور عاشق، معشوق اور متعلقین کے رویئے میں تبدیلیٔ حالات کے باعث جو انقلاب آیا ہے، اُس کا بیان حقائق کے پس منظر میں دیکھیے:

پئے سرہنوں دے تیل دے نال چوپڑ، رانجھے ملکی نوں کہا، صلاح کی اے
عشق ہیر دا اینے، لٹی آیا ہور جھنگ نوں آؤں دا راہ کی اے
ملکی آکھیا چھوہرا دے جی آئیاں، تھوڑی جیہی اک گل تاں دس منیوں
عشق لاؤں تُر پیا ایں آن منڈھوں، کہڑی نوکری تیری تنخواہ کی اے

جیسا کہ ہم نے اوّل ذکر کیا صوبہ سنگھ کی تصنیف "ماڈرن ہیر" اس کے طنز و مزاح کا منفرد نمونہ ہے۔ خدا اور عشق کا بیان طنزیہ انداز میں ملاحظہ کیجئے:

کریے رب دی حمد، ثنا پہلاں، جہڑا کسے نوں نہیں تبول رمیاں!
جنھوں عشق نوں بنیاں نہ کم کوئی، عشق اوس دی ہوندا امول میاں!

رانجھے کا اپنی بھاوجاؤں کے ساتھ جھگڑا اور اس کا دلپذیر تذکرہ:

دھرتی آن نوں روز دُکار جاندیں، تھیوں سب بیماریاں نندیاں نے
لگا توں ہیں اساں نوں دو دن کے، ہور سب ٹھکانیاں وسدیاں نے

لُڈّن ملاح کے ساتھ کنارِ دریائے چناب پار اتارنے کے لئے گفتگو ہوتی ہے۔ لُڈّن کا تیکھا اندازِ بیان دورِ جدید کی لیبر تحریک سے کس قدر مشابہ ہے:

اساں رگڑ کے مت توں نہیں پینا، مڑ ھکا ڈو لیئے تے جان مار دے ہاں
بھاڑا لے کے ٹھیک مسافراں نوں، ٹھیل بیڑیاں پار اُتار دے ہاں

قصّہ "ہیر رانجھا" کے جملہ کرداروں کو صوبہ سنگھ نے طنزیہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا۔ کیدو اور ہیر سب پراُنھوں نے طنز کیا ہے۔ لیکن اس ذہنی کیفیت کے عالم میں بھی صوبہ سنگھ عشق کی عظمت سے انکار نہیں کر سکے۔ اشعارِ ذیل میں ہیر اپنی ماں سے مخاطب ہے:

عشق ہیر دا سمجھ اٹل ہویا، رشتہ لوڑیا رانجھنے نال مائے
مسئلے، گنجھلاں ساریاں کھل گئیاں، باقی رہا نہ کوئی سوال مائے
مکّہ چل کے آگیا وِچ بیلے، دتّا یار نے رب وکھال مائے
اُلٹے پیر میں حج توں پرت آواں، میری اس طرح کی مجال مائے
چاک، چاک، نہ آکھنا رانجھنے نوں، کوئی ہور ہی گڈھنی گال مائے

ہیر کی شادی کہیں اور کر دی جاتی ہے۔ رانجھا ہیر کے ہجر و فراق کا مارا بال ناتھ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ پھر جوگی بن کر ہیر کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دیگر مصنّفین کے برعکس صوبہ سنگھ نے آخر میں ہیر رانجھا کے وصال پیہ قصہ ختم کیا ہے۔ یوں اُس کا قصّہ طربیہ ہے، جبکہ دوسروں نے اِسے المیہ بنایا ہے۔ اور صوبہ سنگھ کے طنز و مزاح کا تقاضا بھی تو یہی تھا:

پائے ہُسّی کے ہتھاں وِچ ہتھ دوہاں، کر کے سچّڑے قول اقرار تُر گئے
عشق وِچ مُصیتاں جھلّیاں نوں، اوہ مناں توں جھٹ وسار تُر گئے
بیلے جھنگ سیال تے کھیڑیاں دے، وچھّے چھڈ جھناں توں پار تُر گئے
شراں ہتّھیاں گُوبجیاں دنجھل تے، یا ہواں نال پیار الار تُر گئے
داسی جھنگ تے تخت ہزاریاں دے، تور جگ تے عشق دی وار تُر گئے

اس دور کے دوسرے اہم شاعر گرنام سنگھ تیر ہیں۔ اُن کے دو درجن مجموعہ ہائے نثر و نظم طبع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے دو کتابیں بطورِ خاص مزاحیہ منظومات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے "عقل جاڑھ" زیادہ مقبول ہے۔ گرنام سنگھ تیر منفرد طنز د

مزاح نگار ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی وساطت سے لاکھوں سامعین و ناظرین اُس کے مزاحیہ کلام سے محظوظ ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ عام طور پر وہ رباعیاں کہتے ہیں۔ اور رباعی کے انداز میں پہلے دو مصرعے سنجیدہ ہوتے ہیں، تیسرا مصرع مزاح کی جانب رُخ کرتا ہے اور چوتھے مصرعے میں مزاح کا بھرپور اظہار ہوتا ہے:

کاہتوں پتھر ہو گئے ہو جی ہسینہ کر یا سِل دا
پہلاں ایداں بلدے سو جی بھور پھُلاں نوں بلدا
ہوکا بھر کے اساں آکھیا وس نہیں کجھ میرے
شاک تہا تھوں ایسا وجا، فیوز اُڈ گیا دِل کا

کل اُنھاں نے ٹُھبلیاں چُکیاں بھری سارے پائی
گذری بیتی محبت رو رو یاد کرائی
جراثیم پھر عشق ہوراں دے پیدا ہوون لگے
ڈِس انفیکٹ کراؤن لئی دل تے ڈی. ڈی. ٹی چھڑکائی

"ٹو لیٹ" دا تختہ لکھ کے دِل ہوہڑے لٹکایا
اِک کرائے دار چھبیلا اس وِچ آن سمایا
نہ تاں دئے کرایہ سانوں، نہ کرے دِل خالی
کیسی رینٹ دا کوئی لڑاں گے سانوں سمجھ نہ آیا

تیرے ہتھ نے میرے ہتھ نوں ایداں گھُٹ گھُٹایا
چپ چپیتے راز محبت ہُندا جو ہیں بھیڑا آیا
چھوہ ہتھاں دی جادو کر گئی، چھاں اپنے پوٹے
جو ہیں کسے بھائی نے ہُندا بھوگ کڑاہ دا لایا

کل اُنھاں دے لو لیٹر نے پاتا بھیڑ پواڑا
ساری رات نیند نہ آئی، دُجیا دل دا تاڑا
"ماہی میریا جے توں میری سسٹن وساویں جانوں
سوہرا بنے لگا دوں گی میں، سکّو گھر جیل ساڑا"

علم دیں منشی توں پڑھنا، تاے کمانے ڈنڈے
میرے جے مانیٹر اُس نے سو سو واری چنڈے
کاکا پڑھدا آنٹی کولوں، لوے پینگھ دے جھوٹے
آنٹی اتے سکول دیکھ کے ہوتا کا لیے ہٹڑے

حسن، عشق دے مت بھیداں دی آکھی سمجھ کہانی
دھرتا مار کے بُوہے دے وچ بہہ گئی دل دی رانی
جے توں عشق! حسن مانا، ہن میریاں منگاں
ٹی، اے، ڈی، اے اپ گریشن وَدّھ توں وَدّھ کرانی

وطنِ عزیز کی اقتصادی حالت کا بیان تبیر مزاحیہ انداز میں یُوں کرتا ہے:

دنیا دے بازاراں اندر، سنکٹ آیا کیسا
ڈالر، پونڈ بیرکدے پھردے رنگ پلٹیا ایسا
ساڈے تیز سنگوٹی آئی، وِچّے بدھی دولت
اس دولت دا نام پیارے "موری والا پیسہ"

آزادی کے بعد ملک میں جو طوفانِ بدتمیزی بپا ہوا ہے۔ وہ بجائے خود ایک المناک داستان ہے لیکن تبیر تے ہیں کا بھی تو، "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

رشوت خوری، چور بازاری. ملاّوٹ وَدھ مہنگائی
ہر چیز دے وچ ملاوٹ، لے آزادی آئی
ساڈے پلّے ہیں ٹڑتالاں' رہیئے ڈھنڈ دیاڑاندے
"ابھی عشق میں کیا ہوتا ہے" آگے دیکھو بھائی

پُرانے اخبارات ردّی کے بھاؤ فروخت کرنا، استعمال شدہ کنستر اور بوتلیں بیچنا بظاہر ایک معمولی سا سانحہ لیکن یہ پُر اسرار کہانی تبیر کی زبانی سنیئے:

"ردّی دیکھو، پیسے دیکھو، بوتل، سُوہڑی چھانی"
ہاکر کئی منتری بن گئے، ساڈی سُنو کہانی
ہُن اہ آپ دیکھدے دیکھو نوکریاں تے کوٹے
اوہی نکرّی، اوہی وٹّے، اوہی ڈنڈی کانی
ذاہ ملاوٹ کرن والیا، تھیوں جیاں بلہارے
ہمت کرکے توں دکھائے نب لوّں جھنبو تارے
دھرتی ماں سی زج گئی تیھوں، اُہ دی روندی پھردی
ربہہ دے تھاں لٹی دے گولے! جائیے وارے وارے

دسہرہ تیوہار کے موقع پر راون کو آگ دی جاتی ہے۔ لیکن اب کی آگ نے راون پر کچھ اثر نہ کیا۔ کاغذ کا پتلا راون جُوں کا توں کھڑا رہا۔ اس حالا کو تیرلویں عیاں کرتا ہے :

مو یا راون لیںلا پھوکن، بڑا اتیسکی آڑیا
تیل مٹی دا پا یا لوکاں تاں اُہ سڑیا بلیا
آتش بازی وچ جلا وٹ، لعنت تیرے سیکھا
کی چنگا سی راون تا لوں توں ہی مُہندا سڑیا

اس ضمن میں ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہمدرد نے بے شک خالص غزل گوئی پر قناعت کی ہے۔ لیکن اُس نے غزل میں طنز و مزاح کا جا بجا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ دیگر پنجابی شعراء کی غزلوں میں بھی طنز و مزاح ملتا ہے لیکن ہمدرد کی غزلوں میں اس کی کثرت ہے اور اکثر اُس نے پوری پوری غزلیں اس رنگ میں کہی ہیں اُس کی غزلوں کے متعدد مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ لیکن اُس کا مجموعہ "ماڈرن غزل" اس کی خالص طنزیہ مزاحیہ غزلوں پر مشتمل ہے :

بقول ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر "مزاح" وہ ہے جس میں کوئی شخص اپنی ہنسی اُڑائے اور طنز، اُسے کہتے ہیں جب وہ کسی اور کا مضحکہ اڑائے، لیکن دونوں کو ملا کر ترکیب طنز و مزاح مروّج ہو گئی ہے۔ سادھو سنگھ ہمدرد کے طنز و مزاح کا معیار جاننے کے لئے غالباً اُس کا یہ شعر قابلِ غور ہے جس میں وہ خود کو مخزوِ مزاح کا نشانہ بناتا ہے :

اُتوں تے ہمدرد ہے سادھو
وچوں بھاویں چور ہے پیارے

بلاشبہ یہ شعر ہمدرد کی اخلاقی جرأت کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس رنگ کے ہمدرد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے :

کریں رحم ربا! میرے حال تے
میرے گل نہ پائیں کدے لیڈری
وکیلاں تے ایڈیٹراں دا ہے زور
سماں ہن نہیں کوئی سچ دا رہا
تباہ ہو گیا، آہ تباہ ہو گیا
جدوں آدمی داد یاہ ہو گیا
اُڈاندی، بٹھاندی، نساندی رہی
تیری یاد کسرت کراندی رہی
تکدا جائے فوٹو اُبھری

پنڈت ہتھ وچ مالا پھڑکے
ہوراں پلے لڈو پیڑے
ساڈے پلے کیڑے ہی کیڑے
ھکھ ہڑتالاں کر کر کے
آج کل پیسہ جوڑی دا

کیتا سی کیمو فلاج میک اپ دا جو
میں ہی سی جو اُس اُتے بھُلدا رہا
خریداں گا ہر کوٹ دی پینٹ دی
خریدی ہے گلی ہی گلی اجے
بنایا کوی رب نے ہمدرد نوں
اڈیٹر تے اوہ خواہ مخواہ ہو گیا

جد توں دیکھیا چمکدا مکھ تیرا
سانوں بھُل گئی اے تیرے طور دی گل
اسیں برف خانے دا رُخ کیوں نہ کریئے
رقیباں نے سانوں تپانا جو ہویا
کوئے غیراں نوں ساڈے تے ٹیکس چاڑھے
دیکھ لئو اِہ ساڈی سرکار دی گل
اِہ دُنیا ہمدرد اُسے دی
جس دے پلے مال ہے پیارے
حُسن دی ہلکی جہی مسکان نے
عشق دی ساری کمائی پی لئی
شیخ سبھوں ڈرے تے میں ڈراں شیخ توں
کِتھے جا کے ساڈی ملاقات ہو گئی
عشق دے وِچ جو ڈُبکے چلے
اُہ جھگڑا ہے، ریل ہُنی ہے

پنجاب کی سیاست شرومنی اکالی دل، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے خاصی متاثر رہی ہے۔ اس ضمن میں ہمدرد کا طنز ان اشعار میں جھلکتا ہے:

میری کانگرس سرکار نے پھسا ہی لیا
میرا من اکالی تیرے شہر وچ
اُنہوں کا مرنڈیاں دی یاد آئے کیوں
طبیعت جہدی ڈالہری ہوگئی
اُہدے ہاضمے دی وی کیا بات ہے
جھنوں کوٹا لوہے دا پچدا رہا

آخری شعر میں ہمارے سرمایہ داروں کی "پرخوری" اور قوتِ ہضم کی طرف معنی خیز اشارہ ہے۔

چند اور پنجابی شعرا نے بھی طنز و مزاح نگاری پر طبع آزمائی کی ہے جن میں سے ہرگوبند لیدی، تارا سنگھ ناتھ، تارا سنگھ کامل۔ دلجیت سنگھ، بھاٹیہ، شمشیر سنگھ سروج، لچھمن سنگھ ہرا وغیرہ اُبھر رہے ہیں۔ ہم انھیں مشورہ دیں گے کہ وہ ڈاکٹر تیر اور صوبہ سنگھ کے کلام کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے ہاں انفرادیت پیدا کریں:

اس رنگ کے چند اور شعر یہ ہیں:

جوانی وِچ ہوردی ہزاراں کم کردے سال
بُڈھاپے وچ سوائے عشق دے کرنے تے کی کریے (برکت رام یمن مرحوم)
ساڈیاں رہتاں دسیاں ہوٹیاں اِہ نہ مول کمانے
اَساں شراب منع کیتی ہے اوہ دُونی پی جاندے (بھائی دسالکھا سنگھ نامدھاری)

علاوہ ازیں ملکھی رام، بیرئل، باوا بدھ سنگھ، دھنی رام چاترک، کرپا رام، رجب علی خاں، تیجا سنگھ صابر وغیرہ کے ہاں بھی طنز و مزاح کم و بیش ملتا ہے۔

الغرض یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ پنجابی زبان طنز و مزاح کے سرمایۂ لازوال سے مالا مال ہے۔ اہلِ پنجاب زندہ دل اور جوان ہمت لوگ ہیں اور طنز و مزاح ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔

□□

اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب اور شاعر راز سنتوکھ سری (پنجابی میں قلمی نام اندر سنگھ راز) کے اس مضمون کی پہلی قسط گذشتہ شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ موصوف نے پنجابی نثر میں طنز و مزاح کے موضوع پہ بھی ایک مضمون عنایت کیا ہے۔ جو ہندوستانی مزاح نمبر میں شامل رہے گا۔ (ادارہ)

نشتر سیوانی

شروع کروں میں کہاں سے پہلے

اُٹھا کے سینڈل جو اُس نے پوچھا شروع کروں میں کہاں سے پہلے
کوئی نہ مائی کا لال بولا "یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے"
سُنی سنائی نہیں سناتا نظر کی دیکھی میں کہہ رہا ہوں
سنیما اکثر ہی دیکھتی ہیں سبھوں کی بیوی میاں سے پہلے
کسی بھی محفل میں کوئی آکر اگرچہ سگریٹ یا پان دیدے
سبھی پکاریں گے لاؤ بابو یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے
ہماری خوش فہمیاں ہیں نشتر ترقی ہم نے بہت ہی کرلی
مگر وہیں ہیں قدم جمائے، قدم اُٹھے تھے جہاں سے پہلے

لگے ہے!

صابر بہاری، رانچی

بےچارہ میاں خشک املتاس لگے ہے
اور اس کی دُلہن تازہ انناس لگے ہے
دن رات مجھے ڈانٹے ہے، بُڈھو بھی کہے ہے
بیوی سے ذرا کم نہ میری ساس لگے ہے
نل ہے نہ کنواں سامنے جاؤں میں کدھر کو
لڑتے ہی نظر اُن سے مجھے پیاس لگے ہے
کھڑکی سے جو محبوب کے گھر آجاتے ہیں عشاق
رستہ یہی اُلفت کا "بائی پاس" لگے ہے
لڑتی ہے "بیٹر ہاف" مگر وائے رے اُلفت
"دو دن کا جدا رہنا بھی بن باس لگے ہے"
کہتا ہے بہت صاف زمانے کی جو باتیں
صابر کی غزل آپ کو بکواس لگے ہے

[illegible]

اصلیت کھولدیں سب شان جتانے جاکو
خود ہی اوندھے پڑیں اوروں کو اُٹھانے جاکو
بولنا تک بھی نئیں آتا تھا، گھمائیں اب تو
کتّے ہشیار ہوئیں کیسے دیوانے جاکو
وہ جو میکہ میں تھے تو میں بھی وہاں جا پہنچا
چار دن ٹک گئیوں میں اُن کو بلانے جاکو
بھاؤ پوچھا تو میں چکرا گیا کچھ نئیں سوجھا
جھینگے لائیں جی میاں مچھیاں لانے جاکو
خود کو ہشیار سمجھتے تھے بہت وہ لیکن
پٹ گئے خود ہی وہ اوروں کو لڑانے جاکو
اِتی مہنگائی ہے اب جینگے غریباں کیسے
دو روپے ہوگئی ہر چیز دو آنے جاکو
اور اسٹیج پہ سوجھا نہ مجے کچھ سنکی
پڑھ دی غالب کی غزل اپنی سنانے جاکو

* * *

[illegible]

بڑھ کے اقبال جو گھٹ جائے، غزل ہوتی ہے
آکے لچھمی جو پلٹ جائے، غزل ہوتی ہے
کھا کے بھر پیٹ نہیں بنتا ہے کوئی شاعر
گھر کی ہانڈی جو اُلٹ جائے، غزل ہوتی ہے
مجھ کو اِک نسخۂ کمیاب ملا ہے یارو
دال جوتی میں جو بٹ جائے، غزل ہوتی ہے
شعر کہنا نہیں آسان ہے اُردو دانو
لاکھوں اشعار جو رٹ جائے، غزل ہوتی ہے
آپ چوپٹ ہیں تو کیا، میں بھی ہوں چوپٹ صاحب
جب قلم گرد سے اٹ جائے، غزل ہوتی ہے

تبصرہ نگار : مظہر الزماں خاں

بال کی کھال (تبصرہ)

تصنیف "چنانچہ"
مصنف : مسیح انجم

ناشر : زندہ دلان حیدرآباد
قیمت : بارہ (۱۲) روپے

"چنانچہ" مسیح انجم کے دس مضامین اور تین خاکوں کا قارئین طنز و مزاح کے لئے خوبصورت تحفہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے منظرِ عام پر آکر قارئین کے ذہنوں میں دیرپا اثر چھوڑ چکے ہیں۔ اور اُمید ہے کہ اُن کا یہ تیسرا مجموعہ مزاحیہ ادب کے قارئین کے ذہنوں میں ایک لمبے عرصہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔

مسیح انجم منفرد لب و لہجے کے داڑھی دار ادیب ہیں اور اُن کی داڑھی میں کوئی تنکا نہیں ہے جبکہ بہت سے داڑھی دار ادباء کی داڑھیوں میں اَن گنت تنکے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ داڑھی کم تنکے زیادہ ہوتے ہیں۔ جنھیں چھپانے کی کوششوں میں وہ خواہ مخواہ خرچ ہوتے رہتے ہیں اور اس قدر خرچ ہوتے ہیں کہ آخر میں داڑھی کی جگہ وہ ایک "جہاں باقی" باقی رہ جاتے ہیں (جہاں بال بچل کی نشانی ہے) بہرحال مسیح انجم کا مجموعہ "چنانچہ" اپنی جگہ ایک مکمل آئینہ ہے۔ ان کے انشائیوں میں مانگے کی ہنسی یا دوسروں کو ہنستا ہوا دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے کا عمل نہیں ہے۔ اور نہ ہونٹوں کا تبسم چھین کر غیر ضروری آنتوں کو گدگدانے کی کوشش موجود ہے ان کے مضامین کو پڑھ کر ہونٹوں پر پپڑیاں نہیں آتیں بلکہ وہ کسی دوشیزہ کے لبوں کی طرح تر و تازہ اور سُرخ ہو جاتے ہیں اور سُرخی کی علامت پوری زمین پر پھیل کر اس دور کی عکاسی کرنے لگتی ہے۔ مسیح انجم کے ان مضامین میں فطری اظہار کا عمل دخل ہے جو اپنے احساس اور اظہار سے قاری کے ذہن کے حساس (اگر قاری حساس ہو) گوشوں میں گدگداہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔

"ماضی میں دسترخوان" پہلے آپ" سے شروع ہوتا تھا۔ اب پہلے میں سے شروع ہوتا ہے" (یہاں مصنف نے دونوں تہذیبوں کو یکجا کر دیا ہے)

"ایک مشاعرے نے روانی میں" شکر بجا آرکر" کو شکر بجا آور کر کچھ اس طرح پڑھا جس طرح اردو کے ایک دسیرہ

اسکالر نے نئے پُل کے پاس "کلیۂ طیبہ" کو کلمہ طیبہ پڑھا تھا۔" (دسترخوان کے شیر)

میرے نزدیک طنز کی تعریف دس آنکھوں والے آدمی کی طرح ہے۔ جو ہاتھوں میں متعدد خنجر لئے بیک وقت چاروں طرف دیکھتا ہے اور جہاں کوئی آنکھوں میں چبھنے والا منظر دکھائی دے جو آنکھوں میں کھچکچاہٹ پیدا کردے وہ نظر نہ آنے والے خنجر سے اُس منظر کو ہلاک کر دیتا ہے یا پھر اُس پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ وہ منظر مدتوں ہرا رہتا ہے بشرطیکہ طنز نگار اپنی دس کی دس آنکھیں پوری طرح کھُلی رکھے اور نشتر ٹھیک اُس مقام یا منظر پر لگائے جو اُس کی آنکھوں میں درد کرتا ہے۔ ورنہ غلط نشانہ یا منظر کو سمجھنے کی غلطی سے طنز نگار خود اپنے ہی نشتر کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ ایسے طنز نگار آنکھوں پر سات پٹیاں باندھ کر لپٹے ہی جسم کو دوسروں کا جسم سمجھ کر زخمی ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی لگائے ہوئے زخم سے مدتوں تلملاتے رہتے ہیں۔ اور یہی فنکار کے اندھے پن کا ثبوت ہے۔ چنانچہ مزاح میں بھی دو طرح کے مزاح نگار ہیں۔ ایک وہ جو بھری محفل میں دس بارہ سال کے لڑکے کا ناڑا توڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کے اس تیسرے درجہ سے بھی گرے ہوئے مذاق کو کچھ بے شرم اور بے شعور بھاڑ سا منہ کھول کر قہقہے لگاتے ہیں تو بہت سی نگاہیں جھک بھی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ایسا مزاح باشعور طبقے کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مزاح ناٹک میں اداکاری کرنے والے اُس مسخرے کی طرح ہوتا ہے جو اسٹیج پر پردہ گرتے ہی بھُلا دیا جاتا ہے چنانچہ طنز و مزاح ادب میں ایسے بہت سے طنز و مزاح نگار

موجود ہیں جو برسوں سے اپنے مصنوعی دانت صاف کر رہے ہیں اُن کی مثال اس نیگرو کی سی ہے جو اپنے چہرے پر چونا پوت کر انگریز بننے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ مسیح انجم ان دونوں طرح کے لکھنے والوں سے الگ اور پوری طرح چوکنا ہو کر اپنے راستے پر چلتے ہیں اور ایسے چلتے ہیں کہ کڑکھڑاہٹ کا تھوڑا سا بھی احساس نہیں ہوتا مثلاً — بونتہ اچھے خاصے پیاج ورک کا نام ہے۔ اس کی تیاری میں گھر کے سارے افراد کے پُرانے کپڑے استعمال میں لائے جاتے ہیں — چنانچہ یہ بونتہ کہاں ہوا۔ یہ تو ایک ایسا ناول ہوا جس پر خوبصورت ٹائیٹل چڑھا دیا گیا ہے۔ یوں بھی بونتہ ایک ایسے ناول کے مماثل ہوتا ہے جس کے محاسن بھی ہوں اور معائب بھی۔ اس بونتہ کا ہر پیاج ناول کا ایک مکمل کردار ہوتا ہے۔" (بونتہ دکنی لفظ ہے جو یہاں خاصہ معروف ہے)
دیکھئے کہ مسیح انجم نے یہاں کتنی خوبصورتی سے گھر کی غُربت اور تاریخ کو یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ بونتہ کا ہر پیاج ایک کردار ہے۔

" رمّی نے کسی کو بھی سرفراز نہیں کیا۔ یہ کھیل وہ کھیلے جو توڑ جوڑ کے فن سے بخوبی واقف ہے۔" فل ہینڈ "

یہاں مختصر جملہ کوٹ کیا گیا ہے ورنہ مسیح انجم کا یہ مضمون جس کا عنوان "فل ہینڈ" ہے اپنے اندر رمّی کی پوری اور بھرپور خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔
چنانچہ مسیح انجم کے مضامین میں طنز و مزاح دونوں بیک وقت اس دریا کی طرح بہتے رہیں جس کے تعلق سے ہم نے سُنا ہے کہ دائیں جانب کا پانی میٹھا اور بائیں جانب کا پانی کھارا ہوتا ہے۔ چنانچہ داخلی مزاح اور خارجی

مزاح کا اظہار ایکسرے اور فوٹو کا سا ہے۔ خارجی مزاح میں فن کار عورت کے بلاؤز میں کیڑا چھوڑ کر تماشہ دیکھتا ہے اور داخلی مزاح میں کیڑا اُس کے اپنے سینے پر رینگنے لگتا ہے۔ اور کیڑے کا خود فنکار کے سینے پر رینگنا اُس کے شعور کی بیداری ہے اور ایسی بیداری ــ جو دوسروں کو بھی بیدار کرتی ہے۔ ہنسو لیکن ایسے کہ تہذیب اپنے اندر ماتم نہ کرے۔

بہر حال مسیح انجم کا یہ مجموعہ طنز و مزاح ادب میں دور تک اور دیر تک دیکھا جائے گا۔

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجا سکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵ روپے	دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸ روپے
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹	بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷
بالآخر	مجتبیٰ حسین	مضامین	۱۲	البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۱۰
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	مضامین	۸	سنی سنائی	لئیق صلاح	مضامین	۱۵
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	مضامین	۱۵	چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	مضامین	۱۰
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	مضامین	۱۲	عبار خاطر	رؤف خوشتر	مضامین	۱۲
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	مضامین	۱۵	چنانچہ	مسیح انجم	مضامین	۱۲
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	مضامین	۱۰	مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مضامین	۱۲
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	مضامین	۱۰	قطع کلام	مجتبیٰ حسین	مضامین	۱۲

خرافات

(مراسلے)

مکرمی ڈاکٹر صاحب۔ تسلیم
شگوفہ چندماہ سے ملتا رہتا ہے۔ تعطیلات میں میں وطن
اتھا۔ وہاں سے واپسی پر شگوفہ کا خواجہ عبدالغفور نمبر ملا۔ شکریہ
آخری سفر سے پہلے حیدرآباد میں خواجہ صاحب مجھ سے
رے شعبے میں ملے۔ طنز و مزاح پر اپنی کتاب مجھے نذر کی اور
رخواست کی کہ اسے ایم اے کے نصاب میں لگا دیا جائے۔
سانے وعدہ کیا کہ جب آئندہ بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ
رگی تو اس میں کوشش کروں گا۔ ہمارے یہاں اتنا ئیے
ایک اختیاری پرچہ ہے۔ اسے ہم پیش نہیں کر پا رہے۔
س سال اساتذہ کی تعداد میں اضافہ متوقع ہے۔ اس کے
ندیہ پرچہ پڑھا سکیں گے اور اس کے ضمن میں خواجہ
ماحب کی کتاب حوالے کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے
جب وہ مجھ سے ملے، کیا معلوم تھا کہ یہ ان کی
ندگی کا آخری ہفتہ ہے۔ آپ نے اتنا اچھا خواجہ عبدالغفور
بر نکالا بڑی تیزی سے۔ خواجہ عبدالغفور کے ساتھ آخری
سفر دل سوزی سے لکھا گیا ہے اور دردناک مضمون ہے۔

گیان چند
پروفیسر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

★ محترم سلام علیکم
بلمبار حیدرآباد میں فساد کی خبریں سن کر پریشانی
لگی رہتی ہے۔ اس بلدہ کی خبر سنتے تو دل کو دہلا دیا۔ خدا کرے
آپ لوگ محفوظ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں پر مہربانی
فرمائے۔ فساد کی اس پریشانی میں آپ لوگ شگوفہ جو
پابندیٔ وقت سے شائع کرتے ہیں۔ یہ بھی زندہ دلی کی دلیل ہے
خدائے پاک آپ لوگوں کو نظر بد سے بچائے۔

تمنا مظفرپوری

★ محترمی، سلام و نیاز!
"شگوفہ" کا خواجہ عبدالغفور نمبر موصول ہوا۔ یہ نمبر خواجہ
صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کا آئینہ دار ہے۔ قلیل مدت میں
اتنا جامع، ٹھوس، مدلل اور یادگار نمبر آپ کے حسنِ ترتیب
اور ادبی صلاحیت کا غماز ہے۔ خواجہ نمبر ادبی تقاضوں کی تکمیل
ہے جو ہر طبقۂ خیال میں تحسین حاصل کرے گا۔ اس نمبر کے
مطالعے سے خواجہ صاحب کی زندگی کی مکمل تصویر سامنے ابھر
آتی ہے جو آپ کی سعیٔ کاملہ کی قیمت ہے۔ آپ نے نادرالمثال
نمبر پیش کر کے لاکھوں کی تشنگی رفع کی ہے۔
امسال پٹنہ میں جشنِ ظرافت کے موقع پر خواجہ
صاحب سے ملنے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی۔ مختصر ملاقات
میں خواجہ صاحب کی بہت سی خوبیاں سامنے آئیں۔ میں ان
کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ خواجہ صاحب انسانی قدروں
کے حامل، اخلاقی محاسن کے پیکر، فنی بلندیوں کا درخشاں
ستارہ، طنز و مزاح کا مزاج، صاحب ضبط و تحمل، مبصر
فکر و فن اور صحت مند تنقیدی صلاحیتوں کے علمبردار تھے
دعاگو ہوں کہ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔

جوہر سیوانی (بہار)

★ برادرِ عزیزم، سلام مسنون:
خواجہ عبدالغفور نمبر نظر نواز ہوا۔ اتنی کم مدت میں
لطیفوں کے سوداگر کی ہمہ جہت شخصیت کو مرتب کرنا اور پھر

منظر عام پر لانا واقعی مشکل کام تھا۔ جسے آپ نے محنت و محبت کے ساتھ ہم تک پہنچا کر غفور شناسی و مزاح نوازی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ شعریات میں فکر تونسوی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، واہی نے دل کھول کر رکھ دیا ہے اور خوب ڈوب کر لکھا ہے۔ بہرکیف آپ نے خواجہ عبدالغفور صاحب کو خراج عقیدت بہترین طور پر ادا کیا ہے۔ اب مزاح نمبر کا انتظار ہے۔ شائد آپ نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ نمبر نومبر میں مزاح کے عالمی جلسہ میں منظر عام پر آئے گا۔

رؤف خوشتر، بکرو، بیدر

* محترمی تسلیمات۔

مئی ۸۴ء کا شگوفہ ملا۔ شکریہ۔ انسان کی مادّی ترقی اور معاشی تنزل نے دنیا کو صحرائے اعظم جیسا بنا دیا ہے۔ ہر وقت ذہنوں پہ خوف سا مسلط رہتا ہے۔ کاش ہماری ترقی کا رخ تعمیر کی طرف ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں اخلاق کی اہمیت اور بھی زیادہ کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ محبت و خلوص کی فضا قائم نہ ہوئی اور حرص و ہوس، بغض و کینہ دلوں سے دور نہ ہوسکے۔ ہماری بڑھتی ہوئی طاقت خود ہماری موت کا باعث بن جائے گی۔

"شگوفہ" جیسی کوششیں اس صحرائے اعظم میں نخلستان جیسی ہیں۔ ان کے دم سے زندگی کی تلخیوں کو بھول کر تھوڑی دیر مسکرانے کا موقع مل جاتا ہے۔ خواجہ عبدالغفور صاحب کی رحلت پر "خاص نمبر" نکالنے کے مستحسن قدم کے لئے مبارکباد۔

عبدالحفیظ خلش تیکیتی۔ ایچل پور

* "شگوفہ" کا تازہ شمارہ نظروں سے گذرا جو کہ "خواجہ عبدالغفور نمبر" سے موسوم ہے، بے حد پسند آیا۔ ویسے تو میں "شگوفہ" کا پرانا قاری ہوں لیکن اس کا ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔

محمد شاہد علی قادری، بمبئی

* آپ کی ادبی کاوشیں و ادارت "شگوفہ" محتاج بیان نہیں۔ "شگوفہ" خصوصاً حیدرآبادیوں کے لئے مژدہ جانفزا ہے اور اہل اُردو کے لئے بھی نعمت غیر مترقبہ ہے۔

مصطفیٰ مجاز، محبوب نگر

* اتفاقاً "شگوفہ" کا ایک پرچہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالہ مزاحیہ انداز کا ہے۔ جس کی زمانہ کو بہت قدر کرنی چاہئے ایسے ادب کی بہت ضرورت ہے۔

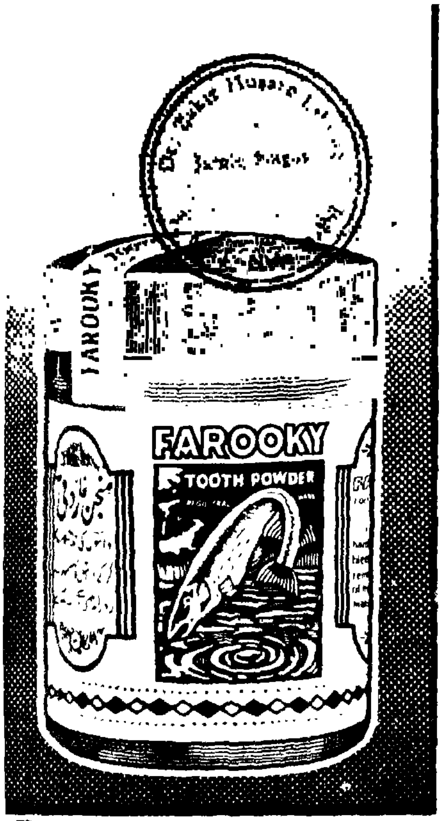
گووند سنگھ پونچھ (کشمیر)

* جنوری ۸۴ء کا شگوفہ دیکھا۔ بھائی واہی صاحب کی نظم "اردو کی نس بندی" طنز و ظرافت سے بھرپور ہے۔ اُردو کے نیم سرکاری اداروں کے سربراہ حضرات بیس نکاتی پروگرام کا اسے ایک اہم انگ سمجھتے ہیں۔ غزل کو نیم وحشی صنف قرار دینے والے "سربراہ نس بندی بھون"، اس نظم کی اشاعت کے پہلے ہی کاروبار ہستی سے اپنی دوکان بڑھا گئے۔ ڈاکٹر بھارت چند کھنہ کی نظم "کرکٹ" اچھی نظم ہے۔ آپ نے مزاح کے اچھے پہلو نکالے ہیں۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے مضمون "طنز و مزاح اور واہی" میں صرف واہی کے شعور کی آئینہ داری ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کے فن کی ایک حد تک نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر طلحہ اگر کچھ اور تفصیل سے کام لیتے تو تشنگی کا تھوڑا بہت احساس جاتا رہتا۔

شہزاد معصومی، پٹنہ

* مختصر عرصہ میں خواجہ عبدالغفور نمبر نکال کر آپ نے حق ادا کر دیا۔

جمال محمد۔ بمبئی





دن بھر کی خوشگوار تازگی!

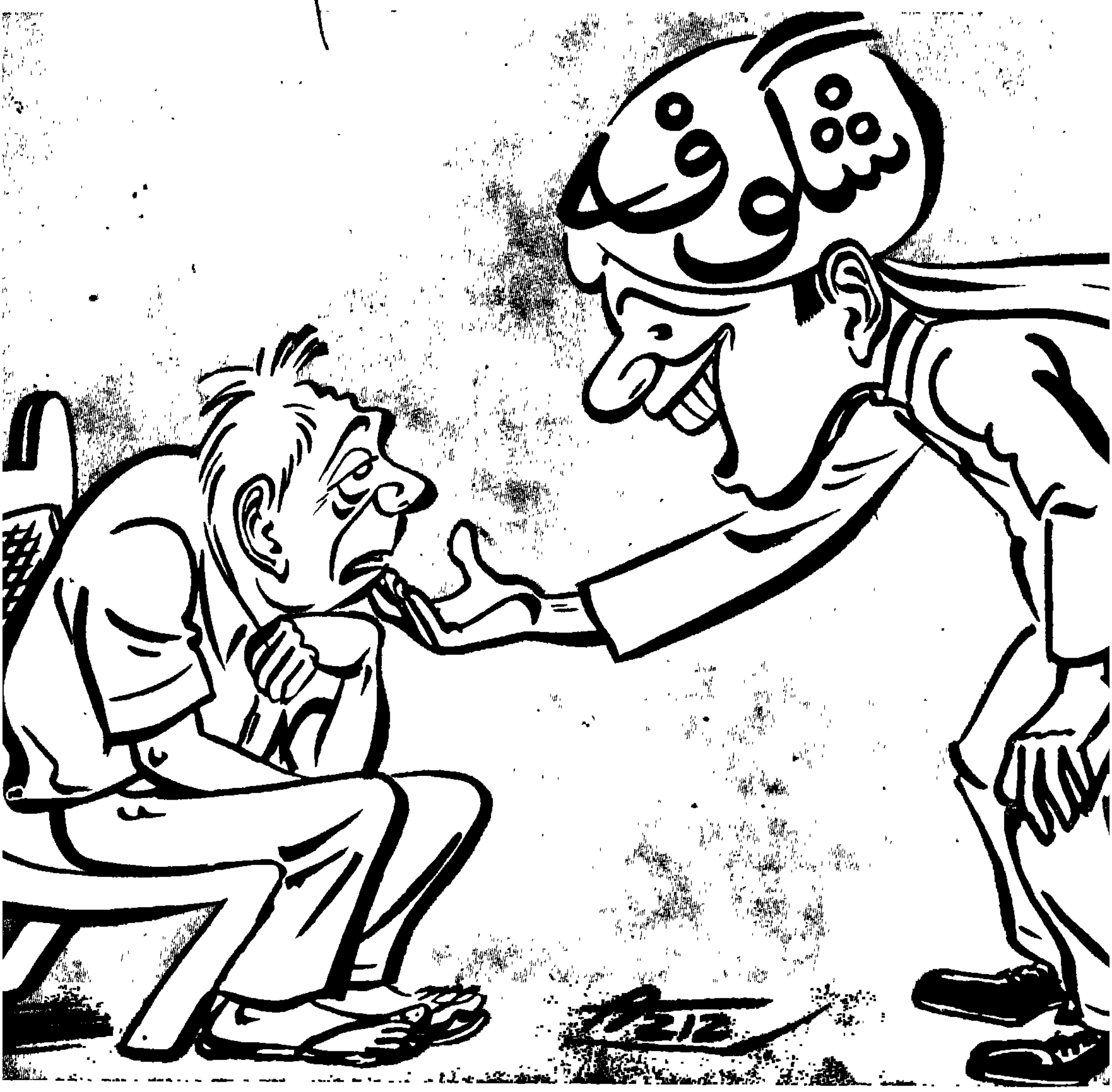
جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
منھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات - حیدرآباد-۱۳

21/12/84



SEPTEMBER 1984 **Rs. 3-0(**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد ۱۷ ○ شمارہ ۹ ○ ستمبر ۱۹۸۴ء

قیمت: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ممالک: ۱۰۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف، مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱
فون: 557716

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

فکریات (خطبۂ صدارت)

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

دخل در نامعقولات (افسانہ)

قاضی جی دبلے (رپورتاژ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن ـــــ (منظومات)

ماہنامہ **شگوفہ** کا

"ہندوستانی مزاح نمبر"

کتابت کے آخری مراحل میں

اردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی
تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی
اڑیا ۔ ملیالم ۔ سندھی ۔ کنڑی ۔
میتھلی اور راجستھانی کے مزاحیہ نثری
ادب کا جائزہ

مہمان مدیر :
یوسف ناظم

★ منتخب مضامین کے ترجمے ۔ اردو کے دس مصنفین کے خود نوشت خاکے اور مضامین ★ ملک کے مشہور تنقید نگاروں کی آراء اور انٹرویو ★ اردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل ببلوگرافی اور مقالہ نگاروں کی تصاویر

قیمت : ۳۰ روپے مجلد ۳۵ روپے
ضخامت تقریباً ۳۵۰
سالانہ خریداران [illegible]
[illegible]

● اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرالیجیے
● یہ خصوصی نمبر "شگوفہ" کے
شمارے کے علاوہ ہوگا

اولمپک ـ بوکسنگ

رضا نقوی واہی

ملا جب مُکّہ بازی میں طلائی تمغہ شوہر کو
خوشی بے حد ہوئی مژدہ یہ سُن کر خانداں بھر کو

مگر اہلِ محلّہ اس خبر سے سخت برہم تھے
چڑھی تھیں تیوریاں سب کی، سبھی یکلخت برہم تھے

سبب پوچھا کسی نے، کیوں نہیں اہلِ محلّہ خوش
تو بیگم نے کہا اُس کی، کہ ہوں گے وہ بھلا کیا خوش

مرے شوہر نے مشقِ مُکّہ بازی کی جو برسوں تک
تو جولانگاہ گھونسوں کی تھی ان لوگوں کے چہروں تک

یہ پھولی ناک، پچکے گال، ٹوٹے دانت والے لوگ
یہ بگڑی شکل والے، یہ محلّے کے جیالے لوگ

نہ بھولیں اس کا مراقی پر تھا، تو اور کیا ہونگے
مسرت میں ہمارے ساتھ شامل کیوں بھلا ہونگے

انہی بے چہرہ لوگوں میں ہوا یہ بوکسر پیدا
"کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"

اولمپک ـ ہیوی ویٹ چمپین

بڑی خوشی ہوئی سُن کر یہ نئی پڑوسی بہن
میاں تمہارے بنے ہیوی ویٹ چمپیئن

طلائی تمغہ ملا بھاری بوجھ اٹھانے میں
قلی سماج کے سردار بن گئے فوراً

تمہارے صدقے گئی، اُن سے اک ذرا کہدو
زباں پہ لاتی ہوں، ڈرتے ہوئے یہ حرفِ سخن

کہ گھر میں میرے ہے لوہے کا اک بڑا صندوق
جہیز میں اُسے لائی تھیں میری خوشدامن

مرے میاں نے بہت زور آزمائی کی
پہ ٹس سے مس نہیں ہوتا وہ پیکرِ آہن

اگر ذرا سی توجہ ادھر وہ فرما دیں
تو میرا مسئلہ ہو جائے حل بہ چشم زدن

اسے اٹھا کے وہ رکھ دیں کباڑ خانے میں
پڑا ہوا ہے جو برسوں سے گھیر کر آنگن

بہن، فقط یہی بندی کی تم سے منت ہے
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"

فکر تونسوی

مزاح نگار ایم اے وحید کی کتاب کے جلسۂ رسم اجراء میں پڑھا گیا خطبۂ صدارت

بہ گردنِ راویؒ

آج مجھے سب سے بڑا صدمہ یہ ہوا کہ مجھے ضعیف العمر سمجھ کر یہ کُرسی صدارت عنایت کی گئی. گویا صدر بننے کے لئے ضعیف العمری شرط ہے. مگر اس شہر میں ضعیف العمروں کی کمی نہیں. اللہ کے فضل سے جسے اب میں بڑی مشکل سے تھوڑا بہت ماننے لگا ہوں، ضعیف العمروں کی شرط پر کئی حضرات پورے اُترتے ہیں. چنانچہ اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین کو لے کر میں ایک بڑھئی کے پاس گیا. وہ نہایت حسین اور نفیس کُرسیاں بناتا ہے. وحید صاحب نفیس اور حسین مضامین لکھتے ہیں. میں نے پوچھا. "جناب! میرا خیال ہے آپ ضعیف العمر ہیں."

بولا "جی ہاں" یہ گورو مہاراج کی کرپا ہے".

میں نے پوچھا. "اسی قسم کی کوئی اور کرپا؟"

وہ بولا. "میرے بیٹے اور بیوی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے".

میں نے کہا "کوئی ہرج نہیں. اورنگ زیب نے بھی اپنے باپ کو گھر سے نکال کر لال قلعہ میں بند کر دیا تھا. باپ بیٹے کی تاریخ نے ہمیشہ اپنے آپ کو دُہرایا. مگر دیکھئے، ہم آپ کو آج ایک ادبی فنکشن کا صدر بنا دیتے ہیں".

وہ کہنے لگا. "معاف کیجئے میرے پاس ٹائم نہیں ہے. کیوں کہ مجھے ایک کُرسی تیار کرنی ہے". ہم نے اُسے ماضی، حال، مستقبل کی فلاسفی سمجھائی. اور کہا. "کہ اب آپ چونکہ ضعیف العمر ہو چکے ہیں. اس لئے آپ کو صرف صدارت کرنی چاہیئے، اور کچھ نہیں کرنا چاہیئے. کیا آپ مسٹر وحید کو جانتے ہیں."

وہ کہنے لگا. "جانتا کیوں نہیں. مجھے آج انہی کی کُرسی تو تیار کرنا ہے. نہایت شریف الطبع اور دیانتدار آدمی ہیں. کُرسی بننے سے پہلے آدھی قیمت ادا کر دیتے ہیں"

... تو آدھی قیمت تو کم؟

پبلیشر اُلٹے مصنف سے پوری قیمت وصول کرکے کتاب چھاپتے ہیں۔ اس لئے یہ ضعیف العمر بڑھئی، اُردُو کتاب کے جشنِ اجرا کا صدر بننے کے لئے موزوں نہیں۔ اور ویسے بھی ہمیں چوب اور ادب میں کافی فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اور پھر یہ تو صدارت کے لئے نصف رقم پیشگی مانگتا ہے۔ ہمیں تو ایسا صدر چاہیئے جو پھولوں کے ایک ہار کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھے۔ اور اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں شخص اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا" اچھا بھتیجی! ایک بات بتاؤ۔ جس گائے کا دودھ بالکل سوکھ جائے۔ اس کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟

وہ اچھلا "گؤ شالا!"

ہاں، سامعین حضرات! میں اس ہال کو گؤشالا بنا کر کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا گیا ہوں؟

دوستو! صدر کی ایک ٹریجڈی اور بھی ہوتی ہے کہ ادبی فنکشن دو گھنٹے کا ہو یا اڑھائی گھنٹے کا۔ وہ بے چارا لاوارث انسان پورا وقت کرسی پر خاموش، گم سُم بیٹھا رہتا ہے۔ تھک کر اگر وہ کرسی پر ایک پہلو سے دوسرا پہلو بدلے تو سامعین سمجھتے ہیں۔ صدر بور ہو رہا ہے۔ (بلکہ کئی سامعین تو سمجھتے ہیں کہ صدر بھی ہماری طرح بور ہو رہا ہے)۔ مگر سامعین کو آسانی یہ ہے کہ وہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اور اُسے بد اخلاقی نہیں سمجھا جاتا۔ مگر صدر اُٹھ کر صرف ایک کونے میں کھانسنے کے لئے بھی نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ اُس کے اُٹھ جانے کو بداخلاقی سمجھا جاتا ہے ——

سالِ گذشتہ ایک مرتبہ ایک وزیر کو صدارت بخشی گئی۔ تو اسٹیج سکریٹری نے آدھے گھنٹے بعد اعلان کیا کہ آنریبل منسٹر صاحب کو چوں کہ ایک ضروری کام کے لئے کہیں تشریف لے جانا ہے۔ اس لئے اب صدارت کے فرائض جناب ڈی۔ سی۔ ماتھر انجام دیں گے۔

بعض صدر، بداخلاقی سے بلند ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ وزیر ہوں۔ اور بداخلاقی کے توڑ کے لئے کسی دکھی ڈی۔ سی۔ ماتھر کا ہونا ضروری ہے۔ اللہ کی درگاہ میں قربانی کا بکرا ہمیشہ ثواب کا ذریعہ بنتا ہے۔

وحید صاحب کی جس کتاب کا یہ جشن اجرا ہو رہا ہے۔ اُس کے متعلق اب تک میں اپنے زریں خیالات پیش کرنے سے برابر گریز کرتا رہا ہوں۔ گریز کی ایک معقول وجہ تو یہ تھی کہ آخر صدر کے خیالات کو ہی زریں کیوں کہا جاتا ہے۔ کیا صدر محترم سے پہلے جن معززین نے اپنے خیالات ارشاد کئے، وہ زریں نہیں تھے۔ میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ صدر جو خیالات پیش کرتا ہے وہ پہلے مقررین کے صرف ایضاً ایضاً ہی ہوتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو ایک صدر محفل کو اتنی دور اندیشی کرتے ہوئے دیکھا کہ اس نے اپنی صدارتی تقریر صرف اس فقرے سے شروع کی اور اُسی فقرے پر ہی ختم کردی۔ کہ میں سابقہ مقررین کے ارشادات سے سو فی صدی اتفاق کرتا ہوں۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر صاحبِ صدر کو سب سے آخر میں کچھ کہنے کی اجازت کیوں دی جاتی ہے۔ اجازت کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کیوں کہ مجلس کا حاکمِ اعلیٰ ہونے کے باوجود اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا وہ حکم نہیں دے سکتا۔ اسٹیج سکریٹری کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ صدر کا مقام اعلیٰ اصل نہیں ہوتا بلکہ

ہوتا ہے۔ وہ صدر تو ہوتا ہے مگر خاتمہ بالخیر قسم کا۔ اُسے یہ جبری استحصال برابر برداشت کرنا پڑتا ہے کہ شیڈول کے مطابق جو مقرر تحریر و تقریر کرنے تشریف لائے۔ صاحب صدر اُنہیں بہ گوش ہوش سُنتا رہے۔ کئی تقریریں سامعین سنجیدگی سے نہیں سنتے، بلکہ اونگھنے تک لگتے ہیں۔ مگر صاحب صدر اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک صدر کو تو میں نے دیکھا جب کچھ سامعین اونگھ رہے تھے تو وہ مقرر کے خیالات میں سے چند تیکھے اور موثر فقرے کاغذ پر نوٹ کر رہا تھا ــــ میرا خیال ہے ایسا معاملے میں سامعین کی پوزیشن صدر سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

اور چوں کہ جشن اجرا والی کتاب کے متعلق ہر مقرر تحسین و توصیف کے کلمات ہی سے کتاب اور صاحب کتاب کے ظاہر و باطن کو تابناک بناتا ہے۔ اس لئے صاحب صدر بھی انہی تابناکیوں کو دُہرا دیتا ہے۔ اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا داد کی تالیاں بھی اس کی اپنی نہیں ہوتیں۔ وہ بھی سامعین کی ہوتی ہیں بشرطیکہ ہوں۔

حضرات! چوں کہ مجھے آج نادر موقع ملا ہے کہ میں کچھ کڑوی کسیلی باتیں کہوں۔ تو عرض یہ ہے کہ میں پہلے کتابوں کے جشن اجراء کے سخت خلاف رہا ہوں۔ اور یہ ایک سچ ہے۔ آج کل سچ کی گفتار کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اور اس کو ناپسندیدگی کو سماجی آداب کہا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ سچ کہنا ہی نہیں چاہیئے ــــ چنانچہ یہ سچ ہے کہ میں پہلے جشن اجراء کے رواج کا مخالف تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور عصمت بھی نہ اس کے عادی تھے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ لیکن آج کل جبکہ جشن اجرا کے بغیر کسی کتاب کو ادب ہی نہیں مانا جاتا۔ اس لئے ادب کی یہ دردشا دیکھ کر میں جشن اجرا کی مخالفت نہیں کرتا۔ اگرچہ اسے میری بدنصیبی سمجھا جائے کہ میں اس کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ بدنصیبی نمبر دو یہ کہ آج میں جشن اجرا کے اس فنکشن میں صاحب صدر بھی بنا بیٹھا ہوں۔

جشن اجراء کے بغیر کوئی کتاب، ادب کیوں نہیں بنتی۔ کیوں کہ ان جشنوں میں وزراء اور اُمراء شامل ہوتے لگتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی شمولیت کے باوجود وہ ادب نہیں بنتی۔

یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ وحید صاحب کی کتاب "بزرگ ذات راوی" کے جشن اجراء میں وزراء اور امرا مجھے دکھائی نہیں دیئے۔ اس لئے وحید صاحب کے مزاح نگار بننے کا چانس مجھے کچھ اور روشن دکھائی دیتا ہے ــــ اور یوں بھی اس جشن اجراء کے صاحب صدر کے ذہین خیالات وہی ہیں جو اس کتاب کے شروع میں عظمیٰ نے تحریر کر دیئے تھے۔ وہ تین پیراگراف ہیں، پڑھ لیجئے، نہ پڑھنا چاہیں تو یہاں مجھ سے سن لیجئے کہ

"طنز و مزاح کی کامیابی کے لئے چند اسباب ضروری ہیں جو مضحکہ خیز اور بھونڈی حرکتیں زبانیں پر آسیبوں کی ٹریجڈی ہے یا وحید صاحب کی کامیڈی۔ کیا آپ نہ مرتا ہیں مکمل دے گئے۔ بلکہ ان کے تجربے اور قلم کے زیر سایہ مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہوئے

گزرے، اور وحید صاحب کی نگاہ نے انہیں گرفت میں لاکر ہمارے سامنے پیش کردیا کہ ان پر ہنسئے یا شرمائیے۔ دونوں عوامل پر کوئی پابندی نہیں"۔

اور آخر میں، میں نے انہیں نصیحت کی تھی۔ کیوں کہ نصیحت سے زیادہ آسان کوئی اور چیز نہیں۔ کہ پیارے! یہ میدانِ طنز و مزاح ہے، اور کرلے جوان رعنا! ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔ میرے ایک دوست تھے، بی۔ اے پاس۔ ایک پرائیوٹ کالج کے ایم۔ اے کے اسٹوڈنٹس کو انگلش پڑھایا کرتے۔ ایک سال بعد ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے، کالج میں پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ آج کل کمپا کولا کی ایجنسی لے رکھی ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیوں؟"

بولے "آپ ہی تو کہتے تھے، ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

مگر وحید صاحب کے متعلق آخری اطلاع یہ ہے کہ وہ کتاب کے بعد بھی دھڑا دھڑ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھے جارہے ہیں۔ کمپا کولا کی طرف نہیں جارہے!

یوسف ناظم

انتظار

۱۹۸۳ء جس سے ہم نے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی تھیں وہ تو ختم ہو ہی گیا لیکن یہ ۱۹۸۴ء بھی ہاتھ سے نکلا جارہا ہے اور اب تک تیسری جنگ عظیم ہو نہیں پائی ہے بلکہ اس کا ریہرسل بھی نہیں ہوا ہے۔ کئی اسکرپٹ (لکھے گئے)۔ مکالمے بھی نہ صرف قلم بند ہوئے بلکہ ان میں سے چند مکالموں کی صدا بندی بھی ہوئی لیکن یہ بڑی بڑی قومیں سوچ کیا کر رہی ہیں۔ ہزاروں قسموں کے اسلحہ تیار کرتی ہیں۔ ان کا تجربہ بھی کرتی ہیں لیکن یہ تجربہ بس اکاڈمک (علمی) نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے آگے نہیں بڑھتا۔ خبریں آتی ہیں کہ فلاں ملک کے تعلقات فلاں ملک سے خراب ہو گئے اور اب صورتِ حال نازک ہے یا یہ کہ فلاں ملک نے اپنی ہوائی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔ کسی ملک کا بحری بیڑہ بھی جنگ کرنے کے لئے رضامند ہو گیا ہے اور کسی ملک کی زمینی فوج تو پیدل چل کھڑی ہوئی ہے لیکن بات یہیں پہ رک جاتی ہے مطلب یہ کہ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

ان نام نہاد بڑی طاقتوں کے مقابلے میں تو ایران اور عراق اچھے رہے۔ لڑے جا رہے ہیں۔ تین سال تو انھیں لڑتے لڑتے ہو ہی گئے ہیں۔ مانا کہ اس جنگ کا اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے اور یہ ایک بے معنی شعر معلوم ہو رہی ہے لیکن انھیں داد تو بہر حال ملنی ہی چاہیئے۔ کبھی کبھی تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ دونوں لڑائی میں واقعی سنجیدہ ہیں یا کوئی کھیل ہو رہا ہے۔ یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کی فوجوں کی کمان عورتوں کے ہاتھ میں تو نہیں ہے عورتوں کے ہاتھ میں کمان نہیں دینی چاہیئے۔ وہ خود تیر ہوتی ہیں اور کسی کو بتائے بغیر کہیں نہ کہیں پیوست ہو جاتی ہیں

تیسری جنگ عظیم کا ایجنڈا تیار ہے۔ مسالہ تیار ہے۔ ماحول سازگار ہے۔ قوموں کے دل و دماغ گرم ہیں۔ جذبات بھی تیز و تند ہیں (صرف برانگیختہ ہونے کی دیر ہے اور جو لوگ منتظر ہیں انھیں جلدی ہے)۔ ہر جگہ کسی نہ کسی کا ہاتھ "کارفرما" ہے۔ حالات دھماکو ہیں۔ رہبران قوم بارود کے دہانے پہ بیٹھے ہیں لیکن جنگ ہے کہ معرض التوا میں ہے۔

دفتر کی کسی فائل کی طرح۔ اگر چند دنوں تک یہی حال رہا تو بڑی بے لطفی ہو جائے گی اور خدشہ ہے کہ عوام جنگ کی باتوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دیں۔ (چھوڑ دیں سے مطلب یہ کہ ترک کردیں۔ یہ لفظ چھوڑ دینا بڑا بے تکا لفظ ہے جب کوئی شخص اخلاقاً داڑھی رکھنے لگتا ہے تو کہا جاتا ہے انھوں نے داڑھی چھوڑ دی ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی)

بہت سے عوام تو اب حالاتِ حاضرہ پر غور ہی نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کوئی پرانا اخبار بھی پڑھو تو تازہ ہی معلوم ہوتا ہے اور آج کا اخبار پڑھو تو پرانا معلوم ہوتا ہے۔ کیا بات ہوئی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہمارا خیال ہے یہ لوگ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا اب بہت زیادہ معمول پسند یعنی روٹین ہو گئی ہے۔ ان کی شکایت بجا ہے۔ کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ ہوائی جہازوں کا اغواء بینکوں کا لوٹا جانا، عورتوں کا بھیس بدل کر حشیش سفر کرنا اور کسی بدذوق شخص کے ہاتھ پڑ جانا، یہ سب روزمرہ کے واقعات ہیں اور ان میں اب کسی شخص کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس لئے دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ایک جنگ منعقد ہو۔ عالمی پیمانے پر۔ ۱۹۸۴ء بھی اب تقریباً گزر ہی چکا ہے لیکن جنگ کا کیا ہے ایک لمحہ میں ہو سکتی ہے۔ منجم حضرات کی رائے ہے کہ اس سال ستارہ زحل برج عقرب میں داخل ہوگا (عقبی دروازے سے) یا ہو سکتا ہے کہ عقرب خود زہرہ میں داخل ہو جائے کیوں کہ ستاروں کے بھی حالات دگرگوں ہیں اور ان کی اصناف بھی بدلی ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ عطارد بھی مخالف سمت میں رواں دواں ہوگا اور مریخ کی ... پیش قدمی کریگا (یہ عطارد اس سے پہلے بھی ایسا کر چکا ہے اور اب تو یہ اس کی عادت ثانیہ بن گئی ہے) ستاروں کا یوں ادیبوں اور شاعروں کی طرح بے مقصد گھومنا یقیناً افتراق کا باعث ہوگا جسے جنگ کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔ (پیش خیمہ ایک خاص قسم کی چیز ہوتی ہے اور ہر بڑے معاملے کا ایک نہ ایک پیش خیمہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ پیش خیمہ اُس خیمے سے مختلف ہوتا ہے جس کے متعلق فارسی میں آیا ہے کہ مجنم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست : ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت ؛ ستارے جتنی تیزی سے ایک سمت سے دوسری سمت میں دوڑیں گے اور اہل سیاست کی طرح اپنی جگہ بدلیں گے جنگ کا اتنا ہی خوشگوار ماحول پیدا ہوگا اور جنگ بھی خوش اسلوبی سے لڑی جائے گی۔ لیکن آسمان پر صرف ستاروں کے اِدھر اُدھر دوڑتے رہنے یا دن کے وقت بنات النعش گروہ کے عریاں ہو جانے ہی سے جنگ نہیں چھڑ جاتی۔ زمین پر بھی تو کچھ ہلچل ہونی چاہیئے۔ سی آئی اے اور کے جی بی قسم کے باوقار اور مستعد اداروں کو بھی اپنی کارکردگی میں دس یا بیس فی صد کی حد تک اضافہ کرنا چاہیئے۔ ایک ملک کے فوجی راز دوسرے ملکوں کے جاسوسوں کو بھی احتیاط کے ساتھ بہم پہنچائے جانے چاہئیں۔ یہ اہم نکتہ ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فوجی رازوں پر آخر کب تک پردہ پڑا رہے گا۔ کسی نہ کسی نوبت پر یہ پردہ اٹھنا ہی چاہیئے۔ فوجی عہدہ داروں کو خواہ وہ برسرکار ہوں یا سبکدوش ہو چکے ہوں اپنی توانائیاں روبکار لانا چاہیئے (انہیں آخر تنخواہ اور پنشن کس بات کی دی جاتی ہے)

جنگ کی پیش رفت میں حکومتوں اور عوام کو مل جل کر کام کرنا چاہیئے۔ کسی معاملے میں تو ان دونوں کو یکجا ہونا چاہیئے۔ بعض ملکوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ حکومت تو جنگ کے لئے رضامند ہے لیکن عوام اس طرف متوجہ نہیں ہو رہے ہیں۔

مانا کہ عوام ان دنوں ویڈیو وغیرہ زیادہ دیکھ رہے ہیں لیکن جنگ عظیم کے معاملے کو کب تک ٹالا جا سکتا ہے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جو وقفہ تھا ٹھیک تھا۔ یہی کوئی ۲۵ سال کا انٹرول تھا لیکن اب تو جنگ ہوئے زمانہ ہوگیا۔ کیا دوسری جنگ عظیم کی گولڈن جوبلی تک ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔ بعض ملکوں میں اندرونی خلفشار ضرور ہے لیکن صرف خلفشار سے کیا ہوتا ہے۔ اتنی بڑی دنیا اور صرف خلفشار۔ یہ کائنات اور صرف معمولی چپقلش زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا خلاء کیا صرف ہوا کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس میں جنگی جہاز آخر کب اُڑیں گے۔ ہم بڑی طاقتوں سے آس لگائے بیٹھے ہیں لیکن دیکھتے ہیں کہ کوئی اولمپک منا رہا ہے تو کوئی فرینڈشپ کھیلوں کا جشن۔ یہ بھی منائیے لیکن جنگ کا بھی خیال رکھیئے۔ ہم ناامید نہیں ہیں کیونکہ کبھی کبھی خاموشی بھی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے (پھر وہی پیش خیمہ۔ پیش خیمے کی جگہ اب کوئی دوسری چیز ایجاد کرنی چاہیئے)۔

دیکھنا یہ بھی ہے کہ تیسری جنگ عظیم کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے اور اس کے لئے اسٹیڈیم کون سا چنا جاتا ہے۔

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے۔

جوہر سیوانی

کیا کروں

دل میرا ہے شیرِ جفا کار کیا کروں
گھر ہی کا خاص فرد ہے غدّار کیا کروں

کرتے ہیں خود ہی دن میں جو مے کے خلاف بات
آتے ہیں بن کے رات میں میخوار کیا کروں

دل لے کے گھومتا ہوں ہتھیلی پہ شہر شہر
ملتا نہیں ہے کوئی خریدار کیا کروں

پابندیوں کا گہرا سمندر ہے بیچ میں
اُس پار وہ ہیں اور میں اس پار کیا کروں

موضوع اور مواد کا پٹرول ختم ہے
چلتی نہیں ہے فکر کی اب کار کیا کروں

ڈر ہے مجھے گرے نہ کہیں جسم کا مکان
ہے کھوکھلی حیات کی دیوار کیا کروں

پھیلا ہے چار سمت گرانی کا کاربن
ہے اب تو سانس لینا بھی دشوار کیا کروں

داڑھی تو ہے سفید چمکتی ہے رات دن
لیکن سیہ ہے شیخ کا کردار کیا کروں

ہے روحِ طنز جوہر سیواں کی شاعری
شہرِ سخن میں ہے یہی پرچار کیا کروں

دفتر کے سامنے

عاشق کھڑے ہیں حسن کے دفتر کے سامنے
منڈلا رہے ہیں بھونرے گلِ تر کے سامنے

ہپّی سے کیجیے نہ تمدن کی گفتگو
گوہر نہ آپ پھینکیے بندر کے سامنے

مسجد کی راہ بھول نہ جائے جناب شیخ
ان کو کھڑا نہ کیجیے ساغر کے سامنے

ہیں زن پرست شیخ تو حیرت نہ کیجیے
ہر ایک شخص جھکتا ہے پاور کے سامنے

میں پیٹتا ہوں بچوں کو اس وقت رات میں
جب چور رینگتے ہیں مرے گھر کے سامنے

دل کو بھی کوٹ کوٹ کے قیمہ بنا نہ دے
رکھیے نہ دل قصاب کی دختر کے سامنے

اُس کی جفا پہاڑ ہے درپن میری وفا
شیشے کی کیا بساط ہے پتھر کے سامنے

جب سے بنی ہیں اندرا پردھان منتری
ہر ایک زن ہے شیرنی شوہر کے سامنے

اک دھند تھا جو راج نرائن کا دھند تھا
ہر ایک ہیرو مات تھا جوکر کے سامنے

وہ قہقہہ لگاتا ہوا لوٹتا ہے گھر
روتا ہوا جو آتا ہے جوہر کے سامنے

وجاہت علی سندیلوی

حقوق ہمسایہ

میں نے ایک ضروری خط لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ سامنے سے میرے ہمسایہ مرزا سیدر بیگ آتے دکھائی پڑے۔ مرزا صاحب وقت یا گھڑی کے قائل نہ تھے۔ ان کے خیال میں وقت کو انسان کا پابند ہونا چاہیے، نہ کہ انسان کو وقت کا اور گھڑی تو محض ایک نمائشی اور تجارتی چیز ہے جس کو انسان کی بنیادی ضرورت یعنی بکواس میں ہرگز مخل نہ ہونا چاہیے، آتے ہی انھوں نے السلام علیکم کا پھندا پھینکا اور میں وعلیکم السلام کہتے ہی ان کا صید زبوں ہو کر رہ گیا۔

مرزا: "تم نے میری للکی کو تو نہیں دیکھا۔ ؟"

میں (متعجب ہو کر) "للکی ! یہ کون ؟"

مرزا۔ وہی میری للکی مرغی !"

میں: "مرغی — ؟"

مرزا: "میں ہاں ! وہی میری لال مرغی جس کے پروں کے حاشیے کچھ سیاہی مائل سنہرے سے تھے اور جس کی گردن چتی دار بھوری تھی اور جس کی چونچ کچھ اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اور جس کے بائیں پیر کا ایک ناخن ذرا گھسا ہوا تھا۔"

"تو پھر ؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کیونکہ کسی مرغی کا اتنا تفصیلی حلیہ میرے لیے کچھ عجیب سی چیز تھی۔

مرزا: "کل شام سے نہیں ملتی۔ سہ پہر میں اس نے انڈا دیا تھا۔ پھر چار بجے جب دانا دیا گیا تو اس وقت بھی موجود تھی اس کے بعد ایک نیولا آگیا تھا اور سب مرغیاں شور مچاتی ادھر ادھر بھاگی تھیں اس وقت بھی وہ باورچی خانے کے پاس والے دالان میں موجود تھی لیکن پھر گھنٹہ بھر بعد جب مرغیاں بند کی جانے لگیں تو اس کا پتہ نہ تھا۔"

میں: "محلے کے کسی مرغے کے ساتھ ہوگی۔" کیونکہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک مرغی کی معشوری پر کم سے کم اور کیا کہا جا سکتا ہے کیونکہ اگر میں اس کے جاں بحق ہو جانے کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرتا تو غالباً مرزا پر مرگی کا دورہ پڑ جاتا۔

مرزا: "چہ خوش ! گھر میں ایک چھوڑ تین تین مرغے موجود ہیں !! اور پھر وہ تو دوسری مرغیوں کو ساتھ لیے بغیر گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالتی تھی۔ کل شام سے میں نے محلے کا ایک ایک کونا چھان مارا ہے۔"

میں: "رپورٹ کر دیجیے تھانے میں۔" اس کے علاوہ میں اس کے علاوہ میں اس موضوع پر اور کچھ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

اور بہر صورت مرزا سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل تو نکالنا ہی تھا۔"

مرزا: ہاں کچھ سوچ تو میں بھی رہا ہوں کہ رپورٹ کر کے چند گھروں کی خانہ تلاشی کروا دوں۔"

میں: "تو یہ کام فوراً ہی ہونا چاہیے، دیر کرنے سے کیا حاصل؟" مرزا کچھ بولنے ہی والے تھے کہ دفعتاً انہوں نے جھپٹ کر میری میز کے نیچے سے کوئی چیز اٹھائی اور دروازے کے قریب روشنی میں جا کر دیکھنے لگے۔ میں نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو مرزا کی انگلیوں کے درمیان کسی پرندے کے چند بال تھے جو غالباً سڑک پر سے اڑ کر آ گئے تھے۔ مرزا کافی دیر تک خفیہ پولس کے کسی افسر کی طرح ان بالوں کا معائنہ کرتے رہے، کبھی ان کو آنکھوں کے قریب لاتے کبھی آنکھوں سے دور لے جاتے، پھر ایک آنکھ بند کر کے اپنی مٹھی کو دوربین بنا کر ان کو بغور دیکھا، اس کے بعد ان کو ملا اور سونگھا اور پھر غم اور غصہ کے ملے جلے تاثرات اپنے سیاہ چیچک زدہ چہرے پر طاری کر کے کرسی پر آ کر دوبارہ بیٹھ گئے، کچھ دیر مجھے گھورتے رہے اور بالآخر بڑی خشونت سے بولے

مرزا: "یہ بال کہاں سے آئے؟"

میں: "کون سے بال؟"

مرزا: "یہی بال!" مرزا نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ جس کی ایک انگلی پر بال کیا بالوں کے دو تین ریشے چپکے ہوئے تھے۔

میں: "آ گئے ہوں گے سڑک سے ہوا میں۔ غور سے تلاش کیجیے تو کمرے کے فرش پر ایسے بہت سے بہت سے نادرات بکھرے ہوں گے، ہفتے میں ایک بار تو جھاڑو دی جاتی ہے یہاں۔"

مرزا کئی منٹ تک فرش کو دیکھتے کیا بلکہ اپنی گہری نگاہوں سے اس پر جھاڑو دیتے رہے پھر کسی منجھے ہوئے نجومی کے لہجہ میں گویا ہوئے ؎

چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر ؛ قریب ہے یارو روزِ محشر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر ؛ لہو پکارے گا آستیں کا

خفت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے میری آواز کپکپانے لگی "کیا مطلب آپ کا مرزا صاحب؟"

مرزا صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "یہی کہ مرغی کی چوری ذرا چھپتی کم ہے اور عموماً بہت گراں ثابت ہوتی ہے۔"

میں غور کرنے لگا کہ مرزا کے ایک موٹی کتاب گھسیٹ کے ماروں تو زیادہ موثر ہوگا یا روشنائی سے لبریز دوات؟ کہ دفعتاً مرزا صاحب کے لڑکوں کے غول نے نعرہ لگایا "مل گئی ککی! مل گئی ککی!"

مرزا صاحب ہڑبڑا کر باہر بھاگے اور میں اپنا توازنِ دماغی قائم رکھنے کے لیے اپنے عینک کے شیشے بلا ضرورت صاف کرنے لگا۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ غالباً اس حادثہ کے بعد مرزا حیدر بیگ کے تعلقات مجھ سے کچھ کشیدہ ہو گئے ہوں گے۔ لیکن توبہ کیجیے! دوسرے روز میں اندر گھر میں داڑھی ہی بنا رہا تھا کہ مرزا صاحب نے دیوڑھی سے پکارا۔ میں یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی تار آیا

مُنہ پر صابن لگائے اور ہاتھ میں استرا لیے ہوئے باہر نکل آیا۔ مرزا صاحب نے ایک پُرجوش سلام علیکم کے بعد بڑے تحکمانہ لہجے میں استفسار فرمایا۔

"یہ جھانسی میل کانپور سے کس وقت چھوٹتا ہے ؟"

"مجھے نہیں معلوم !"

"کیا کرایہ ہے لکھنؤ سے بھوپال کا ۔؟"

"مجھے نہیں معلوم !"

"تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی جگہ تو مل ہی جاتی ہوگی ؟"

"غالباً ۔"

"آج کل چھٹیوں میں واپسی ٹکٹ تو مل ہی رہا ہوگا ؟"

"شاید !"

"کہاں ملتا ہے یہ ٹکٹ اور کیا دام ہوتے ہیں اس کے ؟" وغیرہ وغیرہ۔

میں نے استرا بند کرکے جیب میں ڈال لیا کہ کہیں مجھ سے کوئی حادثہ نہ سرزد ہو جائے ۔ صابن تو نہیں معلوم کب کا سوکھ کر چہرے کی خارشت ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹہ کی سر مغزنی کے بعد گھر واپس آیا تو بیگم نے بتایا کہ مرزا صاحب کی بیوی ابھی کہہ رہی تھیں کہ "بہبود بڑے باتونی ہیں تمہارے میاں ۔ مرزا صاحب کو ایسا باتوں میں لگاتے ہیں کہ انہیں پھر گھر کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی ۔"

مفلس قارونی
(بارسی ٹاکلی)

ہم لوگ

مصلحت کے غلام ہیں ہم لوگ — کس قدر نیک نام ہیں ہم لوگ
صبح کھاتے ہیں شام کھاتے ہیں — یعنی وقفِ طعام ہیں ہم لوگ
بد زبانی میں ہم ہیں لاثانی — یعنی سیف الکلام ہیں ہم لوگ
برق رفتار دوڑتے ہیں سبھی — پھر بھی محوِ خرام ہیں ہم لوگ
جو بھی چاہے خرید لے ہم کو — یعنی کوڑی کے دام ہیں ہم لوگ
رات دن ہر گھڑی ہیں گردش میں — جیسے مینا و جام ہیں ہم لوگ
در سے ٹکرا رہا ہے سیلِ بلا — نیند میں صبح و شام ہیں ہم لوگ
سن کے منہ لوگ پھیر لیتے ہیں — واہ! کیا خوش کلام ہیں ہم لوگ
منہ میں جو آئے بک ہی دیتے ہیں — کس قدر بے لگام ہیں ہم لوگ
کارِ ابلیس ہیں سنبھالے ہوئے — اس کے قائم مقام ہیں ہم لوگ
ستمِ بازوں، شراب نوشوں میں — باعثِ ننگ و نام ہیں ہم لوگ
جوتیاں کھا رہے ہیں سڑکوں پر — واجب الاحترام ہیں ہم لوگ
جس طرح چاہو ڈھال لو ہم کو — یعنی اک جنسِ خام ہیں ہم لوگ
کیوں عمل کا مطالبہ ہم سے — واعظانِ کرام ہیں ہم لوگ
اور کس سے ہیں؟ صرف اپنوں سے — مائلِ انتقام ہیں ہم لوگ
گھر میں چاروں طرف صفایا ہے — کتنے خوش انتظام ہیں ہم لوگ
غیر جس طرح چاہیں کھائیں ہمیں — دوستوں پر حرام ہیں ہم لوگ
پہلے ہم تھے ابوالکلام تو کیا — آج ابن الکلام ہیں ہم لوگ
تم نے قوال ہم کو گردانا — شاعرِ خوش کلام ہیں ہم لوگ
ہیں وہیں ہم جہاں سے نکلے تھے — کس قدر تیز گام ہیں ہم لوگ

کوئی مفلس کا خیر خواہ نہیں
اہلِ زر کے غلام ہیں ہم لوگ

پرویز یداللہ مہدی
(بمبئی)

پڑوسی، پڑوسن اور "وہ"

ہم نے غلطی سے امریکی فلم "LOVE THY NEIGHBOUR" عرف پڑوسی سے وہ کیجئے" دیکھ لی تھی، بس تب ہی سے ہمارے دل میں پڑوسیوں کے لئے ایک بار پھر محبت اور خلوص کا تلاطم بپا ہو گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے صرف ایک بار یہ جذبہ پوری شدّت کے ساتھ بیدار ہوا تھا، لیکن اس کا جو حشر ہوا، ملاحظہ فرمائیے :۔ موجودہ بستی میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے ہم ایک کالونی میں رہتے تھے، اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ پڑوسیوں کی خوشی میں بھلے ہی شریک نہ ہوں لیکن ان کے غم بانٹنے میں پیش پیش رہیں، چنانچہ ایک روز جیسے ہی اپنے ایک پڑوسی مسٹر اے۔ کے چندی والا کی بیوی کے انتقال کی خبر سنی، دوڑے دوڑے ان کے ہاں پہنچے اور دھیمے لہجے میں پرسہ دینا شروع کیا۔ "مجھے یہ روح فرسا خبر سن کر بڑا افسوس ہوا مسٹر چندی والا کہ آپ کی چندی،۔۔۔ میرا مطلب ہے بیوی اچانک اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔۔" ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مسٹر چندی والا حسرت بھرے لہجے میں ہماری بات کاٹ کر بولے "کاش آپ کی یہ بات سچ ہوتی۔۔" اب ہمارے گڑبڑانے کی باری تھی، انہوں نے آگے انکشاف کیا "آپ غلط جگہ آ گئے ہیں میں وہ خوش نصیب چندی والا نہیں۔ انتقال دراصل اے۔ کے چندی والا کی بیوی کا ہوا ہے، اور میں بی۔ کے۔ چندی والا ہوں"

وہ تو ہمارے نصیب اچھے تھے ورنہ سر نیم (SIR NAME) کی یکسانیت کی وجہ سے پٹ گئے ہوتے البتہ اس غلط فہمی کے نتیجے میں ہم نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی پڑوسیوں کے دکھ میں بھی شریک ہونے کی حماقت نہیں کریں گے۔ لیکن خدا بھلا کرے اس امریکی فلم کا جس نے ہمیں قسم توڑنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس فلم میں پڑوسیوں سے میل جول بڑھانے کے جو سائنٹیفک طریقے دکھائے گئے تھے، انہیں اپنے یہاں عملی جامہ پہنانا، اپنے جامے اور ہم جامے دونوں کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا، کیوں کہ مغربی ممالک میں پڑوسی سے محبت کرنے کے جو مواقع فراہم ہیں جو سہولتیں حاصل ہیں، اپنے یہاں ان کا عشر عشیر بھی میسّر نہیں لیکن یہ جذبہ چونکہ بڑی شد و مد کے ساتھ بیدار ہوا تھا اور اسے دوبارہ سلانا بھی ناممکن نظر آتا تھا۔ اس لئے ہم نے سب سے پہلے اس مسئلہ پر غور کیا کہ محبت کی ابتدا

کس سے کی جائے پڑوسی سے یا پڑوسن سے ۔ اس نکتے پر پہنچ کر ہماری ہستی کے "منارے" ہل گئے۔ ہمارے معاشرے میں پڑو
سے میل جول بڑھانا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جن سرپھروں کے نام اس سلسلے میں سند کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، ان کے بارے
میں مشہور ہے کہ اس مہم کا آغاز انہوں نے سر سے کفن باندھ کر کیا تھا۔ البتہ ان سرپھروں کے بھیانک انجام کو دیکھ کر ہم اس
نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سر سے کفن باندھنے کیلئے، سر کی مضبوطی سے زیادہ دل گردے کی مضبوطی شرط ہے، اور دل گردے کے معاملے میں
بدقسمتی سے ہم پیدائش ہی سے عجیب و غریب امراض میں مبتلا ہیں، اب تک ہمارے دل و گردے کو اتنے پیوند
لگ چکے کہ اب یہ بھی سائیکل کے اس خستہ "ٹیوب" کی طرح ناقابل استعمال ہو گئے ہیں، جن کے "پنکچر" دا
ئمی اس "تشدد" والکنائزنگ (VULCANAZING) کی جاتی ہے کہ بالآخر وہ وقت آجاتا ہے
جب اس ٹیوب کو سائیکل کے پہیے میں استعمال کرنے کے بجائے کاٹ کر اس کے پیوند، دوسرے ٹیوب میں جوڑے جاتے ہیں
چنانچہ اپنے خستہ اور شکستہ دل گردے کی حفاظت کے پیش نظر ہم نے اپنی فہرست سے "پڑوسن" کو تو یک جنبش قلم "قلم زد"
کر دیا۔ البتہ پڑوسیوں کے معاملے میں ہم چونکہ دودھ کے جلے تھے اس لئے راست کسی پڑوسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے
قبل، اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ اس سلسلے میں ہماری نظر انتخاب، نکڑ والے "چھپرا" ہوٹل کے
باہر والے پر پڑی، جو تھا تو باہر والا، لیکن محلے کے ہر گھر کے اندر کی خبر رکھتا تھا۔ اس کا منہ کھلوانے کے لئے ہمیں اپنی جیب کا
منہ اس قدر کھولنا پڑا کہ جیب اور دامن کے بیچ کا فاصلہ یکسر مٹ گیا۔ باہر والے نے سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی
ریٹائرڈ، پروفیسر ب۔ خان صدر شعبۂ اخلاقیات کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائیں، جو ہم مختصراً آپکے گوش گزار
کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کو، محلے کے شریر احباب، "پروضیفر" کے نام سے پکارتے ہیں اور دیگر شرفاء "پورے
صفر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ موصوف اپنے گھر کی خواتین کے تعلق سے اس قدر متشکی وا
ہوئے ہیں کہ جب بھی گھر کی دیوار پر، کبوتر، کوّا، فاختہ یا اس قبیل کا کوئی پرندہ پر مارتا نظر آتا ہے جو پیغام رسانی کے فرائض ا
دینے میں تاریخی ریکارڈ رکھتا ہو، تو موصوف فوراً مشکوک نظروں سے پہلے پرندے کو، پھر گھر کی خواتین کو پھر پرندے کو اس
وقت تک گھورتے رہتے ہیں جب تک کہ پرندہ یا گھر کی کوئی خاتون "اڑن چھو" نہیں ہو جاتی۔ معلومات کے پہلے ہی تھپڑ نے
ہمیں خاصا ہلا دیا۔ باہر والے نے ہمارے اندر والے اور باہر والے دونوں کو پیلا پڑتا دیکھ کر ایک آنکھ دبا کر فرمایا "کیوں
بابوجی! سب خیریت ہے نا۔ کہیں پیرو صفر صاحب کی کسی لڑکی سے آنکھ تو نہیں لڑا بیٹھے۔؟ کم بخت نے ایسے چٹخارے دار
لہجے میں آنکھ لڑانے کی بات کہی، جیسے اس کی نظر میں آنکھ ڈالنے اور ٹیل ڈالنے میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ پھر مزید بولا۔ "جب
تک سلامت ہیں ہم آپ کو کیا غم۔ آپ بس میرا خیال رکھئے بابوجی! میں پیرو صفر صاحب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپ کے
دل کی بات ان کی لڑکی تک پہنچا دوں گا۔ مگر پہلے یہ بتائیے آپ کس چھوکری پر لٹو ہوئے ہیں، وہ جو بغیر لاؤڈ اسپیکر کے
سن نہیں سکتی یا وہ جو بغیر ٹٹولے عورت اور مرد میں تمیز نہیں کر سکتی۔" معلومات کے اس دوسرے تھپڑ نے ہمیں بری
طرح پچھاڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے، باہر والے نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔ "وہ دیکھئے بابوجی
پیرو صفر صاحب شکرا کے بازو، الٹے گر رہے" میں اتر رہے ہیں۔" اس عجیب و غریب اطلاع پر ہم لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچے

اور باہر جو دیکھا تو واقعی ایک مختصر سا گول مٹول شخص ٹیلی فون کیبل کے لئے کھودے گئے گڑھے میں اتر رہا تھا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "پیر د صفر صاحب اس گڑھے میں کس لئے اتر رہے ہیں۔!" باہر والا بولا۔ "بابوجی، یہ تو روز ہی اس گڑھے میں چھپ کر اپنے گھر کی عورتوں کی جاسوسی کرتے ہیں کہ کون گھر کے سامنے سے گزرتا ہے، کیا کیا حرکتیں کرتا ہے اور جواب میں گھر کی عورتیں کیا جوابی کارروائی کرتی ہیں۔" یہ انکشاف ہماری معلومات کے تابوت میں آخری کیبل ثابت ہوا۔ ہم نے تو معلومات محض اس لئے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی روشنی میں الاقدم اٹھائیں لیکن پہلے ہی پڑوسی کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ان کے نتیجے میں بجائے روشنی کے گھور اندھیرا ہمارے ہاتھ لگا۔

اگلے دو دن تک ہم یہی سوچتے رہے کہ آیا معلومات کے اس اندھیرے میں ہی ٹھوکریں کھاتے رہیں یا کسی دوسرے پڑوسی کے بارے میں معلومات کا "سوئچ" آن کریں۔ ان دو دنوں میں یہ بھی خیال آیا کہ ہوسکتا ہے باہر والے نے اپنی کسی ذاتی خصومت کی بنا پر پیر د صفر صاحب کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ اب رہی پیر د صفر صاحب کی محکمۂ ٹیلی فون کے گڑھے میں اترنے والی حرکت تو ہوسکتا ہے ان کی کوئی قیمتی چیز گڑھے میں لڑھک گئی ہو، جسے اٹھانے کے لئے انہیں گڑھے میں اترنا پڑا۔ کیا آدمی صرف مر کر ہی گڑھے میں جاتا ہے۔؟ ہم نے تو اپنی ان گنہگار آنکھوں سے بے شمار جیتے جاگتے انسانوں کو مختلف گڑھوں میں دفن ہوتے دیکھا ہے۔ کوئی گڑھا بھوک اور افلاس کا ہے تو کوئی سوکھا اکال اور باڑھ کا۔ کوئی گڑھا فرقہ وارانہ منافرت کا ہے تو کوئی فسادات کے نتیجے میں ناحق مارے جانے والوں کے خون سے بھرا ہے۔ بلکہ اب تو یہ گڑھے اس قدر بھر چکے ہیں کہ حکومت کو چاہیئے کہ ان گڑھوں پر نو ویکنسی (NO VACANCY) کا بورڈ لگا دے۔!!

کافی غور و خوض کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ باہر والے کی فراہم کردہ معلومات پر اندھا دھند بھروسہ کرنے کے بجائے ہمیں خود، پیر د صفر صاحب سے ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔ کے مصداق ہم آتش عشق پڑوس میں کود پڑے۔ سب سے پہلے پیر د صفر صاحب کو سرِ راہ پکڑنے کی کوشش کی وہ بھی سلام کی ڈور سے، لیکن موصوف نے ہر بار رعونت کی قینچی سے اس ڈور کو کاٹ دیا، ہم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، جب بھی سامنا ہوتا، نئی ڈور باندھ کر سلام کی پتنگ چلاتے، آخر ایک روز ہمارے سلام کے ٹھمکوں اور جھٹکوں نے اپنا اثر دکھایا، موصوف ذرا سا پگھلے، یعنی ہمارے اشاراتی سلام کے جواب میں کنایاتی، وعلیکم السلام سے نوازا! اور اس پہلی پہلی کامیابی پر ہم نے خود اپنی پیٹھ ٹھونکی اور اس طرح اپنی ہمت بندھائی ؎

واہ پہ ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور کھل جائیں گے دو چار "سلاماتوں" میں

("سلاماتوں" کی ترکیب پر چونکیئے مت، ضرورتِ شعری کے تحت ہم نے اصل میں "سلام" کی جمع بنائی ہے) اور پھر

واقعی دو چار "سلاماتوں" کے فوراً بعد موصوف نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہمیں یوں لگا جیسے آتش نمرود" پر مع گل و گلزار ہوگئی۔ لیکن یہ ہماری خوش فہمی تھی، موصوف بجائے گھر لے جانے کے ہمیں سیدھے ٹیلیفون کیبل کے گڑھے میں لے گئے۔ گڑھے میں اتر کر جو نقشہ دیکھا تو ہماری آنکھوں کا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ موصوف نے گڑھے کو اپنا دیوان خانہ بنا رکھا تھا۔ ایک طرف دو عدد، ہلتی ٹانگوں والی کرسیاں، اور چھوٹی سی تپائی پر کچھ کتابیں دھری تھیں تو دوسری طرف ایک عدد صراحی معہ گلاس کے رکھی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے حسب توقع ایک عدد کرسی خود سنبھالی اور دوسری ہماری خدمت میں پیش کی۔ اور پھر پہلا سوال داغا۔ "جناب کا اسم گرامی؟"

عرض کیا۔ "خاکسار کو شیخ چاند حیا، بے حیا کہتے ہیں"

چہک کر بولے۔ "حیا بے حیا، دونوں ایک ساتھ یعنی ڈبل ایکٹنگ۔!"

ہم نے وضاحت کی۔ "اصل میں یہ دونوں میرے تخلص ہیں قبلہ! سنجیدہ شاعری میں بے حیا اور مزاحیہ شاعری میں حیا۔!"

منہ بنا کر فرمایا۔ "شاعری کے مرغ کی چونچ سے سورج کے گولے کو کھینچنے کی تو کوشش نہیں کرتے؟"

توبہ استغفار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جی بالکل نہیں کرتا۔!"

تبسم فرماتے ہوئے بولے۔ "پھر ضرور ہتھوڑا اور درانتی چھاپ شاعری کر کے ایک طرف ہتھوڑا ملا کر مزدوروں کو الو بناتے ہو تو دوسری طرف درانتی گھما کر سرمایہ داروں سے اپنا الو سیدھا کرواتے ہو۔!!

عرض کیا۔ جی نہیں۔ میں شاعری کو کسی ازم کا "پروپیگنڈہ" کسی تحریک کا "ایجنڈا" اور کسی سیاسی پارٹی کا "جھنڈا" نہیں سمجھتا۔" اس جواب پر خوش ہو کر بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگے۔ پھر پوچھا۔ شاعری میں فارم کے قائل ہو۔!"

ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "بالکل قائل ہوں بلکہ شاعری ہو یا زندگی دونوں میں ایک ہی 'فارم' کا قائل ہوں"

دریافت فرمایا۔ "کون سا فارم۔؟"

عرض کیا۔ "پولٹری فارم۔!"

چہک کر بولے۔ "بہت اچھے! اب یہ بتاؤ۔ کیا ابھی تک کنوارے ہو۔؟"

کہا۔ "جی اس لمحے تک تو ہوں۔!"

اچانک مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے استغفار فرمایا۔ "گھر کی دیواروں کے ادھڑے ہوئے پلاسٹر کو چھپانے کے لئے کیلنڈر لگانے کے قائل ہو۔؟" جواباً اثبات میں اقرار کیا تو مزید دریافت کیا۔ "عموماً کس قسم کے کیلنڈر پسند کرتے ہو؟ قدرتی نظاروں والے یا وہ جن میں حسین دوشیزاؤں کو فطری پیراہن میں دکھایا جاتا ہے۔؟"

عرض کیا۔ "میں دراصل کسی قسم کے کیلنڈر ٹانگنے کا قائل نہیں ہوں"

پوچھا۔ "پھر تاریخ کس طرح معلوم کرتے ہو۔؟"

جواب دیا۔ "جن دوستوں کے ہاں کیلنڈر پائے جاتے، میں ان کے ہاں جاکر دیکھ لیتا ہوں۔"
شریر لہجے میں فرمایا۔ "کیا دیکھ لیتے ہو، تاریخ یا کیلنڈر سے جھانکتی ہوئی حسینہ کو۔!"
"جی... وہ ...." ہم بری طرح گڑبڑا گئے۔
پوچھا۔ "کبھی محبت میں چوٹ کھائی ہے؟"
سہلاکر جواب دیا۔ "جی نہیں، کبڈی میں چوٹ کھائی ہے!"
"بہت خوب۔! ویسے محبت کے کھیل کو دیگر کھیلوں سے الگ سمجھتے ہو؟"
"جی نہیں۔" ہم نے سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "بلکہ میری تو یہ عین خواہش ہے کہ کھیلوں کے "اولمپک" مقابلوں کی طرح محبت کے بھی اولمپک مقابلے، منعقد کئے جائیں۔"
پوچھا۔ "کیا یہ مقابلے پُرلطف ثابت ہو سکتے ہیں۔؟"
عرض کیا۔ "بالکل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تصور کیجئے کہ محبت کے اولمپک مقابلے میں ایک طرف سے "چینی" محبوبہ یہ کہتے ہوئے میدان میں اُترتی ہے "چُون چوں چیاؤں میاؤں چوُں چوُں چٹاخ"۔ تو دوسری طرف سے "ایرانی محبوب" یہ کہتے ہوئے میدانِ محبت میں کود تا ہے۔ زبانِ یارِ من چینی، مَن چینی نمی چوُں چوُں نمی چوُں چوُں"..!
متحیر لہجے میں فرمایا۔ "تعجب ہے، محبت کے بارے میں ایک طرف تو اس قدر دُور کی سوچتے ہو اور دوسری طرف ابھی تک کنوارے ہو۔؟ کہیں کوئی "صیغۂ راز" والی پوشیدہ بیماری تو نہیں..؟"
"جی۔ ہی۔ ہی۔ بالکل نہیں۔" ہم سٹپٹا کر رہ گئے۔
"تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔؟"
عرض کیا۔ "فی الحال ارادہ نہیں ہے۔"
"کبھی تو کروگے۔"
"جی ضرور کروں گا۔"
"مجھے ضرور یاد رکھنا۔"
"جی۔ آپ کو۔ یعنی کہ ..." ہم مشکوک نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تو گڑبڑا کر بولے... "لاحول ولا قوۃ۔ میرا وہ مطلب نہیں۔ بلکہ میرا اشارہ اپنی لڑکی کیطرف ہے۔ وہ، وہ بیاہنے لائق بیٹھی ہیں۔" "آپ کا اشارہ کون سی لڑکی کیطرف ہے۔" ہم نے بے ساختگی سے پوچھا۔ "وہ جو اونچا سنتی ہے، یا وہ جو بغیر چھوئے بغیر ٹٹولے ...." ہمارا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ موصوف نے بُری طرح چلانا شروع کردیا۔ "نامعقول، پاجی، بدمعاش اٹھو یہاں سے۔ نکلو باہر۔ پولیس پولیس" اس بیچ دیکھو اور پولیس کی [illegible] پر ہم نے جو گڑبڑا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو پہلے دونوں کرسیوں سے الجھے [illegible] [illegible] سے ٹکرائے پھر پروفیسر صاحب کے [illegible] بڑے بمشکل تمام اس کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے

اور جب کھلی فضا میں دوبارہ سانس لینا میسّر ہوا تو جی چاہا کہ چلّا چلّا کر ساری خدائی سے کہیں۔ لوگو! تم نے چاند کی زمین پر قدم رکھ کر آنے والے خلا بازوں، کو دیکھا ہوگا، لیکن مجھے دیکھو، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ کہ میں ابھی ابھی عذابِ قبر سے گزر کر زندہ اور صحیح سلامت قبر سے باہر آیا ہوں۔۔۔!

عذابِ قبر سے ملتے جلتے اس جھٹکے نے اگرچہ آتشِ عشقِ پڑوسی پر تھوڑی سی اوس ضرور ڈال دی تھی پھر بھی ہم نے سوچا کیا ضروری ہے کہ ہر پڑوسی پیرو صفر صاحب کی طرح عجوبۂ روزگار ہو۔ چنانچہ آخری کوشش کا بیڑہ اٹھایا اور کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کئے بغیر ایک شام، اس پڑوسی کے در دولت پر جا پہنچے جن کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ" نے ہمیں بار ہا متوجہ کیا تھا، سیاہ رنگ کی تختی پر اُجلے حروف میں لکھا تھا آئی۔ ایم۔ کانچ والا" نام کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم نے بڑی آہستگی سے اطلاعی گھنٹی بجائی کہ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔۔۔

کچھ توقف کے بعد دروازہ کُھلا اور سچ مچ ایک عدد "آبگینہ" نمودار ہوا۔ نازک مہین چھوٹی موٹی سا بلور کے پُتلے کی طرح یوں لگا جیسے خالقِ کون و مکان نے ازراہِ مذاق زنانے کی "چیز" مردانے میں بھیج دی ہے۔ ہم نے اس آبگینے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر کانچ والا ہیں ۔۔!"

"بالکل ہیں۔ بلکہ اس وقت آپ کے روبرو موجود ہیں۔" آبگینے نے شرماتے ہوئے فرمایا۔ گویا مسٹر کانچ والا سچ مچ اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے ہم نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ وہ فوراً بولے "میں آپکو اچھی طرح جانتا ہوں" "چھپو ہوٹل" کے باہر والے سے آپکے بارے میں بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ میں تو خود آپ سے ملنے کا بےحد مشتاق تھا، اچھا ہوا جو آپ مجھ سے ملنے چلے آئے۔ آیئے تشریف لایئے۔" ہم پر حیرتوں کے بے شمار پہاڑ توڑ کر کانچ والا ہمیں اندر لے گئے۔ گھر کے اندر کی خاموشی صاف بتارہی تھی کہ موصوف ایک دم بے بال و پر آدمی ہیں۔ موصوف نے سب سے پہلے اپنے "صاحبِ فریج" ہونے کا رعب ہم پر ڈالا۔ یعنی ٹھنڈے مشروب سے ہماری تواضع کی' پھر ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ البتہ جب اس گفتگو کا دھارا سیاست' ادب فلم وغیرہ سے ہوتا ہوا ہماری "مجرد زندگی" کی چٹان سے ٹکرایا تو ہم نے گھبرا کر اجازت چاہی تو بڑی لگاوٹ سے اٹھلا کر بولے۔ "بیٹھئے نا ابھی ابھی تو آپ آئے ہیں"۔ اتنا کہہ کر بدلے ہوئے تیور کے ساتھ آگے فرمایا۔ دورانِ گفتگو جو لوگ گھڑی گھڑی، گھڑی) کی طرف دیکھتے ہیں وہ مجھے گھڑی بھر کو بھی اچھے نہیں لگتے اور آپ مجھے پہلی ہی گھڑی میں اچھے لگے ہیں۔ اس انکشاف پر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے غالباً وہ ہماری اس "غیر کیفیت" کو بھانپ چکے تھے اچانک پینترا بدل کر بولے۔ "آیئے پہیلیاں بوجھیں! بتایئے وہ کونسی کلی ہے جو کبھی پھول نہیں بنتی۔" جواب میں ہم انہیں گھورتے رہے کیونکہ وہ خود ایک پہیلی نظر آرہے تھے، ہماری خاموشی پر مسکرا کر بولے۔ "اتنی آسان پہیلی نہیں بوجھ سکے آپ۔ جناب وہ کلی جو کبھی پھول نہیں بنتی۔ اکثر گھر کی دیواروں پر نظر آتی ہے یعنی چھپکلی"۔ اتنا کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے اور ان کی ہنسی کی گونج پر ہمیں کانچ کے چٹخنے کا گمان ہوا۔ پھر اگلی پہیلی داغی۔ "اب یہ پہیلی بوجھئے! وہ کون سی چیز ہے جو لڑکپن میں) مونث ہوتی ہے مگر جوان ہو کر مذکر بن جاتی ہے۔" ہم بھلا ان کی پہیلیاں

کس طرح بوجھتے دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں تھا۔ چنانچہ خود ہی بولے "یہ ذرا مشکل پہیلی ہے میری بنائی ہوئی ہے نا۔ وہ چیز جو مونث سے مذکر میں تبدیل ہوجاتی ہے، اصل میں پھول ہے۔ کلی جب تک کھلتی نہیں مونث ہوتی ہے اور جب کھل جاتی ہے تو پھول کہلاتی ہے اور پھول ظاہر ہے مذکر ہے"۔ موصوف کی ان عجیب و غریب پہیلیوں اور اس سے زیادہ ان کے عجیب و غریب رویئے نے ہمیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ہماری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے مزید فرمایا اب آخری پہیلی۔ ایک چیز ایسی ہے جو تھوڑی اِدھر ہے، تھوڑی اُدھر ہے بتایئے باقی کدھر ہے"؟ ہم اُس وقت کنالامے کی طرح پک چکے تھے اچانک پھٹ پڑے۔ "وہ بیچ کُدھر والی چیز آپ ہیں، صرف آپ"! بجلی کی طرح چکاری مار کر بولے "اللہ کتنے ہشیار ہیں آپ کتنا جلد کا پہچان گئے"! اور پھر اس سے پہلے کہ یہ آبگینہ خود کو ٹھیس پہنچانے کے ارادے سے براہ راست ہم سے ٹکراتا وہاں سے جو بھاگے تو پھر بھاگتے ہی چلے گئے اور پتہ نہیں کب تک بھاگتے رہتے کہ ایک موڑ پر اچانک کسی سے بُری طرح ٹکرائے اور پھر اس کو ساتھ لیئے ہوئے ہی ڈھیر ہوگئے۔ جب حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ ہم ایک ساتھ دو عدد راہ گیروں سے ٹکرائے تھے اور انہیں ساتھ لیئے ہوئے محکمۂ ٹیلی فون کے کیبل والے گڑھے میں پہنچ گئے تھے۔ اور حسنِ اتفاق کہ وہ دونوں راہ گیر کوئی اور نہیں بلکہ ایک تو یہ وصفر صاحب تھے اور دوسرا چھپرو ہوٹل کا باہر والا تھا۔ یہ وصفر صاحب ملتشکی لہجے میں غصّہ سے پھٹ پڑے۔ "میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تمہارا رجحان کس طرف ہے"۔ مرد آدمی کا کافی عمر تک مجرد رہنا اسے اکثر غلط لتوں میں مبتلا کر دیتا ہے!

اس روز ہم کس طرح اس گڑھے سے نکلے اور پھر کیسے گھر پہنچے، اسے جانے دیجئے، البتہ اس دن کے بعد سے ہم نے یہ عہد کر لیا ہے کہ اب کبھی پڑوسیوں سے میل ملاپ بڑھانے کی حماقت نہیں کریں گے تا وقتیکہ اس لائق پڑوسی نہیں پیدا ہوجاتے اور پڑوسی و پڑوسن کے درمیان پائی جانے والی "قہ" قسم کی مخلوق پر ایک بار پھر آسمان سے پتھروں کی بارش نہیں ہوجاتی۔!!!

■■

غزلیں

پاگل عادل آبادی

میں ہوں بچوں سے پریشان خدا خیر کرے
اور بیگم کو ہے ارمان خدا خیر کرے

عشق میں دونوں ہیں حیران خدا خیر کرے
مجھکو ملتی ہی نہیں پرستان خدا خیر کرے

باپ کو تیرے پٹادیں تو پٹائیں کیسے
میں ہوں لاغر وہ پہلوان خدا خیر کرے

بھیک منگے بھی اسے کہتے ہیں کھانے سے گریز
میری بیگم کا یہ پکوان خدا خیر کرے

باپ کا ایک ہی بیٹا ہے مگر کیا بولوں
یہ ولی اور وہ شیطان خدا خیر کرے

ڈبہ چندے کا ہے اس میں ہری پانچ کی نوٹ
ڈگمگانے لگا ایمان خدا خیر کرے

وصل کی شب بھی وہ کرتا رہا ورزش ہر دم
یار ہے اپنا پہلوان خدا خیر کرے

شیخ دیکھا یہ فدا اور یہ اُن کی میڈم
ہے اپنا بھی یہ قربان خدا خیر کرے

میرا شاگرد بھی میں کیا کہوں پاگل نکلا
لیکے بھاگا میرا دیوان خدا خیر کرے

رؤف رحیم

ملک میں جدہر دیکھو خون کی روانی ہے
دیش ٹکڑے ہو جائے مفسدوں نے ٹھانی ہے

آسمان کو چھوتی آج کل گرانی ہے
گھر جنوائی بن جائیں دل میں ہم نے ٹھانی ہے

ساس نے جلا ڈالا خود بہو کو ہاتھوں سے
کم جہیز لائی تھی اس قدر کہانی ہے

کون آج مخلص ہے اس دیاں سنا یارو
منہ پہ کچھ ہے لوگوں کے دل میں اور ٹھانی ہے

صبح میں ڈراتا ہوں رات اُن سے ڈرتا ہوں
دن کا ہوں میں راجہ تو رات کی وہ رانی ہے

جا چکی ہیں میکے کو روٹھ کر مری بیگم
دن مرے سلونے ہیں رات بھی سہانی ہے

چاند میں چلے جائیں یا خلاء سے ہو آئیں
قرض مانگ کر اپنی زندگی بتانی ہے

خطبۂ نکاح جب سے پڑھ دیا ہے قاضی نے
رہن ہاتھ میں ان کے میری زندگانی ہے

لاکھ گالیاں دیں گے پیٹ دیکھے ہم ان کو
اُن کے منہ پر لیکن اپنی بے زبانی ہے

کون سی قباحت ہے اس کی کھچڑیوں میں
جب رحیم دنیا کی تم نے خاک چھانی ہے

○

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

کرفیو نگر

ہر شہر اپنے شہریوں کو کچھ نہ کچھ سوغات دیتا ہے۔ جاپان اپنے شہریوں کو وقتاً فوقتاً زلزلوں سے ہلاتا اور جھُلاتا رہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے شہروں نے اپنے شہریوں کو پٹرول کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ قسمت اپنی اپنی اور نصیب اپنا اپنا ہے۔ شہر حیدرآباد اپنے شہریوں کو کرفیو کی سوغات دیتا رہتا ہے۔ اب تو جناب کرفیو کا نفاذ ہمارے شہر کا ماہواری فیچر بن چکا ہے۔ ہر مہینے حیدرآبادی شہری، کرفیو کے نفاذ کا انتظار بھی کرتے ہیں۔ عید و تہوار پر جلوس نکلے گا۔ تصادم ہوگا، لوٹ مار، آتش زنی اور چھرا زنی ہوگی۔ اور پھر شہریوں کو ان کا محبوب اور مرغوب "کرفیو" کا تحفہ ملے گا۔

لوگ فکر معاش میں دفاتر اور فیکٹریاں گئے ہوتے ہیں۔ طالب علم، علم کی پیاس بجھانے اسکول اور کالج، بیمار حضرات، علاج معالجہ کے لیے دواخانے گئے ہوتے ہیں۔ زندگی کی ہماہمی عروج پر رہتی ہے کہ کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔ لوگ بھاگتے دوڑتے اعلان کرتے جاتے ہیں کہ بلوہ ہوا، فائرنگ ہوئی اور کرفیو لگ گیا۔ ماں باپ پریشان ہیں کہ بچے اسکول سے واپس نہیں آئے۔ بیوی گھر کی چوکھٹ تھامے شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ اور صدر خاندان پریشان، دیر تک ایک ایک فرد کو جمع کرتے ہیں۔ تمام لوگ جمع ہونے کے بعد خدا کا شکر ادا کیا اور گھر میں قید ہو گئے۔ ہمارے شہر میں چند سال سے کرفیو اتنی مرتبہ نافذ ہو چکا ہے کہ اب ہم تجربہ کی بنیاد پر کرفیو کے نفاذ کی پیش قیاسی کر لیتے ہیں۔ کرفیو کے لیے راشن اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ ایندھن کا انتظام ہوتا ہے۔ دوائیں منگوا کر رکھ لی جاتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کرفیو میں طبی مدد کے لیے فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لی ہے۔ حفظ ما تقدم کے طور پر "جہاں ڈاکٹر نہ ہو" عنوان والی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹری بھی شروع کر دی ہے۔ انھوں نے ہمیں بتلایا کہ بعض وقت مرض ٹائیفائیڈ میں جراثیم پیٹ میں گھر کر لیتے ہیں جو وقفہ وقفہ سے مرض پیدا کرتے رہتے ہیں جسے Recurrence کہتے ہیں۔ کرفیو کا نفاذ ہمارے شہر کے لیے ٹائیفائیڈ جیسا مرض بن چکا ہے۔ فرقہ واریت کا زہر شہر میں گھر کر چکا ہے اور دوا ایک جہتی ختم ہو چکی ہے۔

کرفیو نافذ ہوتے ہی گلی کوچوں میں حیدرآبادی شہری تعزیتی میٹنگ کرتے ہیں۔ کسی بھی گلی میں چلے جائیے وہاں لوگ سر نگوں، گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد ایک شخص کہتا ہے "بھائی ابھی پچھلے کرفیو

کے اثرات زائل بھی ہونے نہ پائے تھے کہ پھر کرفیو نافذ ہوگیا۔" دوسرا شخص ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ہے کہ "کرفیو نے جینا محال کردیا ہے، ہر ایک اپنی اپنی پریشانی اور تکلیف کا رونا روتا ہے۔ "بچوں کے لیے دودھ کا کیا ہوگا" "میری دوائیں ختم ہوچکی ہیں" "مہنگائی میں اضافہ ہوگا" "ہم جیسے روز محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے والوں کو اب فاقے کرنے ہوں گے۔" اس کے علاوہ ایک دوسرے کو تسلی، دلاسا اور پرسہ بھی دیتے ہیں۔ اور جناب جب کرفیو اٹھ جاتا ہے تو ہر کوئی بظاہر مصروف ہوجاتا ہے۔ پڑوسیوں سے ملنے ملانے حتیٰ کہ خیر خیریت دریافت کرنے کے لیے چند منٹ بھی نہیں ملتے!

حیدرآبادی شہری کئی کام کرفیو کے دوران انجام دینے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپائیں۔ کرفیو کے نفاذ کے ساتھ ہماری بیوی، پرانے کپڑوں کا انبار لگا دیتی ہے۔ پتلون کو کاٹ کر منے کی چڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ "منی" کے لیے ایک فراک اور بازار سے سودا سلف لانے کیلئے تھیلیاں تیار ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنے ایک دوست سے کہی تو انہوں نے ہمیں بتلایا "جب تم نے سچ کہہ دیا ہے تو کیوں نہ تمہیں بتلادوں کہ کرفیو کے دوران میں برتنوں کی قلعی اور گھر کی داغ دوزی کرتا ہوں۔ ہمیں باتیں کرتا دیکھ کر ہمارے ایک اور ساتھی نے کہا "یار مجھے بیوی بچوں کے کپڑے دھونے پڑتے ہیں۔ پہلے کرفیو کی چھٹیوں میں مزا آتا تھا لیکن اب وقت کاٹے نہیں کٹتا اور گھر پر پڑے جماہیاں لینے سے بیوی الگ بے زار ہونے لگی ہے۔"

ہمارے شہر میں کرفیو کے بار ہا نفاذ نے اکثر شہریوں کی عادات و اطوار بلکہ چال وچلن پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ ہم نے تاش کھیلنا سیکھ لیا ہے۔ ہمارے ایک دوست جنہیں زردے کی بو سے سر کا درد ہوتا تھا آج، زردے کا پان ہمیشہ منہ میں دبائے رہتے ہیں۔ بقول ہمارے ایک دوست، اکثر شہریوں کی چال بدل چکی ہے۔ شہر کے راستوں پر ایسے چلتے ہیں جیسے چاند پر دوڑ رہے ہوں۔ چوکنے، تیز قدم بڑھاتے ہوئے، دائیں، بائیں اور آگے پیچھے دیکھتے ہوئے کہ کہیں سے کوئی نام کے عوض زندگی کے درپے نہ ہو جائے، محفوظ سے محفوظ مقام کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

اس ترقی یافتہ دور میں وقتاً فوقتاً فسادات اور کرفیو کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم تہذیب اور ترقی کے دور سے کئی صدی پیچھے لوٹ گئے ہیں۔ کئی دن اخبار نہیں ملتا، دوست احباب کے خطوط راستے میں رہ جاتے ہیں۔ ٹیلی فون ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ کرنٹ غائب رہتا ہے، نلوں سے پانی نہیں رستا، گلی کوچوں میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگ جاتا ہے۔ دکانیں سامان سے بھری بند رہتی ہیں اور لوگ دواخانے رکھتے ہوئے بھی طبی امداد حاصل نہیں کرسکتے۔ ایسے حالات میں اگر پولیس کسی مریض یا دردِ زہ میں مبتلا خاتون کو دواخانہ پہنچا دے تو اسے انسانی ہمدردی اور انسان دوستی سے تعبیر کیا جاتا ہے!

سیاسی جماعتیں فساد کے لیے ایک دوسرے کو ذمہ دار گردانتی ہیں۔ فساد کے لیے ذمہ دار ہوتے ہوئے بھی کوئی سیاسی جماعت فساد کی ذمہ داری قبول نہیں کرتی بلکہ خفیہ طور پر فساد کی آگ کو اور بھڑکاتی ہے۔ بیانات اور جوابی بیانات اور امن وامان قائم کرنے کی اپیلیں جاری کرتی ہے۔ روایتی یک جہتی اور گنگا جمنی تہذیب کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ جس طرح ناجائز اولاد کا سارا دوش ماں برداشت کرتی ہے۔ ایسے ہی کرفیو کے دوران تکالیف اور مشکلات کو عوام جھیلتے ہیں [illegible] اور جناب ہمارے شہر میں کرفیو چند گھنٹوں کے لیے نافذ نہیں کیا جاتا

کئی کئی گھنٹے بلکہ کبھی کبھی دن بغیر وقفہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ حکام کرفیو نافذ کر کے بھول گئے ہیں۔ گھر میں موجود اناج اور پیسے ختم ہو جاتے ہیں۔ فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔ اکثر لوگ فاقے بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے ایک دوست نے کرفیو کی تعریف یوں کی ہے۔ "کرفیو وہ طریقہ ہے جس میں شہریوں کو فساد سے بچا کر بھوکا مارا جاتا ہے"

آج کی نسل تعلیم اور تہذیب سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔ ہڑتال، الکشن اور سیاست جیسی مصروفیات میں سے طالب علم چند دن پڑھائی کے لیے نکال لیتے تھے لیکن تعطیلات اور کرفیو نے طالب علموں کی تعلیم کے چند دنوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ بڑے صاحبزادے پڑوسی شاعر کی صحبت میں شاعری کرنے لگے ہیں۔ دوسرے صاحب کیرم، تاش، شطرنج اور دوسرے کھیلوں میں مصروف رہنے لگے ہیں۔ تیسرے صاحب ایک گویئے کے یہاں پکے گانوں کا ریاض کرنے لگے ہیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہمیں صرف لڑکے ہیں اور چاہتے تھے کہ وہ سب انجینیر یا ڈاکٹر بنیں لیکن جناب بھلا ہو کرفیو کا، جو ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب صرف آخری لڑکے سے امید ہے۔ ہر روز وہ کسی نہ کسی سے جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ یقیناً وہ لیڈر بنے گا۔

وقت کا صحیح استعمال شاید ہی ہوتا ہے۔ اور جناب کرفیو کے دوران وقت کا صحیح استعمال بھی نہیں ہو سکتا۔ پرانی کتابیں، رسائل اور اخبارات طاقچوں سے نکال کر پڑھے جاتے ہیں۔ ایک ہی کتاب کا ہر بار کرفیو میں ایک دور ہوتا ہے۔ گانوں اور غزلوں کے کیسٹوں کو بار بار سنا جاتا ہے۔ بقیہ وقت غیر ضروری بحث و مباحثہ کی نذر ہوتا ہے۔ کرفیو کا نفاذ اور کرفیو میں نرمی شہریوں کا محبوب موضوع ہے۔ ہمارے شہر میں بار ہا کرفیو نافذ ہونے کے باوجود کرفیو نافذ کرنے اور کرفیو میں ڈھیل دینے کا سلیقہ آج بھی نہیں آیا۔ کبھی تشدد کے بعد بھی کرفیو نافذ نہیں کیا جاتا تو کبھی جلد بازی سے کرفیو اٹھا لیا جاتا ہے۔ بعض وقت کرفیو اٹھتے ہی پھر سے نافذ ہو جاتا ہے۔ شام کرفیو میں نرمی کا اعلان ہوتا ہے لیکن صبح کرفیو پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ ہمیں کرفیو کا نفاذ کبھی محبوبہ کے وعدہ کی طرح تو کبھی شرابی کی توبہ جیسا لگتا ہے۔ جب جی چاہا وعدہ کر لیا اور جب جی چاہا توبہ توڑ دی۔ کرفیو کے باوجود اکثر لوگ بے کاری اور بے روزگاری سے تنگ آکر باہر نکل پڑتے ہیں۔ ایک رکشہ راں نے پچھلے کرفیو کے دوران ہم سے کہا تھا "صاحب فاقے ہو رہے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر گھر سے نکلا ہوں۔ زخمی ہوا یا مر گیا تو میرے رشتہ داروں کو کچھ نہ کچھ رقمی امداد تو ملے گی !!

کرفیو کے سبب شہر میں غذائی اجناس کی اہمیت اور قیمت بڑھ چکی ہے۔ کل تک ٹماٹر چند روپیہ کیلو ملتے تھے آج عدد کے حساب سے سیب کے دام بیچے جاتے ہیں۔ جس غذائی شئے کو سب پر فوقیت ہوئی وہ دال ہے۔ حیدرآباد شہر کی بریانی مشہور ہے۔ لیکن کرفیو کے بار بار نفاذ سے آج بریانی کی جگہ دال نے لے لی ہے۔ ہر گھر میں دال کھانا بنتا ہے۔ یہ ایک طرح سے "کرفیو ڈش" بن گئی ہے۔ حیدرآبادی عوام دال کو کئی طریقوں سے پکانے میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ کھٹی دال، میٹھی دال، کھٹی دال، مصالحہ کی دال، دالچہ، چھوٹو کی دال، جیسی وغیرہ وغیرہ کرفیو کے بار بار نفاذ سے پکوان آسان ہو گیا ہے۔ صبح چاول اور ایک قسم کی دال پکائی اور رات دوسری قسم کی دال کو خیر باد کہہ دیا۔ بار بار کرفیو کے نفاذ کی وجہ سے ہم دو قدیم محاورے

"دال بیچے پال" اور "دال روٹی" کا مطلب واضح مثالوں کے ساتھ سمجھ پائے ہیں۔ دال کھانے کے اب ہم اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہمارے انگ انگ سے دال جھلکتی رہتی ہے۔ اکثر اوقات کرفیو ڈش "دال کھانا" بھی میسر نہیں ہوتی تب ہمیں چاول کی تقسیم کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چاول کی تقسیم کرفیو کے دوران اہم خبروں میں سے ایک ہوتی ہے جو اخباروں میں بڑی سرخی کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ تقسیم کنندگان کی فہرست چاول حاصل کرنے والوں سے زائد ہوتی ہے۔

ہمارے شہر کرفیو میں زندگی کا مزا ختم ہو چلا ہے۔ اب تو جناب محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک عادی مجرم ہیں جو بار بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہتا ہے۔ ویسے چند اشخاص پر "عادی مجرم" کا لیبل چسپاں بھی کر دیا گیا ہے۔ آج حیدرآبادی شہری عجیب نا بندگی اور بے بسی کا شکار بنے رہتے ہیں۔ کرفیو کے دوران، کرفیو برخاست ہونے کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور جب کرفیو برخاست ہو جاتا ہے تو پھر سے کرفیو کے نفاذ کا اندیشہ بے چین کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ آج شہر کرفیو میں آزادانہ ماحول ہے اور نہ ہی زندگی کی طمانیت راستہ چلتے راہرو کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے وہ ملک الموت ہو۔ سورج ڈھلنے سے پہلے گھر نہ پہنچنا خطرناک خدشات پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا ایک مرتبہ شام وقت پر گھر نہ پہنچنے سے کہرام مچ گیا تھا۔ غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام ہو ہی رہا تھا کہ وہ گھر پہنچے۔ سب کو خوشی کی بجائے حیرت تھی کہ وہ زندہ بچ کیسے گئے۔

آج حیدرآباد شہر اور کرفیو لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ چارمینار کے بعد حیدرآباد کی اگر کوئی چیز مشہور ہوئی تو وہ کرفیو ہے بین الاقوامی سطح پر بھی حیدرآباد کا نام ذرائع ابلاغ میں فسادات اور کرفیو کی وجہ سے لیا جاتا ہے۔ چند دن قبل جب ہم دوسرے شہر میں تھے وہاں ہمارا تعارف کروایا گیا۔ "آپ حیدرآبادی ہیں" متعارف شخص نے جھرجھری لی، چہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور دبے لہجہ میں انہوں نے پوچھا "وہی فسادات اور کرفیو کا شہر" ہم نے صرف "جی" کہا۔ وہ یوں ڈرے اور سہم گئے جیسے ہم چاقو سے حملہ کرنے والے ہوں۔ اور پوچھا حیدرآباد میں آپ لوگ کیسے رہتے ہیں؟ ہم نے فخر سے گردن اونچی کر کے جواب دیا "خطرناک حالات کے عادی ہو چکے ہیں" اور پھر گردن نیچی کر کے سوچنے لگے کیوں نہ ہم اپنے شہر کا نام "کرفیو نگر" رکھ لیں۔

سرسوتی سرن کیف

تحقیق کے کام میں حضرت ادیب کا تعاون

ہمارے کاتب جناب افتخار احمد عجیب چیز ہیں۔ دس برس کی عمر میں کتابت سیکھی تھی۔ اس حساب سے چالیس پینتالیس سال کا اس فن میں تجربہ ہے لیکن ممکن ہے کوئی شخص کسی بھی طرح ان سے ایک دن میں رسالے کے دو صفحات سے زیادہ کتابت کروا سکے؟ ڈانٹ ڈپٹ کو شربت روح افزا کی طرح پی جاتے ہیں کیونکہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ میری سخت ڈانٹ پھٹکار کے بعد وہ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے لیٹ جاتے ہیں۔ قلم دان اور کاغذ ایک طرف کھسکا دیتے ہیں، پھر چائے منگاتے ہیں، بیڑی پیتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور ذرا پھیل کر پندرہ بیس منٹ تک خراٹے بھرتے ہیں۔ ہمارا دفتر ہفتے میں پانچ روز کھلتا ہے جس میں اوسطاً تین دن مندرجہ بالا پروگرام عمل میں آتا ہے۔ چھٹی لینے میں بھی ماہر ہیں یعنی جتنے روز ملازمت کی ہے اس کے آدھے دنوں میں کام پر آئے ہیں اور جتنے روز کام پر آئے ہیں اس کے تین چوتھائی دنوں میں شربت تفریح پی کر قیلولہ فرمایا ہے۔

آج انہیں یہ شربت دوگنی مقدار میں ملا تھا کیونکہ انھوں نے ایک مشہور شاعر کی معیاری نظم کی اتنے بھدے ڈھنگ سے کتابت کی تھی کہ میں نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے تھے۔ اُمید تھی کہ چونکہ آج دس منٹ کی بجائے پندرہ بیس منٹ تک ڈانٹ پڑی ہے، اس لئے کم از کم پون گھنٹہ خراٹے بھریں گے۔ مجھے ڈائرکٹر صاحب نے بلایا تھا۔ ساتھ ہی ایک سرکاری پیغام کی کتابت مجھے آج ہی کروانی تھی، اس لئے چپراسی سے انہیں جگانے کی بجائے خود ہی ان کی سیٹ پر جاکر مسودہ دینا طے کیا۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ اگر وہ آرام فرماتے پائے جائیں تو انہیں مزید ایک گلاس شربت تفریح پیش کیا جائے۔

لیکن دور ہی سے انہیں چستی سے بیٹھے اور کسی سے بات کرتے دیکھا تو تعجب ہوا۔ دوسرا تعجب اُس وقت ہوا جب وہ مجھے دیکھ کر گھبرا سے گئے اور کوئی چیز اپنی وردی کے نیچے چھپا کر تپاک سے کھڑے ہو گئے۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی حضور؟ مجھے چپراسی سے بلوالیا ہوتا۔" تیسرا تعجب اس وقت ہوا جب ان سے گفتگو کرنے والے حضرت نے اُٹھ کر میری طرف مڑ کر دیکھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ چہرۂ مبارک جناب ادیب جالنسری کا تھا۔ آج تعجب انگیز واقعات کی ڈبکی لگی ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ جناب ادیب جالنسری نے میرے دماغ کی بجائے افتخار صاحب کا دماغ تناول فرمانے

کا پروگرام بنایا تھا بلکہ مجھے دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے تھے اور مجھے سلام کرنے کے بعد یکسر بے معنی "ہی ہی ہی" سے زیادہ کچھ نہ کر سکے تھے۔

میں نے ان واقعات اور چالبازیوں کو کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ ڈائرکٹر صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے خدا کا شکر البتہ ادا کیا کہ ادیب صاحب نے کوئی بات نہیں کی ورنہ وہ تو ان لوگوں میں ہیں کہ جنازہ روک کر شروع ہو جائیں تو میّت کو بھی اٹھ کر ان کی باتوں پر دو چار مرتبہ ہاں تا کرنی پڑے۔

میں تو اس واقعے کو بھول چکا تھا لیکن تیسرے چوتھے دن افتخار صاحب میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "حضور، کہنا مناسب تو نہیں ہے لیکن بغیر کہے گذارہ بھی نہیں ہے۔ جو تنخواہ مجھے ملتی ہے اس میں گذر ہونی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میرا موڈ اس وقت کافی اچھا تھا۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "منشی جی، آج آپ نے افیم کی چسکی کچھ زیادہ لے لی ہے۔ آپ یہ بھول گئے کہ آپ سرکاری ملازم ہیں، کسی ہفتہ وار کے مالک مدیر کے ہاں کام نہیں کرتے جو آپ کے کہنے پر اُجرت بڑھا دے۔ آپ کی تنخواہ میں تو کیا، ڈائرکٹر صاحب بھی نہیں بڑھا سکتے"

افتخار صاحب ہنس کر بولے "وہ تو میں جانتا ہوں حضور میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر میں کچھ اور کام ہاتھ میں لے لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

میں نے سنجیدہ ہو کر کہا "دیکھئے، ذاتی طور پر تو میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ رسالے کی کتابت آپ اچھی اور بروقت کریں۔ آپ کے پرائیوٹ کام پر مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ قوانین ملازمت کی رو سے آپ پرائیوٹ کام نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دفتر کے وقت کچھ اور کتابت کرنے لگے یا دفتر والوں کو پتہ چلا کہ آپ فلاں یا فلاں کا کام کرتے ہیں اور کسی نے آپ کی شکایت کر دی تو مجھے آپ کے خلاف اقدام کرنا ہی پڑے گا۔"

افتخار صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموشی اختیار کر لی اور چلے گئے۔ مجھے ان کا برتاؤ کچھ عجیب تو لگا لیکن اسی وقت ڈائرکٹر صاحب کا فون آیا اور میں افتخار صاحب اور ان کی عجیب سی درخواست کو بھول گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر منیر انصاری اپنے مختصر جثہ اور منحنی سی آواز کے ساتھ داخل ہوئے۔ آتے ہی بولے "بھائی، تم تو بلرام پور کے رہنے والے ہو تمہیں معلوم ہے کہ وہاں کوئی سیّد خاندان علم و ادب کا دلدادہ ہے؟"

"اٹھارویں صدی کے اوائل میں کسی سید خاندان کے ایسے شاعر کا ذکر ملتا ہے جو اردو اور فارسی کا اچھا سخن گو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنا خوددار تھا کہ نواب آصف الدولہ کے بلانے پر بھی نہیں گیا۔"

"کسی ایسے خاندان کا تو مجھے علم نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن چچا جان، آپ فرما کیا رہے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں نواب آصف الدولہ کہاں تھے؟"

اب منیر صاحب مسکرائے۔ کہنے لگے "یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی خیال نہیں آیا تھا حالانکہ کچھ محسوس ہو رہا تھا کہ بات مشکوک ہے۔ پروفیسر نیازی کو بھی شک تھا اس لئے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔"

مجھے جھنجھلاہٹ ہوئی۔ یہ محقق لوگ اپنے کام میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ معمولی عقل کو بھی کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ انہیں کو دیکھئے۔ "محسوس ہو رہا تھا کہ بات مشکوک ہے" اور یہ بھول گئے کہ آصف الدولہ اٹھارویں صدی کے

اواخر میں تھے۔ پھر کون سی بات مشکوک ہے؟ نیازی کون ہیں؟ آخر کسی ڈھنگ سے بات شروع کی جاتی ہے۔

لیکن بزرگ کی بزرگی کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے سہولت سے کہا۔ "چچا جان، میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا بات مشکوک ہے؟ یہ پروفیسر نیازی کون ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کلکتے والے عاشق تحقیق تو نہیں جو لاکھوں کی جایداد کے مالک ہیں اور ہر سال دس پندرہ ہزار روپیہ مخطوطوں کی فراہمی اور اشاعت پر پھونک ڈالتے ہیں؟"

"وہی ہیں۔ مجھ سے بیس برس کی ملاقات ہے۔ تقریباً دو برس ہوئے انہیں ڈیڑھ سو صفحات کا ایک قلمی دیوان ملا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اسے چھ ہزار روپیوں میں خرید کر رکھ لیا مخطوطہ فراہم کرنے والے نے انہیں ذاتی معلومات کی بنا پر شاعر کا کچھ حال لکھ بھیجا تھا۔ دو مہینے پہلے نیازی نے یہ مخطوطہ اُٹھایا تو اس کی املا، محاوروں، نفس مضمون وغیرہ کی طرف سے کچھ شک ہوا اور انہوں نے میرے پاس کچھ صفحات ۔ ۔ ۔ ۔"

میرے دماغ میں ایک کوندا سا لپک گیا۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ ساتھ لائے ہوں تو مجھے بھی دکھا دیں وہ صفحات۔"

نیر صاحب کے دیئے ہوئے تین چار صفحات میں نے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ واقعی اٹھارویں صدی کا ہاتھ کا بنا کاغذ معلوم ہوتا تھا جو اُس وقت سفید رہا ہوگا لیکن ڈھائی صدیوں نے اسے بادامی رنگ دے دیا تھا۔ گوشوں اور کناروں پر کئی طرح کے کٹاؤ سے تھے جو اس کی قدامت کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ دو تین اُبھرے ہوئے انگریزی حروف پر پڑ گئی۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا۔ نیر صاحب کچھ کہیں اس سے پہلے میں نے ان سے کہا "آپ کچھ دیر کے لئے بغل والے کیبن میں خاموشی سے بیٹھ جائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کے سامنے تحقیق کے کچھ نئے زاویئے آئیں گے۔"

نیر صاحب کو میرا برتاؤ عجیب سا تو لگا لیکن انہوں نے خاموشی سے میری بات مان لی۔

میں نے افتخار احمد کو بلایا۔ مجھے بہت ہوشیاری سے بات کرنی تھی کیونکہ اس خرانٹ کو حالات کا ذرا سا بھی گمان ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس سے حقیقت نہیں اُگلوا سکتی تھی۔ افتخار صاحب آئے تو میں نے انہیں بہ اصرار اپنے بغل میں کرسی ڈال کر بٹھایا اور کیبن کا دروازہ بند کروا دیا۔ ان سے کہا "آپ نے پرائیویٹ کام کے بارے میں پوچھا تھا۔ عجیب صورت حال ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈائرکٹر صاحب کا فون آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے ان تک بات پہنچا دی ہے کہ آپ کچھ پرائیوٹ کام ۔ ۔ ۔ ۔"

کاتب صاحب تپاک سے بولے "نہیں حضور، جو رپورٹ پہنچی ہے غلط پہنچی ہے۔ میں نے ابھی تک کوئی کام نہیں لیا۔ ہاں، آیندہ کے لئے کہہ رہا تھا۔"

میں نے دوسرا سگریٹ سلگا کر کہا "دیکھئے منشی جی، میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں۔ مجھے بھی دنیا کا کچھ تجربہ ہے۔ آپ پرائیوٹ کام کریں گے ضرور، چاہے میں اجازت دوں یا نہ دوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے اپنا ہمراز بنالیں تو میں آڑے وقت پر شاید آپ کی مدد کر سکوں۔"

افتخار صاحب خاموش ہو گئے۔ یعنی زمین نم تھی اور اس پر ہل چلایا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا "اگر آپ کچھ میرا بھی

کام کر سکیں تو.... "

کاتب صاحب نے تپاک سے خاموشی توڑی "حضور، آپ کا غلام ہوں۔ آپ کے حکم کی دیر ہے۔"

"کام ذرا خطرناک ہے۔"

"آپ ارشاد تو فرمائیں۔"

"مجھے بھی روپیے کی کچھ ضرورت ہے۔ سنا ہے پرانے مخطوطوں کے اچھے دام مل جاتے ہیں۔ لیکن مخطوطے ملیں کہاں؟ سنا ہے کچھ لوگ پرانے مخطوطے نئے سرے سے بھی بنا لیتے ہیں۔ آپ تو تجربہ کار آدمی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ ممکن ہے؟"

افتخار صاحب ہنس کر بولے "حضور، ناممکن کیا ہے دنیا میں؟ میں نے بھی ایک صاحب کے لئے ایسا کام کیا ہے۔"

مچھلی نے کانٹا نگل لیا تھا۔ اب اسے آہستہ آہستہ کھینچنا باقی تھا۔ میں نے کہا "آپ باتیں بنا رہے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ دعویٰ کر رہے ہیں۔"

افتخار صاحب پھر تاؤ میں آگئے۔ طیش کھا کر بولے "حضور کو یقین نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ اپنے دوست ادیب جائسوی سے پوچھ لیجئے گا۔ ان کا کام...."

میں نے تعجب سے کہا "اچھا، ان کا کام بھی آپ نے کیا ہے؟ ذرا مفصل طور سے بتائیے۔"

افتخار صاحب نے بتایا "ادیب صاحب کے کوئی رشتے کے چچا مرے تو یہ اُن کا اثاثہ اٹھا لائے۔ چچا میاں دیہات میں رہتے تھے لیکن پرانے ڈھنگ کا شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک دیوان اور کچھ داستانیں چھوڑیں۔ ادیب صاحب نے دیوان کا میرے ہاتھ سے پرانا مخطوطہ بنوا کر کلکتے کے کسی محقق کے ہاتھ چھ ہزار میں بیچا۔ دو ہزار مجھے عنایت کئے، تین ہزار میں اپنے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'شوخیاں' چھپوایا اور ایک ہزار اپنے ذاتی خرچ میں لائے۔ اب چچا میاں کی لکھی داستانوں کا مخطوطہ بھی مجھ سے بنوا رہے ہیں۔"

میں ہنس کر بولا "منشی جی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنے کمال کے آدمی ہیں۔ لیکن آپ پرانا مخطوطہ بناتے کس طرح ہیں؟"

"اس میں کیا دقت ہے حضور؟ کھدر بھنڈار میں ہاتھ کا بنا کاغذ ملتا ہی ہے۔ باورچی خانے میں کچھ ہفتے دھواں دینے پر اس کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔ پرانے ڈھنگ کی کتابت کرنا اور گوشوں اور کناروں کی کانٹ چھانٹ کرنا کیا مشکل ...."

نیر صاحب اب خاموشی سے نہ سن سکے۔ بغل کے کیبن سے میرے کیبن میں آگئے۔ بولے "منشی جی، میں نے سب سن لیا ہے۔ اب جیل جانے کی تیاری کیجئے۔"

منشی جی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھے۔ گھبراہٹ میں ان کا جبڑا کانپنے لگا۔ میری طرف دیکھ کر صرف "حضور، حضور" کہہ سکے۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ "منشی جی، مجھے آپ سے اتنے دنوں کے تعلقات کا خیال ہے ورنہ آپ کو جیل ضرور بھجواتا۔ میں آپ کو بالکل چھوڑ دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ آئندہ ایسی جعل سازی نہ کریں، ادیب سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور داستانوں کی جتنی کتابت ہو چکی ہے وہ میرے سپرد کر دیں۔ اگر ان شرطوں کی خلاف ورزی ہوئی تو آپ جانتے ہیں کیا نتیجہ ہوگا۔"

"میں آپ کے حکم سے باہر کہاں ہوں حضور؟ کبھی

ادیب سے بات نہیں کروں گا، کتابت شدہ صفحات اور تیار شدہ کاغذ ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے یہ چیزیں لاکر مجھے تھما دیں اور باقی دن کی چھٹی کی استدعا کی جو میں نے منظور کرلی۔ افتخار صاحب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

میر انصاری کو اب بھی غصہ آرہا تھا۔ ان کے دوست ہی کو نہیں، ادب اور تحقیق کو بھی دھوکا دیا گیا تھا۔ لیکن میں نے انہیں سمجھایا۔ "ادیب پر مقدمہ چلانے میں آپ ہی لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ اس کے پاس ہے ہی کیا جو جرمانہ بھرے۔ آپ پروفیسر نیازی کو لکھ دیں کہ وہ مخطوطے کو آگ لگائیں چھ ہزار روپے کے بارے میں سمجھ لیں کہ چوری ہو گئے اور آئندہ کسی مخطوطے کی چھان بین کئے بغیر اس کی قیمت کی ادائیگی نہ کریں۔"

بدقسمتی سے اسی وقت ادیب جالنوری کی تشریف آوری ہوئی۔ میر صاحب بہت ٹھنڈے دماغ کے آدمی ہیں لیکن اس روز آپے سے باہر ہو گئے۔ دانت پیس کر بولے۔ "کمینے، مردود۔ خدا تجھے غارت کرے۔" یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔

ادیب صاحب حیرانی سے بولے: "یہ انہیں آج کیا ہو گیا؟"

ان کی بات کے جواب میں میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنی دوسری کتاب کے لئے کس کی کھوپڑی پر استرا پھیروگے؟ نیازی صاحب کو تو میر صاحب نے تمہاری ساری کرامات لکھ بھیجی ہے۔ بھلے آدمی، جعل سازی کیا کرو تو کسی پڑھے لکھے آدمی کو بھی شامل کر لیا کرو۔ ایسی جعل سازی سے کیا فائدہ جو اپنی پول خود کھول دے؟"

ادیب صاحب بگڑ کر بولے۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

میں نے افتخار احمد کے دیئے ہوئے کٹے پھٹے کاغذات انہیں دکھا کر کہا۔ "آپ کی سمجھ میں یہ آرہا ہے؟ میں نے افتخار سے کہہ دیا ہے کہ اس نے آپ سے بات کی تو اسے ملازمت سے نکلوا دوں گا۔"

ادیب صاحب کچھ دیر تک سر پکڑے بیٹھے رہے۔ پھر بولے "نظامی صاحب، آپ نے غریب کے پیٹ پر لات مار کر اچھا نہیں کیا۔"

میں نے آنکھیں تریر کر کہا: "جیل جانا چاہتے ہو؟ کچھ دنوں تک تو روٹیاں ملیں گی ہی۔"

ادیب صاحب جیل جانے کی بجائے خاموشی سے باہر نکل گئے۔

پولیٹیکل ہزل

رفیع احمد (مالیگاؤں)

○

جینے کا حوصلہ دیجیئے — کچھ تو "قیمت" گھٹا دیجیئے
الکشن ہو سر پر کھڑا — مشعلوں کو ہوا دیجیئے
ہے فسادی لہو قوم کا — کچھ تو اس کی دوا دیجیئے
تھی خطا پھر چنا "آپ" کو — اس خطا کی سزا دیجیئے
"تخت" کا خواب جو دیکھ لے — اس کی کرسی گرا دیجیئے
"اے رفیع آپ لیڈر نہیں"
مجھ کو ایسی دعا دیجیئے

○

اے قلی کی یادگار —— اقبال ہاشمی

کیوں نظر لگتی ہے تجھ کو بار بار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

کب ترے چہرے پہ رونق آئے گی
کب تری آنکھوں سے وحشت جائے گی
کب ترے حالات ہوں گے سازگار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

کرفیو کی رسم جانے کب اُٹھے
قید میں کس کس کا جانے دم گھٹے
کب ملے گا پھر تجھے تیرا وقار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

کرفیو بھی بن گیا ہے اک مذاق
آدھا حصہ جوش ہے آدھا فراق
رودِ موسیٰ کیوں بنی تقسیم کار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

تُو، تو گندہ بستیوں کا جال ہے
تیرا جڑواں بھائی کیوں خوشحال ہے
کون اس قسم کا ہے ذمہ دار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

کیوں ترے محلات میں بازار ہیں
اور تالابوں میں کیوں گھر بار ہیں
کون تنگ ہوتا ہے جھیلوں کے حصار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

جس قدر لوگاں سوں تو معمور ہے
اس قدر چہرہ ترا رنجور ہے
کون سا آسیب ہے تجھ پر سوار
کچھ بتا دے اے قلی کی یادگار

○

غالب حسنین
(پٹنہ)

شاعر سے ملاقات

میں بوقت شام بغرض چائے نوشی ہوٹل شیراز میں جیسے ہی داخل ہوا، دور گوشہ سے کسی نے آواز دی (آواز بڑی لچکدار تھی مگر مردانہ) "بھائی حسنین صاحب، ادھر تشریف لائیے۔"

میں آواز کا تعاقب کرتا ہوا گوشہ میں پہونچا تو وہاں نشستوں کے درمیان ایک شخص دکھائی دیا جو کھدر کا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ میں غرق اور کسے ہوئے بغیر ہتھے والی کرسی سے چمٹے ہوئے تھے۔ مونچھ اور داڑھی کے بال بھی تقریباً ایک انچ آگے آئے تھے۔ یہ حضرت لباس سے لکھنوئی اور چہرے پر پیدا شدہ آثار سے اچھے خاصے احمق نظر آرہے تھے۔ چہرے کے واضح اثرات زبان خموش سے جیسے یہ کہہ رہے تھے۔ "حماقت کسی کی جاگیر نہیں ہوا کرتی ہے"۔ سامنے میز پر ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی جس میں سے چند کاغذات اپنے اجسام کا کچھ حصہ باہر نکالنے کی گستاخی کر چکے تھے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ ہی نے خاکسار کو آواز دی ہے، فرمائیے کیا حکم ہے"؟

وہ جھٹ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے "جی ہاں قبلہ، میں نے ہی آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی جرأت کی ہے ... معاف فرمائیے" اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ایک خالی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں"۔

میں شہادت کی انگلی پیشانی پر رگڑتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انہیں کہاں دیکھا ہے؟ پوچھا۔ "معاف فرمائیے گا حضور میں نے آپ کو پہچانا نہیں، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو تعارف کرا دیں"۔

وہ ہلکے سے چونک گئے "کمال کر دیا جناب نے، مجھے پہچانا نہیں، مقام حیرت ہے۔ جہاں تک تعریف کا سوال ہے تو تعریف اس کی کی جائے جو ہمہ صفات ہو۔ بھلا مجھ ادنیٰ کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ پھر بھی یہ ناچیز عبقری حقانی دل آبادی کہلانے کا مستحق ہے۔ اور شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، یعنی شاعری میرے لئے وسیلۂ اظہار خیالات

ہے، اس سے ادب کی خدمت بھی ہو جاتی ہے۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور ہنسی کو چھپانے میں کھانسی آگئی "برا تصور نہ کریں معظم، مجھے کھانسنے کا عارضہ ہے یہ سالی کھانسی بھی عجیب ہے۔ دوران گفتگو بھی چلی آتی ہے۔ ذرا بھی موقعہ کا خیال نہیں کرتی۔ ابھی میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ کلام حلق میں اٹک گیا اور کھانسی کسی مجرا والی کی طرح کمر لچکاتی، جسم کو بل دیتی اور کورنش بجاتی اور تسلیم عرض کرتی سامنے چلی آئی ۔ یا یہ کھانسی اپالو گیارہ کی طرح فضائے بسیط کو چیرتی ہوئی چاند تک جا پہنچی، سچ مانیئے آپ، میں نے بہت سی ترکیبیں استعمال کیں، انواع و اقسام کی گولیاں کھائیں اور رنگ برنگی سیال پیئے کہ اس سے نجات مل جائے مگر ایسا لگتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہے ۔ لگتا ہے تعلق عاشق و معشوق سا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔۔۔۔" اُنھوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "جناب من مجھے بھی تو پیچش کا عارضہ ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پیچش کتنی خراب بیماری ہے، کسی کا لحاظ و خیال نہیں کرتی۔ شاعر اسٹیج پر ہو، مغنیہ دَھنا دھن تا پر، گویا اوپری جان جان پر، ع کرسی انصاف پر، فلم ایکٹر شوٹنگ پر۔ اور اس کا ذرا سے موڈ بگڑا تو سب کا ستیا ناس کر دیتی ہے۔" یہ جملے اُنھوں نے اس طرح ادا کئے جیسے کوئی یتیم اپنے دورِ یسیری کا سب سے المناک واقعہ سنا رہا ہے یا کوئی بھیک منگا دانت نکالے اور منہ پسارے دو پیسے کا سوال کر رہا ہے۔

میں ان کے اس طرزِ کلام سے حظ اٹھائے بغیر نہ رہ سکا، مگر اس دفعہ ضبط و تحمل سے کام لیا ورنہ وہ یقینی طور پر برا مان جاتے۔ میں نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا "محترم، آپ سے پہلے کبھی شرفِ نیاز حاصل کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ میری بدقسمتی ہو، میری ملاقات کسی بھی حضرتِ شاعر سے نہیں ہے، میں خود ہی ان حضرات سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس چھوٹی سی عمر میں میں نے جن جن شاعروں کی خدمت میں حاضری دی ہے یا ان سے شرفِ ملاقات حاصل کیا ہے وہ سب کے سب مخبوط الحواس، معاف فرمایئے غلطی ہوگئی، مخیر العقل ثابت ہوئے اور مجھے مخیر العقل ہستیوں سے چڑھ ہے (کیوں کہ میں خود مخیر العقل نہیں ہوں، بندہ ہوں سیدھا سادا) اس لئے ملاقات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگر میں یہ کہوں تو زیادہ درست ہوگا کہ میں نے ان سے اس درجہ کنارہ کشی اختیار کر لی ہے کہ لگتا ہے کہ اب شناسائی ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اس عمل میں باغیانہ ذہن کو دخل ہو۔"

انھوں نے مجھے یوں دیکھنا شروع کیا جیسے کچا ہی سالم نگل جائیں گے۔ پھر استعجاب سے دیکھتے ہوئے فرمایا "آپ نے شائد مجھے پہچانا نہیں ورنہ اس طرح کلام نہ فرماتے۔ میں دیگر شاعروں سے ذرا مختلف ہوں۔ دل آباد میرا غریب خانہ ہے اور گھائل تخلص کرتا ہوں۔ اصل نام تو محمد شریف ۔ اور عرف کلو ہے۔"

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اچھا ہاں، یاد آیا، آپ وہی محمد شریف عرف کلو تو نہیں جو اکیلا رام ہلدی والے کے منشی تھے اور امجد کا حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ رومان لڑانے کے بعد اس کے ساتھ کافی دولت لے کر بھاگ گئے ۔۔۔۔ اور اپنا بلیک کا کاروبار چھوڑ دیا۔ قابلِ تعریف شخصیت ہے آپ کی بھی، بے چارا اکیلا رام آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ بہت شریف آدمی [illegible]

وہ کچھ جھینپ گئے۔ پھر سنبھلتے ہوئے مریل سی آواز میں بولے "ہاں برادر میں وہی ہوں۔" میں نے اُٹھ کر دوبارہ مصافحہ کیا۔ "آپ سے مل کر خوشی دوگنی ہوگئی، مدّت سے آپ کے دیدار کو ترس گیا ہوں۔ میں کئی دفعہ جلدی منڈی گیا مگر ہر بار مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔"

میں چند لمحوں کے لئے فل اسٹاپ پہ آگیا۔ ان کے سراپا پہ ایک بھرپور نظر ڈالی۔ "آپ نے اب یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، سوکھ کر بالکل کانٹا ہوگئے ہیں جیسے کئی دنوں سے دانہ نصیب نہیں ہوا ہے، لباس بھی بالکل بدل گیا ہے۔ آپ شرٹ پینٹ میں کتنے بھلے لگتے تھے، یہ پوشاک آپ کو زیب نہیں دیتی۔ کہیں دشمنوں کو کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی۔"

یہ سنتے ہی وہ سٹپٹائے اور اپنے لباس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ میز پر رکھی ہوئی ڈائری کی طرف دیکھتے ہوئے یعنی فخریہ سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ "آب میں باقاعدہ اور باضابطہ شاعری کرنے لگا ہوں، اپنے ذہنی استدلال اور تخلیقی کاوشوں کی بنیاد پر اہلِ علم و دانش اور سخنورانِ ادب سے شاعری کی سندِ گراں لے چکا ہوں۔" چند لمحے رک کر "اس اکیلا رام کی لڑکی نے اپنے حسن کی گرمی سے اتنا گرمایا اور بیوفائی کے نوکیلے نشتروں کی تعدادِ وافر کو میرے سینے اور دلِ ناتواں میں چبھویا کہ شاعری کا سہارا لینا پڑا۔۔۔"

میں نے ان میں دلچسپی لینا شروع کی، پوچھا "اس بتِ طناز کا کیا بنا؟ خیریت سے تو ہے؟" اُنہوں نے کہا "آپ سے کیا جھوٹ بولنا، برا ہو اس کے توبہ شکن حسن کا کہ محلہ کا ایک بانکا سجیلا نوجوان اس ایک بچہ والی حسینہ پر انتقال فرمانے لگا۔ عجیب بے وقوف عاشق نوجوان تھا کہ اس کا حسن بے مثل و بے نظیر دیکھ کر رسجھ گیا اور اس امر کا خیال رکھا نہ لحاظ کیا کہ یہ ایک بچّہ کی ماں ہے۔ میری بیوی بھی اس کی خوبصورتی اور جوانی پر ترس کھا کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ رومانی عورتیں زیادہ تر خوبصورت اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والے نوجوان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جانے پر فخر ہی سمجھتی ہیں۔" ایک لمبی سانس لے کر اُنہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھا "وہ ایک سال بعد میرے پاس لوٹ آئی۔"

میں نے ان کے چہرہ پر نظریں ڈالیں کہ کس قسم کے اثر نے جنم لیا ہے مگر اُگے ہوئے بے ترتیب بال کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

انھوں نے پل بھر کے لئے گویا زبان سے دور کی مشین بند کر دی گئے، کہا "اب آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھ کر کس درجہ شرافت اور صبر و تحمل کا ثبوت دیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو گردن پکڑ کر۔۔۔۔ گیٹ آؤٹ کر دیتا۔ پھر بھی نہایت بے رُخی سے پیش آتی ہے۔ طنز کرتی ہے، کہتی ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کر کے اپنے آپ کو برباد کر لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم شاعر بن جاؤگے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ہم دونوں کا معاملہ شعر و شاعری کی بنیاد پر ہی پروان چڑھا تھا۔ کہاں تک سناؤں آپ کو۔ القصّہ مختصر وہ طعنے تشنیع کے دفاتر کھول دیتی ہے۔ اب یہ چوٹ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہے اس لئے زخم پر مرہم اور پھاہا رکھنا ضروری سمجھا اور کھل کر شاعری شروع کر دی۔ اللہ سے تھوڑا غم ہلکا ہوا۔ آپ تو غالباً جانتے ہیں کہ شاعری کرنے یا شعر پڑھنے سے غم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور تسلّی ملتی ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم اور

آپ بزرگوں کی دُعا سے قدر دانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر یہ صحیح ہے کہ میرے کلام میں کافی درد ہوتا ہے اور میں کمی . . . . "

میں نے کہا، گھائل صاحب، آپ کی اس ترقی اور عروج سے قطع نظر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رومان اور تعلقات کے استوار ہونے کے نتائج اکثر و بیشتر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک دفعہ رومان کے دامنِ حسین و لطیف پر لٹو ہونے ہی والا تھا کہ والد صاحب قبلہ کی بروقت مداخلت سے بچ گیا ورنہ آپ کی طرح میرا بھی حشر عبرتناک ہوتا۔

مگر آپ نے شاعری شروع کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعرا تمام عمر آہیں اور ترقی کی منزلیں طے نہیں کرتے اور وہ مرنے کے بعد جیتے ہیں بلکہ لاکھوں شاعروں میں ایک قابلِ صد رشک مقام بنانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ آپ نے وہ شعر سنا نہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ نے میرے خیال سے غلط مشغلہ منتخب کیا جو اس چکر میں پڑ گئے۔ شاعری خداداد صلاحیت اور انتھک لگن کا نتیجہ ہوتی ہے اسد اللہ خاں غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

شاعری وہ کھیل نہیں جسے ہر بچہ کھیلے
غالب نے ہیں سو برس پاپڑ بیلے

کیا اچھا ہوتا جو ہلدی کا کاروبار چلاتے رہتے۔ آپ نے اپنے آپ کو اس زنجیر میں جکڑ کر بہت بُرا کیا۔ میرے خیال سے ہلدی والا کاروبار بھی ختم ہو گیا ہوگا۔"

وہ میری باتیں سن کر پیچ و تاب کھانے لگے۔ خدا کا شکر تھا کہ اُنہوں نے یہ نہیں کہا۔ "میں اپنی شان میں یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔" جیسا کہ عام طور پر شعرائے کرام کہہ کر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ناچار میرے سوال کا جواب دیا۔ "نہیں قبلہ، اب میری بیوی چلاتی ہے اور امید اغلب ہے کہ وہ بھی اس کاروبار کو بند کر دے گی کیوں کہ مجھ سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ اس دھندے سے بھی اکتا گئی ہے اور نئی وضع کا ایک ریستوراں کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میں بھی عنقریب ایک رسالہ نکالنے والا ہوں، اس رسالے میں . . . "

میں نے دیکھا گفتگو کافی طوالت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس موقع پر میرے ایک دوست پردیپار (جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے شاعر ہے) کی بات یاد آ گئی کہ آج کل کے شاعروں سے (شاعروں سے معذرت کے ساتھ) مثل جول ہرگز نہ بڑھاؤ ورنہ سیریڈون اور اسپرو بھی تمہارا دردِ سر ٹھیک نہ کر سکے گا۔ مجھے اس امر کا مشاہدہ بھی تھا اور پردیپار کی بات بھی تیر بہدف کی طرح کام کر گئی۔ میں نے گھائل دل آبادی صاحب سے کہا۔ "جناب آپ مجھ پر ایک احسان کر دیں بہت ممنون ہوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے، اجازت چاہتا ہوں حالانکہ آپ کی صحبت سے لگ [illegible]

انہوں نے شرمندگی کے انداز میں کہا۔ "ارے ہاں، برادر! میں نے آپ کو گفتگو میں الجھائے رکھا اور آپ کی خدمت کرنا بھول گیا۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ گھائل کیسا بد ذوق اور نامعقول آدمی ہے۔" بیرے کو آواز دی اور آرڈر دیا۔ "دو پیالی اسپیشل چائے۔" میں نے رسماً کہا۔ "تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ جھٹ بول پڑے۔ "اس میں تکلف کی کیا بات ہے، ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں تو چائے پیتے ہیں۔"

میں نے ان کے خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ "نہیں بھائی، یہ بات نہیں ہے۔ میں ایک آدمی کو تلاش کرنے آیا تھا۔"

انہوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تب تو میں نے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے، معذرت خواہ ہوں اور اپنی اس غلطی پر نادم و پشیماں ہوں۔" اور بتیسی نکال دی گویا ان کے معذرت خواہ ہونے سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔

میں نے بھی لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔ . . . "اور دوسری بات یہ ہے کہ گھائل صاحب کہ میں بغیر کچھ کھائے منہ لئے چائے نہیں پیتا۔ میں اس معاملہ میں انگریزوں کا پیروکار ہوں۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ . . . ."

"نہیں صاحب، میں ایسا کیوں گمان کرنے لگا۔ ایسا سوچیں آپ کے دشمن۔" دو پلیٹ بالائی بھی۔" بیرے کو ہانک لگائی۔

آرڈر دے چکنے کے بعد گھائل صاحب ڈائری کھولنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اب مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ طبیعت لائی دیکر آرہی ہے اور بالائی کی آمد کی خوشی میں خوشگوار موڈ بگڑنے والا ہے۔ چونکہ بالائی ابھی نہیں آئی تھی اس لئے خموشی کو ترجیح دی۔

انھوں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے کو اپنی نظروں کے سامنے کیا اور مجھے زور دار انداز میں مخاطب کیا۔ "حسنین بھائی، ترقی پسند نظم "میں سورج نگل گیا" جو پچھلے اتوار کو میں نے ریڈیو سے پڑھی تھی وہ آپ نے ضرور سنی ہوگی کیوں کہ آپ کو بھی ادب سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔"

مجھے ہنسی آنے لگی آپ نے "میں سورج نگل گیا" یا سمندر نگل گیا" سے شائقین کو محظوظ (بور) کیا اس سے میرا کیا لینا دینا۔ ذہن میں ایک آواز گونجی "میاں حسنین، اب پڑ گئے نہ چکر میں۔ فوراً سر پہ پاؤں رکھو اور رفو چکر ہو جاؤ، چھوڑو بالائی اور چائے لائچ ورنہ بور ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "ہاں ہاں، میں نے سنی تھی بہت اچھی اور پیاری نظم تھی۔ کیا کہنے ہیں آپ کے۔ وہ حضرت سمجھ گئے کہ میں کذب بیانی سے کام لے رہا ہوں کہہ پڑے۔ "اگر وہ نظم آپ نے نہیں سنی (سنبھلتے ہوئے) میرا مطلب ہے بہت اچھی لگی تو دوبارہ سماعت فرمائیں۔ میں نے یہ نظم بہت محنت سے لکھی ہے جو بحر متقارب میں ہے۔"

میں تقریباً جل گیا۔ "یہ بحر متقارب میں ہو یا بحر ظلمات میں۔" میں نے کہا۔ "خدا کے لئے میرا موڈ نہ بگاڑو۔" انہوں نے سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا مطلع یوں ہے، عرض کیا ہے . . . ."

ابھی وہ میاں میرا مطلب اشعار دے گئے۔ میں نے ٹوکا۔ "کرم فرما گستاخی معاف، سامنے لعنت پڑی ہوئی ہے پہلے لعنت ہضم کر لیا جائے تو بہتر ہے گا۔ اگر اسے ہم نے یونہی دو منٹ تک چھوڑ دیا تو ہوٹل کی آوارہ مکھیاں کہ [illegible] دعوت کا انتظار کر رہی ہیں گی۔ اور آپ تشریف بھی باشعور ہیں [illegible] جانتے ہیں کہ اس طرح نعمت خداوندی کی

توہین ہوگی؟"

وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جل بھن کر کباب ہو گئے ــــ اور مجبوراً بالائی کھائی اور چائے بھی پی۔ میں نے مفت کی چیز سمجھ کر مزے لوٹے۔ ویسے بھی مفت کی شراب تک قاضی کو حلال ہوتی ہے۔ چائے ختم ہوتے ہی انہوں نے نظم سنانی شروع کی۔ بیچ بیچ میں میرا منہ بھی دیکھتے اور میں واہ واہ، بہت خوب، سبحان اللہ، کیا شعر آپ نے کہا ہے، کیا جدت ہے، کیا فکر کی گہرائی ہے، وغیرہ وغیرہ کہہ دیتا۔ وہ خوش ہو جاتے، مثل مشہور ہے ؎

سو بو تل کا نشہ ہے اک واہ واہ میں

میں دل میں کہتا۔ "کیا بنڈل شاعر ہے، کیا بکواس تک بندی ہے، کہیں قافیے کا منہ لٹکا ہوا ہے اور کہیں پیٹ پھولا ہوا ہے۔ اس درمیان انہوں نے بہت سارے سگریٹ پیش کئے اور میں مالِ مفت دلِ بے رحم کی مصداق بھک بھک دھواں چھوڑتا رہا اور چند سگریٹ میری انگلیوں کی غلطی سے اور عیار ذہنیت کی شہ پر میری جیب میں بھی چلے گئے۔

ایک مرتبہ تو انہوں نے جیب سے سگریٹ کی پوری پیکٹ ہی نکال کر دے دی۔ اس کے ساتھ دس روپے کا ایک نوٹ بھی چپکا ہوا تھا جسے میں نے نہایت ہوشیاری سے سنبھال لیا۔ میں نے ان جملوں سے ذہن کو سیراب کر کے نوٹ کو پتلون کی اندرونی جیب میں رکھ لیا کہ رقم اسی کی جیب میں رہنی چاہیئے جو صحیح طور سے اس کی حفاظت کر سکے۔

اختتام نظم سے پہلے [illegible] پیٹ پکڑ کر بیٹھے رہے اور نظم سناتے رہے۔ جب برداشت نہ کر سکے تو کہا "اب ختم ہی سمجھئے" ــــ اور معذرت کرتے ہوئے پیٹ پکڑے ہوئے لپکے۔ میرے جی میں آیا کہ حضرت سے کہوں کہ لگے ہاتھوں ایک اور نظم سنا کر ہی جائیے۔

مجھے اس بار ہنسی نہ آئی بلکہ ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔ موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔ میں ابھی باہر کھڑا ہی تھا کہ گھائل دل آباد کی صاحب نے آواز سے کرچونکا دیا۔

"حضرت آپ یہاں کھڑے ہیں اور میں اندر تلاش کر رہا ہوں"

میں نے بہ عجلت کہا۔ "کیا آپ اتنی جلدی ......!

انہوں نے کہا۔ "آپ کو کوئی اعتراض"؟

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "نہیں" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ راستہ سے بھی لوٹ سکتے تھے"

"ہاں صاحب، یہ پیچش کا مریض بیت الخلاء گیا نہیں کر آیا۔ [illegible]

[illegible] کہا۔ "آپ نے بالکل درست فرمایا" [illegible]

اس صریح [illegible] گو یہ وہ جھینپے اور میں مسکرایا۔ پھر جیب شاید ہے لئے انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔ دیکھا دیکھی میں نے بھی۔

دفعتاً مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے حضرت شاعر سے کہا "ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اگر اجازت دیں تو کہوں

"اُنہوں نے کہا" بے دھڑک کہئے، مجھے اپنا بے تکلف دوست سمجھئے" میں نے کہا" میں بس اب چاہنے لگا ہوں کہ ریڈیو سے مجھے ایک چانس مل جائے۔ کم از کم نثری نظم تو لکھ ہی سکتا ہوں۔ آپ چونکہ ریڈیو سے متعارف ہو چکے ہیں اس لئے آپ کے توسط سے مجھے موقعہ مل جائے گا" انہوں نے میرے کندھے پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے، یہ پروگرام ایکزیکیوٹیو میری بیوی کے سگے خالو ہیں، جب کہئے چانس دلا دوں"

میں نے احسان مند ہوتے ہوئے کہا" میں آپ کا شکر گزار ہوں گا"

اُنہوں نے خاکساری سے کہا" نہیں نہیں، اس میں احسان مند ہونے کی کیا بات ہے" "اچھا اب اجازت دیجئے پھر اگر خدا کو منظور ہوا تو پھر کبھی ملاقات ہوگی"

—— اور میں سیدھا گھر جانے کے لئے مڑا۔ دس قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو گھائل دل آبادی صاحب دوبارہ ہوٹل شیراز میں داخل ہو رہے تھے۔

□□

حفیظ الکبیر پرواز (مناپوری)

مزاج پُرسی کے لئے
دواخانہ تشریف لائیے

دل کی اُلٹی سیدھی خواہشات سے بھی خدا بچائے۔ ہوا یوں کہ کل ہی میاں جمّن سے ملاقات ہوئی۔ مجھے اُن سے نہ ملتے ہوئے بھی ملنا پڑا۔ ہمارے دل میں یہ خواہش جاگ اُٹھی کہ آج کسی سے بحث ہی کی جائے۔ جب ہمیں کوئی کام نہ ہو تو ہماری خواہش ہوتی ہے کہ آج کسی سے تو تو میں میں ہو جائے۔

وہ کوئی منحوس گھڑی تھی کہ ہمیں میاں جمّن دکھائی دیئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم کترا کے نکل جاتے لیکن ہمارا موڈ تو بحث کا تھا۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ میاں جمّن سے ٹکر لینا بے کار ہے۔ کیوں کہ ہم ان سے جیتنے سے رہے۔ کہیں بیٹھنے کے بجائے ہم سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے لوگوں کو تکلیف دیتے ہوئے گفتگو کرنے لگے۔ گفتگو ابھی طویل نہ ہوئی اور نہ ہی اُن سے ہمیں مات کھانے کی نوبت آئی کہ محلے میں ایک طرف سے شور و غل سنائی پڑا۔ وہیں کھڑے کھڑے تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ کہیں جھگڑا طویل نہ ہو جائے اسلئے بات چیت کو ختم کرتے ہوئے میاں جمّن کو [illegible] چھوڑ کر ایک سماجی [illegible] بھی ہاتھ سے جاتا دیکھ کر جھگڑا چھڑانے چل پڑا۔ اسے ہماری کمزوری کہیئے یا ہمدردی کہ ہمیں دوسروں کے معاملات میں فضول ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ دو شریف آدمیوں میں اُدھار پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہو رہا ہے اور یہاں مجمع ایسا لگا ہوا ہے کہ جیسے دو پہلوان اکھاڑے میں اپنے داؤں پیچ دکھا رہے ہوں اور ان کے ارد گرد حلقہ ڈالے تماشہ بین۔ دیکھنے والے سب چھڑانے والا کوئی نہیں۔ تماشہ بین تو ہم بھی ہیں۔ لیکن یہ ہم سے برداشت نہ ہو سکا کہ دو شریف آدمیوں کے جھگڑے کو اتنے سارے لوگ دیکھیں۔ ہم نے سوچا کہ دونوں کے ہاتھ پیر ٹوٹنے سے پہلے ہی اُن میں صلح صفائی کرا دی جائے۔ ابھی جھگڑا ہاتھا پائی [illegible] تو کہیں آرام سے جا کر جھگڑتے ہم ضبط نہ کر سکے اور اُتر پڑے میدانِ جنگ میں۔ اب آپ یہ مت پوچھئے کہ جھگڑے کرنے کے ہتھیار، تلوار، لکڑی یا کوئی دوسری چیز ہاتھ میں لی ہو۔ پبلک نے ماحول ہی کچھ [illegible] جنگ ہی قبول کرتے [illegible] دو گروپ میں [illegible] ایک دوسرے کا [illegible] لگے۔ [illegible] دوسرے کا [illegible] ہمیں پر حملہ آور ہم بیچ بچاؤ کرتے ہوئے [illegible]

لگے لیکن وہ کہاں مانتا۔ ہمارا معاملہ تو وہاں ایسا ہوا کہ "نقار خانے میں طوطی کی آواز" یعنی اُن کا اُدھار لین دین کا معاملہ ایک فیصلہ اور وہ ہمارے پیچھے اس طرح پڑا جیسے ہم ہی نے اس سے اُٹھا لیا ہو۔ الغرض اُدھر مجمع ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ڈنڈے کیا پڑے کہ ہمیں دن ہی میں تارے دکھائی دینے لگے اور ہم رات کا تصور کئے ہوئے چپ رہے اور نہ جانے کب تک پڑے رہے۔

یکایک ہمیں عجیب سی خاموشی کا احساس ہوا۔ جبکہ پہلا ماحول شور و غل کا تھا اور اب ذرا ہماری حس بیدار ہوئی تو ہمیں ایک نئی قسم کی بو کا احساس ہوا جو کہ شفا خانوں کی ہی ہو سکتی ہے اسی بات کی صداقت کے لئے ایک اور ثبوت ہمیں یوں ملا کہ آس پاس ہی سے ہمیں آہیں اور کراہیں سنائی دیں ہم نے بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ آنکھیں کھول دیں اور سامنے ہی نرسیں تھرکتی ہوئی نظر آئیں۔ اب یہ بات پورے ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہاں ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ ڈنڈے کچھ زیادہ ہی زور سے پڑے۔ خدا جانے رات میں ہمیں کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا [illegible] اچھا ہوا کہ ہم ساری رات تارے گنتے رہے اور اِدھر ہماری مرہم پٹی ہوتی رہی اب ہمیں مرحوم اکبر الہ آبادی کی بڑی شدت سے یاد آرہی ہے بقول اُن کے ......

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ہم اس قدر حساس طبیعت کے مالک ہیں کہ اُلٹے سیدھے کاموں اور اچھوتے پن کی وجہ سے ہمیں گھر سے نکال دیا گیا اور پھر ہم نے کبھی گھر کا رُخ نہ کیا۔ یار دوستوں کے وہاں جو کچھ بھی ملا گزارہ کر لیا مانگنا ہماری غیرت کو گوارا نہ تھا۔ سونے کے لئے فٹ پاتھ کو آباد کیا لیکن اب اسپتال میں پڑے ہیں اسی لئے اکبر صاحب کی یاد آئی کہ یہ ہمارا اب آخری وقت نہ ہو بقول ان کے .....

"مرے اسپتال جا کر"

ہم نے جب اپنے پورے بدن کا جائزہ لیا تو وہ پٹیوں سے جکڑا ہوا نظر آیا۔ دواخانے کے ماحول اور موت کے احساس نے ہماری تکلیف دوگنی کر دی اور ہم کراہنے لگے۔ جس کی وجہ سے دوسرے اور مرے مریضوں کو تکلیف ہونے لگی اور وہ ہم سے کہنے لگے "میاں کیا چیخ و پکار کر رہے ہو خاموش رہو یہ دواخانہ ہے "کسی قصائی کی دکان نہیں، یہ سن کر ہم دل ہی دل میں کڑھنے لگے کہ جب یہ لوگ آئے ہوں گے تو کیا یہ دواخانہ ہوگا؟ نہیں یہ تو چیخ و پکار، آہوں اور کراہوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہوگا اور اب یہ حضرت ہمیں سکھا رہے ہیں۔ میں نے کہا حضرت یہ تو غنیمت ہے کہ میں زندہ نہیں رہا۔ بقول اکبر صاحب کے ... "مرے اسپتال جا کر" یہ ہمارا آخری اسٹیج ہے اور ہمیں تو رونا چاہئے میرے اتنا کہنے پر وہ سب اپنے سر پر ہاتھ لیکر ایک دوسرے کو دیکھ کر دائرے بنانے لگے۔ اب یہاں بھی بحث شروع ہوگئی اور مجھے زندگی کی ایک کرن دکھائی دی کہ چند لمحہ ایک تو یہاں لیا ہم مذاق [illegible] ایک مزاج پرسی کے بعد وہ کافی دیر تک میرے پاس ٹھہرے رہے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں [illegible]

بھی ہمیں دیکھنے کے لئے نہ آیا تو دوسرے کیا دیکھنے کے لئے آتے۔ میں خاموش ہوگیا۔ لیکن وہ کچھ سوچ میں دکھائی دیئے! میں نے کہا جمنؔ صاحب! تب اُنھوں نے میری بات کاٹ کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا چھکڑ صاحب! میں سوچ رہا ہوں کہ آدمی سے زیادہ بے بس جانور اس زمین پر شاید ہی کوئی دوسرا پایا جاتا ہو۔ بعض اوقات وہ اپنی گردن کٹ جانے پر بھی واویلا نہیں مچاسکتا؟ لیکن آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ محلے والوں سے اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ذرا چھکڑ صاحب کی مزاج پُرسی کے لئے دواخانہ تشریف لے جایئے اور جاتے جاتے اپنے ساتھ ایک پھلوں کی ٹوکری بھی ضرور لیتے جایئے کیوں کہ اُن کی صحت زیادہ خراب ہے۔ خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ آخر انسان کی صحت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ □□

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپے
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	" "	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷ "
بالآخر	مجتبیٰ حسین	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵ "
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵ "
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰ "
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبار خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
مابین ثامین نقش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "

ہنستے ہنستے ـــ برق آشیانوی ـ مضامین ۱۰ روپے ـــ مطلع عرض ہے ـ دلاور فگار ـــ مضامین ـ ۱۲ روپے
سکنڈ ہینڈ ـ رفیق شاکر مضامین ۱۰ روپے، قطع کلام ـ مجتبیٰ حسین مضامین ۱۲ روپے

شمیم یوسف (ڈھاکہ بنگلہ دیش)

عورت کا ادھیکار

عورت کے مساوی حقوق کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے اس سلسلے میں تمام روشن خیال عورتیں ہی کوشاں نہیں بلکہ مرد بھی دلچسپی لے رہے ہیں اور عورت کی حمایت میں جگہ جگہ جلسہ جلوس اور تقریریں کی جا رہی ہیں اور ساتھ ہی کاغذ و قلم کو بھی کام میں لایا جا رہا ہے اکثر و بیشتر اخبارات و رسائل میں عورت کے ادھیکار کے لئے مضامین لکھے جا رہے ہیں اور اس دوڑ میں سنجیدہ و غیر سنجیدہ دونوں طبقوں کے لوگ شامل ہیں بہت ممکن ہے کہ چند باشعور افراد یہ غور کر رہے ہوں کہ اس "ادھیکار" کے نتیجہ میں کیا انجام ہوگا . . . مگر وہ زبان مصلحتاً نہیں کھولتے، کیوں کہ خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو کتنی دشواریاں پیدا ہوں گی، صرف عورت ہی کے لئے نہیں بلکہ مرد کے لئے بھی . . . . .
عورت کی آزادی بلکہ آزاد روی کے بارے میں گفتگو کرنے والے یہ نکتہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کسان اپنی فصل کی قیمت خود مقرر نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کا خریدار یا بیوپاری پر انحصار ہوتا ہے ۔ اسی طرح ایک عورت اپنی خوبصورتی کا اندازہ صحیح طور پر نہیں لگا سکتی بلکہ اس کے لئے اس کو مرد کا سہارا لینا ہی پڑے گا ۔

مرد کے لئے کوئی مجبوری نہیں کہ عورت اس کی تعریف کرے اس کے حسن و جمال اور سراپا پر روشنی ڈالے مگر عورت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تعریف کی جائے ۔ اس کی خوبصورت آنکھوں، گھنیرے بالوں، گلاب جیسے چہرے اور متناسب جسم کی . . . . دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے اور یہیں سے وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پاتی ہے اور یہیں سے عورت اور مرد کے مساوی حقوق کا مطالبہ کمزور پڑ جاتا ہے وہ ہزار اپنے حسن و جمال کو سجا کر، نکھار کر آرائش و زیبائش سے مزین کر کے مرد کی برابری کرنا چاہے تو اسے ناکامی ہوگی کیوں کہ یہ خارجی سجاوٹ ہے جس کی چمک دمک مرد کی نظروں میں معدوم ہو جاتی ہے اس لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو عورت بھی نہیں چاہتی کہ وہ ایسا کرے اگر عورت کے رخسار پر مرد ایک طمانچہ رسید کر دے تو اس کے سمان ادھیکار کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ برگشتہ ہو جاتی ہے لیکن اس کے جوڑے میں گلاب کا پھول اٹکا دیا جائے تو [illegible] ہو جاتا ہے . . . وہ صرف . . . خود

ہوسکتی ہے بقول ساحر لدھیانوی

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خموش ہے اور سانس رکتی جاتی ہے

دراصل یہ سب ظاہری اور کھوکھلی چیزیں ہیں ان میں سچائی نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ ایسی حالت میں سماں اور صیاد کو تقویت ملتی ہے مگر اس روش پر ایک لمبے عرصے سے مرد وزن گامزن ہیں اور گامزن رہیں گے وہ یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں مجبور و بے بس ہیں بقول عواص قریشی۔

شمع جلتی ہے اور جان کر جلتے ہیں پروانے
زمانہ ہوگیا دونوں کی نادانی نہیں جاتی

عورت اپنی تمام تر آرزوؤں کے باوجود اپنی نسائیت سے مجبور ہے اور یہ نسائیت اس کی آزادی کی راہ میں دیوار کی حیثیت رکھتی ہے جس کو وہ توڑنا بھی چاہے تو نہیں توڑ سکتی۔

میں نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ عورت اپنے آپ کو چاہے جس قدر بھی سجائے بنائے اور تعلیمی اعتبار سے بھی بلند سے بلند ہو مگر مرد کے مقابلہ میں اُس کی فطری بیچارگی اور نسوانی غیرت کسی کی چشمِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں ـــ اس لئے کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر یہ گمان گزرتا ہے کہ اگر عورت "سماں اور صیاد" میں کامیاب ہوگئی تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا !؟

شکیل اعجاز (اکولہ)

رسمِ اجراء بسلسلۂ مشاعرہ

مہاراشٹر کی سرزمین پر دو درجہ سے اُبھرتے ہوئے نوجوان نقاد اور شاعر جناب صفدر کی کتاب "شاعری اور شیوۂ پیغمبری" کی رسم اجراء کے لئے دعوت نامے ملے تو اکولہ سے پانچ آدمیوں کا قافلہ رات کے نو بجے بروڑ پہنچا۔ نئے اور پرانے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک نوجوان نے جو کالا کوٹ، کالی پینٹ اور کالی داڑھی لگائے ہوئے تھے پوچھا "آپ شکیل اعجاز؟ میرا نام اسد اللہ ہے" اسد اللہ کے انشائیے "اوراق" (پاکستان) جیسے معیاری رسالے میں مستقل چھپتے ہیں اس کے باوجود ان میں سادگی اور انکساری دیکھی تو دکھ ہوا کہ ایسی ہم میں کیوں نہیں۔ رسم اجراء سے پہلے کتاب پر فیتا چڑھانا تھا۔ فیاض افسوس نے کتاب کو کاغذ میں لپیٹا۔ فیتا چڑھایا اور کہا دیکھو یہ دو سرے ہیں۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔ بڑے کو کھینچنے سے فوراً کھل جائے گا چھوٹے کو تین دن تک کھینچنا پڑے گا۔ رسم اجراء اور مشاعرے کا اسٹیج خوب سجایا گیا تھا کہ کوئی ایک چیز تو اچھی ہو۔ بعد میں بہت سی چیزیں اچھی ہوگئیں اس لئے اسٹیج کی طرف توجہ نہ رہی۔ پروگرام شروع ہونے سے ذرا پہلے غنی اعجاز۔ فیاض افسوس اور انیس انور چائے پینے کے لئے چوک کی طرف نکلے تو بہت سی دیکھی ہوئی بستیوں کی طرح بروڑ بھی دیکھا ہوا لگا بروڈ کے بھی لوگ شریف النفس اور مہمان نواز ہیں۔ چائے پینے کے بعد ہوٹل والے سے انیس انور نے پوچھا کہ آپ لوگ چائے کے پیسے بھی لیتے ہیں؟ وہ لا لچی نہیں۔ جو نہیں پیتے ان سے نہیں لیتے۔

رات کے نو بجے تقریب شروع ہوئی ناگپور سے آئے ہوئے غلام ربانی نے اناؤنسنگ سنبھالی: ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب نے بڑے والا فیتا کھینچ کر رسم اجراء انجام دی اور حاضرین کو اس وقت تک کتاب دکھائی جب تک فوٹو گرافر نے تصویر نہ کھینچ لی۔ اتفاق سے کیمرہ ٹھیک کرنے میں دو منٹ لگ گئے جتنے انہیں زبردستی مسکراتے رہنا پڑا۔ صفدر صاحب نے جذباتی ہوکر یہ کہا کہ کتاب کی پہلی جلد میرے بڑے بھائی قبول کریں جنہوں نے پڑھا لکھا کر . . . . (اس حال کو پہنچایا ہے)۔ اسد اللہ نے فاکہ سنایا عنوان تھا "لوہا خانے کی کرشمہ سازی"۔ اس میں صفدر بھائی کو ایسی سوئی کہا گیا جو اُردو اکیڈیمی اور آل انڈیا ریڈیو کو اس وقت نظر آئی جب سارا کرکٹ مات ہو گیا۔ مضامین کے مختصر ہوتے ہیں اس لئے اچھے لگتے ہیں۔

ہ اچھا تھا اس لئے مختصر لگا۔ ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب نے دلچسپ مضمون پڑھا۔ مدحت الاختر صاحب نے ذہن برداشتہ قریرکی۔ مقبول واحدی نے ڈائس پر مجھے ایک قیمتی شال عنایت کی۔ فرطِ مسرت سے کان بجنے لگے اور تالیوں کی آواز محسوس ہوئی۔ مدعوئین سے ایک ایک یار اٹھک بیٹھک کرائی تھی اس لئے ہار پہنائے گئے۔ پھر بیورڈ کی مختلف انجمنوں کی طرف سے مفدر بھائی کو ہاروں میں چھپا دیا گیا کہ وہ جگہ سے حرکت نہ کر سکیں لیکن وہ کسی طرح مائک تک آئے اور سب کا شکریہ ادا کیا۔

اب مشاعرے کی کارروائی محمد نعیم اللہ صاحب کی آواز کے سہارے آگے بڑھی موصوف فطرتاً زندہ دل ہیں بطیفوں ور حاضر دماغی کو اس طرح گڈ مڈ کرتے ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ابتداء ناگپور کے شکیل انور سے ہوئی ان کے بعد چند قامی شعراء نے کلام سنایا۔ فیاض افسوس پر پہلی نظر پڑے تو لگتا ہے کہ ملٹری کے آدمی ہیں اور طنز و ظرافت سے ان کی بری دشمنی ہوگی لیکن یہ مزاحیہ کلام سناتے ہیں وہ بھی بغیر مسکرائے۔ لوگ ان کے پہلے شعر پر اتنا ہنستے ہیں کہ دوسرا سُن نہیں پاتے۔ ہر تیسرے پہ ہنستے تو چوتھا کانوں تک نہ پہنچا۔ چنانچہ ان کی غزل میں پہلے کے بعد دوسرا شعر ہوتا ہی نہیں تھا — بلکہ تیسرا وتھا تھا۔ اقبال غلش کی آواز سن کر ایسا لگتا ہے کہ سنسان جنگل میں ایک گنبد ہے جس میں سیٹی بجاتی ہوئی ہوائیں بہہ رہی ہیں۔ ہوب رازی کا کلام کتابوں میں اچھا لگتا ہے۔ مشاعروں میں داد کی بجائے دُکھ جھیلتے ہیں۔ دُبلے پتلے غنی اعجاز مائک پر ئے تو بہت سے موٹے موٹے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پہلی غزل پر وہ داد ملا چاکہ کئی اشعار دوبارہ سنانے پڑے۔ انیس انور آمیز ہیں۔ لندن رہ چکے ہیں ایسے مشاعروں اور نشستوں میں شریک ہوتے ہیں جن میں اشعار پہ داد ملتی ہے انداز پہ نہیں۔ اس لئے پڑھنے کا انداز سادہ ہے۔ داد مل گئی تو افسوس کر لیا نہیں ملی تو خوش ہو لئے کہ میرے اشعار ہر کس و ناکس ہ سمجھ میں آنے والے نہیں۔ یہ اس مشاعرے کے مہمانِ خصوصی تھے۔ غزل بھی سمجھدار مہمان کی طرح تھی۔ مختصر بحر، کم اشعار۔ دیر سے آئی جلدی چلی گئی۔ خواجہ غلام السیدین ربانی کی ناک اتنی اونچی ہے کہ تصور میں ناک ہی ناک نظر آتی ہے آنکھیں اور ہونٹ ہے ہیں یاد نہیں رہتا۔ ان دنوں بہت پیاری شاعری کر رہے ہیں۔ صفدر بھائی نے چھوٹی سی نظم پڑھی جو سمجھ میں نہیں آئی اس لئے یقین ہے کہ معیاری ہوگی۔ قاضی حسن رضا کھنڈوہ سے تشریف لائے تھے۔ اپنے سے پہلے شاعروں کا حشر دیکھ کر اندازہ لیا تھا کہ سامعین خفا ہیں اس لئے ڈائس کی طرف مڑ مڑ کر غزل سناتے رہے ایک دفعہ تو پوری طرح سامعین کی رف پیٹھ کر دی۔ ایک نے کہا صاحب اِدھر ہم بھی ہیں۔ انہوں نے پلٹ کر جواب دیا آپ کی موجودگی، عدم موجودگی دونوں برابر ہ۔ مایوس ہو کر ہی تو اِدھر ملتا تھا۔ اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ بعد میں خراب شعروں پر بھی داد ملنے لگی اور یہ سلسلہ شاعرہ ختم ونے تک چلتا رہا۔ رات ایک بجے آدھے سامعین غائب ہو گئے کہ خواہ مخواہ سردی میں اکٹھا دیا قوالی تو ہوئی نہیں۔ سامعین ی روانگی کے بعد ایگری ینگ مین یعنی عبدالرحیم نشتر نے غزل پڑھی اور داد سمیٹ لی۔

مدحت الاختر صاحب چھوٹے چھوٹے دلچسپ جملے بولتے ہیں۔ طنز و ظرافت کا ستھرا ذوق رکھنے والے مسرور ہو جاتے ہیں۔ صفِ اوّل کے ادبی رسائل میں نمایاں طور سے شائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے بہت اچھی غزل پڑھی۔ چونکہ ہر شعر کو لی ہی دفعہ بالکل صحیح پڑھ لیتے اس لئے دوبارہ یا سہ بارہ کی نوبت نہیں آئی۔ غزل سناتے وقت زیادہ تر سید کی طرف

دیکھتے رہے۔ شاید کبیر نہ صرف شاعری سے بلکہ قد و قامت سے بھی کبیر ہیں یہ واحد کبیر ہیں جن کے سامنے دیگر شعراء صغیر نظر آتے ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز دل کو لبھاتا ہی نہیں ہنسا تا اثر بھی کرتا ہے۔ شاہد صاحب پاکستان کی مارشل لاء حکومت سے ابھی ابھی لوٹے ہیں اور خاصے صحت مند نظر آ رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی "دواؤں" کا عدم استعمال بھی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ کالی شیروانی، کالی ٹوپی، سفید پاجامہ اور سفید داڑھی والے منشاء صاحب کی موجودگی سے مشاعروں میں زندگی آتی ہے اور مشاعروں سے منشاء صاحب میں زندگی آتی ہے۔ پہلے یہ رسائل میں بھی شائع ہوا کرتے تھے لیکن اس میں یہ قباحت ہے کہ داد کی آواز شاعر تک نہیں پہنچتی۔ یہ اپنا کلام صرف سناتے ہی نہیں اشاروں سے سمجھاتے بھی ہیں۔ ان کے سوا کسی میں یہ وصف نہ دیکھا کہ مزاحیہ اشعار سنا کر مغالطہ پیدا کر دیں کہ مزاحیہ اشعار سنا رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ حسرت و یاس کا شعر پڑھتے اور سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ جوشِ غزل سرائی میں دو تین دفعہ اسٹیج کا ٹیوب لائٹ گرتے گرتے بچا اور مائک بچتے بچتے گر گیا۔ ان پر ہمیشہ مشاعروں کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے اس لئے عابد میر نے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ بروڈ سے اکولہ کی بس صبح پانچ بجے نکلتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے سو جانا ٹھیک نہیں تھا۔ جاگنے کے لئے چائے پان سیگریٹیں تھے اس لئے چٹکلیوں سے کام چلایا گیا اس میں وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ شاہد کبیر ہماری روانگی تک اخلاقاً جاگتے رہے اور بعض لوگ مجبوراً۔ ہمارے قہقہوں سے ان کی نیندیں آتے آتے اڑ جاتی تھیں۔ بہت سے میزبان اسٹینڈ تک آنا چاہتے تھے کوشش کر کے انہیں باز رکھا۔ حبیب صاحب وغیرہ تو مان گئے لیکن سید صفدر، عابد میر اور اسد اللہ ہماری روانگی کا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ روشن کچھ اندھیری اونچی نیچی گلیوں سے ہم لوگ اسٹینڈ کی طرف جا رہے ہیں راستے میں صفدر بھائی کہہ رہے ہیں کہ مقامی لوگوں نے اس پروگرام میں بھرپور تعاون دیا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شکریہ ادا کر دں۔

دعا سلام کے بعد بس اسٹارٹ ہو کر اکولہ کی طرف دوڑ رہی ہے۔ سردی زوروں کی ہے اور گہرے کہر میں سورج نکل رہا ہے۔ ☐☐

غلام سرور
(سابق وزیر تعلیم بہار)

طرزِ غالبؔ میں شاعری کرنا

مرزا نوشہ نے کہا ہے ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

میں سمجھتا ہوں کہ طرزِ غالبؔ میں شاعری کرنا بھی اک قیامت سے کم نہیں۔ مرزا کی افتادِ طبع، اُن کی ذہانت، اُن کے تخیل کی بلند پروازی، اُن کا طنز، اُن کا مزاح، اُن کی شوخی، اُن کی زبان، اُن کا بیان اور سب سے بڑھ کر اُن کا کلام اُنہیں اعلیٰ اور عظیم فن کاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

مرزا غالبؔ اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں اور اُن کی شاعری کا منفرد انداز بیان ہے۔ یوں تو وہ بیدلؔ یا میرؔ کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

مگر اس کے باوجود اُن کی اپنی شخصیت اور اُن کی شاعری اُن سے جُداگانہ ہے۔ میرؔ کے یہاں سوز و گداز ہے۔ مرزا کے یہاں زندگی اور زندہ دلی ہے۔ کون فنکار ہے جس کے دل پر موسمِ بہار اپنا نقش نہیں چھوڑتا۔ یاس و حرماں نصیب میرؔ دل ہی دل میں کڑھتے ہیں ؎

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

ض احمد فیض کس حسرت بھرے دل سے کہتے ہیں ؎

نہ گُل کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

زا کی بے ساختگی و برجستگی ملاحظہ ہو ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اسی لئے جب مرزا یہ کہتے ہیں کہ یوں تو دُنیا میں ایک سے ایک اور اچھے سے اچھے سخنور موجود ہیں لیکن غالبؔ کا اندازِ ن ہی اور ہے تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی ان کو شاعروں کی صف میں ممتاز منفرد بناتا ہے۔

ایسی صورت میں طرزِ غالبؔ میں شاعری کرنا ویسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ مگر سورج کو چراغ دکھانا ایک ت ہے اور سورج کی روشنی، ضیاء گرمی اور حرارت سے اپنا ایک چراغ روشن کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ چاند کی روشنی بھی ں کی اپنی نہیں ہوتی۔ وہ تو مانگے کی روشنی ہے۔ اور سورج کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے باوجود ماہِ تاباں کا حسن۔ اس کی اندنی اور کشش اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

اس پہلو کو سامنے رکھ کر اگر ہم ہاشم عظیم آبادی کا "اندازِ بیاں اور" دیکھیں اور اسے پرکھنے کی کوشش کریں تو ہمیں ن کی کاوش و سعی کی داد دینی پڑے گی۔ ہاشم عظیم آبادی شاعر ہیں۔ عظیم آباد کے رہنے والے ہیں۔ اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے ام میں پختگی ہے اور انداز میں تنوع ہے۔ ہاشم عظیم آبادی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں میں غالبؔ ں غزلوں اور ان کے اشعار کی تضمین میں لگ بھگ ڈھائی سو غزلیں کہہ ڈالی ہیں جو ملک کے اُردو روزناموں، ماہناموں، اخبارات ور رسائل میں برابر جگہ پاتی رہی ہیں۔ اور ادب نواز سخن فہم حلقوں سے داد وصول کرتی رہی ہیں۔ ایک تو غزل اور وہ بھی طنزیہ ور مزاحیہ غزل اور پھر طرّہ یہ کہ غالبؔ کی زمین میں غزل کہہ لینا ہی بڑے جوکھم کا کام ہے اور ہاشم عظیم آبادی نے ہمت سے ام لے کر یہ کارنامہ انجام دے ہی دیا ہے۔ بلاشبہ یہ اُردو کی ادبی اور شعری دُنیا کے لئے ایک انوکھا تحفہ ہے۔ وہ خود معترف ہیں ؎

ہم نے مانا ہے سخن ہاشم کا [illegible]
پھر بھی چرچا ہے یہ تیری شوخیٔ تحریر کا

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کہیں کہیں ہاشم اپنا سکہ جمانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے فی زمانہ صورتِ حال کے پیشِ نظر [illegible] شعر ہوگیا ہے ؎

کچھ اور بھی بڑھا دیا بیٹے نے باپ نے ؎
بیٹے کا بھاؤ گرمیٔ بازار دیکھ کر

اور پھر آج کی ریاکار شہرت پسند دُنیا پر کیسی پھبتی کستے ہیں ؎

اے شیخ نظر والوں کو الّو نہ بناؤ
سجدے کے نشاں اور ہیں گٹّے کے نشاں اور

اور آج کل کے زمانہ کے اعتبار سے بزبان غالبؔ یہ مقطع کتنا چست نظر آتا ہے ؎

ہے اک وزیر کا چمچہ پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں ہاشمؔ کی آبرو کیا ہے

اس شعر میں طنز ہے اور لطیف طنز۔ دو دھاری کٹار ہے ؎

میلاد کی یہ بزم بھی راشن کی ہے دکان
شیرینی بٹ رہی ہے تو لمبی قطار ہے

جا بجا اکبرالٰہ آبادی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اُنھیں کے کرزنی چہرے پہ اب ہے زنخہ پن خنداں
کہ جن کے باپ دادا طعنہ زن تھے لارڈ کرزن پر

اردو غزل کو کل شیخ، واعظ، ناصح اور زاہد موضوع دیتے رہے ہیں۔ اور آج لیڈر، وزیر، نیتا اور سیاست داں شاعر کے تخیل کو ایڑ لگاتے ہیں ؎

ہوا گر جیل کی کھائے نہ لیڈر
تو پھر کھدّر پہننے کا مزا کیا

یا

خدا کی دین دیکھو مجھے مل گئی وزارت
مرے قبلہ کو بھی حسرت کہ میں تھانہ دار ہوتا

یا

چھن گیا جب سے قلمدانِ وزارت آپ سے
صبح کرتا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ان باتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم ہاشم عظیم آبادی کے مجموعہ کلام بعنوان "انداز بیاں اور" دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہاشم صاحب کی یہ کوشش کامیاب ہے۔ ویسے بھی جب اخباروں اور رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے تو اس نے مقبولیت حاصل کی ہے اور اسے عام طور پہ سراہا گیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اردو دنیا اس کا خیر مقدم کریگی اور اردو آبادی اسے ہاتھوں ہاتھ لے گی!

[redacted]

خرافات

(مراسلے)

شگوفہ کا ماہ اگست ۸۴ء کا شمارہ موصول ہوا، مندرجات سبھی معیاری ہیں کس کس کی تعریف کروں! محبِ مکرم حضرت رضا نقوی واہی کی نظم اولمپکس ۸۴ء کا کیا کہنا، واہی صاحب کا جو مخصوص انداز بیان طنز و مزاح میں ہے، اس کی پوری جھلک اس نظم میں موجود ہے۔ جناب بھارت چند کھنہ کا مضمون 'وہ بھی کیا زمانہ تھا'، بیک وقت انشائیہ کی دلچسپی اور مقالہ کی سنجیدگی رکھتا ہے۔ بھائی یوسف ناظم کا خاکہ بہت ہی پسند آیا، بڑی پختگی اور پرکاری ہے، شروع سے آخر تک لطیفِ تحریر قائم رہتا ہے اور جس سے "جگرِ شعلہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم" کا عنوان تو بڑا ہی معنی خیز اور مبنی بر حقیقت ہے۔ انیس احمد خان صاحب کا انشائیہ صحافت سے سڑک تک' اپنے اندر طنز کی بھرپور کاٹ رکھتا ہے اور ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔ حیدرآباد میں فسادات کے دوران جو کرفیو کا نفاذ ہوا اُن سے متعلق مضامین بھی خوب ہیں چونکہ میں اپنے شہر بنارس اور دوسری جگہوں پر یہ مناظر دیکھ چکا ہوں اور ان کیفیات سے گزر چکا ہوں اس لئے مجھے دونوں مضامین بھی بہت پسند آگئے۔ دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔ منظومات کا حصہ اور وسیع اور مقصدی ہونا چاہیئے ایسا میرا خیال ہے۔ بہرحال مجھے یہ شمارہ کئی جہت سے پسند آیا۔ خدا کرے اب آپ کے شہر میں امن و اماں ہوگیا ہو۔ پروفیسر حفیظ بنارسی (آرہ، بہار)

کمال صاحب۔ محبت

پچھلے چند ماہ سے تو اخبارات پر نظر ڈالتے ہی حیدرآباد ذہن پر کوڑے برسانے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے ساتھ دو لفظ چسپاں ہوگئے ہیں۔ "فرقہ پرستی" اور "کرفیو"۔ حیدرآباد سے میرا گہرا تعلق ہے۔ میری زندگی کے کئی سال اس شہر میں گزرے اور آج بھی میرے جاننے والوں کی وہاں کمی نہیں ہے میرے کئی ساتھی وہاں ہیں سرینواس لاہوٹی، حسینی شاہد، صبیا راج بہادر گوڑ، پیارے پیارے عاتق شاہ (فٹ پاتھ کی شہزادی والے) اور بالکل اپنے مظہر حسن اور ہاجی (اختر حسین سابق مدیر روز نامہ "پیام") کے گھرانے سے ۔ اور بہت سے دوسرے ۔ کئی تو پاکستان چلے گئے مثلاً حمایت علی شاعر اور کئی بھگوان کو پیارے ہوگئے مثلاً سلیمان ادیب اور دکھنی زبان کے شاعر "ڈنڈا" اور "تاریخ" کے مدیر مسلم سیفی جو پاکستان سے بھی مجھے خطوط لکھا کرتے تھے۔ چند اور بھی ہیں جن سے ملنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ جیسے گیان چند جی اور عابد علی خاں تھا۔ لہٰذا حیدرآباد سے میرا کتنا گہرا تعلق ہے کا اندازہ آپ ان چند ناموں سے لگا سکتے ہیں۔ تین سال پہلے (انجمن ترقی اردو ہند کی اردو کانفرنس کے موقع پر) حیدرآباد گیا تھا۔ کانفرنس کے بعد دو چار دن مظہر حسن کے گھر ملے پلی میں رہا اور سچ کہتا ہوں جس دن واپس لوٹا اس وقت مظہر بھائی رونے لگے اور میری آنکھیں بھی بھر آگئی تھیں۔

حیدرآباد نے میرے شعور کو بیدار کیا تھا میں نے کبھی تلنگانہ تحریک میں حصہ لیا تھا جس پر مجھے آج تک فخر ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی میرا تعلق رہا۔ گو وہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ لیکن آج جب حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں اُس باشعور حیدرآباد کو کیا ہوا حیدرآبادی تہذیب اور بھائی چارگی کو کیا ہوا۔ مخدوم کے وطن کو کیا ہوا؟ کیا ترقی پسند خیالات کے مالک اب وہاں نہیں رہے! کیا عوامی جدوجہد کے تمام سوتے سوکھ گئے؟ آخر کس طرح محبت پر نفرت نے فتح پالی ہے؟ کیا وہاں اب کوئی نہیں رہا جو مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام سے یہ کہہ سکے کہ تم ڈوب مروگے اگر فسادات میں پھنس گئے۔ تم میں اگر اتحاد نہیں تو تم کو مفاد پرست کمزور کرکے نگل جائیں گے۔ محنت کش صرف محنت کش ہوتے ہیں، مزدور صرف مزدور ہوتے ہیں۔ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان چونکہ

اگر وہ ہندو اور مسلمان بن جائیں تو اُن کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اُسی وقت اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں جب وہ ہندو یا مسلمان نہ ہوں بلکہ صرف محنت کش انسان ہوں۔ سرمایہ داری کا مقابلہ آخر بچوں کا کھیل تو نہیں ہے ـــــ؟ فرقہ پرستی نے اس شہر کو کتنا کمزور کر دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج وہاں جمہوریت کا قتل ہونے لگا ہے۔ راما راؤ اور بھاسکر راؤ ــ یہ کیا ڈرامہ ہے؟ راما راؤ سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تلگو دیشم کے پاس کوئی صحت مند اور کوئی ترقی پسند نقطۂ نظر نہیں ہے بلکہ تلگو دیشم کا بنیاد بھی صوبہ پرستی اور زبان پرستی پر ہے۔ جس میں تنگ نظری ہے۔ اور اب دیکھئے ایک اور فرقہ پرست جماعت اتحاد المسلمین بھی ڈرامے میں شامل ہو گئی ہے۔ لیکن ان تمام کے باوجود ہم راما راؤ کا ساتھ دیتے ہیں۔ وجہ محض یہی ہے کہ ہم جمہوریت کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں چونکہ ہم جس ماحول میں آج سانس لے رہے ہیں وہاں اگر کسی طرح جمہوریت کو موت کے گھاٹ اُتارا جا سکے تو کل بڑی آسانی سے ہم سب کا گلا گھونٹا جا سکے گا۔ تمام ترقی پسندوں کا قتل عام کیا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم راما راؤ کو ایک ہیرو بنائے ہوئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک زمانے میں حیدرآباد میں متحدہ محاذ کے رہنما ڈاکٹر جئے سوریہ نائیڈو کو بنایا گیا تھا۔ سماج کو آگے لے جانے کیلئے ہر ہر موڑ پر کسی نہ کسی نائیڈو یا کسی راما راؤ کی ضرورت پیش آتی ہے اور اُن کا وقت پر حسبِ ضرورت استعمال ضروری ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ مغربی بنگال میں فرقہ پرستی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہاں نہ ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں اور نہ برہمن ہریجن فسادات اور نہ ہی یہاں اردو زبان یا کسی اور زبان سے نفرت کا کوئی جذبہ ہے۔ مغربی بنگال کی اردو اکاڈمی نے حال ہی میں بنگالیوں کو اردو پڑھانے کے لئے ایک کلاس کھولا ہے۔ شام کا کلاس، تاکہ دفاتر وغیرہ میں کام کرنے والے شام کو اگر وہ چاہیں تو اردو پڑھ سکیں۔ یہاں کے بنگلہ اخبارات میں صرف ایک دن چھوٹا سا اشتہار دیا گیا تھا تو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے ہاں کوئی دو سو بنگالیوں نے اردو سیکھنے کے لئے درخواستیں دی ہیں اگر اس اسکیم کو کامیاب بنایا جا سکے تو ہر سال ایک دو سو بنگالی اردو سیکھ کر اردو سے مزید محبت کرنے لگ جائیں گے۔ کیا یہ بلند سماجی شعور اور بیدار کلچر کی ترجمانی نہیں کرتا؟ ایک ذاتی بات بھی کہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا تعلق "بھٹا چاریہ" خاندان یعنی بنگال کے سب سے اونچے برہمن گھر سے ہے لیکن میرے بڑے فرزند نے ایک اچھوت لڑکی سے شادی کی ہے اور یہی اچھوت لڑکی میرے گھر کی بہو ہے اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ذات پات کے سخت بندھن کو خود اپنے گھر میں بھی توڑنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خیر یہ سب باتیں جانے دیجئے۔ بہت کچھ لکھ ڈالا "شگوفہ" مل رہا ہے خواجہ عبدالغفور نیر بھی ملا۔ اب "ہندوستانی مزاح نمبر" کا انتظار ہے۔ آپکا **شانتی رنجن بھٹا چاریہ**

(کلکتہ)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اردو رسالوں کی زبوں حالی اور غیر یقینی زندگی کے پیشِ نظر ہم نے شگوفہ کے اداریہ کیلئے یہ مستقل عنوان اختیار کیا تھا لیکن حیدرآباد کے حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا ہے کہ ہر شریف آدمی بوقتِ وداع یہی مصرعہ دہراتا ہے مئی، جون، جولائی، اگست اور پھر ستمبر کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا جس میں فسادات اور کرفیو سے چھٹکارا ملا ہو۔ جس چوراہے پر ہم پچھلے ۲۵ سال سے نصف شب گزرنے کے بعد بلا خوف و خطر محفلیں سجائے ہنسنے کھیلنے کاموں میں مشغول رہا کرتے تھے آج وہی عمارت جارحانہ فرقہ پرستی کی چشم دید گواہ اور ویرانی اداسی کا پیکر بنی ہوئی ہے اس عمارت سے متصلہ شہر کی مرکزی شاہراہ تقریباً دو کیلومیٹر کے فاصلہ تک ایک ہی فرقہ کی دو دکانوں کو پولیس کی موجودگی میں جلایا اور لوٹا گیا کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا۔ ستمبر کے فساد میں ۲۱ آدمی ہلاک اور بے شمار افراد زخمی ہو چکے ہیں! اور تادمِ تحریر شہر میں رات کا کرفیو برقرار ہے ایسے حالات میں ستمبر کا شمارہ اسی مہینے شائع ہونا ناممکن سا تھا۔ یقین ہے کہ شہر کے حالات میں بہتری پیدا ہوگی۔ اور ہم اکتوبر کے شمارہ کے ذریعہ عالمی جشنِ مزاح کی تفصیلات آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں گے!

Vol. 17 Copy 9 September 1984 Phone :

شگوفہ

زندہ دلان حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد ۱۷ ——— شمارہ ۱۰ ——— اکتوبر ۱۹۸۴ء

قیمت: ۳ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف، مسعود انور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۔ ۳۱ ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱، فون: 557716

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام

عالمی جشنِ مزاح

۱۶ / تا ۲۰ / نومبر ۱۹۸۴ء

مجوزہ پروگرام

جمعہ ۱۶/ نومبر۔ شام ½۵ بجے افتتاح ۔ مقام روینیدرا بھارتی تھیٹر
یادگار پوسٹل کور کی تنسیخ ۔ مائم، کٹھ پتلیوں کا ناچ اور کلچرل پروگرام

شنبہ ۱۷/ نومبر ½۹ بجے صبح ۔ مزاحیہ فلموں کی نمائش کا افتتاح ۔ رائل ٹاکیز
ایک بجے دن ۔ افتتاح نمائش کارٹون ۔ انڈور اسٹیڈیم
شام ½۵ بجے ۔ ادبی اجلاس (اُردو) نمائش کلب
۶ بجے شام ادبی اجلاس (گجراتی) ۔ گجراتی ودیا مندر، سلطان بازار
½۴ بجے شام " (ملیالم) ۔ ین بس کے بچے اسکول (بی ایچ ای ایل)
½۵ بجے شام " (مراٹھی) ۔ ویوک وردھنی اسٹیج
½۵ بجے شام " (کنڑی) ۔ کرناٹک ساہتیہ مندر
۶ بجے شام " (بنگالی) ۔ بنگالی سمیتی
۶ بجے شام " (ٹامل) ۔ کیزہائی اسکول، سکندرآباد

یکشنبہ ۱۸/ نومبر ½۱۰ بجے صبح ۔ ادبی اجلاس ہندی ۔ نمائش کلب
½۵ بجے شام ۔ " گجراتی ۔ گجراتی ودیا مندر
" " " مراٹھی ۔ ویوک وردھنی اسٹیج
½۱۰ بجے صبح " کنڑی ۔ کرناٹکا ساہتیہ مندر
۶ بجے شام " ٹامل ۔ کیسترہائی اسکول
۶ بجے شام " پنجابی اور ملیالم
۶ بجے شام ۔ اُردو ہندی مشاعرہ ۔ نمائش میدان
" ادبی اجلاس تلگو ساہتیہ اکیڈیمی

دوشنبہ ۱۹/ نومبر۔ صبح ۱۰ بجے سمپوزیم (انگریزی) ۔ جوبلی ہال
۶ بجے شام ۔ ادبی اجلاس۔ (انگریزی و غیر ملکی زبانیں) جوبلی ہال

سہ شنبہ ۲۰/ نومبر۔ صبح ۱۰ بجے مزاح نگاروں کی ملاقات و مباحثہ ۔ نمائش کلب
۶ بجے شام ۔ عالمی اجلاسِ قہقہہ ۔ نمائش میدان
" " اختتامیہ "

آنند گجپتی راجو، صدر

نریندر لوتھر، کارگذار صدر

طالب خوندمیری، معتمد عمومی

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

رضیہ فصیح احمد
(پاکستان)

موازنہ

اب جبکہ کراچی میں طرحی مشاعروں کا زور باندھا جا رہا ہے، میں ایک اور روایت کا احیا کرنے کا سوچ رہی ں۔ یہ ہے موازنہ۔ ایک زمانہ میں موازنۂ انیس و دبیر اور موازنہ حقیر و فقیر قسم کی چیزیں عام تھیں۔ لیکن بعد کے نقادوں ، نہ جانے کیوں انھیں خلاف ادب قرار دے دیا۔ دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس روایت کو بحال کریں اور موازنے دوبارہ شروع کریں، جیسے موازنۂ عالی و انشا یا ازنۂ سلیم احمد و شمیم احمد۔ ہوتا یوں ہے کہ جو لوگ مشورہ دیتے ہیں اُنہی سے پہل کرنے کی درخواست کی جاتی ہے حالانکہ دنی اچھی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تقسیم کار ہے۔ سوچنے والے لوگ اور ہیں، کام کرنے والے اور، مشورہ دینے لے عمل نہیں کرتے، عمل کرنے والے مشورہ نہیں دیتے۔ اگر دیں تو وہ قابل قبول نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ پھر مشورہ دینے لے کہاں سے کھائیں گے۔ ہم خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتے کہ کوئی تفصیلی موازنہ کر سکیں۔ لیکن حرف آغاز کے طور پر ایک موازنہ اعروں اور نثر نگاروں کا پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے مصرع طرح سمجھ لیجیے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر ن ہوتا ہے اور نثر نگار کون۔

شاعر عموماً ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو شاعری کرتے ہوں۔ خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں۔

نثر نگار وہ لوگ ہیں جو نثر لکھیں، چاہے مطلب کچھ نہ ہو۔

شاعروں کو ہمارے ہاں نہایت اونچا مقام حاصل ہے جو انہوں نے خود ہی ایک دوسرے کو اوپر اچھال اچھال کر اصل کیا ہے۔ شاعروں کو شہرت دینے میں مشاعروں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے علاوہ شاعروں کی شاعری چمکانے ں ریڈیو اور چہرے چمکانے میں ٹی وی بھی بے مثال کردار ادا کرتا ہے۔ ٹی وی میں آئے دن مشاعرے برپا ہوتے رہتے ں۔ جن میں شاعر حضرات کوڑیوں کے حساب سے نظر آتے ہیں جبکہ نثر نگار روز ابر یا شب ماہتاب میں لگتے ما ہے اکا

ر کا دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت جب ناظرین چراغِ ٹی وی گل کر کے خوابوں کے اسکرین کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ مشاعرہ کہیں بھی ہو اس کی روئداد اخبار میں ضرور چھپتی ہے۔ اور وہ بھی باتصویر۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر حضرات کاسہ دار لیئے مائک کے سامنے قطار میں کھڑے ہوں۔ ظاہر ہے کہ تصویروں کے نیچے فلانے شادآبادی، ڈھمکانے نامرادی، لم غریبی اور قلم امیری صاحب کے نام بھی ضرور درج ہوتے ہیں۔

کبھی کسی ادبی نشست میں جا کر دیکھئیے۔ افسانہ سنا جاتا ہے تنقیدی کان سے اور شاعری سُنی جاتی ہے تحسینی نظر سے یعنی اس میں کان گناہ گار نہیں ہوتے) ہر ہر شعر اور مصرعے بلکہ ٹکڑے پر بغیر سنے اور غور کیئے آہ اور واہ کے ڈونگرے برستے ہیں۔ فرض کیجئے افسانہ پڑھنے پر بھی اسی طرح داد ملا کرے تو اس کا نقشہ کچھ یوں ہوگا۔

افسانہ نگار: آج صبح جلدی ہوگئی یا میں دیر سے اُٹھا۔

سامعین: واہ سبحان اللہ۔

افسانہ نگار: آج صبح جلدی ہوگئی۔

سامعین: اچھا کہا ہے، مکرر .....

افسانہ نگار: میں دیر سے اُٹھا، ایک پیالی چائے کی پی جو پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور جب پی چکا تو پتا چلا کہ اس میں ایک مری ہوئی مکھی پڑی تھی۔

سامعین: (بے ساختہ) واہ واہ .... ٹھنڈی ہو چکی تھی .... واہ .... مکرر .... جناب مری ہوئی مکھی دوبارہ عطا ہو۔

افسانہ نگار: پی چکا تو پتا چلا کہ اس میں ایک مرتا ہوئی مکھی پڑی تھی۔

سامعین: واہ واہ .... کیا کمال کی ترکیب ہے، مری ہوئی مکھی .... آپ ہی کا حصہ ہے۔ کیا تہ دار بات ہے، ٹھنڈی چائے کے ساتھ مری ہوئی مکھی۔ پورے معاشرے کو چائے کی پیالی میں سمیٹ لیا اور وہ بھی صبح ہی صبح۔

اس طرح افسانہ سمجھ میں آیا نہ آیا داد بھرپور ملتی رہی اور افسانہ مکمل ہوگیا۔ مگر فی الحال یوں ہوتا نہیں ہے بلکہ جب تک افسانہ نگار پڑھتا ہے سب خاموشی سے سنتے ہیں اور بعد میں افسانہ نگار کو لب بند کر کے بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کے سامنے افسانہ کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ یہ سب روایت کی بات ہے۔ شاعر کے ہر شعر اور مصرعے پر داد نہ دینا بداخلاقی ہے۔ کسی شعر کو بے معنی کہنا جہالت کی نشانی ہے۔ شاعر ویسے بھی حساس مشہور ہیں۔ آبگینوں کو ٹھیس سے بھی بچایا جاتا ہے۔ نثر نگاروں کی کھال موٹی ہوتی ہے اس لیئے انھیں کھری کھری کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ملک کے مشہور گانے والے کیوں اچھے افسانوں کی طرف توجہ نہیں دیتے جبکہ جہاں کسی شاعر کی شاعری کی مسیں بھیگیں اور انہوں نے اس کی غزلیں گانی شروع کر دیں۔ اب جس کو مہدی حسن ملکہ پکھراج، فریدہ خانم وغیرہ نے گا دیا ظاہر ہے کہ وہ غزلیں تو امر ہوگئیں۔ بڑھے لکھوں کا کیا ذکر ہے، ضرور اپنی تغاری

یں ریت اور سیمنٹ کے ساتھ ٹرانزسٹر رکھے غزل سنتے نظر آتے تھیں :

کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
ایک دیوار سی گری ہے ابھی

یا : مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

اب اگر کوئی ان سے اس مصرعے کے معنی پوچھ لے تو ! مگر معنی سے انھیں کیا! وہ تو گائکی کے عاشق ہیں۔ کسان تو دیکھئے کہ بیل کی پیٹھ پر ٹرانزسٹر رکھے گانا سنتا ہے : فصل گل آئی یا اجل آئی ۔ اور چوکیدار ادھ بنے مکان میں تنہا پڑا اس شعر پہ سر دھنتا ہے :

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

پھر شاعروں کو کچھ قدرتی آسانیاں بھی حاصل ہیں۔ سگریٹ کی ڈبیا پہ غزل کے چند اشعار، قطعہ ، رباعی، چھوٹی موٹی نظم یا نظمانے تو آ ہی سکتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ہوائی جہاز، ریل، کاریہاں تک کہ بس میں بھی لکھی جاسکتی ہیں لیکن کوئی نثر پارہ اس قدر مختصر جسامت کا نہیں ہوتا۔ نثر میں غزل کی طرح کی کوئی صنف ابھی ایسی ایجاد نہیں ہوئی ہے کہ دو جملوں میں مضمون مکمل ہو جائے ۔ پہلے شعر میں بات زمین سے شروع ہو، چار چھ اشعار میں کائنات کی سیر کرتی ہوئی مقطع میں سخن گسترانہ شاعر صاحب کے تخلص پر ختم ہو جائے۔ ان سب چیزوں کو صاف کرتے میں بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی شیو کرنے میں، اور نثر نگاروں کا معاملہ یہ ہے کہ چیز لکھی پڑی ہے مگر اتنا وقت نہیں کہ صاف کرسکیں۔

انھیں اسباب جلی وخفی کی وجہ سے نثر نگاروں میں ابھرنے والی . . . شاکرہ پردنیوں اور ریاض فہیم اوں کو کوئی نہیں جانتا۔ اس کمی کے پیش نظر اب نثر نگاروں نے ایک انجمن بنائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نثر نگاروں سے سوتیلے باپوں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مناثروں اور مشاعروں کی تعداد برابر ہونی چاہیئے۔ انہوں نے افسانہ نگاروں ، ناول نگاروں، نقادوں اور انشائیہ لکھنے والوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سب ایک پرچم تلے اکھٹے ہو کر اپنے حق کے لیے لڑیں۔ چند حضرات نے مشاعروں کی طرح مناثروں کی محفلیں بھی شروع کر دی ہیں۔ خدا انھیں نظر بد سے بچائے اور شاعروں کی عمر بھی انھیں لگائے۔ آمین ثم آمین!

▭▭

حفیظ بنارسی

کرکٹیات — (چند قطعات کرکٹ کی اصطلاح میں)

عمر بھر فیلڈ میں رہے لیکن
ہم بھی ہوتے سنیل گاوسکر
کوئی اچھا رومانس ہی نہ ملا
ہم کو بیٹنگ کا چانس ہی نہ ملا

جب سے ہم اولڈ اور کولڈ ہوئے
آؤٹ تو خیر ہم کو ہونا تھا
کسی بازار میں نہ سولڈ ہوئے
اس کا صدمہ ہے کلین بولڈ ہوئے

چھوٹ جاتے ہیں کتنوں کے چھکے
باؤنڈری جو لگا رہے ہیں سنیل
اس قدر سخت میچ ہوتا ہے
باؤنڈری پر بھی کیچ ہوتا ہے

وقت کی گیند تیز تر تھی بہت
ہم نے بلا گھمایا تھا لیکن
کیسے کرتے مقابلہ یارو
مڈل اسٹمپ اڑ گیا یارو

کچھ سمجھ ہی میں اب نہیں آتا
عورتیں بلے بازی کرنے لگیں
کیا ہے مردانہ کیا زنانہ ہے
یا الٰہی یہ کیا زمانہ ہے

ہالۂ روشنی نظر آیا!
گیند پھینکی جو اس نے میری طرف
ثمرِ زندگی نظر آیا!
مجھ کو کچھ اور ہی نظر آیا۔

کیسے کم ہوگی گھر کی آبادی
حکمِ سرکار ہے کہ دو ہی بس
جب برابر بڑھا رہے ہیں ہم
اور SIXER لگا رہے ہیں ہم

بات جو سنیئے وہ بھلی سنیئے
وقت اچھا گزارنا ہے اگر
کیوں کسی کی جلی کٹی سنیئے
ڈٹ کے کرکٹ کمنٹری سنیئے

کس کی جرأت جو مارتا مجھ کو
آؤٹ جب کوئی مجھ کو کر نہ سکا
غلط امپائرنگ نے مار دیا
L.B.W مجھے قرار دیا

عقل سے مجھ کو کوئی کام نہ تھا
کچھ کرکٹ کے کھیل میں گزری
عمر ساری دوانگی میں کٹی
اور کچھ شعر و شاعری میں کٹی

عابد معز

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

الوداع ستمبر

حیدرآباد شہر قدرتی مصائب و آلام سے محفوظ رہا ہے۔ ساحلی شہر تو نہیں ہے کہ طوفان و بادو باراں سے متاثر ہوتا، سرحدی شہر نہیں ہے کہ جنگ کا خمیازہ بھگتنا پڑتا، نیچے آتش فشاں کنویں بھی تو نہیں ہیں کہ بار بار زلزلے آتے۔ آب و ہوا معتدل، نہ گرمی کی شدت سے وصال اور نہ ہی برف باری سے انتقال۔ لیکن انسانی فطرت کو قرار کہاں! مصائب و آلام کو برداشت کرنا انسانی جبلت میں ہے۔ اسی لئے شاید حیدرآبادی شہریوں نے فسادات جیسی قیامتِ صغرا اور بارش کی زیادتی سے رہائے کی پیمالی میں طوفان جیسی کیفیت اپنے اوپر لادی ہے اور جناب سال کے تین سو پینسٹھ دن ایک ہی حالت میں رہ نہیں سکتے۔ کچھ دن مختص کر لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لئے ہر سال کا نواں مہینہ وبالِ جان ٹھہرا۔ اس مہینے میں شہریوں پر اتنے ستم ہوئے کہ اب حیدرآبادی ستمبر کو "ستمگر" کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں۔ ستمبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی مشکلات برداشت کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور مہینہ ختم ہونے کے بعد سکون کا سانس لیتے ہیں۔

ہمارے یہاں بارش کا انحصار مانسون پر ہے۔ مانسون تو مانسون ہیں جو کسی کو مانتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سنتے ہیں حتیٰ کہ ہواؤں کے دباؤ اور سورج کی تمازت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنی مرضی میں جو آئے وہی کرتے ہیں۔ اکثر اوقات رسما چلے آتے ہیں۔ شاذ و نادر اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں ستمبر کے مہینے میں شہر میں طغیانی آئی تھی۔ شہر میں حقیقتاً پانی گھس آیا تھا۔ آج ہمارے شہر میں اس طغیانی کی روداد کہنے والے چند حضرات رہ گئے ہیں۔ آج کی نسل کے لئے یہ سانحہ ایک کہانی بن گیا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ نے کہا کہ اس طغیانی کو انہوں نے آنکھوں سے دیکھا، دو دن مسلسل پانی میں تیرتے ہوئے گزرے تھے۔ انہیں ایک نوجوان نے مشورہ دیا کہ وہ تیراکی یا پھر طغیانی کو کم کر دیں۔

ہمارے شہر میں بارش کو ماہ ستمبر سے عشق ہے۔ دوسرے مہینوں میں بارش ہو یا نہ ہو ستمبر میں بارش کی امید رہتی ہے۔ بارش ہوتی بھی ہے۔ بارش بھی ایسی کہ ندی نالے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ریل گاڑیاں بہا دی جاتی ہیں اور جب کبھی اس مہینے میں بارش نہ ہو تو سمجھئے خشک سالی۔ اسی لئے ہمارے ایک دوست کہتے ہیں۔ "بھئی عجیب مصیبت ہے، بارش ہو تو ستم اور اگر نہ ہو تو مزید ستم!"

۱۹۰۸ء کی طغیانی ہی حقیقت ایک قدرتی عذاب تھا جو ہم حیدرآبادیوں پر نازل ہوا۔ اس کے بعد ستمبر کے مہینے میں جن مصائب سے دوچار ہوئے وہ اپنے ہی نازل کردہ ہیں۔ حتیٰ کہ ہم نے ستمبر ۱۹۸۳ء میں طغیانی لائی تھی۔ ہر شام ایک زبردست افواہ

نے عثمان ساگر کو توڑا اور پانی کو شہر میں بہا دیا۔ "پانی آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کا شور بلکہ واویلا مچا۔ ہر کوئی افراتفری کے عالم میں اونچی اور محفوظ جگہ کی تلاش میں دوڑنے لگا۔ اس دن سے آج تک ہم خوف و دہشت سے دوڑتے ہی چلے جارہے ہیں کبھی جلوس کے ڈر سے، تو کبھی کرفیو کے نفاذ کی وجہ سے اور پھر کرفیو کے دوران پولیس کی مار سے تو کبھی اشرار سے بچنے کے لئے دوڑ لگانا پڑتا ہے۔

خودساختہ طغیانی کی تباہی کا اثر آج بھی ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہے۔ ہلکی پھوار سے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہر کے حالات بارش ہونے کے ساتھ ہی طغیانی لانے کے لئے معاون ہیں۔ سڑکوں پر پانی بہتا نہیں، جمع ہوجاتا ہے بلکہ سڑکوں سے پانی اُبلنے لگتا ہے۔ سڑک پر جمع ہوئے پانی میں قدم رنجہ فرماتے ہی آنکھوں کے سامنے "پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ گنڈی پیٹ کا پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔" والا منظر گھومنے لگتا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ ہم حیدرآبادی شہری ہر سال خودساختہ طغیانی کا دن "سیتمبر ڈے" یا پھر "واٹر ڈے" کے عنوان کے تحت افواہوں کو فروغ دینے کے لئے مناتے جس طرح سے 'اپریل فول' اور 'مئی ڈے'، وغیرہ منائے جاتے ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے ہم نے سیتمبر کے مہینے میں نت نئے جلوس نکالنے شروع کئے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب جلوس نکلے گا تو اس پر پتھراؤ ہوگا یا پھر پتھراؤ کی افواہ پھیلے گی۔ نتیجتاً فساد برپا ہوگا۔ کرفیو نافذ ہوگا۔ چھرازنی کا لامتناہی سلسلہ پھر شروع ہوگا اس سال ۱۹۸۴ء میں بھی یہی سب کچھ ہوا۔ ہم نے نویں مہینے کی نویں تاریخ کو فساد برپا کرڈالا۔ سنتے ہیں حالات کو بگاڑنے کیلئے دوسرے مقامات سے لوگ آئے تھے جبکہ حالات کو قابو میں لے آنے کے لئے مختلف مقامات سے پولیس آئی تھی۔ جو حیدرآبادی شہری فساد سے متاثر نہ رہے لیکن کرفیو میں قید تھے انھیں لگا کہ اس سال ستمبر کا مہینہ آیا ہی نہیں۔ دو دن قبل ہمارے ایک دوست نے کہا "یہ سال صرف گیارہ مہینوں کا ہے"۔ جو لوگ فساد سے متاثر ہوئے ان کے لئے اس مہینے گویا قیامت آئی۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور جناب دھڑلے سے دہراتی ہے۔ ہم نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ جب روم جل رہا تھا تب نیرو دور پہاڑ پر بیٹھا گیٹار بجا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آگ کے شعلوں اور لوگوں کی آہ و بکا سے اس کے ساز میں سوز و گداز پیدا ہوگا۔ کچھ اسی طرح کے واقعہ کو ہمارے شہر میں تاریخ نے دہرایا ہے۔ وہ بھی ستمبر کے مہینے میں! ستمبر کے مہینے کو ستمگر بنانے کی روایت کو تقویت پہنچی۔ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے محبت سے پُرنور شہر میں آگ لگی تھی، کشت و خون کا کاروبار جاری تھا کئی نیرو اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھے۔ ان حیدرآبادی نیروؤں کا خیال تھا کہ اس طرح سے جمہوریت بحال ہوگی۔ اقتدار کی رسہ کشی کا تماشہ دیکھنے اور جمہوریت بحال کرنے کیلئے مختلف مقامات سے کئی لوگ جمع تھے۔ بارہا انھیں توجہ دلائی گئی "بھائی شہر جل رہا ہے۔ خدا کے لئے ایک نگاہِ غلط ادھر بھی ڈالئے"۔ کسے فرصت۔ وہ لوگ "سیاہ" "ست" ہی میں اُلجھے رہے، لنچ و ڈنر اُڑاتے اور خبریں پہنچاتے رہے جبکہ شہر میں کرفیو سے فاقے ہوتے رہے اور چھرازنی سے لوگوں کی قبریں بنتی رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ وقت گذر جاتا ہے، روکے نہیں رکتا۔ سو اس سال بھی ستمبر کا مہینہ گذر گیا۔ بارش اور طغیانی کے دن ختم ہوئے، جلوسوں، فسادات اور کرفیو کا مہینہ بیت گیا۔ سیاسی طوفان اور اقتدار کی رسہ کشی کا مہینہ نکل گیا۔

بارش تو خیر ہوئی نہیں۔ خشک سالی کا دور دورہ ہوگیا۔ جلوس نکلے، فساد اور کرفیو نافذ ہوا اور پھر امن و امان بحال ہوا۔ سیاسی طوفان تھم گیا۔ جمہوریت بحال ہوئی۔ دوسرے مقامات کے لوگ اپنے اپنے گھر سدھارے۔ پولیس نے رخت سفر باندھا اور ہم حیدرآبادی شہری روزمرہ کے کام وکاج میں جٹ گئے ــــــــ زندگی باقی رہی تو آئندہ سال ستمبر کے ستم دیکھیں گے۔ ــــــــ !

-- --

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کچوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپے
دھر گھسیٹ	سر بٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	"	مضامین	۷ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
قطع کلام	"	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
تحریم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبار خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲ "

-- ٠ --

غزل

رشید عبدالسمیع جلیل
(حیدرآباد)

عاشقی میں دل کے بدلے ہم نے اپنا سر دیا
سچ کہا ہے "عشق نے غالب نکما کر دیا"

ہے خدا کا شکر جس نے بے طلب ہی مفت میں
سر جاڑا مونڈنے والی کو اک شوہر دیا

وہ سراپا ناز میں ہے اس میں کوئی شک نہیں
چند سالوں میں مگر اس نے بھی اک لشکر دیا

ایک سیکل ہی ملی تھی تحفتہً سسرال سے
اس پہ قسمت نے سفر میں روز اک پینکچر دیا

کیا کریں شکوہ کسی سے ہم کو جب تقدیر نے
حال، ماضی اور مستقبل سبھی ابتر دیا

کوئی پونجی زندگی میں ہم نے رکھ چھوڑی نہیں
جو لیا اس ہاتھ سے اس ہاتھ سے اکثر دیا

اب شرافت نام ہے کمزوریٔ اعصاب کا
اور کمزوری نے ہم کو اک دلِ مضطر دیا

ہم نہ عاشق ہیں نہ شاعر بلکہ نوکر ہیں جلیل
نوکری نے امشلہ کے ڈھیر اور دفتر دیا

٭ ٭ ٭

تو کیا ہے؟

اسرار جامعی (پٹنہ)

سڑکوں پہ کٹ رہے ہیں پیر و جواں تو کیا ہے
انسانیت کی اڑتی ہیں دھجیاں تو کیا ہے

اپنا ہے گھر سلامت ان کی گلی میں گرچہ
مفقود ہو گیا ہے امن و اماں تو کیا ہے

انسان پی رہا ہے انسان کا لہو اب
اور دیکھتا ہے سب کچھ یہ آسماں تو کیا ہے

خوش نام ہو رہے ہیں اپنے وطن کے لیڈر
بدنام ہو رہا ہے ہندوستاں تو کیا ہے

بہرِ فساد زدگان چندے کی اس رقم سے
بن جائے آپ کا بھی گر اک مکاں تو کیا ہے

سارے قنوطی لیڈر مسرور ہو رہے ہیں
اسرار جامعی ہیں محوِ فغاں تو کیا ہے

٭ ٭ ٭

مشکور حسین یاد
(پاکستان)

خود اعتمادی کا بھرم

جہالت کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہی اس کی سب سے بڑی خرابی ہے یعنی جاہل آدمی ساون کے اندھے کی طرح ہوتا ہے جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جاہل آدمی کے خواہ دوسرے تمام احساسات جاگ رہے ہوں لیکن اس کا احساسِ زیاں خوابیدہ ہوتا ہے۔ احساسِ زیاں جاگ جائے تو جہالت باقی نہیں رہتی۔ یا کم از کم یوں کہہ لیجئے کہ جہالت کی دیواریں بہت بڑا شگاف پڑ جاتا ہے۔

جہالت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلسل عمل کے لئے اکساتی ہے۔ ہمیں چلتے پھرتے لوگ یقیناً اچھے لگتے ہیں لیکن ان کی اس چہل پہل سے ڈرنا بے حد ضروری ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں اس رونق، اس لگاتار مصروفیت کے پیچھے کوئی بہت بڑی جہالت کام کر رہی ہو۔ جاہل کو اپنے فائدے کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا اسی لئے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی نوع کی مصروفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ انسان کی ایک جہالت یہ بھی ہے کہ وہ ہر حرکت میں برکت تلاش کرتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عمل کی مدح سرائی کے پیچھے اس بری طرح کبھی نہ پڑتا۔ تاریخ نے انسان کے اٹھتے ہوئے قدم بہت دیکھے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر اٹھائے ہوئے قدموں کا شمار بہت ہی کم ہے۔ تاہم کہ اگر آدمی اس حقیقت کی طرف انصاف کے ساتھ نگاہ ڈالے تو یقین ہے کہ شرم کے مارے دوبارہ قدم اوپر نہ اٹھا سکے۔ انسان غریب بھی کہاں جائے۔ اس کی ایک مجبوری یہ بھی تو ہے کہ اسے عمل کے لئے اعتماد چاہئے۔ ادھر عام طور پر اعتماد کی بنیاد کسی نہ کسی نوع کی جہالت پر قائم ہوتی ہے۔ اعتماد کے معنی کیا ہیں؟ اپنی ذمہ داری کسی کے کاندھوں پر ڈال دینا یا کم از کم اپنے عمل کے نتائج کی ذمہ داری کسی غیر ذات پر ڈال دینا۔ چلیئے غیر ذات پر ذمہ داری ڈالنے میں تو پھر بھی یہ امکان رہتا ہے کہ دوسرا شخص یا دوسری ذات علم کی دولت سے مالا مال ہوگی۔ خود اعتمادی میں تو امکان بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں عام حالات میں خود اعتمادی آنکھیں بند کر کے قدم اٹھانے کا دوسرا نام ہے اور سچ تو یہ ہے خود اعتمادی میں آدمی آنکھیں بند ہی نہیں کرتا آنکھیں پھوڑ بھی لیتا ہے۔

اعتماد کی مثال ایک اعلیٰ ترین ہیرے کی سی ہے جو ہری کے ہاتھ میں آ جائے تو اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ عام

فرد کے پاس ہو تو محض ایک پتھر۔ آدمی دوسرے پر اعتماد کر کے اس ہیرے کو پرکھ سکتا ہے۔ اپنے پر اعتماد کر کے اسے پرکھنے کے لئے بڑی جگرداری کی ضرورت ہے، جو ہر کس و ناکس میں آسانی سے نہیں ملا کرتی۔

اعتماد کا منفی پہلو جہالت ہے، اعتماد کا مثبت پہلو ایمان۔ اسی لئے جہالت کے ذریعے اتنا اعتماد پیدا نہیں ہوتا جتنا اعتماد کے وسیلے سے جہالت کے پھولنے پھلنے کا احتمال قائم رہتا ہے۔ اس کا اندیشہ خود اعتمادی کی صورت میں اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ پر اعتماد کر کے علم و فضل کے بے شمار دروازے بند کر لیتے ہیں کہ اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے اپنی ذات کو پوری کائنات سمجھ لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اعتماد ہر حال میں جہالت سے ہمکنار رہتا ہے لیکن اپنے آپ پر اعتماد کی صورت میں یہ جہالت، جہلِ مرکب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور غیر ذات پر اعتماد کی صورت میں یہی جہالت نہ صرف ایمان کا روپ دھار لیتی ہے بلکہ سراپا ایمان بن جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ خود اعتمادی کی صورت میں ہم اپنی جہالت سے قطعی طور پر بے خبر رہتے ہیں اور غیر ذات پر اعتماد کی صورت میں ہمیں اپنی جہالت کا بڑی حد تک علم ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لئے سقراط نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا۔ "دوستو! مجھ میں اور تم میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اور تم یہ نہیں جانتے کہ تم کچھ نہیں جانتے"۔ یہی جہالت کا اقرار سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اور کیا ایمان بھی اسی جہالت کا اقرار نہیں ہے؟

سوچنے کی بات ہے کہ خود اعتمادی کے لفظ کے معنی و خیال کے پیچھے ایک بہت بڑی اور خطرناک غلط فہمی کارفرما ہے غالباً اس ضمن میں یہ کہنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ اس غلط فہمی کا سرچشمہ انسان کی کوئی بدنیتی ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے آپ پر اعتماد کر کے انسان اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی کو معلوم کرنا چاہتا ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ خود اعتمادی کے حصار میں آ کر انسان اکثر و بیشتر اپنی ذات ہی کو کائنات کی سب سے بڑی سچائی سمجھنے لگتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوتاہ بینی اس کا مقدر بننے لگی ہے۔ ہم اپنے آپ پر اعتماد کر کے دور تک نہیں دیکھ سکتے۔ وسعت اور گہرائی کو پانے کے لیے ہمیں اپنے آپ سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کائنات کی سب سے بڑی سچائی کو پانے کے لئے خود اعتمادی کی نہیں، حق اعتمادی کی ضرورت ہے۔ حق اعتمادی کی بدولت انسان اپنے علاوہ کائنات کی دوسری سچائیوں کو بھی محسوس و معلوم کرنے کی سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے گرد و پیش کی معمولی معمولی چیزیں بھی غیر معمولی نظر آنے لگتی ہیں۔ ہم اشیائے عالم کا ادراک ہی نہیں کرتے انہیں دل میں بھی بٹھاتے ہیں۔ دل میں بٹھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے ان اشیاء کی پوجا شروع کر دی ہے۔ چیزوں کو دل میں بٹھا کر ان کے سہارے بڑی سچائی کی تلاش میں چل نکلنا ہمارا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔ گویا ہماری یہی حق اعتمادی ہمیں غیب پر یعنی نامعلوم پر اعتماد کرنا سکھاتی ہے۔ زندگی کی وسعت اور گہرائی کا بھرپور احساس دلاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خود اعتمادی کا سب سے بڑا نقصان براہِ راست فرد کی ذات کو نہیں پہنچتا بلکہ کائنات اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ لیکن کائنات باقی نہ رہے تو فرد اپنی ذات کو کہاں لے کر جا سکتا ہے۔ اس لئے کائنات اور فرد کی ذات، دونوں کے لئے خود اعتمادی کی بجائے حق اعتمادی کی ضرورت ہے۔ حق اعتمادی جو فی الحقیقت انسان کو

خوش فہمیاں کے نئے نئے راستوں پر بڑے اعتماد کے ساتھ لے کر نکلتی ہے۔ حق اعتمادی کا تو نام سن کر ہی جہالت کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اب یہ بالکل الگ بحث ہے کہ انسان خود پر اعتماد کرتے ہوئے کبھی نہیں کانپتا لیکن حق پر اعتماد کرنے سے پہلے اس پر عموماً لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں اسی لرزے سے خود اعتمادی کی اصل صورت بھی سامنے آتی ہے اور اس کی ایک نئی صورت کے ظہور کا سبب بھی یہی لرزہ بنتا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں اگر یہ نئی صورت پیدا نہ ہو تو پھر خود اعتمادی جہالت کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی۔ اعتماد کا سارا بھرم حق سے وابستہ ہے۔ □□

نظر برنی (دہلی)

"پیروڈی"

اس بڑھاپے میں ذرا عشق کا دعویٰ دیکھو
"ان کو دیکھو ذرا مرنے کی تمنا دیکھو"

یہ ہے میدان سیاست یہ ہے شطرنج جدید
"چال اب ہم بھی کوئی چلتے ہیں اچھا دیکھو"

قدر کھو دیتا ہے سسرال میں آنا جانا
"ہم نے پہلے ہی یہ تم سے نہ کہا تھا دیکھو"

سود خوروں سے بھی بڑھ کر ہے تقاضا تیرا
"شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو"

ان کی آواز پہ آتے ہیں نکل کر لٹھ باز
اب کبھی بھول کے ان سے نہ اکڑنا دیکھو

مرغ و ماہی بھی ہے سبزی بھی ہے بریانی بھی
ان کا کھانا بھی ہے کس شان کا کھانا دیکھو

تم کو ووٹوں کی بدولت جو ملی ہے کرسی
"کیا سنو عرض مری حال مرا کیا دیکھو"

لاکھ سمجھایا انہیں لڑکی ہے دفتر کی کلرک
"اب بھی وہ روٹھے ہیں لو اور تماشا دیکھو"

منہ دکھائی مری بیگم کی تو دیتے جاؤ
"دیکھنے کے لئے چاہو انھیں جتنا دیکھو"

پہلے تو پیار کیا بعد میں جیبیں کاٹیں
اک حسینہ نے کیا خوب صفایا دیکھو

ان کی شادی کو ابھی چار برس ہی گزرے
بن گئے بھائی نظر ہائے چھوارا دیکھو

صابر بہاری، رانچی

میری صدی کے لوگ

صورت میں تو جوان ہیں میری صدی کے لوگ
ٹوٹی ہوئی کمان ہیں میری صدی کے لوگ

مسلم معاشرہ تو اَن چھوا ہوا مگر!
سید ہیں شیخ و خان ہیں میری صدی کے لوگ

ہنگامہ وہ بپا ہے کہ کچھ بھی نہ سن سکیں
بے کان بے زبان ہیں میری صدی کے لوگ

کب جائیے گا پوچھتے ہیں آتا دیکھ کر
ایسے بھی میزبان ہیں میری صدی کے لوگ

پہنچے کسی کے گھر تو نہ نکلے تمام عمر!
ایسے بھی میہمان ہیں میری صدی کے لوگ

چاقو بغل میں منہ میں ہے دن رات رام نام
کتنے جگت مہان ہیں میری صدی کے لوگ

ہیں فتنہ و فساد میں ابلیس کے چچا!
ویسے تو دھان پان ہیں میری صدی کے لوگ

تین شعر

اکبر جاہدی دہلی

ہماری روٹیاں کس نے ہمارے ہاتھ سے چھینی
نہ کپڑے کا ہی ٹکڑا ہے نہ دسترخوان باقی ہے

سینما چھوڑ کر روٹی کمانا کیسے ممکن ہو
اگرچہ گھر میں دو ہی وقت کا آب و نان باقی ہے

مرا شہر جگمگاتا تو آنکھوں کو کھلا رکھنا
کہ پیا مالنی کے دید کا ارمان باقی ہے

فرحت قمر
(نئی دہلی)

ہم نے اپنے بچّوں کو پڑھایا

ہماری بیوی کا اصرار تھا کہ اب دونوں بچوں کو اسکول میں داخل کرا دینا چاہیئے ۔ وہ محلہ بھر کی مثالیں دیتیں۔ "پنکی ڈھائی سال کا نرسری جاتا ہے" "ٹنکو پانچ سال کا ہے لیکن انگریزی کی تین نظمیں ایک سانس میں سنا دیتا ہے"۔ اسلم صاحب کی شاہین پانچویں میں پڑھتی ہے مگر انگریزی ایسے بولتی ہے جیسے کہ اس کی مادری زبان ہو" اردو چاہے ٹوٹی پھوٹی ہو مگر آج کل انگریزی بولنے کا زمانہ ہے" "انگریزی ساری دنیا کی زبان ہے" وغیرہ وغیرہ - یہ مثالیں اور دلیلیں سُن کر ہم کہہ دیتے "ہاں نیا سیشن شروع ہوتے ہی داخل کرا دوں گا"

یوں تو اپنے ایک "استاد" کی نصیحتوں کو مانتے ہوئے ہم اپنی بیگم سے زیادہ بات چیت یونہی نہیں کرتے لیکن ان کے بار بار کے تقاضہ پر ہم نے ان سے اس مسئلہ پر کھل کر گفتگو کرنے کا ارادہ کر لیا. سب سے پہلے ہم نے اپنی سولہ کلاسیں پاس کرنے اور موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر چشمہ لگانے کی حد تک اپنی آنکھیں خراب کرنے کا رعب جمایا، پھر ان سے عمر میں بڑے ہونے ، دنیا دیکھنے اور بال پک جانے کی لمبی تمہید باندھی اور پھر ایک چھوٹی سی بات کہی کہ کم عمر میں بچوں پر تعلیم کا بوجھ ڈالنا ان کی ذہنی نشو و نما کے لئے صحیح نہیں ہوتا ۔ نفسیات کے اصولوں کا حوالہ دے کر ان کو بتایا کہ ایک سانس میں تین انگریزی نظمیں سنانے والے کم سن بچے شروع شروع میں تو پڑھائی کے میدان میں تیز چلتے ہیں مگر اگلی جماعتوں میں پہنچ کر بدھو ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس بوجھ سے ان کی جسمانی نشو و نما بھی بُری طرح متاثر ہوتی ہے. ہم اپنے مختصر جسم کی وجہ سے اس سلسلہ میں خود اپنی مثال دینا چاہتے تھے لیکن اس سلسلے میں لفظ "بدھو" استعمال کر چکے تھے اس لئے ٹال گئے. ہم نے یہ بھی کہا کہ ہم اپنے بچوں کو ایسے اسکول میں بھیجیں گے جہاں بچوں کو مُرغا بنانے کی بجائے آدمی بنایا جائے لیکن چوں کہ وہ اسکول ذرا مہنگے پڑتے ہیں اس لئے ذرا "پے کمیشن" کی فراخدلانہ سفارشوں کا انتظار کرنا پڑے گا. تنخواہ میں اضافہ ہو جانے پر ہم کوئی اچھا سا انگریزی اسکول منتخب کریں گے جہاں طالب علم شریف آدمی بنیں نہ بنیں "جنٹلمین" ضرور بن جاتے ہیں. اور کسی ایسے اسکول میں داخلہ کے لئے ہم نے اپنی بیوی سے ابھی

نے کی کوشش کرنے کا وعدہ کرلیا۔

ایک اور "استاد" کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہم نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جو کالج تو کیا اسکول میں بھی نہیں پڑھی تھی۔ حالانکہ ایسے معاملہ میں بھی سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوتا ہے لیکن اکثر ایسی بیویاں سمجھ جاتی ہیں۔ کالج کی تعلیم کی سند رکھنے والی بیویاں تو شاید کسی کی بات کو ماننا اپنی ڈگری کی توہین سمجھتی ہیں۔ بہرحال ہماری شریمتی جی ہماری بات سے متفق ہوگئیں اور انھوں نے اسکول میں داخلہ کی بات کو کچھ عرصہ کے لئے ٹال کر بچوں کو کھیلنے کودنے کی پوری آزادی دے دی شاید ان کے ذہن میں ہمارا جسم لاغر ہو اور وہ اپنے بچوں کو جسمانی طور پر فربہ دیکھنا چاہتی ہوں ــــ!

کھیل کود کی آزادی سے ہمارے بچوں کے جسم میں تو کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیا ہاں ایک مہینہ کے اندر اندر انہوں نے مٹی پتھر کی منزلوں سے گزر کر ریڈیو اور گھڑی جیسی چیزوں سے کھیلنا شروع کردیا اور کاغذ پھاڑنے سے شروع کرکے آس پاس کے بڑوں کے کپڑے اور چھوٹوں کے سر پھاڑنے شروع کردیئے۔ بچے آداب سلام بھول کر گالیاں سیکھ گئے تو ہماری بیگم چونکیں اور ہم سے بولیں ــــ

"بچے دن بھر ادھم مچاتے ہیں، قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں اور اب تو گالیاں بھی سیکھ گئے ہیں۔ ان کو پڑھائی میں لگانا چاہیئے۔"

ہم نے کہا "بیوی ذرا دنیا کی رفتار دیکھو اور زمانہ کی نبض کو پہچانو ــــ ایک طرف بچوں کا جسمانی طور پر مضبوط ہونا ضروری ہے مگر دوسری طرف آج کے زمانہ میں گالیاں دینے کی صلاحیت بھی آدمی میں ہونی ہی چاہیئے۔ گالیاں دینے اور دھونس جمانے اور ہاتھ دکھا سکنے کی صلاحیت کے بغیر تندرست توانا جسم اتنا ہی بیکار رہتا ہے جتنا ہمارے گھر آنے والا کریم نکالا ہوا دودھ یا نمک لگا لگا کر ساری کڑواہٹ نکالا ہوا کریلا" (اس قسم کی گھریلو تشبیہات وہ بہت آسانی سے سمجھ لیتی ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوجاتی ہیں) ــــ ہم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس میں مزید وزن پیدا کیا "بچوں کو کھیلنے کودنے دو، تگڑا ہونے دو۔ گالیاں تو انھیں باہر کے بچوں سے ہر حال میں سیکھنی ہیں مگر کمزور جسم کے ساتھ گالیاں سیکھیں تو زندگی بھر جوتے ہی کھاتے رہیں گے۔ آج کل تو جینا ہی بس اسی کا ہے جو تگڑا بھی ہو اور گالیاں بھی دے سکے۔ گلی کے جمعدار سے لے کر اونچے افسر تک اسی کی بات سنتے ہیں جو دو چار گالیوں کی لاگ دے کر اپنی بات چلا چلا کر کہہ سکے"۔

جذبات سے عاری سپاٹ چہرے اور خالی خالی آنکھوں سے وہ ہم کو بس دیکھتی رہیں اور ہم ان کے سُننے کے موڈ سے فائدہ اُٹھانے کی سوچ کر اپنے پھیپھڑوں میں ڈھیر ساری ہوا بھر کر ہم پھر شروع ہو گئے!

"اور گالیاں دینے میں اصولی طور سے برائی بھی کیا ہے۔ نالی کا منہ بند کردو تو پانی اور گندگی اسی میں رک جائے گی۔ اسی طرح آدمی گالیاں دے کر اپنے فاسد خیالات باہر نہ نکالے تو یہ جذباتی گندگی اس کے ذہن میں ہی جمع ہوتی رہے گی۔ آج کے ڈاکٹر اور نفسیات داں لمبی چوڑی ریسرچوں کے بعد ہی نتیجہ نکال پائے ہیں کہ گھٹے دبے جذبات ذہن میں الجھن اور

طرح طرح کے کامپلکس پیدا کرتے ہیں"۔
ہماری عالمانہ دلیلوں کو تو وہ رد نہ کر سکیں مگر پھر بھی معصومیت کے ساتھ احتجاج کیا۔
" مگر زیادہ گندی گالیاں دینا تو بری بات ہے"۔ اور پھر اپنے گنج ہائے معلومات و تجربات سے زوردار دلیل تلاش کر کے انہوں نے دی۔ "ہمارے ابا تو گالیوں کے سخت خلاف تھے"۔

خانگی زندگی کے سابقہ تجربات نے ہم کو سکھایا تھا کہ چاہے بیوی کی مخالفت کر لو مگر بیویوں کے اباؤں کے بارے میں کچھ غلط نہ بولو۔ لہٰذا ہم "ان" کی بات کے جواب میں بس مسکرا دیئے۔ دوسرے یہ ان سے کہتے بھی کیسے کہ ان کو گالیاں سیکھنے کا موقعہ نہ دے کر ان کے ابا نے ان پر زیادتی کی تھی۔ اگر وہ گالیاں دے سکتیں تو ہمارے گھر میں دندناتیں اور میر تقی میر کی طرح مسکین بننے کی بجائے اسد اللہ خاں غالب کی طرح غالب رہتیں۔

یہ سب کچھ کہنے کی بجائے ہم نے بات کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور چپکے سے اصول مکھن (جو زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے ہم آج کل ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں) نکال کر اپنی زبان پر ملا اور بولے "بیگم! تم بھی تو پڑھی لکھی سمجھ دار ہو۔ گھر پر رہ کر تم نے کالج جانے والیوں سے بھی زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ ذرا وقت نکال کر تم ہی بچوں کو تھوڑا سا پڑھا دیا کرو"!

" اچھا" کہہ کر وہ اپنے کاموں میں لگ گئیں اور ہمارے مکھن کے زیر اثر اسی شام سے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ تختیاں سلیٹیں قلم پنسل وغیرہ چیزیں جتنی تیزی سے خریدی جانے لگیں اتنی ہی زیادہ تیزی سے ٹوٹنے لگیں لیکن ہم کو اپنی بیوی کی محنت اور بچوں کی پڑھائی سے خوشی تھی۔!

اپنے ایک تجربہ کار "استاد" کی ایک اور نصیحت کے تحت ہم اکثر گھر سے باہر ہی وقت گزارتے تھے۔ اس فارمولے سے بیوی سے اتنے جھگڑے نہیں ہو پائے تھے جتنا کہ گھر میں زیادہ تر رہنے کے سبب سے ہونے کا امکان تھا۔ ان دنوں ہم اور ہماری بیوی کے درمیان صلح کا دور چل رہا تھا اس لئے ایک اتوار کو ہم گھر میں ہی رہ گئے۔ آدھا دن بغیر کسی خاص بات کے گزر گیا تو ہم نے چھٹی کا بہترین مصرف سونا جان کر لمبی تان لی۔ پورے دو گھنٹے کے بعد کچھ شور سے نیند کھلی تو نیم شعوری حالت میں ہم کو ایسا لگا جیسے کہیں جھگڑا ہو رہا ہے پھر ایسا لگا جیسے پڑوسی کا ریڈیو خرابی کی وجہ سے صحیح کام نہیں کر رہا مگر جب ہم پوری طرح بیدار ہوئے تو ہم کو معلوم ہوا کہ ہمارے دونوں بچے ہمارے پاس ہی دوسری چارپائی پر بیٹھے ہل ہل کر پڑھ رہے تھے۔

کا بے کبرے، کو کبر
صا بے صبرے، کو صبر

اپنے حواس خمسہ کو پوری طرح اٹنشن کرنے کے باوجود بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ بیوی کو ہماری صرف ایک ہی زبان آتی تھی (اور ایک ہی زبان ان کے لئے کافی تھی) اس لئے کسی دوسری زبان کی طرف دھیان جانا خارج از بحث تھا۔ دوسرے یہ زبان نہ فارسی لگ رہی تھی نہ عربی۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھے اور بچوں کی چارپائی پر جا کر ان کی کتابیں

جھانک کر یہ دیکھنے لگے کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ دراصل معاملہ یوں تھا۔

ق، ب تب 'ر' موقوف۔ قبر

ص، ب صب 'ر' موقوف۔ صبر

ہم کو ایک دم غصہ آگیا مگر بچوں کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو غصہ اپنی فطری جگہ یعنی بیوی تک پہنچ گیا اور ہم نے جتنی نرمی کے ساتھ دو دن پہلے یہ بیان دیا تھا کہ ہماری بیوی پڑھی لکھی سمجھ دار ہے اتنی ہی سختی سے اس کی تردید کر ڈالی اور بہانگ دہل اعلان کیا کہ وہ بدھو اور جاہل ہے۔ وہ بولیں کم اور سسکیں زیادہ اور ہم کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ عورت سسکنے لگے تو سمجھا۔ زیر چپ ہونے کی بجائے رونے لگتا ہے اس لئے ہم نے ان کو تو کچھ نہیں کہا اور حسب عادت گھر سے باہر جانے کی ٹھانی مگر چلتے وقت خیال آیا کہ بچے تو وہ ہمارے بھی اتنے ہی تھے جتنے ہماری بیوی کے اور نہ جانے کیوں ایک دم سے احساسِ ذمہ داری نے ہم کو آن دبوچا۔ اس وقت ہم شاید "اھدنا الصراط المستقیم" والی دعا کے اثر کے تحت تھے کہ ہم کو ایک اور خیال بھی آیا کہ تین چھوٹے بچوں کے ساتھ ساری گھر گرہستی کا بوجھ سنبھالنے والی ہماری بیوی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ ٹھیک سے بچوں کو پڑھا سکے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم کو اپنی بیوی بے قصور نظر آنے لگی اور ہم اپنے کو ہی دھتکارنے لگے کہ کسی دوسرے کی بیوی کے کہنے پر ہم اس کے بچوں کو پڑھانے کے لئے تو تیار رہتے ہیں مگر خود اپنے بچوں کو نہیں پڑھاتے۔

تصویر کا یہ پہلو سامنے آتے ہی ہم نے طے کر لیا کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے آپ پڑھائیں گے۔ مگر ہم کسی اسکول میں ٹیچر ہوتے تو کلاس کے بچوں کو چاہے جیسے پڑھاتے ——— یا نہ بھی پڑھاتے ——— مگر یہاں معاملہ خود اپنے بچوں کا تھا اور پھر بالواسطہ طریقہ سے بیوی صاحبہ کو بھی جتانا تھا کہ "دیکھو پڑھایا اس طرح جاتا ہے"۔ تو صاحب ہم کافی سیریس ہو گئے اور اسی شام بچوں کی نفسیات اور ہندوستانی بچوں کی پڑھائی کے طریقوں پر لکھی دو امریکی کتابیں خرید لائے۔

رات کو دیر گئے تک جاگ کر ہم نے دونوں کتابیں دھیان سے پڑھیں اور اتوار کی صبح کو بچوں کو لے کر پڑھانے بیٹھ گئے۔ ہم نے جو کتابیں اس ہفتہ میں پڑھی تھیں ان میں ایک جگہ لکھا تھا کہ پڑھتے لکھتے وقت روشنی دائیں یا بائیں طرف سے آنی چاہیئے۔ خیال آیا کہ یہی امریکی لوگ تو میز پر ٹیبل لیمپ رکھ کر کرسی پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں وہ چاہے جیسے روشنی کو ایڈجسٹ کرلیں۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ دیوار میں ٹھکے پچیس واٹ کے بلب کو پلنگ پر بیٹھے تین افراد کے لئے دائیں یا بائیں کیسے ایڈجسٹ کریں اس لئے ہم نے روشنی کے زاویہ کو امریکیوں کے لئے چھوڑ کر اپنی ہندوستانی روشنی میں ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ روشنی کو صحیح حالت میں لانا ہماری مجبوری تھی اس لئے یہ بات تو ہم نے بچوں کو نہیں بتائی ہاں بیٹھنے کے صحیح طریقے پر اور کتاب کی آنکھوں سے صحیح دوری پر (جس کے لئے باقاعدہ پیمانے کا استعمال کیا گیا تھا) کافی طویل ہدایات دے ڈالیں لیکن ان سب ہدایتوں کے باوجود تھپڑ کھانے سے پہلے ہمارے بچے ہم کو اپنا باپ ہی سمجھتے رہے یعنی کہ باپ سمجھ کر ہماری باتوں کو ٹالتے رہے۔ پہلے دن کی یہ نشست تھپڑ پر ختم ہوگئی اور ہم باہر چلے گئے۔

اگلے دن ہم نے دفتر جاتے سے پہلے آدھا گھنٹہ بچوں کو پھر پڑھایا مگر ہم جیسے استاد اور وقت صرف آدھا گھنٹہ اس سے بچوں کا کیا بننا بگڑنا تھا ہاں ہم کو دفتر پہنچنے میں دیر ضرور ہو گئی اور ہم کو اپنی اس غلطی کا احساس ہونے لگا جو ہم نے اپنے بچوں کو پڑھانا شروع کر کے کر ڈالی تھی۔ اس دن دفتر کا وہ خالی خالی وقت جو گھڑی گھڑی، گھڑی کو دیکھتے، جمائیاں لیتے اور چائے پیتے مشکل سے گزرتا تھا یہ سوچنے میں تیزی سے گزر گیا کہ امریکی اصولوں کو چھوڑ کر ہم اپنے ہندوستانی بچوں کو ہندوستان میں کیسے پڑھائیں۔ بہرحال ہم نے ایک مفصل پروگرام مرتب کر لیا اور شام کو دو دونوں کتابیں آدھے داموں بیچ کر گھر پہنچے۔!

اپنے بنائے ہوئے نئے تعلیمی پروگرام کے تحت ایک ہفتہ تک ہمارے بچے بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہم سے پڑھے یا یوں کہیئے کہ ہم نے پڑھایا (وہ پڑھے کہ نہیں پڑھے معلوم نہیں) یا پھر زیادہ صحیح لفظوں میں ہم نے پڑھا زیادہ اور انہوں نے پڑھا کم! اب آپ کو روز روز کی باتیں تفصیل سے بتا کر کیا بور کریں بس مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ طرح طرح کے تجربات ہم کو ہوئے مثلاً ہم نے ایک دن ایک بچے کو پڑھنے کو کہا ک! زبر کا ز ساکن۔ کار۔ تو انہوں نے پوچھا "پاپا کار چلتی کیسے ہے"؟ ہم نے اپنی ناواقفیت چھپانے کے لئے کہا "ابھی پڑھو۔ بڑے ہو جاؤگے تو خود پتہ لگ جائے گا" دوسرا لفظ 'کام' پڑھایا تو وہ بولے "پاپا ممی کہتی ہیں کہ تمہارے پاپا تو کچھ کام ہی نہیں کرتے سارا دن آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں" اب دوسرا بچہ بھی اس کی باتوں میں شامل ہو گیا اور اپنے گھر کی باتوں کے علاوہ محلہ بھر کے گھروں کی رپورٹنگ کرنے لگا۔ ہم نے ان کو سختی سے منع کر کے پڑھائی کی طرف متوجہ کیا۔ اس منزل پر سب سے چھوٹے صاحبزادے جو اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ "پڑھنے" کے لئے آبیٹھے تھے "پاپا بادل میلے کیوں ہوتے ہیں"؟ ہم نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ جس سوال کا جواب ہم کو کیا ہمارے ابا جان بھی نہیں دے سکتے تھے اس کا جواب دینے کی بجائے ناراضگی ظاہر کرنا بہتر تھا۔ ہمارے سخت سست کہنے سے بچوں کی پڑھائی کی رفتار دفتر کے کام کی طرح سست ہو گئی اور ہم صورتِ حال کو سدھارنے کی بجائے دفتر کو دیر ہوتے کا بہانہ کر کے گھر سے چل دیئے۔

اور ایک دن یہ ہوا کہ ہم نے ایک بچے کو لکھنے کا کام دیا اور دوسرے کو پڑھانے لگے۔ اب بیچ میں پہلے پر نظر پڑی تو اس کو کھڑکی سے باہر دیکھتے پایا۔ اس کو ٹوک کر دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے تو اب وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ دونوں کو سمجھانے کی خاطر کہا کہ کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تو ایک صاحبزادے بولے "پاپا آپ ہم کو دیکھتے رہیئے پھر ہم باہر نہیں دیکھیں گے"۔ کبھی دونوں اس بات پر لڑ پڑتے تھے کہ ایک نے دوسرے کی کتاب کیوں چھو لی اور کبھی ایک کتاب سے ہی دونوں کو پڑھنے کی خواہش جاگ اٹھتی تھی اور چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی تھی حالانکہ دونوں کے پاس ایک جیسی الگ الگ کتابیں تھیں۔ کبھی اتنی زور دار آواز میں پڑھتے کہ ہم کو اپنے کانوں کے پردوں کی فکر ہونے لگتی اور کبھی اتنے دھیرے کہ بہروں کے ذریعہ استعمال کئے جانے والے کان میں لگانے کے آلہ کی ضرورت محسوس ہونے لگتی۔ کبھی لوکل ٹرین کی رفتار سے پڑھنے لگتے تو کبھی چیونٹی بن جاتے۔ جہاں تک نشست کا سوال ہے

ہزاروں بار ہدایت دینے کے باوجود ان کی پوزیشن پرمنٹ بعد بدل جاتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے ان کے پلے کو روکنے کا مسئلہ اتنا ہی مشکل ثابت ہوا جتنا ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا!

اس طرح ایک ہفتے میں درجنوں مسائل سامنے آئے۔ کئی بار ہم نے اپنے غصّہ کو متوازن کرنے کے لئے بچوں کی پٹائی کی یا ان کی کتابیں پھاڑیں اور پھر نئی لاکر دیں، بیوی کی معنی خیز مسکراہٹ کا سامنا بھی کئی بار کرنا پڑا لیکن اب ان سے ہم کچھ کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے لہٰذا جلد ہی ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور بیوی سے بولے "پے کمیشن کی رپورٹ اور اس پر عملدر آمد میں تو ابھی بہت دقت لگے گا۔ تب تک بچوں کو پاس والے عام اسکول میں ہی بھیج دیا جائے۔ اُن کو اسکول جانے کی عادت ہی ہوجائے گی"۔ ہمارے اس فیصلہ کو اُنہوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان سے مشورہ کر رہے ہیں لہٰذا اُنہوں نے اپنے کو زمین سے کچھ اُونچا اُٹھا ہوا محسوس اور بولیں "ہاں ٹھیک ہے۔ نام لکھا دو" اور اس طرح ہم نے اپنے بچوں کو دن بھر شور مچانے، بندروں کی طرح اچھل کود کرنے اور روشنائی سے کپڑے گندے کرنے کے لئے "کچی پہلی" جماعت میں داخل کرا دیا

OO

دل ہی تو ہے — مفلس قارونی

برسوں میں دال بھات کو وہ شیرمال کھائے کیوں — میرا بدن لہو لہو وہ عطر میں نہائے کیوں
لٹیا کے سامنے مری بلڈنگ وہ بنائے کیوں — تقدیر رات دن مجھے کرتب یہ سب دکھائے کیوں
"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

بندر کی طرح رات دن بیوی مجھے نچائے کیوں — بریانی آپ کھائے کیوں، بھرتہ مجھے کھلائے کیوں
تفریح خود منائے کیوں گھر میں مجھے بٹھائے کیوں — ہنستی رہے ہے ہر گھڑی پیہم مجھے رلائے کیوں
خود سوئے لمبی تان کر تنہا مجھے جگائے کیوں

جاکر اسمبلی ہمیں وہ جانتا نہیں ہے جب — پہچان کر بھی وہ ہمیں پہچانتا نہیں ہے جب
جائز مطالبات بھی وہ مانتا نہیں ہے جب — قیمت ہمارے ووٹ کی پہچانتا نہیں ہے جب
مانگنے بھیک ووٹ کی گاؤں ہمارے آئے کیوں

سب کو پتہ ہے سیٹھ وہ مکھی کی کھال کھائے ہے — اپنے لیے حرام کو کہہ کر حلال کھائے ہے
لیا کسی کو کھائے ہے یا پھر اُبال کھائے ہے — جو کچھ بھی آئے سامنے بے قیل و قال کھائے ہے
سوچو مگر وہ مولوی چندے کا مال کھائے کیوں

بھینگی ہوئی تو کیا ہوا باپ اس کا ساہوکار ہے — بزنس ہے جس کا شہر میں لاکھوں کا کاروبار ہے
برسوں ہوئے کنوارپن اک اس کے سر پہ بار ہے — مجھ کو ملازمت اسے شوہر کا انتظار ہے
جا کر تو اس کے در پہ پھر قسمت نہ آزمائے کیوں

وہ جو ہے اک وزیر کا سالا ہمارا یار ہے — پولیس کا جو ہے افسر اعلیٰ ہمارا یار ہے
وہ جس کا ہے شراب کا اڈہ ہمارا یار ہے — اس شہر کا ہر اک بڑا دادا ہمارا یار ہے
شامت کوئی بلائے کیوں ہم سے کوئی کھجائے کیوں

دھندہ بلیک جس کا ہے کھوٹا ہی جس کا کام ہے — حاصل اسے سماج میں اعزاز کا مقام ہے
ہر بزم اس کا ذکر ہے ہر لب پہ اس کا نام ہے — منسوب اس کے نام سے ہر صبح اور شام ہے
مجھ جیسے فاقہ مست کو پھر کوئی منہ لگائے کیوں

آٹا ہے اور نہ تیل ہے چاول ہے اور نہ دال ہے — بیوی کا عذاب جاں ہے تو ہر بچہ اک وبال ہے
میں جانتا ہوں خرچ سے تو کس قدر نڈھال ہے — لیکن اے میرے ہم نشیں تجھ سے بس اک سوال ہے
ہر سال اپنے گھر کی پھر آبادی تو بڑھائے کیوں

مہنگائی کا ہمارے سر جنجال ہے تو کیا ہوا پتلا ہمارا قرض ہے جو حال ہے تو کیا ہوا
گوشت نہ ہو تو کیا ہوا بس دال ہے تو کیا ہوا مفلس کچھ اور اندھی کنگال ہے تو کیا ہوا
آجائے اس کے گھر تو پھر مہمان جلد جائے کیوں

بے قابو ہو کے دل بھلا کیسے مچل نہ جائے پھر تلوار اک نگاہ کی کیوں اس پہ چل نہ جائے پھر
نیت ہماری کس طرح آخر بدل نہ جائے پھر دامن ضبط ہاتھ سے کیوں کر نکل نہ جائے پھر
خود کو بنا سنوار کر وہ گیلری میں آئے کیوں

دعوت کسی کے گھر تجھے مل جائے ہے تو ڈٹ کے کھا اُٹھ کر لپک لپک کے کھا دوڑ کے کھا جھپٹ کے کھا
کچھ آگے آگے بڑھ کے کھا کچھ پیچھے پیچھے ہٹ کے کھا آندھی کی طرح ٹوٹ کر طوفاں کی طرح پھٹ کے کھا
ایسا سنہرا چانس اگر مل جائے تو گنوائے کیوں

جی تیرا بھوک پیاس سے گھبرائے ہے تو شعر کہہ غم تجھ کو میرے ہم نشین تڑپائے ہے تو شعر کہہ
تنہائی میں کوئی تجھے یاد آئے ہے تو شعر کہہ اپنے کیے پہ تو اگر پچھتائے ہے تو شعر کہہ
" روتا ہے زار زار کیا کرتا ہے ہائے ہائے کیوں"

سر پہ مرے سوار ہیں چھ سالے سات سالیاں سن سن کے جن کو ہنستی ہیں اکثر محلے والیاں
دُرگت پہ میری خود مگر بیگم بھی کھلکھلائے کیوں
OO

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (رائچور)

خواب ہم کو دکھائے جاتے ہیں خوب احمق بنائے جاتے ہیں
ہر برس اک نیا بجٹ لا کر اپنی راشی بڑھائے جاتے ہیں
وہ تو سنتے نہیں عوام کی بات صرف اپنی سنائے جاتے ہیں
ہل قلم کے ہیں، کھیت کاغذ کے یوں بھی غلے اُگائے جاتے ہیں
اُن کے وعدوں کی کوئی قیمت ہے آئے دن جو بھلائے جاتے ہیں
رہبروں کا جو جیب بھرتے ہیں ان کو پرمٹ دلائے جاتے ہیں
بن سکے کچھ نہیں جو اے بزمی
ہاں وہ لیڈر بنائے جاتے ہیں

محمد برہان حسین (حیدرآباد)

"نئے دور کے دورے"

آج کل شرفو میاں پر بات بات پر فلمی اشعار پڑھنے اور گنگنانے کا دورہ پڑا ہوا تھا اور یار دوستوں کو ایک نیا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ چنانچہ اُس وقت بھی شرفو میاں نے جیسے ہی ایک واقعہ سنایا جو یونہی سا تھا۔ ناگ بھوشنم نے ماتھر کو اشارہ کیا اور ماتھر نے فوراً اپنی آنکھوں سے دستی لگا کر آنسو خشک کرنے کی اداکاری کی اور شرفو میاں نے فوراً شعر داغ دیا

جو ہم نے داستاں اپنی سنائی آپ کیوں روئے

دوستوں نے اُن سے بارہا کہا بھی کہ فلمی اشعار پڑھنا بدذوقی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور پھر ویسے بھی عامیانہ اشعار نہیں پڑھنے چاہئیں۔ اسی شہر حیدرآباد کی ہی بات ہے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کوئی نصف صدی اُدھر لوگ جان دیتے تھے لیکن عامیانہ شعر پر داد نہیں ملتی تھی۔

دوسرے بیاپ کے عثمانین غفور حسین صدیقی مرحوم فرماتے تھے کہ حیدرآباد میں ایک مشاعرہ میں "گور غریباں" کے شاعر طباطبائی مسندِ صدارت پر تشریف رکھتے تھے۔ ایک شاعر کو کافی داد مل رہی تھی اور وہ بار بار جوش میں جنابِ صدر کی طرف دیکھتا جاتا تھا لیکن جناب صدر خاموش بیٹھے تھے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے دیکھا شاعر نے راست جنابِ صدر کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اس شعر کی داد اُن سے چاہتا ہے۔ شعر پڑھا، لوگوں نے مشاعرہ سر پر اٹھا لیا لیکن طباطبائی بُت بنے بیٹھے ہی رہے۔ تکلفاً بھی داد نہیں دی۔

یوں تو شرفو میاں بھی کوئی بدذوق انسان نہیں تھے۔ اور وہ خود کو بڑے اعلیٰ درجہ کی چیز تصور کرتے تھے اگر کسی محفل میں کوئی صاحب جوش میں آکر کہتے بھئی! اس معاملہ میں ذمہ دار اور تعلیم یافتہ شہریوں کو آگے کھڑا ہونا چاہیے تو شرفو میاں عملاً کرسی سے کود کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن پر اس قسم کے دورے پڑتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے انہوں نے دیکھا تھا کہ ایک عرب مصافحہ کرتے ہاتھ چوم رہا ہے اور اُن پر فوراً اس کا دورہ پڑ گیا تھا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ انھیں جہاں کوئی جان پہچان کی صورت نظر آتی وہ دوڑ کر آتے ہاتھ لیتے، مصافحہ پر مجبور کرتے اور

پھر جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیتے۔ ان کی اس حرکت پر ماسٹر نے پیش گوئی کر دی تھی کہ اُن کے اس دورہ کا خاتمہ بھی ضرور کسی حادثہ پر ہی ہوگا!

ماسٹر کم بخت غضب کا غیب داں تھا اور دوستوں کا خیال تھا کہ ماسٹر کی اچھی پیش گوئیاں تو شاذ ہی درست نکلتی تھیں لیکن اگر وہ کسی کی تباہی، بربادی، حادثہ وغیرہ کی پیش گوئی کر دے تو وہ ہمیشہ صحیح نکلتی تھی۔ چونکہ بقول نذیر دہقانی۔

جس کو ٹوکا وہ پھر نہیں پنپا ٭ بڑی کالی زبان ہے پیارے

شرفو میاں کا ڈھلتے شباب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ آنکھیں جواب دے رہی تھیں، چشمہ لگاتے تھے جس میں نزدیک کی چیزیں دیکھنے کے شیشے نیچے لگے تھے اور دور کی بصارت کے لئے اوپر۔ لیکن چونکہ عمر نے دماغ پر بھی اثر ڈالا تھا اس لئے وہ اکثر بھول کر اوپر کے شیشوں سے پڑھنے کی کوشش کرتے اور سر کو اس قدر نیچے جھکا دیتے جیسے یوگا کر رہے ہوں اور دور دیکھنے کے لئے سر کو اس قدر نیچے جھکا دیتے جیسے ناک میں دوا ڈلوا رہے ہوں۔

اگر اُن کی بیوی کہتی "ارے آپ سر کو اس قدر جھکا کیوں رہے ہیں کہیں اوپر کے شیشوں سے تو نہیں پڑھ رہے ہیں؟" تو وہ بپھر کر کہتے "واہ! گویا میں تمہارے بے ہودہ بھائی کی طرح سٹھیایا ہوا نظر آتا ہوں کہ عینک لگا کر اس میں سے غلط دیکھوں گا؟"

بیوی کہتی "لو۔ ارے بھائی صاحب، خدا اُن کی جوانی کو سلامت رکھے عینک استعمال کرتے ہی نہیں۔ تو وہ اوپر یا نیچے کیا جانیں"۔

شرفو میاں کہتے "میرا مطلب ہے کہ اگر وہ عینک استعمال کرتے تو اپنی بے وقوفی سے ایسا ہی کرتے"۔

بیوی کہتی "دیکھئے! میری بات مانئے۔ آج کل لوگوں کو انگڑائی لینے سے بھی اسپنڈی لائٹس ہوا جا رہا ہے۔ اگر آپ اسی طرح سر کو جھکاتے رہیں گے تو الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا کہیں آپ کی گردن کا "منکا" نہ ٹوٹ جائے"۔

شرفو میاں کا خیال تھا کہ عورت سے ہارنا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن ہار مان لینا بری بات ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی بقاء کے لئے مرد کا خود کو عورت سے عقل مند سمجھنا ضروری ہے چاہے وہ نکما ہی کیوں نہ ہو۔

بیوی کہتی "جدید طب میں یہ تو بڑی خرابی ہے کہ وہ صرف علامات کا علاج کرتی ہے آنکھوں سے نظر کم آئے تو عینک چڑھا دی۔ کان سن نہیں پاتے تو آلہ لگا دیا۔ یہ نہیں غور کرتے کہ اِن کے ساتھ ساتھ دماغ بھی بوڑھا ہو جاتا ہے"۔

شرفو میاں نے تڑپ کر کہا "محترمہ! بڑھاپے میں دماغ ہی نہیں بیوی بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ جدید طب اس کا بھی خیال نہیں کرتی۔ اور نہ آپ کے ذہن میں یہ بات آسکی ــــ!

مصافحہ کر کے ہاتھ چومنے کا سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک واقعہ ہو گیا۔

شرفو میاں دعوت میں مدعو تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اُن کا بچپن اور جوانی کا دوست قلیان چیمپئن رحمت اللہ جو بلی کے دیدے والا کہلاتا تھا۔ ان کے بازو سے نکل کر آگے جا رہا تھا۔ وہ دوڑے اور اُن کے سامنے آگئے اور تپاک سے ڈانٹ کر ... کیا اور ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور جھک کر چوم لیا۔ اس کے بعد ایک زور دار تھپڑ ان کے منہ پر پڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ہتھ...

"اسٹیریو" قسم کا تھا چونکہ پڑا تھا ایک کان پر لیکن دوسرا کان بھی متاثر ہوا تھا. وہ گر پڑے لوگ جمع ہوگئے۔ کسی نے کہا ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ورنہ یہ اتنے بے ہودہ انسان نہیں ہیں"

ایک گرجدار آواز آئی "جی نہیں۔ میں اس سڑک چھاپ فرہاد کو پولیس کے حوالے کر دوں گا آپ نے اس شخص کو مدعو ہی کیوں کیا تھا؟"

کسی منچلے نے کہا "پولس میں دینے سے فائدہ نہیں وہ پہلے ہی ضمانت پر رہا ہیں" شرفو میاں نے نحیف آواز میں کہا "حضرات! کیا وہ میرا دوست رحمت اللہ نہیں تھا، لوگوں نے کہا کہ وہ تو ایک معزز گھرانے کی لڑکی تھی جو جینس پتلون اور بوشرٹ پہنے بال کٹائے ہوئے تھی اور کراٹے کی ماہر تھی۔ اور یہ خصوصیات آج کل معزز گھرانے کی لڑکیوں ہی میں ملتی ہیں۔

اس واقعہ کے بعد شرفو میاں نے ہاتھ چومنا تو کجا مصافحہ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ احتیاط کا یہ حال ہوگیا کہ ہم دوستوں سے ملتے تو بھی پہلے پوچھ لیتے "بھئی! تم میرے دوست ماتھری ہونا؟" اور احتیاطاً دونوں کانوں پر اس طرح ہاتھ رکھ لیتے جیسے اذاں دے رہے ہوں"

اس کے بعد سے فلمی اشعار گنگناتے رہنے کا دورہ اُن پر حال ہی میں پڑا تھا۔ اس پر بھی دوستوں نے انھیں خبردار کیا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں خصوصیت سے اُن جیسے بال بچوں والے شخص کے لئے مناسب نہیں۔ ہماری سوسائٹی گندہ سے گندہ گانا ٹی وی اور ریڈیو پر برداشت کرلیتی ہے لیکن اگر آپ اپنے گھر میں ذرا آواز اُونچی کر کے اگر یہ گنگنائیں ع

تیری دنیا میں دل لگتا نہیں۔ واپس بلالے، مجھ کو اے مالک اٹھا لے تو لوگ یعنی پڑوسی الزام لگائیں گے کہ آپ اُن کی لڑکی، بیوی یا بہو کے لئے

آجا رے، آجا رے، میرے دلبر آجا
من کی پیاس بجھا جا رے۔ آجا رے

گا رہے تھے۔

ویسے اگر ریڈیو پر یہ گانا بج رہا ہو۔

میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند سا ٹکڑا رہتا ہے
افسوس کہ وہ ہم سے کچھ اکھڑا اکھڑا رہتا ہے

اور آپ بالکونی میں کھڑے ہو کر سامنے کی کھڑکی کو گھورنے لگیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

ہم دوستوں کا یہ خیال تھا کہ شرفو میاں کی ان حرکات کی وجہ سے پولیس سے نمٹنے ہمیشہ تیار رہتے تھے کہ اگر وہ پکڑے جائیں تو اعلیٰ عہدہ داروں کی خوشامد کریں، جان پہچان نکالیں رشوت دینے روپیہ تیار رکھیں۔ حتیٰ کہ اخبار میں پولیس عہدہ داروں کے تقررات کی خبریں پولیس اسٹیشنوں کے ناموں کے ساتھ شائع ہوتی تھیں تو ہم اُسے کاٹ کر کیلنڈر کے بازو چسپاں کر رکھتے تھے تاکہ وہ جس پولیس اسٹیشن پر لے جائے جائیں وہاں کے عہدہ داروں

کے نام سے ہیں واقفیت رہے۔

شرفو میاں پر دورہ کی شدت تھی اور وہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، دفتر میں بازار میں ہر جگہ فلمی اشعار پڑھے جاتے تھے ..... کھانے بیٹھتے تو کہتے۔

دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام

بیوی پانی پیتی تو کہتے۔

پیتے ہوئے غریبوں کا لہو شام سویرے
خود باپ کرو نام ہو شیطان کا بد نام۔ انسان ہو۔

ایکدن انھیں ایک فلمی شعر، نسوانی تحریر میں ڈرائنگ روم میں پڑا ہوا ملا ؎

میرے سرتاج میری نیند اڑانے والے
میرے محبوب میری روح پہ چھانے والے

شرفو میاں نے غور نہیں کیا کہ کس نے لکھا کیوں لکھا اور کس کے لئے لکھا فوراً جواب میں زور زور سے گنگنانے لگے ؎

اس دنیا میں اے دل والو، دل کا لگانا کھیل نہیں
اُلفت کرنا کھیل ہے لیکن، کر کے نبھانا کھیل نہیں

دوسرے دن پھر ایک پرزہ پر یہ شعر لکھا ہوا ملا ؎

تم ہمارے ہو نہ ہو، ہم کو تمہارا ہی آسرا

شرفو میاں نے دیکھا اور پھڑک اُٹھے ؎

ڈرنہ محبت کر لے، ڈرنا محبت کر لے
الفت سے جھولی بھر لے۔ دنیا ہے چار دن کی جی لے چاہے مر لے

اب کی تحریر جو ملی بڑی خطرناک تھی ؎

اے دل تو کہیں لے چل، لے چل، لے چل
اس درد کی دنیا سے ہاں اور کہیں لے چل لے چل

شرفو میاں آئیڈیہ پر پھڑک اٹھے اور گنگنایا ؎

جلنے والوں سے دُور
کہیں دور کہیں دور کہیں دور

پھر کہا ؎

جب دیپ جلے آنا، جب شام ڈھلے آنا۔

اس پر یہ تحریر تھی ؎

آپ بُلائیں ، ہم نہ آئیں
ایسے تو حالات نہیں

آخر اس دورے کی انتہائی حادثہ یہ ہوئی ہی تھی تو وہ اس طرح ہوا کہ ایک شام ان کے برخوردار پڑوس کی لڑکی کے ساتھ گلے میں پھول مالائیں ڈالے کھڑے ہیں۔

لڑکے نے کہا "ڈیڈی! ہم دونوں نے شادی کرلی ہے"

شرفو میاں بولے " ارے نالائق! مجھے بتایا بھی نہیں اور شادی کرلی"

لڑکے نے کہا "ڈیڈی! یہ شادی دراصل آپ ہی نے کروائی ہے۔ میں تو دوبئی میں تھا۔ اس لڑکی نے مجھے جتنی چھٹیاں یعنی "لولیٹرس" لکھے آپ نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اس لڑکی کا دل میرے لئے جیت لیا۔ اور آپ نے آخری گانے ـــــ رو کے زمانہ چاہے روکے خدائی تجھے آنا پڑے گا۔

آپ نے بھاگ جانے کا آئیڈیا دیا تھا سو یہ بھاگ کر میرے ساتھ آگئی ہے۔ شرفو میاں بہت تلملائے لیکن کر کیا سکتے تھے۔ اُن کا گھر، ٹھاٹ باٹ، سب کچھ اسی لڑکے کے روپے سے بنا تھا۔ اب اس آرام اور شان کی زندگی چھوڑ کر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اٹھ کر دونوں کو گلے لگا کر مبارکباد دی اور آخری بار یہ غیر فلمی مصرعہ پڑھا ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے!

ظفر کمالی
(پٹنہ)

کیا ہے کام تو نے واقعی بیٹے شجاعت کا

کبھی جس قوم کو تھا فخر دنیا کی امامت کا
لبادہ اوڑھے بیٹھی ہے وہ مدت سے جہالت کا

اگر عزت ہے پیاری بھیگی بلی بن کے رہنا ہے
یہی ہے آج کل معیار سن لیجے شرافت کا

چرایا ہے مجھے بھی شوق نثری نظم کہنے کا
گلا گھونٹوں گا میں بھی اب فصاحت کا بلاغت کا

کلب میں روز جائیں ڈانس کر لے اہلیہ ان کی
نشاں کوئی نہیں شوہر کے چہرے پر ندامت کا

بہو اور ساس کے جھگڑے میں اپنی ماں کو مارا ہے
کیا ہے کام تو نے واقعی بیٹے شجاعت کا

نمازیں چھوڑ دینے سے ہوا یہ فائدہ مجھ کو
نہ پروا ہے طہارت کی نہ کھٹکا ہے نجاست کا

اخوت کا سبق دیتے وہی آئے ہیں خود جن کے
بھڑکتا ہے دلوں میں شعلہ نفرت کا عداوت کا

جو چاہیں حضرتِ کاتب تو رحمت کو کریں زحمت
نرالا ہے عجب یارو یہ پیشہ بھی کتابت کا

سنا ہے یاد تھا دادا کو میرے کلمۂ طیب
کروں میں کیوں نہ سینہ ٹھونک کر دعویٰ شرافت کا

بڑی مشکل سے نکلے تین گھنٹے فلم بینی کو
کہاں سے دس منٹ بھی وقت اب لاؤں تلاوت کا

کھلائی تھی کبھی اک باسی روٹی بھوکے سائل کو
ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہوں میں تب سے سخاوت کا

سکونِ دل کی خواہش ہے تو آ مذہب کی چھاؤں میں
رہے گا کب تلک ہاتھوں میں یہ پرچم بغاوت کا

اگر ہو ذہن ہی بیمار قوموں کا تو پھر ان پر
اثر کچھ ہو نہیں سکتا کبھی لعنت ملامت کا

یہی ہے غلغلہ اس دم سخن فہموں کی محفل میں
ظفر نے نام روشن کر دیا طنز و ظرافت کا

○

انور رشید
(حیدرآباد)

غزل

قیمہ چھٹانک اُن سے جو کھانا پڑا مجھے
بدلے میں ایک دُنبہ کھلانا پڑا مجھے

مرغی جو ایک پال کے رکھی تھی شوق سے
تھا کرفیو تو کاٹ کے کھانا پڑا مجھے

افسر نہ بن سکا تو میں منشی ہی بن گیا
سسرے کا حکم مانتے ہی بن پڑا مجھے

غصے میں کہہ دیا کہ یتیمی برستی ہے
چھوٹو میاں کو ابا بنانا پڑا مجھے

کی میزبانی اُن کی تو دھندہ بنا لیا
بیگن کا روز بھرتا بنانا پڑا مجھے

ہر جلسہ و جلوس میں مرنا ہے سوچ کر
چندہ ملے گا بیوی کو جانا پڑا مجھے

شستہ مزاح پر نہ ہنسے جب بھی سامعین
ہنس ہنس کے بھانڈ پن کو ہنسانا پڑا مجھے

مرگی کا دورہ پڑ گیا محفل میں یک بیک
کیا خوب تڑپ کے داد یہ لینا پڑا مجھے

مختار یونس (مالیگاؤں)

ستاروں کا پوسٹ مارٹم

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

آنکھوں میں دُھول جھونکنے والے، دھوکے باز بازی گر ہم نے بہت دیکھے ہیں۔ میدان سیاست میں لیڈر کی دغا بازیاں روزانہ اخبار کی زینت بنتی ہیں میدانِ انصاف میں وکیل اور ایڈوکیٹ کالا کوٹ اور سفید پتلون میں بازی گری کرتے ہیں۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کی فیس میں مؤکل کو نیلام کر ڈالتے ہیں۔ عدالت کی پیشی کی تاریخ اتنی مرتبہ پڑتی ہے کہ مدعی اپنا جغرافیہ اور مدعا علیہ اپنی شہریت بھول جاتا ہے۔ میدان صحت میں حکیم ڈاکٹر بھی شعبدہ باز ہیں۔ وہ مریضوں کی جیب کا آپریشن پہلے کرتے ہیں۔ مریض کا علاج بعد میں کرتے ہیں۔ یہ مریض کی تشخیص خود نہیں کر سکتے اس لئے اسٹیتھسکوپ سے دل کی دھڑکنوں کو گنتے ہیں۔ ایکس رے سے پسلیوں کا احوال پوچھتے ہیں۔ کارڈیوگرام سے قلب کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے ہیں۔ یا پھر مریض سے انٹرویو لیتے ہیں۔ "ہاں آپ کو کیا شکایت ہے؟" اطباء و وید گشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں یا معجونوں میں مریض کو پیس ڈالتے ہیں اور مریض کو آپریشن و انجکشن سے اتنا ڈراتے ہیں کہ وہ وقت سے پہلے ملک عدم کا ویزا بنا لیتا ہے۔ میدان معیشت میں صنعت کار اور بیوپاریوں کی دھوکہ بازی بھی کم نہیں ہے۔ گندم نما جو فروشی کی کہاوت تجارت کا اصول و (TRADE DOLICY) ہے۔ صنعت کار کم لاگت پر معمول سیل پہ دلکشی حاصل کرتا ہے۔ پانچ پیسے میں تیار شدہ مال کی اشتہار بازی پر وہ پانچ ہزار سے زیادہ خرچ کرتا ہے وہ دیوالی دسہرہ عید اور کرسمس چھوٹ کا لالچ دیکر اپنا سڑا ہوا مال دھڑلے سے بیچتا ہے۔ بجٹ کی دہائی دے کر اشیاء کے دام بام پر پہنچاتا ہے۔ ناپ تول میں ایمانداری کا دعویٰ کرتا ہے اور ملاوٹ کو ہنر سمجھتا ہے۔ مصنوعی قلت اور شارٹیج کے نام پر بلیک مارکیٹ کو فروغ دیتا ہے۔ ان کا بس چلے تو دھوکہ دہی کا بجائے دھوکے کے دری بیچ ڈالیں۔

ہاں تو صاحبان! ہم کواکب کی بازی گری پہ کچھ عرض کر رہے تھے۔ بعض اردو داں حضرات کواکب کا مطلب نہیں

جانتے ایسے لوگ لوٹ زمانیں۔ جب کوکب صاحبان جمع ہوتے ہیں تو انھیں کواکب کہا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں کواکب یعنی ستاروں کی اسمبلی و پارلمنٹ اختر شیرانی کے زمانے میں جب سلمائیں اپنے دو بیٹوں میں سفید و زرد ڈھکیاں ٹانکتی تھیں تو انہیں سلمٰی ستارے کہا جاتا تھا۔ اب یہ آؤٹ آف فیشن نہیں آؤٹ آف نیشن (OUT OF NATION) قرار پاچکی ہیں۔ اسی طرح جب چولہے اور لکڑیاں مرحوم نہیں ہوئے تھے تب جلتے ہوئے توے کی سیاہ ٹیک پشت پر سُرخ ستاروں کے جھرمٹ نظر آتے تھے بعض لوگوں کا قیاس ہے کارل مارکس کا سرخ ستارہ اسی سرخ جھرمٹ کا شہاب ثاقب ہے جو سرخ سویرے کی علامت ہے۔

آج کل جھونپڑیاں ہر بڑے شہر میں باسانی دستیاب ہیں۔ ہر جھونپڑے کی چھت آسمان کا درجہ رکھتی ہے کبھی کسی جھونپڑی میں داخل لیجئے (آپ کو ڈونیشن نہیں دینا پڑے گا) جھونپڑی کی اندرونی چھت کا مشاہدہ کیجئے آپ کو بے شمار سوراخوں سے ستارے جھانکتے نظر آئیں گے۔ اب تو کرنسی نوٹ اتنے خستہ اور درماندہ ہوچکے ہیں کہ ایک اور دو کے نوٹ آسمان کی طرف اٹھائیے آپ کو اتّا دکا ستاروں کے درشن ضرور ہوجائیں گے۔

قارئین! یہ سب معنوی سیارے نہیں بلکہ مصنوعی ستارے ہیں۔ ہم اب آپ کو خالص ستاروں کی طرف لے چلتے ہیں۔ اب ہم قدرتی ستاروں کی دھوکہ بازی دیکھیں گے۔ آسمان کے یہ باسی — جی ہاں یہ بے حد باسی ہوچکے ہیں لیکن ان کی چمک دمک پھر بھی تروتازہ ہے۔ یہ آسمان کے پہریدار ہیں۔ (دواج میں عموماً رات میں ہی اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں) جب شیاطین کرام آسمان کے خفیہ رازوں کی جاسوسی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ستارے انھیں مار بھگاتے ہیں گویا ہر ستارہ میں لاحول ولاقوۃ چھپا ہوا ہے پونم کی رات میں چاند کے سامنے یہ ستارے نہیں ٹک پاتے ہیں حالانکہ یہ ستارے ہمارے سورج سے بھی کئی گنا بڑے ہیں مگر اماوس کی رات میں ہر ستارہ مسکراتا ہوا یہ بی نظر آتا ہے۔ سائنس دانوں کی نظر میں یہ ستارے سورج کے باپ ہیں۔ جب چاند ہمارا ماما ہوسکتا ہے تو یہ ستارے بھی ہمارے خالو اور پھوپھا کہلانے کے مستحق ہیں ماہرین فلکیات سے سمجھے ہے کہ یہ ستارے بڑے غیور اور خود دار ہیں روشنی کے لئے کسی سیارے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے بلکہ ان کی تجوری میں اتنا نور بھرا ہے کہ چاند اور سیاروں کو دان پُن کرتے ہیں۔ ہمارا سورج بھی ستارہ ہے، (سائنٹفک افواہ) دنیا بھر کو لائٹ سپلائی کرتا ہے مگر بجلی کا بل نہیں بھیجتا۔ ہماری جدید تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اس نورانی سخاوت میں بھی دھوکہ بازی ہے۔ آئیے آپ کو راز کی بات بتائیں۔ یہ ستارے دراصل سیاروں میں تاک جھانک کرتے ہیں۔ یہ دیکھنے کو کہ کہاں سے مکہ میں کس کے خلاف کھچڑی پک رہی ہے۔

قارئین! ستاروں کی چال سے بچئے۔ یہ ہم نہیں نجومی کہتا ہے۔ کچھ جیوتشی حضرات کہتے ہیں کہ تمام انسان ستاروں کی مٹھی میں بند ہیں۔ مگر کچھ کے یہ تقریبًا نہیں ماننے کرتے کہ ہر انسان کی مٹھی میں نظر بند ہیں۔ وہ ہتھیلی کی لکیروں کی گہرائی میں روپوش ہیں۔ انسان کی تقدیر سنوارنے اور بگاڑنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ بلکہ غیر ملکی ہاتھ ہے۔

کتنی عجیب بات ہے زہرہ مریخ زحل اور مشتری وغیرہ ڈبل رول ادا کرتے ہیں۔ یہ علم نجوم میں ستارے اور سائنس

میں سیارے بن جاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کس کو دھوکہ دیتے ہیں۔ منجم حضرات کو یا سائنس والوں کو ہو سکتا ہے دونوں کو فریب دے رہے ہوں۔ علم نجوم کے ستارے عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہیں۔ یہ شادی بیاہ کی تاریخ مقرر کرتے ہیں دکان اور مکان کے ادگھاٹن کا شبھ دن طے کرتے ہیں سیاست داں ستاروں کی چال دیکھ کر الیکشن کی تاریخ فکس (fix) کرتا ہے فلم کا مہورت ہو یا فلم کی ریلیز ہر جگہ ستاروں کا آشیرواد ضروری ہے۔

قارئین! اب آیئے فلمی ستاروں کی طرف۔ یہ آسمانِ فلم کے درخشاں ہیں۔ یہ میک اپ روم کی تیز روشنی میں چمکتے ہیں یہ بھی بازی گر ہیں بلکہ جادوگر ہیں۔ دھوکہ دہی چیٹنگ، چوری، ڈکیتی، قتل و خون، مار دھاڑ یہ بھی کرتے ہیں مگر اسکرین پہ۔ یہ فلموں کے ذریعے پبلک کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مکالمے اتنے جاندار ہوتے ہیں کہ بچہ بچہ گھر گھر میں دہراتا ہے اور داہ واہ پاتا ہے۔ ان فلمی ستاروں کے فانس اتنے گرم ہوتے ہیں کہ سردی و زکام بھاگ جاتے ہیں ان کے گیت اتنے اصلاحی ہوتے ہیں کہ والدین بچوں کے ساتھ فلمیں دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ فلم اسٹار جتنے دبلے پتلے ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اکیلا ہیرو اپنے کومل ہاتھوں اور نازک پاؤں سے پہلوانوں کی چھٹی کر دیتا ہے اگر یہ فوج میں بھرتی ہو جائیں تو سرکار کو ایٹمی اسلحہ خریدنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ روس وامریکہ ہمارے فلمی ستاروں کی خدمات مول لیا کریں گے ہمارا عالمی وقار بڑھ جائے گا۔

مگر بھائیو! جب فلم اسٹاروں کی شہرت ماند پڑتی ہے۔ مقبولیت دھندلا جاتی ہے تو یہ جیتے جی مر جاتے ہیں اگر گمنامی کی حالت میں مر جائیں تو کفن کے لئے کپڑا نہیں ملتا اور دفن کے لئے کاندھا نہیں ملتا۔

سُنا ہے مرنے کے بعد بھی برزخ اسٹوڈیو میں شوٹنگ کرتے ہیں جہاں ملٹی اسٹار فلم بن رہی ہے جو قیامت کے روز دوزخ میں ریلیز ہو گی۔

لقب عمران (اچلپوری)

غزل

ہوتا نہیں ہے پیدا میاں کی لیگار میں
دلچسپی لے رہی ہے وہ اک ساہوکار میں

منظور رشتہ کیوں نہیں کرتا تمہارا باپ
کس چیز کی کمی ہے صنم خاکسار میں

تم لو پورے شہر کا کرو سروے مرے حضور
مجھ جیسا نوجواں نہیں پچپن ہزار میں

ان کی زباں سے نشر جو ہو وہ ہے موسیقی
محسوس ہو رہے ہیں مجھے شرڈکار میں

تم جیسا موٹو مل نہیں ہو سکتا ایڈجسٹ
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

خدمت میں ان کی کہہ سکے جا کر پیامِ شوق
اتنی صلاحیت بھی نہیں راز دار میں

اپنی طرف بُلاتے ہیں وہ شوق سے مجھے
کانٹے بچھا دیئے گئے جب رہگزار میں

مجھ کو دیارِ غیر کا کرنا پڑا ہے رُخ
"دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"

حالانکہ اب ہیں ساٹھ کے پیٹے میں ہوں جناب
حسرت ہے اب بھی ان کی دلِ بے قرار میں

اک مہ جبیں سے شادی ہوئی میری بن جہیز
جیسے نمک نہ ڈالا گیا ہو اچار میں

اس کو خدا کا لطف کہوں یا عذاب میں
مجھ کو ملی بھی لفٹ تو دشمن کی کار میں

فرصت نہیں کہ سیر کروں کوئے یار کی
مصروف اس قدر ہوں میں اب کاروبار میں

بیگم کا مشورہ تھا کہ لو مرسڈیز مگر
میں نے پلاٹ لے لیا اسی ہزار میں

القصہ بمبئی میں بھی قربت نہیں نصیب
میں چرچ گیٹ میں ہوں تو محبوبہ کھار میں

آئے ہیں سو مریض مطب میں الٰہی خیر
سب کا علاج کیسے کروں اک انار میں

ساری فضا پہ آج تو چھایا ہوا ہوں میں
فنکار مجھ سا کون ہے قرب و جوار میں

خدمت کا نام بھول کے لیتا نہیں کوئی
دلچسپی سب کو ہے یہاں بس اقتدار میں

اُٹھ بیٹھ کر رہا ہوں میں کمرے میں ہائے ہائے
سوچا تھا میں نے ہوگا مزہ انتظار میں

آتے ہی وہ حسین یہ کہہ کر چلا گیا
رہنا نہیں پسند دلِ داغدار میں

ڈیلی نہ ویکلی نہ کوئی منتھلی یہاں
اُردو ہے خود کے بل پہ سلامت برار میں

مہنگائی ہے کہ قہرِ الٰہی ہے اے لقب
دو بیگھہ کھیت ملتا ہے پچپن ہزار میں

سرسوتی سرن کیف (چنڈی گڑھ)

تشکیلِ انجمنِ (بے) ادبی بدستِ ادیب

حضرت ادیب جھانسوی پھر میرے کیبن میں آگئے۔

یوں تو حضرت ادیب کی کہیں بھی آمد تعجب کی بات نہیں ہوتی، مصیبت ہی کی بات ہوتی ہے۔ تعجب اس لئے ہوا تھا کہ تین ...پہلے ہی انہیں تحقیق سے متعلق جعلسازی پر نیر انصاری کی گالیاں اور میری ڈانٹ ڈپٹ سننے کو ملی تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں ...ب جھانسوی کی تشریف آوری کو مستقل طور سے نہیں روک سکتیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس واقعے کا اثر اتنی جلدی ڈھل جائے گا۔ خیر میں نے ...بالامکان بددلی سے ان کا استقبال کیا۔ ان کے سلام کا جواب دے کر خاموشی سے ایک فائل دیکھنے لگا۔

ادیب صاحب بولے "اب تو غصہ تھوک دیجئے حضور۔ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ کان پکڑتا ہوں کہ اب ...."

میں نے کہا "دیکھئے ادیب صاحب، میں کچھ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ مجھے آپ پر بالکل اعتماد نہیں رہا ہے۔ آپ کے وعدوں کا اور ...کی توبہ کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی کوئی تخلیق لائے ہیں تو اسے واپس لے جائیے۔ مجھے دیں گے تو میں بغیر دیکھے اسے پھاڑ ...ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں گا۔"

ادیب صاحب ہنس کر بولے "جنابِ عالی، میں کوئی تخلیق نہیں لایا۔ بلکہ یہ بھی کہہ دوں کہ جب تک آپ خود طلب نہیں کریں گے ...کی خدمت میں کچھ نہیں دوں گا۔"

تعجب تو پہلے بھی تھا لیکن ان کی اس بات نے دماغ کے اشتعال کو تقریباً ختم کر دیا اور استعجاب بھر دیا۔ میں نے کہا۔ "پھر کیا ...ت تفریح کے لئے تشریف لائے ہیں جناب؟"

"نہیں جناب تفریح کے لئے نہیں، ایک بہت اہم کام میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس ...ر میں ادبی انجمنیں تو بہت ہیں لیکن ایسی ایک بھی انجمن نہیں ہے جو خالص مزاحیہ ادب پیش کرے۔ ہر جگہ وہی دردِ دل اور آہ وزاری ...باتیں ہیں جنہیں ادب سمجھا جاتا ہے۔ اجی صاحب، میں کہتا ہوں کہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدبختی ہمارا یہی رونے بسورنے والا ...ب ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو ہنسنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جو جوان ہر وقت آئیں بھرے گا وہ وطن کی خدمت کیا کرے گا۔ ہنسنے والے ...ل ہی میدانِ جنگ میں جوہر دکھا سکتے ہیں اور وہی کھیتوں اور کارخانوں میں پیداوار بڑھا سکتے ہیں۔"

مجھے اور تعجب ہوا۔ ادیب صاحب یہ سیاسی اور سماجی نعرے بازی کہاں سے سیکھ آئے ؟ اور ان کے دل میں وطن کا درد کس روز سے پیدا ہوگیا۔ میں نے سہولت سے صرف یہ کہا "تو کیا آپ کا خیال ہے کہ سارے سنجیدہ ادب کو دریا برد کر دینا چاہیئے "؟

"نہیں نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں تو صرف مزاحیہ ادب کی اہمیت بتا رہا تھا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ شہر میں جو بھی ادبی انجمنیں ہیں ان سے مجھے کوئی نفرت نہیں ہے . . . . "

"لیکن انہیں آپ سے نفرت ہے " میں نے دل ہی دل میں کہا۔

ادیب صاحب نے بات جاری رکھی : "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک انجمن خالص مزاح نگاروں کی ہو اور وہ ہو بھی..."

"تو میں کیا کروں ؟ میں تو کوئی مزاح نگار نہیں ہوں "

"اجی صاحب آپ کا کوئی ادبی تحریک کہاں چھوڑ سکتی ہے ؟ ہونے کو تو آپ شاعر بھی نہیں ہیں لیکن کوئی مشاعرہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں آپ کو مدعو نہ کیا جائے "؟ ادیب صاحب بولے

میں سوچنے لگا کہ خدا کی قدرت بے حد و حساب ہے۔ کون اُمید کر سکتا تھا کہ ادیب جیسا احمق ایسا برجستہ اور منہ توڑ جواب دے گا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا فرمائیے، میرے لئے کیا حکم ہے؟ "

"اگلے اتوار کو نواب ذوالفقار حسین کی کوٹھی پر ایک میٹنگ ہے جس میں بزمِ ضاحک کی تشکیل کی جائے گی۔ اس میں اس کا آئین بھی پاس ہوگا اور غالباً انتخابات بھی ہو جائیں گے۔ باقاعدہ عہدیداروں کا چناؤ نہ ہوا تو بھی ایک عارضی کمیٹی بنا دی جائے گی اور اس کا کنوینر چن لیا جائے گا۔"

میرا تعجب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نواب ذوالفقار حسین، ادیب جہانسوی اور ان کی فطرت سے ناواقف نہیں ہیں۔ پرانے تعلقہ دار خاندان کے فرد ہیں، شہر کے کامیاب وکیلوں میں سے ہیں۔ انہیں یہ کیا سوجھا ؟ میں نے کہا۔ "نواب صاحب بھی اس میں تعاون کر رہے ہیں ؟ "

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے " ادیب صاحب تپاک سے بولے "آپ ابھی انھیں ٹیلیفون کر کے پوچھ لیجئے۔"

اشتیاق مجھے بھی بہت تھا اور میں نے ٹیلیفون اُٹھایا بھی لیکن دفتر کے ایکسچینج آپریٹر نے کہا کہ باہر کی چاروں لائنیں خراب ہیں۔ خیر، میں نے ادیب سے کہا " دیکھئے، اُن کے گھر میٹنگ ہے تو میں پوچھ کر ہی جاؤں گا۔ فون مل جائے تو . . . . "

"آپ فوراً ان سے بات کریں۔ وہ آپ کو مفصل بات بتائیں گے " ادیب صاحب بولے "اچھا، اب مجھے اجازت ہو۔"

ٹیلی فون کی لائنیں شاید ادیب صاحب کی روانگی کا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ انہیں گئے ہوئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اُٹھایا تو آپریٹر کی آواز آئی "لائنیں مل گئی ہیں۔ آپ کس سے بات کرنا چاہتے تھے ؟"

میں نے آپریٹر کو نواب ذوالفقار حسین کا نمبر دے دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ آج کل کچھ علیل ہیں اور عدالت نہیں جاتے۔ نواب صاحب سے بیس پچیس منٹ تک ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ تین ہفتے سے ادیب جہانسوی انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ شروع میں دو چار مرتبہ نواب صاحب پریشان ہوئے بلکہ ایک مرتبہ تو اتنے پریشان ہوئے کہ ڈانٹ ڈپٹ

ـنھیں بھگا دیا اور ان کے جانے کے بعد ملازم کو حکم دے دیا کہ آئندہ یہ آئیں تو پالتو آلسیشن جوڑے میں سے کتے کی زنجیر
ـ دی جائے۔ لیکن دو ایک روز بعد انھیں خود اپنے برتاؤ پر پچھتاوا ہوا۔ ان کے خاندان میں کسی نے کاشتکاروں پر بھی سختی نہیں
ـی۔ بذلہ سنجی کی بات الگ ہے ورنہ انہوں نے خود کسی کی کبھی دل آزاری نہیں کی تھی۔ کتے کی زنجیر کھولنے کا حکم واپس لے
ـیا اور ادیب صاحب جو اس خطرے سے ناواقف رہے تھے حسبِ دستور بے شرمی سے آتے جاتے رہے۔ ادھر ایک مہینے سے
ـواب صاحب کو بتا رہے تھے کہ اس شہر میں دو ہی مزاح شناس ہیں، ایک وہ خود اور دوسرے نواب صاحب۔ چنانچہ ان کے
ـ کے مطابق ضروری تھا کہ بزمِ ضاحک کی تنظیم کی جائے اور ایک سہ ماہی مزاحیہ رسالہ نکالا جائے۔ ادیب صاحب کی تجویز تھی کہ
ـن کے صدر نواب صاحب ہوں اور سکریٹری وہ خود۔ اسی طرح رسالے کے مالک نواب صاحب ہوں اور ایڈیٹر وہ خود۔
میں نے کہا۔ "نواب صاحب، مانا کہ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے لیکن روپے کی بربادی کیا ضروری ہے؟"
نواب صاحب واقعی دھوکے میں تھے۔ کہنے لگے "آدمی عجیب سا تو ضرور ہے لیکن مخلص ہے، شائد چلا ہی لے جائے"
ـنے انھیں تنبیہہ کی اور مختصر میں بتایا کہ کلکتے کے ایک صاحبِ تحقیق کے ساتھ انہوں نے کیسی جعل سازی کی تھی اور کس طرح
ـکے سر ایک جعلی مخطوطہ منڈھ دیا تھا۔ اب نواب صاحب نے مجھ پر زور دیا کہ میں اتوار کی میٹنگ میں ضرور آؤں۔ میٹنگ کا
ـ شام کو چار بجے رکھا گیا تھا اور ادیب کے غالباً ڈھائی بجے آ جانے کی امید تھی۔ (نواب صاحب کا باورچی خانہ دن میں بند
ـہیں ہوتا تھا۔ ادیب صاحب کو ان کا ہم طعام ہونے کی ہمت تو کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن دو ایک مرتبہ انہوں نے دو ڈھائی
ـآکر باورچی خانے کے کھلے رہنے کا فائدہ اٹھایا تھا) لہذا نواب صاحب نے مجھے بارہ بجے ہی بلا لیا اور کہا کہ کھانا میرے
ـہ کھاؤ کیونکہ صلاح مشورے کے بعد بھی ہم لوگوں کو تیسرے پہر دو گھنٹے تک آرام کرنے کا بھی موقع مل جائے گا۔ میں نے
ـر کر لیا۔

نواب صاحب نے مجھے اتنا صلاح دینے کے لئے نہیں بلایا تھا جتنا اپنی تجویز کو سمجھانے اور مناسب ڈھنگ سے اس
تعاون کرنے کے لئے بلایا تھا۔ ادیب صاحب نے مجھے بلانے کو تو نواب صاحب سے کہا تھا لیکن گوپی ناتھ نظرؔ، فکرؔ بنارسی
ـرکھپوری اور نیر انصاری کو دعوت دینے کی مخالفت کی تھی۔ نواب صاحب بھی نیر صاحب کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے لیکن
ـں نے کہا کہ نظرؔ سے میری تیس برس کی دوستی ہے، اس سے پوچھے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا۔ میرے کہنے سے انہوں نے یہ بھی
ـر کر لیا کہ ٹیلیفون پر نظرؔ سے بات کر لیں اور یہ بھی مان لیا کہ فکرؔ کو دعوت نامہ بھیج دیا جائے کیونکہ انھیں بھی حضرت ادیب سے
ـنا آتا ہے۔

اتوار کو نواب صاحب کے گھر پہنچا تو کھانے پر نواب صاحب بولے "تجویز تو میں بعد میں بتاؤں گا، یہاں ملازموں کے
ـنے بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی صرف ایک بات کہتا ہوں کیونکہ شاید بعد میں بھول جاؤں۔ میں نے کچھ نوجوانوں کو بھی
ـہے۔ ان کی طرف آپ بالکل دھیان نہ دیں چاہے ان میں آپ کا کوئی واقف بلکہ آپ کا بیٹا یا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔"
عجیب سی بات تھی لیکن میں سمجھ گیا کہ ان تین دنوں میں نواب صاحب نے کچھ کیا ہے۔ خیر، ان کی یہ تجویز مان لینے

میں کوئی برائی بھی نہ تھی۔ نوجوانوں سے بات نہ کی تو کیا بگڑ جائے گا میرا ؟ کھانے کے بعد سونے کے کمرے میں اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹ کر ہم لوگوں نے نواب صاحب کی تجویز پر غور کیا۔ میں نے دو ایک ترمیمیں پیش کیں جنھیں نواب صاحب نے منظور کر لیا۔

ادیب صاحب ڈھائی بجے نہیں آئے، ساڑھے تین بجے آئے۔ آج انھیں کسی قسم کا ہلکا پن ظاہر نہیں کرنا تھا۔ انجمن کے سکریٹری اور رسالے کے ایڈیٹر کو جگہ جگہ مانگ کر کھانا تو نہیں چاہیئے۔ کپڑے بھی آج غیر معمولی طور پر صاف پہنے تھے۔ نواب صاحب کے لمبے چوڑے ڈرائنگ روم سے صوفے ہٹا کر زمین پر قالین بچھا دیے گئے تھے۔ لیکن لوگ آنے شروع ہوئے تو ادیب کو کچھ تعجب ہوا۔ نظر کے ساتھ نکر آ گئے تھے۔ ان نوجوانوں میں ایک کو دیکھ کر ادیب صاحب بھی چونکے اور میں بھی۔ یہ تھے جناب فرید نظامی یعنی خاکسار کے فرزند عالی گہر۔ میں تو وعدے کے مطابق خاموش رہا ہی، ادیب بھی کیا کہتے ؟ میٹنگ جناب گوپی ناتھ نظر کی صدارت میں شروع ہوئی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھ سے ٹیلیفون پر بات ہونے کے بعد نواب صاحب نے اپنے صاحب زادے کے توسط سے فرید کو بلا بھیجا تھا اور اس سے مفصل بات کر لی تھی۔ نواب زادے خود میٹنگ میں شامل نہ ہوئے، بغل کے کمرے میں پردے کے پیچھے سے کارروائی کا جائزہ لیتے رہے۔ نوجوانوں کی رہنمائی فرید صاحب کر رہے تھے بلکہ تین چوتھائی حد تک کر بھی چکے تھے۔

ادیب صاحب نے میٹنگ کے مقصد سے حاضرین کو آگاہ کیا اور کہا "اب آپ لوگوں کے سامنے انجمن کے آئین کا مسودہ پیش کیا جائے گا آپ لوگ اس پر رائے زنی کریں۔"

فرید میاں نے پہلا گولہ داغا "میں صاحب صدر سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کارروائی غیر آئینی ہے۔ یہ پہلا عام اجلاس ہے اس میں پہلے تو عام مقاصد پر حاضرین کا اتفاق ہونا چاہیئے، پھر ایک آئینی کمیٹی بننی چاہیئے اور اس کا کنوینر مقرر ہونا چاہیئے وہ کمیٹی آئین کا مسودہ بنا لے تو ممبروں کے عام اجلاس میں وہ مسودہ پاس کیا جائے۔"

ادیب صاحب نے بے چارگی سے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب ہی کے کہنے پر وہ کسی انجمن کا آئین اٹھا لائے تھے اور نام کی تبدیلی کے ساتھ اسے پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت نواب صاحب بولے "نوجوان کا اعتراض درست ہے۔"

ادیب نے پھر حاضر دماغی سے کام لیا۔ بولے "اچھا، انجمن کے قیام کے لئے کمیٹی بنا لی جائے گی۔ آپ لوگوں کی دوسری تجویز یعنی رسالے کے متعلق کیا خیال ہے ؟ آپ لوگوں کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ رسالے کے ابتدائی اخراجات نواب صاحب نے اٹھانے کا وعدہ فرمایا ہے۔"

"خیال اچھا ہے" فرید کا ایک معاون بولا "لیکن اس کا ایڈیٹر کون ہوگا ؟ شہر میں تو کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا۔ باہر سے کسی کو بلانا پڑے گا۔"

نظر صاحب نے فرمایا "ادیب جعفری اس کام کو نہیں کر سکتے ؟"

"رسالہ مزاح کے لئے ہوگا یا پھل فروشی کے لئے ؟ ادیب صاحب تو مکمل طور پر پھل فروش ہیں۔" ایک اور نوجوان بولا۔

ادیب کا رنگ فق ہوگیا۔ ان کی ساری چالیں اُلٹی پڑ رہی تھیں۔ مجبوری میں عمر رسیدہ ادبا کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ فکر صاحب بولے "صاحبزادے، میں آپ سے متفق نہیں ہوں ۔۔۔۔۔"

ادیب کو ڈھارس بندھا لیکن اُسی وقت ٹوٹ گیا۔ فکرؔ کی بات اس طرح پوری ہوئی "ادیب کی تصانیف میں پانچواں حصہ تو مہمل نہیں ہوتا۔"

"تو انہیں ایڈیٹر بنا یا پنچ بنا دیا جائے۔" کسی نے تجویز پیش کی۔ یہ میٹنگ اب زعفران زار بن چکی تھی۔ نواب صاحب اور نظر صاحب مسکرا رہے تھے، باقی لوگ کھل کر ہنس رہے تھے، ادیب رونے رونے کو ہو رہے تھے۔

آخر ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ چیخ کر کہنے لگے "آپ لوگوں کو کس احمق نے بلایا ہے۔ نکل جائیے یہاں سے ..."

اب ایک لمبا چوڑا نوجوان اٹھا۔ ادیب صاحب کی بانہہ مضبوطی سے پکڑ کر بولا "یہ تمہارے باپ کا گھر ہے کیا؟ ہمیں نواب صاحب نے بلایا ہے، جنھیں تم احمق کہہ رہے ہو۔ تمہیں کس نے بلایا ہے؟"

نواب صاحب سہولت سے بولے "ادیب صاحب، آپ کو اس طرح طیش میں نہیں آنا چاہیئے۔ یہ سب نوجوان مزاحیہ ادب میں دلچسپی ہی نہیں رکھتے مزاح نگاری کرتے بھی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تصنیفات ابھی تک ایک آدھ ہی چھپی ہیں۔ لیکن میں نے خود ان کے مسودے دیکھے ہیں۔"

"خاک دیکھے ہیں آپ نے" ادیب صاحب بے لگام ہو گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ نواب صاحب نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔

نظر صاحب نے صدر کی حیثیت سے کہا۔ "ادیب صاحب، آپ اپنی زبان پر قابو رکھیں۔ آپ برابر نواب صاحب کی توہین کئے جا رہے ہیں۔"

"توہین میری نہیں ہو رہی ہے؟ اس وقت تو آپ ۔۔۔۔" ادیب صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"ابے مردود، تیری عزت ہی کیا ہے جو تیری توہین ہو؟" پہلوان نما طالب علم بولا۔

"دیکھئے صدر صاحب، اس بدتمیز کو ۔۔۔۔"

ادیب صاحب کی بات پوری نہ ہو سکی۔ پہلوان طالب علم نے ادیب کا مختصر سا جسد اٹھایا، اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا اور سڑک پر لے جا کر جو دھکا دیا تو ادیب صاحب آدھے نالی کے اندر اور آدھے باہر۔

ادھر نواب صاحب بولے "بزم ضاحک تو ختم ہو گئی۔ اب بزم سخن شروع ہونی چاہیئے۔ میاں فرید! اپنی پوٹلی کی غزل سناؤ۔"

رؤف رحیم (حیدرآباد)

شعر، شاعر اور مشاعرہ

گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف جاتا ہے اور انسان کی قضا پکارتی ہے تو وہ شاعری کے میدان کی طرف سنا تھا کہ شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے لیکن آج کل تو شاعر بننے لگے ہیں اور کوڑی میں تین تین کے حساب سے مل بھی جا ہیں ہر گلی کوچے میں ایک دو شاعر بہ آسانی مل جائیں گے چاہے اُن میں شاعر کم متشاعر زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔ خوش ق سمجھئے کہ شومیٔ قسمت ہم شاعر کے گھر پیدا ہوئے اور ہماری گھٹی اور خون میں شاعری سرائیت ہے ہمیں پیدائشی یا مورو شاعر بھی کہا جا سکتا ہے جس طرح "فلمی دنیا" میں نامور اداکاروں کے لڑکوں نے جگہ بنالی ہے اُسی طرح "قلمی دنیا" میں شعراء کے لڑکے اور لڑکیوں کے شاعر ہونے کا رواج جاری ہے: بچپن سے کانوں میں شعر فلمی گانوں کی طرح گھل گئے شاعری کو شروع میں ہم مفلسی کی علامت سمجھتے رہے اور کوشش کی کہ اُس سے دور ہی رہیں لیکن شاعری کے ہاتھ بھی کے ہاتھوں کی طرح لانبے ہوتے ہیں اور ہم اس کے شکنجے سے کوشش کے باوجود نہیں نکل سکے!

مشاعروں میں شرکت کے لئے بہت سی شرائط ہوتی ہیں جن میں گروپ بندی، توڑ جوڑ، تعلقات، چاپلو ترنم اور کبھی کبھی کلام کی پختگی۔ چوں کہ ہم نے ایک شاعر کے گھر جنم لیا جو صرف آخری دو شرائط کے علاوہ کسی بھی پر پورے نہیں اترتے تھے اور وہی دو صفات ہم میں بھی آگئی ہیں جب میدانِ شعر و ادب میں قدم رکھنا تھا تو حا سے سمجھوتہ ضروری ہو گیا!

ہماری آنکھوں کے سامنے دوسرے شعراء مشعلِ راہ بنے جو اپنی مندرجہ بالا خصوصیات کے باعث مشہو معروف ہو گئے تھے ان خصوصیات کے علاوہ جد و جہد بھی لازمی شرط ہے جو جد و جہدِ آزادی سے کم نہیں ہم ایک شاعر سے اچھی طرح واقف ہیں جو ایک ہی رات میں عنبر پیٹ اور مولا علی کے مشاعرے اپنی سیکل پر جا کر سناتے تھے داد اور ہوٹنگ میں فرق نہ سمجھ کر اپنے ہونٹوں سے ترنم سے بار بار سماعت پر چھا جاتے موصوف اپنے ساتھ کچھ حواریوں لے کر آتے تاکہ کم از کم اُن سے داد مل سکے لیکن بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی اصحاب انھیں ہوٹنگ کے

ڈالیں سے ہٹا چکے ہیں اُن کی آمد کے بغیر کسی مشاعرہ کا آغاز تقریباً ناممکن ہے ہر میدان میں گروپ بندی ہوگئی ہے سیاست میں تو پارٹیوں کا ٹکراؤ فطری ہے لیکن شعر و ادب میں گروپ بندی نہ صرف فنکاروں کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ زبان کی بقاء اور ترقی کے لئے خطرہ بھی۔ ہم اُن کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور مشاعروں کی اطلاع کے لئے اخبار کا مطالعہ بغور کرنے لگے۔ ہمیں یاد ہے "ضرورت ہے" کا اشتہار ہم اپنے دورِ بیروزگاری میں اسی طرح تلاش کیا کرتے تھے اور "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہار بھی ہمارے لئے بصیرت افروز ہوا کرتے تھے جہاں کہیں بیروزگار گریجویٹ کی روزگار یا رشتہ کے لئے ضرورت ہوتی ہم بہ عجلتِ ممکنہ درخواست روانہ کر دیتے۔ اسی طرح جب کبھی جہاں کہیں مشاعرے کے انعقاد کی اطلاع دیکھتے تو برسات گرمی سردی کی پرواہ کئے بغیر مقامِ مشاعرہ پہنچ جاتے مشاعرے میں موقع کی تلاش کرتے اور کسی کے ذریعے اپنے نام کی چٹھی داعیٔ مشاعرہ تک پہنچا دیتے (یہ گُر بھی ہم نے موصوف ہی سے سیکھا تھا) شریکِ مشاعرہ ہو جاتے۔ آج کل مشاعروں میں سامعین کی تعداد کم ہوگئی ہے اور شعراء کی زیادہ۔ اس لئے کلام پر داد خوب مل جایا کرتی ہے ہر شاعر یہ چاہتا ہے کہ داد اس ہاتھ دیں اُس ہاتھ لیں۔ شہرت کی اس بھاگ دوڑ میں ہمیں اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہم بغیر ڈائٹنگ کے دُبلے ہوگئے شاعر ہونے کی اولین شرط یہی تو ہے۔ ؎

لیڈر کی یہ پہچان کہ وہ پھولتا جائے
شاعر کی یہ پہچان کہ موٹا نہیں ہوتا

دوسری جانب نقصان یہ ہوا کہ جو بھی ہمیں دیکھتا ہم سے کتراتا کہ کہیں ہم انھیں اپنی غزلیں سُنانا شروع نہ کر دیں۔ ہم نے فوری شہرت حاصل کرنے کے لئے اپنے دماغ پر زور دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سنجیدہ شاعری میں مقابلہ بہت کڑا ہے اس لئے مزاحیہ شاعری میں کچھ عرصہ میں ہمارا نام جانا پہچانا ہوگیا۔ ٹی وی، ریڈیو اور مشاعروں میں بُلائے جانے لگے لیکن ہمارے اندر کا شاعر (جو بے حد سنجیدہ ہے) حصار توڑ کر باہر آگیا۔ ہمارا سنجیدہ کلام بھی موقر ماہناموں میں چھپنے لگا اور اُسی شوق سے پڑھا اور سنا جانے لگا تو بڑے مشاعرے کے شعراء کے پیٹ میں تکلیف ہونے لگی اور سازشوں کا طوفان اُمڈ پڑا ویسے تو ہم بھی بڑے مشاعروں کی شرائط پر پوری طرح نہ اُتر پائے اور اُمید ہے کہ تادمِ آخر بھی نہ اُتر پائیں گے ہمیں پتہ نہیں گروپ بندی کس کھیت کی مولی ہے اور توڑ جوڑ کس چڑیا کا نام ہے طبیعت میں انکساری ضرور ہے لیکن چاپلوسی کی حد تک نہیں بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے چاپلوسی یا جی حضوری ضروری ہے ہمارے استادِ محترم نے اس کی تعلیم ہی نہیں دی۔

جب سے ہمیں مشاعروں میں پسند کیا جانے لگا اور رسالوں میں چھپی غزلوں کی پسندیدگی کے خطوط ہمارے گھر آنے لگے ہیں تو ہماری شاعری ہماری خاتونِ خانہ کے لئے سوتن بن گئی وہ ہماری شہرت سے جلتی ہیں اور گھبراتی ہیں کہ ہم کسی کے منظورِ نظر نہ بن جائیں اور کوئی ہمارا منظورِ نظر نہ ہو وہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ ہم شاعری سے دور اور اُن سے قریب رہیں لیکن غزل کے حسنِ غیر مرئی میں جو جاذبیت ہے وہ ان میں کہاں؟ ہم انھیں اس خوش فہمی میں رکھتے ہیں

آپ ہی ہماری جانِ غزل ہیں اور تغزل کا ہر شعر آپ پر لکھا گیا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ شاعری بہت مشکل صنف ہے لیکن ہم نے جب سے مشاعروں میں شریک ہونا شروع کیا تو یہ صنف بے حد آسان لگنے لگی۔ شاعر ہمہ اقسام کے ہوتے ہیں ایک وہ جو خود شاعر ہوتا ہے دوسرا وہ جو کسی استاد سے کلام لکھا کر ترنم سے پڑھ لیتا ہے کچھ شاعر غیر مطبوعہ کلام اور پرانے پرچوں سے کلام حاصل کر کے مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں اسی طرح شاعری کی بھی کچھ قسمیں ہیں کلاسیکی اور ترقی پسند شاعری جس میں فکر و فن پر زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے جو کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق ہوتی ہے دوسری شاعری کو آزاد شاعری کا نام دیا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ کچھ جملوں کو وزنِ عروضی کے تحت مختلف سطروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جس کے لئے ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ہے۔ نہ فکر و فن کی ضرورت نہ قافیہ ردیف کی پابندی۔ تیسری قسم تو نثری نظم کی ہے جس میں وزنِ عروضی بھی معاف ہوا کرتا ہے اس سے زیادہ تو نثر مقفیٰ و مسجع میں زیادہ کد و کاوش کرنی پڑتی ہے جو سامعین کے لئے دلکش بھی ہوا کرتی ہے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک شاعر ڈائس پر کھڑے کچھ فرما رہے تھے اور کچھ دیر مائک کے سامنے کھڑے رہ کر لوٹ گئے تالیوں کی بوچھار ہوئی ہم ابھی تک یہ سمجھ نہ پائے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں ہم نے تو انھیں پہلے مقرر سمجھا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے آزاد نظم سنائی تھی اور سامعین نے بغیر سوچے سمجھے تالیاں اس لئے بجائیں کہ باذوق بیٹھے افراد انھیں جاہل تصور نہ کریں جیسا کہ غالب فہمی کے سلسلے میں ہر ایرا غیرا نتھو خیرا خود کو اتھارٹی سمجھتا ہے تاکہ اپنی جہالت کا بھرم کھلنے نہ پائے۔

ایک اور شاعر کے ایک شعر پر "مکرر، مکرر" کی آوازیں آتی رہیں جب کئی مرتبہ شعر دہرانے کے بعد شاعر نے دریافت کیا کہ آخر وہ اس شعر کو اتنا کیوں پسند فرماتے ہیں تو کسی نے آواز دی "آپ دہراتے رہیئے یہاں تک کہ آپ اس شعر کو صحیح نہ پڑھ لیں" وہ شرمندہ ہو کر ڈائس پر بیٹھ گئے شاعری سے ایک بہت بڑا فائدہ قوتِ برداشت میں اضافہ ہے شاعر ہوٹنگ یعنی بے عزتی کو بہ آسانی ہضم کر جاتا ہے اور کسی انسان میں جب یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ترقی کی راہوں پہ بے جھجک چل پڑتا ہے!

مشاعروں میں کلاسیکی شاعری کے علاوہ جدید شاعری سے بھی ہم روشناس ہوئے ہم "فیروز اللغات" لے کر نئے الفاظ کی تلاش میں بیٹھ گئے چوں کہ کلاسیکی شاعری ہمارے ذہن پر چمگادڑ کی طرح چپک گئی ہے کہ الفاظ کی طوطا مینا اڑانا ہمارے بس کی بات نہ تھی ہمیں مرغ کی چونچ میں سورج رکھنا اور زمین سے چاند اگانا ابھی تک نہیں آیا ہمیں ایسے تخم بیش بہا کی تلاش ہے جس کے ذریعہ سورج، چاند تارے زمین سے اگیں اور ہم اپنی محبوبہ کو تو ڑ کر دے سکیں کیوں کہ ہم نے دعدہ کیا تھا کہ اس کی مانگ ستاروں سے بھردیں گے چاند تارے آسمان سے توڑ کر لانے میں اخراجات بہت ہیں اور ہم راکٹ بنا کر پیچھے تک ڈھیر ایٹم بم کے دھماکے یا قیامت کے بے رحم ہاتھ چاند تاروں کو ملیامیٹ نہ کر دیں الحکومت ہماری تنہائی خواہش کے لئے اتنے اخراجات برداشت کرنے پر تیار نہ ہوگی۔

بڑے مشاعرے میں شرکت کا مسئلہ آج کل بچوں کو مشن اسکول میں داخلہ دلانے یا سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے برابر ہے۔ مدرسہ میں داخلے کے لئے سفارش اور عطیات کی ضرورت ہوتی ہے مشاعرہ بھی سفارش اور عطیات کے ذریعہ پڑھا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ذریعہ اہم شخصیت کا حامل ہو اور خصوصاً سماجی و سیاسی مرتبہ رکھتا ہوں عطیہ کی صورت یہ ہے کہ داد کیلئے چند حواریوں کو خرید جائے اور ممکنہ حد تک داعی مشاعرہ کی آؤ بھگت کیجئے اگر مشاعرہ تجارتی ہو تو ٹکٹوں کی فروختگی کی ذمہ داری لی جائے۔

مشاعرہ پڑھنے کے لئے کسی نہ کسی پلیٹ فارم کی بھی ضرورت ہوتی ہے یہاں پلیٹ فارم سے میری مراد کسی انجمن سے وابستگی ہے جو صرف مشاعروں کے انعقاد میں دلچسپی رکھتی ہو۔ ہم نے بھی ایک انجمن کا دامن پکڑا اور مشاعرے کے انعقاد کی تیاریاں شروع کردیں۔ جب صدر مشاعرہ کے انتخاب کی باری آئی تو ہم نے مشہور شاعر کا نام تجویز کیا لیکن ہمارے ساتھیوں نے ہمیں رائے دی کہ یہ غلطی کبھی نہ کریں کسی شاعر کو صدارت دیں تو دوسرا شاعر اُن کی صدارت میں مشاعرہ نہیں پڑھے گا کیوں کہ کوئی بھی شاعر اپنے آپ کو کمتر نہیں سمجھتا اور دوسرے یہ کہ ادبی شخصیتوں کی بجائے کسی سیاسی شخصیت کو صدر بنائیں تو اُسے بھی پلیٹ فارم مل جائے گا اور اخبارات کے فوٹوگرافرس بھی مفت آجائیں گے اور صدر مشاعرہ انجمن کو مستحکم بنانے مالی امداد کا اعلان کریں گے اردو دوستی کے گن گائیں گے چاہے دل میں کچھ ہی کیوں نہ ہو! ؎

کون آج مخلص ہے اس زبان کا یارو
منہ پہ کچھ ہے لوگوں کے دل میں اور ٹھانی ہے

ہم نے اُن کی رائے کو مقدم سمجھا اور مہمانانِ خصوصی کے لئے بھی سماجی و سیاسی اہمیت کے حامل اصحاب کو مدعو کیا اب ہمارے گھر سفارشی خطوط کا تانتا بندھ گیا مفت میں لوگ ہماری تعریفوں کے بلا لحاظ اپنی وجہ ترسیل بیان فرمانے لگے۔

حکومت اکیڈیمیوں کے قیام سے شعراء ادبا کو فیض پہنچانا چاہتی ہے لیکن ہمارے ہاں اکیڈیمی کے قیام کے ساتھ ہی اُس کے انہدام کی سازش شروع ہو جاتی ہے جس کی وجہ شعراء کو امداد تو نہیں ملتی بلکہ اُن کے داخل کردہ سودے ردّی میں کوڑیوں کے مول بک جاتے ہیں سیکولرزم کو چلانے کے لئے اُن غیر اردو داں کا انتخاب کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے جو اردو سے زیادہ اپنے عہدے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس حال میں شعر شاعر اور مشاعروں کا خدا ہی حافظ ہے!

OO

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

"ہم مہمانِ خصوصی بنے"

مہمانِ خصوصی عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو موٹی سی رقم دے کر یعنی چندہ دے کر مہمانِ خصوصی بن بیٹھتے ہیں۔ یعنی خود ساختہ مہمانِ خصوصی۔ دوسرے وہ جنہیں پروگرام کے سلسلے میں درج ذیل سرکاری انتظامات کی سہولت کی خاطر یا دلِ نخواستہ مہمانِ خصوصی بنا دیا جاتا ہے۔

(۱) جلسگاہ میں جھاڑو لگوا کر گرد و غبار اُڑا نے پھر اسے پھلا بٹھانے کے لئے پانی کے چھڑکاؤ کا انتظام۔

(۲) کسی سرکاری پنڈال کی غیر سرکاری حصولیابی۔

(۳) کرائے کے سامعین کو ٹرکوں اور ٹریکٹروں میں بھر کر جلسہ گاہ تک پہنچانا۔ (جلسے کے اختتام کے بعد ٹرکوں اور ٹریکٹروں کو ان سے بچانا) ـ

(۴) پروگرام کے دوران ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے اور بوقتِ ضرورت یعنی استقبالیہ تقریب میں کسر رہ جانے پر جلسگاہ میں بھگدڑ مچانے کی غرض سے لاٹھی چارج کرنے اور آنسو گیس چھوڑنے کے لئے پولیس کا بندوبست۔

یہ حُسن اتفاق ہے یا عشقِ اتفاق کہ اس پروگرام کے مہمانانِ خصوصی کا ہر دو قسم کے مہمانانِ خصوصی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے اور خوشی کی بھی۔ حیرت کی اس لئے کہ یہ آج کے چلن (Trend) سے ہٹ کر ہے، خوشی کی اس لئے کہ چندے کی رقم یا سیاسی پوزیشن کی بجائے خلوصِ دل کو معیارِ انتخاب بنایا گیا۔ خود میرا بھی یہی معاملہ ہے میں نے اس پروگرام کے سلسلے میں کوئی چندہ نہیں دیا۔ (بلکہ مجھے تو اُمید بلکہ یقین ہے کہ اس پروگرام کے آرگنائزر خود ۵۰۰، پچاس روپے خود مجھے بطور نذرانہ پیش کریں گے اور میں اس رقم کو بغیر کسی تکلف کے قبول کر لوں گا کیونکہ جیسے مہمانِ خصوصی کی روزی روٹی اسی طرح چلتی ہے) اور نہ میں کوئی سرکاری آدمی ہوں کہ مہمانِ خصوصی بننے کے لئے یہی بات Special - Qualification - ٹھہرتی۔

جب مجھے مہمانِ خصوصی بننے کی دعوت دی گئی تو میں نے کہا "یار غضب کرتے ہو۔ اپنے ہی شہر میں، اپنے ہی لوگوں کے بیچ مہمان یعنی بیگانہ بنانے پر تُلے ہوئے ہو، آخر تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

ورنہ یہ بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مہمانِ خصوصی دراصل Chief Guest کا ترجمہ ہے اور روایتاً ایسا کہا جاتا ہے۔"

"اچھا چلو، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن جب شہر میں کئی Certified مہمانانِ خصوصی موجود ہیں تو مجھ گوشہ نشین کو کیوں مدعو کر رہے ہو۔ کسی اور کو . . . .

میری بات کاٹ کر بولے "وہ تو کر چکا"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"میں نصف درجن کے قریب کو Already مہانانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کر چکا ہوں۔"

"پھر مجھے کیوں تکلیف دے رہے ہو۔"

"چھ کا عدد اچھا نہیں لگتا"

"تو پہلے سوچنا چاہیئے تھا، پانچ بھی ہو سکتے تھے۔"

"ہونے کو تو ایک بھی ہو سکتا تھا۔"

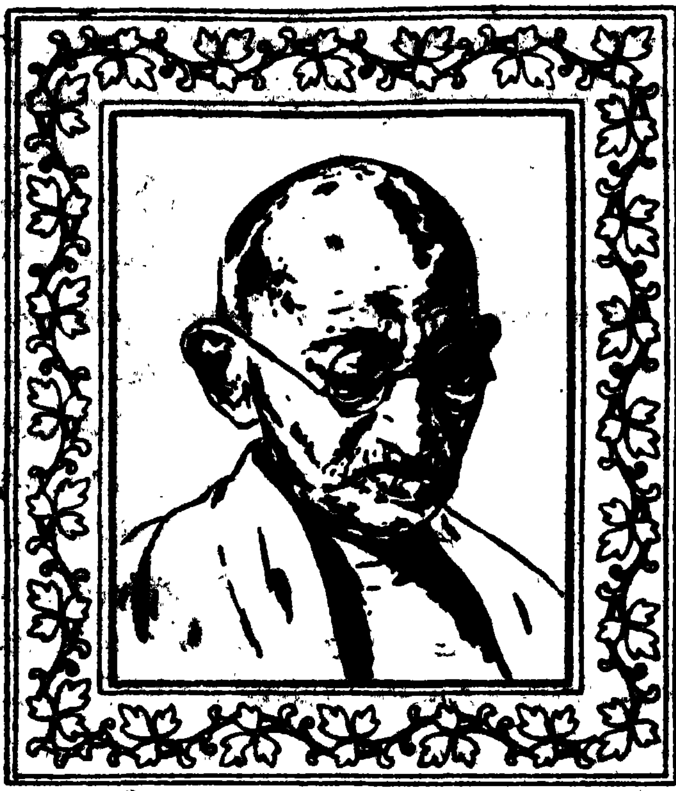
"تو ہونے دیتے، پھر تو کیا سے چھ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

"کام کرنے سے پہلے سوچنے کی عادت ہوتی تو یہ گڑ بڑ ہی کیوں ہوتی۔"

میں بظاہر بے پروائی سے گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن حقیقتاً مہمانِ خصوصی بننے کے بارے میں غور کر رہا تھا اور مہمان کے ساتھ لگی ہوئی خصوصی کی دُم میرے دل میں گدگدی پیدا کرنے لگی تھی اس لئے آخر کار میں نے یہ کہہ کر کہ "ٹھیک ہے مصیبت کے وقت میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے" مہمانِ خصوصی نمبر ۶ بننا منظور کر لیا۔

مہمانِ عمومی ہو یا خصوصی آخر مہمان ہوتا ہے اور گھر ہو یا جلسہ ایک حد تک قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بھاشن بھی دینے لگے تو ناقابلِ برداشت ہونے لگتا ہے اور لوگ اس کے ٹلنے کی دعائیں کرنے لگتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میری اس تقریر سے بیزار ہو کر سامعین ہوٹنگ پر آمادہ ہو جائیں یا جنابِ صدر کی گھنٹی بج جائے، میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کر دیں، میں شکریہ ادا کرتے ہوئے خاموش ہوتا ہوں اور اپنی جگہ لینا چاہتا ہوں۔ ——

٭ ٭ ٭



محمد نسیم الدین ایم۔ اے (فلسفہ)
(کورٹلی: محبوب نگر)

بھیڑ میں پھنس کے ہم رہ گئے

روسو نے کہا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے" انسانی زندگی کے بدلے ہوئے جدید تہذیبی و تمدنی حالات کے تحت ہمارا یہ خیال ہے کہ "انسان اکیلا پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ بھیڑ میں گھرا ہوا ہے" اس بات کا فیصلہ صاحبانِ نظر خود کر سکتے ہیں کہ زنجیروں میں جکڑے رہنا زیادہ آسان ہے یا بھیڑ میں پھنسے رہنا! ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ زنجیروں میں جکڑا انسان آزادانہ نقل و حرکت نہ سہی کم از کم آزادانہ فریاد تو کر سکتا ہے جبکہ بھیڑ میں گھرا انسان کیا کر سکتا ہے سوائے گھر یاد کرنے کے!! ہماری اس تحریر سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم دنیا بیزار یا مردم آزار قسم کی کوئی مخلوق ہیں اور کسی ویرانے سے بھٹک کر انسانوں میں آ پہنچے ہیں۔ ہم اپنے بے شمار دوست احباب (جن سے ہم بہر حال ناخوش ہیں) کے سر عزیز کی قسم کھا کر یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ بذاتِ خود ہم نہ تنہائی پسند ہیں اور نہ خلوت نشین اور نہ ہی ہمارے آباء و اجداد میں سے کسی نے کبھی دنیا سے سنیاس لے کر ہمالیہ کی کوہستانی چوٹیوں پر آسن جمایا تھا۔ ہمیں اپنے آباء و اجداد کی اس غفلت پر کبھی بہت غصہ آتا ہے کہ انہوں نے ہمارے ... مکران سے لطف اندوز ہونے کا ایک نادر موقعہ گنوا دیا۔ ان کے بعد ہی ہمارا پتہ تو سکون تھا۔ ہمیں ارسطو کے اس قول سے صد فیصد اتفاق ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ لیکن سماج پسند ہونے کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر مقام پر بھیڑ میں پھنسے رہو تو ایسی سماجیت کو دور ہی سے سلام، ہم تو اکیلے ہی بھلے۔ اگلے زمانے کے لوگ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ چاند پر نہ پہنچ سکے تو کیا ہوا کم از کم زمین پر تو آزادانہ چل پھر سکتے تھے جس طرح آسمان پر چاند حرکت کرتا ہے کسی سے ٹکرائے یا کسی سے ٹکر کھائے بغیر۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں کہ حقیقتاً غالب ایک بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ بڑے آدمی بھی تھے۔ لیکن کتنے بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ایسے بڑے شاعر اور آدمی کی معمولی سی تمنا یعنی ایسی جگہ رہنے کی حسرت جہاں کوئی نہ ہو، دم نکلنے تک نہ نکل سکی۔

یہ بات نہیں کہ ہم جد و جہد اور کشاکش روزگار سے گھبراتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو بی۔ اے کی ڈگری ہاتھ میں لئے پانچ سال سے روزگار کے چکر میں دفتروں اور کمپنیوں کے چکر لگا لگا کر بجائے آرام سے خودکشی کر چکے ہوتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں بھیڑیوں کے غول سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا بھیڑ سے ...!

ڈرتا ہوں بھیڑ سے کہ بھیڑ گزیدہ ہوں

ہمارے لئے بھیڑیوں سے نمٹنا آسان ہے لیکن بھیڑ سے جیتنا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ بھیڑیوں سے بھڑ جائیے صرف جان کا خطرہ لاحق ہوگا لیکن بھیڑ میں نہ صرف جان بلکہ عزت و ایمان بچانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ بھیڑ میں پھنسنے کے بعد بھیڑ کے خلاف آپ کچھ بھی کیجئے کچھ بھی کہئے کچھ نہ ہوگا۔ آپ کی آواز اسی طرح دبا دی جاتی ہے جس طرح جمہوریت میں حزب مخالف کا احتجاج اور آپ کی ساری تگ و دو اور دہائی ایسے ہی بے اثر جیسے حکومت کی نشہ بندی پالیسی

ابھی پرسوں ہی کا واقعہ ہے ہم اپنے ایک دیرینہ رفیق کو رخصت کرنے کے لئے جو بسلسلۂ روزگار کسی خلیجی ملک کو جا رہے تھے اسٹیشن پہنچے۔ پلیٹ فارم کا ٹکٹ خرید کر جوں ہی اندر داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ آدمیوں کا ایک سمندر ہے جو پلیٹ فارم پر اُمڈ آیا ہے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تل دھرنے جگہ نہیں تھی۔ ہم نے بچتے سنبھلتے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی، دیوار سے ٹکرائی گیند کی طرح کئی قدم پیچھے چلے آئے۔ بہزار سنبھالا لیا اور قدم جمانے کے لاکھوں جتن کئے لیکن وہ کوئی میدان جنگ تو تھا نہیں کہ مضبوطی سے قدم پھر سے جم جائیں، بھیڑ تھی بھیڑ، جس میں پھنس کر سوائے بھیڑ چال کے تمام چالیں ناکام اور تمام حربے بیکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پھر ہوا ... جوں ہی ہم دم لے کر ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے جواباً کئی قدم پیچھے دھکیل دیئے جاتے۔ حتیٰ کہ اس ترقی معکوس کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب کہ ہم نے آگے بڑھنے کی آخری کوشش کی اور ایسا دھکا کھایا کہ یا تو ابھی اسٹیشن کے اندر تھے یا ابھی گیٹ کے باہر چاروں شانے چت اندر داخل ہونے والے بھیڑ میں سمندر سے جانے سے بچنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے کہ بہ ہزار دقت اٹھ کر لے ہوئے تھے کہ ٹرین کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ اسٹیشن میں داخل ہونے کی ہمت تھی نہ گنجائش لاچار جاتی ہوئی ٹرین کو حسرت سے دیکھا کئے۔ ہمیں کیا پتہ کہ احباب کو "خوش رفتہ دید" کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے کہ شوق گلپوشی میں زمین بوسی کرنی پڑتی ہے اور گلے مل کر وداع کرنے کی حسرت میں دھکے کھا کر جدا ہونا پڑتا ہے۔ خیر ہمارا کیا ہم تو سہہ جائیں گے لیکن حسرت ان گجروں پہ ہے جو بن پہنے مرجھا گئے۔ جب ٹرین کی آخری بوگی بھی معشوق کی کمر کی طرح معدوم ہو گئی تو ہم نے سر سہلاتے کپڑے جھاڑتے گھر کی راہ لی۔ دوسرے دن بیگم کی ایک نئی فرمائش کی تکمیل کے لئے ہم بازار کی بھیڑ میں دھکے کھا رہے تھے کہ ایک جگہ اپنے اسی دوست کو کھڑا پایا جنہیں رخصت کرنے کے لئے ہم اسٹیشن گئے تھے اور بھیڑ کے آگے منہ کی کھا آئے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ ان کی روانگی بھی بھیڑ میں پھنس کر رہ گئی تھی یعنی یہ کہ بھیڑ نے انہیں بھی اسٹیشن کے باب الداخلہ سے اسی طرح دھکیل دیا تھا جس طرح ٹکٹ چیکر بن ٹکٹ سفر کرنے والوں کو ڈبے کے باہر دھکیل دیتا ہے۔

ہمارے ذہن میں بھیڑ میں اٹھائے گئے تلخ تجربات کی خود ایک بھیڑ ہے۔ دھکا۔ مکا۔ گالی۔ غرض بھیڑ میں کیا نہیں کھایا اور جوتے سے لے کر بیگم تک کیا نہیں کھویا (افسوس اس بات کا ہے کہ بیگم تو فوراً مل گئیں لیکن بٹوہ نہیں ملا) ہم اس بھیڑ سے بچنے کی لاکھ کوشش کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں پھنس ہی جاتے ہیں۔ انسان کو بھیڑ سے مفر کہاں ....! گھر میں بچوں کی بھیڑ، اس پر مستزاد ناخواندہ مہمانوں کی بھیڑ! بازار میں باوجود کمر توڑ مہنگائی کے خریداروں کی بھیڑ! ایمپلائمنٹ ایکسچینج آفس میں بے روزگاروں کی بھیڑ۔ غرض ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ ہے۔ جیتے جی بلکہ مرنے کے بعد بھی بھیڑ سے چھٹکارا نہیں چھوٹتا۔ اس سلسلے میں اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ

اب تو مشکل ہے بھیڑ میں پھنس کے
عافیت کی خبر خدا جانے

تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہر شخص کو اپنی ذاتی رائے رکھنے کا حق ہے لیکن جہاں تک ہمارا معاملہ ہے ہماری مثال ایسی ہی ہے جیسے آسمان سے ٹپکے کھجور میں اٹکے۔ یعنی ہم نے بھیڑ سے فرار ہونا چاہا اور انسانوں کی اس بھیڑ میں پھنس گئے جو بھیڑیے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے

کہیں کس سے ہم کہ کیا ہے یہ بھیڑ بڑی بلا ہے
ہمیں کیا برا تھا پھنسنا اگر ایک بار ہوتا

بال کی کھال (تبصرہ)

"دشتِ آرزو" (شعری مجموعہ)

شاعر: غنی اعجاز

تبصرہ از: نظام الدین نظام

شعر کی تعریف ناقدین جو بھی طے کریں، سامعین اور
رئین کے دل سے پوچھئے تو شعر وہی ہے جو دل میں
جائے۔ شاعر رجعت پسند ہو، ترقی پسند ہو یا جدید
ی کو غرض اس سے نہیں کہ شاعر کا لیبل کیا ہے وہ
بعض حالات میں شاعر کا نام تک بھول جاتا ہے شعر
یں اُتر جاتا ہے اور یاد رہ جاتا ہے۔ ایسے اشعار
خالق بصورتِ شعر ہمیشہ دلوں میں رہتا ہے۔ "دشتِ
زو" کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے یہی محسوس کیا کہ
ی اعجاز ایسے ہی خوش نصیب شاعروں میں ہیں ۔
ی اعجاز کے اشعار کہیں روایت کے پاس دار محسوس
تے ہیں کہیں ترقی پسندانہ موضوعات کا اعادہ کرتے
، اور کہیں جدید [illegible] جذبہ کی تصویر نظر آتے
ں۔ اور ایسا صرف [illegible] ہے کہ "دشتِ آرزو" کے
لق نے اپنے ذہن کو طے شدہ نظریوں اور اصولوں
ے بس اسیر نہیں ہونے دیا۔ شاذ تمکنت کے الفاظ
دہ "ایک عبادت گزار کی طرح فن کی دیوی سے لو
ئے رہا۔ فن کی دیوی [illegible] پجاریوں کو اس کی پرواہ
ہی ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔

اردو کے شاعروں نے گل و بلبل، دشت و صحرا اور جام و مینا وغیرہ سے جب رشتہ توڑا تو سراپا رسن و دار کے اسیر اور نئی صبح کے سورج کے طرفدار ہوگئے۔ اور جب رسن و دار اور نئی صبح کے سرخ سورج کے جادو سے نکلے تو کربِ ذات، بے چہرگی اور احساسِ تنہائی کے دلدل میں اُترتے چلے گئے اور اس "دفعتاً ترکِ تعلق" کے نتیجے میں بعض موضوعات پیاسے ہی رہ گئے۔ ایک دوسرے کی ضد میں شاعروں نے ان موضوعات کو اس گہرائی میں دفن کیا کہ پھر اُبھر ہی نہ سکے۔ خوشی ہوتی ہے کہ غنی اعجاز نے اپنے اشعار کے لئے ایسے ہی تشنہ موضوعات کا انتخاب کیا اور فن کی باطنی صداقتوں کے ساتھ انھیں برتا۔ یہ تین اشعار مثال کے طور پر۔ تین مختلف موضوعات۔ تین متفرق ڈکشن اور تین منفرد جذبے۔ مگر ہر جذبہ شدید، ہر ڈکشن دل پذیر اور ہر موضوع زندہ۔

جھوٹ کو تاج ملا، سچ کو ملے دار و رسن
منصفِ وقت کے قانون نرالے نکلے

حدودِ شہرِ تمنا کا جائزہ لیجیے
یہاں بھی غم کی پرانی فصیل نکلے گی

غنی اعجاز کے قیمتی اشعار میں یہ شعر بھی قاری کو دشتِ آرزو کے صفحے اُلٹنے سے روک لیتا ہے (اس شعر کو پس ورق کی جیکٹ کار گلکار نے بھی کوڈ کیا ہے مگر پتہ نہیں یہ حرف "واہ" کہہ کر کیوں رہ گئے !؟)

[illegible] رُت نے برہنہ کیا درختوں کو
[illegible] ہے ڈھیر سا اُتری ہوئی قباؤں کا

غور کرنے والوں کو یہ شعر شاعر کے مزاج اور شعری

روّیے کا پتہ دیتا ہے یہ دشتِ آرزو، کا کلیدی شعر ہے۔ بدلتی رُت، ہریالی، درخت اور اتری ہوئی جاتیں، وہ بھرپور علامتیں ہیں جو ٹوٹتے ہوئے دلوں کا نوحہ بھی ہے اور استحصال زدہ ماحول کا بیان بھی۔ قدروں کے ٹوٹنے کا ملال اور نئی قدروں کی گرمیِ بنیاد کا احساس۔ کئی اعتبار سے یہ علامتیں لکھنے والوں کو "دفتر" لکھنے کی اور سوچنے والوں کو خلاء نوردی کی دعوت دیتی ہیں۔ اس قبیل کے اور بھی کچھ اشعار میں نے نوٹ کئے ہیں۔ چند یہ ہیں۔

قطرۂ اوس کہ اڑنے کا بہانہ ڈھونڈے
اور سبزہ ہے کہ قدموں کی نشانی مانگے

ڈالیوں سے جو لپکی ہے لپٹی ہوئی سیجاں کی بیل
ان درختوں میں ہے کتنی معتبر پیچیدگی

تھم جائے ذرا بارش، پھر دھوپ نکل آئے
پہنچیں گے منڈیروں تک پر اپنے سکھا لیں گے

ان چند سطور میں دشتِ آرزو کی تمام شاداب کیفیتوں کا احاطہ تقریباً ناممکن ہے۔ مگر تب بھی ڈاکٹر مظفر حنفی، غلام ربانی تاباں اور ڈاکٹر بشیر بدر کے چند جملوں کی رہبری میں (جو اس کتاب کے فلیپ پر لکھے ہیں) اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ:

"آدمی پُر خلوص، خوش خصال، نرم مزاج اور پاک طینت ہونے کے ساتھ سچا اور کھرا شاعر بھی ہو تب کہیں دشتِ آرزو منظرِ عام پر آتا ہے۔ ابھی جب کچھ ایسی غزلیں سامنے آتی ہیں جن میں روایت کا تسلسل بھی ہے اور زبان و بیان کی تازگی بھی تو نہ صرف یہ کہ جی خوش ہوتا ہے بلکہ غزل کی سخت جانی اور قوت حیات پر یقین دو چند ہو جاتا ہے۔

یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کو "دشتِ آرزو" کے مطالعے سے مایوسی نہیں ہوگی۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اس کتاب میں چند نظمیں بھی ہیں اور میں نے ان کا تذکرہ دانستہ نہیں کیا کیونکہ میری دانست میں حقی احمد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں!

OO

خرافات

(مراسلے)

● کمپان - آداب!

. . . اتنے کم عرصے میں آپ نے اتنا وقیع نمبر نکالا ہے کہ حیرت کے ساتھ ساتھ مسرت ہو رہی ہے۔ میں کوشش میں ہوں کہ خواجہ صاحب پر پی ایچ ڈی کے لئے کسی کو رجسٹرڈ کرا دوں۔ رضا نقوی واہی پر ابھی ایک صاحب کو پی ایچ ڈی کروایا ہے۔ خواجہ صاحب پر بھی کام ہونا چاہیئے۔

مناظر عاشق ہرگانوی - بھاگلپور

● مجتبیٰ مصطفےٰ کمال صاحب! سلام و احترام!

"ترد ورد" پر محترم رؤف خیر کا تبصرہ چند مفروضات سے قطع نظر خوب ہے۔ تبصرے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے خام پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے اور خوبیوں کو سراہا جائے۔ دونوں میں توازن ضروری ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ ضرورتاً، مجبوراً یا مصلحتاً یا صرف قصیدہ گوئی کر کے اپنی عافیت بچا لے جاتے ہیں اور کچھ حقیقت نگاری کے زعم میں حد اعتدال سے گزر کر صرف عیب جوئی پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہرحال مجھے خیر صاحب کا تبصرہ اچھا لگا۔

محبوب راہی، بارسی ٹاکلی

● شگوفہ کے خواجہ عبدالغفور نمبر کا جواب نہیں۔ جن لوگوں نے انھیں قریب سے دیکھا تو انھیں ایسا لگے گا کہ دوبارہ ملاقات ہوئی ہے۔ اور جو لوگ انھیں صرف ایک آفیسر سمجھتے تھے وہ افسوس کریں گے کہ ایک بیش قیمت شخص ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

شکیل اعظم، بھاگلپور

● "شگوفہ" کا خواجہ عبدالغفور نمبر، اس قدآور شخصیت کے شایانِ شان نکلا۔ اتنے مختصر عرصے میں باوجود ناگزیر حالات کے ان کو جس انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ وہ یقیناً کمال صاحب کا کارنامہ ہے۔ "زنار" کی ترکیب جو مرحوم کی تصانیف کی پہچان ہے اس کا مقصد "مدیر شگوفہ" نے زنارِ روس "سے ملایا تھا، وہ آج زندہ ادب تک جا پہنچا۔ اس خصوصی اشاعت کا نثری حصہ ہو کہ شعری دونوں انفرادیت کے حامل ہیں۔ آئندہ جب خواجہ صاحب پر تحقیقی کام ہوگا تو یقیناً لکھنے والوں کو سب سے پہلے "شگوفہ" سے استفادہ کرنا پڑے گا اور یہی (علمی و ادبی حلقوں میں) اس نذرانۂ عقیدت کی قبولیت کی دلیل ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا یہ شاہکار رسالہ جو ہزاروں مردہ دلوں کو شگفتگی عطا کرتا ہے، تمنا ہے کہ وہ ایسے سانحات سے محفوظ رہے۔ اس لئے کہ

ع - زندگی عبارت ہے اس کے جینے سے

نام نامی اسم گرامی، شہر زندہ دلان

● مرحوم خواجہ عبدالغفور نمبر کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے۔ اتنی جلد اور اس قدر مربوط نمبر نکال کر واقعی آپ نے اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جس کی ایک دنیا پہلے ہی سے قائل ہے۔

سید حسن عباس۔ گوپال پور (بہار)

● خواجہ عبدالغفور نمبر موصول ہوا۔ میرے حلقے میں بڑی عقیدت اور چاؤ سے پڑھا جا رہا ہے۔ اتنے کم وقتوں میں اسے آپ نے ہر زاویے سے آراستہ فرما کر اپنے مدیرانہ جوہر کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ پڑھنے کے بعد خواجہ صاحب کی شخصیت، فن اور اردو ادب سے ان کے لگاؤ کا جذبہ اور بھی اجاگر ہوتا ہے۔ کاش ایسا مخلص انسان کچھ برسوں تک اور بھی زندہ رہتا۔ خواجہ صاحب نمبر میں جن قلم کاروں نے حصہ لیا ہے، خواجہ صاحب کی زندگی اور ان کی شخصیت نیز فن سے انصاف برت کر

قارئین کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

صابر بہاری، رانچی

▬ کل ہی "شگوفہ" کا "خواجہ عبدالغفور نمبر" دستیاب ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ چوٹی کے ادیبوں کی تخلیقات کو خراج تحسین کی صورت میں آپ نے شگوفہ میں جگہ دی۔ سب کے ساتھ انصاف کیا ہے یقیناً یہ کام بے حد مشکل اور صبر طلب ہے۔ آپ کی محنت اور استقلال سے کسی کو انکار نہیں۔ اتنا خوبصورت اور یادگار نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

محمد ایوب، اٹاری (مہاراشٹرا)

▬ خواجہ عبدالغفور نمبر ملا۔ بہت خوب۔ لوگوں نے کافی پسند کیا ہے۔

جلال الدین، گورکھپور

▬ خواجہ عبدالغفور نمبر بیحد پسند آیا۔ اس سے قبل بھی میں نے دو لفافے لکھے تھے لیکن . . . . اس دفعہ اُمید کرتا ہوں میری مزاحیہ غزل شائع ہوگی۔ جناب رؤف خوشتر صاحب کی جانب سے سلام عرض ہے۔

ساغر شولاپوری

▬ آپ کی ادبی کاوشوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ اردو میں طنز و مزاح پر "شگوفہ" ہی وہ واحد رسالہ ہے جو ہمیشہ سے ہی اپنی آن بان اور شان کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شگوفہ کے توسط سے جب بھی کوئی نمبر نکلا یادگار نمبر ثابت ہوا اور اردو کے دوسرے ماہناموں میں ممتاز اور اعلیٰ مقام پایا ہے۔ اس کی مثال شگوفہ کا "ڈرامہ نمبر" ہے جو ڈرامہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انسائیکلو پیڈیا ثابت ہوا ہے۔ اس وقت شگوفہ میں ایک اور اعلان نظر سے گذرا "ہندوستانی طنز و مزاح نمبر" — اور اُمید ہے کہ یہ نمبر بھی اردو ادب میں اہم ثابت ہوگا۔

شکیل شاہجہاں، ناگپور

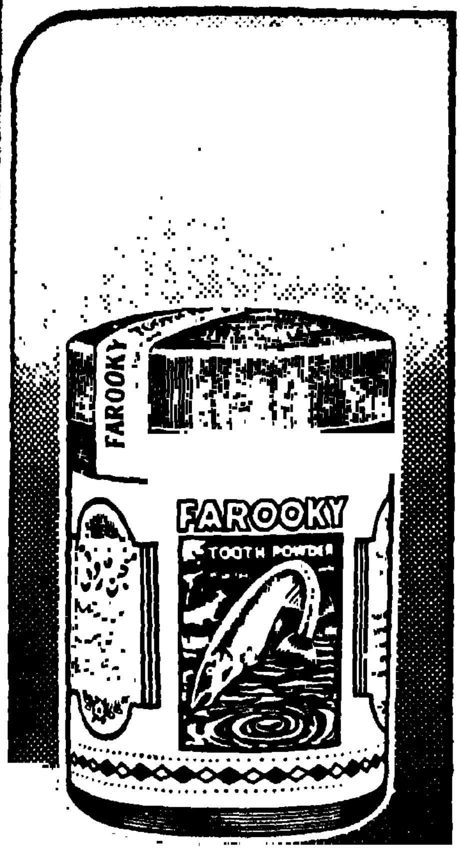
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے منائے جانے والے عالمی جشن مزاح کی تیاریاں جناب نریندر لوتھر کی قیادت میں بڑے اہتمام کے ساتھ جاری ہیں ہمارے ملک کے اخبارات میں ان تقاریب کا ذکر ہو رہا ہے اور تمام ادبی حلقوں نے مجوزہ تقاریب کے اقدام کو سراہتے ہوئے اپنا مکمل تعاون پیش کیا ہے۔ یہ عالمی جشن اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد تو ہے ہی۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک میں پہلی بار کسی اُردو ادارے نے انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے علاوہ تمام ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادبی اجلاس منعقد کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ تمام زبانوں کے ادیب و شاعر یکجا ہوکر مختلف اللسان آبادی کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کریں۔ یقین ہے کہ ان تقاریب کے انعقاد سے ایک جانب صنف طنز و مزاح کی بقا اور ترقی کے سامان مہیا ہوں گے، دوسری طرف اس مقبول اور کارگر صنف کے ذریعہ عوام کے شعور کو بیدار کرنے اور ان میں صحتمند رجحانات پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ ۱۶؍ تا ۲۰؍ نومبر کی تاریخ میں منعقد ہونے والی ان پانچ روزہ تقاریب کے پروگرام بارہ مختلف زبانوں کے متوازی ادبی اجلاسوں کے علاوہ جرمنی کے فنکاروں کا پیش کردہ کٹھ پتلیوں کا ناچ، مائم، کارٹونوں اور مزاحیہ فلموں کی نمائش وغیرہ جیسی دوسری دلچسپیاں بھی شریک ہیں۔ زندہ دلان نے ایک بہت ہی سنجیدہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے لیکن ادبی حلقوں اور خاص طور سے اہل حیدرآباد کے تعاون کے بغیر اس پروگرام کو کامیاب بنانا ممکن نہیں۔

* عالمی جشن مزاح کے موقع پر شگوفہ کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوگا نیز ہندوستانی مزاح نمبر کی بھی اشاعت اس جلد عمل میں آئے گی۔

[illegible]


FAROOKY
FAROOKY
TOOTH POWDER



ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد



NOVEMBER 1984 **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۱۷
شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۸۴ء

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد

قیمت: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

فون:
آفس:
557716
رہائش:
521064

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۱۳۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱

مجلس مشاورت کے رکن
راجندر سنگھ بیدی کے انتقال پر سوگوار

ادارۂ "شگوفہ"

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (افسانہ، ڈرامہ)

نہیں آتی تو یاد ان کی ..... (یادِ رفتگاں)

مرا شہر لوگاں سوں .... (شہر حیدرآباد)

حق تو یہ ہے کہ ... (ترجمہ)

پھوریاں (منظومات)

عالمی جشن مزاح

کے التواء کی وجہ سے نومبر کے زیر نظر شمارہ کو عام شمارہ
میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔
جشن کی نئی تواریخ — اور
شگوفہ کے خصوصی شماروں کی تفصیلات
دسمبر کے شمارہ میں شائع کی جائیں گی
ان پروگراموں کی تبدیلی سے قارئین اور ایجنٹ حضرات کو ،
جو زحمت ہوئی۔ اس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

——— (ادارہ)

یوسف ناظم

کٹ جائیے

ترقی یافتہ ملکوں میں یہ مہذب طریقہ رائج ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کا خواہ وہ آدمی ہوں یا جانور، پورا پورا خیال رکھا جائے اور ان کی نسل کو برقرار رکھنے کی تدابیر نہ صرف دریافت کی جائیں بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس وقت اچھے شہریوں کے علاوہ اعلیٰ نسل کے تندرست اور توانا جانور بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے پرندوں کو بھی تقریباً وہی سہولتیں حاصل ہیں جو وہاں کے عوام کو حاصل ہیں۔ ہندوستان میں بھی اب یہی رواج جڑ پکڑ رہا ہے۔ یہاں اب تک صرف بچوں اور نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے کام ہوا کرتے تھے خاص طور پر بچوں کے سلسلے میں تو بہت کچھ ہوا ہے۔ بچوں کے لئے کون سا دودھ مفید ہوگا۔ صرف اس ایک موضوع پر کتابیں پر کتابیں لکھی گئی ہیں جب کہ ان ساری کتابوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی یہ طے تھا اور بخوبی ثابت ہو چکا تھا کہ بچوں کے لئے صرف وہی دودھ مفید ہے جو قدرت نے مقرر کیا ہے نہ کہ وہ دودھ جس کی چھاچھ اور آئس کریم بنتی ہے۔ بچوں کی پرورش اور ان کی نشوونما وغیرہ کے امور پر بھی حکومتوں کو غور کرتے اور وقت ضائع کرتے دیکھا گیا ہے۔ حکومتیں بچوں کی ذہنی تربیت کے بارے میں بھی مسائل پیدا اور ان کا حل تلاش کرتی ہیں حتیٰ کہ بچوں کے ادب کے بارے میں بھی تقاریر اور جلسے ہوتے رہتے ہیں جن میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس تیزی سے بچے پیدا ہو رہے ہیں اس رفتار سے بچوں کا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ (ان تقاریر سے متاثر ہو کر ہمارے کتنے ہی ادیبوں نے بچوں

مضامین لکھنا شروع کر دیا ہے)۔ اس موضوع پر لوگ کافی دیر تک اظہار افسوس کرتے ہیں۔ بچوں کی صحت کے بارے میں اپنے "اظہار افسوس" کو ایک شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

کیا چھچھوندر سے نکالے ہیں یہ بچے شیخ جی!
قبلۂ عالم! انہیں بار دگر پیدا کرو

اسی طرح نوجوانوں کے سلسلے میں بھی سر جوڑ کر بیٹھتے اور پھر کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہی نوجوان آگے چل کر ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالیں گے (لیکن یہ باگ ڈور اتفاق سے نوجوانوں کے ہاتھ جاتی نہیں ہے)۔ اس لئے ان نوجوانوں کی صحت کی طرف سے ارباب اقتدار تشویش میں مبتلا ہونے پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انھیں اسکولوں میں دوپہر کی چھٹی میں دودھ اور بسکٹ (۲ عدد) فوراً فراہم کئے جانے چاہییں۔ (یہ دودھ اور بسکٹ تعلیم کے علاوہ ہیں، کوالٹی ان تینوں چیزوں کی ایک ہی ہوتی ہے)۔

بچے اور نوجوان تو اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں لیکن جہاں تک بوڑھوں کا تعلق ہے ان کے متعلق کم ہی سوچا جاتا ہے اور افسوس اس کا ہوتا ہے کہ یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ بوڑھے ملک و قوم کے لئے کوئی مفید چیز نہیں ہیں۔ ان کا رہنا نہ رہنا برابر ہے (نہ رہنے کو بہتر سمجھا جاتا ہے) حالانکہ دیکھا جائے تو معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کی پیرانہ سالی اور ضعیفی کی وجہ سے صنعت اور تجارت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ مصنوعی دانت، وِگ، عینکیں، خضاب، کالی مہندی (جو بعد میں سرخ ہو جاتی ہے) حکیموں کے مشہور و معروف نسخے، واکنگ اسٹک، طرح طرح کے ٹانک اور ایک مخصوص قسم کا لٹریچر، ان ساری چیزوں کی تجارت کا انحصار کہئے کس پر ہے — صرف بوڑھوں پر — ملک میں مہنگائی کا احساس دلانے والے بھی یہی بوڑھے ہوتے ہیں۔ جب وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک روپے میں کئی سیر اصلی گھی اور کئی سیر بالائی وغیرہ جیسی چیزوں کے علاوہ بے تحاشہ بادام اور پستے کھائے ہیں تو سننے والوں کے منہ ہی میں پانی بھر نہیں آتا ان کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ دل بھی بھر آتا ہے۔ مہنگائی کا احساس دلانے کیلئے ہم بوڑھوں کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔ دنیا میں عصری حیثیت کے علاوہ جو کچھ بھی حیثیت باقی ہے اس کا سہرا بوڑھوں کے سر ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ملک میں جا بجا بوڑھوں کے معاملات سے متعلق سیمینار وغیرہ منعقد ہو رہے ہیں اور تحقیقاتی کام بھی شروع ہوا ہے اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک جائزے کے دوران بوڑھوں نے اپنے انٹرویو میں یہ بیان دیا کہ نوجوان طبقہ ان کا مخالف نہیں ہے اور بوڑھوں سے انھیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ (اکا دکا واقعات تو ہر جگہ ہوتے ہی رہتے ہیں)۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ نوجوان طبقہ بوڑھوں کا مخالف نہیں ہے (انھیں اس کی فرصت ہی نہیں ہے)۔ جتنی بھی سیاسی اور سماجی جماعتیں نوجوانوں کی ہیں ان کے جلسوں میں بولنے اور سننے والے بوڑھے ہی ہوتے ہیں۔ نوجوان جو بھی کھیل کھیلیں گے، اس کے کوچ، ریفری اور امپائر بوڑھے ہی ہوں گے۔ نوجوانوں اور بوڑھوں میں آج بھی کئی باتوں میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ جب بھی کسی گھر میں کسی نوبیاہتا بہو کو (بدوران زندگی) نذر آتش کرنا ہوتا ہے تو اس کارِ خیر میں نوجوان شوہر جتنی سرگرمی اور جوش کا مظاہرہ کرتا ہے اتنا ہی یا اس سے کچھ زیادہ ہی جوش اور ولولے کا اظہار معمر ساس سسر کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور اگرچہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ ہوتا ہے لیکن وہ ان ہی ہاتھوں سے اپنے بیٹے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بعض وقت پیش قدمی ان ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

فلمی گانوں کے معاملے میں بھی جوانوں اور بوڑھوں کی پسند ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم کے گانے دونوں کان لگا کر سنتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ پہاڑ کے دامن میں ریتیلی زمین پر لیٹ کر دو آدمی جن میں سے ایک مستورات ہو، گانا کیسے گا سکتے ہیں اور یہ دونوں موسیقار ہو کیسے سکتے ہیں جب کہ ان میں ایک بات کرتے وقت ہکلاتا اور ——— دوسری پارٹی کے بارے میں ہم کچھ کہنا پسند نہیں کرتے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ نوجوان طبقہ ان اُمور پر غور نہ کرے لیکن بوڑھوں کو تو بہرحال سوچنا چاہیئے۔ ان کا تجربہ وسیع ہوتا ہے۔

ارباب اقتدار اب یہ سوچ رہے ہیں کہ بوڑھوں کے لئے علیٰحدہ گھر بنائے جائیں تاکہ ایسے بوڑھے جن کے جائز ورثا نہ ہوں یا جن کے جائز ورثا انھیں قبول کرنے پر رضامند نہ ہوں تو یہ بوڑھے ان گھروں میں قیام پذیر ہو سکیں (گھر ابھی بننے ہیں)۔ بوڑھوں کی مشترکہ رہائش کے پیچھے (اور آگے بھی) مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ساتھ رہ کر اپنے اپنے حالاتِ زندگی سے ایک دوسرے کو روشناس کرائیں اور کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک کا غم دوسرے کے غم سے کم یا زیادہ ہے ——— کہیں نہ کہیں تو مساوات ہونی چاہیئے۔ (اب یہ صرف بوڑھوں کے گھر میں ممکن ہے لیکن یاد رہے یہ گھر ابھی بننے ہیں)۔

"گھر" کی تجویز کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ بوڑھوں کے لئے چھوٹے موٹے کام بھی فراہم کئے جائیں ——— یہ بات غلط ہے۔ ان میں سے اکثر بوڑھے تو ایسے ہوں گے جن کی عمر کام کی آرزو میں کام آگئی ہوگی۔ ان کی درخواست جو انھوں نے اپنی نوعمری کے زمانے میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج بھیجی تھی اب یعنی ان کی معمری کے وقت تک نمبر پر نہیں آئی ہوگی۔ (نمبر پر آنا ایک محاورہ ہے جو ہمارے دفاتر میں بطور سکّہ رائج الوقت مستعمل ہے)۔

لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ جب تک یہ مشہور و معروف "گھر" بن نہیں جاتے بوڑھوں کو کچھ "ٹکٹ" دیئے جانے چاہئیں بالکل واپسی کا ٹکٹ نہیں بلکہ ہماری مراد ان ٹکٹوں سے ہے جن کے ملنے پر لوگ "کھڑے" ہوتے ہیں اور ایک مرتبہ کامیابی سے کھڑے ہونے پر ٹکٹوں ہی کو اپنے سامنے دست بستہ کھڑا رکھتے ہیں ——— ہمارا اشارہ اسی ٹکٹ کی طرف ہے۔ ••

* * *

رضا نقوی واہی

وضعداری

اولمپک کے کھلاڑی ہاتھ خالی جب وطن آئے
طلائی کیا، نہ کانسے کا بھی تمغہ جیت کر لائے

سبب پوچھا گیا جب ہار کا کپتان صاحب سے
تو چہرے کا پسینہ پونچھ کر رومال سے، بولے

ہماری وضع داری کو سمجھتے ہیں جو پسپائی
انھیں مطلق نہیں قومی روایت سے شناسائی

ہماری وضع "قبلہ آپ پہلے" کی جو خوگر ہے
وہی جہد و عمل کے راستے میں اپنی رہبر ہے

سرِ راہِ عمل ترکِ روایت ہم نہیں کرتے
ٹرینیں چھوٹ جاتی ہیں پہ سبقت ہم نہیں کرتے

ہماری وضعداری جب "سودیشی ریل" بنتی ہے
تو قومی زندگی کی انفرادی شان بنتی ہے

کمندیں ڈالتے ہیں دوسرے جب چاند تاروں پر
ہم اپنی وضعداری کو چلاتے ہیں کھٹاروں پر

ہماری وضعداری میں ہے فرقہ واریت شامل
نہ ہو یہ مشغلہ تو زندگی گزرے بصد مشکل

مقابل زور آور ہو تو گھٹنے ٹیک دیتے ہیں
مگر کم زور کو ہم ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں

اولمپک میں ہماری ہار، فتح وضعداری ہے
یہ وہ نکتہ ہے منطق کا جو ہر نکتے پہ بھاری ہے

ہمیں منظور تھی جب دوسری ٹیموں کی دلداری
سرِ میداں ہماری ٹیم اگر ہاری تو کیا ہاری

ذرا سی جیت کی خاطر رُخ اُن کا یوں بدل جانا
ہمیں پیچھے سے دھکے دے کے خود آگے نکل جانا

یہ خود غرضی، ہماری انکساری کے منافی ہے
انھیں موقع دیا بڑھنے کا بس اتنا ہی کافی ہے

ہمیں سونے کے اک ٹکڑے کا لالچ کیوں بھلا ہوتا
خود اپنی آنکھ میں رُتبہ ہمارا گھٹ گیا ہوتا

خدا رکھے کہ اسمگلر ہمارے باری باری سے
ٹنوں سونا درآمد کر رہے ہیں باری باری سے

اولمپک میں نیا ریکارڈ یوں قائم کیا ہم نے
حریفوں کو خوشی کا موقعِ زرّیں دیا ہم نے

بھلا اپنی روایت کا گلا کیوں کر دبا دیتے
اگر ہم جیتتے تو ساکھ اپنی خود مٹا دیتے

ہماری وضعداری پر کوئی کف در دہاں کیوں ہو
"شبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو"

سرسوتی سرن کیف
(چندی گڑھ)

دائر کرنا مقدمہ حضرت ادیبؔ کا

رمضان کا مہینہ تھا۔ عید کو چار پانچ روز ہی رہ گئے تھے۔ سچی بات کہہ دوں کہ سارے رمضان روزے رکھنے کا سلسلہ میں نے ادھر چار پانچ برس ہی سے شروع کیا ہے ورنہ تو یہ حال تھا کہ کسی سال دس رکھ لیے کسی سال بارہ۔ چنانچہ رمضان میں میری کام کرنے کی طاقت معطل سی ہو جاتی ہے، خصوصاً آخری چار پانچ دنوں میں۔ ان دنوں خاموشی سے قرآن خوانی ہی میں زیادہ وقت گذارا کرتا ہوں، کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔

اس لیے تیسرے پہر گھنٹی بجنے پر جب کڑھتے ہوئے دروازہ کھولا تو تعجب ہوا۔ میرے ملنے والے عموماً تعلیم یافتہ حضرات ہوتے ہیں۔ یا پھر دفتر کے چپراسی وغیرہ۔ یہاں دیکھا کہ دو صاحبان کھڑے ہیں۔ ایک تقریباً نوّے برس کے بزرگ جن کی سفید داڑھی تھی اور سفید دھوتی اور سر پر عمامہ دوسرے صاحب تقریباً میرے ہم عمر تھے، اُونچا پاجامہ، قمیص، صدری اور پرانی مخملی ٹوپی پہنے اور کندھے پر انگوچھا ڈالے۔ خیر، آنے والا دیہات سے آیا ہو یا جنگل سے، خیر مقدم تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ بزرگ وار سے پوچھا "آپ نے روزہ داری نہ کی ہو تو آپ کے لیے شربت وغیرہ بنوا دوں؟"

وہ بولے "نہیں میاں اللہ کا بڑا کرم ہے کہ ابھی تک اتنی صحت قائم رکھی ہے کہ اس کی عائد کی ہوئی آزمائش سے گذر سکوں۔"

مجھے اور تعجب ہوا۔ یہ وضع اور اتنی متین اور شستہ زبان! پوچھا "کیسے تکلیف فرمائی؟"

اب کی دوسرے صاحب نے جواب دیا "ہم لوگ . . . . ضلع کے میرپور گاؤں سے آئے ہیں۔ آپ ادیبؔ جھانسوی کو تو جانتے ہی ہیں۔ وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور چچا جان (بزرگ وار کی طرف اشارہ کر کے) کے صاحبزادے۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے نیاز حاصل کر کے" میں نے کہا۔

"خوشی تو ہمیں بھی ہوئی ہے یہاں آکر۔ آپ کے خلق و مروّت کی جتنی تعریف سنی تھی اس سے زیادہ آپ کو پایا۔ لیکن میاں اصلی خوشی تب ہو گی جب ہماری کچھ مدد کر سکو" بزرگوار تقریباً ہنستے ہوئے بولے۔

"ارشاد فرمایئے۔ جو کچھ بن پڑے گا ضرور کر دوں گا۔"

بزرگ وار بولے "آپ کے دوست ہمیں برباد کرنے پر تلے ہیں۔ اگر آپ انہیں سمجھا بجھا کر انسان بنا سکیں تو . . . . ."

میں نے ہنستے ہوئے کہا "حضرت، وہ آپ کی نصیحت پر کان نہیں دیتے تو میری کیا سنیں گے؟ بہرحال جاننا

ضرور چاہتا ہوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جس سے آپ پریشان ہیں۔ غلط نہ سمجھیے گا۔ میں ان کی جانب داری نہیں کر رہا ہوں۔ ان کی حرکات پریشان کن ہوتی ہی ہیں۔ میں صرف واقعات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

بزرگ وار اپنے بھتیجے سے مخاطب ہوئے۔ "میاں نفیس! تمہیں بتاؤ۔ میں بولنے لگوں گا تو مجھے غصہ آ جائے گا اور ممکن ہے زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے کہ روزہ خطا ہو جائے۔"

میاں نفیس یعنی نفیس الدین صاحب بہت سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ ایک مڈل اسکول میں معلم تھے۔ ان کے چچا میاں نیاز الدین کسی زمانے میں چھوٹے موٹے زمیندار تھے، زمینداری کے خاتمے کے بعد خاندان میں بیس بائیس بیگھے کی کاشت اور دو باغ رہ گئے ہیں۔ ادیب صاحب انکے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ان کا نام لطیف الدین ہے۔ ادیب کے ایک چھوٹا بھائی ہے جس کا نام شریف الدین ہے۔ وہی اس وقت کھیتی باڑی اور گھر بار کا انتظام دیکھتا ہے۔ اس وقت کچھ علیل ہے اس لیے نہیں آیا۔ گھر کی حیثیت معمولی ہے لیکن عزت دار سید خاندان ہے۔ شریف الدین خود میٹرک پاس ہیں لیکن چونکہ گاؤں میں اور کوئی شخص خانگی انتظام کے لیے نہیں تھا اس لیے جنگ عظیم کے دوران ملی ہوئی عارضی ملازمت چھوٹنے کے بعد اور کہیں ملازمت نہیں کی بلکہ گاؤں میں بس گئے اور والد کی مدد کرنے لگے۔

میں نے کہا "تعجب ہے۔ ادیب صاحب اس طرح اپنے گھر بار کی باتیں چھپاتے ہیں جیسے انہیں خاندان کا ذکر کرنے میں شرم آتی ہو۔"

"ارے کیا کہوں اُس ......" بڑے میاں نے روزہ ٹوٹنے کے ڈر سے اپنی زبان کو قابو میں کیا۔

نفیس الدین نے بیان جاری رکھا۔ لطیف میاں لڑکپن میں آوارہ لوگوں کی صحبت میں پڑ گئے تھے۔ اس کی وجہ سے اور کوئی خرابی تو نہ ہوئی لیکن سینما اور ناچ گانا دیکھنے کا شوق ہو گیا اور جلد ہی تعلیم کو خیرباد کہہ بیٹھے۔ باپ نے جتنی سرزنش کی اتنا ہی بگڑتے گئے ضدی تو ایک نمبر کے ہیں۔ ان کی شادی اس خیال سے کرا دی گئی کہ شاید بیوی انہیں انسان بنا دے لیکن وہ غریب اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ کبھی کبھی گاؤں جاتے رہتے ہیں۔ جتنا روپیہ لڑ جھگڑ کر چھوٹے بھائی سے لانا ممکن ہے لے آتے ہیں۔ باپ کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتے اور کبھی سامنا ہوتا ہے تو گالیاں دینے لگتے ہیں کہ بڈھا سب کچھ چھوٹے بیٹے پر لٹائے دے رہا ہے۔ بڑے بیٹے کی اسے کوئی فکر نہیں ہے۔ ہاں اپنی بیوی کو تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ضرور دے چکے ہیں۔

"اپنے بال بچوں کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کس کا خیال کریں گے۔ ان کے خیال میں ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی مدد کرے اور اُن کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کو نقصان پہنچائیں۔"

ان کی سرگذشت میں میری دل چسپی کافی بڑھ گئی تھی۔ مفصل طور پر پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناب کم از کم دس بارہ جگہ ملازمت کر چکے ہیں۔ کبھی سینما گھر کے گیٹ کیپر رہے ہیں کبھی لالہ لوگوں کے گماشتہ۔ دس پندرہ برس پہلے برسوں ایک جلد ساز کی دکان پر ملازمت کی۔ معلوم نہیں دکان کا مالک ان سے کیوں بہت خوش ہو گیا اور دو ایک مرتبہ ان کی چوری پکڑی جانے پر بھی اس نے انہیں برطرف نہیں کیا۔ پانچ برس پہلے جلد ساز کی وفات ہو گئی۔ اس کے بیٹے دور دراز جگہوں میں ملازمت کرتے تھے۔ کسی کو دکان میں دل چسپی نہ رہی اور کچھ دنوں میں دکان بند ہو گئی۔ دکان میں ملازمت کے دوران ہی انہیں ادیب بننے کا خبط سوار ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کو اپنا نام نہیں بتایا اور آبائی مسکن کو چھپانے کے لیے خود کو جالنوی کہنا شروع کر دیا۔ یہاں ایک درزی کی کھپریل میں پڑے رہتے ہیں۔ اس غریب کے سر

بھی اس لیے پڑ گئے ہیں کہ اس کا چھوٹا بھائی ان کے ساتھ جلد ساز کی دکان میں کام کرتا تھا۔

داستان سناتے سناتے نفیس الدین صاحب نے کہا "آپ کو شاید ہماری باتوں کا یقین نہیں آرہا ہوگا کیونکہ آپ کے دوست......"

"مجھے ہر بات کا یقین آرہا ہے ان کی جائے رہائش میں نے دیکھی ہے۔ اور یہاں ہر شخص ان کی دوسروں سے فائدہ اٹھانے اور انہیں نقصان پہنچانے کی عادت سے واقف ہے بلکہ میں ان کے قصے سناؤں تو شاید آپ یقین نہ کریں۔ خیر، یہ فرمائیے کہ انہوں نے ایسی کیا حرکت کی ہے جس کی وجہ سے آپ لوگوں کو آنا پڑا ہے" میں نے کہا۔

دونوں حضرات ہنسنے لگے۔ نفیس الدین بولے "ہم جو امید لے کر آئے تھے وہ تو شاید پوری نہ ہو۔ آپ لوگ جب خود ہی ان سے نالاں ہیں تو انہیں کیا سمجھا سکتے ہیں۔ لیکن آپ اتنی ہمدردی سے پوچھ رہے ہیں تو بتانا ہمارا فرض ہے۔ چھ مہینے پہلے وہ گاؤں گئے تھے کہہ رہے تھے کہ چھوٹے باغ کے سارے درخت کٹوا کر ان کی لکڑی مجھے دے دو کیونکہ آبائی جائیداد میں کچھ میرے کام بھی تو آنی چاہیے۔ اس باغ کو بیس برس پہلے اچھی طرح تیار کیا گیا تھا اور اس وقت درختوں کی اتنی تیاری ہے کہ تیس چالیس ہزار میں بک جائے گا۔ خود انہیں کی دو لڑکیوں کی شادی کے لیے اس باغ کا سہارا لیا گیا ہے، ایک لڑکی کی شادی تو ہم لوگوں نے جوڑ توڑ کر کے کر دی تھی۔ لیکن انہیں اپنی اہلیہ اور اپنے بچوں کی پہلے بھی کب پروا رہی ہے جو اب ہوتی؟ درختوں کی آمدنی سے بلڈنگ کا کام شروع کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ہم لوگ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ ان میں انتظام کی کتنی لیاقت ہے۔ اس لیے ان کی تجویز سختی سے مسترد کر دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے گاؤں کے ایک اور سابق زمین دار سے سازباز کی۔ اس شخص کی زمین باغ سے ملحق ہے اور اس کا دانت باغ پر ہے۔ اس نے انہیں مقدمے کا خرچ دیا ہوا ہے اور ان سے وعدہ لے لیا ہے کہ مقدمہ جیتتے ہی پانچ ہزار روپے کے عوض باغ اسے فروخت کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دادا کے نام پر ایک جعلی وصیت نامہ تیار کیا ہے جس کی رو سے ان کے دادا اپنی زندگی ہی میں وہ باغ ان کے نام کر گئے تھے انہوں نے دعویٰ کر دیا ہے کہ ان کے والد ازراہ مکر اس وصیت نامہ کو دبائے بیٹھے رہے اور پچھلے دنوں گھر کے کاغذات میں وہ وصیت نامہ انہیں دستیاب ہوا ہے لیکن ان کے باپ اور چھوٹا بھائی اب بھی باغ کو ان کے قبضے میں نہیں دے رہے ہیں۔"

"کمال ہے صاحب" میں نے کہا۔ "یہاں ہم لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ وہ حد درجہ دروغ گو اور وعدہ فراموش شخص ہیں۔ لیکن اس درجہ جعل سازی کر سکتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ عموماً تو وہ ہر جگہ ایسی حماقتیں کرتے ہیں کہ دوسروں کی بجائے انہیں کا نقصان ہوتا ہے۔"

"سنا نہیں آپ نے، 'دیوانہ بکار خویش ہشیار'" بڑے میاں بولے۔ "اچھا اب اجازت ہو۔ بہت سمع خراشی کی آپ کی۔"
"افطار تک تو رکیے۔ شاید وہ بھی آجائیں۔ وہ روزہ تو نہیں رکھتے۔ لیکن افطار کہیں نہ کہیں ضرور کرتے ہیں۔ کوئی کہہ بھی رہا تھا کہ آج ان کا ارادہ میرے ہاں افطار کرنے کا ہے" میں نے کہا۔

ہم سبھی اس بات پر ہنسے لیکن وہ رکنے کو تیار نہ ہوئے کیونکہ خود ادیب کا سامنا نہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں آئیں۔ بولیں "کون تھے یہ لوگ؟" انہیں بھی ان دونوں کی ظاہری وضع قطع اور مہذب لہجے پر

تعجب ہوا کہ وہ بات چیت نہیں سن سکی تھیں۔ میں نے انہیں ادیبؔ جھانسوی کے ماضی اور حال سے مطلع کیا۔

وہ سن کر غیر معمولی طور پر متفکر ہو گئیں۔ اس وقت تو کچھ نہ بولیں لیکن رات کو کھانے کے بعد آ کر میرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ کہنے لگیں "ادیبؔ کے مقدمے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟"

میں بوکھلا کر بولا "میں کیا کر سکتا ہوں؟ کیا سمجھتی ہو، میرے سمجھانے سے سمجھ جائے گا؟"

"سمجھے یا نہ سمجھے، آپ کو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ باغ چلا جائے گا تو بے چاری لڑکیاں کنواری ہی بیٹھی رہیں گی کیا؟"

اب سمجھ میں آیا کہ بیگم صاحبہ ادیبؔ کے پیچھے کیوں پڑی ہیں۔ عورت ذات سب کچھ سہہ سکتی ہے کسی کی بیوگی یا کنوارپن نہیں سہہ سکتی۔ لیکن میں نے پھر وہی عذر کیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ ادیبؔ صاحب میرے سمجھانے سے سمجھیں گے نہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ لڑکیوں کو بیاہ سکوں۔

بیگم صاحبہ کچھ اور قریب کھسک آئیں اور پانچ منٹ تک سرگوشی کرتی رہیں۔ ان کی تجویز سن کر میں بھڑک اٹھا "تمہارا دماغ تو صحیح ہے بیگم! مجھ سے دھوکہ بازی کرنے کو کہہ رہی ہو؟"

"ہاں ہاں، آپ نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب کیوں بولیں گے؟ ادیب کو آپ نے پہلے تو کبھی دھوکا دیا نہیں ہے، دیا بھی ہے تو ہنسی ٹھٹھے کے لیے دیا ہے۔ اچھے کام میں تو دھوکے بازی دوستی آڑے آ رہی ہے۔"

راج ہٹ، بال ہٹ اور تریا ہٹ کی پائداری بچپن ہی میں میرے دل پر نقش کر دی گئی تھی۔ چنانچہ میں افسروں کی جا بے جا فرمائشوں پر اڑیل پن دکھاتا تھا نہ بچوں کی بے کار ضدوں کو مسترد کرتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی ہٹ تو کبھی کبھی ہوتی تھی۔ اس لیے صرف آدھ گھنٹے کی جھائیں جھائیں کے بعد میں نے، ان کی تجویز منظور کر لی۔ ویسے بھی میں اس بات میں ان سے اصولاً متفق تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن جب عورت کی طرف سے ایسی جراءت دکھائی جائے تو میں، نام ہی کے لیے سہی، بہرحال مرد تھا۔

دوسرے ہی روز ادیبؔ صاحب کے نام ایک لمبا خط لکھا۔ اس میں گذشتہ واقعات کے لیے معافی مانگی گئی تھی، ان کی ادبی کاوشوں کے لیے تعاون کا یقین دلایا گیا تھا اور عید کی شام کو کھانے پر بلایا گیا تھا۔ خط فوراً ڈاک میں ڈلوا دیا گیا۔

عید کے روز ادیبؔ جھانسوی کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ کھانے کو تر مال، ادبی رسالے کے ایڈیٹر کا مستقل تعاون کا وعدہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو مقدمہ انھوں نے دائر کیا تھا اس میں مدعی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونے کے لیے میں نے رضامندی دے دی تھی۔ ادیبؔ صاحب نے گھنٹوں تک بتایا کہ ان کے باپ ان کی بیوی بچوں پر کتنا ظلم ڈھاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ادیبؔ ادارۂ نشریات قائم کر کے خود کفیل بنیں۔ میں نے ان کی ہر بات سے اتفاق کیا۔

تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد گواہی کی تاریخ پڑی۔ میں نے دفتر سے رخصت لے لی۔ صبح ہی ادیبؔ صاحب مجھے اور دوسرے گواہ وسیم احمد کو لے کر اپنے وکیل کے پاس گئے۔ ادیب کو معلوم نہیں تھا لیکن وسیم میرا پرانا دوست تھا اور نہایت خود دماغ قسم کا آدمی تھا جو ہر معاملے میں اتنی منصف مزاجی دکھاتا تھا کہ ہم لوگ کالج کے زمانے میں اسے ڈان کوئک زوٹ کہا کرتے تھے۔ میں نے اس سے پہلے ہی بات کر لی تھی۔ ادیبؔ کے وکیل نے یقین دلایا کہ مقدمہ جیتا جتایا ہے۔ مدعا علیہ کا وکیل بالکل گاؤدی ہے اور اس کے گواہ چٹکی میں اڑا دیئے جائیں گے۔ ہم لوگوں سے کہا "آپ لوگ وصیت نامہ کی تصدیق کر دیجیے گا، ان کے بارے میں کہیے گا

بہت دیانت دار آدمی ہیں۔ اور یہ کہیے گا کہ ان کے دادا کے دوست مختار حسین نے برسوں پہلے آپ کو اس وصیت نامہ کے بارے میں بتایا تھا۔" یہ خیال رہے کہ مختار حسین وہی سابق زمین دار ہیں جو باغ ہتھیانا چاہتے تھے۔

عدالت میں مجھے مدعی کے گواہ کی حیثیت سے دیکھ کر نیاز الدین، شریف الدین اور نفیس الدین کی آنکھیں پھٹ گئیں لیکن میں نے ان کی طرف بڑی بے اعتنائی سے دیکھا۔ گواہی شروع ہوئی۔ حلف کے بعد مدعی کے وکیل نے مجھ سے پوچھا "آپ لطیف الدین کو کب سے جانتے ہیں؟" "تقریباً تین برس سے۔"

"ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اچھا خیال نہیں ہے۔ قابل اعتماد آدمی نہیں ہیں۔"

"کیا؟"

"بہت جھوٹے اور دھوکے باز قسم کے آدمی ہیں۔"

"وصیت نامہ آپ نے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کو اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟"

"صریحاً جعل سازی ہے۔ نہ کاغذ پچاس برس پرانا ہے نہ اس وقت کا کوئی منشی اتنی غلط سلط اردو لکھتا۔"

وکیل نے عدالت سے درخواست کی کہ ہمارا گواہ مناقض (HOSTILE) ہوگیا ہے، اس سے جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دے دی گئی۔ جرح میں بھی وکیل یا فریق مدعی کو کیا ملنا تھا؟ میں نے یہ بھی کہا کہ نہ میں مختار حسین کو جانتا ہوں نہ وہ مجھے جانتے ہیں۔ وصیم صاحب کی گواہی بھی میری طرح ہوئی، ہاں انہوں نے ادیب صاحب کی شان میں مجھ سے دوگنے الفاظ کا استعمال کیا۔ مدعی کا دعویٰ سرسری طور پر مسترد ہوگیا۔ میرے سہارے پر ادیب صاحب نے صرف دو گواہ پیش کیے تھے۔ اور وہ دونوں ان کے خلاف گئے۔

باہر نکل کر دیکھا ادیب صاحب اپنے وکیل سے الجھے ہیں۔ وکیل جھنجھلا کر کہہ رہا تھا "آپ نے خوب گواہ پیش کیے۔ آپ تو احمق ہیں ہی مجھے بھی ساری عدالتوں میں مورد تضحیک بنا دیا۔ اب تشریف لے جائیے۔ نہ مقدمے کی اپیل ہوسکتی ہے نہ اس مدعا پر دوسرا مقدمہ قائم ہوسکتا ہے۔"

مجھے دیکھا تو ادیب صاحب بولے "نظامی صاحب، قیامت میں اللہ آپ سے سمجھیگا۔"

میں نے کہا "میرے کام سے تو اللہ کی خوشنودی ہی ہوگی۔ آپ ضرور تائب ہو جائیں ورنہ جہنم کے دروازے آپ کے لیے کھل جائیں گے۔"

[پچھلے کئی ماہ سے ادیب کی سرگرمیوں پر جناب سرسوتی سرن کیف کے پُر مزاح اور دلچسپ افسانے شائع ہو رہے تھے۔ قارئین نے اس سلسلہ کو بے حد پسند بھی کیا تھا۔ یہ ان افسانوں کی آخری کڑی ہے —] (ادارہ)

جوہر سیوانی (سیوان، بہار)

"زندگی سخت ہوئی جاتی ہے پتھر کی طرح"

چوری کی، جیل گئے، رہتے ہیں لیڈر کی طرح
اُن کو آرام میسر ہے وہاں گھر کی طرح

دن کو دفتر میں نظر آئے جو افسر کی طرح
رات میں آئے نظر بیوی کے نوکر کی طرح

رات دن پڑتے ہیں مہنگائی کے اولے سر پر
"زندگی سخت ہوئی جاتی ہے پتھر کی طرح

گھر جمائی نہ بنو، کھانا پکانا ہوگا
کھٹنا ہوگا تمہیں سسرال میں کوکر کی طرح

آپ نیتا ہیں تو نیتا کی طرح رہیئے جناب
کیوں نظر آتے ہیں ہر موڑ پہ لوفر کی طرح

کوئی سرکار ہو، گدی کے پجاری چپکے
چپکے رہتے ہیں سدا کوٹ کے استر کی طرح

بنچ، کرسی کو چٹاؤ نہیں رشوت جب تک
فائلیں میز پہ جم جاتی ہیں پتھر کی طرح

وہی گپ شپ، وہی غیبت، وہی تاش و شطرنج
اب دفاتر نظر آتے ہیں کلب گھر کی طرح

دفتر اُردو کے کچھ رکن ہیں زہریلے ناگ
پھن جو پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں اجگر کی طرح

لکھ کے جو پڑھتے نہیں، پڑھتے ہیں لکھوا کے غزل
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ تاش کے جوکر کی طرح

اُن کے اشعار پہ، ہوٹنگ کی آندھی جو چلی
اڑ گئی ان کی غزل پھوس کے چھپر کی طرح

میری شہرت کے رقیبوں کی ہے پہچان یہی
بھنبھناتے ہیں اندھیرے میں وہ مچھر کی طرح

نئی تہذیب کے پیڑوں کی نئی ڈالوں پر
کودتے پھرتے نظر آتے ہیں بندر کی طرح

درد، غم، ٹیس، کسک کرتے ہیں مل کر حملہ
دل کے ایوان پہ افواجِ سکندر کی طرح

اُس کی شہرت سے جلن اور رقابت کیوں ہے
آئیے آپ بھی میدان میں جوہر کی طرح

مختار یوسفی (مالیگاؤں)

بُدّھو

مجنوں کا چچا، والدِ فرہاد ہے بدھو
دل پھینک ہے استادوں کا اُستاد ہے بُدھو

خود اپنے ہی فردوس میں آباد ہے بُدھو
ساجے کی غزل پڑھ کے بہت شاد ہے بُدھو

پچیس برس بیت گئے شوہری کرتے
جھنجھٹ سے مگر بچوں کی آزاد ہے بدھو

احباب کی محفل میں ہے بے دال کا بودم
سسرال کی نظروں میں پری زاد ہے بُدھو

روتوں کو ہنسا دیتا ہے بے عقلی سے اپنی
واللہ بڑا ہی ستم ایجاد ہے بُدھو

احباب کئی دن سے جو فقرے نہیں کستے
غمگین ہے، افسردہ ہے، ناشاد ہے بُدھو

مختار اسے ہوش کریں لاکھ سخن سنج
ٹلنے کا نہیں کشتۂ فولاد ہے بُدھو

رؤف خوشتر (بیدر)

لقوہ جوابِ لقوہ

یورپ اور ایشیائی باشندوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ان کے شب و روز میں بالترتیب قرض اور مرض کا بڑا دخل رہتا ہے۔ چنانچہ اول الذکر قرض نبھانے اور آخر الذکر مرض بڑھانے میں مصروف رہتے ہیں۔

شہروں میں مکانات، سینما گھر اور تعلیمی اداروں کے علاوہ شفا خانوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ اس بات کا مظہر ہے کہ اب ہم قلیل مدت میں علیل ہونے کا گُر جان گئے ہیں۔ اب تو ہمارا یہ حال ہے کہ جب تک مہینہ میں کم از کم ایک بار ڈاکٹر کے دیدار نہیں ہوتے جان کو چین نہیں ملتا۔ بعض حضرات تو اس تشویش کے ساتھ اپنے خاندانی معالج کے پاس دوڑ پڑتے ہیں کہ پورا مہینہ بخیر کیسے گزرا؟ انھیں کچھ بھی تو نہیں ہوا؟ کہیں کچھ نہ ہونا بھی کوئی نیا مرض تو نہیں؟

اب دل کے مریض بھی دلدار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ذیابیطس میں مبتلا خود کو دنیا کا سویٹ SWEET شخص بتلاتے ہیں۔ دردِ شکم میں تڑپنے والے خود کو کارل مارکس کا کٹر مخالف گردانتے ہیں۔ صاحب دردِ سر کا خیال ہے کہ عقلِ سلیم انہیں کے پاس ہے۔ غرض جتنے امراض کے آپ مالک ہوں گے اتنا ہی آپ کی سماجی حیثیت بلند ہوگی آپ ڈاکٹر کے یہاں طبیّ نہیں سماجی ضرورت کے لئے جاتے ہیں۔ اور وہ اسناد اور توصیفی دستاویز کے بجائے ایکس رے X RAY اور طبّی رپورٹ بتلاتے ہیں کہ دیکھو ہم بھی ہر ماہ ڈاکٹروں کو اتنی فیس دیتے ہیں۔ کیا امیر کیا غریب سبھی خود کو مریض کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ذرا سی چھینک بھی بھیک مانگنے والوں کو ماہرِ چھینک سے ٹھیک علاج کروا لینے پر مجبور کرتی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے اپنے چپراسی یوم الدولہ کو خلافِ توقع کاندھوں پر شال اوڑھے رکشہ میں سوار آفس آتے دیکھا تو ہم ہکا بکا رہ گئے (اس لئے کہ ہم پیدل آتے ہیں) اس نے ہمارے ظرف کو ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

.... ہم گذشتہ امرا اور وزیروں کو ہی دل کا مرض ہوتا تھا۔ اب تو جمہوری دور ہے کسی کو

معاملہ میں عوام خواص سے بھی پیچھے نہیں۔ راز کی بات بتلاؤں جب سے دفتر میں بالائی آمدنی چل رہی ہے بڑے صاحب کی طرح میرا بھی بینک اکاؤنٹ اور بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں پچھلے ہفتے سینہ میں فلش ہوئی۔ فوراً قلب شہر میں واقع دل کے بہترین ڈاکٹروں کے شفا خانہ میں شریک ہوا۔ ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ میرے سینہ میں بھی دل ہے اور دل نے امیروں کے دل کی طرح بل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے کرتب دکھائے۔ ڈاکٹروں نے پھیکی غذائیں اور مہنگی دوائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ میرا جگر دیکھئے کہ دل کے لئے دل کھول کر خرچ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹروں سے بھی کہہ دیا ہے کہ ؎

بل جو بھی بنے گا دے دیں گے ۔ دُنیا میں ہمارا دل ہی تو ہے

جہاں وہ اب تک آفس میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے اُونگھتا تھا وہاں اب وہ دل پر ہاتھ دھرے سوتا ہے۔ سرخ فیتوں والی فائل کو کسی خاص مجبوری کے سبب ذرا سا آگے بڑھانا مقصود ہو تو چپراسی کو بہ وقت تمام بمشکل جگانا پڑتا ہے۔ کام کرنے اور اُس کا فرض یاد دلانے پر لیٹے ہی لیٹے دل پر ہاتھ رکھ کر گنگناتا ہے۔ ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت غرض سے بھر نہ آئے کیوں
سوئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں اٹھائے کیوں!

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح طبقاتی فرق یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ بھاری مرض اور پرس والوں کے لئے آرام دہ شفا خانے ہیں۔

غریبوں کے لئے سرکاری شفا خانے ہیں جہاں ہر مرض اور عرض کے جواب میں ایک ہی دوا دی جاتی ہے۔ دوا جسے دیکھ پانی بھی پانی پانی ہو جائے۔ اور یوں بھی اِن دنوں سرکاری دواخانوں کی دوا، ریلوے اسٹیشنوں کے ہوٹلوں کی چائے اور پوسٹ آفسوں کے گوند میں پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو جب بھی پیاس لگتی ہے وہ قریب کے سرکاری دواخانہ سے کسی نہ کسی درد کا رونا رو کر ایک گلاس دوائی کرا پنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔

دوا پینے کا مرض اتنا عام ہوگیا ہے کہ اب ڈر ہو چلا ہے کہ کہیں خون کا عطیہ مہم کے وقت جسم سے خون کے بجائے دوا نہ نکلے اور بلڈ بینک والوں کو خون کے مختلف گروپ کے بجائے دواساز کمپنیوں کا لیبل نہ لگانا پڑے۔

اب ان شفا خانوں میں رشوت کا مرض پھیل گیا ہے۔ عملہ کو کچھ تھمانے پر آپ کو تمام سہولتیں اور راحتیں مہیا ہوں گی۔ اِس شور سے بھرے اور غموں سے گھرے ماحول میں سکون کے دو بہترین ٹھکانے، دواخانے اور جیل خانے ہو گئے ہیں۔

اگلے وقتوں میں دل کا سکون روح کا چین پانے کے لئے کعبہ کاشی کا عزم کرتے تھے اب وہ بڑے بڑے خانگی شفا خانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ جہاں کی ہر شئے سفید ہوتی ہے، عمارت، فرش، آلات، پلنگ، بستر اور نرسیں، ان میں عموماً سیاہ دولت والے ہی شرکت کی صحت اور شہادت رکھتے ہیں۔ وہ کچھ دل بیوی، انکم ٹیکس اور دوسرے سنگین مسائل سے دور اس سفید ماحول میں لیٹے ہی لیٹے سیاہ دولت حاصل کرنے اور چھپانے کے منصوبے بناتے

رہتے ہیں۔

اب سیاسی دنیا میں ایک نئی متعدی بیماری پھیل گئی ہے۔ کسی دن اچانک ہی قائد کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ مہنگے شفا خانہ کے ہمہ وقتی نگہداشت وارڈ (جہاں اس کی نگہداشت طبّی عملہ سے زیادہ اس کے سیاسی کارکن کرتے ہیں) میں داخل ہو جاتا ہے۔ بھولے بھالے عوام اس کی سلامتی اور صحت یابی کے لیئے اپنی صحت کو خطرہ میں ڈال کر رات رات بھر شفا خانہ کا چکر لگاتے ہیں۔ لیکن باشعور شہری سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی انٹرول ہے۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد قائد کی مکمل صحت یابی کی شہ سرخی حریفوں میں کھلبلی مچاتی ہے۔ قائد دواخانہ سے ڈاکٹروں کی پرچی کے بجائے ایک نئی پارٹی کا منشور لیئے نکلتا ہے، اس کے فوری بعد حزب مخالف کا قائد دواخانہ میں شریک ہوجاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں صحت مند معاشرہ کا بیمار اکھاڑہ۔ دواخانہ کا عملہ خاموش تماشائی بن کر ان عصری تبدیلیوں کو سمجھ جاتا ہے کہ

بستر تو وہی رہتا ہے مگر بیمار بدلتے رہتے ہیں

ایک زمانہ تھا لوگ تعلیم، کھیل کود میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب ماحول اور مواقع بدل گئے ہیں۔

ہمارے دفتر کے دو ساتھی ایک دوسرے کے کٹّر حریف تھے ہر معاملہ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ دونوں نے دوبارہ شادیاں کیں۔ دونوں رشوت لیتے پکڑے گئے اور معطل ہو گئے۔ پھر دونوں دے دلا کر بحال اور نہال (ترقی پاکر) ہو گئے۔

اِن میں ایک صاحب کو لقوہ ہو گیا۔ ہم نے دوسروں کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی اپنی صحت پر تف کہتے ہوئے کفِ افسوس ملنے لگے کہ اُن کا حریفِ سود و زیاں اب حریفِ ناتواں بن کر ایک معاملہ میں اُن سے آگے بڑھ گیا۔

پھر سُنا کہ اگلے مہینہ ہی دوسرے صاحب کو بھی لقوہ ہو گیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے متعلق تشویشناک خبریں سن سن کر خوش ہوتے ہیں۔

ہم تو شکوہ جوابِ شکوہ دیکھتے اور شکوہ جوابِ شکوہ سُنتے آئے تھے لیکن اسے کیا کہیں گے۔

چپراسی یوم الدولہ کب خاموش رہتا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا:

"اجی صاحب اسے کہتے ہیں" لقوہ جوابِ لقوہ"!

حفیظ بنارسی (بہار)

تذکرہ تنقید کا

○

پڑھ رہا ہوں ان دنوں میں فلسفہ تنقید کا
تاکہ آئے کچھ سمجھ میں مدعا تنقید کا

بیشتر نقاد کرتے ہیں ادب کی چیر پھاڑ
سرجری سے جوڑتے ہیں سلسلہ تنقید کا

چور دروازے سے گھستے ہیں ادب کی بزم میں
رہزنوں سے پوچھ لیتے ہیں پتہ تنقید کا

اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ ہے
اب کہاں کوئی اصول و قاعدہ تنقید کا

دوستوں کی مدح خوانی غیر کی تنقیص ہے
کس قدر اندوہگیں ہے ماجرا تنقید کا

کل وہ دقیانوسی ہوگا آج ہے جو تازہ تر
اس طرح تبدیل ہوگا زاویہ تنقید کا

سائنسی ہے مارکسی ہے نفسیاتی ہے کبھی
ٹوٹتا رہتا ہے ہر دم بلبلہ تنقید کا

کچھ ارسطو سے چرایا ایلیٹ سے کچھ لیا
بن گیا ہر مبتدی پھر پیشوا تنقید کا

واسطہ شیرینیٔ گفتار سے کچھ بھی نہیں
کس لئے کڑوا نہ ہو پھر ذائقہ تنقید کا

ٹھیکے داری چاہتا ہے جو ادب کی وہ سنے
سب سے اچھا ان دنوں ہے مشغلہ تنقید کا

شعر کی محفل میں جس کی دال کچھ گلتی نہیں
اپنے سر پر رکھ کے چلتا ہے گھڑا تنقید کا

اک مجاور کی طرح کھاتا ہے روٹی بیٹھ کر
ہاتھ جس کے لگ گیا ہے مقبرہ تنقید کا

ہے بلند اقبال کوئی حضرت اقبال سے
کوئی غالب کی بدولت ہے چچا تنقید کا

کشتیٔ نقد و نظر کو اے خدا تو ہی بچا
ہر اناڑی بن گیا ہے ناخدا تنقید کا

اس لئے برہم رہا کرتا ہے ہر نقّاد جی
کم بہت تخلیق سے ہے مرتبہ تنقید کا

نظم پڑھ کر میری کیوں مجھ سے خفا ہیں وہ حفیظ
روز کرتے تھے جو مجھ سے تذکرہ تنقید کا

○

جہانگیر انس

اُردو کی برکتیں

الیکشن میں منہ کی کھانے یعنی ضمانت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد میری حالت کٹی پتنگ جیسی ہو گئی تھی کل تک جو آگے پیچھے رہنا اپنی شان سمجھتے تھے اب وہ مجھے دیکھتے ہی راستہ بدل دیتے اور میرے سائے سے بھی دور رہنے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ مالی طور پر بھی مفلوج ہو چکا ہوں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ میں نے اپنی ساری جمع پونجی اس امید پر الیکشن مہم میں جھونک دی تھی کہ کامیابی کے بعد ایک کے بدلے میں سو بلکہ ہزار حاصل کر لوں گا لیکن ایسی الٹی ہوا چلی کہ خلاف امید پانسہ ہی پلٹ گیا۔ جس پارٹی کو عوام نے کچھ عرصے پہلے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا اسی کو سر آنکھوں پر بٹھا لیا اور جیسے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا ایسے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ ہاتھی کی طرح عوام کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ خوش ہیں تو پیٹھ پر بٹھائے پھریں گے اور مزاج بگڑا تو پیروں تلے روند دیں گے ہاتھی کی طرح کب یہ بھڑک اٹھیں گے اس کی پیشین گوئی بڑے سے بڑا جیوتشی بھی نہیں کر پاتا۔ ذاتی شکست سے زیادہ پارٹی کی شکست کا صدمہ تھا، اگر پارٹی جیت جاتی تو کسی نہ کسی محکمہ میں مجھے ایڈجسٹ کر ہی دیتی لیکن ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

میرے اس تاریک دور میں پرانے اور گھاگ سیاست داں "علامہ گڑگڑ" روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوئے "یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب تک اپنی شکست کا ماتم کرتے رہو گے میاں! بازی ہارنے کا نام ہار نہیں ہوتا۔ ہمت ہارنے کا نام ہار ہوتا ہے اور ایک حقیقی سیاست داں سب کچھ ہار سکتا ہے لیکن ہمت نہیں ہار سکتا!"

میں نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، سیاسی امیج کی بات الگ رہی مالی طور سے بھی کمر ٹوٹ چکی ہے"

"ارے بھئی سیاسی امیج بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی، اس کا ماتم کرنا فضول ہے۔ مالی طور سے کمر ٹوٹنے کا جہاں تک سوال ہے، سرجری کے اس ترقی یافتہ دور میں اس مرض سے چھٹکارا پانا مشکل نہیں صرف ہمت چاہیے۔ زندگی میں خاص طور سے سیاسی زندگی میں اگر کامیابی چاہتے ہو تو ہمیشہ اپنے پیش نظر یہ رکھو کہ ع

ہم سے زمانہ ہے زمانے سے ہم نہیں۔

تم زمانے کی پرواہ کرنا چھوڑ دو، زمانہ تمہاری پرواہ کرنے لگے گا، جو وعدہ کرو اسے بھول جاؤ، ہوشمندی کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے پُرجوش باتیں کرو، تمہارے نام کے نعرے لگیں گے اور لوگ تمھیں ایک کامیاب، سیاستداں سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھائیں گے ......"

علامہ گرگٹ کی بات کاٹتے ہوئے میں نے کہا "آپ کی باتیں سر آنکھوں پر، لیکن فی الحال تو میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"شب کی تاریکی کی گود سے ہی صبح کی روشن کرن نمودار ہوتی ہے۔ تاریکی کا ماتم کرنے کے بجائے حوصلہ سے کام لو کوئی ہنگامہ کرو، کوئی نیا شوشہ چھوڑو، اور کچھ نہیں تو اردو کے مسئلہ کو ازسرِنو زندہ کرو۔ جلد ہی الیکشن ہونے والا ہے اور الیکشن کے لیے اُردو ایک ایسا مسئلہ ہے جسے کسی بھی سیاسی پارٹی کے کاونٹر پر بھنایا جاسکتا ہے۔"

علامہ گرگٹ کا مشورہ میرے لیے مینارِ نور سے کم نہیں تھا۔ اردو ـــــ ہاں اردو کے مسئلہ سے بڑھ کر جذباتی مسئلہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس مسئلہ کو اٹھانے والے ہمیشہ ڈبل فائدے میں رہے ہیں۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام ـــــ نیک کام میں دیر کیسی، یا علی مشکل کشا کہہ کر میں نے لنگوٹ کس لیا۔ آنچ لگنے کی دیر تھی لوہا گرم ہونے لگا اور جب بالکل سرخ ہوگیا تو میں نے ہتھوڑا چلانا شروع کر دیا۔ "بہی خواہانِ اردو! اگر اردو کو ہم زندہ رکھنا چاہتے ہیں، اس کی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں سر اور دھڑ کی بازی لگانی ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں منعقد کرنے، جلوس نکالنے اور میمورنڈم پیش کرنے سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا وقت کا تقاضہ ہے کہ اعلیٰ پیمانہ پر آل انڈیا اُردو کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ حکومت یہ سمجھ لے کہ بہی خواہانِ اردو کی ہمت ابھی پست نہیں ہوئی ہے اور وہ اس وقت تک جدوجہد کرتے رہیں گے جب تک اردو کو اس کا جائز حق نہیں مل جاتا ـــــ اور اگر اس کے بعد بھی اردو کو اس کا جائز حق نہیں ملتا تو ہم غاصب سرکار کا بائیکاٹ کریں۔ اس کا تختہ الٹ دیں۔ اور قوت بازو سے اُردو کا جائز حق چھین لیں ....."

"اُردو کے لیے ہم جان دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"
"جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔"
"اُردو زندہ باد"

بہی خواہانِ اُردو کے حوصلہ کو جذباتی آنچ دے کر گرم کرنے کے بعد میں نے اپنے پروگرام کو عملی شکل دینا شروع کر دیا۔ علامہ گرگٹ کے مشورے پر ایک ہنگامی نشست منعقد ہوئی جس میں اردو بچاؤ "مورچہ" کا قیام عمل میں آیا۔ مورچہ کے صدر اُردو کے پرانے خادم اور نامی مقرر دُم دَم دھولپوری مقرر ہوئے۔ آنت پیٹ پوری، گُردہ کلیجی نگری اور دل خونوی برِاتفاق رائے نائبین صدر کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ ارجمند فرزند پوری جنرل سکریٹری اور کنگھی کیسو نگری، سہر تمنیوی اور دانت ہونٹوی سکریٹریز مقرر ہوئے۔ گڑبڑ گھوٹالوی خزانچی اور جہاں گرد بالوتی سکریٹری نشر واشاعت چنے گئے۔ اس کے علاوہ دس ممبران

پر مشتمل مجلس مشاورت بھی قائم کی گئی۔ علامہ گرگٹ نے مجھے مورچہ کا نگراں اور مشیر خصوصی بنا کر تمام عہدیداران کو میرے تابع کر دیا یعنی میں حسب منشا مورچے کا "خمینی" بن گیا۔

مورچہ کی پہلی نشست میں ہی کل ہند اردو کانفرنس" کی تجویز بہ اتفاق رائے پاس ہوگئی۔ پہلا مرحلہ بحسن وخوبی طے ہو جانے کے بعد عہدہ داران نے کانفرنس کے لیے جگہ، وقت اور تاریخ کا تعین کیا۔ اخراجات کا تخمینہ پچاس ہزار اور وصولی کا نشانہ ایک لاکھ روپیے بنایا گیا۔ بہی خواہانِ اردو کے جوش وخروش کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک لاکھ روپے کی "فراہمی" کل ہند اردو کانفرنس" جیسے اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے ایک معمولی بات تھی۔

گرگٹ بڑگھوٹالوی کو چند معاونوں کے ساتھ چندہ وصول کرنے کا کام سونپا گیا۔ موصوف بذات خود سرمایہ دار ہیں اس لیے دوسرے سرمایہ داروں سے اچھا تعلق رکھتے ہیں۔ عام حضرات سے قطع نظر وہ حضرات بھی جن کے بچے اردو سے نابلد ہیں اور جو بذات خود اردو کے رسائل یا اخبار خریدنا یا پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، خلاف توقع دل کھول کر چندہ دیا۔ ہدہد بنارسی نے تو کمال ہی کر دیا۔ انھوں نے دس ہزار روپے کا یکمشت چیک کاٹ کر حاتم کی روح کو شرمندہ کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ چندہ دیتے وقت انھوں نے طنزاً کہا کہ بقول عصمت چغتائی اردو مر چکی ہے اور اب اس کا کریا کرم ہونا باقی ہے۔ اور اس قسم کی کانفرنسوں کے ذریعے کریا کرم بھی انجام پا جائے گا۔"

بلبل بہاری بھی ہدہد بنارسی سے پیچھے نہیں رہے۔ موصوف کبھی اردو کے ادیب کی حیثیت سے خاص وعام میں کافی مشہور تھے لیکن جب لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ان کی مقبولیت ان کے گھر کے بجھے ہوئے چولہے میں آگ روشن نہ کر سکی اور بیوی نے مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آکر میکے میں رہنا شروع کر دیا، تو انھوں نے ادب سے رشتہ توڑ کر کوئلے سے جوڑ لیا یعنی کوئلے کی دلالی کرنے لگے۔ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالا ہوتا ہے لیکن روایت کے برعکس ان کے ہاتھ پیلے ہوگئے اور وقت کے ساتھ وہ کوئلے کے دلال سے جواہرات کے دلال بن گئے۔ انھوں نے ایک ہزار ایک سو ایک روپے ایک پیسے کا چیک کاٹ دیا۔

ادھر گرگٹ بڑگھوٹالوی چندہ کے لیے گرٹ پڑ گھوٹالا کرتے پھر رہے تھے تو ادھر جہاں گرد باتونی اور ڈم ڈم دھولپوری پروپگنڈا کے ساتھ اپوزیشن کے لیڈروں، پیشہ ور مقرروں، ادیبوں، شاعروں، ماہرین تعلیم، دانش وروں اور صحافیوں کو مدعو کرتے پھر رہے تھے۔

میں بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ جہاں داؤ لگ جاتا وہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتا۔ پریس والوں سے مفت میں نہایت ہی قیمتی کاغذ پہ خوب صورت سہ رنگا اشتہار، دعوت نامہ، رسید اور بھی کئی چیزیں شائع کرا لینا میرا معمولی کارنامہ تھا۔ کانفرنس کی صدارت مشہور سرمایہ دار توہم اجاڑآبادی کے نام الاٹ کی گئی اور اس کا معاوضہ میں نے حسب منشا حاصل کر لیا۔ مہمان خصوصی حضرات نے بھی اچھا نذرانہ پیش کیا۔

——وقت مقررہ پر نہایت ہی شان وشوکت کے ساتھ کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ مقرروں نے اپنی جادو بیانی

سے اردو والوں کے دلوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو وجد میں لا دیا۔ ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے اردو تعلیم کے مسائل اور اردو کی روشن تاریخ نیز ماضی اور حال پر اپنے بیش بہا خیالات سے سامعین کو نواز اپوزیشن لیڈروں نے اُردو کی بھرپور حمایت اور اردو والوں کی ہر ممکنہ مدد کا وعدہ کیا۔ آخر میں حسب روایت ریزولوشن پاس کیا گیا جس میں اردو تحریک کو تیز تر کرنے کی بات کہی گئی تھی اور بہی خواہان اُردو سے جدو جہد کی اپیل کے ساتھ کانفرنس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جب میں نے کانفرنس کے نتیجہ کا جائزہ لیا تو میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور میں علامہ گرگٹ کے زرخیز سیاسی دماغ کا قائل ہو گیا۔

الیکشن میں برسر اقتدار اردو دشمن پارٹی نے تھالی میں رکھ کر مجھے اپنا ٹکٹ پیش کیا۔ مجاہدین اردو نے مجھے اس شان سے جتا دیا کہ تمام مخالفین کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ ایم۔ یل۔ اے ہونے کے بعد نہ صرف مجھے نئی وزارت میں شامل کر لیا گیا بلکہ محکمہ تعلیم کا قلمدان مجھے یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ "اب اُردو کا معاملہ تمہارے سپرد ہے" اور جب اردو کی فائیل میرے پاس آئی تو میں نے اس پر یہ نوٹ لگا کر فائیل وزیر اعلیٰ کو واپس کر دی کہ

"اُردو بھی کوئی زبان ہے ؟"

عابدہ محبوب
(حیدرآباد)

آرٹ کے نمونے

شہر کی مشہور فیشن ایبل ہوٹل میں سویرے سویرے جھاڑو لگانے اور صفائی، ستھرائی کا کام چل رہا تھا۔ ایک ملازم کے ذمے ڈانس ہال کی صفائی کا کام تھا۔ جیسے ہی اس نے ڈانس ہال کا صدر دروازہ کھولا پہلے تو دم بخود کھڑا رہ گیا اور پھر زور زور سے چلانے لگا۔

"خون ...... خون ...... خون"

سارے ملازم اپنا اپنا کام چھوڑ کر ڈانس ہال کی طرف دوڑ پڑے۔ سب نے دیکھا ان کا ساتھی ڈانس ہال کے دروازے کی دہلیز پر کھڑا کانپ رہا ہے۔

"کیا ہوا؟ کہاں ہے خون؟" سب کا سوال ایک ہی تھا۔

"...... یہ دیکھو..." وہ بمشکل کہہ سکا۔ سب نے اس کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھا کہ ایک کان جس میں جھمکا اٹکا ہوا تھا، دروازے کی دہلیز سے ایک قدم کے فاصلے پر ڈانس ہال کے اندر پڑا ہوا تھا!

"ارے ...... وہ ...... وہ بھی تو دیکھو" دوسرے ملازم نے چلا کر کہا۔

"وہ بالوں کا گچھا جس میں گلاب کا ہیرپن لگا ہوا ہے۔"

"ہاں .... ہاں! واقعی ...... وہ دیکھو" سب ایک دوسرے کو بتلانے لگے۔

"لگتا ہے کسی لیڈی کا خون ہوا ہے۔" ایک ملازم نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

"مگر کب ہوا یہ خون؟" دوسرے ملازم نے سوال کیا۔

"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں خون کے وقت موجود تھا۔" پہلے ملازم نے دوسرے ملازم کو غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"ارے بھئی! قاتل وقت بتا کر تھوڑی آتا ہے" تیسرے ملازم نے جو ڈر گیا تھا کہا۔ "بس آتا ہے اور اپنا کام کرکے چلا جاتا ہے۔!"

"مگر لاش کہاں ہے؟ نظر نہیں آتی!" چوتھے ملازم نے ادھر ادھر تاک جھانک کرتے ہوئے پوچھا۔

"نظر کیسے آئے گی؟ قاتل نے چھپا دی ہوگی!" پانچویں ملازم نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے لے کر چلا گیا ہو ـــ!" چھٹے ملازم نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا" پانچویں ملازم نے دعویٰ کیا۔ "اگر ایسا ہوتا تو خون کے نشان تو نظر آتے!"

"خواہ مخواہ بحث کرنے سے کیا فائدہ! چلو اندر چل کر دیکھیں۔ آخر معاملہ کیا ہے؟"

ایک اور ملازم نے اپنی دلیری دکھائی۔

میں تو اندر نہیں آؤں گا۔" دروازہ کھولنے والا ملازم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

"بزدل! ڈرتا کیوں ہے! ہم سبھی تو ساتھ ہیں" دلیر ملازم نے ہمت بندھائی۔

تمام ملازمین نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ اور ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں ڈانس ہال میں داخل ہوئے۔ صدر دروازے سے تین گز کے فاصلے پر ڈانس کے لیے سنگ مرمر کا خوب صورت فرش تھا۔ ملازمین فرش کے قریب جاکر اک دم رک گئے اور ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے! ڈانس کے فرش پر جابجا خون کے چھینٹے تھے قریب ہی مرد کے ہاتھ کی ایک انگلی پڑی تھی جس میں نگینہ جڑی انگوٹھی بھی تھی۔ اور اس سے بالکل دو بالشت کے فاصلے پر دو دانت خون میں منجمد پڑے تھے۔!

دروازہ کھولنے والے ملازم کا حال بُرا تھا۔ "دیکھا! ایک نہیں دو خون، اسی لیے میں اندر آنے ڈر رہا تھا!"

دس خون ہونے دو! ہمیں کیا لینا دینا ہے۔" دلیر ملازم نے لاپرواہی سے کہا۔

"لگتا ہے یہ خون آپسی رقابت کا نتیجہ ہیں!" چوتھے ملازم نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"مجھے تو یہ کام کسی ویلن کا لگتا ہے! پانچواں ملازم جو پکچر زبہت دیکھا کرتا تھا بول پڑا۔" اس کم بخت نے ہیرو اور ہیروئن کو مار دیا۔"

"مگر لاشیں کہاں ہیں؟" دلیر ملازم کا تجسس جاری تھا۔

یہی تو سسپنس (suspense) ہے۔" پانچویں ملازم نے کہا "کسے پتہ لاشیں۔"

پانچویں ملازم کی بات ادھوری ہی رہ گئی! ڈانس ہال کے صدر دروازے پر ایک عمر رسیدہ ملازم جو ان سب کا انچارج تھا، کھڑا ان کو ڈانٹ رہا تھا!

"بے وقوفو! اندر جانے کی کیا ضرورت تھی! ذرا تو عقل سے کام لیا ہوتا! خون کا معاملہ ہے کوئی دل لگی تھوڑی ہے! خواہ مخواہ ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ چلو... جلدی باہر نکلو! میں نے منیجر صاحب کو فون کیا ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے!"

تمام ملازمین تیزی سے باہر نکل آئے۔ دروازہ کھولنے والے ملازم کا حال بُرا تھا کہ نہ جانے منیجر صاحب کیا کیا پوچھیں؟ بات تو صرف اتنی تھی کہ اس نے دروازہ کھولا تھا ـــــ بس!

"تو ڈرتا کیوں ہے؟ معمر ملازم نے مشورہ دیا۔" جو بات سچ ہے بس وہی کہہ دے۔! ہم کیا قاتل لٹیرے لگتے ہیں؟ اگر ہوتے تو ہوٹل کی نوکری کیوں کرتے؟ لارڈ بن کر بیٹھے ہوتے!"

"ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔!" دوسرے ملازمین نے دلاسا دیا۔

اتنے میں منیجر صاحب کی گاڑی آکر رکی۔ وہ تیز تیز قدموں سے بھاگنے کے انداز میں ڈانس ہال کی طرف آرہے تھے۔

"تم لوگ بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے پولیس کو بھی فون کردیا ہے۔"

منیجر صاحب بولے "وہ بس ابھی آتی ہی ہوگی!"

پولیس کا نام سن کر دروازہ کھولنے والے ملازم کا دم حلق میں آکر اٹک گیا۔ منیجر صاحب بولے جارہے تھے۔" مجھے تو یہ

ہم ہمارے کسی دشمن کا لگتا ہے جو ہماری ہوٹل کی ترقی دیکھ نہیں سکتا۔ وہ ہماری ہوٹل کی نیک نامی و شہرت کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ خیر میں بھی ایک ایک کو دیکھ لوں گا!" وہ بات کرتے کرتے ڈانس ہال کے صدر دروازے تک آگئے۔

یہ دیکھیے سرکار!' انچارج ملازم نے کان اور بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ہوں!" وہ کان اور بالوں کو دیکھتے ہوئے تیزی سے ڈانس ہال میں داخل ہوگئے۔ وہ ڈانس ہال کے سنگ مرمر کے فرش کے پاس جاکر ایک سکنڈ رکے اور پھر یکایک زور زور سے ہنسنے لگے اور ہنستے ہی چلے گئے۔ ملازم حیران ہوکر ان کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید خوف ناک منظر دیکھ کر وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔

"سرکار"! انچارج ملازم نے ڈرتے ڈرتے انھیں پکارا۔

منیجر صاحب ہنستے ہنستے یکدم رک گئے! اور غصے سے پلٹ آئے پھر اپنی گرج دار آواز میں ملازمین پر برس پڑے۔

"بے وقوف کہیں کے! خواہ مخواہ میری نیند حرام کردی! کھانا کھاتے ہو یا گھاس؟ تم احمقوں کو اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ کل رات پندرہ اگسٹ کی خوشی میں، پہلی بار اس ہال میں مشہور ڈسکو ڈانسرز کا مقابلہ ہوا تھا"!

اسمٰعیل ظریف

...... بولنے لگے

جو قافیہ بھی ہاتھ لگا بولنے لگے
وصلِ ردیف ہو نہ سکا بولنے لگے

شاگردِ ناخلف کی شرارت تو دیکھئے
استاد ہی کو خالی گھڑا بولنے لگے

جو باپ کو بھی باپ نہیں بولے آج تک
وہ کیوں پڑوسیوں کو چچا بولنے لگے

میرا خیال ہے کہ گئے بھائی کام سے
جو کھوٹے مال کو بھی کھرا بولنے لگے

چاندی جھلک رہی ہے اُدھر زلفِ یار میں
ہم پھر بھی اس کو کالی گھٹا بولنے لگے

گرمی کے مارے لگتا ہے بھائی نکل گئے
جو آندھیوں کو بادِ صبا بولنے لگے

ہم نے جدید لہجے میں اُن کو سُنا حضور
اب وہ چٹائی کو بھی ردا بولنے لگے

صورت بُری بنا کے وہ محفل سے اُٹھ گئے
ہم پھر بھی ان کو جانِ وفا بولنے لگے

جس شہر میں وفا کا جنازہ نکل گیا
کیوں اس کو آپ شہرِ وفا بولنے لگے

بولی جو بولنا ہے وہی بولئے جناب
یہ بار بار کیا ہے بھلا بولنے لگے

دو دو قلم سجانے لگے جیب پر ظریف
لگتا ہے تم بھی بول بڑا بولنے لگے

پاگل عادل آبادی

غزل

سفارش مل گئی ہوتی سہارا مل گیا ہوتا
یہ بیکاری سمندر ہے کنارا مل گیا ہوتا

اُڑا ہے دل کا راکٹ آرزو کے آسمانوں میں
نہیں گر چاند تو اک جھاڑو تارا مل گیا ہوتا

تمہارے چاہنے والوں کی لسٹ اب سامنے آئی
نکاح سے پہلے گر سگنل تمہارا مل گیا ہوتا

سمجھ کر شامیانہ اُس کو بھی لے کر چلا جاتا
اگر نوکر کو بیگم کا غرارا مل گیا ہوتا

مریضِ غم ملک الموت کو بھی ہاتھ دے دیتا
تمہارے کھیت کا آلو بخارا مل گیا ہوتا

بہا دیتے اگر تم چار آنسو قبر پر میری
بیچاری بکریوں کو کچھ تو چارا مل گیا ہوتا

یہ مانا ریل اپنی چل رہی ہے آخری پھر بھی
نیا ماڈل نہیں تو اک کھٹارا مل گیا ہوتا

تمہاری یاد میں پاگل بنا دیتا محل کوئی
اگر قسمت سے جادو کا پٹارا مل گیا ہوتا

شکیل شاہجہاں کامٹوی (ناگپور)

"اس کے باوجود"

ہماری ٹرینوں کا المیہ یہ ہے کہ اگر آپ پانچ منٹ دیر سے اسٹیشن پہنچیں تو ٹرین نہیں ملتی اور اگر ٹرین ملنے کی اُمید لیئے آدھا گھنٹہ پہلے ہی پہنچ جائیں تو ٹرین دو گھنٹہ لیٹ ملے گی ___ میں بھی ٹرین ملنے کی اُمید لیئے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پر پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ ٹرین پورے دو گھنٹے لیٹ ہے۔ اس وقت میرے سامنے بس ایک ہی سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے کیوں کہ فی زمانہ سینما ہال کے باہر اور اسٹیشن کے اندر وقت گزارنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپوزیشن پارٹی میں رہ کر اپنی مانگیں منوانا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جسے میں بور کرسکوں۔ دیکھا کہ ایک کنارے کُرسی پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ موقع کو غنیمت جان کر فوراً ان کی بغل میں جا بیٹھا۔ اگر ذرا سی بھی دیر کرتا تو کوئی دوسرا اس کُرسی پر بیٹھ جاتا کیوں کہ ہمارے ملک میں کرسی پر بیٹھنے کے خواہش مند لوگ بہت ہیں۔ جو کرسی کو حاصل کرنے کے لیئے بڑے سے بڑا کام کر گزرتے ہیں جسے انسانیت کی لغت میں جرم کہتے ہیں۔ اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ باتوں کا سلسلہ کسی طرح شروع کیا جائے۔ بارے خیال آیا اور میں نے پوچھا۔

"جناب کیا وقت ہوا ہے ___؟"

وہ صاحب مجھے نیچے سے اُوپر تک دیکھنے لگے۔

"بھئی میں آپ سے وقت پوچھ رہا ہوں"۔ میں نے ٹوکا۔

"گھڑی تو آپ کے پاس بھی ہے"۔ وہ صاحب گھورتے ہوئے بولے۔

"ہے تو مگر مجھے اس گھڑی پر اعتماد نہیں ہے"

"تو کیا یہ ریلوے سے نہیں ملی ہوئی ہے"۔ انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ گھڑی تو سسرال سے ملی ہوئی ہے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ شادی شدہ ہیں ــــــ؟" انہوں نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جی ہاں ــــــ شادی شدہ بھی ہوں اور مصیبت زدہ بھی!"

یہ سنتے ہی وہ صاحب زور سے ہنس پڑے۔

"اور آپ ــــــ؟" میں نے جھٹ سوال کیا۔

"میں ــــــ میں گھر جوائی ہوں ــــــ" انہوں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"یہ کس یونیورسٹی کی ڈگری ہے؟"

"سماج کی یونیورسٹی کی ــــــ" انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

سماج کی یونیورسٹی سے مجھے خیال آیا کہ بڑے بڑے شاطر چور، ڈکیت، لُچے لفنگے، سب سماج کی یونیورسٹی کے طالب علم یا فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

"ویسے آپ بننا کیا چاہتے تھے؟" میں نے مزید کریدا۔

"میں فلم کا ہیرو بننا چاہتا تھا۔ جب ہیرو نہ بن سکا تو گھر جوائی بن گیا۔"

"واہ صاحب!" میں نے کہا۔ "زندگی میں آپ کچھ تو بنے کیوں کہ کچھ نہ بننے سے کچھ بننا بہتر ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر آپ کسی کچہری کے کلرک نہ بن سکیں تو چپراسی ہی بن جائیں کیوں کہ چپراسیوں کو بھی خاصی رشوت مل جاتی ہے۔"

اتنے میں دس بارہ سال کا ایک لڑکا آیا اور میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر گڑگڑانے لگا۔

"بابوجی! دو روز کا بھوکا ہوں۔ کچھ پیسے دے دیجئے۔"

بھوک کا لفظ سنتے ہی میری نظر اس کی پھولی ہوئی توند پر پڑی۔ خیال آیا کہ توند تو لیڈروں کی بھی بہت پھولی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ ووٹ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔ "کیا تم سچ مچ بھوکے ہو؟"

"چاہے جو قسم لے لیجئے بابوجی، میں بھوکا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔

"تو ایسا کرو آج تم قسم کھا کر پیٹ بھر لو۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں آدھے لوگ قسم سن کر پیٹ بھرتے ہیں۔ اور آدھے لوگ قسم کھا کر پیٹ بھرتے ہیں۔"

"بابوجی! آپ کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی ہیں۔" لڑکے نے مجھے آگاہ کیا۔

"پلے پڑے گی بھی کیسے، بھوکے پیٹ تو بھجن بھی نہیں ہوتا۔ ایسا کرو تم میرے ساتھ چلو میں تم کو پیٹ بھر کھانا کھلاتا ہوں۔"

"نہیں بابوجی! آپ پیسے دے دیجئے میں خود کھا لوں گا۔" لڑکے نے عاجزی کی۔

شاید لڑکا ڈر رہا تھا کہ اس کو کسی محفوظ جگہ لے جا کر میں اس کے پیسے نہ چھین لوں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں پولیس کانسٹبل نہیں ہوں۔ میں تو سچ مچ تم کو پیٹ بھر کھانا کھلانا چاہتا ہوں۔ پیٹ بھر اس لئے کیوں کہ ہندوستان کے چالیس فیصد لوگ کچھ ہی موقعوں پر پیٹ بھر کھانا کھاتے ہیں۔ باقی دنوں میں وہ آدھا پیٹ کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہنستے

ہیں، کھیلتے ہیں، ناچتے ہیں اور ووٹ بھی دیتے ہیں۔

"نہیں بابوجی۔ آپ مجھے پیسے دے دیجئے" لڑکے نے پھر گڑگڑا کر کہا۔

"اچھا میں پیسہ دے دوں تو تم کیا کروگے" میں نے پوچھا۔

"سچ بول دوں بابوجی۔" لڑکے نے سر کھجاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تو کیا۔ تم جھوٹ بھی بولتے ہو ـــــ ؟"

"ہاں بابوجی! اگر میں سچ بولنا شروع کردوں تو بھیک کون دے گا"

"دیکھو۔ اگر تم سچ بولوگے تو میں نے جتنے پیسے دینے کی نیت کی ہے اس کا ڈبل دوں گا"

"سچ بابوجی ـــــ! تو سنو میں پکچر دیکھنے کے لئے پیسے مانگ رہا ہوں"

"تم کسی شریف خاندان کے لگتے ہو۔ تمہارے ماں پتا کہاں ہیں؟"

"پتاجی رکشہ چلانے چلے جاتے ہیں۔ اور ماں مٹی گارے کا کام کرنے نکل جاتی ہے۔ اور میں اسکول چلا جاتا ہوں۔ مگر اب ارادہ کرلیا ہے کہ اسکول نہیں جاؤں گا" لڑکے نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اسکول کیوں نہیں جاؤگے۔ پڑھوگے لکھوگے تب نا نواب بنوگے!"

لڑکے نے کہا "ماسٹر جی ہم کو سکھاتے ہیں کہ بری عادتوں سے بچو اور خود سگریٹ پیتے رہتے ہیں"

میں حیرت سے اس لڑکے کو تکنے لگا۔ عمر اتنی کم اور عقل اتنی ـــــ! دراصل عقل تو ہم بڑوں کو نہیں ہوتی۔ ہم بڑے لوگ نصیحت اپنے لئے رکھ لیتے ہیں اور فضیحت دوسروں میں بانٹ دیتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ اگر میں نے پیسے دے دیئے تو کون سی پکچر دیکھوگے"

"خون خرابہ ـــــ اور اگر ٹکٹ نہیں ملی تو پرائیویٹ لائف دیکھوں گا۔ لڑکے نے برجستہ کہا۔

"مگر پرائیویٹ لائف تو صرف بالغوں کے لئے ہے"

"سب کہنے کی بات ہے بابوجی۔ میں اس سے پہلے بھی بالغوں والی کئی فلمیں دیکھ چکا ہوں" لڑکے نے ذرا مسکراتے ہوئے جواب دیا ـــــ میں لیڈر نہیں ہوں اس لئے اپنا وعدہ فراموش نہیں کرسکا۔ میں نے اسے پیسے دے دیئے، وہ خوشی خوشی آگے بڑھ گیا ـــــ اتنے میں گھنٹی بجی۔ ٹرین آرہی تھی۔ گھڑی دیکھا ٹرین صرف پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ جب کہ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا تھا تو اس نے پورے دو گھنٹے لیٹ کی خبر سنائی تھی۔ اس وقت اسٹیشن ماسٹر کو ایک ذمہ دار آفیسر جان کر اس کی باتوں پر یقین کرلیا تھا۔ مگر اب کس پر یقین کروں؟ ـــــ خیر جوں توں کرکے کمپارٹمنٹ میں گھسنے میں کامیاب ہوا۔ اگر میرے پاس سامان ہوتا تو یقین مانیئے میں اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ بھیڑ حد سے زیادہ تھی۔ اس وقت مجھے ہندوستان کی آبادی کا صحیح اندازہ ہوا۔ ایک کے اوپر ایک لوگ جمے جارہے تھے ایسا معلوم ہورہا تھا۔ جیسے کمپارٹمنٹ میں انسانوں کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ ایک گھنٹہ کا یہ سفر اتنا اذیت ناک کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کسی مجرم کو بہت سخت سزا دینا ہو تو اسے جیل کی چاردیواری میں قید مت کرو بلکہ کسی سکنڈ کلاس کے بغیر ریزرویشن کمپارٹمنٹ میں سوار کرکے کسی لمبے سفر پر روانہ کردو آدھے سفر میں ہی وہ یہ کہہ دے گا کہ مجھے جیل کی چاردیواری میں قید رہنا پسند ہے لیکن اس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا اذیت ناک تھا

غزل ــــــ رؤف رحیم

انتخابات ہیں تیار، خُدا خیر کرے
گرم ہے خون کا بازار، خُدا خیر کرے

ہیں مذاہب کے علاقوں کے زباں کے جھگڑے
دیش میں پھوٹ کے آثار خُدا خیر کرے

لوگ آآ کے عیادت کو مجھے لوٹیں گے
پڑ گیا ہوں میں جو بیمار، خُدا خیر کرے

ہر ستم اُن کا گوارا ہے مجھے اے ناصح
بھائی اُن کے ہیں جمعدار خُدا خیر کرے

کیسے چل پائے گی جیون کی کھٹارا اپنی
کم سخن میں ہوں وہ طرار، خُدا خیر کرے

گن رہا تھا میں جو تارے تو نظر اُس پہ پڑی
وہ ستارہ جو تھا دُم دار خُدا خیر کرے

اُن کو لیڈر کہیں، مکار کہیں یا واعظ
بات کرتے ہیں لچکدار، خُدا خیر کرے

دھمکیاں دیتے ہیں میکے سے چلے آنے کی
سر پہ لٹکی ہے یہ تلوار، خُدا خیر کرے

پاس رہ کر مرے جیبوں پہ نظر ہے اُن کی
اُن کے مشکوک ہیں اطوار، خُدا خیر کرے

ہیپی بن کر ہی جو ڈھاتے تھے قیامت مجھ پر
آج پہنے ہیں وہ شلوار، خُدا خیر کرے

فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں معمول
ایسے بدلے ہیں کچھ اقدار خُدا خیر کرے

بہتے ہیں خون کے دریا تو کہیں آگ کا راج
کوئی اپنا نہیں غم خوار، خُدا خیر کرے

ساری تنخواہ رحیم اُن کے حوالے کر دو
آج غصّہ میں ہیں سرکار، خُدا خیر کرے

ھزل ــــــ نسیم سحر

○

شیخ کو مےسے اتنی اس لئے پرخاش ہے
خود تو وہ پیتا ہے چھُپ کر، یہ کھُلا عیّاش ہے

درحقیقت ہو گئی اس کو سزائے عمر قید!
کتنا احمق ہے کہ دولھا اس قدر بشّاش ہے

ہو گیا ہے شیخ اتنا اس لئے پرہیزگار
اب وہ جسمانی و مالی طور پر قلّاش ہے

دال، بیگم نے پکائی ہے کچھ اتنی گھوٹ کر
یہ پتہ چلتا نہیں ہے، مونگ ہے یا ماش ہے

قیس کو لیلیٰ بطور گِفٹ اے.سی بھیج دے
کب سے بےچارے کی اک صحرا میں بود و باش ہے

○

محمد طارق (مہاراشٹرا)

عشق کا انتظار

ہم پر جوانی کا نیا نیا دور تھا ــــــ

ہم گھنٹوں اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا کرتے تھے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے تھے کہ ایسے بحرانی دور میں اُس نے ہمیں جوانی عطا کی جبکہ آج کے اکثر و بیشتر انسانوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اُن کی زندگیوں سے جوانی اس طرح غائب ہے جیسے بازار سے اصلی اشیاء!

جوانی آتے ہی ہمیں ایک فکر نے بُری طرح جکڑ لیا تھا۔ چاروں طرف سے پکڑ لیا تھا۔ راتوں کے خراٹے ہم سے چھین لیے تھے اور دنوں کی نیندیں۔ رہ رہ کر بس ایک فکر لاحق ہو گئی تھی کہ جوانی کا فرض اولین ہمیں جلد ہی ادا کرنا چاہیئے یعنی عشق کرنا چاہیئے اور عشق کرنا چاہیئے اور . . . اور عشق کرنا چاہیئے! تاکہ بعد مرنے کے ہم خُدا کے حضور میں فخر سے سینہ تان کر کہہ سکیں یا خدا! ہم نے اپنی تمام زندگی عشق میں گزاری ہے اس معاملہ میں ہم بہت زیادہ تجربہ کار ہیں اس لئے حوروں کے حق دار پہلے ہم ہی ہیں!

تجربۂ عشق سے پہلے ہم نے تھیوری پڑھنا مناسب سمجھا

فلسفۂ عشق پر لکھی گئی کتابیں کھنگال لیں ــــــ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی خونچکاں داستانیں پڑھیں

اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عشق کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے۔

جس طرح مچھر کے کاٹنے سے ملیریا ہو جاتا ہے۔ سردی سے زکام، بخار، ہاتھ پیروں میں درد کی شکایت ہو جاتی ہے اسی طرح لڑکی کا لڑکے کو ــــــ عورت کا مرد کو۔ بوڑھی کا بوڑھے کو دیکھنے (بشرطیکہ ترچھی نظر سے ہو) اور دیکھ کر مسکرانے سے (بتیسی نظر نہ آئے ایسی مسکراہٹ) عشق لاحق ہو جاتا ہے۔

ویسے عشق کا ہونا اپنی اپنی طبیعت اور مزاج پر بھی منحصر ہے۔

شاعرانہ مزاج رکھنے والوں کو ایک ہی نظر ہماری عشق میں مبتلا کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ غیر شاعرانہ اکھڑ مزاج والوں کے لئے نگاہوں کے تیر نہیں بھالے بھی چبھ جاتے ہیں تو وہ عشق میں جلدی آہیں نہیں بھرتے۔ بھرتے ضرور ہیں لیکن ذرا دیر سے ـــــ آہیں عشق کی علامتوں میں سب سے اہم علامت ہے جس سے عاشق کے پھیپھڑے ہی پناہ نہیں مانگتے پڑوسی بھی!

دورِ جدید میں عشق میں مُبتلا ہونے کی اور بھی وجوہات کا پتہ لگا ہے جس میں خاص وجہ کسی لڑکی کو مصیبت سے بچانا اور اس کے شکریہ ادا کرنے پر سر جھکا کر، مسکرا کر کہنا "یہ تو میرا فرض تھا" اور پھر دھیرے سے اُس سے عشق کا ہو جانا ـــــ اسی وجہ سے آج بڑے پیمانے پر عشق ہو رہا ہے!

ہم بہت گھبرائے۔ پریشان ہو گئے ـــ پھر مایوس ہو گئے۔ اس لئے کہ ہم اتنے طاقت ور تو ہیں نہیں کہ کسی لڑکی کی مصیبت میں کام آتے لیکن ہمیں یقین تھا کہ کیوپڈ کا ہم پر نظرِ کرم ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ یقیناً ہوگا مگر دیکھنے دکھانے سے مسکراتے سے۔ رات دن ہمیں ڈر سا رہنے لگا۔ عشق کا کیا بھروسہ کہیں کالی کلوٹی لڑکی سے نہ ہو جائے جس کا بدن بھینس کی طرح ہو اس کے مقابل بیٹھ کر ہم سپیرے کی طرح عشق کی بین بجانا شروع نہ کر دیں اور وہ ادائے بے نیازی سے ہمیں دیکھے بالکل اُس بھینس کی طرح جو ہارن کی آواز سُن کر روڈ کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے اور تھوڑی ترچھی گردن کر کے دیکھتی ہے . . . . دیکھتی رہتی ہے پھر خراماں خراماں شہزادی کی سی چال سے چلی جاتی ہے۔

اس طرح وہ ہمارے عشق کی بین سُن کر دیکھے اور چلی جائے اور ہم دیوانوں کی طرح گھومتے رہ جائیں ـــ اس کے غم میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیں۔ اپنے بال نوچ کر گنجے ہو جائیں یا اس کے سرپرست ہی ہمیں گنجا کر دیں . . . .

خدا نہ کرے ہمیں ایسی لڑکی سے کبھی عشق ہو۔

اور ایسی مہذب لڑکی سے بھی نہ ہو جو ہمارے والد بزرگوار کا بینک بیلنس پوچھے، نفی میں جواب سُن کر معذرت چاہے اور اثبات میں سُن کر ہماری والدہ محترمہ بننے کے خواب دیکھنے لگے۔

ہمیں عشق ہو۔ ضرور ہو۔ فوراً ہو۔ پل بھر میں لیکن ایسی لڑکی سے، جو نیک ہو اور نیک سے زیادہ سیدھی سادھی بالکل ہر کہا ماننے والی شرمیلی (دوسروں کے ساتھ) اور ایسی حسین وجمیل جسے دیکھ کر مُلّا اپنا ایمان، پنڈت اپنا دھرم اور لیڈر اپنی کرسی چھوڑ دے اور . . . . نہیں . . . . نہیں یہ تمام اپنے دھندوں میں لگے رہیں۔ اپنا اپنا بیوپار خوب کریں۔ ہماری محبوبہ کو دیکھ کر اُن پر رائی کے دانے کے برابر اثر نہ ہو ـــــ ویسے اُن کی نظر نہ پڑے اس پر تو بہتر رہے گا کیوں کہ یہ ظالم! ہماری محبوبہ کو کسی بھی حالت میں ہم سے چھین لیں گے۔ اور ہماری ایسی دُرگت بنائیں گے جو لیلیٰ کے باپ نے مجنوں کی بھی نہیں بنائی تھی۔ شیریں کے والد محترم نے فرہاد کی بھی وہ دُرگت نہ بنائی ہو۔

ہماری محبوبہ کے والد محترم بہت مال دار ہوں۔ نیک دل دریا دل نہیں سمندر دل۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور ہمارے جذبۂ عشق کی جو اُن کی دُختر نیک اختر کے صرف ایک ہی بار مسکرا کر ترچھی نظر سے دیکھنے پر ہمارے دل میں

ہوگا، قدر میں سب کچھ چھوڑ دے۔ اپنی بڑی ساری بلڈنگ مال و دولت۔ سب کچھ اور اپنی قرۃ العین کو ہماری تحویل میں دے کر خود لنگوٹی لگاکر بیابانوں میں چلے جائیں۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیئے۔۔۔۔
خدا کرے ایسے باپ کی حسین و جمیل سیدھی سادھی بیٹی سے ہمیں عشق ہو جائے جلدی۔۔۔ فوراً۔۔۔۔

یہ گوارا نہیں

کریک بتیاوی

مغربی ملک کی عورتیں بیشتر
ان کا شوہر بدلنے کا ہے شغلہ
اس کہاوت میں سچائی کو ڈھونڈنے
اس نے دیکھا کہ یوروپین عورتیں
اپنے شوہر پہ دل جاں لٹاتی بھی ہیں
اس کی تحقیق کرنے کمر باندھ کر
ناگہاں ایک لیڈی پہ ٹھہری نظر
جھلتی جاتی تھی پنکھے سے وہ قبر کو
دیکھا سیاح نے اس کو حیرت ہوئی
وہ دبے پاؤں اس کے نزدیک چلا آیا
اس نے رونے میں اپنے اضافہ کیا
بعد کچھ دیر کے منچلے نے کہا
کس لئے اس قدر خوں لنڈھاتی ہیں آپ
ہچکیاں بھر کے عورت نے اس سے کہا
اس سے پہلے ہیں دو شوہر ان سے بائی فورس
چاہتا تھا مجھے یہ بھی ایمان سے
کیا کہوں یہ ستم پھر دغا ہو گیا
سن کے سیاح نے دکھ بھری داستاں
مشرقی عورتوں میں بھی دیکھا نہیں
مغربی عورتوں میں یہ نادر کمال
بولی اے نوجواں! یہ نہیں ہے بجا
مر گیا گر کہیں میں تو تم کو قسم
دوسری شادی بائی گاڈ کرنا نہیں
اس پر دستخط کا ہے یہ ادائے حسیں
خشک کرتی ہوں پنکھے سے میں قبر کو
یا خدا جلد ہو خشک خاک لحد

ایک شوہر پہ کرتی نہیں ہیں گزر
عہد پیری تلک ہے یہی فیصلہ
منچلا ایک یورپ گیا گھومنے
جو سنا تھا ہیں اس سے الگ شکل میں
اس کی میت پہ آنسو بہاتی بھی ہیں
شہر در شہر گھوما وہ شام و سحر
رو رہی تھی جو اک قبر پر رکھ کے سر
یہ کمال محبت ہے اسے دوستو!
اور حقیقت سمجھنے کی چاہت ہوئی
دیکھا عورت نے اس کو تو کیا پوچھنا
پنکھا جھلنے کا فن تیز تر کر دیا
مرنے والے سے رشتہ تھا کیا آپ کا
کیسلی مٹی پہ موتی لٹاتی ہیں آپ
مرنے والا تھا خاوند سوئم مرا
وائے قسمت کہ خود لے چکی ہوں ڈائی وورس
میں بھی قرباں تھی اس پہ دل جان سے
یہ بھی ہسبنڈ مجھ سے جدا ہو گیا
دی تسلی اسے اور کھولی زباں
ایسا سودا محبت کا میں نے کہیں
اپنے شوہر کی میت پہ یہ حال و قال
موت سے پہلے مجھ سے وہ کہتا رہا
جب تلک قبر کی میری مٹی ہو نم
میرے ارمانوں کا سہرا کھلتا نہیں
اب دلاؤں میں تم کو یہ کیسے یقیں
ہو رہی ہوں نہایت یہ کہ کے قبر کو
تا کروں اپنی شادی کی جہد و جہد

چوتھی شادی بغیر اب گزارا نہیں
میں ادھوری رہوں یہ گوارا نہیں

promise ۳ divorce ۲ grave ۱

یاد رفتگان

انیسہ سلطانہ
ریسرچ اسکالر (حیدرآباد)

عصمت اللہ بیگ

مرزا عصمت اللہ بیگ اُردو کے مزاحیہ شاعر اور ایک اچھے مضمون نگار تھے۔ فرحت اللہ بیگ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے والد بھوپال میں ڈاکٹر تھے۔ وہ بھوپال ہی میں پیدا ہوئے لیکن کمسنی ہی میں دہلی چلے گئے۔ وہ دہلی کے اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کو غالبؔ اور مومنؔ سے نسبت تھی۔ جس نے خواجہ امان مترجم "بوستانِ خیال" کو جنم دیا تھا۔ انہوں نے دہلی ہی میں ابتدائی تعلیم پائی۔ فارسی اپنے چچا مرزا عنایت اللہ بیگ (مرحوم) سے پڑھی۔ دہلی سے جب حیدرآباد آئے زمانہ کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ بھی انگلش میڈیم اسکول چادرگھاٹ میں داخل ہو گئے۔ انگریزی کا شوق چرایا تو اپنے نام کی مناسبت سے اپنا نام Goldsmith رکھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

یورپی رنگ اس قدر چھایا طبیعت پر مری
پہلے تو عصمت تھا میں اب گولڈ اسمتھ ہو گیا

عصمت اللہ بیگ کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چچا مرحوم شاعر تھے اور بھائی فرحت اللہ بیگ ملک کے شاعر اور مزاح نگار تھے۔ حکیم معشوق علی خاں جوہر کی صحبت نے اس ذوقِ علمی کو نکھارا۔ انہیں تعلیمات میں ملازمت ملی، ملازم ہو کر جب گلبرگہ گئے تو سجاد مرزا صدر مہتمم تعلیمات تھے جنھوں نے عصمت اللہ بیگ کی حوصلہ افزائی کی۔

نواب مسعود جنگ بہادر فرانسیسی ادب کے دلدادہ تھے۔ اُردو میں مزاحیہ ادب کی کمی کا انہیں شدید احساس تھا۔ جب انھوں نے عصمت اللہ بیگ کی شہرت سُنی تو انہیں اپنے یہاں بلوایا اور مزاحیہ نظمیں لکھوائیں۔ اس زمانہ کی نظموں میں شدید طنز تھا بلکہ تلخی بھی۔ موجود تھی بعض وجوہات کی بناء پر یہ نظمیں شائع نہ ہو سکیں۔

عصمت اللہ بیگ کو مصوری اور نقشہ کشی سے لگاؤ تھا۔ اور ان ہی دنوں دارالطبع سرکاری کی تنظیم اور ترقی کے مسائل پر غور ہو رہا تھا۔ نواب مسعود جنگ بحیثیت ناظم تعلیمات ان کو وظیفہ دے کر سروے جنرل سرکار عظمت مدار کے دفتر کو جو کلکتہ میں واقع تھا بھیج دیا تاکہ وہ بلاک بنانے کا طریقہ سیکھ کر دارالطبع سرکاری عالی میں اس شعبہ کو قائم کر سکیں۔

عصمت اللہ بیگ کی تصنیفات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ حیدرآباد کی کانگریسی حکومت	۲۔ پنج سالہ منصوبہ (باتصویر)	۳۔ مضامینِ عصمت
۴۔ ہمارا ہندوستان	۵۔ فنِ طباعت	۶۔ غلط در غلط
۷۔ زرین حکایات	۸۔ آسمان کے بھید	۹۔ رفیقِ اُردو داں
۱۰۔ یوگ آسن	۱۱۔ کاک ٹیل۔	

"دادا لال بھکڑ"۔ "گدھے کی عقلمندی"۔ "مچھلی خان"۔ "راجہ بیربل"۔ یہ چار کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئیں۔ "ایسوپ کی کہانیاں"۔ "انوارِ تبسم"۔ "حکیم معشوق علی خاں جوہر"۔ "جھنکار" بھی ان کی تخلیقات ہیں ۔ ان میں "کاک ٹیل" اور "انوارِ تبسم" مزاحیہ کتابیں ہیں ۔

عصمت اللہ بیگ نے "انوارِ ظرافت" کے نام سے سعدی و جامی کی حکایتوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اُن کے اہم کارناموں میں سے ایک حکایت رومی ہے اور دوسرا حکایتِ سعدی و جامی۔ یہ کتابیں فارسی میں رومی اور سعدی کے مخصوص طرزِ نگارش کی وجہ سے ادبی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ آسان نہ تھا دوسرے یہ کہ عصمت نے ان میں ادبیت اور ظرافت پیدا کر کے اس کو فارسی کی طرح دلچسپ بنا دیا!

عصمت اللہ بیگ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے جنھیں ان کی نوعیت کے لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۔ تعلیمی ۲۔ ادبی اور ۳۔ فنی۔

تعلیمی مضامین اکثر رسالہ "المعلم" میں چھپے جو حیدرآباد سے نکلتا تھا۔ ادبی مضامین زیادہ تر مزاحیہ ہیں۔ جن میں سے بعض اخبار "رعیت" میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں "حکیم جی کا مطب" ان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ حکیم جی کے تعلق سے لکھتے ہیں:۔

"سیدھے ہاتھ میں نرسل کی قلم یہ ان کے باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس سے نسخہ بھی لکھتے، کان کا میل بھی نکالتے، اس کی نوک ٹوٹی ہوتی کیونکہ اس سے خطِ شکستہ اچھا لکھا جاتا . . . . . حکیم جی مریضوں سے بڑی محبت کرتے ہیں، نسخہ لکھتے، دوائیں پلاتے ہیں۔ ناامیدی ہوجاتی ہے تو لیسین پڑھتے ہیں اور جب مرجاتا ہے کاندھا دے کر قبرستان تک پہونچاتے ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ مریض بھی ان پر جان دیتے ہیں۔"

"قاضی جی کی کارگذاری" جو سب رس ۱۹۳۶ء میں چھپا اور "ملاجی کا مکتب" نومبر ۱۹۳۸ء میں چھپا، یہ بہت اچھے مضامین ہیں۔

"ملاجی کے مکتب" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہم مکتب کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بڑا دالان ہے اور زمین پر بوریئے کا فرش ہے جو شائد باوا آدم سے بیشتر کا ہوگا۔ چھت سفال پوش تھی اور وہ بالکل قدیم رصدگاہوں کے نمونے پر بنائی گئی تھی یعنی اس میں ہزارہا سوراخ تھے۔ جن کے ذریعہ علم مناظر اور فلکیات کی عملی تعلیم . . . . . . دی جا سکتی ہے چنانچہ صبح کے وقت

نور کی اشاعت، نور کی ترکیب یعنی نور کی جہت کے سوراخوں سے گذر کر اس کی شعاعوں کو پہاڑ یا مختلف رنگوں میں تقسیم کرنے کے تجربے ہو سکتے تھے اور رات کے وقت نظام شمسی کے سیاروں کی گردشیں منطقۃ البروج دم دار ستارے اور شہاب ثاقب وغیرہ کا معائنہ نہایت تفصیل سے کیا جا سکتا ہے۔"

ایک اور مضمون حکیم معشوق علی خان جوہر پر لکھا جو رسالہ "ہجو لی" میں شائع ہوا تھا۔ ان کی مختصر سوانح کو عصمت نے ایک مزاحیہ افسانہ بنا دیا۔

عصمت بہت اچھے مزاحیہ شاعر بھی تھے "انوار تبسم" اور "کاک ٹیل" ان کے مزاحیہ کلام کے مجموعے ہیں۔

قدرت شاعر کو ایک ایسا ذہن عطا کرتی ہے کہ اگر وہ اپنے ذہن سے اچھے کام لے تو معمار قوم بن سکتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں ہمیں ایسے شاعر ملتے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے قوم کو انسانیت کے بلند ترین معیار پر پہنچانے کی کوشش کی۔ شاعر فطرت کا نقیب اور زندگی کا ترجمان ہے وہ مصلح قوم ہوتا ہے اور اپنی شاعری میں اپنے دلی جذبات کو سمو دیتا ہے۔ اس کی شاعری غم ذات اور غم کائنات پر محیط ہو سکتی ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے طنز و مزاح کے نشتر سے سماج کے ناسوروں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ عصمت اللہ بیگ کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر احتشام حسین ندوی طنز نگار شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں :—

"طنز نگار کسی کی دل آزاری کو اپنا مطمح نظر نہیں قرار دیتا وہ کسی کا نام بھی نہیں لیتا بلکہ اس کا طنز آفاقی ہوتا ہے وہ حماقتوں کے پردے فاش کرتا، سوسائٹی کے طرز عمل کو درست کرنے کا رجحان پیش کرتا ہے وہ جرم جس پر عدالت سنگین سزائیں عائد کرتی ہے۔ طنز نگار اس کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے کہ وہ مذاق جسمانی سزا سے کم اذیت رساں نہیں ہوتا۔" ؎۱

بعض وقت طنز شدید ہو تو اس میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز و مزاح کا سلیقہ عصمت کو فطری طور پر عطا ہوا تھا۔ چونکہ ان کی طبیعت میں زندہ دلی، بذلہ سنجی اور طنز و ظرافت کی فراوانی تھی، انہوں نے اپنے لئے مزاحیہ شاعری کا انتخاب کیا اور اس میں شہرت حاصل کی۔

عصمت کی شاعری کی خصوصیت آمد اور فطری ظرافت ہے۔ انھیں معشوق علی خاں کی صحبت میں ضلع جگت اور رعایت لفظی کا چسکا لگ گیا تھا جسے انہوں نے آخر وقت تک اپنے کلام میں جگہ دی۔ یہ صفتیں ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ ان کے کلام میں روانی بھی ہے اور پر لطف تکلف بھی ہلکا پھلکا اور لطیف مزاح بھی عصمت اللہ بیگ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں پند و نصیحت ہے اور نہ گہرا طنز۔ اس قسم کی نظموں میں "بڈھا دولہا" اور "گڈے اور گڑیا کا بیاہ" نہایت مقبول ہیں۔ عصمت اللہ بیگ کو حیدرآباد کے اکثر صاحبانِ ذوق 'اکبر دکن' کے نام سے ملقب کرتے آئے ہیں۔ عصمت اور اکبر کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا وہ ہے قوم کی اصلاح۔ غدر کے بعد مسلمان اپنی شامت اعمال کا نتیجہ بھگت رہے تھے۔ فضول خرچیوں اور تعیش پرستیوں کا دور دورہ تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت دکن کی بھی تھی۔ شکست و ریخت کے اس دور میں عصمت اللہ بیگ نے

؎۱ ۔ سید احتشام حسین ندوی "طنز مزاح کا نظریاتی مطالعہ" (مضمون) سب رس، جنوری ۱۹۷۳ء

قومی اصلاح کے معاملے میں وہی رنگ اختیار کیا جو اکبرؔ الہ آبادی نے کیا تھا۔ یہاں اکبرؔ اور عصمت کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصد ہے کہ یکسانیت نے ان کی شاعری میں بعض جگہ مماثلت پیدا کردی بعض اشعار تو بالکل اکبرؔ ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سیاسی تحریک ہوم رول سے عصمت اللہ بیگ بھی متاثر ہوئے تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کا بنیادی مسئلہ معاشی نوعیت کا ہے۔ سیاسی آزادی کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے کہا تھا۔ ؎

جو گھر چلتا رہے عصمت یہی ہے ہوم رول اپنا
نہ ہو کچھ ہاتھ کی تنگی یہ مطلب ہے فریڈم کا

ان اشعار میں بھی اکبرؔ ہی کا رنگ جھلکتا ہے ؎

درّہ کے طلسموں کو توڑا ہے جپا تم نے — اب تم سے بدکتے ہیں چینی ہو کہ جاپانی
ایٹم سے تمہارے بھی عالم پہ کھلے جوہر — پر تم نے نہیں سمجھا کچھ جوہر انسانی

"یورپ کا کچھوا" عصمت کی مشہور نظم ہے۔ جس میں انہوں نے ایسے نوجوانوں کا نقشہ کھینچا ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے یورپ جاتے ہیں لیکن وہاں کی رنگینی میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ اپنے عظیم مقصد کو بھول جاتے ہیں، چنانچہ وہ نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

رات دن اپنے گزارو تم حصولِ علم میں
زلف و عارض میں نہ کھو دینا کہیں شام و سحر

اکبر الہ آبادی نے اپنے بیٹے عشرتی کو نصیحت کرتے ہوئے یہی باتیں بتائیں۔ اس نظم میں انہوں نے تین قسم کے غوطہ خوروں کے بارے میں بتایا ہے ایک تو وہ ہے جو "اصلی گہر" دریا کی گہرائی سے نکال کر لاتا ہے۔ بعض صرف موتیاں ہی نکال لیتے ہیں۔ ایک ایسا بھی غوطہ خور ہے جو ؎

ڈھونڈ کر لاتا ہے ایک دریا سے وہ سیپی بڑی
دیکھتا ہے اس کو جب خشکی میں باہر ڈال کر
ایک بڑا کچھوا دکھائی دیتا ہے چلتا ہوا
جس کو وہ سیپی سمجھتا تھا وہ کچھوا ہے مگر

تم سمندر پار سے کچھوا نہ لے آنا کہیں
لے کے تم جو کچھ چلو اس کو سمجھ لو بیشتر

"گڈے گڑیا" کی شادی میں ایک اہم مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے۔ یہ نظم پڑھ کر مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم حیدرآباد نے انھیں ایک اشرفی عطا فرمائی تھی۔ ۱؎

۱؎ عصمت اللہ بیگ۔ "انوارِ تبسم" - صفحہ ۳۵۰

عصمت اللہ بیگ نے سیاسی موضوعات پر بھی کئی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں ان میں بھی ظرافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے "ووٹ اور نوٹ" میں الیکشن کے زمانہ میں لیڈر جو عوام کا استحصال کرتے ہیں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ؎

نوٹوں کو رکھا سامنے پر دیکھو تماشہ ۔۔۔ جاتا ہے اُدھر ووٹ کہ آتا ہے اِدھر نوٹ
ہر ووٹ کا اک نوٹ ہے ہر نوٹ کا اک ووٹ ۔۔۔ لو ایک اِدھر نوٹ تو دو اک اُدھر ووٹ
اللہ کی قدرت ہے کہ یاروں کی کرامت ۔۔۔ پڑتا ہے اُدھر ووٹ نکلتا ہے اِدھر نوٹ

عصمت ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے انہیں عوام کے مسائل اور پریشانیوں کا پوری طرح احساس تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے عوام معاشی طور پر تباہ ہو چکے تھے۔ "یہی بس ہے" میں اسی حالت زار کی عکاسی کی گئی ہے۔

پیچھے بیوی ہے گود میں بچہ ۔۔۔ سر پہ گھر بار ہے یہی بس ہے
سوزِ الفت سے میرا کشتہ دل ۔۔۔ قائم التار ہے یہی بس ہے
تن پہ کپڑا اگر نہیں نہ سہی ۔۔۔ سر پہ دستار ہے یہی بس ہے

زاہدوں کی دو رنگی ہمیشہ ہی سے طنز کا نشانہ بنتی رہی۔ زاہد ایک طرف تو وعظ و نصیحت کرتا ہے لیکن خود اس پر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اسی لئے تقریباً ہر شاعر نے زاہدوں پر طنز کیا۔ عصمت نے زاہد پر جس تیکھے پن سے طنز کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

بہار مئے دیکھنا اگر ہے تو دیکھ لو آکے اس کی صورت
کہ میکدے سے یہ پیر زاہد چلا ہے کیا شوخ و شنگ ہو کر

"انوارِ تبسم" میں سنجیدہ اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ بعض وقت حالات نے انہیں اتنا مایوس و مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کے اشعار بھی نظم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے ؎

کس بلا کی تیرگی اے چرخ نیلی فام ہے
کبھی پتہ چلتا نہیں یہ صبح ہے یا شام ہے

یہ شبِ غم ہے کہ یارو موت کا پیغام ہے
کوئی دم میں اب تو صبحِ زندگی کی شام ہے

عصمت اللہ بیگ کے طرزِ ادا میں سادگی اور بے ساختگی موجود ہے۔ اس میں فطری ظرافت ہے۔ چاہے موضوع کوئی بھی ہو انہوں نے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ انہیں الفاظ پر عبور حاصل ہے اور ان کے اشعار میں بلا کی سلاست اور روانی موجود ہے۔ "جوتیاں چٹخیاں میری" انداز بیاں کے اعتبار سے اچھی نظمیں ہیں۔ عصمت کی بہترین نظموں میں "نوکری کا کانسٹی ٹیوشن" "یورپ کا بچھو" اور "ووٹ اور نوٹ" "جوتا چور" "رکشا والا" "بھارت کا لشکر جرار" شامل ہیں۔

"انوارِ تبسم" میں تشبیہات اور استعارات کی کمی ہے۔ اکبر سے مماثلت اور مزاحیہ موضوعات کی یکسانیت کے باوجود دونوں میں معیار کا ذرا سا فرق ضرور محسوس ہوتا ہے۔

(انتخاب کلام ص ۴۲ پر)

مرزا عصمت اللہ بیگ

رہیں گے

پابند نہ ہم اِف (IF) کے نہ اب بَٹ (BUT) کے رہیں گے
رسّی تری زلفوں کی مگر بٹ کے رہیں گے

جو سر کہ تصور میں کسی لٹ کے رہیں گے
وہ گیسوئے جاناں کی طرح کٹ کے رہیں گے

کچھ روز رہا اور جو پٹرول پہ راشن
سب موٹریں اُڑ جائیں گی اور جھٹکے رہیں گے

اک برقِ بلا سوز ہیں آہوں کے میرے بم
نکلے جو اگر دل سے تو پھر پھٹ کے رہیں گے

دو چار اگر ہاتھ رقیبوں پہ جما دوں
میلوں ترے کوچے سے وہ پھر ہٹ کے رہیں گے

ہرگز نہیں کچھ دخل خواتین کا اس میں
پردے یہی کہتے ہیں کہ ہم پھٹ کے رہیں گے

سمجھے نہ اگر اب بھی وہ رفتارِ زمانہ
جھٹکوں پہ صدا کھاتے ہوئے جھٹکے رہیں گے

ہو جائے گی اس بزم میں جو غیروں میں کشتی
پھر لطف بڑے دیکھنا جت پٹ کے رہیں گے

سولی پہ چڑھے غیر تو ہم بانس پہ چڑھ جائیں
ہرگز نہ کسی سے کبھی ہم گھٹ کے رہیں گے

بلواتا ہے گر بزم میں جلدی سے بلا لو
کب تک ترے دروازے پہ ہم لٹکے رہیں گے

برابر

ہو جاؤں کھڑا اگر جو کہیں ڈٹ کے برابر
پھٹکے نہ کوئی پھر تیری چوکھٹ کے برابر

راشن کے سبب سے ہوا پتلون گھٹنا
نخرے رہے قائم ترے گھونگھٹ کے برابر

دشمن ہوئے سب پچھلے دریچوں سے نفرو
دیکھا جو مجھے یار کی چوکھٹ کے برابر

ڈر ہے مجھے اے شیخ کہ یہ ریشِ مبارک
رندوں میں نہ ہو جائے کہیں بٹ کے برابر

تم شیخ کی معصوم اداؤں پہ نہ جانا
جب دیکھو نظر آئیں گے پنگھٹ کے برابر

سُن لیجئے عصمت کے بقائے کا خلاصہ
کہتے ہیں کہ وہ ہو گیا کٹ چھٹ کے برابر

مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار)

انسان ساز

(پردہ اٹھتا ہے)

(ایک مکان کا ڈائننگ روم. ٹیبل پر ناشتہ رکھا ہوا ہے. ڈاکٹر صاحب، شہلا، اور شاہدہ ناشتہ کر رہے ہیں. اسی وقت ارشد ایک شخص کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

ارشد :- ڈیڈی، یہ سلیم ہے. میرا دوست. ان دنوں بھاگلپور یونیورسٹی میں لکچرر ہے. ہم دونوں سائنس کالج کے ہاسٹل میں روم میٹ تھے.

ڈاکٹر صاحب :- ہاں، یاد آیا. تم اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کی بے حد تعریف کیا کرتے تھے.

ارشد :- بیٹھو سلیم. تمہیں ان لوگوں سے تعارف کرا دوں. یہ ہیں میرے ڈیڈی، ای. این. ٹی اسپیشلسٹ. یہ میری بہن ڈاکٹر شہلا ہے، ہارٹ اسپیشلسٹ. اور یہ میری وائف شاہدہ ہیں.

سلیم :- غالباً یہ بھی ڈاکٹر ہیں. تم نے خط میں لکھا تھا. آپ کس بیماری کی اسپیشلسٹ ہیں؟

ارشد :- یہ میٹرنیٹی اسپیشلسٹ ہیں.

سلیم :- اوہو. لیکن زمانے کے لحاظ سے انہیں ضبط تولید اسپیشلسٹ ہونا چاہیئے.

(سبھی ہنستے ہیں)

ڈاکٹر صاحب :- غالباً تم ہمارے یہاں پہلی بار آئے ہو؟

سلیم :- جی ہاں، ارشد کی شادی میں آنا چاہتا تھا لیکن عین موقع پر بیمار پڑ گیا.

شہلا :- آپ کو چلا آنا چاہیئے تھا. یہاں چار چار ڈاکٹر ہیں. آپ کی بیماری ہوا ہو جاتی.

سلیم :- بس غلطی ہو گئی.

ڈاکٹر صاحب :- ان دنوں یونیورسٹی بند ہے شاید. کب کھلے گی

سلیم :- ایک مہینہ کے بعد.

ڈاکٹر صاحب :- تب یہیں آرام سے چھٹیاں گزارو. یہاں موسم بھی اچھا ہے.

شہلا :- گھر کی طرح رہیئے یہاں.

سلیم :- گھر کی طرح؟ تب تو گھر سے باہر رہنے کا مزہ ہی جاتا رہے گا.

شاہدہ :- مذاق چھوڑو. شہلا ٹھیک کہہ رہی ہے.

سلیم :- لیکن ڈاکٹروں کے بیچ رہ کر میں کیا محسوس کروں گا

شہلا :- ہمیشہ یہی محسوس کریں گے کہ بیماری نزدیک نہیں پھٹکے گی۔ جانتے ہیں، بیماری ہمارے محلے سے گزرتے ہوئے خوف کھاتی ہے۔

سلیم :- یقیناً خوف کھاتی ہوگی۔ اور ارشد میں تو تمہیں مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر بنانے کے لئے تم اپنے بچے کو میڈیکل کالج بھیجنے کے چکر میں نہ پڑنا۔

ارشد :- کیوں ؟

سلیم :- اس لئے کہ تم دونوں کے ڈاکٹر ہوتے ہوئے تمہارا بچہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ساتھ پیدا ہوگا۔ آچھیں۔ آچھیں۔ آچھیں . . . . آآ . . . آ . . . . . چھیں۔

ارشد :- ارے تمہیں چھینکیں آرہی ہیں!

سلیم :- نہیں کوئی . . . آچھیں . . . بات نہیں . . چھیں . . . . ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- بات کیوں نہیں ہے۔ یہ چھینکیں غیر معمولی ہیں۔

شہلا :- جی ہاں یہ چھینکیں یوں ہی نہیں ہیں۔

ارشد :- چلو، سلیم، اندر کمرے میں چلو۔ تمہارا یہاں بیٹھنا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر صاحب :- (نوکر کلو کو آواز دیتے ہوئے) : اے کلو اِدھر آؤ۔ جلدی۔

(کلو داخل ہوتا ہے)

کلو :- جی صاحب۔

ڈاکٹر صاحب :- دیکھو، یہ صاحب مہمان آئے ہیں۔ ارشد کے کمرے کے بغل والا کمرہ ان کے لئے کھول دو۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

کلو :- (جاتے ہوئے) اچھا صاحب۔

سلیم :- (ارشد کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے)

دوست، مجھے بیمار کیوں بنا رہے ہو۔ میں ایک دم ٹھیک

ارشد :- ابھی ٹھیک ہو۔ لیکن کسی وقت بھی بخار آسکتا

سلیم :- کہیں اس دور اندیشی کے چکر میں میرا کھانا نہ کرا دینا۔

ارشد :- بس۔ چپ چاپ لیٹ جاؤ۔ کھانا تو بند ہوگا صرف پھل، دودھ اور کانجی کی اجازت ملے گی۔

سلیم :- (بستر پر بیٹھتے ہوئے) مگر یار، میں صبح سے بھوکا ہوں۔ تم جانتے ہو میں سفر میں کھانے کا عادی نہیں ہوا اب اس وقت ناشتے کی میز پر بیٹھا ہی تھا کہ . . . . !

ارشد :- (بات کاٹتے ہوئے) باتیں پھر ہوں گی۔ پہلے ہاتھ بڑھاؤ۔ نبض دیکھوں گا۔

سلیم :- تم بخار دیکھنا چاہتے ہو۔ لو، دیکھو تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

ارشد :- (کلو کو آواز دیتے ہوئے) کلو، ذرا میرے کمرے سے میرا باکس لے آنا۔ (کلو فوراً باکس دے جاتا ہے)

سلیم :- اب کیا ارادہ ہے۔

ارشد :- (باکس سے سیرنج نکالتا ہے) انجکشن دینا ضرور ہے۔

سلیم :- تم نہیں مانوگے۔

ارشد (سیرنج بھر لینے کے بعد) ہاتھ دو۔ ہاں! مَن مانی کی نہیں چلتی، ڈاکٹر کی چلتی ہے۔

سلیم :- ٹھیک کہتے ہو۔ جس پر من مانی کرنی ہو اسے بیمار بنا دو۔ لو، لگاؤ انجکشن۔

(ارشد انجکشن لگاتا ہے۔ سلیم منہ بناتا ہے)

ارشد :- تم بہت ہی پیارے دوست ہو۔

سلیم :- سبھی ڈاکٹروں کی نظر میں ہر بیمار پیارا لگتا ہے۔

ارشد :- اچھا۔ اچھا۔ زیادہ بڑبڑ نہ کرو۔ یہ چار ٹیبلٹس رکھ رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد دو کھا لینا۔ اور رات کو سوتے وقت دو۔ پانی کے ساتھ۔

سلیم :- اس کے بعد؟

ارشد :- اوہ! تم نے ٹھیک یاد دلایا۔ ذرا زبان دکھاؤ۔ ہاں اور باہر نکالو۔ اچھا اب سینہ دیکھنے دو۔ (اسٹیتھسکوپ سے دیکھتا ہے) سانس کھینچو زور سے ... چھوڑو۔ ہاں۔ اب مجھے بلڈ پریشر بھی دیکھ لینے دو۔

سلیم :- آخر اس سے فائدہ؟

ارشد :- ہر بیمار اسی طرح کے سوالات کرتا ہے۔ خاص کر پڑھا لکھا بیمار۔ آج کل پڑھے لکھوں کا علاج کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

سلیم :- اناڑی لوگ ایسا کہتے ہیں۔

ارشد :- کیا میں اناڑی ہوں؟ باتیں کرنے کی تمہاری بری عادت نہیں گئی ہے۔

سلیم :- کھانا تو ملے گا نا؟

ارشد :- قطعی نہیں۔ تمہیں پھلوں کے سوا کچھ نہیں کھانا ہے۔

سلیم :- نہ معلوم کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔

ارشد :- کل صبح تمہارا اسٹول اور یورین ٹسٹ ہوگا۔

سلیم :- کیوں؟ آخر مجھے بیماری کیا ہے؟

ارشد :- دراصل بیماری کی ہر چیز ہم ٹسٹ کرتے ہیں۔ جہاں تک بیماری کا سوال ہے مجھے لگتا ہے تمہارا ایک لنگ انفیکٹڈ ہے۔

سلیم :- انفیکٹڈ ... مطلب یہ ہے کہ مجھے ٹی بی ہے؟

ارشد :- آثار ایسے ہی لگتے ہیں۔

سلیم :- کیا تم سنجیدہ ہو؟ ویسے تم کس بیماری کے اسپشلسٹ ہو ...؟

ارشد :- ٹی بی اسپشلسٹ۔

سلیم :- تب تو مجھے ضرور ڈرنا چاہیئے۔

ارشد :- کیوں؟

سلیم :- مجھ میں ٹی بی پیدا کرکے چھوڑ دوگے۔

ارشد :- بکواس نہیں۔ اچھا میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ کوئی ضرورت ہو تو کلو کو پکار لوگے۔

(ارشد کے جاتے ہی ڈاکٹر صاحب آجاتے ہیں۔ ہاتھ میں باکس ہے)

ڈاکٹر صاحب :- کیسی حالت ہے سلیم! تمہیں اس طرح بیٹھے نہیں رہنا چاہیئے۔ لیٹ جاؤ۔

سلیم :- میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ڈاکٹر صاحب :- تمہارے کہنے سے میں نہیں مان سکتا۔ اگر بیمار نہیں ہو تو کیا، ہو سکتے ہو۔ اس طرح بیٹھے رہو گے تو انفلوئنزا، تھروٹ پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔

سلیم :- (لیٹتے ہوئے) بجا فرمایا۔ آپ ای این ٹی کے اسپشلسٹ ہیں نا۔

ڈاکٹر صاحب :- ہاں، نبض دکھاؤ ... زبان نکالو۔

سلیم :- ابھی ارشد دیکھ کر گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- وہ بچہ ہے۔ مجھے دیکھنے دو۔ اب چھاتی ... سانس زور سے کھینچو ... چھوڑو ... اب پیٹھ دکھاؤ ... پہلے کی ہی طرح سانس کھینچو ... چھوڑو۔ اب یہ تھرمامیٹر لگاؤ۔

سلیم :- بلڈ پریشر تو نہیں دیکھیں گے نا؟

ڈاکٹر صاحب :- وہ بھی دیکھ لیتا ہوں ... اور ایک انجکشن بھی دے دیتا ہوں۔

سلیم :- ابھی ارشد دے گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- (انجکشن دیتے ہوئے) ارشد اور میرے تجربے میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ایک شیشی دیتا ہوں، اس میں تمہارے لیئے دوا ہے۔ تین تین گھنٹے بعد لیتے رہنا (باکس سے شیشی نکال کر دیتے ہیں)

سلیم :- مجھے بیماری کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب :- لگتا ہے، تمہارے گلے کی خرابی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔

سلیم :- لیکن گلا تو میرا صاف ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- ابھی تو مجھے بھی صاف لگتا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کل وہ ایسا ہی رہے۔

سلیم :- میرے اِنر اور لنز میں بھی خرابی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- میں اس پر بھی غور کر رہا ہوں۔ لیکن گلا کی خرابی ہی سمجھ میں آرہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کینسر نہ ہو جائے۔

سلیم :- یا خدا . . . کیا آپ کینسر کے بھی اسپیشلسٹ ہیں؟

ڈاکٹر صاحب :- نہیں۔ مگر تم فکر مت کرو۔

سلیم :- کھانا تو کھا سکتا ہوں؟

ڈاکٹر صاحب :- ابھی نہیں۔ تین دن بعد۔ جب تک مرض کا پورے طور پر پتہ نہ چل جائے۔ کھانا بند رہے گا۔ پھل، دودھ چائے استعمال میں رکھو۔

سلیم :- اچھی بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی تکلیف ہو تو اطلاع دینا۔ (ڈاکٹر صاحب جاتے ہیں اور ابھی سلیم سانس بھی نہیں لے پاتا ہے کہ شاہدہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں باکس ہے)

شاہدہ :- کہو سلیم، طبیعت کیسی ہے؟ تمہاری علالت سے ہم سب بے حد فکر مند ہیں۔

سلیم :- شکریہ، بہت بہت شکریہ۔

شاہدہ ذرا نبض دیکھوں۔

سلیم :- میں سب کچھ دکھا چکا ہوں بھابی۔ ایک بار نہ دو بار۔

شاہدہ :- کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ بار بار دکھانے بیمار کا کیا جاتا ہے۔

سلیم :- (ہاتھ آگے کرتا ہے) دیکھئے نبض دکھانے بعد زبان، سینہ اور پیٹھ بھی دکھا دوں گا۔ تھرمامیٹر لگالوں گا۔

شاہدہ :- بہت سمجھ دار ہو۔ اب زبان دکھاؤ . . اب چھاتی . . . سانس کھینچو . . . چھوڑو .

سلیم :- تھرمامیٹر لگانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

شاہدہ :- کیوں؟

سلیم :- دو بار لگا چکا ہوں۔ دونوں بار نارمل آیا

شاہدہ :- آج نارمل ہے۔ لیکن کل ٹمپریچر ہو سکتا ہے (باکس سے سیرنج نکالتی ہے)

سلیم :- (گھبرا کر) کیا آپ بھی انجکشن لگائیں گی؟

شاہدہ :- یقیناً۔

سلیم :- لیکن . . . .

شاہدہ میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ جلدی سے آگے کرو۔ (سلیم ہاتھ آگے کر دیتا ہے)

سلیم :- آخر مجھے ایسی کونسی بیماری ہے کہ مسلسل انجکشن دیئے جارہے ہیں۔

شاہدہ :- یہ سب پوچھنا تمہارا کام نہیں ہے۔ مریض کو مرض سے لاعلم ہونا چاہیئے۔ اس لیئے خاموشی سے پڑے

سلیم :- بھابی! آپ کس بیماری کی اسپیشلسٹ ہیں؟ میں

ہدہ :۔ میں کسی بیماری کی نہیں بلکہ میٹرنیٹی کی اسپشلسٹ ں۔

لیم :۔ کہیں مجھے میٹرنٹی کی بیماری تو نہیں؟

(شاہدہ ہنس پڑتی ہے)

اہدہ :۔ مذاق چھوڑو۔ میں ڈیوٹی پر جا رہی ہوں۔ یہ ٹس ٹیبل پر رکھے دے رہی ہوں۔ آدھ آدھ گھنٹے کے تین تین لوگے۔

(شاہدہ جاتی ہے)

یم :۔ (خود سے) آدھ آدھ گھنٹے کے بعد تین تین۔ ارشد ایک ایک گھنٹے کا حکم دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب الگ ادے گئے ہیں۔ اگر میں اتنی دوائیں کھا گیا تو اگلے سات تک میرے بال بچوں کو بھی کوئی بیماری نہیں ہوگی۔

۔ . . . میرا بازو کیسی ٹیس اٹھ رہی ہے۔

شہلا :۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) یہ آپ ہی آپ بڑبڑایا جا رہا ہے؟

سلیم :۔ (آنکھیں بند کرتے ہوئے) جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔

شہلا :۔ آخر بات کیا ہے؟ آنکھیں کھولیئے۔

سلیم :۔ (آنکھیں کھولتے ہوئے) جل تو جلال تو، آئی بلا کو ل تو۔

شہلا :۔ میں سمجھ ہی رہی تھی کہ وہ چھینکیں معمولی نہیں تھیں۔ ب دیکھئے اتنی جلدی سرسامی کیفیت ہو گئی ہے۔

(شہلا باکس کھول کر انجکشن نکالتی ہے)

سلیم :۔ (ہڑبڑا کر اٹھتا ہوا) خدا کے لئے انجکشن نہ دیجئے دلوں بازو پھوڑا ہو رہا ہے۔

شہلا :۔ (سلیم کو لٹاتے ہوئے) ایک بچے کی طرح چپ چاپ لیٹے رہیئے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں آپ کی بہتری کے لئے کر رہی ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔

سلیم :۔ لیکن انجکشن سے پہلے نبض دیکھئے۔ زبان دیکھئے۔ چھاتی، پیٹھ، ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دیکھئے۔ انجکشن بعد میں دیجئے گا۔

شہلا :۔ مجھے سبق مت پڑھایئے۔ نبض وغیرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کا مرض سمجھ گئی ہوں۔

سلیم :۔ کون سی بیماری ہے مجھے۔

شہلا :۔ آپ کو بتلا کر میں فکر مند کرنا نہیں چاہتی۔ ویسے میں ہارٹ اسپیشلسٹ ہوں۔ اس لئے سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کو دل کی بیماری ہے۔ ایسے میں سخت آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم لوگ انسان ساز اور مرض شناس ہیں۔

سلیم :۔ خطرے کی بات نہیں ہے جب بھی کف ٹسٹ ہوگا، اسٹول اور یورین ٹسٹ ہوگا۔ چار چار بار بلڈ پریشر دیکھا جا رہا ہے۔ کل شاید ایکسرے بھی ہو۔ ادھر انجکشن پر انجکشن لگائے جا رہے ہیں اور گولیاں اور مکسچر کا تو شمار ہی نہیں۔

شہلا :۔ زیادہ بولنا بھی آپ کے لئے نقصان دہ ہے۔ لایئے ہاتھ بڑھایئے۔

سلیم :۔ نہیں، میں انجکشن نہیں لوں گا۔ اگر کھانا کھلا دیجئے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بھوک سے حالت غیر ہو گئی ہے۔

شہلا :۔ کھانا؟ کھانا تمہارے لئے زہر ہے۔ صرف پھل کھا سکتے ہو۔ لیکن پہلے انجکشن۔

سلیم :۔ ایک منٹ۔ ذرا میں باتھ روم سے آ رہا ہوں۔

(سلیم بستر سے اٹھا اور کھلے دروازہ سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔ وہ اپنے پیچھے شہلا اور کلو کی چیخ پکار سن رہا تھا۔ مگر بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا) سلیم :۔ (بڑبڑاتے ہوئے) جان بچی تو لاکھوں پائیں . . . . !

(پردہ گرتا ہے)

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

"ہمارا شہر خوبصورت ہے...."

ہمیں نہیں معلوم کہ خواندگی سے شہری زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے یا نہیں لیکن خواندگی کے تناسب میں اضافہ سے شہر میں نعرے لکھنے کا فن ضرور ترقی کرتا ہے۔ ماضی کے برخلاف آج ہمارے شہر میں جگہ جگہ کوئی نہ کوئی نعرہ لکھا نظر آتا ہے۔ ہر دیوار ایک نوشتۂ علم ہے۔ کہیں "ہم دو ہمارے دو" تحریر ہے تو کہیں "مزدور اتحاد زندہ باد" کا نعرہ لکھا ہوا ہے۔ ایک بورڈ پر "کتے آپ کے دوست ہیں" تو دوسرے پر "کمزور طبقات پر ظلم نہ کیجئے" پینٹ کیا ہوا ہے۔ ایسے ہی کئی اور نعروں کے ہجوم میں یہ نعرہ، ایک عرصہ دراز تک ہمارے شہر کی زینت بنا رہا

"ہمارا شہر خوبصورت ہے، اِسے خوبصورت بنائے رکھیئے"

اس نعرہ کی خوبی یہ تھی کہ ہر کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا تھا۔ جسے دیکھئے نعرے کے سامنے ٹھہرے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کاندھے اچکا کر اور ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی راہ لگتا تھا۔ ہم نے بھی کئی مرتبہ اس نعرہ کے بارے میں غور و فکر کیا ہے۔ لیکن پتہ ہی نہیں چلا کہ ہمارے شہر کی خوبصورتی کیا اور کیسی ہے تو پھر جناب والا شہر کو خوبصورت بنائے رکھنے کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ حیدرآباد کے شہری مختلف طریقوں سے شہر کو بدصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن میں فرقہ وارانہ فسادات سرفہرست ہیں۔ اس موضوع پر کیا لکھیں۔ لکھتے لکھتے سیاہی بلکہ خون تک خشک ہو چکا ہے کسی کے الفاظ میں حیدرآباد شہر اور اس کے شہریوں کو فسادات کی عادت ہو گئی ہے؟

اس نعرہ سے کئی غلط فہمیوں نے جنم لیا ہے۔ دوسرے شہروں کے لوگ حیدرآباد آئے اس نعرہ کو پڑھا اور ایمان لے آئے۔ انھیں شہر حیدرآباد واقعی خوبصورت لگا اور وہ یہیں بس کر حیدرآباد کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھانے لگے۔ اسی لئے شہر حیدرآباد میں ہر شہر بلکہ ہر ملک کے لوگ بستے ہیں۔ حیدرآباد کی متوطن آبادی نے جب اس نعرہ کو پڑھا اور حقیقت کے خلاف پایا تو ہجرت کر کے دوسرے شہروں میں بسنے لگے۔ مختصراً ہمارا شہر اسی نعرہ کی بنا پر کاسموپولیٹن شہر بنا۔ کاسموپولیٹن شہر کی تعریف بھی یہی ہے کہ ایسے شہر میں دوسرے شہروں کے متوطن لوگ بستے ہیں جبکہ خود اس کے متوطن، دوسرے شہروں کا رُخ کرتے ہیں!

انسانی زندگی میں اکثر خوبصورت موڑ آتے ہیں لیکن خوبصورت شہر میں ہر موڑ خطرناک ہوتا ہے ہمارے شہر کے راستوں میں کئی موڑ بلکہ قدم قدم پر ایک موڑ ہے۔ موڑ پر کسی سواری یا خود موڑ سے بغیر ٹکرائے گزر جانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ملک الموت کی طرح اچانک کوئی سواری سامنے سے بھڑ جائے اس مڈبھیڑ کے علاوہ ہر موڑ پر کچرے کا ڈھیر ایک مستقل فیچر ہے۔ کچرے کے اطراف آس پاس کے لوگوں کا پیش کردہ صبح کے آرٹ کا منظر بکھرا پڑا ہوتا ہے۔ جس کی خوشبو دُور سے آنے لگتی ہے! ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ حیدرآبادی شہری اگر ناک پر کپڑا رکھنے لگیں تو شاید پہننے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہو۔ اسی لئے ہم نے ناک کو اس بُو کا عادی بنالیا ہے۔ اور جناب کوئی حیدرآبادی اس بُو سے بچنے پر مُصر ہے تو اُسے کوئی بڑا سیاسی عہدہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ شہر میں "بڑے آدمی" کی آمد پر کچرا صاف کیا جاتا ہے، جراثیم کش پوڈر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ سڑکوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ اسٹریٹ لائٹ کو کارکرد بنایا جاتا ہے۔ ہر حیدرآبادی شہری بڑا آدمی نہیں بن سکتا اس لئے خوبصورت شہر کا عام شہری راستوں پر اچھلتے کودتے اور گرتے اُٹھتے بدبو میں چلنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

"ہمارا شہر خوبصورت ہے" انسانوں سے زیادہ جانوروں کو اس نعرہ پر یقین محکم ہے۔ مچھر اور مکھیاں سال کے بارہ مہینے شہر میں مستقل ڈیرہ جمائے ہوتے ہیں۔ جب دیکھئے شہر کی خوبصورتی کا فائدہ اٹھا کر شہریوں میں بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ مویشیاں شہر کی سڑکوں پر انسانوں سے زیادہ آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ چوراہے اور سہ راہے مویشیوں کے پسندیدہ مقامات ہیں جہاں وہ جگالی کرتے ہوئے محفل مشاعرہ یا مذاکرہ منعقد کرتے ہیں۔ سڑکوں پر جانوروں کی فری اسٹائل کشتی اور آپسی محبت اور عہد و پیماں کے خوبصورت نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ جانور شہر کی بے ہنگم ٹریفک کو بھی سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر کنٹرول کرتے ہیں۔ ٹریفک پر قابو اتنا موثر ہوتا ہے کہ اکثر ٹریفک رُک جاتی ہے۔ روزمرہ کے حرکات و دواں ہیں اگر حیدرآبادی شہری مداخلت کریں تو مویشیوں کو غصہ آتا ہے اور وہ شہریوں کی خوبصورتی بگاڑنے پر تل جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم ایسے ہی حادثہ سے دوچار ہوئے۔ گدھے کی دولتی کھا کر کئی دن فریش رہے۔ دوست احباب عیادت کے لئے آتے اور کہتے "آپ نے کمال کر دیا۔ ٹکر بھی لی تو گدھے سے! برادری کا معاملہ لگتا ہے"!

ترقی اپنے ساتھ کچھ تقاضے اور تحدیدات بھی لے آتی ہے۔ ہمارا شہر ترقی کرنے کے باوجود اپنے شہریوں پر کوئی پابندی عائد نہ کرسکا شاید اس لحاظ سے ہمارا شہر خوبصورت ہے۔ حیدرآبادی شہری ایک دوسرے کی زمین پر قابض ہو سکتے ہیں۔ سڑکوں پر دھڑلے سے کاروبار کر سکتے ہیں۔ راستوں پر اپنے مکان اور دوکان کو بڑھا لے سکتے ہیں اور تو اور جب چاہیں جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں ایک یا دو انگشت والی ضرورت پوری کر سکتے ہیں! ایسے ہی کوڑا کرکٹ پھینکنے اور پان کی پیک تھوکنے کے لئے بھی مقام کی قید نہیں ہے۔ کوئی چاہے تو شہریوں پر کچرا پھینک سکتا ہے۔ پان کی پیک سے کپڑے خراب کر سکتا ہے۔ موز کے چھلکے پھینک کر شہریوں کی ہڈیاں تڑوا سکتا ہے۔ اس ضمن میں چند شہریوں نے جنہیں اس نعرہ کی سچائی پر تھوڑا بہت یقین تھا، شہر کی خوبصورتی قائم رکھنے اور کچرا ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ کو کوڑا کرکٹ بھینٹ کیا۔ اس کے باوجود بھی ہمارا شہر خوبصورت نہ بن سکا۔

ہمارا شہر پوسٹرس اور اشتہارات کا شہر ہے راستوں کی دونوں جانب اور اُوپر ہورڈنگس پوسٹرس لگے ہوتے ہیں تو سڑک پر اشتہارات لکھے ہوتے ہیں۔ معروف سڑکوں اور خطرناک راستوں پر پوسٹرس اور اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ حدِ نگاہ تک پوسٹرس ہی پوسٹرس نظر آتے ہیں جن پر فلمی اداکار کم سے کم کپڑوں میں بہت خوبصورت نظر آتے ہیں۔ ان کا تصویری حسن، ادائیں اور ہوش ربا مناظر شہریوں کا دل موہ لیتے ہیں حیدرآبادی شہریوں کا محبوب مشغلہ پوسٹر بینی سے شروع ہو کر فلم بینی پر ختم ہوتا ہے۔ اکثر شہری پوسٹر بینی کے لئے پیدل چلتے ہیں تو بعض شہری پوسٹروں کے سامنے آنکھیں پھاڑے گھنٹوں کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں حیدرآباد شہر میں یہی پوسٹرس خوبصورت لگتے ہیں۔ لیکن صرف فلمی پوسٹرس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر "ہمارا شہر خوبصورت ہے" کہنا شاید زیادتی ہے بلکہ یہ بھی ایک فلمی ڈائیلاگ لگتا ہے۔ فلمی پوسٹرس کے تعلق سے ہمارا تجربہ عبرت انگیز ہے۔ ایک مرتبہ ہماری نظریں ایک خوبصورت اور کم عمر فلمی حسینہ کے پوسٹر پر لگی رہیں، ذہن تو خیر لو اسٹوری میں اُلجھا رہا۔ نتیجتاً ہم نٹ پاتھ پر چار دل خانے چت ہوئے اور اسکوٹر لاری سے ٹکرا کر ہماری گود میں آگری۔

قلی قطب شاہ کے شہر میں ایک ندی بہتی ہے۔ سال میں صرف ایک مہینہ یہ ندی، ندی کی تعریف میں آتی ہے پانی روانی سے بہتا ہے۔ بقیہ گیارہ مہینوں میں ندی، نالی بن جاتی ہے۔ اس عرصہ میں شہر کے فاضل اور فضول مادہ کو بہایا جاتا ہے اور ندی کے دامن میں انسانوں کے لئے مچھروں اور مویشیوں کے لئے گھاس کی کاشت کی جاتی ہے۔ ندی کے کناروں پر شہر کے تین بڑے ہسپتال موجود ہیں جہاں علاج کے ساتھ مریضوں کو مکھیوں اور مچھروں سے کٹوا کر ایک نئے مرض کے ساتھ گھر روانہ کیا جاتا ہے۔ ندی بلکہ نالی کے کنارے ہسپتالوں کا وجود بھی ہمارے شہر کی چند خوبیوں میں سے ایک ہے۔ شہر حیدرآباد کی جہاں اپنے جڑواں بھائی سکندرآباد سے سرحد ملتی ہے وہاں ایک جھیل ہے جھیل کی سطح پر آبی پودے اُگے ہوئے ہیں جو مچھروں کی افزائش کرتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم حیدرآبادی مچھروں کی افزائش نسل میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ انھیں پالتے پوستے اور ان سے نقصان اُٹھاتے ہیں ملیریا پھیلانے والے مچھر کی نشاندہی ہماری سرزمین پر ہی کی گئی ہم پھر مضمون کی طرف لوٹتے ہیں جھیل کے آس پاس کی فیکٹریوں سے خارج شدہ پانی جھیل میں پہنچ کر مچھلیوں کو مار ڈالتا ہے۔ ہم حیدرآبادی سرِ شام کھلے آسمان کے نیچے تفریح کے لئے اس جھیل پر جمع ہوتے ہیں۔ عجیب اور گندی بُو سونگھتے ہوئے اپنے آپ کو مچھروں سے کٹواتے اِدھر کھجاتے اُدھر کھجاتے تفریح کا مزا اٹھاتے ہیں۔ اس جھیل کے علاوہ تفریح کے لئے خوبصورت شہر میں چند باغ باغیچے اور ایک عدد پہاڑ بھی ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں شہر کے اکثر باغ باغیچوں میں ہری گھاس بیٹھنے کو تو کجا کھانے کے لئے بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اور جہاں ہرا فرش اُگا ہوتا ہے وہاں شہریوں کا داخلہ اس لئے ممنوع ہوتا ہے کہ باغ کی خوبصورتی قائم رکھی جائے ویسے بھی شہر کے باغ باغیچوں میں داخلہ اخلاقاً ممنوع ہوتا ہے اس لئے کہ وہاں کئی لوگ بسیرا کئے ہوتے ہیں۔ یہ بھی خوبصورت شہر کا ایک پہلو ہے۔ ہمارے شہر میں تاریخی عمارتیں بھی موجود ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا شاید ہماری روایات کے خلاف ہے۔ وہ چند عمارتیں جن کا تذکرہ تاریخی کتابوں میں ملتا ہے ان کا اب پتہ ہی نہیں ملتا ۔!

" ہمارا شہر خوبصورت ہے، اسے خوبصورت بنائے رکھئے" یہ نعرہ شہر حیدرآباد کی خوبصورتی بگاڑتے اور بدصورتی

قائم کرنے والے محکمہ نے شہریوں کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے دیا تھا. جانے کیوں آج یہ نعرہ کہیں بھی لکھا نظر نہیں آتا. شاید محکمہ کو اپنی اہلیت اور حیثیت کا ٹھیک اندازہ ہوگیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خوبصورت شہر کے معنی و مفہوم سمجھ میں آگئے ہوں. لیکن صاحب ہمارے نزدیک، ہمارا وطن مالوف ان تمام نقائص کے باوجود صرف خوبصورت ہی نہیں جنت نشان بھی ہے. اسی لئے ہماری تجویز ہے کہ اس نعرہ میں مزید خوبصورتی پیدا کی جائے!!

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے

حسبِ ذیل
مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپے
دھرگھیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	"	مضامین	۷ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
قطع کلام	"	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
کویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ٹائیں ٹائیں فش	سید ویزید اللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲ "

بید براری خان

میرے عہد میں

میرے عہد میں لوگ کاہل۔ جاہل (پڑھے لکھے جاہل زیادہ) اور باتونی تھے۔ اکثر جن کے کپڑے زرق برق ہوتے ان کی جیبیں بالکل خالی پائی جاتیں۔

ہر وہ شخص اپنے آپ کو انٹلکچوئل سمجھتا جو بڑے سیاسی لوگوں کو بڑی گالیاں دیتا۔ ان کی خانگی زندگی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ـــــ دو تین بچے ہو جانے کے بعد ذہن کا ٹیڑھا پن کچھ کم ہوتا تو اسے تھوڑا تھوڑا سب اچھا لگنے لگتا ـــــ ایسے لوگوں کی جگہ ان سے بھی زیادہ ٹیڑھے دماغ کے لوگ سنبھال لیتے ـــــ آخر میں ان کا زیادہ ہی خراب انجام ہوتا۔ جو لوگ غیر سیاسی ہوتے ان کا بڑا برا حال تھا۔ الکشن کے زمانے میں انہیں 'کم خراب' کو ووٹ دینا پڑتا۔ جب کہ اپوزیشن والے بے وقوفی کی حد تک ایسا ضروری سمجھ لیتے کہ وہ مخالف ہیں تو سارا زمانہ ان کے ساتھ ہو جائے گا۔ کانگریس کے نام پر ووٹ لینے والوں کو الکشن سے پہلے کائنات کے ذرّے ذرّے سے پیار رہتا اور الکشن کے بعد ان کو ووٹ دینے والے کھٹکتے پھرتے ـــ

ہم وفا کر کے بھی تنہا رہ گئے!

میرے عہد میں تعلیمی ڈگریاں عام طور پر اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے پاس پائی جاتیں۔ اکثر و بیشتر کلرک بھی یہ روگ پال بیٹھے تھے۔ یہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد جوئے۔ سٹہ۔ لاٹری۔ شراب (جنسی لوازمات کا ابھی ذکر نہیں) کے عادی ہو جاتے۔ ان کی اولادیں نوکریوں کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد پنکچر بنانے کے ٹھیلوں پر پائی جاتیں اور بیویاں کسی نئی فلم کی ریلیز پر لائن میں!

میرے عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جو شخص جس چیز کا بالکل کورا ہوتا وہ شئے اس کے نصیب میں لکھی ہوتی ـــ قابلیت سے کورے لوگ پروفیسر، لکچرار بنتے۔ ان لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ادبی اکیڈیمیوں کا ممبر بنایا جاتا جو جہالت

'بے ادب' ہوتے۔ جن لوگوں کو ریاست کا نقشہ دیکھنا نہیں آتا وہ سیاست کے میدانوں میں کبڈی کبڈا کرتے مارتے۔

مذہب کے کورے دنیا بھر کے مذہبی اور نیم مذہبی جلسوں کی صدارت کرتے، مہمانانِ خصوصی بنتے۔ جو لوگ یہ نہیں بن سکتے وہ ایسے جلسوں کے ناظم بن جاتے!

نمائشی دین دار لوگ خُدا کے علاوہ ہر ایک سے ڈرتے۔ اُن پر انیس کا یہ شعر اک لفظ کی تبدیلی کے بعد پوری طرح صادق آتا۔

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں خُدا کو خُدا وند کہوں

میرے عہد کا مزدور انقلاب لانے اور انقلاب آنے سے پہلے ہی ختم ہو چلا تھا۔ سیٹھ ساہوکاروں کی تعمیرات اور فیکٹریاں قائم کرنے کی ہوس نے مزدور کو غلط طریقہ پر اس کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ رکشا کھینچنے والے تک کسی کی شدید ضرورت پر ہی شدید معاوضہ کھینچنا نہیں بھولتے۔

دوستی اور دشمنی کے جذبوں میں ضعف آچلا تھا۔ لوگ دشمنی کرتے تو یہی فکر انہیں کھائے جاتی کہ اب مخالف کیا کرے گا؟ دوستی کرتے تو یہ سوچ کر کہ یہ کب اور کس طرح ہمارے کام آئے گا!؟

اردو اکادمیوں کے ممبران اور ان کے ہی خواہ بڑی تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اکادمی کے تعاون سے اپنی کتابیں شائع کرواتے۔ فروخت کرواتے۔ جہاں سمینار منعقد کرواتے وہاں مقالے بھی خود پڑھتے۔ ہر معاملہ میں ان کا یہی خیال تھا کہ گھر کی بات (یا گھر کی دولت) گھر میں ہی رہے تو اچھا ہے۔ عام طور پر ایسے لوگ اشتراکی تھے اس لئے دولت کی تقسیم (آپس میں) مساوی کرتے۔

میرے عہد میں اردو کے بیرونی ممالک سے بھیجے جانے والے افسانے کسی بھی پرچے میں شائع ہوسکتے تھے۔ افسانہ کیسا بھی ہو۔ افسانہ نگار کے نام کے آگے پاکستان، لندن، چین، جاپان، عمان وغیرہ لکھا ہونا کافی تھا۔

کئی خراب لکھنے والے بال دار لوگ محض مشہور پرچوں میں شائع ہونے کے لئے بیرونی ممالک کی راہ لیتے ــــ ان میں سے کئی لوگ ابھی تک اپنے اپنے وطن نہیں لوٹے ہیں۔

اُن لوگوں کی ادبی حس بہت تیز تھی جو صرف اردو کے دم سے ہی زندہ ہیں۔ ہندوستان میں اگر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اردو نکال دی جائے تو نجانے کتنے جسموں سے روح نکل جائے یہ لوگ اس سڑک سے کم کم گزرتے جہاں اُردو کے ادبی کُتب و رسائل فروخت ہوتے تھے!

طلباء و طالبات کو حصولِ علم کے علاوہ ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ اُن کی بہترین تفریح اسکولوں اور کالجوں میں ہوتی جہاں ان کے لئے مُفت تعلیم کا انتظام تھا۔ والدین بادل نخواستہ بچوں کو اردو مدارس میں بھیجتے ــــ ان کی ساری محنت اور دولت اس وقت چھلک پڑتی جب بچہ کانوینٹ میں پڑھتا۔ اردو اسکولوں میں بچوں کے سرپرست صرف اساتذہ کو

مارنے یا گالیاں دینے آتے ـــــ وہ توان گھٹیا اسکول میں قدم رکھنے کے بھی خطا وار نہ ہوتے۔ لیکن بیچارے وہ بھی کیا کرتے کہ چند سالوں بعد اُن کے ذہین بچوں کو کانوینٹ کی فضاء راس نہیں آتی تھی۔ یوں بھی کانوینٹ کے اخراجات کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے! (جاری)

□□

محمد خورشید نادر
دکامٹی، مہاراشٹرا)

خوبیٔ تقدیر

[انگریزی زبان کا ایک شاعر ROBERT SOUTHE یوں تو ایک معمولی اور غیر معروف شاعر ہے، مگر اس کی ایک مزاحیہ نظم بہت مشہور ہے۔ نظم کا عنوان ہے "The Well of St. Kene" اس نظم کی تلخیص و ترجمہ قارئین "شگوفہ" کی ضیافتِ طبع کیلئے پیش کیا جاتا ہے۔]

شہر کارنوال کے مغربی حصہ میں ایک کنواں ہے جس کا پانی اپنی ایک عجیب و غریب خصوصیت کے لئے خاص شہرت کا حامل ہے۔ اس علاقہ کی تقریباً تمام عورتیں اس کنویں کے پانی کی معجزاتی خصوصیت سے بخوبی واقف ہیں۔

ایک دن ایک مسافر اس کنویں کے قریب پہنچا۔ چونکہ اسے سخت پیاس لگی تھی، اس لئے اس نے اس کنوئیں کے سرد و شیریں پانی سے اپنی پیاس بجھائی اور قریب ہی ایک سایہ دار درخت کے نیچے کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک شخص، جو قریب ہی رہتا تھا، کنویں سے پانی بھرنے کی غرض سے آیا۔ ایک اجنبی کو وہاں دیکھ کر اس کے قریب آیا اور اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

"جناب! اگر آپ کنوارے نہیں بلکہ شادی شدہ ہیں تو یقیناً آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ نے اس طلسمی کنویں کا پانی پی لیا۔ لیکن پہلے یہ بتائیے کہ کہیں آپ کی بیوی، آپ سے پہلے، اس کنویں کا پانی تو نہیں پی چکی ہے؟"

مسافر نے جواب دیا۔

"جی نہیں! میری بیوی اس طرف کبھی نہیں آئی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ محض ایک چلّو پانی پی لینے سے میں خوش قسمت کیسے ہوگیا۔"

اس شخص نے کہا۔ "غالباً آپ کو علم نہیں کہ اس کنوئیں کے پانی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی مرد شادی کے بعد

اس پانی کو پی لے تو پھر اس کی بیوی تمام عمر اس کی مطیع و فرمانبردار رہتی ہے، اور اگر خدانخواستہ بیوی شوہر سے پہلے پانی پی لے تو پھر شوہر کا اللہ ہی نگہبان ہے۔"

اس مسافر نے جب یہ بات سنی تو فوراً اٹھا، تیزی سے کنویں کے پاس پہنچا اور خوب شکم سیر ہو کر دوبارہ پانی پی لیا اور کہا "محترم! جب آپ اس پانی کی خصوصیت سے واقف ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ نے بھی شادی کے بعد یہ پانی ضرور پیا ہوگا۔"

اس شخص نے ایک سرد آہ کھینچی اور بڑے مغموم لہجے میں کہا۔

"نہیں جناب، میں اس معاملہ میں بدنصیب نکلا۔ ہوا یہ کہ ہماری شادی قریب کے چرچ میں ہوئی تھی۔ شادی کے فوراً بعد میں نے بیوی کو چرچ کے پورچ میں چھوڑا اور دوڑتا ہوا اس کنویں کے پاس آیا اور پانی پی کر واپس اس کے پاس پہنچا۔ مگر میری بیوی اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ چالاک نکلی، کیونکہ میں جب پانی پی کر اس کے قریب پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک خالی بوتل نظر آئی اور وہ میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے، شادی کے لئے روانہ ہونے سے قبل، اس کنویں سے بوتل میں پانی بھر لیا تھا اور اسے چھپا کر اپنے ساتھ چرچ لے گئی تھی اور جس وقت میں اسے پورچ میں چھوڑ کر کنویں کی طرف اندھا دھند دوڑ لگا رہا تھا، اس نے ساتھ لائی ہوئی بوتل کا پانی پی لیا اور اس معاملہ میں مجھ سے سبقت لے گئی۔"

شگوفے

* ایک ڈاکٹر اپنے دوست کے ساتھ پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک عورت کو دیکھ کر باڑھ کے پیچھے چھپنے لگا تو دوست نے پوچھا۔ "کیوں بھئی کیا ہوا؟"

"میں اُس عورت سے بچنا چاہتا ہوں۔" ——— "وجہ؟"

"میں نے اُس کے شوہر کا علاج کیا تھا اس لئے وہ مجھ سے خفا ہے" ——— "تو کیا وہ مر گیا؟" دوست نے دریافت کیا ——— "نہیں۔ وہ میرے علاج سے ٹھیک ہو گیا۔"

* ایک شوہر نے اپنے دوست سے بیوی کی شکایت کی۔ "میری بیوی مجھے گذشتہ چھ ماہ سے چیزیں کھینچ کر مار رہی ہے۔ کوئی علاج بتاؤ۔" ——— دوست نے حیرت سے پوچھا۔ "یار، وہ تمہیں چھ مہینے سے مار رہی ہے اور تم اب کہہ رہے ہو" ——— شوہر نے کہا۔ "پہلے ڈر اور شکایت کی کوئی بات نہیں تھی۔"

"پھر اب کیا ہوا؟" دوست نے سوال کیا۔

شوہر نے جواب دیا۔ "پہلے اس کا نشانہ خطا ہو جاتا تھا۔"

خرافات

(ہمراسلے)

✱

یہ "شگوفہ" جو ستمبر کا مرے ہاتھ میں ہے
ہر ورق اس کا منوّر ہے صنوبر کی طرح
بات اب آئی سمجھ میں کہ اسی کی خاطر
سارے فنکار ہیں پر جھاڑے کبوتر کی طرح
"فکرِ راوی" کے قریں بیٹھے ہیں یوسف ناظم
سرخیٔ عارضِ گلگوں ہے ٹماٹر کی طرح
گو ہے پاگل مگر عابد کی طرح پھرتا ہے
اپنے بچوں سے وہ بھاگے ہے گداگر کی طرح
لکھ کے "کرفیو کا نگر" محترم عابد بھائی
سانپ کے منہ میں دبے ہیں وہ چھچھوندر کی طرح
ہوں رفیع، غالب و اقبال کہ پرواز ادیب
گال ہیں سب کے مسرّت سے چقندر کی طرح
ڈھاکہ بنگال کے یوسف جو ہیں "عورت" والے
اپنا "ادھیکار" جمائے ہیں منسٹر کی طرح
"رسمِ اجراء" کے جو موقع پہ ملے ہیں اعجاز
رُعب سے بیٹھے ہیں بارُعب کلکٹر کی طرح
دیکھ کے مصطفےٰ سیّد سے اڈیٹر کا کمال
دانت دشمن کے نکل آئے ہیں بندر کی طرح
کھنہ و بیدی و لوتھر ہوں کہ منظور مسیح
سب دُکھے بھی ہیں ہنستے بھی ہیں گوہر کی طرح
اس "شگوفے" کو خدا بخشے حیات گر گٹ
یہ خدا کام کرے جادو و منتر کی طرح

محمد گوہر کھوکھپوری

✱ شگوفہ کا تازہ شمارہ دیکھا۔ ساری تخلیقات معیاری ہیں اور عہدِ حاضر کی نبّاض بھی۔ رہا یہ کہ اردو میں ظریفانہ شاعری کی جو صورتِ حال ہے وہ شگوفہ کی شعری تخلیقات پر بھی اثرانداز ہوتی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبرؔ مرحوم اُردو کی ظریفانہ شاعری کو جہاں چھوڑ گئے تھے، اس سے آگے بڑھانے کی کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔

(ڈاکٹر) اعجاز علی ارشد، پٹنہ

-٭- -٭- -٭-

✱ جس طرح آپ شگوفہ نکالے بغیر ایک مہینہ بھی چین سے نہیں رہ سکتے اسی طرح میں بغیر "شگوفہ" پڑھے۔ آپ ادبی دنیا میں خصوصاً اردو ادب میں ایک ریکارڈ بنا رہے ہیں ورنہ اتنے دنوں بایں پابندیٔ وقت کوئی بھی مزاحیہ و طنزیہ رسالہ زندہ نہیں رہ سکتا ـــــ اور آپ ہیں کہ ترقی کی جانب بڑی استقامت سے قدم بڑھائے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قدم اور زیادہ۔

(ڈاکٹر) ایم کمال الدین۔ دربھنگہ

-٭- -٭- -٭-

✱ میری دانست میں تو پورے ہندوستان میں "شگوفہ" ہی اپنے طرز کا واحد رسالہ ہے۔ جو لوگ حالات سے اوب جاتے ہیں اور کچھ رو لیتے ہیں تو "شگوفہ" انہیں ہلکا کر دیتا ہے۔ اگر ایک طرف یہ قہقہوں کا سمندر اور مسکراہٹوں کا دریا ہے تو دوسری طرف طنز کے تیر و نشتر بھی چھوتا اور لگاتا ہے۔ شائد اسی لئے انسان کو حیوانِ ظریف بھی کہا گیا ہے، یقیناً یہ Proverb ایجاد کرتے وقت ادب کی یہ صنف بھی پیشِ نظر رہی ہوگی۔

غالب حسنین۔ پٹنہ

— —

اداریہ

۳۱ اکتوبر کو ہمارا ملک ایک عظیم، ناقابلِ تلافی اور شدید سانحہ سے دوچار ہوا، جبکہ ملک کی مقبول وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو انہیں کے محافظین نے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا —— یہ قتل ہندوستان کی بے مثال سیاسی لیڈر اور وزیر اعظم کا قتل ہی نہیں بلکہ بھروسہ و اعتماد کا، پولیس کی چوکسی کا، اور مذہبی، اخلاقی اور جمہوری اقدار کا قتل ہے۔ اس قتل اور اس کے نتیجہ میں دارالخلافہ کے علاوہ ملک کے تقریباً ایک سو شہروں میں پھیل جانے والے فسادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرہ پر، تشدد پسندوں اور حالات کا استحصال کرنے والوں کی گرفت کس قدر سخت ہے۔ معاشرہ کی رگوں میں پھیلے ہوئے تشدد کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے نیک نیتی کی ضرورت ہے۔ مگرمچھ کے آنسوؤں کی نہیں! شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی سیاسی بصیرت اور پرکشش شخصیت کے ذریعہ عالمی سطح پر ہندوستان کے وقار کو بلند کرنے میں نمایاں حصہ ادا کیا۔ لیکن ملک کے داخلی مسائل انھیں آخر وقت تک ستاتے رہے۔ اور ان ہی مسائل کی وجہ سے ملک نے ایک عظیم سیاسی مدبر کو کھو دیا۔ اب بھی وقت ہے کہ اس قربانی کے بعد ہم اپنے داخلی مسائل کو حل کرنے کے لئے ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و خوص کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اور تشدد کو ابھارنے والی طاقتوں کے آگے صف آرا ہو جائیں۔

* صدر زندہ دلان حیدرآباد جناب نریندر لوتھر عالمی جشن مزاح کے انتظامات کو قطعیت دینے اور وزیر اعظم کو افتتاح کیلئے مدعو کرنے کے لئے ۳۱ اکتوبر کو ہی دہلی پہنچے تھے۔ لیکن اس سانحہ کی وجہ سے جشن کے سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے۔ اور التوا کا اعلان کر دیا گیا۔ اب انتخابات کے بعد ہی عالمی جشن مزاح کا انعقاد ممکن ہو سکے گا۔

* زیر نظر شمارہ کی کاپیاں پریس پہنچ چکی تھیں کہ نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے انتقال کی روح فرسا خبر ملی۔ وہ تین چار سال سے بیمار تھے۔ جولائی کے مہینے میں ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا تھا کہ کینسر کا شبہ اب یقین میں بدل چکا ہے اور اب وہ چند مہینوں کے مہمان ہیں۔ اپنی موت کا جس بے فکری اور بے جگری سے انھوں نے ذکر کیا تھا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ بیدی صاحب ظریف الطبع آدمی تھے۔ حیدرآباد کی مزاحیہ محفلوں میں اپنے مضامین اور لطیفوں کے ذریعہ انہوں نے خوب رنگ جمایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مزاح کی طرف زیادہ متوجہ ہوں لیکن نجی حالات مانع رہے اور وہ بجھ سے گئے۔ "شگوفہ" سے انھیں خاص دلچسپی تھی اور روز اول سے اس کی مجلس مشاورت میں شریک تھے۔ بیدی صاحب اب ہم میں نہیں رہے لیکن صنف افسانہ کے سرمایہ میں انھوں نے جو اضافے کئے وہ ادب میں انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ——

-٥- -٥- -٥-

No. 15822/68 **SHUGOOFA Hyderabad-1** Postal Regd. No. H/HD
ol 17 Copy 11 November 1984 Phone : 55771



ماہنامہ

DECEMBER 1984

Rs. 3-00



زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۷ ـــــ دسمبر ۱۹۸۴ء ـــــ شمارہ ۱۲

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ:

شگوفہ، ۳۱ بیچلر کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

فون، آفس: 657716

رہائش: 521964

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

حق تو یہ ہے کہ ... (ترجمہ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوٹ (منظومات)

عالمی جشنِ مزاح کے موقع پر

ماہنامہ "شگوفہ" کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

* اُردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں :

فکر تونسوی ، بھارت چند کھنہ ، مجتبیٰ حسین ، یوسف ناظم
احمد جمال پاشا ، نریندر لوتھر ، وجاہت علی سندیلوی ، رشید قریشی
شفیقہ فرحت ، برق آشیانوی ، مسیح انجم ، پرویز یداللہ مہدی
کے منتخب مضامین اور خود نوشت سوانح

مہمان مدیر
یوسف ناظم

* ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں :

گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی) ، گل کی (ٹامل) ، ونود بھٹ اور
مگن بہار لال مہتا (گجراتی) ، متھورا نند (اڑیا) ، بیچی (کنڑا)
لیپا یانی کر (ملیالم) ، تاراپن گنگو پادھیا ئے (بنگلہ) ،
اوتار کرشن رہبر اور ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری) ،
شری پورن شرما (راجستھانی) ، شرد جوشی (ہندی)
کی تخلیقات کے تراجم

اداریہ

اردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض بھی گلشن کے کاروبار سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ آزادی کے بعد جن شاعر نے اپنے فن اور شخصیت کے مشترکہ جادو سے اردو شاعری کی آبرو اور وقار کو قائم رکھا تھا فیض اس کی آخری کڑی تھے۔ وہ اپنی ترقی پسندی، سیاسی بصیرت اور بین الاقوامی روابط کی وجہ سے ساری دنیا کے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے فیض غور و فکر کی دنیا میں ڈوبے رہنے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ ایک ایسے انقلابی عملی انسان تھے جو اپنے تصورات کے مطابق دنیا کو آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے خون دل میں انگلیاں ڈبو لی تھیں۔ متاعِ لوح و قلم پہ پابندیوں سے بے پرواہ وہ آگے بڑھتے رہے۔ کوئی مقام ان کی نظروں میں جچا ہی نہیں۔ لیکن روشن مقامات اور منزلوں کی نشان دہی کے لئے جو منفرد طرز، شاعری میں اُنہوں نے اختیار کیا تھا وہ رہتی دنیا تک ادب میں انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

بہار کے ایک ممتاز طنز و مزاح نگار شاعر جوہر سیوانی ۱۲ر نومبر کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ احمد جمال پاشا صابر بہاری اور کیک بیتیادی کے خطوط کے ذریعہ ان کے انتقال کی خبر ملی تو طبیعت پر ایک عجیب اداسی چھا گئی گو کہ ان سے دہلی، پٹنہ اور حیدرآباد میں تین یا چار مرتبہ ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ ہمیشہ اس خلوص سے ملتے اور جدا ہونے پر اسی پابندی سے خط لکھتے کہ دوری کا کبھی احساس نہ ہونے پاتا تھا۔ پچھلے کئی سال سے نہایت پابندی کے ساتھ شگوفہ کے لئے ہر مہینہ تازہ کلام بھجوایا کرتے اور شگوفہ کے ہر شمارہ پر اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ شرمندگی اس بات پر ہوتی تھی کہ منع کرنے کے باوجود وہ جوابی خط لکھا کرتے تھے۔ جوہر صاحب کے انتقال سے ان کے خاندان والوں کو جو صدمہ پہنچا اس میں ادارۂ شگوفہ برابر کا شریک ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ انھیں جوارِ رحمت سے سرفراز فرمائے۔

- عالمی جشن مزاح کی تقاریب اب ۸ تا ۱۲ فروری منعقد ہو رہی ہیں۔ نئے پروگرام کی تفصیلات بھی طے پا چکی ہیں جو حسب ذیل ہیں:
- ۸ر فروری۔ صبح ۹½ بجے افتتاح۔ سووینیر اور یادگار پوسٹل لفافہ کی رسم اجراء
- ۱۲ر بجے دن کارٹونوں کی نمائش
- ۸ر بجے شب کٹھ پتلیوں کا ناچ اور مائم شو۔
- ۹ر فروری ــ صبح ۹ر بجے مزاحیہ کارٹونوں کی نمائش کا افتتاح۔ ۲½ بجے اردو سمینار
- ۶ر بجے شام مختلف ہندوستانی زبانوں کے متوازی اجلاس
- ۱۰ر فروری۔ صبح ۱۰ر بجے جشن لطیفہ۔ شام ۵½ بجے ہندوستانی زبانوں کے اجلاس۔
- ۱۱ر فروری۔ صبح ۱۰ر بجے سمپوزیم (انگریزی) ۸ر بجے شب ہندی اردو عالمی مشاعرہ
- ۱۲ر فروری۔ غیر ملکی زبانوں کا اجلاس اور شام ۴½ بجے اختتامی اجلاس۔

وجاہت علی سندیلوی

مشاعرہ اور مرغا

(بیگم ایک چوکی پر بیٹھی ایک ڈسک سامنے رکھے ترکاری کاٹ رہی ہیں۔ ناصر ایک ہاتھ میں قلم لئے اور دوسرے سے ایک رجسٹر سینے سے لگائے داخل ہوتے ہیں)

ناصر۔ آج مابدولت دفتر نہیں جائیں گے

بیگم کیوں خیریت ؟

ناصر۔ خیریت کہاں ؟ آج ہماری نانی مرگئی ہیں اور پرسوں شہر میں ایک کل ہند مشاعرہ ہو رہا ہے۔

بیگم۔ ہے۔ ہے کیا سلیمن نانی چل بسیں ؟ پرسوں ہی تو گوپال بھائی کے یہاں شادی میں ملی تھیں اور تب تو بھلی چنگی تھیں۔ کیسے چٹ پٹ ختم ہوگئیں وہ ؟ اور کیا اُن بے چاری کا تیجا جھاڑ و پھیرے مشاعرے میں ہوگا ؟

(ناصر سامنے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

ناصر۔ بات سمجھتی نہیں اور سمجھے بغیر اُس کا بخیہ اُدھیڑنا شروع کر دیتی ہیں آپ۔ سلیمن نانی بالکل خیریت سے ہیں۔ ہماری سگی نانی یعنی ہمارے سگے نانا کی حقیقی بیوی مرگئی ہیں اور مجھے مشاعرے کے لئے ایک تازہ گرم گرم چٹپٹی غزل کہنا ہے۔

بیگم۔ پہیلیوں میں تو آپ خود بات کرتے ہیں۔ آپ کی سگی نانی کو مرے تو اللہ بخشے پچیس برس ہو چکے ہیں۔ اب آج وہ پھر کیسے مرگئیں ؟ ان بیچاری نیک بی بی کی موت کسی عاشق کی موت تو تھی نہیں کہ روز جنازہ اُٹھتا روز تربت بنتی اور وہ قبرستان سے بھاگ کر گھر پر شب فراق میں تارے گنتے جاتے۔

ناصر۔ ماشاء اللہ کیا زبان چلتی ہے آپ کی۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ! اجی بیگم صاحبہ آج ہماری نانی اس لئے مرگئیں کہ جب وہ واقعی اللہ کو پیاری ہوئی تھیں تب ہم دفتر میں نوکر نہیں تھے۔ دفتر پر ہماری یہ چھٹی اُدھار تھی۔ چنانچہ ہم اپنے ساتھی لالہ رام ناتھ کے ہاتھ اپنی یہ درخواست دفتر بھجوا دیں گے کہ ہماری نانی مرگئی ہیں لہذا ہم کام پر نہیں آسکتے۔

بیگم۔ تو باوا آدم کے وقت سے اور آپ کے ملازم ہونے کی تاریخ تک تو ایسی لاکھوں چھٹیاں آپ کی دفتر پر باقی ہیں۔ ایکدم سے یہ سب چھٹیاں لے ڈالیے اور اطمینان سے گھر پر بیٹھ کر شعر و شاعری سے دل بہلائیے۔

ناصر۔ ہائے۔ ہائے۔ قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار ! اتنے

بڑے شاعر کی شریک حیات بلکہ نصف بہتر اور اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ نانی کے مرجانے کا جھوٹ بول کر ہم صرف اس وجہ سے چھٹی نہیں لینا چاہتے کہ پنڈت جی اور مرزا صاحب کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلیں یا خوش گپیاں اڑائیں بلکہ ہم تو جتنا کام دفتر میں کرتے اس سے کہیں زیادہ کام آج شعروادب کی خدمت میں گھر پر کریں گے۔ وہاں تو پسینہ بہاتے یہاں خون جگر بہا دیں گے اور پرسوں ہونے والے مشاعرے میں ایسی دھاک بٹھا دیں گے کہ بس دوسرے شاعروں کا ناطقہ بند ہو جائے گا۔ اور دُم دبا کر بھاگ جائیں گے میدان سے۔

بیگم۔ خیر دوسرے شاعروں سے مجھے کیا مطلب؟ مگر آپ مشاعرے سے گھر آیئے گا تو جوتا ٹوپی ساتھ لانا نہ بھول جایئے گا۔ سعادت گنج کے مشاعرے سے لوٹے تھے تو نہ جوتا تھا نہ ٹوپی۔ اور ہاں نئے گاؤں کے مشاعرے میں جو شیروانی پہن کر گئے تھے اُس پر ٹماٹر اور انڈوں کی زردی کے کچھ ایسے نشان پڑ گئے ہیں کہ دو دفعہ میں نے گھر پر دھویا، ایک دفعہ دھوبی سے دھلایا لیکن موئے دھبے ہیں کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

ناصر۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ کی باتیں سن کر آپ کی معصومیت پر پیار آنے لگا ہے۔ آپ جانتی ہی نہیں کہ مشاعرہ ہوتا کیا ہے۔ ہر بڑے شاعر پہ ہوٹنگ ہوتی ہے۔ مرزا غالبؔ پر قلعہ معلیٰ کے مشاعروں میں جہاں خود بادشاہ صدارت کرتے ہوٹنگ ہوتی۔ اب یہ اور بات ہے کہ اُس وقت ٹماٹر اور انڈے اس قدر گراں نہ تھے کہ وہ مشاعروں کو پیش کئے جانے کے لائق سمجھے جاتے۔ اچھا تو ہم باہر کمرے میں جاکر فکر سخن کرتے ہیں۔ . . . (اٹھتے ہیں)

ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

بیگم۔ اجی یہ دھوبی کے حساب کا رجسٹر تو دیتے جایئے، کہہ گیا ہے آج سویرے ہی آنے کو۔

ناصر۔ خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا ہے آپ نے۔ اب اگر اس پر دو چار مصرعے لکھ دیے ہیں تو فوراً چاہتی ہیں آپ کہ انہیں کسی بہانے دیکھ لیں۔ اجی تھوڑا صبر کیجئے۔ پوری غزل ہو جائے تو ہم خود سنا دیں گے آپ کو!

(بیگم منھ پر پلّو رکھ کر ہنسنے لگتی ہیں۔ اُسی وقت بیٹھکے سے ناصر صاحب، ناصر صاحب کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ناصر صاحب جاتے ہیں۔)

(بیٹھکے میں مرزا اور رام دیال پہلے ہی سے بیٹھے ہیں۔ ناصر آتے ہیں تو دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں)

ناصر۔ آداب عرض۔ آداب عرض!

مرزا۔ آداب عرض۔

رام دیال۔ آج کل آپ دکھائی ہی نہیں دیتے؟ بہت کٹے کٹے پھرتے ہیں۔

ناصر۔ کٹا کٹا کیا پھرتا ہوں۔ پرسوں مشاعرہ ہونے والا ہے اور اُس کے لیے ابھی نہ غزل تیار ہو پائی ہے نہ نظم۔ چھٹی ہی نہیں ملتی۔

رام دیال۔ مرزا صاحب آپ کی غزل تو پوری ہو چکی ہوگی؟

مرزا۔ ہاں صرف مقطع باقی تھا لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات پڑ گئی۔

ناصر۔ کیوں خیریت؟

مرزا۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) خیریت کہاں؟ کیوں ناصر صاحب آپ نے میرا گھورو تو نہیں دیکھا؟ کل شام سے لاپتہ ہے۔

ناصر۔ گھورو؟

مرزا۔ اجی وہی جو سر کو جھٹکا دے کر سینہ تانے ذرا پورے پورے قدموں سے کسی نیتا کی طرح چلتا تھا۔

ناصر۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔ لیکن یہ گھورو آپ کے کس صاحبزادے کا نام ہے؟

رام دیال۔ (قہقہہ لگا کر) بہت معصوم بنتے ہو ناصر۔ اجی گھورو مرزا صاحب کا مُرغا جس نے پارسال نخاس میں پالی جیتی تھی۔ لیکن شاید اُس وقت آپ محلے میں نہیں آئے تھے۔

مرزا۔ اجی گھورو کو تو شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ تعجب ہے اگر آپ نے اُس کا نام نہیں سُنا۔ اب وہ بڈھا ہو کر پالی توڑنے کے تو قابل رہا نہیں لہٰذا میں نے اُسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ کل شام کو دانا دینے کے وقت موجود تھا۔ پھر گھر سے باہر نکل کر اُس نے دو بانگیں دیں اور پھر یہیں گلی میں للّی کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگا۔

ناصر۔ پھر آپ نے للّی سے نہیں پوچھا؟

رام دیال۔ اجی تم آدمی ہو یا نرے شاعر۔ للّی مرزا صاحب کی وہ مرغی ہے جس کے بال زیادہ لال اور کچھ بھورے ہیں اور جس کے بائیں پیر کا ایک ناخن گھسا ہوا ہے

مرزا۔ چونچ ذرا سی نیچے جھکی ہوئی ہے اور اُس پر دو تین کالی مہین دھاریاں ہیں۔

(ناصر حیرت سے مرزا اور رام دیال کا منہ تکتے اور کبھی اپنے بال نوچتے اور کبھی ناک مروڑتے ہیں۔)

ناصر۔ بھئی میں نے آج تک کسی مرغے کا اور مرغی کا اتنا تفصیلی حلیہ نہیں سنا — آپ تھانے میں رپٹ کیوں نہ لکھا دیجئے۔

مرزا۔ بھئی سوچ میں بھی یہی رہا ہوں۔ لیکن شاید چند گھروں کی خانہ تلاشی بھی کرانا پڑے۔

رام دیال۔ بالکل صحیح خیال ہے آپ کا۔ بغیر خانہ تلاشی کے کام نہیں چلے گا۔

ناصر۔ تو پھر اس نیک کام میں دیر کیوں کیجیے۔ رپٹ جتنی جلدی ہو جائے گی اتنی ہی جلدی کارروائی شروع ہو جائے گی۔ مجھے تو آج اپنی غزل پوری کرنا ہے ورنہ . . . . . .

مرزا۔ لیکن میرا دماغ یہ کام نہیں کرتا کہ گھورو جا کہاں سکتا ہے اور محلے میں کس کی یہ ہمت ہو سکتی ہے . .

(مرزا باتیں کرتے جاتے لیکن ان کی نظریں بیٹھک کے فرش پر جھاڑو سی دے رہی تھیں۔ ایک دم سے وہ کھڑبڑا کر کرسی سے اُٹھ کر جھپٹتے ہوئے میز کے نیچے سے کچھ پر چٹکی میں اُٹھا لیتے ہیں۔ پہلے آنکھ کے قریب لے جا کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر ہاتھ سے دوربین بنا کر ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے انہیں دیکھتے ہیں۔ پھر انگوٹھے

سونگھتے ہیں اور پھر ناصر کو بڑی خشونت سے
دیکھ کر کڑک دار آواز میں بولتے ہیں)
یہ پر یہاں، کیسے آگئے ؟

رام دیال۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں ! (پروں کو دیکھتے اور
اور پھر سونگھتے ہیں اور مرزا کو واپس کرتے ہوئے
معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں)

مرزا۔ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ناصر صاحب، یہ پر یہاں
کیسے آگئے ؟

ناصر۔ اب میں کیا عرض کروں ؟ آگئے ہوں گے گلی سے
اڑ کر۔ ہفتوں تو اس بیٹھکے میں جھاڑو دینے کی
نوبت نہیں آتی۔

رام دیال۔ بھئی پر تو یہ تازے سونگھائی پڑتے ہیں۔

ناصر۔ تو کیا ؟ کل ہی اڑ کر آئے ہوں گے۔

مرزا۔ کل ہی گھورو غائب ہوا اور کل ہی یہ پر اُڑ کر
آپ کے بیٹھکے میں آگئے

(ناصر بہت بوکھلائے نظر آتے ہیں)

ناصر۔ کیا مطلب اس سے آپ کا مرزا صاحب ؟ بال کہیں
سے اور کبھی بھی آسکتے ہیں۔

رام دیال۔ آتو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ کیسے آئے ؟
اور گھورو کی مفروری کے فوراً ہی بعد۔

ناصر۔ آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں رام دیال جی ؟ بھئی
کمرے کی دو کھڑکیاں اور ایک دروازہ سڑک پر کھلتا
ہے۔ ہوا کے جھونکوں میں نہیں معلوم کتنی گرد، کتنی
پتیاں، کتنے تنکے کتنے بال اُڑ کر آجاتے ہیں۔
اب میں کیا بیٹھ کر کوئی فہرست بناتا ہوں کہ کون سی
چیز کس تعداد کے ساتھ کب آئی۔ اور یہ تو نہیں کہ
یہ بال مرغے کے ہیں یا کوے کے ؟

مرزا۔ اب زیادہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش
مت کیجئے۔ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ یہ بال سوائے
(آواز بھرا جاتی ہے) گھورو کے اور کسی کے ہو ہی
نہیں سکتے۔

رام دیال۔ ان سے صاف وہی زعفران جیسی خوشبو آرہی ہے۔

مرزا۔ میں تو آپ کو ناصر صاحب آج تک ایک اچھا دوست،
اور پڑوسی سمجھتا تھا۔

ناصر۔ بھئی صاف صاف کہیئے کہ آپ کا مطلب کیا ہے ؟
کیا آپ کو شبہ ہے کہ خدانخواستہ آپ کے گھورو
کی مفروری میں میرا ہاتھ ہے۔ ایسا سنگین اور
مبتذل الزام لگاتے آپ کو . . .

مرزا۔ جی میں الزام نہیں ثبوت پیش کر رہا ہوں۔ الزام
سنگین اور مبتذل ہے تو اس کے بارے میں آپ کو
پہلے سوچنا چاہیے تھا۔

ناصر۔ اُف خداوندا ! اجی مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں نے
آپ کے گھورو کو دیکھا بھی ہو۔

رام دیال۔ دیکھنے سے آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں ؟ اسی گلی میں
تو گھوما کرتا۔

ناصر۔ اجی میں بیسیوں مرغی مرغے گھومتے دیکھا کرتا ہوں
اب مجھے پتہ کہ اس میں جناب گھورو صاحب کون
ہیں۔ یہ بھی خوب رہی۔ میں دفتر سے چھٹی لے کر
آج شعر و شاعری کی فکر میں تھا اور یہاں مجھ پر مرغے
کی چوری کا الزام لگا کر میرے ہوش و حواس کے
خرمن پر بجلیاں گرائی جا رہی ہیں۔

مرزا۔ معاف کیجئے گا ناصر صاحب آپ ابھی نوسیکھیا ہیں۔

مرغے کی چوری چھپتی ذرا کم ہے

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

ایک دم سے گلی میں شور سنائی دیتا ہے "ظلم ہو گیا" "گھورو زندہ باد" کے کئی نعرے لگتے ہیں۔ مرزا اور رام دیال ہڑبڑا کر بھاگتے ہیں۔ مرغا یہ دیکھتا ہے کہ کوئی شعر پڑھتا ہے ؎

سر کو جھکاتے ہیں دُم کو اُٹھاتے ہیں
بول میرے مرغے ککڑوں کو

اور ککڑوں کوں کی صدائیں اور قہقہے بلند ہوتے ہیں۔
ناصر کرسی سے اُٹھ کر مٹھیاں بھینچتے اور بند کرتے اور کبھی بال نوچتے ٹہلنے لگتے ہیں۔ پسینہ پونچھتے ہیں پھر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہیں جیسے اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ایک عورت داخل ہوتی ہے۔

عورت۔ تسلیم ناصر میاں!

ناصر۔ تسلیم۔ کہیے کیسے آنا ہوا؟

عورت۔ اللہ میرے شبو کو ایک غزل لکھ دیجیے۔ پرسوں مشاعرے میں پڑھنے کی ضد کر رہا ہے۔

(ناصر عورت کو گھورتے ہیں۔ غصے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن پھر ضبط کر کے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

ناصر۔ مجھے فرصت نہیں۔ میں دفتر جا رہا ہوں۔ شبو میاں کو ایسا ہی غزل پڑھنے کا شوق ہو تو حضرت گھورو سے لکھوائیں وہ مرزا صاحب کے یہاں رہتے ہیں۔

عورت۔ جی وہ تو آپ ہی سے غزل لکھوانے کو کہہ رہا تھا اجی لکھ بھی دیجیے۔

ناصر۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) للہ مجھ پر رحم کیجیے اور مجھے دفتر جانے دیجیے۔

(عورت جانے کے لیے مڑتی ہے۔ ناصر جھپٹ کر گھر کے اندر چلے جاتے ہیں۔)

ناصر۔ بیگم جلدی سے کھانا دیجیے، میں دفتر جا رہا ہوں مرزا صاحب کے مرغے نے تو میرے اعصاب مجروح کر رکھ دیے۔

بیگم۔ میں سب سن رہی تھی پردے کے پیچھے سے۔ تو بہ ہے ان محلے والوں سے! لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آج دفتر نہیں جائیں گے۔

ناصر۔ جی ہاں میں جو کچھ کہہ رہا تھا غلط کہہ رہا تھا۔ میری کہانی ادھوری نہیں رہ سکتی، پوری نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے بس دفتر جانے دیجیے اور شکر کیجیے کہ حوالات یا اسپتال نہیں جا رہا ہوں۔

بیگم قہقہہ لگاتی ہیں اور ناصر بھی ہنسنے لگتے ہیں۔

پروفیسر حفیظ بنارسی
(آرہ)

تھالی کا بینگن

نئے بھارت کا نیتا ہوں میں اک دل بدلو لیڈر ہوں
کبھی اِس دل کے اندر ہوں کبھی اُس دل کے اندر ہوں

میں عہدوں کی ہوس میں رات دن بیتاب رہتا ہوں
اسی اک خواب کے باعث سدا بے خواب رہتا ہوں

تمنائے وزارت مجھ کو ہر دم کھائے جاتی ہے
یہی اک آرزو دل بھی مرا بہلائے جاتی ہے

نہ میری پارٹی کوئی نہ میرا کوئی جھنڈا ہے
نشاں میرا کبھی چرخہ کبھی ہنسیا ہتھوڑا ہے

جو دن میں آفتابی ہوں تو شب کو ماہتابی ہوں
کبھی میں گاندھی وادی ہوں کبھی میں انقلابی ہوں

مرا کردار مت پوچھو کہ ہوں گفتار کا غازی
زبانی ہی لگاتا ہوں میں اپنی جان کی بازی

کبھی میں اتحاد من کا نعرہ لگاتا ہوں
کبھی شیخ و برہمن کو میں آپس میں لڑاتا ہوں

جنونِ شوق میں مجھ کو کہاں کچھ ہوش ہوتا ہے
مری تقریر میں کچھ بھی نہیں بس جوش ہوتا ہے

اُسی جانب میں جھکتا ہوں جدھر کا پلہ بھاری ہو
میں ابن الوقت ہوں کیوں فکر نہ سب سے بیری یاری ہو
ہوا جس رُخ کی ہوتی ہے اُسی رُخ پر میں چلتا ہوں

نہ پاسِ عہد کچھ مجھ کو نہ کچھ میرا پرنسپل ہے
مری ہر بات نا محکم مرا ہر قول ڈھل مل ہے

اصول زیست میرا بے اصولی بے وفائی ہے
ہے جس سے آج یارانہ اسی سے کل لڑائی ہے

قواعد اور ضوابط کی میں پابندی نہیں کرتا
سیاست کی فضائے پاک میں گندی نہیں کرتا

کہاں کی خدمتِ قومی، وطن کی پاسبانی کب
سوائے مکر و فن ہے اور میری زندگانی کب

میں اپنی جیب بھرتا ہوں فقط میں نیدہ زر ہوں
جو سچ پوچھو تو میں رہبر نہیں رہزن سے بدتر ہوں

مرا مقصد فقط یہ ہے الکشن جیت جاؤں میں
وطن کا حال کچھ بھی ہو خوشی کے گیت گاؤں میں

بڑا ہشیار ہوں عقل و خرد سے کام لیتا ہوں
اگر قیمت ملے اچھی تو خود کو بیچ دیتا ہوں

بجا ہوگا اگر تھالی کا بینگن مجھ کو گردانا
حقیقت ہے اگر جنتا کا دشمن مجھ کو گردانا

انوکھی میری عادت ہے نرالی میری خصلت ہے
ہے دل بدلی مرا پیشہ "ڈفکشن" میری فطرت ہے
مری باتوں پہ مت جانا بھروسہ کچھ نہیں :

عابد معز

انتخابات کا موسم

ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ ویسے جمہوریت، مطلق العنانیت، سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ کے فائدے اور نقصانات دانشور جانیں، ہم جیسے ایک عام شہری کے لئے جمہوریت کے معنی زندگی کے ہر قدم پر "انتخابات کا انعقاد ہے تاکہ عوام کے لئے" عوام کی جانب سے عوامی اقتدار قائم ہو۔ اسکولوں، کالجوں میں اسٹوڈینٹس یونین، ٹیچرس یونین، مزدوروں میں ٹریڈ یونین، دفتروں میں کلاس فور یونین، گزیٹیڈ یونین، نان گزیٹیڈ یونین، سماجی زندگی میں یوتھ یونین، چلڈرنس یونین، ومینس یونین، بے روزگاروں کی یونین، بیماروں میں ذیابیطس یونین، لیپرس یونین اور جناب سیاست میں بلدیہ، بلاک سمیتی، اسمبلی اور پارلیمنٹ وغیرہ وغیرہ کے انتخابات جمہوری ملک میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

یوں تو سال کے بارہ مہینے کسی نہ کسی انجمن، اسوسی ایشن وغیرہ کے انتخابات ہوتے رہتے ہیں لیکن جب سیاسی انتخابات ہوتے ہیں تو ایک دلچسپ اور پر خطر سماں بندھ جاتا ہے۔ چہار طرف انتخابی تقاریر اور نعرے گونجتے رہتے ہیں، چوبیس گھنٹے انتخابات پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ سڑکوں پر جا بجا پوسٹرس، بیانرس اور ہورڈنگس کے ذریعہ ووٹ کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ انتخابی نشانات سڑکوں پر لٹکنے لگتے ہیں جن پر برقی قمقمے لگائے جاتے ہیں۔ جا بجا ورقیئے اور پمفلٹ تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ جگہ جگہ سے انتخابی جلوس نکلنے لگتے ہیں۔ شہر کے در و دیوار بھی انتخابات کے ترجمان بن جاتے ہیں اخبار اور رسائل انتخابی مواد سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ انتخابی جھڑپوں سے ماحول خطرناک بن جاتا ہے۔ نقضِ امن کا اندیشہ رہتا ہے! انھیں حالات کے پیشِ نظر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی انتخابات کے آس پاس منجمد ہو گئی ہے اور ہم، جمہوریت پسند لیکن انتخابات زدہ شہری ہیں۔

انتخابات کے دوران قدم قدم پر انتخابی دفتر کھل جاتے ہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار مل جاتا ہے۔ انھیں مفت کھانا پینا مہیا کیا جاتا ہے۔ گھومنے پھرنے کے لئے سواریاں تیار رکھی جاتی ہیں۔ دلجوئی اور دلچسپی کے تمام سامان میسّر کر دیئے جاتے ہیں۔ فلمی گانے بجتے رہتے ہیں۔ تاش، شطرنج اور کیرم کی محفلیں جمتی ہیں اور جب ان مشاغل سے

فرصت ملتی ہے تو کارکن دوران میں ووٹروں کی چھان بین کرتے ہیں۔ کون کہاں رہتا ہے، کون زندہ ہے، کون مرگیا، کس گھر میں کتنے ووٹ ہیں۔ یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ ایک کارکن کو کتنے ووٹ ڈالنا ہے۔ رات میں دیواروں پر نعرے لکھنا اور پوسٹرس چپکانا جاری رہتا ہے۔ یہ تمام کام وہ نوجوان انجام دیتے ہیں جو ووٹ دینے کا حق نہیں رکھتے۔ یہی نوجوان جوش و خروش سے انتخابی مہم چلاتے ہیں۔ اپنے جلسے کو کامیاب اور مخالف امیدوار کے جلسے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ کئی ووٹ ڈالتے ہیں اور تو اور جناب وقت آنے پر بیلیٹ باکس بھی لے اُڑتے ہیں۔

انتخابات کے دوران جہاں کہیں تھوڑی سی جگہ ملے وہاں انتخابی جلسہ ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک ہی مقام پر دو تین انتخابی جلسے ہوتے ہیں۔ اُمیدوار ہی اپنے خرچہ پر جلسے کرواتا اور پھول پہنتا ہے۔ مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی تقاریر ازبر کرکے سنائی جاتی ہیں۔ تمام تقاریر کا موضوع "ووٹ" رہتا ہے لیکن انداز جُدا ہوتے ہیں۔ ملک کی سالمیت موضوعِ بحث ہوتی ہے جمہوریت اور سیکولرزم پر حملے ہو رہے ہیں۔ مہنگائی اور قیمتیں، غربت اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ بے روزگاروں اور نوجوانوں میں تشدد کے رجحان پر تشویش کا اظہار ہوتا ہے افراطِ زر، بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ کے خلاف انتباہ دیا جاتا ہے۔ رشوت خوری اور چارسو بیسی پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ عورتوں اور کمزور طبقات پر مظالم کا واویلا ہوتا ہے۔ فسادات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ جہیز نہ ملنے سے ہونے والی اموات کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہمارے تمام کے ملکی اور انفرادی مسائل کا حل رائے دہندے کے صرف ایک "ووٹ" میں سمٹ جاتا ہے۔ اپنا ووٹ امیدوار کے حق میں استعمال کرنے سے تمام مسائل حل کر دینے کا یقین دلایا جاتا بلکہ قسم کھائی جاتی ہے۔ ہم نے آج تک انتخابی تقاریر پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ یہ انتخابات جیتنے کے جذبہ کے زیرِ اثر کی جاتی ہیں۔ اسی لئے ہم انھیں "انتخابی بڑ" کہتے ہیں۔

انتخابات کے موسم میں رائے دہندوں کو اپنے مکانات محفوظ رکھنا ایک مسئلہ ہوتا ہے دیواروں پر مختلف جماعتوں کے نعرے اور اپیلیں لکھی جاتی ہیں۔ اُمیدواروں کی مسلسل دستک سے دروازوں کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی ہے انتخابات کے بعد گھر کی دیواروں کی آہک پاشی کروانا پڑتا ہے۔ دروازوں کی مرمت بھی کروانی پڑتی ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے اپنے گھر کی ایک یا دو انتخابات کے بعد آہک پاشی کروائی تھی لیکن انتخابات کی بہتات اور مہنگائی میں اضافہ کی وجہ سے ہم نے اپنے مکان کو جمہوریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آج ہمارا مکان الیکشن کمیشن کی طرح ہے جہاں مختلف النوع قسم کی پارٹیاں رجسٹرڈ ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے مکان کو انتخابات سے محفوظ رکھنے کے لئے دیوار پر ایک نمایاں تختی بنوائی اور اس پر لکھا "جگہ برائے انتخابی نعرے اور سیاسی تک بندی" ان کا خیال تھا کہ ہمارے ملک کی جمہوریت میں انھیں اپنی دیواریں محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے لیکن جناب صرف اسی تختی کو چھوڑ کر ان کے گھر کی ساری دیواریں سیاسی جماعتوں کا مینی فیسٹو بن گئی تھیں۔

انتخابات کا موسم ہی وہ وقت ہوتا ہے جب لیڈر عوام کی خدمت کا ارادہ کرتے ہیں بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ خدمت حاصل کرتے ہیں۔ انتخابات کے بعد لیڈر اپنی اور اپنے حواریوں کی خدمت میں مصروف رہتا ہے۔ اسی

لئے ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ہماری ترقی میں انتخابات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انتخابات کے موسم میں ہی سڑکیں بنوائی جاتی ہیں۔ نل لگوائے جاتے ہیں کنویں کھدوائے جاتے ہیں۔ روزگار فراہم کیا جاتا ہے۔ نئی بسیں اور ریل گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔ اور ایسے ہی عوامی بھلائی کے چند اہم کام انجام دیئے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر ہم انتخابات کی آمد کا اندازہ کرلیتے ہیں۔ ہمارے محلہ میں موجود سرکاری نل میں انتخابات کے وقت ٹوٹی لگتی ہے اور پھر جیسے ہی انتخابات ختم ہوئے ٹوٹی بھی غائب ہوجاتی ہے۔ ہم اس نل سے انتخابات کی پیش قیاسی کرلیتے ہیں۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ جو بھی اُمیدوار اس نل پر پہلے ٹوٹی نصب کروائے گا وہی بازی جیتے گا۔

انتخابات کے دوران لیڈر "پدیاترا" کرتے ہیں۔ جو بڑی بے بسی کا عالم ہوتا ہے۔ اُمید اور نا اُمیدی کی کیفیت لئے ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ جوڑے چلے جا رہے ہیں۔ "بھائی! صرف ایک ووٹ!!" ہر ووٹر اپنا مطالبہ پیش کر رہا ہے جتنے رائے دہندے اس سے زیادہ مطالبات "ہمارے لڑکے کو ملازمت دلائیے" "میرے لئے بلدیہ کا لائیسنس بنوا دیجئے" "گھر میں برقی کے کنکشن کے لئے سفارش کیجئے" بعض رائے دہندے سوالات بھی کرتے ہیں۔ "قیمتیں کم کیوں نہیں ہوئیں" "پچھلے وقت ہم نے آپ ہی کو ووٹ دیا تھا۔ ہمیں تو کچھ نہیں ملا سوائے اس کہ آپ کو پھر سے ووٹ دینے کا موقع ہاتھ آیا ہے" لیڈر ہر مطالبہ کو غور سے سُن کر انہیں پورا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ مطالبات قبول کرنے کے علاوہ لیڈر اپنی طرف سے کئی باتوں کا اعلان کرتے ہیں جسے مینی فیسٹو کہتے ہیں۔ "ہم غریبی دور کریں گے" "ہم سبز اور سفید انقلاب لے آئیں گے" "آپ ہمیں ووٹ دیجئے ہم آپ کو روٹی، کپڑا اور مکان دیں گے" وغیرہ وغیرہ لیکن جناب آج کا معشوق وعدے وفا کرنے لگا ہے جبکہ ہمارے سیاست داں ماضی کے معشوق کو بھی مات دے رہے ہیں ——!

انتخابات کے موسم میں اُردو زبان کی بَن آتی ہے۔ اردو پھر سے دیسی زبان بن جاتی ہے۔ اردو زبان کی مٹھاس اور اس کی چاشنی کے گن گائے جاتے ہیں۔ اردو اسکول کھولنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ اردو کو دوسری زبان بنانے کی قسم کھائی جاتی ہے لیڈر اپنی تقریروں میں بے موقع و محل اُردو اشعار پڑھتے ہیں۔ ایک قائد نے اُردو زبان کے تعلق سے ایک سچ بات کہی تھی اردو قومی زبان تو نہیں ہے لیکن قومی لباس شیروانی کی طرح ضرور ہے جس کا مخصوص موقعوں پہ استعمال کیا جاتا ہے۔

انتخابات لڑنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پچھلے انتخابات میں ہم نے ایک سیاسی پارٹی کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا ہمیں کئی سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے اہم سوال تھا، کیا آپ انتخابات کا خرچہ برداشت کرسکتے ہیں؟ اب ہم انھیں کیا جواب دیتے۔ عوامی خدمت کے صلہ میں ہم اپنا خرچہ ہی مشکل سے برداشت کرپاتے ہیں۔ دوسرے سوالات تھے انتخابی مہم کے لئے کارکنوں کا بھتہ، کھانا پینا اور گھومنے پھرنے کے لئے سواریوں کا انتظام کرسکتے ہیں۔ اپنے لئے جلسے کروا سکتے ہیں۔ مخالف اُمیدوار کے جلسہ میں گڑبڑ کروا سکتے ہیں۔ دنگا فساد کروا سکتے ہیں۔ اپنی طرف سے کتنے ووٹ ڈلوا سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمام سوالوں کو ہم نے غور سے سُنا اور کہا "بھائی ہم صرف عوامی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں ہم پسند کرتے ہیں اور نہ ہی کرواسکتے ہیں! ہمیں مخلصانہ مشورہ دیا گیا' تو پھر آپ یہ سب کچھ کرنے والے کے حق میں اپنا قیمتی ووٹ استعمال کیجئے۔ شکریہ!"

انتخابات کے موسم میں سیاسی قائدین اور کارکنوں کی نیند اڑ جاتی ہے' دن کا چین ہوا ہو جاتا ہے۔ یہ بات قدرتی ہے لیکن ہم شہریوں کا بھی ناک میں دم رہتا ہے یہ لیڈروں کی مہربانی ہے۔ رات دیر گئے انتخابی جلسوں سے چھٹی ملتی ہے۔ آپ جلسہ میں نہ جانا چاہیں بھی تو کوئی بات نہیں جلسہ خود آپ کے پاس چلا آتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ لیڈر اپنی تقریر کو آپ کے اپنے گھر میں بٹھا کر سنوا دیتا ہے۔ ووٹ کی اپیل بھی کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست انتخابی تقاریر سے بچنے کے لئے دونوں کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہیں۔ پھر بھی آواز آنے لگتی ہے۔ ہلمیٹ پہن لیتے ہیں۔ رات دیر گئے بہت مشکل سے نیند آتی ہے۔ چند لمحے ہی سو پاتے ہیں کہ صبح سورج نکلنے اور مرغ بانگ دینے سے پہلے لیڈر صاحب پدیاترا کرتے ہوئے دروازے پر موجود رہتے ہیں۔ لیڈر سیاسی مسائل پر گفتگو کی بجائے آپ کی خیر خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اور ووٹ کی التجا کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ اب کارکنوں کی آمد و رفت شروع ہوتی ہے۔ چھوٹی پرچیاں اور پمفلٹ لئے رائے دہندوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں جوں توں کرکے بغیر ناشتہ دیر سے دفتر پہنچتے ہیں۔ دفتر میں بھی سیاست، جمہوریت اور انتخابات پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ ہر کوئی اپنی پارٹی کے حق میں تقریریں جھاڑ رہا ہے۔ دفتر سے گھبرا کر کینٹین یا ہوٹل جائیے وہاں بھی "سیاسی گفتگو منع ہے" کی تختی کے نیچے بیٹھ کر انتخابات پر بات چیت کی جاتی ہے۔ بس میں بیٹھئے یا راشن کی کیو میں ٹھہریئے ہر جگہ انتخابات کا چرچہ ہوتا رہتا ہے "کیوں جناب! انتخابات کون جیتے گا؟" اس سوال پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ دن تمام انتخابات کو بھگتنے کے بعد شام گھر آنے پر پتہ چلتا ہے کہ زوجہ محترمہ انتخابات پر بات چیت کے لئے پڑوس میں گئی ہوئی ہیں۔ آرام کرنا چاہتے ہیں تو کارکن انتخابی جلسوں میں جانے کے لئے آنے لگتے ہیں اور پھر جلسے شروع ہو جاتے ہیں غرض ایسے لگتا ہے چہار طرف ایک وبا پھیل گئی ہے جسے "الیکشن فیور" کہا جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ بخار سے زائد سرسام کی کیفیت ہے۔ اور جناب جب انتخابات ختم ہو جاتے ہیں تو ہر دو کو سکون میسر آتا ہے۔ لیڈر آئندہ انتخابات تک عوام سے ترک تعلق کر لیتا ہے جبکہ عوام حسب سابق روزمرہ کے کاموں میں الجھ جاتے ہیں۔

اس بار انتخابات میں مختلف اداکار سیاست میں حصہ لے رہے ہیں اب ہمیں پتہ چلا کہ سیاست اور اداکاری میں گہرا رشتہ ہے۔ لیڈر عوام کے سامنے فی البدیہہ اداکاری کرتا ہے جبکہ اداکار ڈائرکٹر کی ہدایت کا محتاج ہوتا ہے۔ ہم نے جانا کہ لیڈر عوام سے ڈھونگ رچا رہے تھے کبھی غریبی دور کرنے کا تو کبھی سوشلزم اور سیکولرزم لے آنے کا۔ آج ملک کے مسائل کا تذکرہ بھی ایکٹنگ اور ڈائیلاگ ڈلیوری کی باریکیوں کے ساتھ ہو رہا ہے بلکہ اکثر تقاریر میں اوور ایکٹنگ ہو رہی ہے۔ بعض وقت تقاریر کے دوران عوام کے اصرار پر فلمی ڈائیلاگ بھی بولے جا رہے ہیں۔ چند دن قبل ایک ایسے ہی فلمی اداکار کا انتخابی جلسہ ڈسکو ڈانس پروگرام میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہم بھی فلمی اسٹائل میں عوام سے یہ کہنے پر مجبور ہیں

آتا نہیں گزرا زمانہ حافظ خدا تمہارا

ہمارے ملک میں پارٹیوں کی کمی نہیں۔ انتخابات کے قریب ٹکٹ کے مسئلہ پر پھوٹ کے نتیجہ میں مزید چند پارٹیاں بنتی ہیں مسلمہ اصول کے تحت دائیں اور بازو والی پارٹیاں ہونی چاہئیں لیکن ہمارے یہاں کئی پارٹیاں درمیانی نوعیت کی بھی ہیں اور ہر پارٹی کی چند شاخیں حروف تہجی کے لحاظ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہر پارٹی کی پالیسی منفرد، ہر امیدوار کے خیالات الگ الگ اور اپنی پارٹی سے جدا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے ووٹ دیں۔ ہم اکثر اسی ادھیڑبن میں رہتے ہیں کہ ہمارا ووٹ کوئی اور استعمال کر جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے اس الجھن کا حل یہ نکالا کہ وہ اس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں جس نے انھیں سب سے زیادہ کھلایا، پلایا اور پہنایا ہے وہ کہتے ہیں۔ امیدواروں کی پالیسی اور خیالات وہ جانیں یہ ہماری اپنی پالیسی ہے۔

رائے دہی کے دن عوام کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ نام، ولدیت، عمر اور جنس لکھی ہوئی پرچیاں ہر امیدوار آپ کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ شاذونادر ہی صحیح معلومات درج ہوتی ہیں۔ پچھلے انتخابات میں ہمارے والد محترم کا نام بدل دیا گیا تھا۔ ایک اور وقت ہماری جنس تبدیل کر کے پڑوس میں رہنے والے خان صاحب سے ہماری شادی بھی کرا دی گئی تھی۔ آپ ووٹ ڈالنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہی کوئی کارکن اپنی پارٹی کا بیاج آپ کے سینے پر لگا جاتا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد دوسرا پھر تیسرا بیاج سینہ پر چسپاں ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں آپ کا سینہ ہمہ اقسام کے بیاج سے پُر ہو جاتا ہے۔ ہر پارٹی کا کارکن سواری پیش کرتا ہے۔ پولنگ بوتھ تک آپ کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اگر آپ اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا چاہیں تو خدارا جلد از جلد علی الصبح استعمال کریں ورنہ اکثر و بیشتر آپ کا ووٹ پڑ چکا ہوتا ہے۔ پولنگ بوتھ سے باہر نکلنے کے بعد آپ سے کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ بھائی آپ نے کس پارٹی کے حق میں ووٹ دیا ہے اگر آپ کسی کارکن سے کہیں کہ ہم نے آپ کو اپنا قیمتی ووٹ دیا ہے، وہ آپ کا شکریہ تک ادا کرنا نہیں چاہتا۔ پچھلی بار پولنگ بوتھ سے باہر آتے ہی ہماری ملاقات اس امیدوار سے ہوئی جس کو ہم نے ووٹ دیا تھا۔ ہم نے احسان جتانے کے لئے کہا "ہم نے آپ کو ووٹ دیا ہے"۔ یہ سن کر امیدوار نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا تھا "اگر جیت گیا تو شکریہ کا بیان اخبار میں پڑھ لیجئے اور ہاں اب آئندہ انتخابات تک خدا حافظ!"



فرحت قمر (نئی دہلی)

سبزیوں کا سماجی تجزیہ

سبزی جس طرح انسانی خوراک کا ایک اہم حصّہ ہے اسی طرح انسان کی سماجی زندگی میں بھی سبزی کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔ مگر یہ بات آپ کو تسلیم نہ ہو تو اپنے پڑوسی یا اپنے افسر کی سبزی لانا شروع کر دیجئے۔ پڑوسی کی سبزی لانے سے پڑوسی اور پڑوسن کے دل میں آپ کے لئے محبت جھلکے گی، آپ کی عزت بڑھے گی۔ افسر کی سبزی لانے پر آپ کی عزت تو یقیناً نہیں بڑھے گی لیکن دفتر سے مختلف قسم کی مراعات ضرور ملنے لگیں گی ـــــ ترقی بھی مل سکتی ہے۔ بازار سے سبزی خرید کر گھر اپنے باغیچہ میں اگائی ہوئی بتا کر افسر کو تحفتہً پیش کی جائے تو اور بھی اچھا تاثر ابھرتا ہے۔

سبزی میں دیہی اور شہری زندگی کا امتیاز بھی صاف جھلکتا ہے۔ دیہات میں ندی کے یا کنوئیں کے صاف پانی میں دھل کر بھی پتہ نہیں کیوں نکھار نہیں آتا اور اس کو یونہی ٹوکرے میں رکھ کر زمین پر رکھ کر فراخدلی کے ساتھ تول کر فروخت کیا جاتا ہے۔ بھاؤ بھی کلو کے حساب سے بتایا جاتا ہے مگر شہری سبزی گندے نالے کے پانی میں دھو کر بھی اس طرح سجا سنوار دی جاتی ہے جیسے سجی سجائی ہوئی عورت ـــــ اس سلسلہ میں مولی، چقندر جیسی سبزیوں کی شیمپو بنانے سے لیکر بینگن کی تیل مالش کرنے تک کے طریقے شامل ہوئے ہیں۔ اور صاحب جب یہ سبزیاں سلیقہ اور ترتیب سے شہری دکانوں پر سجائی جاتی ہیں تو پھر دیکھیے ان کی کشش! بچپن میں درجہ ایک کے منشی جی نے ایک فارمولا یاد کرایا تھا :-

" جتنے آنوں کا ایک چھٹانک، اتنے روپیوں کا ایک سیر "

کچھ اسی طرح ہم شہری اور دیہاتی سبزی کی قیمت کا فارمولا بھی بنا سکتے ہیں :-

" گاؤں میں جتنے کی ایک کلو، شہر میں اتنے کی ایک پاؤ "

بہرحال صاحب یہ تو دنیا جانتی ہے کہ شہر میں زندگی کے علاوہ ہر چیز مہنگی ہوتی ہے۔ اور صاحب جب شہر کا سبزی فروش ان کی گڈیاں بنائے گا، تراش خراش کرے گا، ان کو سلیقہ سے سجائے گا، تو قیمت میں بھی ایک عام طوائف کے مقابلے کال گرل کی سی زیادتی پائے گا۔

سبزیوں کے طبی مزاج و خواص تو بڑے بڑے حکیم لکھ چکے ہیں۔ اس میدان میں ٹانگ اڑانے کا ہم کو کوئی حق نہیں کچھ سبزیوں کے سماجی نقطہ نظر سے مزاج و خواص پیش خدمت ہیں۔

سیتا پھل ـــــ سیتا پھل کہو یا کاشی پھل اس کے مزاج میں ہندوازم ہی دکھائی دیتا ہے اس لیئے دہلی کے ہندو بازار سیتارام میں زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ اس کو "کدو" بھی کہتے ہیں مگر اس نام سے بھی اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی اور کچھ لوگ تشدید لگا کر جب اس کو "کدّو" کہتے ہیں تو یہ سبزی سے زیادہ گالی بن جاتا ہے۔

شلجم ـــــ شلجم میں کچھ اسلامی عنصر پایا جاتا ہے۔ جامع مسجد کے علاقہ میں خوب فروخت ہوتا ہے۔

ٹماٹر ـــــ ارتقاء کی منزلیں طے کر کے سبزی کی بجائے پھل بنتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی دس بارہ روپیہ کلو ملتا ہے اور کچا کھایا جاتا ہے

کریلا ـــــ ذائقہ میں تلخ ہوتا ہے۔ بچے اس کو بہ کراہت کھاتے ہیں۔ نیم پر چڑھ جاتا ہے تو اور زیادہ کڑوا ہو جاتا ہے۔

آلو ـــــ ایک سیکولر سبزی ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی اس کو خوب استعمال کرتے ہیں۔ اپنے سیکولر مزاج کی سے ہی اس کو ہر طرح کاٹا، بھونا، مسلا کچلا جاتا ہے۔

پالک ـــــ پالک کا نام سن کر "لے پالک" بچّہ کی یاد آتی ہے۔ غیر شاعرانہ سبزی ہے کیوں کہ اس سے پیٹ میں گیس زیادہ ہو جاتی ہے۔

بینگن ـــــ "لطائف بیربلؒ" کے حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سبزی اکبر بادشاہ کو بہت مرغوب تھی اور بیربل نے ایکبار کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "قدرت نے اس کے سر پہ تاج رکھا ہے" اور تنقیص کرتے ہوئے ریمارک دیا تھا "قدرت نے الٹا لٹکایا ہے"۔ بینگن اگر ایک تھالی میں رکھ دیئے جائیں تو ناقابل اعتبار اور خطرناک ہو جاتے ہیں۔

پھول گوبھی ـــــ آدمی کو موٹا بناتی ہے۔ جب وہ موٹا ہو جاتا ہے تو کسی ناگوار صورت حال سے بچ کر بھاگ نہیں سکتا اس گوبھی کے پھول کی طرح دانت نکال کر ہنس دیتا ہے۔

لوکی ـــــ لوکی کو گھیا بھی کہتے ہیں لیکن یہ نام غیر فصیح ہے اور شاید غیر مہذب بھی۔ اس کو سفید پھول کا کدو بھی کہا جاتا ہے لیکن صورت میں یہ اور بھی بازاری لگنے لگتا ہے۔ اس سبزی کے ساتھ ایک عجیب بات وابستہ ہے اور وہ یہ کہ مہذب اور شریف دال لوگ بازار سے تو "گھیا" لا کر ہی پکاتے ہیں لیکن "گھیا" کہہ کر کھاتے کھلاتے نہیں۔ 'لوکی' نام پا کر ہی یہ اچھے گھروں کے دسترخوانوں پہ پہونچ سکتی ہے!!

☐ ☐

مضامین صاف خوش خط اور صفحے کے ایک جانب لکھے ہونے چاہیں۔
تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھئے!

تمنا مظفرپوری

آزاد صاحب نے نقل کرایا

آزاد صاحب سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور آج جب ان سے اچانک ایک سڑک پر مڈبھیڑ ہوئی تو میں حیران رہ گیا۔ پینٹ کا پائنچہ اور ایک پیر کا جوتا کیچڑ میں لدبھد تھا۔ چہرے پر ہوائی اُڑ رہی تھی۔ اس حلیے میں انہیں کیوں کر کوئی پہچانتا مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکے اور پھر بچ کر نکل جانا چاہتے تھے کہ میں نے انہیں پہچان لیا اور آگے بڑھ کر پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "آزاد صاحب! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت! ہاں بالکل خیریت ہے بھائی۔" پہلے آزاد صاحب کچھ ہچکچائے پھر بے تکلفی سے بولے "دراصل آج کل ہائی اسکول کا سالانہ امتحان چل رہا ہے نا۔"

میں نے کہا۔ "امتحان کا آپ کے اس حلیے سے کیا سروکار۔ امتحان تو بچوں کا ہو رہا ہے۔ کیا آپ کا بھی مقابلہ ہوگیا ہے۔"

بولے۔ "اجی میاں تم کو پتہ ہے کہ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ سب ٹھیک ہے مگر آپ کیچڑ میں لدبھد کہاں سے آرہے ہیں؟"

بولے۔ "یہی تو ٹریجڈی ہے اولاد پیدا کرنے کی۔"

میں نے کہا۔ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ کا بچہ تو بڑا شریف، شرمیلا اور فرماں بردار ہے۔ کیا اس سے جھگڑا ہوگیا ہے!"

فرمانے لگے۔ جھگڑا نہیں ہوا مگر اس کی وجہ سے میں گندے نالے میں چلا گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "آزاد صاحب! آپ کیا بک رہے ہیں۔ کچھ تفصیل سے بتائیے کہ کیا حادثہ پیش آیا۔ اس حال میں آپ کو دیکھ کر مجھے ہول آرہا ہے۔"

بولے۔ "برادرم آج کل ہائی اسکول کا امتحان چل رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ ہاں! اور کچھ پرچے قبل از وقت آؤٹ ہوگئے ہیں۔ اس کی خبر اخبار میں آچکی ہے۔"

بولے۔ "جانتے ہو یہ پرچہ آؤٹ کیسے ہوا؟

میں نے جواب دیا۔"کسی عملے کی غلطی سے اور کیوں ؟"

" اجی میاں! تم رہ گئے نرے بے وقوف۔" آزاد صاحب نے فوراً کہا۔" ویسے یہ سوال برسوں تک مجھ سے کوئی پوچھتا تو میں بھی یہی جواب دیتا، لیکن جب اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تو یقین آیا۔"

میں نے پوچھا۔" آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

آزاد صاحب نے کہا۔"میرے صاحبزادے بھی اس سال امتحان دے رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔" ماشاءاللہ! وہ حضرت تو بڑے ذہین اور ہوشیار ہیں، فرسٹ ڈیویژن تو اُن کا رکھا ہوا ہے۔"

دریں چہ شک آزاد صاحب نے کہا۔" مجھے بھی یہی گمان تھا اور میں خوش تھا۔ مگر وہاں امتحان گاہ میں جو دیکھا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ انتظامیہ کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہنے لگا۔ لیکن یہ ماتم کا مقام نہ تھا۔ بقول بیگم صاحبہ کچھ کرنے کا مقام تھا۔" پھر آزاد صاحب نے بتایا۔" صاحبزادے دو روز سے امتحان دے رہے ہیں اور گھر آکر اپنی والدہ سے داستان امتحان دہراتے ہیں کہ تمام لڑکوں کے گارجین ان کو جوابات مہیا کرتے ہیں اور لڑکے اُسے کاپی پر نقل کر دیتے ہیں وہ حضرت تو اپنی ذہانت اور یادداشت سے کام لے رہے تھے لیکن یہ سوچ کر کہ نقل کرنے والے لڑکوں کو اچھے نمبر ملیں گے، گھبرا گئے اور بیٹے کی داستان سن کر بیگم صاحبہ مجھے طعنہ دینے لگیں کہ کیسے باپ ہو، اپنے بیٹے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ دیکھو پچھلے سال منشی جی کا لڑکا جو اپنا نام بھی ٹھیک سے نہیں لکھ سکتا تھا نقل کر کے فرسٹ ڈیویژن میں پاس کر گیا۔ صرف نقل کی وجہ سے اسے اچھا نمبر آیا اور اسے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ اگر تمہارا بیٹا اچھا نمبر نہیں لاتا ہے تو اس کا کالج میں داخلہ بھی ناممکن ہو جائے گا۔" پھر آزاد صاحب نے بتایا۔"بیگم کے طعنے سن کر اور منشی جی کے بیٹے کا واقعہ یاد کر کے میں نے کہا اچھا بھئی میں کل خود اسکول جا کر دیکھوں گا کہ کیا ماجرا ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں۔"

آزاد صاحب نے مزید بتایا۔" کل میں اسکول گیا تو وہاں کی حالت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اندر امتحان چل رہا تھا اور باہر لوگ پریشان نظر آئے۔ ہر شخص اس فکر میں مبتلا تھا کہ سوال کیسے حاصل کروں اور کس طرح نقل کرائی جائے۔ ایک طالب علم پر تین سے پانچ گارجین تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک صاحب کہیں سے سوال لے کر آئے تو سبھی ان پر ٹوٹ پڑے اور وہ حضرت سوال لے کر بھاگے اور ایک گلی میں گھس گئے۔ ان کے پیچھے کئی حضرات بھی بھاگے۔ میں بھی مشاہدے کے لئے ان لوگوں کے پیچھے ہو لیا۔ وہاں پر کئی لوگوں نے مل کر سوال حل کیا اور کاربن سے کئی کاپی کئے گئے۔ پھر وہ سب اسے لیکر اپنے اپنے لڑکوں کو دینے کے لئے امتحان گاہ کی جانب دوڑ پڑے۔ میں یہ منظر بھی دیکھنے کو چلا آیا تاکہ سبھی بات کی جانکاری ہو جائے۔ امتحان گاہ پہنچا تو دیکھا کہ لوگ امتحان گاہ کے پچھلے حصے سے چہار دیواری پر چھلانگ لگا کر کلاس کی کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس طرف موجود پولیس والے نے اپنے ڈنڈے لے کر جب انہیں دوڑایا تو کچھ لوگ گرتے پڑتے بھاگے اور کچھ کو پولیس والوں نے ڈنڈے لگائے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے بڑا مزا آیا۔ میں نے سمجھا یہ بھی ایک قسم کا دلچسپ کھیل ہے بلکہ میں نے سوچا کہ یہ نقل بازی کا کھیل دراصل کرکٹ کے کھیل سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اور

ب سے بڑھ کر اس میں خوبی یہ ہے کہ نہ اس میں کھلاڑی کی تعداد کی کوئی پابندی ہے اور نہ ٹاس جیتنے کا جھمیلا اس طرف ان گاہ میں سوال دیا گیا اور کھیل شروع ہوگیا۔ دوڑ دھوپ کرنا، چھلانگ لگانا، پولیس والوں سے لُکا چھپی کرنا یا اسے اد میں لینا، پھر سوال حاصل کرنا، حل کرنا اور کرانا چھلانگ لگا کر کلاس تک پہنچنا اور کیچ ہونے یعنی پولیس والوں ڈنڈے سے بچنے کے لئے زبردست رن بنانا۔ یہ ہوا دلچسپ کھیل اور شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ نقل بازی میں بہت زیادہ بہی لیتے ہیں۔

میں نے کہا "آزاد صاحب! گویا یہ امتحان ان طالب علموں کا نہیں بلکہ ان کے گارجین کا ہے؟"

"ہاں بھائی میرے" آزاد صاحب نے فرمایا۔ "بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ سبھی گارجین کو نفسا نفسی کے عالم میں پایا۔ سبھوں ں کی فکر تھی کہ نقل کیسے کرائی جائے کسی کو اس کا افسوس نہیں تھا کہ نقل کیوں ہو رہی ہے اور تمنا بھائی مجھے اپنے بیٹے معصومیت پر اس وقت بہت ترس آیا جب ایک طالب علم اپنے گارجین کو بہت سخت سست کہنے لگا کہ اس نے ال حل کر کے نہیں بھیجا جس کی وجہ سے اس کا یہ پرچہ خراب ہوگیا۔ اور باپ بیچارا نادم و مجرم بنا اپنے بیٹے کی کھری ی بات سنتا رہا۔ مجھے بھی اپنے بیٹے کی شرافت اور فرماں برداری پر رحم آیا پھر میں نے پولیس اور نقل بازی کے اِس چھپی کے دلچسپ کھیل میں حصہ لینے کا پروگرام بنا لیا"

پھر آزاد صاحب نے بتایا۔ "لہٰذا آج میں نے اس کے لئے سوال حاصل کیا۔ اس ہجوم کے درمیان اسے حل کرایا اور خود بھی حل کیا آخر میں جب میں اسے اپنے بیٹے تک پہنچانے گیا تو اس کی کھڑکی تک پہنچنے سے پہلے جو نالہ تھا اسے چھلانگ رہا تھا کہ ایک پاؤں نالے کے اندر اور میں اس طرف دھڑام سے گر پڑا۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب! آپ بڑے آئیڈیالوجسٹ بنتے تھے پھر اس چکر میں کیسے پڑ گئے؟"

بولے۔ "تم خواہ مخواہ مجھے گھسیٹ رہے ہو۔ جب سبھی گارجین ایسا کرتے ہیں تو اکیلا میں کیسے اس آب و ہوا سے سکتا تھا۔ دراصل ہم لوگ پیدا ہی غلط عہد میں ہو گئے ہیں جب آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ یہاں آئیڈیالوجی، تہذیب پائی اور ایمانداری نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اجی برادرم میں ہی کیا اسی نقل بازی کے چکر میں افسران بھی شامل ہیں تم کو یقین نہیں تو خود چل کر دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔ ان غلط افسران اور غلط نظام کی وجہ سے ہی تو غلط کام ہوتا ہے ورنہ یہاں کے عوام تو بڑے ے سادے ہیں۔ انہیں جس راہ پر چلایا جاتا ہے چلنے لگتے ہیں۔"

آزاد صاحب نے میری بات کو قطع کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی اپنی تقریر بند کرو۔ مجھے کسی طرح لوگوں کی نظروں سے ر گھر لے چلو۔ میں آپ بیتا یا نقل کرانے سے!!

∞

پاگل عادل آبادی

بیادِ اندرا

قطعہ

سوچا نہ سمجھا کام لیا نہ دماغ سے
بلبل کو دور کر دیا مالی نے باغ سے
اندرا کو گولی ماردی خود اُس کے گارڈ نے
"اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

غزل

آل راونڈر تھی، ٹاپ تھی اِندرا
اچھے اچھوں کی باپ تھی اندرا

مونچھ والے بھی ڈر کو مرتے تھے
آندھی، طوفاں تھی بھاپ تھی اندرا

ہندو مسلم ہو سکھ ہو عیسائی
سبھوں کی مائی باپ تھی اندرا

امن ہو یا ہو جنگ کا میداں
ہر جگہ ٹاپ ہی ٹاپ تھی اندرا

نقش جس کا نہ مٹ سکے گا کبھی
دوستو ایسا چھاپ تھی اندرا

دشمنوں کی نگاہ میں ہر دم
ایک روڑا تھا گیاپ تھی اندرا

دانت دشمنوں کے کر دیئے کھٹے
شیرنی، اپنے آپ تھی اندرا

راہ نما خود ہی کارواں خود ہی
اپنے قدموں کی چھاپ تھی اندرا

ٹاپ کے لوگ بھی یہ کہتے ہیں
ٹاپ لوگوں میں ٹاپ تھی اندرا

بھول سکتا نہیں کبھی عالم
اَمن کی لَے پہ تھاپ تھی اندرا

جس کا ثانی نہیں تھا اے پاگلؔ
پھول وہ اپنے آپ تھی اندرا

ظفر حسینی (بھوپال)

چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث.....

میں چشمہ لگاتا ہوں مجھے منظور لیکن جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ داری نہ تو نظر کی خرابی پر عاید ہوتی ہے اور نہ ہی معدہ کے فلل یا منہ کی بدمزگی۔ اس میں تو سراسر مجھ کو اپنی بیوی کی ہی خطا معلوم ہوتی ہے اور اسی پہ کیا موقوف جوانی سے بڑھاپا آ گیا بقول کسی کے اندھیری رات میں چاند بھی کھلا اور چاندنی بھی چاروں طرف ننھے مُنّے تاروں کے ساتھ جگمگانے لگی اور اس تمام مدت میں ایک دو نہیں اَن گنت ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن میں قطعی طور پر میری بیوی قصوروار تھی اب نہ ماننے تو بات تسلیم کرانے کی گارنٹی تو میں بھی نہیں دے سکتا۔ آپ سولی پر لٹک کر بھی اگر اپنی بیوی سے پوچھیں کیوں ہماری بات کا یقین آیا تو وہ یہی کہے گی کہ یہ تو منوانے کا بہانا ہے۔ اب یئے آپ سے تو لٹکائیے پھانسی گلے ہی تاکہ اس کو آپ کی بے چارگی پہ ترس آئے اور پھر کہیے مرحوم واقعی سچ کہتے تھے۔ حالانکہ اس میں بھی شک ہے۔ ہو سکتا ہے تب بھی یہی کہتی سنائی دے کہ آجی وہ تو مرنے کا بہانا ڈھونڈھ رہے تھے، میری اپنی رائے تو یہی ہے کہ شوہر پرست بیویاں تو سب اللہ کو پیاری ہو چکیں بقول شاعر ؎ "ڈھونڈ وگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

اب تو یہی چھاتی پر مونگ دلنے والی بیویاں رہ گئی ہیں جو ہمہ وقت شوہروں کو پٹّے دیا کرتی ہیں اور خدا جانے اللہ نے اس جنس کی زبان میں کیسی تاثیر دی ہے کہ بابا آدم کو جنت سے نکال کے دنیا کے گلے میں لا پھنسایا اور اب دُنیا سے نکال کے پھر جنت پہنچانے کے درپے ہے۔ بے چارہ شوہر احمقوں کی طرح ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کرتا ہے اور یہ بیٹھے دیکھ بڑی خوبی سے اپنا کام نکالتی ہیں اور یہ مٹی کا مادھو ٹکر ٹکر دیکھا کرتا ہے۔ بولنے سے مجبور اور کچھ کرنے سے قاصر۔

اب آج کا ہی واقعہ لیجیے۔ دوپہر کا وقت صبح سویرے کا ناشتہ کیے ہوئے جب دن کے ایک بجے کھانا کھانے بیٹھے تو بھوک اتنی لگ رہی تھی کہ بقول دانشمندوں کے بھوکنے کو جی چاہ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ بڑے چاؤ پیار سے کھانا نکال کر لائیں، دور سے ہی خوشبو ناک سے گزر کر دماغ تک کو معطر کرنے لگی۔ دل میں بڑے خوش ہوئے واللہ آج قسمت جاگی پتہ نہیں کون

سے جن کی نیکی کام آئی جو کہ بیوی مہربان ہوئی۔ آج تو بڑا خوش ذائقہ کھانا نوش کرنے کو ملے گا۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ تمام خوشی پیغام حسرت آیات ثابت ہوگی۔ بسم اللہ کہہ کر پہلا نوالہ منہ میں لیا ـــــ اور بس! معلوم ہوا جیسے متھرا ریفائنری کی چیز پر (زبان) رکھ دی ہو منہ سے معدہ تک آگ ہی آگ پھنک گئی آنکھیں رم جھم کر کے ساون کا مینہ برسانے لگیں ناک بھی پگھلتی ... کی مانند رادی۔ چناب کا منبع بن گئی اور لگی اپنا سٹر سٹر راگ الاپنے۔ بس بقول مجاز

ع　"اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آبھی گئے"

سر اٹھا کر دیکھا بیگم صاحبہ معصوم سی صورت بنائے کھڑی نظر آئیں اور اسی انداز دلربانہ سے سوال ہوا

"کیا ہوا؟" میں نے کہا

"کچھ نہیں آج دادی مرحومہ کی یاد آرہی ہے"

بولیں "کھانا کھاتے وقت ہی یاد کرنے کی کون سی تک تھی؟"

"دراصل دادی جان مرحوم زردہ اور چونا کی بہت شوقین تھیں"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"سنئے تو جانیئے، دراصل بات یہ ہے کہ چونے کی زیادتی کی وجہ سے ان کی زبان میں چھالے اکثر رہا کرتے تھے! وہ کھانے پکاتے وقت اپنے لیئے بنا مرچ کا یا ہلکی مرچ کا سالن الگ نکال کر رکھ لیا کرتی تھیں"

"تو یوں کہیئے نا مرچیں زیادہ ہیں کیا؟"

"جی نہیں شاید نمک کم ہے"

بات مطلب کی تھی فوراً اچک لی اور الزام فدوی کے سر ہی منڈھ دیا بولیں "اس مہینہ نمک بڑا خراب آیا ہے، پتہ نہیں اس میں چاک ہے کہ راکھ۔ مٹھیوں سے بھر بھر کر ڈالا کر دیکن پتہ ہی نہیں چلتا"

"ہو سکتا ہے نمک خراب نہ ہو مرچ ہی تیز ہوگی" میں نے جوابی کارروائی کے طور پر کہا۔

پینترا بدل کر بولیں "مرچیں تو ایسی خراب ہیں آج تک نہیں آئیں، تھوڑی ڈالو تو رنگت غائب، زیادہ ڈالو تو آنکھ ناک نربدا کا منبع بن جائیں۔ میری تو جان عجب کشمکش میں ہے"

میں نے ٹالنے کی غرض سے پوچھا "مصالحہ کس نے پیسا تھا؟" بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، فوراً بولیں

"اے لو یاد آیا مصالحہ تو بوا نے پیسا تھا، جب کبھی بوا سے مصالحہ پسواؤ یہی حشر ہوتا ہے، کبھی مرچ زیادہ تو کبھی یہ کم، کبھی ہلدی جیسا پیلا کبھی ایکدم لہسن کی طرح سفید ..." شومئی قسمت، اسی وقت بوا کا داخلہ ہوا گفتگو کا آخری جملہ ... کے کانوں میں بھی پہنچ گیا۔ فوراً تنتناتی ہوئی بولیں "بیگم صاحبہ کیوں الزام دیتی ہیں، صبا کا مسالا تو آپ نے ہی پیسا تھا میں تو ... وقت برتن مانجھ رہی تھی"

"لو سنو بوا، مصالحہ تم نے پیسا تھا یا میں نے۔ اور یہ تمہاری عادت کیا ہے کان کھڑے لیا کرتی ہو، چوری چھپے

باتیں سن رہی تھیں :-

"اللہ مات کرے بیگم صاحب ہیں کیوں کن کھنے لوں کی کے، میں تو پوچھنے آئی تھی" (ا ا دنت کیا کچھ کہا ؟)"

"پکے گا میرا سر، میں سب سمجھتی ہوں تم لوگوں کی حرکتیں"

"بیگم صاحب محنت کرتے ہیں تو دو ٹکے ملتے ہیں، نوکری کرتے ہیں پر بلا فضول کے الزام نا دیں"

"تو یوں بولو کوئی دوسری جگہ دیکھ لی ہے" "سن لیا آپ نے" بیگم صاحبہ نے ششدر بیٹھے مجھ تنہا تماشبین سے مخاطب ہوکر کہا۔ "بوا حضور جواب مانگ رہی ہیں، چوری اور سینہ زوری" تنازعہ کو نپٹانے کی غرض سے میں نے کہا جانے دو بوا کا مقصد یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں" بس اتنا کہنا کافی تھا۔ بیگم صاحبہ مجھ پر ہی اُلٹ پڑیں، یہی ہمدردی تو اُن لوگوں کا اور ستیاناس کرتی ہے، کریں خود، پر الزام ان پر نہ آئے۔ مصالحے کا ستیاناس یہ کریں کھانے کی بدسلیقگی کا الزام میرے سر، میں کہتی ہوں اب یہ بوا رہے گی یا میں"

"ارے ارے یہ کیا کہتی ہیں، آپ تو اس گھر کی مالک ہیں آپ کہاں جائیں گی" میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"یہ نہیں ہوسکتا جب تک یہ بوا کی چھٹی نہ ہو میں یہاں پر نہیں رہ سکتی"

بوا جو اتنی دیر سے بیگم کی گفتگو سُن رہی تھی پہلے ہی کافی تاؤ کھا چکی تھی اب جو اس نے اپنی سبکدوشی کا اعلان سُنا تو اور بھی کھل کر لوہا۔ نتیجہ یہ کہ بیگم اور بوا میں تقریباً نصف گھنٹہ تک معرکہ رہا اور راوی بے چارہ خالی موقعہ کے لیئے حیران پریشان فرار کا راستہ تلاش کرتا رہا معاً دروازہ پر دستک ہوئی فدوی جان چھڑا کر باہر نکلا۔ کافی دیر گئے شام کو جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا بوا نوکری چھوڑ کر جا چکی، چولہا ٹھنڈا پڑا تھا کیوں کہ بیگم صاحب بنا بوا کی امداد کے باورچی خانہ نہیں سنبھال سکتیں۔ نیز الزام میرے سر ہے کہ میں نوکر دار کی حمایت اور ہمدردی کرتا ہوں جس سے نوکر بگڑتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ نوکر کا انتخاب بیگم صاحبہ خود انٹرویو لے کر کریں گی۔ آپ کی نظر میں کوئی نوکر یا بوا ہو تو ضرور اور جلد بھیجیے کیوں کہ تکمیل انتخاب تک فدوی کو ہوٹل کا کھانا ہی زہر مار کرنا پڑے گا۔

□□

صابر بہار (رانچی)

فلمی تضمینات

مجھ سے ہے عشق کا یوں ماجرا
اک حسینہ سے سڑک پر دل لگا
جانِ من جو پیار سے میں نے کہا
وہ طمانچہ زور کا اس نے جڑا
"پینترے سب عاشقی کے رہ گئے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے"

ہنسیئے نہ میرے حال پہ یہ بات جانئے
اس کو ستم ظریفیٔ حالات جانئے
یعنی مری غریبی کی سوغات جانئے
خواہش یہ اپنی کب تھی میاں ساٹھ کا ملے
"دل کی یہ آرزو تھی کوئی دل رُبا ملے"

مرے ساتھ ہوٹل میں کھاتی ہو بیگم
مرے سنگ پکچر بھی جاتی ہو بیگم
بری طرح باتیں بناتی ہو بیگم
قدم سے قدم تم ملاتی ہو بیگم
"محبت کی ہم تم سراپا ادا ہیں
نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں"

غزلیں

اقبال ہاشمی

حسین مرغیوں کا نظارہ کرو
مگر دال پر ہی گزارا کرو
یہی نہ ہو تو پانی بن جائے گا
یہی عشق لیکن دوبارہ کرو
بہت چین سے دن گزر جائیں گے
بجٹ میں ہمیشہ خسارہ کرو
زبانوں کے جھگڑے سلجھ جائیں گے
زبانوں کو اپنا دوبارہ کرو
ہتھیلی میں جنت دکھا کر مجھے
نہ شیشے میں اپنے اتارا کرو
ملاوٹ کے گھی میں سمجھ ہاشمی
نہ شیخی کی ہانڈی بگھارا کرو

سراج دہلی

چپاتی کا وہ جو کھاتا جا رہا ہے
کلر چہرے پہ آتا جا رہا ہے
سڑک پر جو جنازہ جا رہا ہے
میرے [illegible] کا مُردہ جا رہا ہے
سناتا جا رہا ہوں اس کو غزلیں
مروت میں وہ سنتا جا رہا ہے
ستم دیکھو کہ جس کا ہے اسی کو
چرا کر مرغ بیچا جا رہا ہے
اندھیرے میں ہوا ہے چور غائب
پکڑ کر مجھ کو پیٹا جا رہا ہے
سراج اب افسروں کا بن کے چمچہ
ترقی خوب کرتا جا رہا ہے

حیدر بیابانی (بیتول گنج)

فنِ دروغ گوئی

انسان پیدائشی سچّا ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ جھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پہلی بار اس جھوٹی دُنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنی بدنصیبی پر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے ہیں ویسے ویسے ماں اُسے جھوٹ گھُٹّی کے ساتھ پلانا شروع کر دیتی ہے، روتے ہوئے کو جھوٹ کہہ کہہ کر ہنسانے کی کوششیں کرتی ہے۔ لوریوں اور کہانیوں کے ذریعہ بہت سارا جھوٹ اُس کے کانوں میں اُنڈیلنے لگتی ہے اور اُسے جھوٹ موٹ کا راجہ بیٹا اور چندا بیٹا کہنے سے نہیں چوکتی ہے وہ راجہ بیٹا کسی بھکاری کے گھر ہی کیوں نہ پیدا ہوا ہو یا وہ چندا بیٹا شکل وصورت کے حساب سے سالا اور بدصورت ہی کیوں نہ رہا ہو۔

جب بچّہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو دروغ گوئی کا دوسرا کورس شروع ہوجاتا ہے۔ اُسے عملی تعلیم بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً والد بزرگوار گھر میں تشریف فرما ہیں اور قرض خواہ دروازے پر کھڑا ہوا ہے، ایسی حالت میں جھٹ بچے کے ذریعہ جھوٹ کہلوا دیا جاتا ہے۔ "ابو گھر میں نہیں ہیں" یا پھر گھر میں مہمان آگئے ہیں اور آفس جانا کسی صورت ممکن نہیں، اس لیے بچّہ فوراً آفس جاکر بہانہ کرآتا ہے "پاپا کے سر میں درد ہے" یہ بہانہ بھی جھوٹ کی ایک خاص قسم ہے اس طرح انسان دورِ طفلی سے ہی فنِ دروغ گوئی میں طاق ہونے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے پکّا دروغ گو بن جاتا ہے۔

دروغ گوئی کا سلسلہ گود سے لے کر گور تک چلتا رہتا ہے۔ آدمی جب مر جاتا ہے تو بعد از مرگ جھوٹ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ رشتہ دار جھوٹے آنسو بہاتے ہیں، پڑوسی جھوٹے دلاسے دیتے ہیں۔ اور احباب جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔

میدانِ دروغ گوئی میں اُستاد شاگرد کے بھی رشتے ہوتے ہیں۔ کہیں اُستاد کے اُستاد ہوتے ہیں اور کہیں پر اُستادوں کے اُستاد بھی پائے جاتے ہیں۔ اِس مضمون کو پڑھنے والے حضرات بھی یقیناً جھوٹ سے دلچسپی رکھتے ہوں گے یا پھر دروغ گوئی کا فن سیکھنے کا شوق ضرور رکھتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ لاکھ ضروری کام چھوڑ کر اس مضمون کو پڑھنے اور سُننے بیٹھ گئے یا کھڑے کھڑے اور لیٹے لیٹے ہی پڑھنے میں مگن ہیں۔

اس دنیا میں شہرت حاصل کرنے کا بہترین ہتھیار دروغ گوئی یا جھوٹ ہے۔ اگر اعتبار نہ ہو تو جھوٹ کہہ کر دیکھ لیجئے یا کسی جھوٹے شخص کے درشن کر لیجئے۔ ساری باتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیں گی۔ لوگ جھوٹ کہہ کہہ کر اور جھوٹ سن کر خوش ہوتے ہیں۔ جھوٹے کی عزت ہوتی ہے اور ہمیشہ چار آدمی اُسے گھیرے رہتے ہیں۔ اس مہذب سماج میں شہرت، عزت و دولت حاصل کرنے کا سب سے خوب صورت اور سہل ذریعہ دروغ گوئی اور صرف دروغ گوئی ہے۔ اس میں ہینگ لگتا ہے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آجاتا ہے۔

کسی نے کیا ہی خوبصورت جھوٹ کہا ہے کہ "سچ کہنا صرف بچوں اور بے وقوفوں کا کام ہے" اگر اس بات کا تجزیہ کیا جائے تو بر آج کی یہی سب سے بڑی جھوٹ ثابت ہوگی۔ بچوں کے بارے میں آپ پڑھ اور سن چکے ہیں، اور رہے بے وقوف تو اُن کی کسی کو سچ سمجھنا ہی سب سے بڑی بے وقوفی ہوگی۔

جھوٹ کی ایک قسم تعریف ہوتی ہے آپ کسی شخص کی تعریف کرتے ہیں تو سمجھو دروغ گوئی کے علاوہ کچھ نہیں کرتے ہیں۔ (ویسے تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہوتی ہیں) آپ اگر کسی شخص سے تھوڑا سا سچ ملا کر یہ بات کہیں کہ "تم نے فلاں کام بڑے اچھے انداز کیا ہے لیکن یہی کارنامہ پہلے بھی ایک آدمی اتنے ہی اچھے ڈھنگ سے انجام دے چکا ہے" تو سمجھ لیجئے اُس شخص کی ناک بھوں چڑھنے لگے گی لیکن یہی بات جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ یوں کہی جائے کہ "واہ واہ صاحب آپ نے وہ کام کر کے تو کمال ہی کر دیا ایسا کارنامہ کبھی ہوا نہ کبھی ہوگا" تو وہ شخص آپ کو سر آنکھوں پر بٹھالے گا اور تب آپ کو جھوٹ کی کرشماتی طاقت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ نظر آجائے گا۔ کیف بھوپالی کا ایک شعر ہے ؎

"چاروں جانب دیکھ کر سچ بولیئے
آدمی پھرتے ہیں سرکاری بہت"

جھوٹ کہتے میں ویسے تو [illegible] یا داخلی مزہ [illegible] نہیں ہوتی ہے۔ جھوٹ بولیے اور سر عام بولیے۔ اگر خدانخواستہ آپ کا [illegible] سرکاری آدمی کو جھوٹ کا شبہ بھی ہو [illegible] تو پہلے سے بہتر جھوٹ گڑھ لیجئے اور برملا کہہ دیجئے کوئی گرفت نہیں کرے گا۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ وہ سچ کہتے ہیں کیوں کہ جھوٹ کہنے کی انھیں عادت ہی نہیں ہے۔ لیکن غالب کا یہ دعویٰ بھی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے ویسے تو ساری روایتی اردو شاعری ہی جھوٹ کا پلندہ ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اتنی بڑی جھوٹ کہہ کر تو غالب جھوٹوں کے شہنشاہ ہی بن گئے اتنی سفید جھوٹ اور اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ! اچھا صاحب آپ نہ ہوئے ہوتے تو کوئی تیر نہیں مار لیتے تھے آپ کا ہونا ہی آپ کے حق میں بہتر رہا۔ کچھ نہیں تو شاعر اعظم تو کہلائے گئے سب میں امر ہو گئے۔

شاعری کے علاوہ مذہب نے بھی جھوٹ بولنے کی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اپنی ذرا سی جھوٹ بولنے سے جان بچتی

نے بچ رہی ہو تو بلا تکلف جھوٹ بولنے کی اجازت ہے لیکن یہاں تو اتنا بگاڑ پیدا ہوگیا ہے کہ جب ڈاکٹر سڑا دانت نکالنے تا ہے تو ہم مارے تکلیف کے "یا اللہ مرگیا" کہہ کر سر بسر جھوٹ بول دیتے ہیں۔

دروغ گوئی کی ایک خطرناک قسم دھوکہ دہی ہوتا ہے۔ دھوکہ دہی کی ہزاروں داستانیں تاریخ کے صفحات پر بکھری ہی ہیں آج کے دور میں "سچے کا بول بولا اور جھوٹے کا منہ کالا" والی بات جھوٹی ثابت ہو چکی ہے اب تو جھوٹے کا بول بالا سچے کا منہ کالا ہونے لگا ہے۔ دورِ جدید میں نئے نئے جھوٹے پیدا ہو چکے ہیں۔ جھوٹی دلیلیں دینے والا پلیڈر بنتا ہے۔ جھوٹے سرٹیفکٹ دینے والا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ اور جھوٹے وعدے کرنے والا لیڈر کہلاتا ہے۔

"جھوٹ اتنی بار اور اس انداز سے کہو کہ سچ بن جائے" ساری باتوں میں ہمیں بس اسی بات میں سچائی نظر آتی ہے۔ اور یدانوں کی طرح کھیل کے میدان میں بھی یہ بات سچ ثابت ہوئی ہے۔ کرکٹ میں اگر اپیل پُرزور اور بار بار کی جائے تو امپائر سے تسلیم کر لیتا ہے چاہے وہ غلط اور جھوٹی ہی کیوں نہ رہی ہو لیکن کبھی کبھی کھیل کے میدان سے باہر بھی کہی گئی جھوٹ سنگین صورتِ حال پیدا کر دیتی ہے۔ کرکٹ کے ایک نامور کھلاڑی سے ٹیم کے مینیجر نے یہ وعدہ لیا کہ وہ صرف کھیل پر دھیان دے گا اور لڑکیوں سے دور رہے گا۔ اگلے دن مینیجر نے اس کھلاڑی کو ایک لڑکی کے ساتھ کیساپا کرتے دیکھا تو آگ بگولہ ہوگیا۔ کھلاڑی بولا جناب غصے میں آنے سے پہلے میری بات سن لیجئے یہ لڑکی میری بیوی ہے۔ . . . . مینیجر برس پڑا "تمہاری بیوی؟ کم بخت یہ میری بیوی ہے"

فنِ دروغ گوئی میں طاق شخص کبھی رائی کو پربت کر دیتا ہے تو کبھی پربت کو رائی کر دکھاتا ہے۔ بنیادی طور سے ساری اولادِ آدم ہی جھوٹی واقع ہوئی ہے۔ لیکن اُن میں معتبر جھوٹے گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔ یہ وہ مردِ مجاہد ہوتے ہیں جن کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزرتی ہے ایسے ہی جھوٹوں نے فنِ دروغ گوئی کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور قدمے سخنے مدد فرمائی ہے۔ اس لیئے ہم تمام چھوٹے بڑے جھوٹوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے شہر اپنے دیہات یا اپنے محلے میں ایک ایک عدد "انجمنِ دروغ گویاں" یا "جھوٹوں کی انجمن" ضرور بنائیں تاکہ اس فن کو جلا ملے اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ہاں یہ خیال ضرور رہے کہ انجمن کے عہدے دار ایسے ہی افراد ہوں جو بذاتِ خود معتبر پکے اور سچے جھوٹے ہوں اور صدر نشین تو کوئی جھوٹوں کا شہنشاہ ہی ہونا چاہیئے۔ آگے چل کر گاہے گاہے مقابلۂ دروغ گوئی اور فنِ دروغ گوئی پر سمینار بھی ہونے چاہیئے۔ جھوٹوں کو وظیفے بھی ملنا چاہیئے۔ اور اُن کی عالمی پیمانے پر ایک اکیڈمی بھی قائم ہونی چاہیئے۔ آخر حقداروں کو اُن کا کچھ تو حق ملے!!

*

مجیب الرحمن بزمی (رانچی)

جسم ہے ان کا بھاری بھرکم، پاؤں بھی ان کا بھاری جی — اونچی نیچی پگڈنڈی پر چلنے میں دشواری جی
کوئی بتاؤ کون سی شئے ہے دھن دولت پر بھاری جی — ماں کی اُلفت، باپ کی شفقت، بیوی کی دلداری جی
لاعلمی کی بات نہیں یہ سوچی سمجھی حیالیں ہیں — سوکھی روٹی، گندا انڈا، کچھ باسی ترکاری جی
میر پہ تھیسس لکھ کر اس نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی — میر کا شعر سمجھنے سے ذہن ہے جس کا عاری جی
ٹوٹی چپل، میلا اچکن، ہاتھ میں جھولا راشن کا — دیکھ کے حلیہ جان گیا میں کیا اس میں دشواری جی
میرے قلم کی جولانی سے چور اُچکے لیڈر ہیں — راشن لے کر بھاشن بکھنا پیشہ ہے سرکاری جی
کھادی دھوتی، کھادی کرتا، اس پر جیکٹ کھادی کا — لیڈر بن کر دھونس جمائے خوب کرے بدکاری جی
اپنے دیش کے اوتاروں کو یارو مت بدنام کرو — اونچ نیچ اور ذات پات کی دور کرو بیماری جی
اس دھرتی پہ مجھ سے پہلے کتنے پاپی آئے گئے — اُن لوگوں پر بزمی تم کو دنیا کہتی بھاری جی

غزلیں

افضل خاں افضل (رائے پوری)

بھوک و بیکاری کا چرچا آج ہر اک گھر میں ہے
صرف دو روٹی کا سودا آدمی کے سر میں ہے
حاکم اعلیٰ ہو یا ادنیٰ سا اک عرضی نویس
کس طرح رشوت کا مال آئے اسی چکر میں ہے
کتنی دلکش اور حسین تصویر ہے جمہور کی
زندگی لپٹی ہوئی بوسیدہ سی چادر میں ہے
تو قفس کے چند دانوں پر قناعت کر گیا
قوتِ پرواز ورنہ تیرے بال و پر میں ہے
ازدواجی زندگی کیسے ہو افضل کامیاب
ڈھنگ اب جینے کا نہ بیوی میں نہ شوہر میں ہے

محمد رحیم الدین سنؔ

ساس کی "ہو" تو سمجھو بہو کی "نہیں"
کاں بی ہو ساس بہو کی جمتی نہیں
پہلے اپنی زبان کھلتی نہیں
اور بولے تو بات سرتی نہیں
غصہ کس پو اُترتا نہیں معلوم
اُن کے آگے تو دال گلتی نہیں
گھر کے باہر اکڑ کو پھرتیں پر
گھر کا دیکھے تو چُھٹی ہنڈی نہیں
میری باتوں کو سب پکڑتیں پر
لوگاں بولے منجے تو کچھ بھی نہیں
سنگی سُسرال میں چلا لو سب
اپنے گھر میں تو اپنی چلتی نہیں

شکیل رضا (بنگلور)

کرسی کی آرزو میں..

بچپن سے ہی ہماری دلی آرزو رہی تھی کہ ہم ایک اچھے سیاست داں اور لیڈر بنیں! کیوں کہ طبیعت ہی کچھ ایسی پائی کہ کبھی ہم سے نچلا بیٹھنا گوارا نہ ہوا. مگر ایک سیاست داں اور لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی الیکشن میں کھڑے ہو کر انتخاب لڑے! کیوں کہ کوئی بھی سیاست داں جب تک کسی الیکشن میں حصہ لے کر کسی اور سیاست داں کے مقابل انتخاب نہیں لڑتا۔ وہ ایک اچھا اور سچا لیڈر نہیں بن سکتا. اور پھر کسی بھی سیاست داں اور لیڈر کی اچھائیوں اور سچائیوں کا علم تو اس کے الیکشن میں کھڑے ہو کر انتخاب لڑنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ورنہ انتخابات میں کھڑے ہونے سے قبل کوئی سیاست داں کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، لوگ اُسے ایک اچھا لیڈر نہیں مانتے اور جب کوئی کسی الیکشن میں کامیاب ہو جاتا ہے تو لوگ اُسے اپنا ہیرو سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں. چاہے وہ انگوٹھا چھاپ ہی کیوں نہ رہا ہو!

ویسے تو ہم بچپن سے ہی لیڈر بنے پھرتے تھے مگر ہمیں ایک اچھا اور سچا سیاست داں بن کر دکھانا تھا. اس لئے ہم نے سوچا کہ اسمبلی کے الیکشن میں نہ سہی. بلدی الیکشن میں تو ضرور کھڑے ہونا چاہیئے! یہاں پر ہم آپ کو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے دیں گے کہ ہم اس قابل نہ تھے کہ اسمبلی کا الیکشن نہیں لڑ سکتے. سارا شہر جانتا ہے کہ ہم نہ صرف اسمبلی کا الیکشن لڑ سکتے ہیں. بلکہ اگر ہم اکبری جلال میں آجائیں تو پارلیمنٹ کا الیکشن بھی لڑ کر دکھا سکتے ہیں. چاہے ہمیں الیکشن میں ہارنا ہی کیوں نہ پڑے! کیونکہ آج کل کسی الیکشن میں ہار جانا بھی بہادری کی نشانی سمجھی جاتی ہے! جس طرح محبت اور جنگ میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا! اسی طرح الیکشن اور جنگ میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا. اور جنگ میں ہار جانے والا سپاہی بھی بہادر ہی کہلاتا ہے. لیکن ہمارا یہ اصول رہا ہے کہ ہر کام اصول کے دائرے میں رہ کر کیا جائے اور ہر کام کا یہ پہلا اصول ہے کہ کوئی بھی کام سلیقے سے سرانجام دیا جائے. جہاں تک پارلیمنٹ اور اسمبلی کی ٹکٹ حاصل کرنے کا سوال ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی کا چمچہ کہلانا پسند نہیں تھا. اس لئے ہم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ کسی کا چمچہ بننے کے بجائے بالکل تن تنہا بغیر کسی قید و بند کے، شتر بے مہار کی طرح مطلوبہ آزاد امیدوار بلدیہ کے الیکشن میں حصہ لے کر کسی پہاڑ کے مقابل کھڑے ہوں! کیوں کہ کسی پہاڑ کے مقابل رائی ہو تو پہاڑ بھی نظ

اس مصمم ارادہ کے بعد "خاندانِ جلال الدین اکبر" کے پورے جوش اور جلال کے ساتھ ہم اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ بلدیہ کا الیکشن قریب تھا اور "پرچہ نامزدگی" داخل کرانے کے لئے صرف آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اس لئے ہم اپنی خاندانی کرسی، جس کا پچھلا حصّہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اپنے سر پہ رکھ کر دفترِ نامزدگی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے! اگر ہم اپنے سر پہ کرسی رکھ کر اس طرح نہ بھاگ کھڑے ہوتے تو الیکشن میں ہمارا کھڑے ہونا مشکل ہی نہیں۔ بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ کیوں کہ ہماری طرح سینکڑوں امیدوار دفترِ نامزدگی کے روبرو اپنی اپنی نشانیاں لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی ہاتھی، گھوڑے پہ سوار تھا۔ تو کوئی راکٹ میں بیٹھا اُڑا جارہا تھا اور کوئی اپنا ہی گریبان پھاڑ رہا تھا۔ اور خود کو سیاسی میدان کا مجنون بتا رہا تھا، جس کی وجہ سے دفتر کے اندر داخل ہونے کے لئے تل بھر کی جگہ خالی نہ تھی۔ مگر ہمارے سر پہ لدی ہوئی کرسی دیکھ کر لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے تھے اور ہم پوری رفتار سے دفتر کے اندر بھاگتے چلے گئے۔ اور پرچۂ نامزدگی داخلِ دفتر کر کے اسی رفتار سے پلٹ گئے!

الیکشن کی تیاریاں ابھی تشنہ لب تھیں اور ہمارے ہاتھوں میں کوئی ساغر و مینا تھمانے والا نہ تھا۔ لے دے کر پرکھوں کی ایک حویلی کھڑی رہ گئی تھی۔ جو کسی عجائب خانے سے کم نہ تھی۔ جس میں صرف ایک صندل کی کرسی باقی رہ گئی تھی۔ جو ہمارے لئے کسی خزانے سے کم نہ تھی۔ کیوں کہ ابھی اس میں جلال الدین ظلِ سبحانی کے جلال کی گونج باقی تھی۔ اور ہم اسی کرسی کو اپنا انتخابی نشان بنانے والے تھے۔ کیوں کہ حاصل الیکشن صرف کرسی ہی تو ہوتی ہے۔ جسے الیکشن کے بعد حاصل کرنا ہو! اسے پہلے ہی کیوں نہ حاصل کر لیا جائے۔ ناکامی کی صورت میں یہ حسرت باقی نہ رہے کہ ہائے ری قسمت۔ زندگی میں ایک کرسی بھی نہ حاصل ہو سکی!

ہمارے ایک بہت ہی قریبی دوست سے جو اتفاق سے کرسیاں بنانے میں بڑے ماہر تھے۔ اور کتنے ہی لیڈروں کی کرسیاں توڑ چکے تھے! ہم نے التجا کی کہ وہ اپنی کمپنی کی ساری کرسیاں الیکشن میں داخل کر کے ہمارے لئے کینواسنگ میں دامے۔ درمے۔ اور شامیانے کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ تو ہماری اور ہماری خاندانی کرسی کی جیت یقینی ہوگی! ہماری اتنی سی التجا اور اشارہ ابرو پہ ہمارے دوست نے اپنی کمپنی کی ساری کرسیاں اور شامیانے کرکٹ گراؤنڈ میں سجا کر ہمارے سارے حریف پہاڑوں کو رائی بنا دیا۔ اور ہر چوراہے پہ ایک شامیانہ لگا کر ایک شاہانہ کرسی بھی رکھا دی۔ اور ساتھ ہی میکروفون کا انتظام بھی خود ہی کروا دیا۔ جس کے ذریعہ ہر وقت کرسیوں کی خوبیاں بیان کی جاتی تھیں!

اس انتظام کے بعد ہمارے حریف حیران تھے اور کفِ افسوس مل رہے تھے کہ ہائے کرسی کا خیال انہیں پہلے کیوں نہیں آیا۔ اتنے اہم نشان کو وہ کیوں کر بھول گئے۔ جب کہ کرسی کے بغیر قوم و ملک کی خدمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا! بہرحال پہلے ہی محاذ پہ ہم نے اپنے حریفوں کو چت کر دیا تھا اور ہر ایک زبان پہ بس ہماری جلالی کرسی ہی کا نام تھا۔ ان دنوں ہمیں پل بھر کی فرصت نہ تھی۔ کیوں کہ ہر دن ہمیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی در کے دربان بنا پڑتا تھا۔ اور جلسوں میں خطاب کرنا پڑتا تھا۔ اس دوران ہمیں اتنے طوفانی دورے کرنے پڑے تھے کہ ہمیں خود دورے پڑنے لگے۔ مگر ہم نے کسی بھی دورے کی پرواہ نہیں کی اور خطاب جاری رکھا۔

میرے عزیزو! مہربانو اور قدردانو! آج آپ سب میرے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ کل آپ کے ہاتھوں میں

ہماری کرسی کی قسمت جاگنے والی ہے۔ ورنہ کل تک میں آپ کو جانتا تک نہیں تھا۔ اور آئندہ کبھی آپ کو جاننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ کیوں کہ آپ خود مجھے اچھی طرح جان جائیں گے۔ اس لئے آج ہم آپ سے کوئی وعدہ نہیں کریں گے۔ کیوں کہ جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا۔ مگر وہ وعدہ ہی کیا جو نبھانا پڑے! بہرحال آپ سوچتے ہوں گے کہ ہم نے کرسی ہی کو اپنا نشان کیوں بنایا۔ وہ اس لئے کہ ہم آپ کو اُوپر اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اور کرسی کے بغیر کسی کو اُوپر اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور یہی وہ کرسی ہے۔ جس کے لئے لوگ دوڑ لگاتے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ دوڑ لگائیں اور ہمیں کرسی پر بٹھائیں تو ہم آپ کو ساتھ لے کر چلیں گے اور آپ کے لئے کبھی ہم اپنی کرسی نہیں چھوڑیں گے! ہمارا اپنی کرسی سے پیار کرنا، آپ سے پیار کرنے کے مترادف ہوگا!

مذکورہ بالا دھواں دھار تقریروں اور طوفانی دوروں کا یہ صلہ ہے کہ آج ہم کئی بنگلوں اور کاروں کے مالک ہیں۔ اور مزید کرسیوں کی آرزو میں جئے جا رہے ہیں! کیوں کہ ہمارا ملک اور ہماری قوم ابھی بہت پیچھے ہے۔ انہیں اور آگے لانا ہے!!

شاہد عدیلی

غزل

میک اپ مجھے نانی کا ایسا نظر آتا ہے
بوسیدہ عمارت پہ چونا نظر آتا ہے

اس دورِ ترقی میں کیا کیا نظر آتا ہے
"مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے"

جس دن سے دیا دھوکہ مجھ کو مرے سالے نے
ہر چور مجھے اپنا سالا نظر آتا ہے

اولاد کی کثرت سے چاچا کو لگے جھٹکے
چاچا کا وجود اب تو سایا نظر آتا ہے

پٹتے ہوئے بیوی سے شوہر جو نظر آیا
ہر شادی شدہ مجھ کو ہولا نظر آتا ہے

پولیس کا جواں جب بھی ملتا ہے کوئی مجھ سے
کیا جانیئے کیوں مجھ کو غنڈا نظر آتا ہے

کیا ان کی یہ ہوئی شادی بینائی ہوئی چوپٹ
ڈونگا بھی انھیں اب تو چمچا نظر آتا ہے

کچھ نقص ہے مرغی میں یا مرغ ہے آوارہ
کیوں ورنہ ہر اک انڈا گندا نظر آتا ہے

معشوق سے ملنے کی ہمت نہ رہی شاہد
معشوق کی چوکھٹ پہ کتا نظر آتا ہے

کریک پٹیالوی

ہزل

لکشمی کا جب بڑے بالو کو درشن ہو گیا
سامنے جو پڑ گیا تھا سب کا دشمن ہو گیا

موت سے پہلے چہلم میں نے اپنا کر لیا
بعد مرنے کے جو جھنجھٹ تھا سماپن ہو گیا

ودھوا پنشن کا جو فنڈ آیا تھا کتنے ہی بھی
بیچلر آفیسروں کے بیچ وتَرن ہو گیا

کھول دو کھڑکی نکل بھاگوں گلی کی راہ سے
رات کافی ڈھل چکی بارہ کا ٹن ٹن ہو گیا

آج تھو ملو لے سوہن پر کیا کرتے تھے جو
ان دنوں در ملیہ انہیں ہانڈی کا گھرجن ہو گیا

چھپر کر دو چار چھوٹے افتخار احمد کریک
شہر کا مشہور اور معروف سرجن ہو گیا

ممتاز مہدی
حیدرآباد

فجّو

فجّو کا تصوّر ذہن میں اجاگر کرنا ہو تو کسی عجوبۂ روزگار کا خیال کرنا کافی ہوگا۔ وہ لمحہ غیر معمولی تھا جب بابا میرے قریبی دوست نے فجّو سے ہمارا تعارف کروایا تھا۔ رنگ چمکتا سیاہ، قد اوسط، بالوں کی لمبائی اوسط، ناک مختلف کھنڈروں سے آراستہ لیکن اوسط، ہونٹ بھی اوسط، کان بڑے، آنکھیں چھوٹی، مونڈھے ڈھلے، ہاتھ اکڑے ہوئے جو سدا بے چین، پاؤں ہمیشہ سیدھے لیکن جب چلنے لگیں تو یوں محسوس ہو کہ اب گریں کہ تب گریں۔ بات کریں تو آفریقیوں کی طرح چمکتے دانت دکھا کر بے معنی ہنسی ہنس کر ایک بات شروع کی اور دوسری بات میں اُلجھادی۔ پہلی بات ہوا میں معلق لٹکتی رہے گی اور دوسری بات پلے نہ پڑی ہوگی کہ وہ پہلی بات گھسیٹ لائیں گے لطف یہ کہ ہر بات میں تضاد! ابھی موجود اور ابھی غائب ———

پہلی ملاقات میں ہم انہیں بہت چھوٹے نظر آئے تھے اس لیئے ہمیں سلام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور جب ہم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اُنہوں نے شانِ بے نیازی سے اپنے ہاتھ کھینچ لیئے۔ بابا نے بھانپ لیا تھا کہ ہماری بہت ہی حقیر سی بے عزتی ہوگئی ہے۔ اس لیئے ٹکٹ خریدنے میں بہت عجلت سے کام لیا۔ لیکن سینما بینی کے دوران ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فجّو بابا کو فلم دیکھنے نہیں دے رہے ہیں بلکہ باتوں میں اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ بابا کی آواز صاف سُنائی دیتی تھی کہ ہم مانوس تھے۔ دوسرے وہ قریب تھے لیکن فجّو بعد کی سیٹ پر اور کہنے کا انداز ایسا تھا کہ آپ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں تو یوں لگے گا جیسے ہونٹوں سے نکلے ہوئے سگریٹ کے مرغولوں میں اتفاقیہ بننے والی تحریر کو آپ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

فجّو سے ہمارے ایک اور ساتھی راہی بہت گھبراتے ہیں۔ راہی کو وقار کا بہت خیال ہوتا ہے۔ لیکن از راہِ بچت اپنوں سے آنکھ چرا کر چھوٹے موٹے کام کر گزرنے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ اس لیئے اُنہوں نے ہمیں سینما کی تھرڈ کلاس لائین میں ٹھہرا دیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے راہی کی نظر فرسٹ کلاس پر گئی جہاں فجّو ایک کہنی پہ دوسرا ہاتھ جمائے کھلے ہاتھ سے چہرے کا غیر ضروری جائزہ لیتے ہوئے کھڑے تھے۔ راہی نے جونہی انہیں دیکھا، کہا "یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ عزت کا معاملہ ہے"۔ دونوں کے قدم تیز تیز تھیٹر کی گیٹ سے باہر نکلنے لگے اور ایک [illegible] کہنے لگی "راہی۔ [illegible]" [illegible] پاس "پاس بیٹھے" [illegible] بہت [illegible] اور نہ جانے کیا کیا کہا لیکن [illegible]

اُلٹے پاؤں گھر چلے آئے۔ ایک دو اور ملاقاتیں بدقسمتی سے ہوگئیں، وجہ بابا کی مجبوری کہ وہ کام کے لوگوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ فجو کام کے اس لئے تھے کہ وہ نیم ماہر الکٹریشن تھے۔ خود ہماری الکٹرک استری اُنہوں نے مہینہ میں آٹھ بار درست کی تھی۔

ایک بار بابا کے ہمراہ فجو کے مکان کی بیرونی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا موصوف ٹیپ ریکارڈر کا ایک آلہ ہاتھ میں لئے مصروف تھے چونکہ ملاقات مقصود تھی کہ اسی غرض کے تحت بیگم بازار سے ملے پلی تک سیکل پر ٹانگیں دُکھائی تھیں۔ لہٰذا کئی صدائیں لگائی گئیں بیل (BELL) دبائی گئی، کھڑکی پر آوازیں لگائی گئیں، دروازے کو پیٹا گیا لیکن فجو جو ہمیں صاف دکھائی دے رہے تھے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک خلاسفر کی طرح ٹیپ ریکارڈر لئے غرقِ فکرِ دفن تھے۔ بابا نے کہا "دروازہ تو کھلا ہے ہی چلو گھس پڑیں"۔ ہم نے کہا "اور زنانہ"؟ بابا نے کہا "ہوتا تو فجو کہدیتا کہ آجاؤ" لہٰذا اندر پہنچے اب ہمارے اور فجو کے درمیان بہ مشکل ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ پھر بھی جواب ندارد۔ آخر جھنجلا کے ہم اُٹھنے کا قصد کر ہی رہے تھے کہ زبانِ فجو آخر بول اُٹھی "بابا! ٹیپ ریکارڈر درست کرنا اور تین گھنٹے کے اندر لوٹانا ہے اور معاملہ بڑے بھائی صاحب کا ہے خرابی کچھ نہ تھی لیکن اپنا ہنر آزمانے کی وجہ سے ایک ایک چول بگڑ گئی ہے دس منٹ میں بھائی صاحب آنے والے ہیں میں بہت پریشان ہوں مہربانی ہوگی جہاں سے تشریف لائے ہیں، وہیں جلد سے جلد چلے جائیں، ہم بادلِ ناخواستہ لوٹ آئے۔

ٹیپ ریکارڈر کا جب ذکر نکلا ہے تو عرض ہے کہ فجو میاں نے کتنے ٹیپ ریکارڈر درست کئے ہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن ٹیپ ریکارڈر سے انہوں نے اپنی قسمت ضرور بنالی جسب معمول ہم نے بیرونی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا فجو بہت ہی مستعدی اور تجسس سے ٹیپ ریکارڈ میں دیکھ رہے ہیں ہم نے آواز کی تو فوری جھپٹ کر ہمیں دیکھا اور انگلی کے اشارے سے خاموشی سے اندر آجانے کو کہا۔ کمرہ کے اندر داخل ہوئے وہ اپنے جبڑے دبائے ناک پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کیلئے کہہ رہے تھے، ٹیپ ریکارڈر "آن" تھا۔ مائیک کا وائیر کمرے کی اندرونی کھڑکی سے گھر کے اندر جاتا ہوا نظر آرہا تھا اور چپیدہ دیوار سے زنانہ آوازیں آرہی تھیں۔ اس خاموش فضاء سے جب زیادہ دیر لڑ نہ سکے تو باہر نکل آئے اور باہر سے سیدھا اپنے گھر کے اندر۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ٹیپ ریکارڈر پر فجو میاں اپنی بڑی ہمشیرہ اور اُن کی سہیلیوں کی گفتگو ریکارڈ کر رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ہمشیرہ کی اپنی زبان سے کہی ہوئی اُن کی اپنی داستانِ عشق فجو کے ٹیپ میں محفوظ ہوگئی تھی جسے فجو نے اپنی ہمشیرہ کو سُنایا اور اس کے بعد سے اپنے "آب و دانہ" سے بے فکر ہوگئے۔

ایک دن فجو کے گھر کے روبرو ہم، بابا اور فجو میاں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ان کے ایک اور پڑوسی نیّر چلے آئے۔ نیّر نے شکایتہً کہا "فجو بھائی آپ طرح طرح کی چیزیں بنا کر اپنے دوستوں مہدی اور بابا کو دیتے ہیں بھائی ہمیں بھی ایک ہیٹر (HEATER) بنا کر دے دیں تو مہربانی ہوگی"۔ فجو میاں نے کہا "مہدی اور بابا کا تم سے کیا مقابلہ وہ میرے قریبی ساتھی ہیں تم ابھی بچے ہو۔ ہم تمہیں اس گستاخی کی معقول سزا دیں گے"۔ نیّر صاحب کا گھر فجو کے گھر سے متصل تھا اُنہوں نے اپنے پلگ (PLUG) لگانے والے ہولڈر میں ایسے تار بٹھا دیئے جس کے نتیجہ میں ہوتا یہ تھا کہ نیّر صاحب جب بھی اپنا ریڈیو کھولتے اس میں گھڑگھڑاہٹ شروع ہوتی اور وہ ریڈیو سن ہی نہیں سکتے تھے۔ مجبور ہوکر نیّر نے فجو سے ایک سکینڈ ہینڈ ٹرانسسٹر خرید لیا جس کی مرمت ہر چند دن بعد فجو کیا کرتے۔

ایک بار بابا کے ساتھ ہم اور فجو فائی گراونڈ کے ریگ زار پر براجمان تھے کہ اچانک ہماری نظران کی چھت پر پڑی جہاں ڈھیر سی ٹیوب لائٹیں بکھری پڑی تھیں۔ ہم نے فجو سے کہا "یہ کیا ماجرا ہے"؟ انہوں نے صاف صاف بتادیا کہ ان کے بھائی صاحب نے کہیں سے ہراج کا مال چھڑا لایا ہے اور پوری ٹیوب لائٹیں گیلی ہیں اس لئے دھوپ میں رکھی گئی ہیں سوکھنے پر ان کو درست کرنے کی کوشش کی جائیگی طے ہوا کہ ایک ایک ٹیوب لائٹ ہم اور بابا خریدیں گے اور معاوضہ کے طور پر فجو کو دو وقت کے کھانے کے لئے علیحدہ علیحدہ بریانی، مرغ کا سالن مع پراٹھے کھلائیں گے، ایک ایک فلم دکھائیں گے اور مشترکہ طور پر ایک کلو کھوپرے کا تیل بھی دلائیں گے جو ان کے گھر کے مکینوں کی مہینہ بھر کی ضرورت کی تکمیل کرے گا۔ اور تیل کی جو قیمت فجو نے گھر سے لی ہے ان کی جیب میں صحیح سلامت رہے گی۔ دو ٹیوب لائٹیں لئے فجو وارد ہوگئے لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ٹیوب لائٹ بہت ہی چھوٹی اور دوسری اتنی ہی بڑی جتنی کہ عموماً ہوتی ہیں۔ چھوٹی ٹیوب لائٹ ہمارے حوالے کر دی گئی۔ ہم نے سوال کیا کہ "چھوٹی ٹیوب لائٹ ہمارے حق میں کیوں؟ جبکہ بابا نے بھی اتنی ہی قیمت ادا کی ہے!!" کہنے لگے "نہیں نہیں وہ تو واجبی ہے تمہیں پتہ نہیں کہ تم نے بابا سے کم قیمت ادا کی ہے۔ تم نے جو بریانی کھلائی وہ گھٹیا تھی، تم نے جو مرغ کا گوشت کھلایا اس میں ٹانگ نہیں تھی، گوشت تھا مگر پوست کے ساتھ نہیں، فلم بھی اتنی اچھی نہیں دکھائی جتنی کہ بابا نے اور جو کھوپرے کے تیل کے پیسے ہماری جیب میں تم دونوں نے مل کر ڈالے تھے وہ اسی دن گم ہوگئے لہٰذا بابا کو جو ٹیوب لائٹ عنایت کی جارہی ہے انشاء اللہ ایک مہینہ تک ضرور کام دے گی"۔ ہم نے دیدے پھاڑے فجو سے پوچھا "ہماری ٹیوب لائٹ کتنے دن کام دے گی!؟" جواب ملا "اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی"، اور انہوں نے اپنے دست مبارک سے ٹیوب لائٹ ہمارے گھر میں سجادی، پورا گھر بقعۂ نور بن گیا لیکن دوسرے دن ٹیوب لائٹ نے اپنی مخصوص ادا سے آنکھ مارنا شروع کر دیا اور تیسرے دن گھر میں گھپ اندھیرا۔ ایک ہفتہ تک یہ اندھیرا چھایا رہا چوں کہ ایک ہفتہ بعد بابا کی ٹیوب لائٹ بھی اندھیری روشنی دینے لگی تھی۔ فجو میاں کئی دن کی ٹال مٹول کے بعد آئے، دونوں کی ٹیوب لائٹیں درست کیں اور چلے گئے جونہی گئے گھر میں اندھیرا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا فجو میاں دونوں ٹیوب لائٹوں کے لئے کرنٹ کا کام کر رہے ہیں۔ جب تک ہیں روشن ہیں جونہی گھر سے باہر قدم رکھا، اندھیرا ہی اندھیرا۔

فجو ایک دن حساب کتاب میں اُلجھے نظر آئے۔ حساب ان کے بس کا روگ نہ تھا اسی لئے نویں جماعت کے بعد دسویں جماعت کو حقیر نظروں سے دیکھا اور بالآخر دھتکار دیا۔ فجو میاں کی گتھی سلجھتی نظر نہ آئی تو ہم نے عارضہ کی نوعیت پوچھی پتہ چلا کہ ان کے مکان میں ان کا اپنا حصّہ کتنا ہے وہ جاننا چاہتے تھے۔ ہم نے جھٹ پٹ مکان کا جائزہ لیا اور ان کے بھائیوں کے ساتھ بہنوں کا بھی شرعی حق الگ کرنے کے بعد بتایا کہ جملہ بارہ ہزار ان کی جھولی میں سماسکتے ہیں۔ فجو نے سکون کی سانس لی آدھ گھنٹہ سوچ میں غرق رہے اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

اس دن سے فجو اور ان کے والد کے درمیان خانہ جنگی چھڑگئی کہ فجو نے اپنا حق مانگا تھا، والد محترم ضعیف اور موظف آدمی لاکھ سمجھایا لیکن فجو کا استدلال یہ تھا کہ گریجویٹی کی رقم بنک سے خاموشی سے نکالی جائے اور ان کے حوالے کر دی جائے۔ ان کے والد نے اس مطالبہ کی تہہ تک پہنچ کر معلوم کیا کہ فجو اس رقم سے آنکھ بچا کر رہنا چاہتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ فجو

آٹو کے اور آٹو فجو کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتے لہٰذا بضد انہوں نے کرانہ کی دکان کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ پہلے دن فجو بھائی صورت بنائے سیٹھ بن کر بیٹھے کسی گاہک سے بات کرنی انہیں گوارہ نہیں۔ ان کے والد صاحب ہی گاہکوں سے لین دین کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے دن فجو ایک بالکل نیا آٹو رکشا لئے والد صاحب کے دیوان خانہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ والد بزرگوار نے حیرت سے اس منظر کا نظارہ کیا اور باہر نکل آئے۔ فجو آٹو سے نکل آئے اور آٹو سے لگے ایک جانب خاموش کھڑے ہوگئے۔ والد صاحب تیز قدم بڑھاتے دکان تک ہو آئے اور فجو انہیں خاموشی سے دیکھتے رہے۔ والد صاحب نے استفہامیہ ہاتھ اٹھایا فجو نے کہا کچھ نہیں تو ہزار میں دکان چند دلال چورسیا کو بیچ دی ہے اور یہ آٹو خرید لیا ہے۔ والد صاحب نے سر پکڑ لیا کہ ایک ہی دن میں تین ہزار کا نقصان فرزند دلبند نے کر دیا تھا۔

فجو میاں پیدائشی کاریگر آدمی تھے، ہفتہ میں ایک دن ضرور آٹو کھول دیتے اور فٹ بھی کر دیتے۔ اور اپنی ایجادیں بھی شامل کرتے چلے جاتے۔ میٹر کے چکر لگانے والے گھیر کے چند دانے اس مہارت سے توڑ کر رکھ دیئے تھے کہ وہ تیزی سے گھوم جاتا تھا بلکہ آپ کے پانچ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے تھے کہ فجو میاں کا میٹر دس پیسے کا اشارہ کرتا تھا اسی کے نتیجہ میں انہوں نے دو قسم کے موٹر بنا رکھے تھے جب ایک موٹر الکٹرک سے گھومتا ہے تو برقی کا میٹر تیزی سے سیدھے رُخ میں گھومنے لگتا ہے۔ دوسرا اسٹارٹ کیا جائے تو برقی کا میٹر اُلٹا گھومنے لگتا۔ فجو کے گھر میں چاہے سو روپے کی برقی صرف ہو چاہے ہزار کی میٹر تو فجو کے حکم کے تابع ہوتا ہے ہر ماہ صرف چھ روپے کا بل ہی آتا ہے۔ یعنی آٹو سے پبلک کا زائد خرچ کرواتے ہیں تو برقی سے حکومت کی نظر میں کم خرچ ثابت ہوتے ہیں۔

فجو میاں سے آٹو کو عمدگی اور بدسلیقگی ہر دو طرح سے استعمال کرنے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ پہلا اندیشہ ہماری خوش فہمی پر دلالت کرتا تھا۔ ایک بار ایک سیکل سوار جس کے آفت آئی تو اپنا ہینڈل فجو کے آٹو رکشا میں پھنسا لیا۔ فجو نے یہ منظر دیکھ کر بھی آٹو کی رفتار بڑھادی آٹو فراٹے بھرنے لگا سیکل سوار آٹو کی رفتار سے کھنچا چلا گیا اور جسم کے تقریباً تمام حصوں پر زخم آگئے۔

ایک بار فجو کو دوسرے آٹو ڈرائیور نے اوورٹیک کرنا چاہا اس لیئے فجو نے رفتار بڑھاتے بڑھاتے اس کی آخری منزل تک آکر آٹو کو فیل ہی کر دیا۔ پیچھے کا آٹو زوردار دھکے سے رک گیا، فجو کے آٹو رکشا کا پچھلا حصہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور فجو کا سیکل سوار بھی بری طرح مجروح ہوگیا۔ لیکن ٹکراتے ہوئے آٹو رکشا کو بہت ہی خفیف سا نقصان پہنچا۔ فجو کا کہنا ہے جب تک سب رکشا والے مل کر اس قسم کی کارروائی نہیں کریں گے اوور ٹیک کی بیماری ختم نہیں ہوگی۔

فجو عام انسانوں کی طرح دل رکھتے ہیں جو حسن کے پیچھے بے تاب ہوتا ہے۔ تڑپتا ہے۔ ان کا کہنا ہے آٹو رکشا ایک کثیر سرمایہ سے خریدنے کا مقصد اتنا ہی تھا کہ کوئی حسینا ہاتھ کے اشارے سے انہیں قریب بلائیں گی۔ اس طرح فجو کی دل کی مراد آتی تھی لیکن آٹو کے مسلسل نقصانات کے بعد انہیں یہ تجربہ کافی مہنگا پڑا [illegible] ہم کیا دیکھتے ہیں کہ فجو لمبی لمبی موٹی زنجیریں گھر کے صدر دروازے کے اندر [illegible] میں مصروف تھے۔ انہوں نے دوسرے دن [illegible] افتتاح کو [illegible] ہیں

تقسیم کر کے گیا۔ تیسرے دن دیکھا کہ فجو کے گھر کا صدر دروازہ بند ہے۔ کافی دیر بعد دروازہ کھلا تو بہت سی حسین پریاں چہچہے کرتی نکلیں اور محلے کے مختلف گھروں میں غائب ہو گئیں۔ فجو نے کہا "ہماری عقل ماری گئی تھی جو ہم نے آٹو خریدا ورنہ یہ تو کتنا سہل اور سستا نسخہ ہاتھ لگا ہے کہ گھر میں جھولا ٹانگ دیا اور محلہ بھر کی حسین پریاں ہمارے ہاتھوں کے دوش پر آسمان سے باتیں کرنے لگیں"۔

اب فجو سے ملاقات ایک مشکل مسئلہ بن گئی تھی کہ جب جایئے دروازہ بند ہے۔ بابا کو بھی جوش آگیا جن کا مکان انتہائی تنگ گلی میں واقع تھا انہوں نے بھی اپنے مکان کے صدر دروازہ کے اندر جھولا ٹانگ دیا اور دودھ پیڑے سے جھولے کا افتتاح کیا لیکن واہ ری بدقسمتی بابا کو یہ علم ہی نہ تھا کہ بیگم بازار چھوٹا سا ہندوستان ہے اور جہاں وہ جس خصوصی گلی میں رہتے بستے ہیں وہاں ہر رنگ، ہر پیشہ، ہر طبقہ اور ہر ذات کے لوگ بیگانوں کی طرح رہتے ہیں۔ چاہے حُسن ہو کہ عشق اس کو اپنی منتیں اور مُرادیں دور دراز کی گلیوں میں ملتی ہیں۔ قصہ مختصر جونہی جھولے کا افتتاح ہوا محلے بھر کے سو دو سو چھوٹے چھوٹے مرد بچوں نے قطار باندھ لی اور بابا ہر روز کسی نہ کسی پڑوسی سے دست بہ گریباں ہیں کہ کسی دن کسی لڑکے نے ٹانگ توڑلی تو کسی لڑکے نے ہاتھ۔ آخر بابا نے تنگ آکر جھولا ہی توڑ پھینکا اور بابا نے سوچا کہ چلو فجو ہی کے جھولے کے حصہ دار بن جائیں گے۔ فجو کے گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہجوم فجو میاں کے گھر پہ ٹوٹ پڑا ہے۔ قریب جاکر دیکھا وہ ہجوم کے درمیان میں تھے اور موٹی موٹی زنجیریں ان کے سر کو گنجا کر رہی تھیں۔ یہ وہی زنجیریں تھیں جو شاید اب سے کچھ دیر پہلے جھولے کا ایک مضبوط حصہ تھیں۔ ہجوم درہم برہم ہوا ہم فجو بھائی کے قریب پہنچے، روداد پوچھی، زخم اور آنسو پونچھے انہوں نے مردانگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور کہا "عشق چھپائے نہیں چھپتا"۔ ہم نے معصومیت سے پوچھا "کیا ہوا"؟ انہوں نے کہا "ہوتا کیا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا اور جھولے پر کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر پڑ گئی اور کچھ نہیں"۔ ہم نے کہا "اگر ایک گھنٹہ قبل بابا تشریف لائے ہوتے تو شاید وہ آپ کے مکمل حصہ دار ہوتے"۔

فجو اور بابا اب بہت زیادہ قریب ہو گئے۔ لمبی لمبی سڑکیں ناپتے۔ دھوپ کی پرواہ نہ برسات کی۔ ان کے اشارے پل دو پل میں کسی رکشا میں بھی ہو جاتے تو کبھی سینما میں لمبی چوڑی بات چیت بھی ہو جاتی۔ ایک بار یونہی کسی برقعہ نے بابا کو برقعہ ہٹا کے دیکھ لیا۔ زو (zoo) کا مقام ہے اور یار دوست جانوروں کو دیکھنے کے بجائے برقعوں کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑ گئے۔ زُو سے نکلتے نکلتے زوردار بارش شروع ہو گئی اور اب سیکلوں پر بیٹھے ہمارے دوست اُدھر ہی سیکل کا ہینڈل موڑ دیتے ہیں۔ جہاں رکشا مڑ جاتا ہے راہ میں بابا اور فجو کی گفتگو بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی۔ فجو کہتے ہیں "میں نے دیکھا تو نہیں، خوبصورت ہے کیا"؟ بابا تیزی سے کہتے ہیں "بہت زیادہ"۔ فجو، بابا کی توجہ دوسری جانب لیجاتے اور اپنی مطلب کی بات کہتے ہیں "رکشا والا سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کچھ نوٹ دکھائے ہیں، ایک پانچ روپے تو ضرور دینے ہوں گے اور یہ کام تم سے نہیں ہو سکتا بہتر ہے تم میرے راستے ہٹ جاؤ"۔ بابا کہتے ہیں "کہانی ہم سے شروع ہوئی ہے تو ہم پر ہی ختم ہونا چاہیئے"۔ فجو جواب دیتے ہیں "کہانی آج کل کہیں سے بھی شروع کی جارہی ہے اور کہیں بھی ختم کی جارہی ہے لیکن تم کو

دوستی برقرار رکھنا ہے کہ نہیں" یکایک دوسری بحث چھڑ جاتی ہے کہ جس رکشا کا ہم تعاقب کر رہے تھے وہ لال تھا کہ کالا اور ایک موڑ ایسا آیا کہ جہاں کے سہ راہے پر کالا رکشا ہے اور نہ لال۔ انجان سڑک تیز بارش سے کچھ سوجھتا نہیں بدن بھیگ کر حالت ابتر۔ مزید حالات کا جائزہ لے کر ہم فجو میاں سے دامن بچانے لگے۔

کچھ ہی دلوں میں فجو کی شادی ہوگئی اور یہ مرحلہ ہر کس و ناکس کے حصہ میں آتا ہے۔ بعض دلہنیں ہمت والی ہوتی ہیں اس لیئے ناکس دولہوں سے طلاق لے لینا ضروری سمجھتی ہیں لہٰذا فجو کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ آج ہم فجو کے اتنے قریبی اور گہرے ساتھی نہ رہے کہ شادی اور طلاق وغیرہ کی تفصیلات اپنے سیدھے سادھے انداز میں سنا سکتے۔ ہاں البتہ مہینوں میں جب کبھی فجو کے ہاں چلے جاتے ہیں تو ان کا ٹوٹا پھوٹا خالی خول ڈلا آٹو رکشا جس کو ڈھانچہ کہا جا سکتا ہے ایک کونے میں خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے فجو بھائی اُکڑوں بیٹھے سوچ و چار میں گم ہیں!

ادارۂ **شگوفہ** کے توسط سے

حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵	روپے
دھڑ گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹	"
بہر حال	"	مضامین	۷	"
بالآخر	"	"	۱۲	"
قطع کلام	"	"	۱۲	"
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰	"
سمندر فروزر	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
نئی [illegible]	لیق صلاح	"	۱۰	"
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲	"
[illegible]	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
ٹامیں ٹامیں فش	پرویز یداللہ مہدی	مضامین	۱۵	روپے
حنا چہ	مسیح انجم	"	۱۲	"
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲	"
[illegible]	رفیق شاکر	"	۱۰	"
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲	"

ایس ایم آرزو (کلکتہ)

ریزگاری کی قلت

چوں کہ آج اتوار تھا اس لیے ساڑھے آٹھ بجے سو کر اٹھا غسل کیا اور ساڑھے نو بجے ناشتے کے میز پہ آدھمکا۔ ے ہی آج کا تازہ اخبار اٹھایا تو دیکھا پہلے صفحہ پر جلی سرخیوں میں یہ لکھا ہے۔

ریزگاری کی قلت ختم ہو گئی

مرکزی وزیر خزانہ کا دعویٰ

نیر صاحب ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد گھر میں پڑا پڑا بور ہو رہا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ اس بوریت سے پیچھا چھڑانے کے لیے نیز چھٹی کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی اچھی سی فلم دیکھ لوں اس خیال کا آنا تھا کہ ذہن مشین کی طرح کرنے لگا۔ اور بالآخر اس بات پر سمجھوتہ ہوا کہ میٹنی شو چلیں گے۔ چوں کہ وقت کی کوئی قلت نہیں تھی اس لیے خراماں خراماں چل کر مقررہ وقت سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے سینما ہال پہنچ گیا اور ٹکٹ کاؤنٹر کا رخ کیا اور دیوار پہ چسپاں ٹکٹ چارٹ کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کیوں کہ سوائے فرنٹ اسٹال کے تمام ٹکٹ بآسانی مل رہے تھے میں بھی قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا دس پندرہ منٹ بعد میری باری آئی تو میں نے جیب سے کڑکڑاتا ہوا پانچ کا نوٹ نکال کر جونہی کاؤنٹر کلرک کو دینا چاہا اس نے گرج کر کرخت آواز میں کہا پچاس ساٹھ یا دس پیسے کا ریزگاری دو ورنہ . . . . . ظاہر ہے کہ میری طرح کوئی بھی شریف آدمی کاؤنٹر کلرک کے یہ جملے سننے کے بعد وہاں کھڑا نہیں رہتا لہٰذا میں نے فوراً رخصت ہونے میں ہی اپنی عافیت جانی اور ادھر اُدھر اُٹھرپے نار نگاہوں سے ریزگاری کی تلاش میں لگ گیا اتنے میں ایک صاحب فرشتۂ رحمت بن کر آئے اور کہنے لگے کیا آپ کو ٹکٹ چاہیئے میں نے کہا ٹکٹ تو چاہیئے لیکن میرے پاس پانچ روپے کا نوٹ ہے وہ صاحب کہنے لگے کوئی بات نہیں اور انہوں نے یہ جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ ہم نے روپیہ ان کے حوالے کر دیا اور ٹکٹ دینے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ بقیہ رقم انہیں واپس کر دو ان کے دوست نے مجھ سے پوچھا کتنا روپیہ آپ کو واپس چاہیئے تو میں نے کہا دو روپے دس پیسے کا ٹکٹ ہے اس لیے مجھے دو روپے نوے پیسے واپس چاہئیں۔ تو ان کے ساتھی نے کہا دس پیسے ریزگاری لائیے میں ان کا جملہ سن کر ششدر رہ گیا

خیر اُس فرشتہ صفت شخص نے مداخلت کی اور کہا کہ تین روپے دے دو۔ اور میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

ٹکٹ لینے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا ابھی آدھا گھنٹہ اور باقی ہے تو صاحب میں نے سوچا کہ جب وقت بھی ہے پیسہ بھی ہے اور بھوک بھی زوروں کی لگی ہوئی ہے تو کیوں نہ سامنے والے ناگ سوئیٹ چلے جائیں جو مشہور زمانہ ناگن مارکہ مٹھائی بناتے ہیں اور پھر اتنا زیادہ رقم اینٹھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ سانپ کی طرح ڈس رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس سانپ سے اپنے آپ کو ڈسواؤں یہ خیال دل میں آنا تھا کہ قدم خود بخود حرکت میں آگئے اور سیدھا ناگ سوئیٹ میں جاکر رکا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جہاں بیٹھنے کے لیئے ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا، وہاں اس کے برعکس بالکل بھیڑ نہیں تھی، خیر صاحب بیرا جیسے ہی آیا میں نے کہا ناگن سندیس اور ناگن رس گلہ لاؤ۔ میرے کہنے کے بعد اس کو مشین کی طرح کام پر لگ جانا چاہیئے لیکن اس نے سوال کیا آپ کے پاس کتنے روپے ہیں یہ سُنتے ہی جھلاہٹ سوار ہوگئی اور میں نے دل پر جبر کرکے اسے بتایا کہ ۱۳ روپے ہیں پھر اس نے سوال کیا یہ ۱۳ روپے کتنے نوٹوں پر مشتمل ہیں میں نے جواب دیا تین، دس کا ایک دو کا ایک اور ایک کا ایک۔ پھر اس نے تیسرا سوال کیا کہ آپ کتنے روپے کی مٹھائی کھائیں گے تو میں نے سخت غصّے میں کہا اس سے آپ کو کیا مطلب تو اس نے بھی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا کہ مطلب ہے تبھی نا، کیا آپ نہیں جانتے ان دنوں ریزگاری کی کتنی قلت ہے میں نے کہا آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا اس نے کہا دیکھئے صاحب آپ کتنے روپے کی مٹھائی کھائیں گے یہ بتائیے اور میرا اور اپنا وقت برباد مت کیجئے۔ یہ اخبار وخبار کی بات آپ اپنے پاس رکھیئے کیا آپ نہیں جانتے کہ وزراء کیسے آئے دن بدلتے رہتے ہیں اسی طرح مرکزی وزرا اپنی زبان بدلتے ہیں، خیر صاحب اِن باتوں کو چھوڑیئے اور یہ کہیئے کہ آپ کو کتنے روپے کی مٹھائی کھانا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ کم نہ زیادہ تین روپے کی مٹھائی کھاؤں گا۔ خیر صاحب رسٹورنٹ سے نکلے تو سنیما دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ سارا غم غلط ہوگیا۔ تقریباً ۵ بج کر ۵۰ منٹ پر فلم ختم ہوئی، تو میں نے چاہا کہ بس میں سوار ہوکر پکنک گارڈن جلد از جلد پہنچ جاؤں کیوں کہ وہاں میری منگیتر میری راہ تکتی ہوگی یہ سوچ کر سنیما ہال سے سیدھا بس اسٹینڈ آیا تقریباً ۵ منٹ کے انتظار کے بعد ایک بس آکر رکی، کنڈکٹر نیچے اتر آیا، بس میں سوار ہونے کے لیئے جوں ہی پاؤں اُٹھایا کنڈکٹر نے کہا اگر آپ کے پاس ریزگاری ہے تو بس پر چڑھیئے ورنہ . . . . . اس سے آگے کہ کنڈکٹر کچھ اور کہے میں نے بس سے اتر کر پیدل چلنا شروع کیا خیر کسی طرح پکنک گارڈن پہنچا میں ابھی گیٹ میں داخل ہو رہا تھا کہ دیکھا میری منگیتر بہت ہی غصے سے باہر نکل رہی تھی میں نے پکارنا شروع کیا لیکن وہ نہ رکی تو میں نے دوڑنا شروع کیا ابھی دوڑ کر چند قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی پکڑو پکڑو سالے کو لڑکی کو اکیلی دیکھ کر چھیڑ رہا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے ہوش نہیں جب آنکھ کھُلی تو اپنے آپ کو اسپتال میں پڑا ہوا پایا نرس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تین دن کے بعد مجھے ہوش آیا ہے گزرے ہوئے تمام واقعات ایک ایک کرکے ذہن میں اس طرح آنے لگے جس طرح پردہ سیمیں پر ایک سین کے بعد دوسرے سین آتے ہیں تو میں نے سوچا کیوں نہ اپنی آپ بیتی کو شگوفہ بناؤں !

مصنف نگار: ریشی منتری
مترجم: محمد اسداللہ

مراٹھی

بسہوان وری کی چوری

آپ کے گھر اگر چوری ہو گئی تو آپ کیا کریں گے؟
پولس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروائیں گے یا اپنے گھر خاموش بیٹھے رہیں گے۔ دراصل جب آپ کے یہاں پہلی چوری ہوتی ہے تب آپ اس ظلم پر چراغ پا ہو کر پولس کی طرف دوڑتے ہیں، مگر صرف ایک بار۔ اگلی چوری میں آپ کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ معاملہ پولس تک جاتے ہی نہ پائے کیوں کہ پولس انکوائری کے جھٹکوں سے آپ پہلی مرتبہ کافی عبرت حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

ایک دن تقریباً ۹ بجے ایک ۲۵ سالہ نوجوان وامن دیھوواڑی تعلقہ کے ایک گاؤں کے تھانہ دار کے دفتر میں ایک چوری کی رپورٹ لکھوانے گیا۔ چوری کی رپورٹ دینے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ پولس اسٹیشن کے زینے چڑھ رہا تھا تب سے لباس میں ایک پولس جوان آنگن میں تمبا کو گھونٹ رہا تھا۔ وامن نے اسے دیکھا اور پوچھا — تھانے دار صاحب ہیں؟
نہیں اتنے سویرے سویرے۔ کون ہو تم؟ پولس جوان نے پوچھا۔
میرا نام وامن ماروتی ٹینھورنی کر عرف ماروتی سوت۔
کیا کام ہے؟
چوری کی رپورٹ دینا ہے۔
کلرک کے آنے پر آؤ۔
لیکن کام ارجنٹ ہے۔
ہو گا۔ ڈائری کلرک لکھے گا۔ میں کیا کروں۔ اس کے آنے تک بیٹھو۔ وامن باہر پڑے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔
آفس تھا۔ یہاں جنک کی فائلیں دیواروں پر ٹنگی تھی۔ ٹیبل پر ایک میلی کچیلی چادر تھی اس پر دوات قلم چند فائلیں، کاغذ اور

قریب ہی کلرک کا ٹیبل تھا۔ وہیں دو کرسیاں پڑی تھیں۔ کوئی گھنٹہ بھر ان چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد وامن نے کلرک آمد کی انتظار تھی۔ خاکی پینٹ، سفید بشرٹ، میلی کچیلی سفید ٹوپی اس حلیہ میں وہ کلرک میونسپل کمیٹی کی پانی کا چھڑکاؤ کرنے والی موٹر کی طرح دونوں طرف پان کی پچکاریاں چھوڑتا ہوا آیا۔ اجنبی آدمی کو اندر دیکھ کر بھانپ لیا کہ کوئی کام کی بلا آئی ایک کونے میں تمباکو کا مراکبہ لگا کر بیٹھے ہوئے پولس سے اس نے پوچھا۔ کیوں کیا لفڑا ہے ——؟ چوری یا ڈاکے کا کیس ہے۔ تم ہی پوچھ لو —— پولس بیزاری سے بولا۔

کلرک اندر گیا اور وامن کو بلوا بھیجا۔ اس کے بعد کلرک کے اندر انکوائری کمیشن کا بھوت سما گیا۔ تمہارا نام؟

وامن ماروتی ٹینبھورنی کر عرف ماروتی سوت۔

جتنا پوچھوں اتنا بولو۔ تمہارا نام؟

وامن۔

باپ کا نام؟

ماروتی۔

سرنیم

ٹینبھورنی کر۔

عمر؟

۲۴ سال

پتہ؟

ٹینبھورنی کر واڑی، پتلی گلی باوڑا۔ حال مقام معرفت رائے باغ کر، ۱۳، بیچ کی گلی دیبھوواڑی۔

کیا چیز چوری ہوئی؟

سیفادری۔

یہ سنتے ہی تیزی سے لکھتا ہوا کلرک اچھل پڑا اور تقریباً چیخ کر پوچھا۔ کیا کیا؟

اس آواز پر باہر کا پولس بھی چونکا لیکن پولس اسٹیشن میں تو یہ چلتا ہی ہے یہ سوچ کر وہ پھر تمباکو کی جگالی کرنے لگا۔

ہاں سیفادری کی چوری ہوئی ہے۔

یعنی سیفادری نام کی کوئی بھینس گائے تھی تمہاری؟

نہیں سیفادری پہاڑ چوری ہو گیا۔

کلرک کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ سامنے کھڑا شخص پاگل ہے یا سنکی، اس کا وہم ہے، یہ خیال اس کے ذہن سے گزر گیا۔ لیکن وامن کا چہرہ نارمل تھا۔ وہ واقعی کسی اہم مال کی چوری ہو جانے کے احساس کے تحت بلبلاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کلرک نے

پھر پوچھا ـــ ایں کیا کہہ رہے ہو، سیفادری پہاڑ چوری ہو گیا؟
ہاں، رات کے تقریباً ڈیڑھ دو بجے ہوں گے سیفادری پہاڑ کی چوری ہو گئی۔ وامن نے پوری سنجیدگی سے کہا۔
ارے، میں ۱۵ سال سے پنچنامے کر رہا ہوں آج تک ایسا کیس نہیں آیا۔ کلرک نے کہا۔ اس میں میں کیا کر سکتا ہوں پچھلے پندرہ سالوں میں یہ پہاڑ کبھی چوری ہوا ہی نہیں۔" اب کلرک واقعی چکرا گیا۔ قانون کے مطابق اسے آئی ہوئی چوری کی رپٹ درج کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن اگر پورا سیفادری پہاڑ چوری ہو گیا ـــ؟
اس کی بھی رپورٹ درج کی جانی چاہیئے۔ اور جب چوری کی رپورٹ ہے تو مالِ مسروقہ کے متعلق باریک سے باریک تفصیلات آئیں گی ہی۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیئے کلرک نے پوچھا ـــ ہاں تو جو مال چوری ہوا اس کے متعلق بتا سکتے ہو؟
ہاں ہاں ضرور ـــ وہ بہت بڑا تھا یعنی مہاراشٹر کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک، اتنا بڑا۔
ایسے گول مول نہیں ہم ناپتے آنا چاہیئے اس طرح بیان کرو!
ہاں۔ یعنی ہم ایسا کہہ سکتے ہیں کہ سیفادری پہ بڑے بڑے درخت تھے، گھاٹیاں تھیں، گھاٹ تھے۔
گھاٹ کیا؟ نام بتاؤ۔ کلرک نے پولیس کی طرح ہتھے سے اکھڑ کر کہا۔
وامن اس سے ذرہ برابر متاثر نہ ہوا بولا ـــ سیفادری پہاڑ کے گھاٹ کل بتیس[۳۲]۔
ہاں بتیس لکھ نام ـــ پار گھاٹ، ڈھوڑا گھاٹ، گوپیا گھاٹ، اینولی گھاٹ، چمپر گھاٹ، چینڈھے میڈھے گھاٹ شیو تیا گھاٹ، کمبھ گھاٹ، کوا گھاٹ۔
بس بس بس یہ خواہ مخواہ کوؤں چڑیوں کے نام کیوں گنوا رہے ہو۔ لا تو پورا سیفادری پہاڑ ہی ملے گا۔ نہیں کیا؟ کہ ایک آدھ گھاٹ یونہی کہیں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا ملے گا؟ اس کی پوری فہرست نہیں چاہیئے آگے بولو ـــ بولتا ہوں۔ اس پہاڑ کی چھیاسی شاخیں مختلف ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سات پڑا، سامڑا، ہتی، اجینا، ڈانگ، گنجھیرہ، تنگار، مبکوبا، لوا کنوڑا، پارسک، کاترابانی، شیر کو نجا۔
ارے ارے یہ کیا؟ کلرک نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور چیخ کر بولا۔
کیا مجھے پاگل کر کے چھوڑو گے؟
ممکن ہے۔ وامن نے سنجیدگی سے کہا۔
ممکن ہے!! کیا ممکن ہے؟ مجھے چوری کا پنچنامہ کرنا ہے کہ جغرافیہ لکھنا ہے ویسے تو اب اس کو پنچنامہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فقط چوری کی رپورٹ لکھ رہا ہوں اور ابھی وہ بھی آدھی بھی نہیں ہوئی اور تم مجھے آدھا پاگل بنا چکے ہو۔
پوری رپورٹ تو لکھ لیجئے۔ وہ بے ساختہ بولا۔
ہاں۔ یعنی میں پورا پاگل ہو جاؤں۔ یہی نا۔ کلرک گویا کفن پھاڑ کر چیخا۔
ایسا نہیں ہے تمہیں پاگل کر کے مجھے کیا ملے گا۔ وامن اسے سمجھانے لگا ـــ لیکن چوری کے مال کا پوری رپورٹ تو لکھو۔

ں اب اس پہاڑ پر تلیے نہیں تو رائے گڑھ . . .

ارے بس بس تمہارے تلیے رہنے دو بکافی ہے بتھوڑی دیر میں تم اس پہاڑ پہ کے تمام درختوں کے نام گنوانا شروع کر دوگے۔
یا وہ بھی وہ سب لکھتے بیٹھے رہیں۔ صرف تعداد بتاؤ۔

درخت ۔ ہاں۔ ستائیس کروڑ اڑتالیس لاکھ پچاس ہزار تین سو چھتیس درخت ہیں اس پہاڑ پر ان کی قسمیں بتاتا ہوں خصوصاً ببول، جامن . . . کیوں بھئی ؟ لکھ نہیں رہے سر میں درد ہے کیا ؟ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"تم تم اتنے درخت گنتے ہیں ؟"

"کیا ؟ اس میں کیا مشکل ہے۔ دراصل مجھے حساب سے ذرا دلچسپی ہے۔ سینا دری کے درختوں کی پتیوں کی تعداد پر سے والے درختوں کا اندازہ لگایا۔"

ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کتنے ؟ ستائیس کروڑ پچیس لاکھ اڑتیس ہزار نہیں اڑتیس لاکھ پچیس ہزار۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اس چوری میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے یعنی تمہیں کس پر شک ہے۔ کلرک نے مطلب کا سوال پوچھ لیا۔ بجائے درختوں پتھروں میں الجھنے کے ڈائریکٹ میتھڈ کا استعمال اسے زیادہ مناسب معلوم ہوا۔

وامن سوچ میں پڑ گیا پھر بولا — میرے خیال میں یہ چینی لوگوں کی کارستانی ہو سکتی ہے۔ چین کی ؟ پھر تو آئی کمبختی۔ ارے تو معاملہ بہت بڑا ہو گیا۔ ڈی ایس پی صاحب کو تار کرنا پڑے گا۔ کلرک فکر مند ہو گیا۔ اس نے زور سے ٹیبل پر پڑی گھنٹی بجائی اس کے باوجود باہر بیڑی پیتا ہوا سپاہی اندر نہ آیا کیوں کہ وہ کلرک کا مدعا سمجھ چکا تھا۔ تب کلرک غصہ میں پیر پٹکتا ہوا باہر آکر چیخا — سندھیا، ابے کب سے گھنٹی بجا رہا ہوں سنا نہیں کیا ؟

نہیں — سپاہی نے اطمینان سے جواب دیا۔

خیر — اب تو ادھر آ یہ لے فوجدار صاحب کے پاس جا کہنا ارجنٹ کیس ہے ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کو تار کرنا ہے فوراً آؤ۔

سندھیا یہ پیغام لیکر کچھوے کی چال چلتا ہوا چلا گیا۔ کلرک نے اندر آکر دوبارہ پوچھنا شروع کیا — اچھا تو چینیوں نے چوری کی مگر ان کا نام پتہ وغیرہ بتا سکتے ہو کیا ؟

آپ بھی عجیب ہیں صاحب چوروں کا نام پتہ بتانے پر کیا آپ ان کو پوسٹ کارڈ لکھ کر پولیس اسٹیشن بلوائیں گے اور پھر گرفتار کریں گے۔ چوروں کو تلاش تو آپ کو کرنا ہے۔ وامن نے حتی الامکان غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

دراصل ایسا ہے کہ چوروں کا حلیہ پتہ فوٹو وغیرہ چیزیں رہیں تو چوری پکڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کلرک نے چوری پکڑنے کا طریقہ بتایا۔

اب وامن کو بجائے غصہ کے ہنسی آئی بولا۔ ٹھیک ہے یعنی چور جہاں چوری کرتا ہو وہاں ہم کیمرہ لے کر پہلے ہی جا پہنچیں اور پھر اس سے کہیں اسٹڈی پلیز، اب ذرا مسکرایئے۔ اور اس کا فوٹو لیں پھر پتہ نوٹ کریں۔ فوٹو کی ایک کاپی اس کو دیں اور ایک پولیس اسٹیشن کو۔ ایسے ہی نا۔ ارے بھئی اگر فوٹو نکال سکتے تو بجائے فوٹو نکالنے کے اسی کو نہ پکڑ لیتے۔

تمہاری یہ بات ٹھیک ہے مگر دراصل کیا ہے کہ تصویر رہی تو ہمارا ریکارڈ کمپلیٹ رہتا ہے. چوری اگر پکڑی نہیں جا سکی تو بھی کوئی بات نہیں مگر ہم اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ہمارا ریکارڈ برابر رہے۔

اسی دوران فوجدار صاحب کھٹ کھٹ بوٹ بجاتے ہوئے آئے کلرک اٹھ کھڑا ہوا. کلرک پر بُری طرح جھلاتے ہوئے اور خود کو نرم گدّے دار کرسی کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔ کیوں رے! کیا لفڑا ہے۔

کلرک ہکلایا. چوری. . . چوری کی پوچھ تاچھ کر رہا ہوں. یہ کہہ کر اس نے وامن کی طرف اشارہ کیا۔

پھر پوچھ تاچھ کیا کر رہا ہے ایک لات لگا اس کی پیٹھ میں. فوجدار نے چوری پکڑنے کا تیر بہدف نسخہ بتایا. یہ سُن کر وامن بُری طرح چونکا. چور چھوڑ کر سنیاسی کو سولی چڑھانے والا ہے پولیس کا یہ اوتار اس کے لیئے بالکل نیا تھا. غصّہ سے بولا — مجھے کیوں؟

کلرک نے انکساری کا اظہار کیا — صاحب دراصل یہ چوری کی رپورٹ دینے آئے ہیں.

ارے! چوری کئے بغیر یہاں کوئی آتا بھی ہے. فوجدار کا دفتر کیا کوئی اسکول ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم ہے جس کے جب جی میں آیا چلے آیا جب جی میں آیا چلے گیا — فوجدار صاحب بُری طرح گرجے. صبح صبح پولس اسٹیشن میں قدم رکھتے ہی کام تیار دیکھ کر ان کی طبیعت بُری طرح جھنجھلا چکی تھی. اور یہاں آئے ہوئے آدمی کو لاتیں مار کر نکالا بھی نہیں جا سکتا. یہ صورتِ حال ان کے لیئے ناقابلِ برداشت تھی. کلرک نے اصل مدعا بیان کیا —

صاحب ان کی جو چوری ہوئی ہے وہ ذرا عجیب قسم کی ہے۔

چوری اور عجیب قسم کی؟ چور دروازہ پھوڑ کر اندر گیا کیا اور کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہوا کیا. کیا فرق ہے اس میں کیا مال چوری ہوا ہے؟ اب صاحب نے تفتیش کا کام اپنے ہاتھ میں لیا —

سیفادری پہاڑ چوری ہوگیا.

اچھا سیفاد . . . کیا کہا سیفادری پہاڑ چوری ہوگیا.

بہت دیر بعد چوری کا انوکھا پن فوجدار صاحب کی سمجھ میں آیا.

ہاں سیفادری پہاڑ کی چوری ہوگئی. وامن نے خصوصی اطلاع دی.

ابے گدھو! اُس وقت تم کیا سوئے ہوئے تھے؟ فوجدار صاحب گرجے.

ہاں سوئے ہوئے تھے. وامن نے غیر متوقع مگر صحیح جواب دیا.

چوری کے مال کی اندازاً قیمت کیا ہوگی؟

صاحب اس قسم کی چوری اس علاقے میں کبھی ہوئی ہی نہیں. کلرک بتانے لگا مگر پھر بھی دو چار کروڑ تو ہوگی ہی.

ابے کبھی تو نے عمر بھر میں دو چار کروڑ پیر میں پہننے کے بھی دیکھے ہیں. فوجدار نے خالص پولیسی جوک (JOKE) چھوڑا. اتنی بڑی چوری ہو گئی ضلع کو تار کرنا پڑے گا جا فارم لا.

کلرک فارم لانے کے لیئے تیزی سے نکل گیا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر دامن عرف ماںعتی سوت بیٹھ گیا۔ فوجدار صا
بھی سوچ میں پڑ گئے ان کی ۱۲ سال کی سروس میں کبھی اس قسم کی چوری نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس چوری کی تنفتیش کس طر
جائے یہ ان کے علم سے باہر تھا۔ اور اتنا بڑا پہاڑ چرا کر لے جاتے ہوئے چور کو پکڑنا بھی مشکل تھا۔ بھلا اتنا بڑا پہاڑ اس
کہاں چھپا کر رکھا ہوگا ؟ ویسے آج کل چور اتنے شاطر ہو چکے ہیں کہ کون سی چیز کہاں چھپائیں گے کچھ کہا نہیں جا سکتا
کا فارم آتے ہی فوجدار صاحب نے ڈی ایس پی کو تار کیا۔

HYADRI STOLEN ACTION AWAITED BANDOBASTA INCREASED

اپنی ڈائری میں بھی نوٹ کر لیا کہ سیخادری کی چوری ہوگئی ہے یہ خبر ملتے ہی فوراً پولیس بند وبست بڑھایا گیا۔ واقعۃً
کے "انتظامات بڑھائے گئے" یہ انتہائی بے معنی سا محاورہ ہے لیکن کچھ نہ کرتے ہوئے بہت کچھ کرنے کا سہرا اپنے سر
کے لیئے بندوبست بڑھایا گیا یہ محاورہ بہت مفید ہے۔

ڈی ایس پی کے لیئے بھی یہ مصیبت نئی تھی لہٰذا انہوں نے بھی آئی۔ جی۔ پی کے آفس میں فون کر کے سیخادری کی چ
کی اطلاع دی اور اسی کے ساتھ سرکاری مشنری حرکت میں آگئی۔ احکامات صادر ہوئے کہ خبر انتہائی اہم ہونے کی وجہ
بالکل SECRET رکھی جائے۔ اسی لیئے یہ خبر فوراً عام ہوگئی۔ اخباروں نے شاہ سرخیوں میں ۔۔۔ سیخادری چ
ہوگیا لکھ کر ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ چند شاطر قسم کے ایڈیٹروں نے اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے ہمارے "خصوصی نامہ نگ
کی دم لگا کر خبر کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا کہ ۔۔۔

" ہماری باریک بین نگاہ پچھلے کئی دنوں سے سیخادری کے اطراف کچھ لوگوں کو مشکوک حرکتوں میں ملوث دیکھ چکی
ایک دوسرے اخبار نے لکھا۔ شاید اس خیال سے کہ سیخادری پہاڑ میں خفیہ کاغذات نہیں ہیں جو چوری ہو
اس طرف سے لاپرواہی برتی گئی۔ ایک اداریہ میں لکھا گیا ۔۔۔ ہم پچھلے سال بھر سے چیخ رہے ہیں کہ ہنگامی حالات ہ
دشمنوں کی رات ہے کہاں کیا ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا سرکار ہوشیار رہے مگر ہماری سنتا کون ہے۔ اب سیخ
پہاڑ کی چوری سے ہمارے اس اشارے کی اہمیت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ جہاں سرمایہ دار اور کالا بازار کرنے وا
تاجر دن رات عوام کا استحصال کر رہے ہوں وہاں سیخادری اور ونعھیادری جیسے پہاڑ چوری نہ جائیں تو اور کیا ہو
ہم سرکار کو خبردار کیئے دیتے ہیں کہ ملک کے ہر پہاڑ پر سخت پہرہ بٹھائے ورنہ عوام زبردست اندولن کیئے بغیر نہ رہے گی۔

ملک کے مختلف اخباروں نے سیخادری کی تصاویر بھی شائع کیں اداریوں میں ان تصویروں کے متعلق لکھا تھ
غیر ممالک کے تمام اخباروں میں سیخادری پہاڑ کی اس قسم کی تصویریں شائع کی جائیں اور یہ پہاڑ اگر کسی کو کہیں نظر آجا
وہ فوراً بھارت سرکار کو لوٹا دے نیز اس قسم کی اطلاعات بھی شائع کی جائیں کہ سیخادری پہاڑ واپس لا دینے والے ک
پولیس محکمہ نے ۱۵ روپے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

اس غیر معمولی چوری کے متعلق سیاسی لیڈروں نے بتیر ما گئے انٹرویو دیئے۔ پونہ کے نامی گرامی انٹرویو دیئے

آبا صاحب بولے —— میں دلّی میں تھا تبھی سیفا دری چوری ہونے والا تھا مگر میں نے کمالِ عقلمندی سے سرکار کو بروقت اطلاع دے کر یہ چوری رکوائی تھی۔ میں پنجاب میں تھا اس وقت چوری شدہ درّہ خیبر میں نے من وعن حاصل ہو گیا۔ مگر مفادِ عامہ کے لیئے اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا گیا اسی لیئے میں خاموش رہا۔ آپ اس کا اندازہ کیجئے کہ جب میں کسی موضوع پر بول نہیں پاتا ہوں تو مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ پھر بھی میں نے درۂ خیبر کا ایک چھوٹا سا پتھر ثبوت کے طور پر اپنے گھر محفوظ رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر کوئی میرے اس کارنامے کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ایک نئی سیاسی پارٹی اس موضوع پر بحث کرنے کے لیئے میٹنگ بلوانے والی تھی لیکن کہیں اس بحث میں پارٹی کے مزید ٹکڑے نہ ہو جائیں اس خیال سے میٹنگ ملتوی کر دی گئی ——!

ٹیچرس نے پرائمری طلباء کے مورچے نکال کر ان سے سیفا دری کی چوری کی مذمت میں نعرے لگوائے۔ ان ہی پھیر لول بچوّں نے دارو بندی کی (پرمیٹ سمیت) حمایت میں اور کھادی کو بڑھاوا دینے کے متعلق نعروں کے علاوہ گاندھی زندہ باد تک کے نعرے لگائے۔

ایک بڑی سیاسی پارٹی کی طرف سے چوپاٹی پر ایک عوامی جلسہ ہوا جس میں صدر نے کہا۔ تم مہاراشٹرین لوگو کے پہاڑ کی چوری ہو گئی۔ یہ بہت بڑا ہوا اب تم لوگ باپو جی کے راستے سے جاؤ۔ اسی دوران ان کے سکریٹری نے کان میں کپڑے کی شدید DEMAND کا تار انھیں تھما دیا لہٰذا سیٹھ جی فوراً دوسروں کو گاندھی جی کے راستے سے جانے کا مشورہ دے کر خونریزی سے اپنے کپڑا مل میں گئے اور کپڑے کے دام اڑھائی گنا بڑھا دیئے۔

چوپاٹی پر لوگوں کو مشم بکشم چھوڑ کر اب ہم دیہجوواری چلیں اور دیکھیں کہ وہاں پولس اسٹیشن میں کیا چل رہا ہے۔ اب تک یہاں اعلیٰ پولس افسران کی لائن لگ چکی تھی۔ پولس نے گاؤں کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ آنے جانے والوں کے کپڑوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ڈی ایس پی کے آتے ہی فوجدار فوراً آفس میں حاضر ہوئے۔ ان کی جیپ کی آواز سنتے ہی دوڑتے ہوئے ان کے آگے گئے اور سیلوٹ کیا۔ پولس اسٹیشن کھڑے رہے۔ اور فوجدار کے اشارے پر انہوں نے بھی سیلوٹ کیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے فوجدار کی ڈائیری دیکھی۔ حقیقتاً سیفا دری کی چوری ہو گئی تھی۔ اپنے حلقے کے پر اتنی بڑی چوری ہوا اس کا انھیں بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے فوجدار کو سخت حکم دیا کہ —— اڑتالیس گھنٹے کے اندر کا پتہ لگنا چاہیئے۔ یس سر فوجدار نے سلام کیا وامن ٹھیوورکر کو پھر بلایا گیا۔ اس نے اصل رپورٹ لکھاتے وقت دی گئی دوبارہ دی۔ اتفاق سے یہ دوسرا تجربہ مفید ثابت ہوا اس بار ڈی ایس پی نے ایک نیا سوال پوچھا جو پہلے نہیں پوچھا گیا تھا۔

سیفا دری کی چوری ہوئی اس کا ثبوت کیا ہے؟۔

ثبوت؟ ہاں ہاں لیجئے وامن جیب ٹٹولتا ہوا بولا۔ یہ لیجئے۔ اس نے جیب سے ایک تڑا مڑا سا کاغذ

ڈی ایس پی کو تھما دیا۔ اس پر نظم کے دو مصرعے لکھے تھے ۔

ہمالیہ کو آگ لگی سیہنا دری کی چوری ہوگئی

ڈی ایس پی نے یہ مصرعے پڑھے چار یا پانچ بار پڑھنے کے بعد وہ کاغذ فوجدار کی طرف بڑھا دیا۔ فوجدار نے تین چار بار پڑھ کر صاحب کو لوٹا دیا۔ ہو سکتا ہے پڑھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی اس خیال سے وہ کاغذ انہوں نے وامن کے پاس دیا اور زور سے پڑھنے کے لئے کہا۔ جب وہ مصرعے سب کو یاد ہو گئے۔ بہت دیر سوچنے کے بعد ڈی ایس پی صاحب بولے

۔ یعنی تم شاعری کرتے ہو؟

ہاں ۔

اور جو کچھ تم لکھتے ہو اس کو سچ بھی سمجھتے ہو ؟

جی ہاں ! بالکل یہ تو یقین کا معاملہ ہے میری شاعری کا ایک ایک لفظ مجھ پر منکشف ہونے والی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ وامن نے کسی فلسفی کے سے انداز میں جواب دیا یعنی سیہنا دری کی چوری ہوئی اس کا کوئی اور ثبوت نہیں ؟

ڈی ایس پی نے دوسرا سوال پوچھا ۔

نہیں ۔ وامن نے کہا ۔

ٹھیک ہے تم گھر جا سکتے ہو یہ کہہ کر انہوں نے وامن کو رخصت کیا پھر فوجدار کی طرف مڑ کر کہا ۔ بہت عقلمند ہو۔

یس سر۔

یس سر کیا ؟ گدھے ہو۔

یس سر ۔ پھر ایک سیلوٹ ۔

اگلے دن اخبار میں چار لائن کی خبر تردید کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں کہا گیا تھا ہمارا شہر کے مشہور شاعر مار وتی سوت کی ایک نظم کی وجہ سے سیہنا دری کی چوری کی خبر غلط فہمی کی بناء پر پھیل گئی یہ خبر پوری طرح بے بنیاد ہے۔

اس معاملے کے بعد اب پولیس محکمہ میں ایک ادب کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ (مراٹھی سے ترجمہ) □□

بال کی کھال (تبصرہ)

ماہنامہ "سہیل"

ایک شمارہ منوّر رآنا کے نام"

" علامہ جمیل مظہری نمبر" کے بعد ماہنامہ "سہیل" کا زیرِ نظر خصوصی شمارہ تشنگانِ شعروادب کی تسکین و تشفی کا بہت بڑا سامان مہیا کرتا ہے ـــــ منوّر رانا کا نام کم سے کم ہم جنوبی ہندوالوں کے لیئے اجنبی تھا لیکن اُن کی شاعری پڑھ کر ساری اجنبیت دور ہوگئی ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

از دل خیزد بر دل ریزد والی کیفیت رآنا کے شعر کا طرۂ امتیاز ہے اور اس کا سب سے بڑا حُسن جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ اس کی قدرتِ بیان اور اچھوتا طرزِ اظہار ہے یا جدید تنقید کے محاورے میں کلیشوں (CLICHES) سے دامن کشی غزل کہنا اور کلیشوں سے دامن بچانا بقول غالب "لانا ہے جوئے شیر کا" مگر یہ کام رآنا نے چٹکی بجاتے کیا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب شاعر بے پناہ انفرادی شخصیت کا مالک ہو جس کا بڑا اچھا اظہار اس انٹرویو میں ہوا ہے جو جمیل منظر (مدیر سہیل) اور کامل حمیدی نے لیا ہے ـــــ اوّل تو تخلص رآنا ہی بڑا عجیب لگا لیکن یہ بہر حال اُن کے استادِ محترم کی دین ہے کہ اس میں کوئی مجال دم زدن نہیں خصوصاً ان مشرقی آداب و روایات کی پاسداری کے پس منظر میں جس کی رآنا صاحب کی شخصیت اور شاعری حامل ہے سرِ ورق پر نام کے مراحل سے گزر کر جب انٹرویو ختم کرتے ہیں تو مشتاق احمد یوسفی کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ "نام ٹھیک ہی ہے"! جس کا احساس انھیں خر غوث الاسلام نامی صاحب سے مل کر ان کے بارے میں ہوا تھا رآنا صاحب اپنے کھرے اور کھر درے پن کے اعتبار سے اُردو ادب کے رانا [illegible] معلوم ہوتے ہیں ان کے ہاں بقول مولانا ابوالکلام آزاد "دل اور زبان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں" زندگی اور ادب کے بارے میں اُن کے سوچے سمجھے کچھ خیالات ہیں جن کے بارے میں انھیں کوئی شک نہیں کیوں کہ بڑے سوچ بچار اور زندگی کے تلخ و ترش تجربات کی روشنی میں وہ ان نتائج پر پہنچے ہیں اور مزہ تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ بہت کم وقت میں حاصل کر لیا ہے جس طرح بعض لوگ ایک لمحظ غافل ہو کر سو سال

دیکھے جا پڑ بتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ چند لمحوں میں سالہا سال کا راستہ بھی طے کر لیتے ہیں راناصاحب کا تعلق اسی موخرالذکر خوش نصیب گروہ سے ہے۔ ان کی ساری مشرقی روایات مذہب پسندی دردمندی، انسان دوستی کے باوصف ایک بات جو بڑی عجیب لگی وہ اُن کی اقبال بیزاری ہے۔ جو اُن کے انٹرویو میں کھل کر نہ سہی بین السطور جھلکتی ہے ممکن ہے اقبال کی ساری اردو اور فارسی شاعری بہ امعان نظر انھیں پڑھنے کا موقع نہ ملا ہو۔ ویسے جوان کا طرز بود و باش ہے اس کو دیکھتے ہوئے جب ان کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اسی سیم و زر کی افراط نے صلاح الدین پرویز کا کیا حشر کیا اور منوّر رانا کا ایک بال بھی بیکا نہ کر سکی کیا خوب کہا ہے مولانا روم نے ؎

چیست دُنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

منوّر رانا کی غزلیں پڑھتے ہوئے مجھے گولڈسمتھ کی نظم DESERTED VILLAGE یاد آگئی شہروں کی گھٹی گھٹی مصنوعی زندگی سے وہی بیزاری اور گاؤں کی سادہ اور پاکیزہ زندگی کی تلاش ـــ گولڈسمتھ جس عہد کی دین ہے تقریباً اسی عہد سے اب ہم گزر رہے ہیں یعنی صنعتی انقلاب کی چیرہ دستیاں اور اعلیٰ انسانی قدروں کی پامالی۔ منوّر رانا کا بھی وہی قصہ ہے۔ رائے بریلی کے ایک دیہات کے سادہ و پاکیزہ ماحول سے نکل کر انھیں کلکتہ جیسے کثیر آبادی والے صنعتی شہر میں بس جانا پڑا لیکن انھوں نے اپنی روح کے نہاں خانے میں پرورش پانے والی مغربی یوپی کے دیہات کی سادگی و پاکیزگی کو کلکتہ کی زندگی سے آلودہ ہونے نہیں دیا وہ اسی طرح محفوظ ہے جیسے پانی پر تیل یا دنیاداری کے جھمیلوں میں ماں کا پیار (جو اُن کی شاعری میں بہت نمایاں ہو کر اُبھرا ہے) بڑا عجیب واقعہ ہے اور یہی وہ روحانی قوت ہے جو ان کے شعر کے کالبد میں جان ڈال رہی ہے بلکہ شاید اسے حیات جاودانی بھی عطا کر رہی ہے۔ مغرب زدہ صنعتی اور مشینی زندگی نے نہ صرف احساس کو کچل کر رکھ دیا ہے بلکہ انسانی رشتوں کی معنویت اور ان کی پاکیزگی اور تقدس کو بھی اس دیو بے زنجیر نے روند ڈالا ہے۔ منوّر رانا ان رشتوں کے تحفظ کی بات کرتے ہیں یعنی ؎

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

قابل مبارکباد ہیں جمیل منظر سنسبار وی کہ پے در پے ایسے خاص نمبر اس علم و ادب کی کساد بازاری میں سامنے لا رہے ہیں (آج ہی اطلاع آئی ہے کہ اب وہ سردار جعفری نمبر بھی نکال رہے ہیں) پھر ایسے حالات میں جبکہ اردو والے اخبار تک خرید کر نہیں پڑھتے۔ خصوصاً ایسے شاعر کا نمبر نکالنا یعنی بے نیازی کے سبب ادبی دُنیا میں اتنا روشناس بھی نہیں ہیں ؎

انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد !

(۱۵۲) صفحات پر مشتمل یہ نمبر جس میں شاعر کے فن اور شخصیت پر چھوٹے بڑے پچاس مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جن کے لکھنے والوں میں شاعر ... جیسے ... اور مظفر حنفی جیسے ... شامل ہیں ... کلام کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے صرف دس روپے میں گویا سرمۂ مفت نظر ہے!!

خرافات (مراسلے)

■ محترمی و مکرمی! سلام مسنون،
شگوفہ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ، پرچہ بہت ہی خوب ہے۔ مبارکباد۔ میرے ایک قطعہ میں لفظ 'سُنیں'، کی جگہ کاتب صاحب نے 'سُنیل' لکھ دیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیئے۔

" باؤنڈری جو لگا رہے ہیں سُنیں "

حفیظ بنارسی، آرہ

-:- -:- -:-

■ میں عرصۂ دراز سے رسالہ "شگوفہ" کا باضابطہ طور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اکتوبر کا تازہ شمارہ بھی اپنی ترتیب نو کے ایک ایک رنگ سے وہ تمام رعنائیاں جھلکا رہا ہے جس کا اب "شگوفہ" کا ہر قاری عادی بن چکا ہے۔

"شگوفہ" کا "خواجہ عبدالغفور نمبر" اپنی مثال آپ ہے۔ مطالعہ کے بعد خواجہ صاحب کی نہ صرف شخصیت بلکہ فن اور دیگر پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب پر مستقبل قریب میں جب بھی تحقیقی کام ہوگا تو لکھنے والوں کے لیے اس نمبر سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔

خدا کرے "شگوفہ" کا "ہندوستانی طنز و مزاح نمبر" بھی "ڈرامہ نمبر" کی طرح معیاری ہو۔

زاہد انور،
صاحب گنج۔ سنتھال پرگنہ

-:- -:- -:-

■ بعد مدت کے میرے گھر شگوفہ چھوٹا۔ شگوفہ چھوڑنے کا شکریہ۔ کتنا دیدہ زیب پرچہ ہے! قریب ایک سال بعد آنکھوں کو باکمال شاہکار ملا اور دل سے دعا نکلی۔

"آپ تو کمال میں سکّے کی طرح نام چلے
دن چلے رات، چلے صبح چلے شام چلے"

ادھر ریڈیو پر حیدرآباد کی کچھ منحوس خبریں سننے کو ملیں! دل پریشان ہو اٹھا۔ مالکِ حقیقی کے آگے سر بسجود ہو کر دعا مانگی "یا رالہا ہر بلائے ناگہانی سے سارے عزیز و اقارب کو بچائے رکھنا"۔ ۳۸ برس پہلے ہم ہندوستانی یہ کہا کرتے تھے کہ یہ سب انگریزوں کی سازش ہے مگر اب انگریز تو نہیں رہے۔

انگریز تو وطن سے ہمارے نکل گئے
اثرات اب نہیں انگریزی کھاد کے
نفرت کے بیج بوتے ہیں خود ہی جناب شیخ
اُگتے نہیں اُگاتے ہیں پودے فساد کے

نشتر سیوانی

-:- -:- -:-

■ یقین جانیے میں شگوفہ کا ہمیشہ سے مداح ہوں اور جب شگوفہ کا مداح ہوں تو آپ کا بھی مداح ہوا نا! . . . اتنی محنت اور لگن کے ساتھ اتنا خوبصورت پرچہ صرف آپ ہی نکال سکتے ہیں۔ اگر غزلوں کو کم کر کے کچھ مزاحیہ خاکوں میں اور اضافہ کریں تو پرچہ اور بھی نکھر جائے گا۔

آپ ہمیشہ سے ہی نئے فنکاروں اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے آرہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اس کا خیال رکھیں گے۔

محمد مظہر حیات، ناگپور

خشک سالی اور طوفان بادوباراں کے متاثرین کیلئے امدادی اقدامات

آندھراپردیش کو سال رواں کے دوران شدید خشک سالی سے دوچار ہونا پڑا۔ ابھی یہ معاملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ماہ نومبر میں سائیکلون کی وجہ سے سرکاری وخانگی جائیداد کو قابل لحاظ نقصان پہنچا۔

متاثرہ علاقوں کے عوام کی شدید تکلیف دور کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے مسٹر ین۔ ٹی۔ راماراؤ کی زیر قیادت کئی امدادی اقدامات کئے ہیں۔

خشک سالی امداد

* خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کاموں پر خرچ کرنے کے لئے 20 کروڑ روپے جاری کئے گئے۔ (20 کروڑ روپے مرکزی عارضی امداد)
* خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں مالگذاری کے بقایاجات۔ قرضے۔ محاصل (بشمول ڈرینج محصول اور خصوصی محصول اراضی) کی وصولی کو موتوف کردیا گیا۔
* ان علاقوں میں رہنے والے کمزور طبقات کے طلباء کو تعلیمی فیس، امتحانات کی فیس اور دوسری خصوصی فیس کی ادائی سے چھوٹ دے دی گئی۔
* اضلاع سریکاکلم۔ وزیانگرم اور وساکھاپٹنم میں روزگار پیدا کرنے والے کاموں پر خرچ کرنے کے لئے 25 لاکھ روپے منظور کئے گئے۔
* ان اضلاع میں ہنگامی زرعی پیداواری پلان کے لئے 15 لاکھ روپے جاری کئے گئے۔

سائیکلون امدادی اقدامات

* اضلاع نیلور۔ پرکاشم۔ کرشنا۔ گنٹور اور چتور کے طوفان بادوباراں سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کاموں پر خرچ کرنے کیلئے 5 کروڑ روپے جاری کئے گئے
* طوفان بادوباراں میں ہلاک ہونیوالے ہر فرد کے پسماندگان کو 2 ہزار روپے بطور ایکس گریشیا منظور کئے جائیں گے۔
* طوفان کی وجہ سے کلی طور پر تباہ ہونیوالے مکان کیلئے 250 روپے اور جزوی طور پر تباہ ہونیوالے مکان کیلئے 75 روپے دیئے جائیں گے
* طوفان سے متاثرہ ہر خاندان کو 10 کلو چاول مفت دیئے جائیں گے۔
* ہر اس خاندان کو جسکا مکان طوفان میں تباہ ہوگیا ہے ایک دھوتی کا جوڑا ایک ساڑی اور سوتی بلانکٹ دی جائے گی۔

امدادی کام جنگی خطوط پر جاری ہیں۔

(جاری کردہ ناظم محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ)

DIPR. NO. 11/64/84 - dated : 16-11-84


FAROOKY
FAROOKY
خوشگوار تازگی!
دندان و دہن یعنی
منہ کی مکمل حفاظت کیلئے
منجن فاروقی